رپورٹ

تحقیقاتی عدالت

(مقرر کردہ زیر پنجاب ایکٹ ۲ سنہ ۱۹۵۴ء)

برائے تحقیقات

فسادات پنجاب سنہ ۱۹۵۳ء

نذیر اولڈ بک شاپ
0321-4509820

فہرست

صفحات

ابتدائیہ 1

حصۂ اوّل، تقسیمِ ملک سے لیکر لاہور کنونشن تک 8

نزاع 8

احمدی 8

احرار 10

دو احراری لیڈروں کی گرفتاری 13

میجر محمود کا قتل 13

احرار لیڈروں کی تقریریں 15

افغانستان میں احمدیوں کی سنگساری اور "الشہاب" 18

مزید قتل 24

یوم تشکر 29

احمدیوں کی مسجد جلا دی گئی 30

احراریوں کی دُوسری تقریریں 31

پالیسی اور تدابیر 33

بُخاری کی مزید تقریریں 36

مسجدوں میں عام جلسوں کے خلاف دفعہ ۱۴۴ کے احکام کا نفاذ۔ سرگودھا اور گوجرانوالہ کے کیس 63

جہانگیر پارک میں چودھری ظفراللہ خاں کی تقریر 76

کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن 79

لاہور میں آل مسلم پارٹیز کنونشن 80

اخبارات 83

محکمۂ اسلامیات 88

حصہ دوم: لاہور کنونشن سے لیکر کراچی اور پنجاب میں علما کی گرفتاری تک

(از ۱۴ر جولائی ۱۹۵۲ء تا ۲۷ر فروری ۱۹۵۳ء)

دفعہ ۱۴۴ کے احکام واپس لے لئے گئے ۸۹

کُپ کا واقعہ ۹۲

بعد کے واقعات ۹۹

اخبارات ۱۰۱

آزاد ۱۰۱

آفاق ۱۰۴

احسان ۱۰۵

مغربی پاکستان ۱۰۶

مزید تقریریں، پالیسی پر نظر ثانی ۱۱۹

علما کی سرگرمیاں۔ اور وزیراعظم اور وزیراعلیٰ سے اُن کی ملاقاتیں ۱۲۷

ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ ۱۳۸

ڈائرکٹ ایکشن کی دھمکی کے مقابلے کی تیاریاں ۱۳۹

ابتدائی تدابیر ۱۴۷

حصہ سوم: فسادات

(۲۷ر فروری سے فسادات کے خاتمہ تک)

فسادات کا حال ۱۵۳

لاہور ۱۵۳

دولتانہ صاحب نے ۶ر مارچ کا بیان واپس لے لیا ۱۷۲

سیالکوٹ ۱۷۳

گوجرانوالہ ۱۸۰

راولپنڈی ۱۸۴

لائل پور ۱۸۶

منٹگمری ۱۸۹

حصّہ چہارم: وہ کوائف جن کا نتیجہ مارشل لا کے اعلان کی صورت میں نکلا .. ۱۹۲

مسلمانوں اور احمدیوں کے درمیان عقائدی اختلافات ۱۹۶
ختمِ نبوّت ۱۹۶
میسحیّات ۲۰۰
جہاد ۲۰۲
دیگر شکایات والزامات ۲۰۷
مطالبات کی پشت پر کیا نظامِ عقائد تھا ؟ ۲۱۳
اسلامی مملکت ۲۱۴
اسلامی مملکت کی بنیادیں: قرآن ۔ سنّت ۔ اجماع ۔ اجتہاد ۲۱۷
اسلامی مملکت کے لازمی اجزا ۲۲۵
اسلامی مملکت میں حاکمیت اور جمہوریت ۲۲۶
علما کے نزدیک اسلامی مملکت کے دوسرے لوازم کیا ہیں ۲۲۷
مقنّنہ اور قانون سازی ۲۲۷
غیر مسلموں کا موقف ۲۲۹
ارتداد ۲۳۶
دوسرے مذاہب کی تبلیغ ۲۳۸
جہاد ۲۳۹
غیر مسلم مملکتوں کے مسلمانوں پر ردّ عمل ۲۴۵
دوسرے کوائف ۲۴۸
مطالبات کے متعلق خواجہ ناظم الدّین کا ردِّ عمل ۲۵۱
جن کوائف کا نتیجہ مارشل لا کی صورت میں نکلا۔ ان کا جامع خلاصہ ۲۵۴

حصّہ پنجم: فسادات کی ذمّہ داری

ذمّہ داری ۲۵۵
آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور ۲۵۸
تعلیماتِ اسلامی بورڈ کے ممبر ۲۶۰

جماعتِ اسلامی ۲۶۱

احرار ۲۷۲

احمدی ۲۷۹

مسلم لیگ ۲۸۱

اخبارات ۳۰۰

مرکزی اور صوبائی حکومتیں : خواجہ ناظم الدین اور مسٹر دولتانہ کا نزاع ۳۰۲

حصّہ ششم : سول کے حکّام نے صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے جو تدابیر اختیار کیں وہ کافی تھیں یا ناکافی۔

نظمِ حکومت کی مشینری ۳۰۸

مئی ۱۹۵۲ء میں ڈی آئی جی۔سی آئی ڈی نے صورت حالات کا عام اندازہ لگایا اور پالیسی کی وضاحت کیلئے نئی چٹھیاں جاری کیں ۳۴۰

۵ جولائی ۵۲ء کے فیصلے ۳۴۸

۱۹ جولائی ۵۲ء کو احرار کی طرف سے یقین دہانی ۳۵۱

۲۴ دسمبر ۵۲ء کا فیصلہ ۳۶۳

پریس ۳۷۱

تعلیم بالغاں کا فنڈ ۳۸۱

مزدور (اخبار) ۳۸۳

آزاد (اخبار) ۳۸۳

ڈائرکٹ ایکشن ۳۸۴

آخری مرحلہ ۳۸۶

حصّہ ششم کے متعلق نتائج کا جائزہ ۴۲۲

ابتدائیہ

منجانب :-

عدالت تحقیقات فسادات پنجاب - لاہور

بخدمت :-

جناب ہوم سکرٹری صاحب حکومت پنجاب لاہور

لاہور - مورخہ ۱۰ - اپریل ۱۹۵۴ء

جناب والا -

ہم اُس عدالت تحقیقات کے صدر اور رکن کی حیثیت سے جو فسادات پنجاب (تحقیقات عامہ) ایکٹ ۱۹۵۴ء کے ماتحت وجود میں لائی گئی۔ آپ کی خدمت میں ذیل کی رپورٹ پیش کرتے ہیں:-

عدالت کی ترکیب

مارچ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں پنجاب کی سرزمین پر وسیع فسادات پھوٹ پڑے جو بعض مقامات پر اپریل ۱۹۵۳ء کے وسط تک جاری رہے۔ ان فسادات نے ایسا ہولناک رنگ اختیار کیا اور ایسی پُرخطر شکل پکڑ لی کہ متعدد مقامات پہ ملٹری کو طلب کرنا پڑا اور لاہور میں تو مارشل لا کا اعلان کئے بغیر چارہ نظر نہ آیا جو مئی ۱۹۵۳ء کے وسط تک نافذ رہا۔ مارشل لا کے اعلان سے پیشتر پولیس کو کئی مقامات پر گولی چلانی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو آدمی ۴ مارچ کی رات کو اور دس نفوس ۵ مارچ کو مارے گئے۔ گولی چلنے سے مزید چھیاسٹھ افراد ضرور زخمی ہوئے ہونگے کیونکہ لاہور کے ہسپتالوں میں جو زخمی داخل کئے گئے ان میں چھیاسٹھ ایسے تھے جن کے جسموں پر گولی کے زخم تھے۔ لاہور کی آتش فسادات کو فرو کرنے میں ملٹری کو جو کچھ کرنا پڑا اس میں ملٹری کے اعتراف کے مطابق گیارہ ہلاک اور ۴۹ زخمی ہوئے۔ دوسرے شہروں میں بھی پولیس یا فوج کے گولی چلانے سے چند اشخاص ہلاک اور زخمی ہوئے۔

یہ فسادات کیوں ہوئے؟ بات یوں ہوئی کہ ۱۶۔ جنوری ۱۹۵۳ء سے لیکر ۱۸۔ جنوری تک کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن منعقد ہوئی جس نے ایک مجلس عمل تر ترتیب دے دی۔ اس مجلس عمل نے چند علما کو یہ اختیار دیا کہ وہ ایک وفد کی صورت میں وزیر اعظم پاکستان کو بتاریخ ۲۱۔ جنوری ۱۹۵۳ء بمقام کراچی ایک الٹی میٹم دے دیں۔ چنانچہ اس وفد نے الٹی میٹم دے دیا جس کو خواجہ ناظم الدین (تب وزیر اعظم پاکستان) نے رد کر دیا۔ یہی استرداد فسادات کے پھوٹ پڑنے کا باعث ہوا۔ الٹی میٹم یہ تھا کہ اگر ایک مہینے کے اندر اندر قادیانی احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار نہ دے دیا گیا۔ چودھری ظفراللہ خاں احمدی وزیر خارجہ کو موقوف نہ کر دیا گیا۔ اور دوسرے احمدی جو مملکت میں کلیدی عہدوں پر فائز ہیں ملازمت سے علیحدہ نہ کر دیئے گئے تو مجلس عمل ڈائرکٹ ایکشن (راست اقدام) کرے گی۔ ۲۷۔ فروری کی صبح کی ابتدائی ساعتوں میں مرکزی حکومت کے وزرا اور مغربی پاکستان کے صوبوں کے نمائندہ حضرات کی ایک کانفرنس منعقد

ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ الٹی میٹم کو رد کر دیا جائے۔ اور مجلس عمل کے ممتاز ممبروں کو کراچی میں اور تحریک کے بعض لیڈروں کو پنجاب میں گرفتار کر لیا جائے۔ اس فیصلے پر عمل ہونے کے ساتھ ہی فسادات شروع ہو گئے۔ جو براہ راست ان گرفتاریوں ہی کا نتیجہ تھے۔

۱۹۔ جون ۱۹۵۳ء کو گورنر پنجاب نے آرڈی ننس ۳ ۱۹۵۳ء صادر کیا۔ جو ہماری تجویز کردہ بعض ترمیمات کے بعد فسادات پنجاب (تحقیقات عامہ) ایکٹ ۱۹۵۴ء بن گیا۔ جس میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ فسادات کے متعلق تحقیقات عامہ کرنے کی غرض سے ایک عدالت قائم کی جائے۔ آرڈی ننس کی دفعہ ۳ کی ذیلی دفعہ (۱) کے ماتحت جو اختیارات گورنر کو حاصل ہیں ان کو استعمال کرتے ہوئے گورنر صاحب نے ہمیں اس عدالت تحقیقات کا ممبر مقرر کر دیا۔ اور ہدایت فرمائی کہ ہم مندرجہ ذیل دائرہ شروط کے اندر رہ کر فسادات کی تحقیقات کریں۔

(۱) وہ کیا کوائف تھے جن کی وجہ سے ۶۔ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لا کا اعلان کرنا پڑا۔

(۲) فسادات کی ذمہ داری کس پر ہے۔ اور

(۳) صوبے کے سول حکام نے فسادات کے حفظ ماتقدم یا تدارک کے لئے جو تدابیر اختیار کیں۔ آیا وہ کافی تھیں یا ناکافی۔

ہم نے یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو تحقیقات شروع کر دی اور کل ۱۱۷۔ اجلاس کئے جن میں ۹۲ اجلاس شہادتوں کی سماعت اور اندراج کے لئے مخصوص رہے۔ شہادت ۲۳۔ جنوری ۱۹۵۴ء کو ختم ہوئی۔ اور اس مقدمے پر بحث یکم فروری سے ۲۸۔ فروری ۱۹۵۴ء تک جاری رہی۔ پانچ ہفتوں میں ہم نے اپنے نتائج فکر مرتب کئے اور رپورٹ قلمبند کی۔ اس تحقیقات کا ریکارڈ تحریری بیانات کے ۳۶۰۰ صفحات اور شہادت کے ۲۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ تین سو انتالیس دستاویزیں رسماً عدالت میں پیش کی گئی ہیں۔ اور شہادت اور بحث کے دوران میں کثیر التعداد کتابوں کتابچوں، رسالوں اور اخباروں کے حوالے دیئے گئے۔ علاوہ بریں ہمیں کثیر التعداد چٹھیاں بھی وصول ہوئیں جو کئی کئی صفحوں پر لکھی ہوئی تھیں۔ اور چند کی ضخامت تو سو صفحے سے بھی زیادہ تھی۔ ہم نے ایک ایک چٹھی کو نہایت احتیاط سے پڑھا۔

ضابطۂ کار اور فریقان تحقیقات

چونکہ یہ تحقیقات عمومی نوعیت کی تھی۔ کسی خاص اور معین فرد یا جماعت کے خلاف نہ تھی۔ اور چونکہ حکومت پنجاب کا اس معاملے میں اپنا کوئی نقطۂ نگاہ نہ تھا۔ اس لئے ہم نے اپنا ضابطۂ کار خود تجویز کر لیا۔ تاکہ ہر قسم کا متعلقہ مواد ہمارے سامنے آجائے اور ہم ایکٹ کے مطابق اپنے وظائف ادا کر سکیں۔ ایکٹ کی دفعہ ۵ کی ذیلی دفعہ ۵ میں یہ لکھا تھا کہ ہم مجموعہ ضابطہ فوجداری کی شروط و قیود کے پابند نہ ہوں گے۔ اس سیکشن میں جو اختیار ہم کو دیا گیا تھا اس کو استعمال کر کے ہم نے یہ قاعدہ وضع کر لیا کہ ہم قانون شہادت کے بھی پابند نہ ہوں گے۔ اس قاعدے کا مقصد یہ تھا کہ یہ تحقیقات حتی الامکان کم سے کم وقت میں مکمل ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم اپنے نتائج و مشاہدات کے لئے اس قدر قابل اعتماد اور مستند مواد فراہم کر سکیں جو بحالات موجودہ حیطۂ امکان میں ہو لیکن اس قاعدے کے باوجود بھی ہم نے

قانون شہادت کے اصولوں کی خاصی پیروی کی ہے۔ اور کسی کے خلاف کسی ایسے مواد کی بنا پر جو قانون شہادت کے ماتحت غیر متعلق اور ناقابل قبول ہو کوئی سنگین و سنجیدہ رائے قلمبند کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ چونکہ ہمارا مواد بہت کثیر اور ہماری تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس لئے ہم بعض موقعوں پر سنی سنائی شہادت کے خلاف قاعدے سے انحراف کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ لیکن ہم نے سنی سنائی کو صرف اسی صورت میں قبول کیا ہے جب ہم نے یہ محسوس کر لیا کہ اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں۔ تحقیقات کے بعض فریقوں اور بعض اہم افسروں سے ہم نے تحریری بیانات حاصل کئے ہیں۔ لیکن ہمیشہ ان بیانات کے معائنہ کی اجازت دی ہے۔ اور فریق متاثر کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ان بیانات کے دینے والوں کو جرح کی غرض سے دوبارہ طلب کرے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ضابطۂ کار اختیار کرنے سے ہم نے غلطی کے عنصر کو حتی الامکان خارج کر دیا ہے۔

بحث کے دوران میں ہم نے اُن تقریروں کے بے شمار اقتباسات کا حوالہ دیا ہے۔ جو کہا جاتا ہے کہ بعض لوگوں نے خاص موقعوں پر کیں۔ یہ تقریریں جب تک اخباروں میں درج نہ ہوئی ہوں۔ یا فریق متعلقہ کی کسی کتاب وغیرہ میں واقع نہ ہوئی ہوں یا ہمارے سامنے شہادت میں بطور ثبوت پیش نہ ہوئی ہوں رسماً ثابت شدہ نہیں سمجھی جا سکتیں۔ لیکن خواہ کوئی تقریر ثابت ہوئی ہو۔ یا نہ ہوئی ہو۔ اگر اسکی روداد درج ہوئی ہے اور اس پر کوئی کارروائی کی گئی ہے تو اس کارروائی کے کافی و مناسب ہونے یا نہ ہونے کا تعین کرنے کے لئے وہ روداد بالکل کافی ہو گی۔ اس لئے اس رپورٹ میں جہاں جہاں تقریروں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ ان کو مذکورہ بالا اشارے کی روشنی ہی میں پڑھنا چاہیئے۔

انگریزی رپورٹ میں ہم نے قرآن مجید کی بعض آیات کا ترجمہ نقل کیا ہے جو فریقوں کے نزدیک معتبر اور مسلّم تھا۔ اس قسم کے تمام ترجمے علامہ عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن مجید سے نقل کئے گئے ہیں۔

بعض اشخاص اور بعض اداروں کے متعلق ہماری عدالتی رائے یہ تھی کہ وہ اس تحقیقات کی شروط کا جواب دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے ان کو کارروائی عدالت میں فریق بنا لیا۔ اور ان کو ہدایت کی کہ وہ تحقیقات کے دائرہ شروط کے متعلق تحریری بیانات داخل کریں۔ جن میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں جو ادارے اس طرح پر فریق بنائے گئے۔ وہ حسب ذیل تھے:۔

۱۔ حکومت پنجاب
۲۔ صوبہ مسلم لیگ
۳۔ مجلس احرار
۴۔ مجلس عمل (مقرر کردہ مجلس تحفظ ختم نبوت پنجاب)
۵۔ جماعت اسلامی۔
۶۔ صدر انجمن احمدیہ ربوہ
۷۔ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

جس زمانے پر یہ تحقیقات حاوی ہے اس میں ۲۶۔ نومبر ۱۹۵۱ء تک سردار عبدالرب نشتر صوبے کے گورنر تھے۔

ان کے بعد مسٹر آئی۔ آئی چندریگر مقرر ہوئے جو مارشل لا کے اعلان کے بعد تک اس عہدے پر فائز رہے۔ صرف چند مہینے مسٹر فدا حسین چیف سکرٹری حکومت پنجاب کے عہدے پر متمکن ہوئے۔ باقی عرصہ حافظ عبدالمجید چیف سکرٹری رہے۔ یہی صاحب ۳۰ ستمبر سے ۷ دسمبر ۱۹۵۱ء تک ہوم سکرٹری بھی تھے۔ سید احمد علی ۱۷ - مارچ ۱۹۴۹ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۵۱ء تک ہوم سکرٹری رہے اور مسٹر غیاث الدین احمد ۷ دسمبر ۱۹۵۱ء سے ہوم سکرٹری چلے آتے ہیں۔ مسٹر قربان علی خاں ۱۱ - فروری ۱۹۵۳ء تک انسپکٹر جنرل پولیس رہے۔ ان کے عہدے کا چارج مسٹر انور علی نے لیا جو انسپکٹر جنرل پولیس کے فرائض کے ساتھ ساتھ اپنے اصلی عہدے یعنی ڈی آئی۔ جی۔ سی آئی ڈی کے وظائف بھی برابر ادا کرتے رہے۔

حافظ عبدالمجید، مسٹر غیاث الدین احمد، مسٹر انور علی، مسٹر ایس این عالم، سید اعجاز حسین شاہ اور مرزا نعیم الدین اپنے عام سرکاری فرائض کی بجا آوری کی وجہ سے فسادات کے آغاز اور ان کی ترقی کے متعلق تازہ ترین اور صحیح ترین معلومات کے حامل تھے۔ اور آخری تین تو زمانہ متعلقہ میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل لاہور رینج، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور اور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اس لیے ان سب افسروں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ تحقیقات کے دائرہ شرائط کے متعلق اپنے بیانات پیش کریں۔ مذکورہ بالا پولیس افسروں کو یہ بیان کرنے کی بھی ہدایت کی گئی کہ فسادات کے دوران میں گولی بارود کی کتنی مقدار حقیقتہً دی گئی۔ اور استعمال کی گئی اس کے علاوہ پولیس کی فائرنگ سے کتنے آدمی ہلاک و مجروح ہوئے۔ سید اعجاز حسین شاہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ ان مجسٹریٹوں کے متعلق مکمل بیان پیش کریں جن کی دوران فساد میں روزانہ ڈیوٹیاں لگائی گئیں۔ ان کے نام کیا کیا ہدایات جاری کی گئیں اور انہوں نے کیا کیا رپورٹیں پیش کیں۔ مزید براں شاہ صاحب سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ ان تمام احکام کی نقلیں پیش کریں جو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری صادر کیے گئے۔ ان احکام کی کیا کیا خلاف ورزیاں کی گئیں۔ اور ان پر کیا کارروائی کی گئی۔ اس کے علاوہ ہم نے ان کو یہ بیان کرنے کا بھی حکم دیا کہ آیا زیر دفعہ ۱۲۹ ضابطہ فوجداری ملٹری طلب کی گئی یا نہیں۔ اگر طلب کی گئی۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اور اگر طلب نہیں کی گئی۔ تو اسکی وجوہ کیا تھیں۔

ان افسروں کے بیانات کا معائنہ کرنیکے بعد ہم نے ضروری سمجھا کہ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کو جو دوران فسادات میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اپنی وزارت کی جانب سے ایک تحریری بیان داخل کرنے کی ہدایت کریں۔ اور ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ اگر وہ کارروائی مقدمہ میں ایک فریق کی حیثیت سے شامل ہونا چاہیں تو عدالت کو اپنی اس خواہش کی اطلاع دیں۔ اس نوٹس کے جواب میں میاں دولتانہ نے ایک درخواست کے ذریعے استدعا کی کہ انہیں ایک فریق قرار دیا جائے۔ ہمارے نزدیک ان کی یہ استدعا قدرتی تھی۔ چنانچہ ہم نے ان کو ایک فریق قرار دے دیا۔ اور ہدایت کی کہ وہ ایک تحریری بیان پیش کریں۔

چونکہ فسادات سے راولپنڈی۔ سیالکوٹ۔ لائل پور۔ گوجرانوالہ اور منٹگمری کے اضلاع متاثر ہوئے تھے اس لئے ہم نے ان اضلاع کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے اپنے اضلاع میں ہونے والے فسادات کے مفصل حالات پیش کریں۔ اور یہ بھی بتائیں کہ فسادات کیونکر شروع ہوئے اور کس طرح بڑھ گئے۔ ان کے دبانے کے لئے کیا کیا تدبیریں اختیار کی گئیں۔ ان فسادات کے دوران میں اور ان سے متعلق کن کن جرائم کے ارتکاب کی اطلاعیں موصول ہوئیں۔ علاوہ بریں ان تمام جرائم کی ابتدائی رپورٹوں کی نقلیں بھی پیش کریں۔ مزید براں ان افسروں سے

یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ انہوں نے اینٹی احمدی شورش اور اس سے پیدا ہونے والے فسادات کے متعلق یکم جنوری ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۵۔ مئی ۱۹۵۳ء تک جو روزانہ صورت حالات کی رپورٹیں۔ خاص رپورٹیں اور ہفتہ وار رپورٹیں حکومت کو یا کسی اعلیٰ حاکم کو ارسال کیں۔ ان کے اقتباسات کی نقلیں بھی پیش کریں۔ ان سے بالخصوص یہ استدعا بھی کی گئی کہ افراد یا جماعتوں کی طرف سے تشدد پر اکسانے کے جو واقعات پیش آئے۔ ان کا ذکر بھی کریں۔ اور یہ بھی بتائیں کہ انہوں نے صورت حالات کے متعلق کیا کیا اطلاعات حکومت کو دیں اور حکومت کی طرف سے کیا کیا ہدایات ان کو وصول ہوئیں۔

ہم نے میجر جنرل محمد اعظم خاں جنرل آفیسر کمانڈنگ دہم ڈویژن سے بھی جنہوں نے اپنے آپ کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر لیا تھا یہ استدعا کی کہ وہ مارشل لا کے اعلان کے وقت کی صورت حالات بے کم و کاست بیان کریں۔ اور وہ وجوہ بتائیں جن کی بنا پر انہوں نے مارشل لا کا اعلان کیا۔

اخباروں میں اشتہارات کے ذریعے سے عوام کو بھی اطلاع دی گئی کہ جو شخص تحقیقاتی عدالت کے دائرہ شروط کے متعلق عدالت کے سامنے شہادت دینے کا خواہاں ہو۔ وہ عدالت کے سکرٹری کو اس شہادت کے متعلق جو وہ دینا چاہتا ہے مختصر بیان ارسال کر دے۔ یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ ایسی شہادت خفیہ رکھی جائے گی۔ سوائے اس حالت کے کہ شہادت پیش کرنے والا شخص خود عدالت میں حاضر ہونے اور اجلاس عام میں زبانی شہادت دینے پر آمادہ ہو۔

جس تحریک سے فسادات پیدا ہوئے۔ اسکے اکثر لیڈر چونکہ جیل خانوں میں محبوس تھے۔ ان میں سے بعض سزا یاب ہو چکے تھے۔ اور بعض پبلک سیفٹی ایکٹ اور سیکیورٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند تھے اس لئے ہم نے حکومت پنجاب سے استدعا کی کہ وہ اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر ان قیدیوں کو جو پنجاب کے باہر کے جیلوں میں بند ہیں۔ لاہور لانے کا بندوبست کرے۔ تاکہ وہ اپنے تحریری بیانات کی تیاری کے لئے اپنے نمائندوں کو ہدایات دے سکیں۔ حکومت پنجاب نے ہماری استدعا پر عمل کیا۔ اور ہمیں اس امر پر مسرت ہے کہ دوسری حکومتوں نے حکومت پنجاب کی استدعا کو قبول کر کے ایسے قیدیوں اور نظر بندوں کو لاہور بھیج دیا۔

حکومت پنجاب اور پنجاب مسلم لیگ کے سوا باقی تمام فریقوں نے جامع بیانات داخل کئے۔ اور ان کے تحریری بیانات میں واقعات و حقایق اور دلیل و برہان کی جو وسیع تفصیلات ہمیں میسر ہوئیں۔ ہم ان کے لئے بے حد شکر گزار ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی نے بھی جو ایک فوجی عدالت سے عمر قید کی سزا پا چکے ہیں۔ جماعت اسلامی کے سابق امیر کی حیثیت سے ایک تحریری بیان داخل کیا۔ اور جماعت نے جو تحریری بیان پیش کیا ہے۔ وہ مولانا کے بیان کے بالکل مطابق ہے۔ مولانا عبدالستار نیازی بھی اسی قسم کے سزا یافتہ قیدی ہیں۔ انہوں نے درخواست دی کہ ان کو بھی کارروائی میں ایک فریق کی حیثیت دی جائے۔ لیکن ہم نے بحث کرنے والے فریقوں کے متعلق جس اصول کو اختیار کیا ہے۔ اس کے ماتحت ہم ان کی درخواست کو منظور نہ کر سکے۔ البتہ ہم نے انکو اس امر کی اجازت دے دی کہ اگر وہ چاہیں۔ تو ایک تحریری بیان پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے صدہا صفحوں کا ایک بیان پیش کیا جسے ہم نے نہایت احتیاط سے پڑھ لیا۔

حکومت پنجاب کا تحریری بیان صرف چند سطر کا تھا جس میں عدالت کو یہ بتایا گیا تھا کہ حکومت کا اس معاملے کے متعلق کوئی نقطہ نگاہ نہیں۔ لیکن وہ عدالت کی امداد کے لئے اس امر کا ذمہ لیتی ہے کہ جس قسم کا

مواد عدالت کو مطلوب ہوگا وہ اسکی خدمت میں پیش کردے گی۔ اس وعدے پر پوری پابندی سے عمل کیا گیا۔ عدالت نے جب بھی حکومت پنجاب سے بعض دستاویزوں۔ بعض معلومات اور بعض عملیات کے لئے استدعا کی حکومت نے نہایت سرعت اور مستعدی سے اس پر عمل کیا۔ اگر حکومت ایسی مستعدی کا اظہار نہ کرتی تو خدا جانے ہماری تحقیقات کسقدر طول کھینچ جاتی۔ شہادت کے خاتمہ پر حکومت پنجاب کے وکیل مسٹر فضل الٰہی نے حکومت کے اس رویّے کا اعادہ کیا۔ کہ وہ اس معاملے میں کوئی رائے یا کوئی نقطۂ نگاہ نہیں رکھتی۔ لیکن جو مواد ریکارڈ پر موجود تھا اسکی بنا پر وکیل مذکور نے تین دن کی بحث کے دوران میں اپنے ذاتی خیالات عدالت میں پیش کر دئے باقی رہی مسلم لیگ۔ تو اس کے خلاف یہ الزامات لگائے گئے کہ ڈائرکٹ ایکشن کی فتنہ انگیز تحریک کے خلاف مسلم لیگ نے کوئی اصولی اور نظریاتی مزاحمت نہیں کی۔ ہم نے ان الزامات کو کافی حد تک صحیح پایا ہے۔ بلکہ ہم پر یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ متعدد اضلاع میں لیگ کے عہدہ داروں نے خود بھی اس شورش میں نمایاں حصہ لیا۔ صوبہ مسلم لیگ کی طرف سے جو تحریری بیان داخل کیا گیا ہے وہ نہایت مایوس کن ہے۔ کیونکہ اس میں صرف وہ قراردادیں نقل کر دی گئی ہیں جو پنجاب مسلم لیگ کی کونسل یا مجلس عاملہ نے اینٹی احمدی شورش کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار کے لئے منظور کی تھیں۔

ایکٹ کی دفعہ ۵ کی ذیلی دفعہ ۲ کے رُو سے اس عدالت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی پولیس افسر کو جو سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کم درجے کا نہ ہو کسی ایسی تفتیش کی ہدایت دے۔ جو عدالت کے نزدیک تحقیقات کے مقاصد کے لئے ضروری ہو۔ ہم نے اس اختیار کو اکثر استعمال کیا ہے۔ اور مسٹر محمد حسین سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کو متعدد ایسے امور کی تفتیش پر مقرر کیا ہے جن کی براہِ راست سماعت اگر عدالت میں کی جاتی تو بہت سا روپیہ بھی صرف ہوتا۔ اور خاصی تاخیر بھی ہو جاتی۔ مسٹر محمد حسین نے حسب معمول مستعدی اور ہمہ گیری سے اپنے فرائض کو انجام دیا۔

دوران فسادات میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم تھے مسٹر چندریگر گورنر پنجاب تھے۔ اور سردار عبدالرب نشتر مرکزی کابینہ کے ایک وزیر تھے۔ ان کے علاوہ چودھری ظفراللہ خاں وزیر خارجہ سردار بہادر خاں وزیر مواصلات۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر اطلاعات و نشریات۔ اور مسٹر مشتاق احمد گورمانی وزیر داخلہ تھے۔ کسی نہ کسی فریق کی استدعا پر عدالت نے ان سب حضرات کو طلب کر کے ان کے بیانات قلمبند کئے۔ البتہ مسٹر دولتانہ نے خود اپنے آپکو اپنے گواہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ ان تمام گواہوں کی شہادت بند کمرے میں قلمبند کی گئی۔ لیکن اسکے بعض حصے اخباروں کو اشاعت کے لئے دے دیئے گئے۔

کون سے مضامین زیر بحث آئے

تحقیقات کی عقائدی حیثیت اور دوسرے متعلقہ مذہبی موضوعات کے متعلق ہم نے ایک طرف ممتاز علما کو اور دوسری طرف مرزا بشیرالدین محمود احمد (قادیانی احمدیوں کے موجودہ امام) کو عدالت میں طلب کیا۔ تحقیقات کے اس حصے میں علم انسانی کی تقریباً ہر شاخ اور ہر شعبے پر نظر ڈالی گئی۔ مذہب۔ فلسفہ۔ سائنس۔ اخلاقیات

صفات الٰہی تشبیہ و حلول۔ عقل۔ الہام۔ تفسیر۔ علم کائنات۔ تخلیق۔ زمان و مکان۔ انسان کی ابتدا اور اسکی منزل مقصود۔ زندگی کے مقصد۔ مملکت اور دینی اداروں کے وظائف۔ حاکمیت۔ جمہوریت۔ دینی حکومت۔ یہ تمام مضامین جیسا کہ تفصیل سے ظاہر ہوگا کسی اعتبار سے بھی تحقیقات سے بے تعلق نہ تھے۔ تحقیقات کے اندرونی امور تنقیح طلب جو اکثر اپنی پوری وضاحت اور اپنے تمام متعلقات کے ساتھ سامنے آئے۔ وہ اس قدر گہرے اور بنیادی ہیں کہ ان کے جوابات پاکستان کی نئی مملکت کو بنانے یا بگاڑنے کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اور اسکی تاریخ کی آئندہ رفتار کو کاملاً تبدیل کر سکتے ہیں۔

ہم نہ صرف ان تمام موجودہ اور سابقہ عزت مآب وزیروں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنے خیالات ہمارے سامنے پیش کرنے کیلئے طویل سفر کی زحمت برداشت کی۔ بلکہ وہ حکام اور علما بھی ہمارے دلی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے اس طویل تحقیقات کے دوران میں اول سے آخر تک ہماری امداد کی۔ مجلس عمل کی طرف سے مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش۔ احرار کی طرف سے مولانا مظہر علی اظہر اور جماعت اسلامی کیطرف سے مسٹر سعید ملک نے یقیناً اس کام کی انجام دہی میں محنت شاقہ برداشت کی ہوگی۔ جو انکی جماعتوں نے انکے سپرد کیا تھا۔ ان فاضل حضرات کے ساتھ کام کرنا ہمارے لئے ایک بالکل نیا اور نہایت خوشگوار تجربہ تھا۔ جو ہمارے حافظہ میں مدت دراز تک محفوظ رہیگا۔ ہم پیشۂ وکالت کے بعض حضرات کے بھی ممنون ہیں۔ مسٹر یعقوب علیخاں۔ مسٹر نذیر احمد خاں۔ مسٹر اسد اللہ خاں۔ مسٹر عبد الرحمٰن خادم اور مسٹر فضل الٰہی اپنے اپنے موکلوں کے مقدمات پیش کرنے میں ہمارے لئے بیش بہا امداد و اعانت کا باعث ہوئے۔

ان اشارات کے بعد ہم اپنے قانونی کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

حصوں میں تقسیم

بحث کے دلائل کی سماعت کے بعد ہم دونوں اس امر پر متفق ہو گئے کہ ہمیں شروط تحقیقات کے جوابات کس طریق سے دینے چاہئیں۔ اسکے بعد ہم نے کام تقسیم کر لیا۔ یعنی ہم میں سے ایک تو عمومی ذمہ داری کے مسئلے پر غور و بحث کرے۔ اور دوسرا خاصکر نظم حکومت کی کارروائیوں پر نظر ڈالے۔ پہلے تین حصوں میں ہم نے متعلقہ واقعات کے متعلق ایک واقعاتی بیان قلمبند کر دیا ہے۔ مثلاً:-

حصہ اوّل: تقسیم ملک سے لیکر آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقدہ لاہور مورخہ ۱۳۔ جولائی ۱۹۵۲ء تک

حصہ دوم: کنونشن سے ۲۱۔ جنوری ۱۹۵۳ء تک جب وزیر اعظم کو الٹی میٹم دیا گیا۔

حصہ سوم: الٹی میٹم کی تاریخ سے لیکر فسادات کے خاتمے تک۔

شروط تحقیقات کے جوابات آخری تین حصوں میں پائے جائیں گے۔ مثلاً:-

حصہ چہارم: وہ کوائف جو مارشل لا کا باعث ہوئے۔

حصہ پنجم: فسادات کی ذمہ داری

حصہ ششم: سول حکام کی انتظامی کارروائی کافی تھی یا نہیں۔

حصہ ششم کے مقاصد کیلئے مدت زیر مشاہدہ کو چار ذیلی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ذیلی حصہ جو خاص مسئلہ پیش کرتا ہے۔ اس کے اعتبار سے اسکو علیحدہ اور ممتاز رکھا گیا ہے۔

حصّہ اوّل

تقسیم ملک سے لاہور کنونشن تک

نزاع

جس نزاع کا نتیجہ فساد کی صورت میں رونما ہوا۔ اسکی ابتدا اس مناقشہ سے ہوئی تھی جسکو سرکاری تحریروں میں "احرار احمدی نزاع" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے یہ مناقشہ تقسیم سے بہت پہلے موجود تھا۔ لیکن ہمارے سامنے تمام غیر احمدی فریقوں نے اس تعبیر کے خلاف اظہار ناراضی کیا۔ اس بنا پر کہ احمدیوں سے اختلافات صرف احرار تک محدود نہیں۔ بلکہ مسلمانوں کے تمام فرقے ان اختلافات پر متحد ہیں۔ اسی طرح غیر احمدیوں نے اس امر کے خلاف بھی برہمی کا اظہار کیا کہ لفظ "احمدی" مخصوص طور پر مرزا غلام احمد کے پیرووں کے لئے استعمال کیا جائے۔ اور تمام مسلمان احمدی ہیں۔ کیونکہ وہ محمد رسول اللہ صلعم کے پیرو ہیں (جن کا دوسرا نام احمدؐ ہے) غیر احمدیوں کا خیال ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیرووں نے یہ لقب زبردستی مسلمانوں سے چھین رکھا ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے سواد اعظم کو جو مرزا غلام احمد کو نہیں مانتا متمیز و ممتاز کرنیکے لئے لفظ "مسلمان" استعمال کریں اور احمدیوں کے قادیانی فرقے کیلئے جو مرزا غلام احمد کو نبی مانتا ہے۔ احمدی۔ قادیانی یا مرزائی کی اصطلاح اختیار کریں۔

احمدی

قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو عقایدی اور معاشرتی اختلافات ہیں۔ ان کے متعلق ہم حصہ پنجم میں تفصیل سے گفتگو کرینگے۔ یہاں ہمیں صرف تحریک احمدیت کی مختصر کیفیت بیان کرنا ہے۔ اس تحریک کی بنیاد مرزا غلام احمد نے رکھی۔ جو سکھ دربار کے ایک جرنیل مرزا غلام مرتضیٰ کے پوتے تھے۔ مرزا غلام احمد ۱۳ فروری ۱۸۳۵ء کو بمقام قادیان پیدا ہوئے۔ یہ ضلع گورداسپور کا ایک گاؤں ہے۔ جس میں واحد مالک کی حیثیت اسی خاندان کو حاصل تھی۔ مرزا غلام احمد نے فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم گھر پر پائی۔ کسی قسم کی مغربی تعلیم کے حصول کا سراغ نہیں ملتا۔ ۱۸۶۴ء میں انکو عدالت ضلع سیالکوٹ میں ایک نوکری مل گئی۔ جہاں وہ چار سال تک کام کرتے رہے۔ جب انکے والد کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے اپنے آپکو از سرتاپا دینیات کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا۔ اور ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۴ء کے درمیان اپنی مشہور کتاب "براہین احمدیہ" چار جلدوں میں لکھی۔ کچھ مدت بعد چند اور کتابیں بھی تصنیف کیں۔ اس زمانے میں شدید مذہبی مناقشے اور مناظرے جاری تھے۔ اسلام پر نہ صرف عیسائی مشنری ہی پے در پے حملے کر رہے تھے۔ بلکہ ہندوؤں کی مقبول عام تحریک آریہ سماج کے پرچارک بھی اسی مشغلے میں معروف تھے۔

مارچ ۱۸۸۲ء میں مرزا غلام احمد نے دعوے کیا کہ انہیں الہام ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص مقصد تفویض کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا وہ "مامور من اللہ" ہیں۔ ۱۸۸۹ء میں انہوں نے پھر ایک

الہام کی بنا پر اپنے موئیدین سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ سن ۱۸۹۰ء کے اواخر میں مرزا صاحب کو پھر الہام ہوا کہ یسوع ناصری (عیسیٰ ابن مریم) نہ صلیب پر فوت ہوئے۔ نہ آسمان کی طرف اٹھائے گئے۔ بلکہ جب وہ صلیب پر زخمی ہو گئے تو ان کے شاگردوں نے انہیں اسی مجروح حالت میں صلیب پر سے اتار لیا۔ اور ان کے زخموں کا علاج کیا۔ اسکے بعد وہ کشمیر چلے گئے اور وہیں طبعی موت مر گئے۔ یہ عقیدہ غلط ہے کہ وہ روزِ قیامت کے قریب اپنے اصلی جسم عنصری کے ساتھ دوبارہ ظاہر ہوں گے۔ ان کے دوبارہ ظہور کے وعدے کا مطلب صرف یہ ہے کہ عیسیٰ ابن مریم کی صفات و اخلاق رکھنے والا ایک اور شخص اُمت محمدیہ میں پیدا ہوگا۔ یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے اور مرزا غلام احمد ہی وہ مثیل عیسیٰ اور مسیح موعود واقع ہوئے ہیں۔ اس عقیدے کی اشاعت پر مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ کیونکہ یہ اُس عام مسلّمہ عقیدے کے منافی تھا کہ عیسیٰ ابن مریم جسم عنصری کے ساتھ آسمان سے اُتریں گے۔ چنانچہ علمائے دین نے اسکی شدید مخالفت شروع کر دی۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے "مہدی معہود" ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ اور اعلان کیا۔ کہ میں ایسا مہدی نہیں جو جنگ و خونریزی میں مصروف ہو جاؤں بلکہ میں مہدی معقول ہوں۔ اور دلائل و براہین کی قوت سے اپنے مخالفین کو مغلوب کروں گا۔ اس نئے دعوے سے مرزا صاحب کی مخالفت زیادہ بھڑک اٹھی۔ اور علمائے دین ان کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرنے لگے۔ سن ۱۹۰۰ء میں مرزا صاحب نے ایک اَور عقیدے کا اظہار کیا کہ آج کے بعد جہاد بالسیف کا قصہ ختم ہے۔ اب جہاد اسی پر موقوف ہے کہ مخالف کو دلیل و برہان سے قائل کرنے کی کوشش کی جائے۔ سن ۱۹۰۱ء میں مرزا صاحب نے "ظلّی نبی" ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور "ایک غلطی کا ازالہ" کے عنوان سے ایک اشتہار شائع کیا جس میں بتایا کہ ختم نبوت کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلعم کے انتقال کے بعد کوئی ایسا نبی پیدا نہ ہوگا جو کسی نئی شریعت کا حامل ہو۔ لیکن کسی غیر تشریعی نبی کا ظہور عقیدہ ختم نبوت کے خلاف نہیں ہے۔ نومبر سن ۱۹۰۴ء میں مرزا صاحب نے سیالکوٹ کے ایک جلسہ عام میں "مثیل کرشن" ہونے کا دعوےٰ بھی کیا۔

جماعت احمدیہ سن ۱۹۰۱ء میں قائم کی گئی۔ اور مرزا صاحب کی استدعا پر اسی سال مردم شماری کے کاغذات میں اس جماعت کو ایک علیحدہ مسلم فرقہ ظاہر کیا گیا۔ جماعت کی موجودہ تعداد پاکستان میں دو لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے اور احمدی دوسرے مسلم ممالک میں اور بھارت۔ یورپ اور امریکہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اس نئی تحریک کو مرزا صاحب کی زندگی ہی میں خاصی تائید حاصل ہو گئی تھی۔ اور متعدد ممتاز اور ذی اثر لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ جب سن ۱۹۰۸ء میں مرزا صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تو مولوی نور الدین جماعت احمدیہ کے خلیفہ اوّل مقرر ہوئے۔ سن ۱۹۱۴ء میں خلیفہ نور الدین کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیر الدین محمود احمد (موجودہ امام جماعت) خلیفہ ثانی قرار پائے۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد کی مسند نشینی پر جماعت میں پھوٹ پڑ گئی۔ جماعت کا ایک حصہ خواجہ کمال الدین اور مولوی محمد علی کی سرکردگی میں الگ ہو گیا۔ اور ایک علیحدہ پارٹی "لاہوری پارٹی" کے نام سے وجود میں آ گئی۔ دونوں پارٹیوں میں فرق یہ ہے کہ قادیانی پارٹی کے عقیدے میں مرزا غلام احمد نبی ہیں لیکن لاہوری پارٹی مرزا صاحب کو یہ درجہ دینے پر آمادہ نہیں۔ اس کے نزدیک مرزا صاحب زیادہ سے زیادہ ایک مجدّد یا محدّث ہیں۔ ان الگ ہونے والوں نے لاہور میں اپنی ایک تنظیم قائم کر لی۔

جو احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام کہلاتی ہے۔ دونوں پارٹیاں غیر ممالک میں وسیع پیمانے پر تبلیغ و اشاعت کا کام کرنے میں معروف ہیں۔

احرار

قوم پرست مسلمانوں کی ایک ٹولی نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کرکے ۴ ۔مئی ۱۹۳۱ء کو لاہور میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ اور مجلسِ احرارِ اسلام کی بنیاد رکھ دی۔ احرار سب سے پہلے ۱۹۳۱ء کی تحریکِ کشمیر میں نمایاں ہوئے۔ اسی سال ۳۰۔ اکتوبر کو مظہر علی اظہر کی سرکردگی میں ایک سو رضاکاروں کا ایک جتھا سیالکوٹ سے جموں کے علاقے میں داخل ہونے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ پنجاب میں تحریکِ کشمیر اس لئے پیدا ہوئی کہ ڈوگرا دربار نے کشمیری مسلمانوں کو انتہائی جبر و ظلم کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ اور مسلمانانِ پنجاب کو ان سے نہایت گہری ہمدردی تھی۔ کشمیری مسلمانوں کی شکایات یہ تھیں کہ ریاست نے متعدد مسجدوں۔ قبرستانوں اور دوسرے مقدس مقامات پر قبضہ کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کو سرکاری دفاتر میں ملازمت نہیں دی جاتی۔ ان کی مذہبی رسوم کی بجا آوری پر قیود عائد کی جاتی ہیں۔ اور ریاست میں کوئی باقاعدہ اور آئینی قانون ساز مجلس موجود نہیں۔ جس میں مسلمان ریاست کے اندر اپنے تناسبِ اعداد کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکیں۔ جب اخباروں میں اِن شکایات کے تدارک کے لئے مہم جاری کی گئی۔ تو نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳۔ جولائی ۱۹۳۱ء کو سری نگر میں بلوہ ہوگیا۔ اس بلوے سے جو شورش عام پیدا ہوئی۔ اس کا چارج لینے کی کوشش دو جماعتوں نے کی۔ جن میں ایک تو مجلسِ احرار تھی۔ اور دوسری ایک اور انجمن موسومہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی تھی۔ جو ۲۶ جولائی کو وجود میں آئی۔ اور جس میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نواب سر ذوالفقار علی خاں۔ خواجہ حسن نظامی۔ نواب ابراہیم علیخاں۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد (موجودہ امام جماعت احمدیہ) شامل ہوئے۔ اور ایک احمدی عبد الرحیم درد اس کے سیکرٹری قرار پائے۔ چونکہ احرار اور احمدی شورش کشمیر کے دوران میں مخالف کیمپوں میں ہونیکی وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف ہو رہے تھے۔ لہٰذا اسکے بعد بھی ان دونوں کے درمیان تصادم جاری رہا۔ احرار نے ۱۴۔ اگست کو یومِ کشمیر منانے کا انتظام کیا۔ اور اس سے دوسرے دن باقاعدہ اعلان کر دیا کہ انہوں نے کشمیری مسلمان بھائیوں کی حمایت میں تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ۳۰۔ اکتوبر کو مظہر علی اظہر کی سرکردگی میں ایکسو رضاکاروں کا ایک دستہ علاقہ جموں میں داخل ہوگیا۔ اس ڈرامائی اقدام سے احرار کی حیثیت بہت نمایاں ہو گئی۔

اگرچہ احراری کانگرس سے الگ ہو گئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تقسیم ملک تک برابر کانگرس سے سازباز کرتے ہی رہے۔ مجلسِ احرار کی مجلسِ عاملہ کا ایک اجلاس ۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ جس میں پاکستان کی تجویز کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا۔ اور بعد میں بعض احرار لیڈروں نے اپنی تقریروں میں پاکستان کو "پلیدستان" بھی کہا۔ ۲۹۔ نومبر ۱۹۴۲ء کو مولانا داؤد غزنوی نے اخباروں میں ایک بیان شائع کرایا۔ جس میں احرار کے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ وہ اپنے آپکو کانگرس میں جذب کر دیں گے۔ پنجاب پراونشل احرار کانفرنس منعقدہ گوجرانوالہ (از ۱۷۔ تا ۱۹۔ مارچ ۱۹۴۳ء) میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ اور پھر اسی سال سہارنپور میں بھی ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ ان دونوں موقعوں پہ احرار نے مجوزہ تقسیم کی مخالفت کی۔ اور

اس کو وطن کی چیر پھاڑ قرار دیا۔ احرار کے ہر لیڈر نے اپنی ہر اہم تقریر میں مسلم لیگ پر تنقید کی۔ اس کے لیڈروں پر نکتہ چینی کی۔ یہاں تک کہ قائداعظم کو بھی نہ چھوڑا۔ جن سے وہ سخت متنفر تھے۔ حالانکہ ان کی شخصیت اُن دنوں مسلمان قوم کے واحد اور مسلمہ رہنما کی حیثیت سے قلوب عوام میں گھر کر چکی تھی۔ چونکہ قائداعظم روشن خیال آدمی تھے اور مذہبی امور میں کسی نمود و نمائش کے قائل نہ تھے۔ اس لئے احرار نے انکی اس خصوصیت سے ناواجب فائدہ اٹھا کر انہیں کافر کہنا شروع کر دیا۔ یہ شعر مولانا مظہر علی اظہر سے منسوب ہے۔ جو تنظیم احرار میں ایک ممتاز شخصیت ہیں ؎

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا

یہ قائداعظم ہے کہ ہے کافر اعظم

مولانا مظہر علی اظہر نے ہمارے سامنے نہایت خیرہ چشمی سے یہ اظہار کیا کہ (قائداعظم کے متعلق) وہ اب تک اسی خیال پر قائم ہیں۔ احرار نے اپنی تقریروں میں صرف یہی نہیں کہا کہ قائداعظم نے ایک پارسی خاتون سے شادی کی تھی۔ بلکہ یہ اعتراض بھی کیا کہ قائداعظم اب تک حج کے لئے مکہ معظمہ کیوں نہیں گئے۔ ۱۹۲۵ء میں انہوں نے شیعہ سُنی تنازعہ کی آگ بھڑکانے کی کوشش بھی کی۔ اور مولانا مظہر علی اظہر اور ان کے بیٹے قیصر مصطفےٰ تحریک مدح صحابہ کے احیا کے لئے ۱۶۔ نومبر کو لاہور سے لکھنؤ روانہ ہوئے۔ ۱۹۲۶ء کے انتخابات میں تین احرار امیدوار مسلم لیگی امیدواروں کے مقابلے میں کھڑے ہوئے۔ لیکن ان سب کو شکست کھانی پڑی۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے پنجاب میں جو "ڈائریکٹ ایکشن" شروع کیا اس سے احرار کاملاً الگ رہے۔

احرار کی بڑی بڑی سرگرمیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں احمدیوں کی مخالفت کرتے رہتے تھے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ احرار کی پیدائش ہی احمدیوں کی نفرت سے ہوئی۔ ابھی مجلس احرار کی تاسیس پر دو ہی سال گزرے تھے۔ کہ انہوں نے ایک قرارداد منظور کی۔ جس کا منشا یہ تھا کہ کوئی قادیانی کسی مجلس عامہ کا ممبر منتخب نہ کیا جائے۔ قادیان تقسیم سے پہلے تقریباً خالص احمدی قصبہ تھا۔ ۱۹۳۴ء میں احرار نے قادیان میں ایک کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ لیکن جب اس جلسے کو ممنوع قرار دیا گیا۔ تو انہوں نے اسی سال ۲۱۔ اکتوبر کو قادیان سے صرف ایک میل کے فاصلے پر ایک گاؤں اجادہ کے دیانند اینگلو ویدک ہائی سکول کی گراؤنڈ میں کانفرنس منعقد کر لی جس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں تک پہنچی۔ اس کانفرنس میں احرار کے مقبول عام خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے احمدیوں کے خلاف پانچ گھنٹے کی ایک نفرت آمیز تقریر کی "جس میں انہوں نے ایسی باتیں کہیں جن سے صرف یہ مقصود تھا کہ سننے والوں کے دلوں میں احمدیوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اُٹھے۔" انہوں نے اپنی تقریر میں امن و امان کے دعاوی کے ساتھ ہی ساتھ نہایت پست قسم کی دشنام طرازی اور مسخرگی سے کام لیا۔ اس تقریر کی بنا پر بخاری کے خلاف مقدمہ چلایا گیا جس کی سماعت کے دوران میں اتنی سنسنی پیدا ہوئی۔ اور احمدیوں کے خلاف جذبات اتنے برانگیختہ ہوئے کہ خود تقریر سے بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ اس مقدمے میں بخاری کو سزا دی گئی۔ وہ دن اور یہ دن۔ ہر قابل ذکر احراری مقرر احمدیوں۔ ان کے رہنماؤں اور ان کے عقیدوں کے خلاف ہر قسم کی باتیں کہتا رہا ہے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم اور پاکستان کا قیام احرار کے لئے بہت بڑی مایوسی کا پیغام تھا۔ کیونکہ اس سے ہر قسم کا اقتدار

کانگرس یا مسلم لیگ کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور احرار کے لئے ہندوستان یا پاکستان میں سیاسی سرگرمی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ پاکستان کی نئی مسلم مملکت کے قیام سے انہیں شدید صدمہ ہوا۔ ان کے نظام عقاید کی عمارت متزلزل ہو گئی۔ اور وہ ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے بالکل ختم ہو گئے۔ کچھ مدت تک وہ اسی ناکامی و مایوسی کی حالت میں رہے۔ انہیں اپنے مستقبل کے متعلق کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ان کے دو لیڈروں یعنی مولوی عبدالغنی ڈار اور مولانا حبیب الرحمن نے بھارت میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک اور اہم حیثیت کے لیڈر شیخ حسام الدین کچھ مدت تک تو گو مگو کی حالت میں رہے۔ آخر انہوں نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اور لاہور میں "ویرا ہوٹل" کا چارج لے لیا۔ جو ایک کانگرسی مسٹر پربودھ چندر نے ان کے سپرد کر دیا تھا۔ ماسٹر تاج الدین لودھیانوی اور مولوی محمد علی جالندھری بھی پاکستان چلے آئے۔ ماسٹر صاحب نے سیالکوٹ میں اور مولوی صاحب نے ملتان میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری بھی جو گجرات کے رہنے والے ہیں ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں منتقل ہو گئے۔ مولانا مظہر علی اظہر سیاسیات سے دست بردار ہو گئے۔ اور صاحبزادہ فیض الحسن نے اپنے گاؤں آلومہار ضلع سیالکوٹ میں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں احرار نے اپنی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس خان گڑھ میں منعقد کیا۔ جہاں سید عطا اللہ شاہ بخاری مقیم ہو گئے تھے اجلاس کا مقصد یہ تھا۔ کہ احرار کے آئندہ پروگرام پر غور و خوض کیا جائے لیکن وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچے۔ یہی حشر اس اجلاس کا ہوا جو دسمبر ۱۹۴۷ء میں بمقام لاہور منعقد کیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں تین ممکن راہ ہائے عمل پر غور کیا گیا۔ اول۔ جماعت کو ختم کر دیا جائے۔ دوم۔ سیاسی سرگرمیوں کو ترک کر کے صرف مذہبی مشاغل اختیار کئے جائیں۔ سوم۔ جماعت کو بدستور زندہ رکھا جائے۔ لیکن غور و بحث کے بعد فیصلہ صرف یہ ہوا کہ ایک "آل پاکستان مجلس احرار" کی بنیاد رکھی جائے۔ اس کے بعد مئی ۱۹۴۸ء میں بمقام لائل پور جو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں احمدیوں کے متعلق ہلکے ہلکے اشارے کئے گئے۔ اور پاکستان کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا گیا۔ جب اسکے بعد جون ۱۹۴۸ء میں ایک جلسہ بمقام لاہور منعقد ہوا۔ تو پاکستان کی حمایت میں زیادہ وضاحت سے اظہار جذبات کیا گیا۔ اور اسکے ساتھ یہ اشارہ بھی کیا گیا کہ احرار مسلم لیگ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس میں چودھری ظفر اللہ خاں اور میاں افتخار الدین جیسے لوگ بھی ہیں۔ جن کے عقائد اسلام کے خلاف ہیں تقسیم کے بعد احرار کا سب سے بڑا اور اہم اجتماع وہ تھا۔ جو "احرار ڈیفنس کانفرنس" کے موقع پر ۱۲۔ جنوری سے ۱۴۔ جنوری ۱۹۴۹ء تک بمقام لاہور منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں احرار نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ مجلس احرار اب ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے ختم کر دی گئی ہے۔ اور آئندہ صرف ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے گی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ سیاسی امور میں وہ مسلم لیگ کی پیروی کرینگے۔ اس کے بعد انہوں نے "تبلیغ کانفرنس" کے نام سے اپنی کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کر دیں۔ چنانچہ اوکاڑہ۔ لائل پور۔ گھیانہ۔ چنیوٹ۔ سیالکوٹ۔ گوجرانوالہ۔ گجرات۔ پنڈ دادن خاں۔ جہلم۔ شجاع آباد۔ بوڑے والہ۔ اور ملتان میں کانفرنسوں کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا۔ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے راولپنڈی کی ایک کانفرنس میں کیا گیا۔ اور اس کے بعد یکم مئی ۱۹۴۹ء کو پنڈ دادن خاں کے ایک جلسہ عام میں اسکا اعادہ کیا گیا۔ بعد ازاں احرار اپنی تمام تقریروں میں جماعت

احمدیہ کے بانی اور چودھری ظفر اللہ خاں پر باقاعدہ نکتہ چینی کرنے لگے۔ اور محسوس کرنے لگے کہ انہیں مسلم لیگ کی امداد طلب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور وہ آیندہ ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت سے اپنے وظائف بجا لا سکتے ہیں۔ مسلم لیگ نے بھی احرار کے متعلق دوستانہ رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ جب ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو کراچی میں پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ تو جو انیس جماعتیں مسلم لیگیوں کے لئے ممنوع الداخلہ قرار دی جا چکی تھیں۔ ان میں سے احرار کو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ (یعنی مسلم لیگی مجلس احرار کے ممبر بن سکتے تھے)

دو احراری لیڈروں کی گرفتاری

احرار کو اس حقیقت کے احساس میں کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہئے تھی کہ پاکستان قائم ہو جانے کے بعد ان کی سابقہ سیاست متروک ہو چکی ہے۔ اور نئی مملکت میں ان کے لئے اپنی پرانی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن احراری اس مٹی کے بنے ہوئے نہ تھے۔ وہ پرانے یاران دیدہ شورش پسند تھے۔ جن کو اپنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں اضافہ کرنے کے لئے بڑی بڑی مہمیں چلانے اور ہنگامے برپا کرنے کا تجربہ حاصل تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایسے طریقوں پر غور و خوض شروع کر دیا۔ جن سے کام لے کر وہ نئے ماحول میں اپنی سرگرمیوں کے لئے کوئی مخرج پیدا کر سکیں۔ کسی موجودہ شورش سے فائدہ اٹھانا کسی نئی شورش کی تخلیق کے مقابلے میں دوسرے درجے کی چال ہے۔ آگے چل کر معلوم ہو جائے گا کہ احراریوں نے اپنی ہستی کا ثبوت دینے اور جماعت کی حیثیت سے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کیلئے اسی چال سے کام لیا۔

ابھی قیام پاکستان پر ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ مخدوم شاہ جنوری سکرٹری مجلس احرار پاکستان ۱۵ جولائی ۱۹۴۸ء کو زیر دفعہ ۳۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کر لئے گئے۔ ان کی گرفتاری کے معین وجوہ تو شہادت میں واضح نہیں کئے گئے۔ لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ ان پر کسی خلاف عدالت سرگرمی کا شبہ تھا۔ جو ان کی گرفتاری کا باعث ہوا۔ ان کے بعد ایک اور احراری لیڈر شیخ حسام الدین ۲۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اسی ایکٹ کے ماتحت گرفتار کئے گئے۔ آخر جب ان دونوں نے لمبے لمبے بیانات دے دیئے تو انہیں رہا کر دیا گیا۔

میجر محمود کا قتل

مرزا بشیر الدین محمود احمد ۱۹۴۸ء کے موسم گرما میں بمقام کوئٹہ مقیم تھے۔ ان کی موجودگی میں ایک نوجوان فوجی افسر میجر محمود جو احمدی تھا نہایت وحشیانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔ ریلوے کے مسلم ملازمین کی ایسوسی ایشن نے ایک جلسۂ عام کا اعلان کیا تھا جو ۱۱۔ اگست ۱۹۴۸ء کو منعقد ہوا۔ اس جلسے میں بعض مولویوں نے تقریریں کیں۔ اور ہر شخص نے اپنی تقریر کے لئے ایک ہی موضوع یعنی "ختم نبوت" اختیار کیا۔ ان تقریروں کے دوران میں قادیانیوں کے کفر اور اس کے نتائج کی طرف بار بار اشارے کئے گئے۔ ابھی یہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا کہ میجر محمود ایک مریض کو دیکھنے کے بعد واپس آتے ہوئے جلسہ گاہ کے پاس سے گزرے۔ اتفاق سے ان کی موٹر کار جلسہ گاہ کے قریب بیٹھ گئی اور اس کو دوبارہ چلانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ عین اس موقع پر ایک ہجوم

موٹر کار کی طرف بڑھا۔ اور اس نے میجر محمود کو گھسیٹ کر نیچے اتار لیا۔ میجر محمود نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ان کا تعاقب کیا گیا۔ اور آخر پتھر اور چھرے مار مار کر ان کو ہلاک کر دیا گیا۔ ان کی پوری انتڑیاں پیٹ سے باہر نکل آئی تھیں۔ انکی نعش کے پوسٹ مارٹم معائنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جسم پر کند اور تیز دھار والے ہتھیاروں سے لگائے ہوئے چھبیس زخم تھے۔ اور موت ایک تو صدمے سے اور دوسرے داخلی جریان خون سے واقع ہوئی۔ جو بائیں پھیپھڑے، بائیں گردے اور جگر کے دائیں کنارے کے زخموں سے جاری ہوا تھا۔ کوئی شخص بھی "اسلامی شجاعت" کے اس کارنامے کی نیکنامی لینے پر آمادہ نہ ہوا۔ اور بے شمار عینی شاہدوں میں ایک بھی ایسا نہ نکلا۔ جو ان "غازیوں" کی نشان دہی کر سکتا یا کرنے کا خواہشمند ہوتا جن سے یہ "بہادرانہ" فعل صادر ہوا تھا۔ لہٰذا اصل مجرم شناخت نہ کئے جا سکے۔ اور مقدمہ بے سراغ ہی داخل دفتر کر دیا گیا۔ پولیس کے کاغذات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیظ سے بھرے ہوئے لوگ چھوٹی ڈاڑھیوں والے اشخاص کی تلاش میں دیوانے ہو رہے تھے تاکہ انہیں ہلاک کر دیں۔ (واضح رہے کہ احمدی چھوٹی ڈاڑھیاں رکھتے ہیں)

جب حکومت پاکستان کے انٹیلی جنس بیورو کو اس ہولناک قتل کی اطلاع ملی۔ تو اس نے اپنی چٹھی نمبری P(C)-8/7/B/15 مورخہ ۲۶- اکتوبر ۱۹۴۸ء بنام مسٹر ذوالقرنین خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس (A) سی آئی ڈی پنجاب لاہور میں حکام صوبہ کی توجہ مجلس احرار کی خفیہ سرگرمیوں کی طرف مبذول کرائی جو بیورو کے نزدیک پاکستان کے مفاد کے لئے مضرت رساں تھیں۔ بیورو نے لکھا کہ مجلس احرار کے بڑے بڑے لیڈر اپنی تحریروں اور تقریروں میں مملکت کی وفاداری کے جو عہد و پیمان باندھ چکے ہیں۔ وہ سب محض لیپ پوت اور دھوکا ہے۔ آخر میں مرکزی حکومت کی اطلاع کے لئے حکومت صوبہ کی رائے طلب کی گئی تھی کہ آیا احرار کی ان سرگرمیوں کے پیش نظر بحالت موجودہ انکے خلاف کسی سخت کارروائی کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اسکے جواب میں ملک حبیب اللہ نے اپنی چٹھی نمبری BDSB-۲۲۴۵۱ مورخہ ۲۰- نومبر ۱۹۴۸ء میں احرار کے متعلق پنجاب سی آئی ڈی کا رویہ نہایت تفصیل سے بیان کیا۔ اس چٹھی میں اس تقریر کا اقتباس دیا گیا ہے۔ جو عبدالرحمٰن میانوی نے چونڈہ ضلع سیالکوٹ میں ۷- مئی ۱۹۴۸ء کو کی تھی۔ اور جس میں بتایا تھا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی ذمہ داری قائد اعظم مرحوم پر ہے۔ پھر صاحبزادہ فیض الحسن کی تقریر کا ذکر ہے، جو انہوں نے موضع بھلر ضلع شیخوپورہ میں کی۔ اور جس میں بیگم لیاقت علی خاں اور دوسری تعلیم یافتہ خواتین پر جو پردے کی پابند نہیں ہیں بازاری حملے کئے گئے تھے۔ اس چٹھی میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ مخدوم شاہ بنوری اور شیخ حسام الدین کی گرفتاری کے بعد سے احراری لیڈروں کے دماغ درست ہو رہے ہیں۔ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ماسٹر تاج الدین پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداری کے اعلان کا اعادہ کر کے حکومت کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ احرار کی شدید نگرانی کی جا رہی ہے۔ اور جب کبھی ان کی سرگرمیوں میں ایسے آثار نظر آئے کہ وہ مفاد مملکت کے منافی ہیں۔ ان کے خلاف فوری اقدام کیا جائے گا اور انکی جمعیت توڑ دی جائے گی۔ آخر میں حکومت پنجاب کا یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ موجودہ مرحلے پر احرار کی تنظیم کو ممنوع اور خلاف قانون قرار دینے کی سخت کارروائی

مناسب نہیں ہے۔

احرار لیڈروں کی تقریریں

صاحبزادہ فیض الحسن کی جس تقریر کا ذکر ملک حبیب اللہ کی چھٹی میں کیا گیا ہے اسکی رو داد سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبزادہ نے یہ تقریر ۲۷۔ اگست ۱۹۴۹ء کو موضع بھلر میں سید امام علی کے عرس کے موقع پر کی تھی۔ جس میں بتایا تھا کہ بیگم لیاقت علی خاں اور دوسری عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں سب بازاری عورتیں ہیں۔ اور مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے جو ایک لاکھ مسلمان عورتوں کو اغوا کر لیا تو اسکی وجہ یہ تھی کہ قائد اعظم پاکستان کے گورنر جنرل بننے کے لئے بے حد مضطرب تھے۔

۸۔ اگست ۱۹۵۰ء کو حکومت پاکستان کے انٹیلی جنس بیورو کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے اپنی چھٹی نمبری ۲۵/۵۰۰/B/9 بنام سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) سی۔ آئی۔ ڈی پنجاب کے ساتھ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے ایک خطبہ کی نقل بھیجی۔ جس میں انہوں نے اپنے پیروؤں کو آگاہ کیا تھا کہ وہ آجکل ایک نہایت خوفناک خطرے سے دوچار ہیں۔ اس خطبے میں امام جماعت احمدیہ نے یہ کہا تھا کہ صورت حالات کی پوری پوری اطلاع حکومت تک نہیں پہنچائی جا رہی ہے۔ جماعت کو نیست و نابود کر دینے کا کھلم کھلا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ حکومت اس پروپیگنڈا کی روک تھام کے لئے کوئی تدبیر اختیار نہیں کر رہی ہے۔ ہمارے جان و مال سخت خطرے میں ہیں۔ افراد جماعت کو چاہیئے کہ اگر ضرورت پڑے تو اپنے دفاع کے لئے نہایت چست و مستعد رہیں۔ اس چھٹی کے جواب میں ملک حبیب اللہ نے اپنی خفیہ چھٹی نمبری ۹۹۳۱-DSB مورخہ ۳۱۔ اگست ۱۹۵۰ء کے ذریعے سے بیورو کو اطلاع دی کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے خطبے میں غالباً احرار کی ان تقریروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو مجلس احرار کو مسلم لیگ میں مدغم کر دینے کے بعد سے برابر جاری ہیں اور جن میں احمدیوں کے خلاف دشنام طرازی کی مسلسل مہم چلائی جا رہی ہے۔ اس چھٹی میں یہ بھی لکھا گیا کہ احرار کی ان سرگرمیوں کی اطلاع بارہا حکومت کو دی جا چکی ہے۔ لیکن قانون و انتظام کے مشیر نے فوری کارروائی کرنے سے انکار کر دیا ہے کہ مبادا احرار اس گیرو دار کی وجہ سے سستی شہادت حاصل کر لیں احراری لیڈر ماسٹر تاج الدین کو تنبیہ کی جا چکی ہے۔ اور اس تنبیہ کا کوئی اثر اس لیڈر کی سرگرمیوں پر نہیں پڑا اب گورنر نے ایک تازہ تنبیہ کی ہے جسکے نتائج کا انتظار ہے۔

احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے یکم مئی ۱۹۴۹ء کو پنڈ دادن خاں کے ایک احراری جلسے میں کیا گیا۔ اس کے بعد سے احرار کے تمام جلسہ ہائے عام میں صرف احمدی ہی ہر تقریر کا موضوع قرار پائے۔ اور نہ صرف احمدی جماعت کے لیڈر بلکہ چودھری ظفراللہ خاں وزیر خارجہ بھی ان کی دشنام و بدگوئی کا سب سے بڑا نشانہ بن گئے۔ ۲۶۔ ۲۷۔ نومبر ۱۹۴۹ء کو احرار نے سیالکوٹ میں جو تبلیغ کانفرنس منعقد کی۔ اس میں گیارہ ہزار حاضرین کے سامنے ماسٹر تاج الدین۔ مولوی محمد حیات۔ مولوی محمد علی جالندھری۔ شیخ حسام الدین۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے تقریریں کیں۔ اور ان سب نے

احمدیوں کو۔ احمدیت کے بانی کو۔ احمدی لیڈروں کو اور چودھری ظفر اللہ خاں کو گالیاں دیں۔ اس جلسے میں جو تقریریں کی گئیں ان کا ایک نمونہ مولوی محمد حیات کی تقریر کی روداد میں ملے گا۔ آپ نے کہا:

"اگرچہ مرزا غلام احمد جھوٹا تھا لیکن ہم اسکو الزام نہیں دیتے۔ کیونکہ صرف کبھی کبھی زنا کرتا تھا۔ ہمارا اعتراض موجودہ خلیفہ پر ہے جو ہر روز زنا کاری کا مرتکب ہوتا ہے۔"

پراسیکیوٹنگ پولیس افسر نے جب قانونی کارروائی کی غرض سے اس تقریر کا مطالعہ کیا تو یہ رائے دی کہ اس قسم کے بیانات تو سیاسی مقررین کا شیوہ عام ہیں جن سے کسی کی بھی دل آزاری نہیں ہوتی۔

اس کے بعد احرار نے ۷۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کو نوشہرہ ورکاں میں اہل السنت والجماعت کے نام سے ایک جلسہ عام منعقد کیا جس میں مولوی غلام اللہ خاں نے یہ کہا کہ مرزا غلام احمد دجال تھا۔ جسکو انگریزنے مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے کی غرض سے پیدا کیا تھا۔ قادیانی لوگ خصوصاً چودھری ظفر اللہ خاں پاکستان اور ملت مسلمہ کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اور قادیان کے لئے کشمیر کو فروخت کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ تقریر زیر دفعہ ۱۵۳۔ الف مجموعہ تعزیرات اور زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قانونی کارروائی کے قابل بتائی گئی۔ اور میاں انور علی ڈی۔ آئی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے یہ کیس ہوم سکرٹری کی خدمت میں بھیجتے ہوئے دریافت کیا کہ آیا حکومت کا یہ ارادہ ہے کہ جو لوگ چودھری ظفر اللہ خاں کو گالیاں دے رہے ہیں۔ اور جمہور کے ایک خاص حصے کے خلاف نفرت پھیلا رہے ہیں۔ ان کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے۔ مسٹر انور علی نے اپنے تبصرہ میں ایک معاہدے کا ذکر بھی کیا جو احراریوں کے قول کے مطابق ان کے اور وزیر اعظم کے درمیان ہو چکا ہے۔ اور اس معاہدے کا مقصد یہ ہے کہ چودھری ظفر اللہ خاں جو ایک سیاسی خطرہ بن چکے ہیں۔ وزارت مرکز سے نکال دیئے جائیں۔ جب یہ کیس شعبۂ قانون کے مشیر کے پاس پہنچا تو اس نے ایک اور کیس میں اپنی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے حکم صادر کیا کہ فی الحال احرار لیڈروں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی اور حکومت ابھی حالات کا انتظار کرے گی۔

اس کے بعد مجلس احرار نے ایک اہم تبلیغ کانفرنس ۱۷۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۴۹ء کو لائل پور میں منعقد کی جس میں کوئی پانچ ہزار حاضرین کے سامنے مولوی غلام غوث سرحدی۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی۔ مولوی محمد علی جالندھری شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے تقریریں کیں۔ جو مسٹر انور علی کی یادداشت مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کے رو سے زیر دفعہ ۱۵۳۔ الف مجموعہ تعزیرات۔ اور زیر دفعہ ۲۱۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قانونی کارروائی کے قابل تھیں۔ شعبۂ قانون کے مشیر نے ۲۔ جنوری ۱۹۵۰ء کو اس کیس پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا:-

"ان لوگوں نے احمدیوں کو اپنے حملے کا نشانہ اس لئے بنایا ہے کہ عوام ان کی باتیں سن لیں۔ یہ لوگ ان مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو عام مسلمانوں کے دلوں میں احمدیوں کے خلاف جاگزیں ہیں لیکن میری رائے ہے فی الحال احرار کے خلاف کوئی اقدام مناسب نہ ہوگا کیونکہ مسلمان احمدیت کے معاملے میں بے حد حساس ہیں۔ اور اگر احرار پر احمدیوں کو گالیاں دینے کی بنا پر مقدمات چلائے گئے۔ تو یہ لوگ عوام کی نگاہوں میں شہادت کا مرتبہ حاصل کر جائیں گے۔

جس کے یہ بالکل مستحق نہیں ہیں۔ لہٰذا میں احرار لیڈروں کے خلاف کسی قسم کے اقدام کا مشورہ نہیں دے سکتا۔"

جب یہ کیس ۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو سردار عبد الرب نشتر (گورنر پنجاب) کے سامنے آیا تو انہوں نے اپنی یادداشت میں لکھا کہ چند روز ہوئے مولوی غلام غوث سرحدی مجھ سے ملنے آئے تھے تو میں نے ان کو آگاہ کر دیا تھا کہ حکومت کسی شخص کو اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت سے روکنا نہیں چاہتی۔ لیکن وہ ایسی تقریروں کو برداشت نہ کرے گی جن سے نقض امن کا احتمال ہو۔

جب احراریوں نے ایسی تبلیغ کانفرنسیں شروع کر دیں جن میں احمدیوں کو گالیاں دی جاتی تھیں تو احمدیوں کو بھی عذر مل گیا اور وہ بھی اپنے جلسے منعقد کرنے لگے۔ ایسا ایک جلسہ ۱۵۔ جنوری ۱۹۵۰ء کو سیالکوٹ میں ہوا۔ یہ جلسہ گویا اس تبلیغ کانفرنس کا جواب تھا جو ۲۶۔ نومبر ۱۹۴۹ء کو منعقد ہوئی تھی۔ لیکن احراریوں نے خشت باری کر کے اس جلسے کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ اور پولیس کو ہلکا سا لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ موقع پر پہنچ گئے۔ جب پولیس نے بلوائیوں کو ہٹا دیا تو جلسہ پھر شروع ہو گیا۔ لیکن فوراً وہاں سے ذرا فاصلے پر ایک بڑا ہجوم جمع ہو گیا جس نے لاؤڈ سپیکر بھی لگا لیا۔ اور لوگ مطالبہ کرنے لگے کہ چار بلوائی جو گرفتار کئے گئے ہیں رہا کر دیئے جائیں اور وہ احمدی ہمارے حوالے کر دیا جائے جس نے ایک غیر احمدی کے چھرا مارا ہے۔

ملتان میں تبلیغ کانفرنس ۲۸۔ ۲۹۔ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہوئی۔ جس میں بہت سے مقررین نے تقریریں کیں۔ ان مقررین میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی۔ غلام نبی جانباز اور مولوی محمد علی جالندھری بھی شامل تھے۔ اس جلسے میں حاضرین کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ اس میں مقررین نے مرزا غلام احمد کو ماسٹر تارا سنگھ سے تشبیہ دی۔ چودھری ظفر اللہ خاں کے خلاف توہین آمیز اشارات کئے گئے۔ اور انہیں مسلمان قوم کا غدار بتایا گیا۔ اس کے علاوہ جماعت احمدیہ کے بانی اور اسکے موجودہ امام کے متعلق فحش باتیں کہی گئیں۔ جنرل نذیر احمد کو بھی تبصرہ کا نشانہ بنایا گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بیان کیا کہ ڈپٹی کمشنر ملتان نے بعض مسجدیں مسلمانوں سے چھین کر مرزائیوں کو دے دی ہیں۔ جب اس اجتماع کی روداد ۱۱۔ فروری ۱۹۵۰ء کو شعبۂ قانون کے ممبر کے سامنے آئی تو انہوں نے اپنی وہی پرانی دلیل دہرا دی کہ اگر وزیر خارجہ اور احمدیوں کو گالیاں دینے کی پاداش میں احراریوں کے خلاف کوئی اقدام کیا گیا تو احراری مرتبہ شہادت حاصل کر لیں گے اور عوام کو ان سے بے انتہا ہمدردی ہو جائے گی۔ حالانکہ وہ عوام کی نگاہوں میں ایسا محترم مقام حاصل کرنے کے مستحق نہیں ہیں

جب ۱۳۔ فروری ۱۹۵۰ء کو یہ کیس سردار عبد الرب نشتر نے ملاحظہ کیا تو لکھا کہ میرے نزدیک مجلس احرار کے صدر کو طلب کر کے اسکو آگاہ کر دیا جائے کہ احرار نے مملکت کے فوجی اور غیر فوجی معززین کے خلاف دشنام طرازی کی جو مہم جاری کر رکھی ہے اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ آپ نے لکھا کہ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ مذہب کا نام لیکر مملکت کی بنیادوں کو کمزور کرے۔ میں نے مسئلے کے اس پہلو پر قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولوی غلام غوث سرحدی سے بات چیت کی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اس

اشارے کا کوئی اثر نہیں ہُوا۔ آپ نے ہدایت کی کہ اب احراریوں کے ساتھ ذرا کھلی کھلی بات ہو جانی چاہیئے اور اگر قانون کے مشیر صاحب احراریوں سے گفتگو کرنے میں کوئی دشواری محسوس کرتے ہوں تو میں خود اُن سے بات کروں گا۔ چنانچہ ۲۰۔ فروری ۱۹۵۳ء کو شعبۂ قانون کے مشیر نے ماسٹر تاج الدین صدر مجلس احرار کو طلب کر کے تنبیہ کی کہ چودھری ظفر اللہ خاں اور جنرل نذیر احمد جیسے معزز و مقتدر ارکان مملکت کو گالی گلوچ کا نشانہ بنانے کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ ماسٹر صاحب سے یہ بھی کہہ دیا گیا۔ کہ حکومت اس تنبیہ کے نتیجے کو دیکھے گی اور اگر اس کا کوئی اثر نظر نہ آیا۔ تو حکومت مجبور ہوگی کہ احرار کے خلاف شدید اقدامات کا حکم دے۔

افغانستان میں احمدیوں کی سنگساری اور الشہاب

بعض ممتاز علما نے ہمارے سامنے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے اس لئے اگر احمدی کافر ہیں تو جو شخص احمدی ہو جاتا ہے۔ وہ گویا اپنے آپکو سزائے موت کا مستوجب بنا لیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ افغانستان میں قانون ملکی کی حیثیت سے نافذ ہے۔ چنانچہ وہاں بہت سے اشخاص اپنے غیر اسلامی عقائد کی وجہ سے موت کے گھاٹ اُتارے جا چکے ہیں۔ پہلا احمدی جسکو اس قانون کے ماتحت جان دینی پڑی ایک شخص عبدالرحمان خاں تھا جو امیر عبدالرحمان خاں کے عہدِ حکومت میں ہلاک کیا گیا۔ دوسرا عبداللطیف تھا جو ۱۹۰۳ء میں امیر حبیب اللہ خاں کے دورِ حکومت میں سنگسار کیا گیا۔ عبداللطیف افغانستان کا باشندہ تھا اور کچھ مدت تک قادیان میں مرزا غلام احمد کی صحبت میں رہ کر خود احمدی ہو گیا تھا جب وہ ۱۹۰۳ء میں افغانستان کو واپس آیا تو علما نے اسکو احمدی ہو جانے کی وجہ سے مرتد قرار دیا۔ اور اس کو موت کی سزا دی۔ چنانچہ وہ کمر تک زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا اور اس کے بعد پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہی حشر نعمت اللہ خاں کا ہوا جس کو علمائے افغانستان نے احمدی ہونے کی وجہ سے مرتد قرار دیا۔ چنانچہ وہ ۳۱ اگست ۱۹۲۴ء کو بمقام شیر پور بر سر عام سنگسار کر دیا گیا۔

نعمت اللہ کی سزائے موت پر ہندوستان میں اس امر کے متعلق نزاع پیدا ہوا کہ آیا اسلام میں مرتد کی سزا موت ہے یا نہیں۔ دیوبند کے ایک عالم مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس مسئلہ پر ایک کتابچہ "الشہاب" کے نام سے لکھا جس کے پہلے حصے میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ احمدی مرتد ہیں۔ اور دوسرے حصے میں اس دعوے کے دلائل دئیے گئے تھے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے۔

یہ کتابچہ کوئی تیس سال تک گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا لیکن مارچ ۱۹۵۰ء سے کچھ پہلے قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے اسکے مصنف سے (جو اب شیخ الاسلام پاکستان بن گئے تھے) اسکو دوبارہ چھاپ کر شائع کرنے کی اجازت طلب کی جو عطا کر دی گئی۔ اور اب احراریوں کی تقریروں میں اس کتابچہ کے مندرجات بطور فتوے بیان کئے جانے لگے۔ ۱۴ سے ۱۶۔ اپریل ۱۹۵۰ء تک کمپنی باغ راولپنڈی میں ایک جلسۂ عام ہوا جس میں قریب قریب ہر مقرر نے حاضرین سے اپیل کی کہ "الشہاب" کی کاپیاں خریدیں۔ جب یہ اطلاع مسٹر انور علی ڈی۔ آئی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے پاس پہنچی تو انہوں نے اپنی یادداشت مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۵۰ء میں چیف سکرٹری کو اس امکان کی طرف توجہ دلائی کہ شاید کوئی شخص اس فتوے سے مشتعل ہو کر

کسی احمدی کو ہلاک کر دے۔ لیکن مسٹر انور علی نے یہ رائے ظاہر کی کہ بعض بیّن وجوہ کی بنا پر اس کتابچے کی اشاعت کے خلاف کوئی کارروائی کرنا مناسب نہ ہوگا۔ آخر میں مسٹر انور علی نے اسی تجویز پر اکتفا کیا کہ ماسٹر تاج الدین انصاری اور دوسرے احرار لیڈروں کو جو سخت بدلگام ہو رہے ہیں طلب کر کے تنبیہ کر دی جائے۔ چیف سکرٹری مسٹر فدا حسن نے ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی سے اتفاق کیا کہ کتابچے کو ممنوع قرار دینے سے احراری اور بھی زیادہ چمکیں گے۔ لہذا ایک زبردست تنبیہ کافی ہوگی۔ شعبۂ قانون کے مشیر نے اس تجویز پر صاد کیا۔ اور جب فائل ۳۰۔ جون کو سردار عبدالرب نشتر گورنر کی خدمت میں پیش ہوئی تو انہوں نے لکھا:-

"گزشتہ تنبیہات موثر ثابت نہیں ہوئیں۔ ان لوگوں کو نہایت شدید تنبیہ کرنی چاہیئے اور بتا دینا چاہیئے کہ کسی فرد یا گروہ کے خلاف خصوصاً جبکہ افراد متعلقہ ممتاز سرکاری عہدے دار ہوں اور مملکت کے اہم فرائض ادا کرنے میں معروف ہوں۔ اشتعال انگیز تقریریں کرنا ہرگز برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اگر احراری اپنے اس طرزِ عمل سے باز نہ آئے تو حکومت ان کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔"

اس فیصلے کے مطابق گورنر صاحب نے بنفس نفیس ماسٹر تاج الدین انصاری کو شدید تنبیہ کی۔ تاہم اس کتابچے کے اقتباسات عام جلسوں میں برابر سنائے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ وزیر داخلہ پاکستان نے اس کتابچے کو دیکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انکو اس کتابچے کے بیان کردہ عقاید کے امکانات کا اندازہ کر کے سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ انہوں نے تجویز کی کہ حکومت پنجاب اس کتابچے کو فوراً ضبط کر لے۔

اسی اثنا میں احرار کانفرنس منعقدہ حافظ آباد میں ہونے والی تقریروں کی رپورٹ موصول ہوئی۔ اس کانفرنس میں محمد علی جالندھری نے چودھری ظفر اللہ خاں کو "دیوانہ کتا" کہا۔ ملک حبیب اللہ نے یہ رپورٹ ۱۹۔ جولائی ۱۹۵۱ء کو ڈی۔ آئی جی سی۔ آئی۔ ڈی کو بھیجی اور لکھا۔ کہ اگر احرار کی تقریروں کے لہجے پر کوئی قید عاید نہ کی گئی۔ تو عنقریب حکومت کو بلوے اور قتل کے چند واقعات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مسٹر انور علی ڈی۔ آئی۔ جی سی۔ آئی۔ ڈی نے یہ کیس شعبہ قانون کے مشیر کو بھیجا۔ مشیر نے اسکو سردار عبدالرب نشتر گورنر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور گورنر صاحب نے ڈی۔ آئی جی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کو اس مسئلے پر گفتگو کرنیکے لئے طلب فرمایا۔ اس مرحلے پر مسٹر انور علی ڈی۔ آئی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے پوری صورت حالات کا جائزہ لیا اور ذیل کی یادداشت لکھی:-

"مجلس احرار احمدیت کے بانی اور اسکے موجودہ امام کے متعلق فحش اور غلیظ باتیں تو کرتی ہی ہے۔ اب اس نے دانستہ بھی اور نادانستہ بھی تشدد کی حمایت شروع کر دی ہے۔ یاد ہوگا کہ پچھلے سال ایک نوجوان احمدی افسر جو کپتان کا درجہ رکھتا تھا کوئٹہ میں نہایت وحشیانہ طور پر قتل کر دیا گیا کیونکہ اس نے احمدیت کے خلاف بعض مظاہرہ کرنے والوں کے کردار پر اعتراض کیا تھا۔ مجلس احرار برصغیر ہند کی تقسیم کے خلاف تھی۔ احرار لیڈروں پر کانگرس اعتبار کرتی تھی۔ اور احراری ہمیشہ کانگرس کے کارکنوں سے خلا ملا رکھتے تھے۔ تقسیم کے بعد یہ لوگ منقار زیر پر ہو گئے۔ کچھ مدت

تک وہ عوام کے غیظ و غضب سے خائف رہے۔ اور کبھی کبھی اس مطلب کے بیانات دیتے رہے کہ وہ پاکستان کے وفادار ہیں۔ ان کی حکمت عملی اس زمانے میں خالص دفاعی تھی۔ اور وہ پناہ گیروں کے کیمپوں اور دوسرے مرکزوں میں خدمت اور امداد کا کام کر رہے تھے۔ چونکہ ممبر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اسلئے کچھ مدت تک پارٹی شکستہ و منتشر رہی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری لاہور سے اٹھے اور ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ شیخ حسام الدین نے اعلان کیا کہ ان کی سیاسی زندگی ختم ہو چکی ہے۔ اور پھر انہوں نے بھارت اور پاکستان کے درمیان تجارت کرنے کے لئے مشترک راس المال کی ایک کمپنی قائم کر لی۔ کچھ مدت تک شیخ حسام الدین زیر دفعہ ۳۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ نظر بند رکھے گئے۔ کیونکہ پاکستان سے ان کی وفاداری مشتبہ تھی۔ ان کا ایک رفیق کار مخدوم شاہ بنوری بھی کچھ مدت تک نظر بند رہا۔

۲۔ جب اس صوبے کی مسلم لیگ میں اختلافات بڑھ گئے اور اسکے اثر و اقتدار کو شدید صدمہ پہنچا تو احرار نے خیال کیا کہ سیاسی میدان میں ان کے داخلے کا یہ وقت نہایت مناسب ہے۔ چنانچہ اسی خیال سے انہوں نے پے درپے تبلیغ کانفرنسیں منعقد کرنی شروع کر دیں۔ اب احراری مقررین کی تقریروں کے خصوصی نکات یہ تھے کہ ہم پاکستان کے وفادار ہیں۔ مسلم لیگ کو ملک بھر کی واحد سیاسی جماعت تسلیم کرتے ہیں۔ جہاد کشمیر بالکل حق بجانب تھا۔ اور ملک کے دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے عوام کی سعی و جہد کو منظم کرنا چاہیئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے احمدیوں کے خلاف بھی تقریریں شروع کر دیں۔ مجلس میں بعض نہایت موثر خطیب شامل ہیں۔ چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنے گوشۂ عزلت سے نکل آئے اور انہوں نے ایک دفعہ پھر اپنی شیوا بیانی سے جماعت میں جوش عمل پیدا کر دیا۔ جتنا وقت گزرتا گیا تقریروں کا لہجہ بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ پروگرام کے دوسرے نکات فراموش کر دیئے گئے۔ احرار نے اپنی پوری توجہ احمدیوں کی بدگوئی پر مرتکز کر دی۔ اور نہایت شرمناک دشنام طرازی کا آغاز کر دیا۔ جب ان کی ساکھ کسی قدر عود کر آئی تو انہوں نے سر ظفر اللہ خاں پر حملہ کرنا اور انہیں غدار بنانا شروع کر دیا۔ اب احرار کا رویہ مدافعانہ نہیں رہا بلکہ قطعی طور پر جارحانہ ہو چکا ہے۔ حالات بہت زیادہ بگڑ چکے ہیں اور شائستگی اور سیاسی اخلاق کی حدود و قیود توڑی جا چکی ہیں۔ اب تک مندرجہ ذیل قابل ذکر باتیں ظہور میں آئی ہیں:۔

(۱) مرزا غلام احمد کی تحریروں کے اقتباسات ناگوار حد تک نقل کئے جا رہے ہیں۔ اور ان کو توڑ مروڑ کر ان سے فحش اور غلیظ مطالب نکالے جاتے ہیں۔

(۲) مرزا غلام احمد اور موجودہ خلیفہ کو زناکار اور خلاف وضع فطرت حرکات کا مرتکب ظاہر کیا جا رہا ہے۔

(۳) احمدیوں کو غدار کہا جا رہا ہے اور دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ وہ پاکستان کے وفادار نہیں ہیں۔

(۴) سر ظفر اللہ کے خلاف بدگوئی اور دشنام طرازی جاری ہے۔ ان کو اکثر "گدھا" اور "مکار" بتایا جاتا ہے۔ اور ان پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ قادیان میں احمدی مفادات کے تحفظ کی خاطر کشمیر کو فروخت کر دیں گے۔

(۵) یہ کہکر عوام کو دہشت زدہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان پر احمدیوں کی حکومت ہے جو ملک کے غدار ہیں۔ اس مقصد کی خاطر فوجی اور غیر فوجی احمدی عہدہ داروں کی فہرستیں اکثر شائع کی جاتی ہیں۔

(۶) سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے بارہا کہا ہے کہ اگر مرزا غلام احمد نے ان کی زندگی میں نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو وہ اُن کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتے۔

(۷) پچھلے دنوں احراریوں کے ایک جلسے میں جذبات اس قدر مشتعل کئے گئے کہ حاضرین میں سے ایک شخص نے اُٹھکر اعلان کیا کہ میں مرزا بشیرالدین کو قتل کرنے کیلئے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔

(۸) ملتان کے ایک جلسے میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی تقریر سُنکر ایک شخص اُٹھا اور کہنے لگا کہ اگر حکم ہو تو میں جا کر سر ظفراللہ کو قتل کر دوں۔

(۹) "الشہاب" کے نام سے ایک کتابچہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ احمدی مرتد ہیں لہٰذا ہر مسلمان انکو قتل کر سکتا ہے۔ یہ کتابچہ دوبارہ چھاپ کر شائع کیا جا رہا ہے (یہ کتابچہ مولانا مرحوم نے اس زمانے میں لکھا تھا۔ جب افغانستان میں دو احمدیوں کے ہلاک کئے جانے پر ملک میں ایک بحث چھڑ گئی تھی)

(۳) احرار نے ان بے شمار اقتصادی۔ معاشرتی اور سیاسی مسائل کے متعلق جو پاکستان کو درپیش ہیں کبھی کوئی تعمیری خدمت انجام نہیں دی۔ عملاً ان کے پاس کوئی سیاسی پروگرام نہیں۔ سوائے اس خواہش کے کہ آئندہ انتخابات میں انہیں عوام کی حمایت حاصل ہو جائے۔

(۴) عوام کا حافظہ دردناک حد تک کمزور ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ آج سے دو سال پہلے احرار لیڈر شک و شبہ اور بے اعتباری کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آج وہ جب کبھی عام جلسوں میں تقریریں کرتے ہیں۔ تو بے شمار حاضرین اُن کو سننے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو ان احرار لیڈروں کی نسبت پر اعتراض کریں یا ان سے اتنا ہی پوچھ لیں کہ آخر وہ احمدیوں کے خلاف اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں۔ احرار جزوی طور پر اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپکو دوبارہ عوام کی نظروں میں مقبول بنا لیا ہے اور وہ عنقریب ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اٹھیں گے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ وہ جماعت مسلم لیگ کی حامی ہو۔ اگر وہ مخلص ہوتے تو اپنی تنظیم کو ختم کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو جاتے۔

(۵) احرار لیڈروں کو غالباً اس امر کا احساس نہیں ہے۔ کہ وہ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ مسخراپن کو تو کسی حد تک نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب عوام کے جذبات کو اس حد تک مشتعل کر دیا جائے کہ قتل۔ بلوے اور توہین و تضحیک وغیرہ کے خطرات پیدا ہو جائیں تو اس کو روکنا قطعی طور پر لازمی ہے۔ ممکن ہے احرار لیڈروں کے خلاف قانون تعزیرات کے ماتحت مقدمات چلانا مناسب نہ ہو۔ (تاکہ مزید بحث و نزاع پیدا نہ ہو) لیکن چونکہ ان کی سرگرمیاں سلامتی عامہ اور امن عامہ کے قیام کے منافی ہیں۔ اس لئے مندرجہ ذیل تجاویز پر غور کرنا ضروری ہے:۔

(الف) جب عملی تشدد کی تلقین کی جائے یا اس تلقین کی اعانت کی جائے تو زیر دفعہ ۳۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کارروائی کی جانی چاہیئے۔

(ب) احرار لیڈروں کی طرف سے سر ظفر اللہ خاں کے خلاف دشنام و بدگوئی کسی حالت میں برداشت نہ کی جائے۔ ہر شخص جو کابینہ کے کسی وزیر کی علے الاعلان توہین کرے اس امر کا مستوجب ہونا چاہیئے۔ کہ اسکے خلاف زیر دفعہ ۲۱۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کارروائی کی جائے۔

(ج) غیر شریفانہ اور فحش تقریریں جن سے اخلاق عامہ کی تخریب ہوتی ہو اور عوام کی حس شائستگی کو صدمہ پہنچتا ہو ہرگز برداشت نہ کی جائیں۔ احراری مقررین نے بارہا کہا ہے کہ مہاتما گاندھی اور احمدیوں کے خلیفہ ہم بستر ہوئے تھے۔ اس قسم کی نفرت انگیز اور مکروہ تر ین ظرافت علی الخصوص ایک اسلامی مملکت میں ہرگز قابل برداشت نہ ہونی چاہیئے۔

(د) آخر میں مجلس احرار کو زیر دفعہ ۱۶۔ ضابطہ فوجداری ترمیمی ایکٹ ۱۹۰۸ء خلاف قانون جماعت قرار دینے کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

۶۔ شعبۂ قانون کے مشیر صاحب کو یاد ہوگا کہ عزت مآب وزیر داخلہ نے اس رائے پر زور دیا تھا کہ کتابچہ "الشہاب" جس میں احمدیوں کے خلاف تشدد کی تلقین کی گئی ہے فوراً ضبط کیا جانا چاہیئے۔ یہ بھی یاد ہوگا۔ کہ وزیر داخلہ نے بالکل درست فرمایا تھا۔ کہ اگر موجودہ مرحلے پر جماعت احرار اور اس کے کارکنوں کے خلاف اقدام نہ کیا گیا تو انکی ہر دلعزیزی کئی گنا بڑھ جائے گی۔ اور اس وقت ان کے خلاف اقدام کرنے سے ایک طرف وہ شہیدوں کا مرتبہ حاصل کر لیں گے۔ اور دوسری طرف حکومت کے لئے عملی مشکلات بھی پیدا ہو جائینگی۔ میں اس حقیقت کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ہوشمند اور روشن خیال لوگ احراری لیڈروں کی ناشائستہ تقریروں کے متعلق حکومت کی بے عملی کو مستحسن نہیں سمجھتے۔

۷۔ میں اپنے فرض کی بجا آوری میں کوتاہی کروں گا اگر میں حکومت سے یہ عرض نہ کروں کہ احرار لیڈروں نے جو فضا پیدا کر دی ہے۔ وہ نہایت خطرناک امکانات سے معمور ہے۔ اور ممکن ہے کہ احمدیوں کے خلاف تشدد کے انفرادی واقعات رونما ہونے لگیں"

ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی نے اپنی یہ یادداشت چیف سکرٹری کو ارسال کی۔ جنہوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا کہ "الشہاب" کو ضبط کر لیا جائے۔ اور جہاں کہیں عملی تشدد کی تلقین کی جائے۔ یا جہاں اس تشدد کی اعانت کے لئے کسی اور جرم کا ارتکاب کیا جائے۔ وہاں زیر دفعہ ۳۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کارروائی کی جائے۔ چودھری ظفر اللہ خاں کی توہین کے خلاف اقدام کی جو تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس کے متعلق چیف سکرٹری نے یہ کہا کہ ایسا اقدام اسی صورت میں کیا جائے جبکہ وزیر موصوف خود اس طرز عمل سے اتفاق کریں۔ احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دینے کے متعلق چیف سکرٹری نے تجویز کی کہ فی الحال کچھ مدت تک انتظار کیا جائے۔ جب یہ فائل شعبۂ قانون کے مشیر کے پاس بھیجی گئی۔ تو انہوں نے ۱۱۔ جون ۱۹۵۱ء کو اس پر ایک طویل یادداشت لکھی جس میں "الشہاب" کی ضبطی سے اتفاق کیا۔ اور بتایا کہ انہوں نے صدر مجلس احرار ماسٹر تاج الدین کو جو شدید تنبیہ کی تھی۔ اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس لئے احراری لیڈروں کو پھر طلب کر کے ایک اور شدید تنبیہ کی جائے۔ مشیر صاحب نے یہ بھی لکھا کہ احرار اپنی تقریروں میں تشدد کی تلقین نہیں کر رہے ہیں بلکہ صرف احمدی مذہب پر حملے کر رہے ہیں۔ اور اس عمل نے ان کو

عام مسلمانوں میں ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ اگر احمدیوں اور ان کے مذہب پر حملہ کرنے کی پاداش میں ان کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی۔ تو اس سے احراریوں کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوگا۔ اور وہ شہید بن جائیں گے اس لئے ان کی سرگرمیوں کے تدارک میں حزم واحتیاط سے کام لینا ضروری ہے۔ یہ یادداشت گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر کی خدمت میں پیش کی گئی۔ سردار صاحب نے اس کو پسند کیا۔ اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ کچھ مدت پیشتر انہوں نے مولوی غلام غوث سرحدی اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو زبانی تنبیہ کی تھی کہ اگر وہ حدود سے تجاوز کرینگے اور تشدد پر اکسانے والی تقریریں کرتے رہیں گے تو حکومت کو ان کے خلاف کارروائی کرنی پڑے گی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ تنبیہ اور وہ جو شعبۂ قانون کے مشیر صاحب نے ماسٹر تاج الدین انصاری کو کی تھی۔ بالکل بے اثر رہی ہیں اسلئے چیف سکرٹری ایک دفعہ پھر ماسٹر تاج الدین انصاری کو طلب کرکے اُن سے گفتگو کریں۔ اس کے بعد گورنر صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ ماسٹر تاج الدین انصاری سے بنفس نفیس گفتگو کرینگے۔ چنانچہ تاج الدین انصاری طلب کئے گئے اور گورنر صاحب نے ان کو تنبیہ کرنے کے بعد مندرجہ ذیل یادداشت قلمبند کی:۔

"ماسٹر تاج الدین صدر مجلس احرار کا سراغ شب گزشتہ ملا۔ اور وہ آج صبح آٹھ بجے میری ملاقات کے لئے آئے۔ میں نے ان کو بتایا کہ حکومت کسی فرد یا ادارے کی مذہبی سرگرمیوں میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن اسکے ساتھ ہی وہ ایسی سرگرمیوں کو بھی برداشت نہیں کرسکتی جن سے نقض امن کا احتمال ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ چند ماہ پیشتر صوبہ سرحد کے ایک احراری لیڈر مولوی غلام غوث مجھ سے ملنے آئے تھے اور میں نے اُن سے احراری سرگرمیوں کے اس پہلو پر گفتگو کی تھی۔ اسکے بعد ایک دن قاضی احسان احمد شجاع آبادی مجھ سے ملے تو میں نے یہ صورت حالات انکو بھی سمجھائی۔ لیکن نہایت افسوس ہے۔ کہ اس گفتگو کے باوجود احرار لیڈروں کی تقریروں کا لہجہ عام طور پر اشتعال انگیز رہا۔ شعبۂ قانون کے مشیر نے میری ہدایت پر ماسٹر تاج الدین کی وساطت سے احرار کو جو تنبیہ کی تھی۔ وہ بھی غیر موثر ثابت ہوئی۔ احراریوں کی تقریریں صرف احمدیوں کے عقائد مذہبی کی جائز تنقید تک محدود نہیں رہیں۔ ان میں سے بعض مقرر ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن کا نتیجہ فساد کی صورت اختیار کرسکتا ہے۔ حکومت اس صورت حالات کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اور اگر احرار نے اپنا یہ رویہ ترک نہ کیا۔ تو حکومت مجبور ہوگی کہ صوبے کے قانون وانتظام کی حفاظت کے لئے ان کے خلاف مناسب اقدام کرے۔ میں نے ان کو یہ بھی بتادیا کہ عام خیال یہ ہے (اور میرے نزدیک یہ صحیح بھی ہے) کہ احراری "ختم نبوت" کے پردے میں جو کانفرنسیں منعقد کررہے ہیں۔ ان سے اپنے سیاسی مقاصد کا حصول مقصود ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان عوام میں (جو قبل تقسیم کی احراری سرگرمیوں کی وجہ سے طبعاً بیزار ہیں) از سرنو ہر دلعزیز ہو جائیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ عوام اتنے احمق نہیں ہیں کہ اس کھیل کو سمجھ نہ سکیں جسے بعض احراری کھیل رہے ہیں۔ وہ آئے دن پاکستان کے وزیر خارجہ کو اور بہت سے اعلیٰ فوجی اور غیر فوجی عہدہ داران حکومت کو جو احمدی ہیں۔ نشانۂ دشنام بنا رہے ہیں۔ اگرچہ اس پروپیگنڈے کو مذہبی رنگ دیا جارہا ہے۔ لیکن اسکا اصل مقصد یہی سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں حکومت پاکستان کے خلاف نفرت وحقارت پیدا کی جائے جس نے یہ ذمہ داری کے عہدے ایسے اشخاص کے سپرد

کر رکھے ہیں۔ ابھی تھوڑی ہی مدت گزری۔ کہ احراریوں کے ایک حامی اخبار نے ایسے فوجی افسروں کی ایک طویل فہرست شائع کی تھی۔ جن کو قادیانی بتایا گیا تھا۔ اگر اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اس طریقے سے احراری عساکر پاکستان کے متعلق مسلمانوں کے جوش و تپاک کو کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ اور جب احرار احمدیوں کے متعلق حکومت افغانستان کی پالیسی کا ذکر کرتے ہیں۔ تو یہ امر اور بھی زیادہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ تقریروں میں یہ کہا جاتا ہے کہ حکومت افغانستان احمدیوں کو سزائے موت دیتی ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی لوگوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ حکومت پاکستان کا رویہ احمدیوں کے متعلق کیا ہے۔ اس مقابلے اور موازنے کا یقیناً یہ مطلب سمجھا جا سکتا ہے کہ حکومت پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں نے صدر مجلس احرار کو یہ بھی بتا دیا کہ اب تک مسلم لیگی حکومت احراریوں کی سرگرمیوں کو بے نقاب کرنے کے لئے میدان میں نہیں آئی۔ لیکن اگر احرار کا شیوہ یہی رہا تو ارکان حکومت کو سامنے آنا پڑے گا۔ اور وہ عوام کو احرار کی گزشتہ سرگرمیاں اس انداز سے یاد دلائیں گے کہ میرے نزدیک احراری ہمیشہ کے لئے مردود قرار پا جائیں گے۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ ایک بے حد تعجب انگیز بات یہ ہے کہ احراری پاکستان کے مسلمانوں کے جذبات کو احمدیوں کے خلاف اس بنا پر برانگیختہ کر رہے ہیں کہ اگر احرار کے بیان کے مطابق احمدی ایک خاص رویہ اختیار نہ کرتے۔ تو ضلع گورداسپور کا ایک حصہ جو اب بھارت کا جزو ہے پاکستان کو مل گیا ہوتا۔ حالانکہ احراری خود زندگی بھر تقسیم ہند کی مخالفت اور کانگرس کی حمایت کر کے پورے کا پورا پاکستان ہندوؤں کے حوالے کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔

۲۔ ماسٹر تاج الدین نے جواب دیا کہ ہماری سرگرمیوں کے متعلق آپ کا یہ خیال سُن کر مجھے بے حد اذیت ہوئی ہے۔ میں تو ہمیشہ ہی احراری مقررین کو تلقین کرتا رہا ہوں کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کریں۔ جس سے حکومت کو کسی قسم کی پریشانی ہو۔ یا امن و امان درہم برہم ہو جائے۔ ماسٹر صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ میرے خیالات اپنی جماعت کے لیڈروں تک پہنچا دیں گے۔ اور مجھے یقین دلایا۔ کہ آئندہ پوری کوشش کی جائے گی۔ کہ حکومت کو کسی قسم کی وجہ شکایت پیدا نہ ہو۔"

مزید واقعات قتل

"الشہاب" کی وسیع اشاعت اور احمدیوں کے خلاف احرار کی نفرت انگیز مہم کے نتائج قطعی اور قدرتی تھے انیس سال کے ایک نوجوان محمد اشرف نے اوکاڑہ میں ایک احمدی مدرس غلام محمد کو قتل کر دیا۔ اس قتل کی کہانی درج ذیل ہے:۔

یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء کو ایک احمدی مولوی نوردین سات، دوسرے احمدیوں کے ساتھ تبلیغی مہم پر چک نمبر ۵ میں گیا۔ یہاں کے غیر احمدیوں نے ان مبلغوں کو گھیر لیا۔ پھر ان پر کیچڑ پھینکی۔ ان کے چہروں پر کالک ملی۔ اور گندے پانی میں سے انہیں ہنکا کر ریلوے سٹیشن اوکاڑہ تک پہنچا یا۔ پولیس میں اس واقعہ کی رپورٹ لکھائی گئی۔ جس پر ایک شخص مولوی فضل الٰہی زیر دفعات ۱۴۷ و ۳۴۲ زیر حراست لے لیا گیا۔ اس گرفتاری کے خلاف

احتجاج کے طور پر اوکاڑہ میں دکانیں بند ہوگئیں۔ اور ۳۔ اکتوبر کی رات کو ایک جلسہ عام ہُوا۔ جس میں ہزاروں اشخاص شامل ہوئے۔ بہت سے مقررین نے تقریریں کیں۔ جو بے انتہا اشتعال انگیز تھیں۔ ایک مقرر نے جلسے کے نوجوان حاضرین سے اپیل کی کہ مرزائی فتنہ سے قوم کو نجات دلاؤ۔ دوسرے دن محمد اشرف نے جو تقریریں سُن چکا تھا ایک چھرے سے مسلح ہو کر غلام محمد کا تعاقب کیا جبکہ وہ اوکاڑہ جا رہا تھا۔ محمد اشرف نے غلام محمد کو ایک نہر کے قریب جا لیا۔ اور اس کے چھرا گھونپ دیا۔ غلام محمد کا زخم کاری تھا۔ چنانچہ وہ تھانے کو لے جانے سے پہلے ہی مر گیا۔ محمد اشرف ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا جہاں اس نے یہ بیان دیا :-

"پہلے یہ کہا کہ ستمبر میں پھر کہا کہ اکتوبر کی تیسری تاریخ کو اوکاڑہ میں ایک جلسہ ہوا۔ جس میں صوفی بشیر احمد۔ مولوی ضیاالدین۔ قاضی عبدالرحمٰن۔ چودھری محبوب عالم اور صدر جلسہ نے جو غالباً قاضی تھے پُر جوش تقریریں کیں۔ جن میں بتایا کہ مرزائی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گالیاں دیتے ہیں۔ ہم حضورؐ کی عظمت کے لئے اپنی جانیں دے دیں گے۔ تقریروں میں یہ کہا گیا۔ کہ جو لوگ ان کو (احمدیوں کو) پہچان کر نابود کرنے پر آمادہ ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ اُٹھائیں جلسے میں علم دین غازی کا ذکر بھی کیا گیا۔ اور اُسکی سرگزشت سنائی گئی۔ میں نے اس سے پہلے بھی علم دین غازی کی سرگزشت پڑھی تھی۔ اور ایک دفعہ اسکے مقبرے پر بھی گیا تھا۔ اسکے بعد جلسہ ختم ہو گیا۔ میں گھر واپس آ گیا۔ تقریروں کے الفاظ رات بھر میرے دماغ میں گونجتے رہے۔ صبح اُٹھکر میں سائیکل پر چک ۴۸ گیا۔ جہاں ماسٹر تفریحی چھٹی پر اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ میں چک میں ٹھیرا رہا۔ تاوقتیکہ وہ سکول میں نہ آ گیا۔ گاؤں کے چوک کی ایک دکان پر میں نے ایک سگریٹ پیا۔ جب میں باہر نکلا۔ ماسٹر سکول میں نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ماسٹر مرزائی ہے۔ اور میں اسی نیت سے آیا تھا۔ چک میں میں نے ایک سید سے پوچھا۔ کہ آیا حضور نبی کریمؐ کے زمانے میں ہمارے بچوں کو پڑھانے پر کوئی کافر مقرر تھا؟ اس ماسٹر کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارے چک میں مقیم ہے۔ زمین الاٹ کرا رکھی ہے۔ اور بچوں کو پڑھا رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ ماسٹر کہاں گیا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ چک ۴/۲ آر کو گیا ہے۔ میں نے پوچھا سائیکل پر یا پیدل؟ جواب ملا سائیکل پر میرے پاس اسوقت ایک چھرا تھا۔ میں نے اس کو دو میل کے فاصلے پر جا لیا۔ وہاں میں نے اپنے سائیکل سے اُتر کر اسکے سائیکل کو دھکا دیا اور اسے گرا لیا۔ میں نے ماسٹر کو چھرے سے ایک ضرب لگائی۔ اور وہ بھاگ کر چھوٹی نہر کے پانی میں گھس گیا۔ چھرا ٹھیک نہ رہا۔ میں نے اُسے درست کیا۔ اور پھر پانی میں دو ضربیں لگائیں میں اسکو مار ہی رہا تھا کہ ادھر ادھر سے کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ اور انہوں نے مجھے روکا۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے نہ روکو۔ میں ایک کافر کو قتل کر رہا ہوں۔ ایک اَور اجنبی شخص نے بھی مجھ سے سوالات کئے۔ میں نے اسکو بھی یہی بتایا۔ کہ میں نے ایک کافر کو ہلاک کر دیا ہے۔ پھر میں اوکاڑہ چلا گیا"

سیشن جج نے محمد اشرف کو عمر قید کی سزا دے دی۔ اور جب اسکی اپیل ہائیکورٹ میں پیش ہوئی۔ تو مقتول کی بیوہ کی طرف سے سزا کو بڑھانے کے لئے بھی ایک درخواست داخل کی گئی۔ جب بنچ نے (جس کا ایک ممبر ہم میں سے ایک تھا) حکم سزا کے مسئلے پر غور کیا تو بعض ایسے خیالات ظاہر کئے۔ جو موجودہ موقع سے متعلق ہیں۔ لہٰذا تفصیل سے ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔ بنچ نے لکھا :-

" اس مقدمے میں حکم سزا کا مسئلہ دشواری کا موجب ہے۔ اور ہم نے کئی روز تک اس امر پر فکر مندانہ غور کیا ہے۔ کہ آیا جو نوجوان اس مقدمے میں ایک قطعی بیگناہ شخص کے سوچے سمجھے ہوئے قتل کا مرتکب ثابت ہو چکا ہے اسے زندہ رہنا چاہیئے یا مر جانا چاہیئے۔ فاضل سشن جج نے اسے عمر قید کی سزا دی ہے لیکن مقتول کی بیوہ مسماۃ دولت بی بی نے درخواست دی ہے کہ اس کو سزائے موت میں بدل دیا جائے۔ اس درخواست کی تائید میں یہ کہا گیا ہے۔ کہ اصول اور معمول دونوں کے اعتبار سے سزائے موت دی جانی چاہیئے تھی۔ اس سے کم سزا دینے کے باعث انصاف کا منشا پورا نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں " علم دین بنام شہنشاہ اے آئی آر سنہ ۱۹۳۰ء لاہور ۱۵۷" اور " عزیز احمد بنام شہنشاہ اے آئی آر سنہ ۱۹۳۸ء لاہور ۳۵۵" کا سہارا لیا گیا ہے۔ ان دونوں مقدمات میں اول الذکر مقدمے کی کیفیت یہ ہے۔ کہ انیس بیس سال کا ایک نوجوان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت کے جذبے سے متاثر ہو کر ایک ہندو کے سوچے سمجھے ہوئے قتل کا مرتکب ثابت ہوا تھا۔ جس نے ایک نہایت پست مبتذل اور غلیظ کتاب لکھکر پیغمبر خدا پر حملے کئے تھے۔ جسٹس براڈوے اور جسٹس جانسٹن نے اپیل کی سماعت کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ مجرم کی عمر اور مقصد قتل دونوں شارٹ جرم میں کسی تخفیف کے روادار نہیں۔ چنانچہ انہوں نے سزائے موت کی تصدیق کر دی۔ دوسرے مقدمے کی کیفیت یہ ہے کہ ایک راسخ الاعتقاد احمدی نے ایک " مرتد " احمدی کو قتل کر دیا تھا۔ کیونکہ جس پارٹی سے مقتول تعلق رکھتا تھا اسکی طرف سے ایک پوسٹر شائع ہوا تھا جس میں راسخ الاعتقاد فرقے کے امام پر حملہ کیا گیا تھا۔ سزائے موت کے جواز پر غور کرتے ہوئے جسٹس ینگ نے لکھا:۔

" ہمارے خیال میں اس ملک کے اندر اس یقین کی بنا پیدا کرنا خطرناک ہوگا کہ قتل کی وارداتوں پر خواہ وہ مذہبی جماعتوں کے پیشواوں پر حملے کی وجہ سے ہوں۔ یا ان کے زیر اثر واقع ہوئی ہوں۔ موت کی سزا بالکل نہ دی جائے گی۔ سوائے اس حالت کے کہ ان کا ارتکاب نہایت گہرے اور ناگہانی اشتعال کی حالت میں کیا گیا ہو۔

ہم یہ کہ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مذہبی جماعتوں کے لیڈروں کے لئے یہ امر سخت خطرناک ہے کہ وہ اپنے مخالفین پر علی الاعلان برسر منبر حملے کریں۔ اور بالخصوص ایسی زبان اختیار کریں۔ جو خلیفہ صاحب نے مصری عبدالرحمن اور اسکے مقلدین کے متعلق استعمال کی۔ کیونکہ کسی شخص کا ایسی تقریر سے جوش میں آکر قتل کا ارتکاب کر بیٹھنا بالکل آسان ہے۔ یہ ہندوستان میں پہلا واقعہ نہیں ہے۔ کہ اس قسم کی لعنت ملامت کے فوراً ہی بعد موت واقع ہو گئی ہو۔ اگر ہم اپیلانٹ کے وکیل کی یہ حجت بھی تسلیم کر لیں کہ خلیفہ صاحب نے روحانی معنوں میں سزا و عذاب کا ذکر کیا تھا۔ تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی مذہبی پیشوا کے بعض جوشیلے پیروؤں کے لئے روحانی اور جسمانی سزا میں امتیاز کرنا مشکل ہو جایا کرتا ہے۔ بہر کیف اس ملک میں ایسے مذہبی دیوانے ہر وقت موجود رہتے ہیں جن کو یقین ہے کہ خدا نے انکو اس قسم کی سزائیں دینے کے لئے اپنا آلۂ کار مقرر کیا ہے۔ ہم عزیز احمد کی سزائے موت کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں اور اسکی اپیل خارج کرتے ہیں "

اس کے برعکس اپیلانٹ کی طرف سے نہایت سنجیدگی سے یہ دلیل پیش کی گئی (اور ہم اس دلیل کا ذکر اس لئے نہیں کرتے۔ کہ واقعی کسی سنجیدہ غور و خوض کی مستحق ہے۔ بلکہ محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مذہبی نزاعات کس طرح غصے اور نفرت کی آگ کو بھڑکانے کا باعث ہو سکتے ہیں) کہ احمدی لوگ غیر احمدی مسلمانوں کے لئے ایک مستقل وجہ اشتعال واقع ہوئے ہیں۔ اور ممکن ہے اس فرقے کے عقائد کی حمایت میں کوئی عام اور جارحانہ تبلیغ اس قدر عمیق اور ناگہانی اشتعال کا باعث ہو جائے کہ جرم قتل کی سنگینی کم ہو کر محض ہلاکت انسان مستلزم سزا رہ جائے اور کسی موقع پر عدالت وجوہ تخفیف پر غور کر کے سزائے موت کی منسوخی کو جائز قرار دے دے۔

اگر ہم اسی اصول کی پیروی کرتے جو مذکورہ بالا دو مقدموں میں قائم کیا گیا ہے تو ہمارے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا کہ ہم عمر قید کی سزا کو بڑھا کر موت کر دیتے۔ لیکن یہ دونوں قبل تقسیم زمانے کے مقدمات ہیں۔ اور ان دونوں میں اصل فیصلے پر حکومتی مصالح کا اثر پڑا ہے۔ موجودہ مقدمے میں ہم اس حقیقت کی طرف سے آنکھ بند نہیں کر سکتے کہ قتل کا ارتکاب کسی پشت مقصد سے نہیں کیا گیا۔ مجرم نوجوان ہے۔ اور اثر قبول کرنے والی عمر میں ہے۔ اس کو یقین دلایا گیا کہ ان حالات میں قتل ایک فریضہ ہے جس کی بجا آوری سے اس کو بڑا ثواب ہو گا۔ ۲۔ اکتوبر کے جلسے میں جو تقریریں کی گئیں۔ ان میں احمدیوں کو اسلام کے لئے خطرہ بتایا گیا۔ اور اس قسم کے خوفناک فتوے کا لازمی نتیجہ ہلاکت ہے۔ جب کبھی کوئی نوجوان اپنے بزرگوں کے زیر اثر قتل کا مرتکب ہوا ہے۔ ہم نے ہمیشہ یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کو موت کی سزا نہ دی جائے۔ اور ہم اس قسم کے مقدمات اور موجودہ مقدمے کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ موجودہ مقدمے میں بزرگوں کی جگہ علمائے دین نے لے لی ہے جنھوں نے علی الاعلان ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت سے تشدد کی تلقین کی ہے۔ اس کے علاوہ قتل کی ایک اور قسم بھی ہے جس میں عدالتیں عام طور پر موت کی سزا نہیں دیتیں۔ یعنی جب جرم کسی ایسے خلل دماغی کے زیر اثر کیا گیا ہو جو قانون کے نزدیک دیوانگی کی حد تک نہ پہنچا ہو۔ ہمارے نزدیک ایک مذہبی جوشیلے اور دیوانے آدمی کا معاملہ جرم کی اس قسم سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ اس مقدمے کی سزا میں اضافہ کرنا مناسب نہ ہو گا۔ بہرکیف اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کوئی عمومی قاعدہ قائم کر رہے ہیں بلکہ اگر اس قسم کے جرم کا اعادہ کیا گیا جس سے مذہب کی رسوائی کا احتمال ہو۔ اور جس سے مذہب اضحوکۂ روزگار بن جائے۔ تو ہو سکتا ہے کہ ہم اس سے مختلف نقطۂ نگاہ قائم کریں۔ اور قتل کی وہی سزا تجویز کریں جو معمول عام ہے۔"

اوکاڑہ کے قتل کے بعد اسی مہینے میں ایک اور احمدی قتل کر دیا گیا۔ دونوں وارداتوں کے درمیان صرف چند روز کا وقفہ تھا۔ راولپنڈی کے باغ گوال منڈی میں ایک شخص ولایت خاں نے بدرالدین احمدی کو گولی سے مار ڈالا۔ اس قتل کا مقصد کچھ واضح نہیں ہوا لیکن عینی شاہدوں میں سے ایک نے جس پر سیشن جج اور ہائی کورٹ دونوں نے اعتبار کیا ہے۔ یہ بتایا کہ جب مجرم کو عین موقع پر گرفتار کیا گیا تو اس نے خود یہ اعتراف کیا تھا کہ میں نے بدرالدین کو اسلئے ہلاک کیا ہے کہ وہ احمدی ہے۔

ان واقعات قتل پر احمدی جماعت نے شدید صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اس سلسلے میں مرکزی حکومت کے

پاس بعض عرضداشتیں بھی بھیجیں۔ وزارت داخلہ نے اپنی چھٹی نمبری 50/(1) 5-109 مورخہ ۲۔ نومبر ۱۹۵۰ء کے ساتھ ایک قرارداد چیف سکرٹری حکومت پنجاب کو بغرض تبصرہ بھیجی۔ جو احمدیہ مسلم ایسوسی ایشن کراچی نے ۲۰۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو منظور کی تھی۔ قرارداد حسب ذیل ہے :۔

"جماعت احمدیہ کراچی کا یہ جلسہ عام اوکاڑہ میں ماسٹر غلام محمد احمدی اور راولپنڈی میں چودھری بدرالدین احمدی کے قتل کے خلاف شدید ملامت کا اظہار کرتا ہے اور ان واقعات کو ان اشتعال انگیز تقریروں کا نتیجہ سمجھتا ہے جو احراری لیڈر احمدی جماعت کے خلاف کر رہے ہیں۔ یہ جلسہ اس امر پر گہری تشویش ظاہر کرتا ہے کہ صوبائی اور مرکزی حکومتیں پاکستانی شہریوں کے ایک طبقے کے خلاف احراریوں کی شرارت آمیز سرگرمیوں کی طرف اب تک توجہ نہیں کر سکیں۔ یہ جلسہ دونوں حکومتوں کی توجہ اس خطرناک صورت حالات کی طرف مبذول کراتا ہے جو اس قسم کی سرگرمیوں سے پیدا ہو چکی ہے اور دونوں حکومتوں سے اصرار کرتا ہے کہ اس معاملے میں مناسب اقدام کریں۔"

مرکزی حکومت نے حکومت پنجاب سے یہ بھی سوال کیا کہ آیا اس کے نزدیک واقعی صوبہ پنجاب میں احمدیوں کے لئے عام خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔ اس پر حکومت پنجاب کا جواب یہ تھا کہ احمدیوں کے خلاف کسی متشددانہ ہنگامے کا کوئی خطرہ نہیں۔ دونوں واقعات قتل کے مقدمات کی سماعت عدالت میں ہو رہی ہے اور اگر احرار (حسب اطلاع) مسلم لیگ کے ساتھ تعاون پر رضامند ہو گئے تو جس فرقہ بندانہ تبلیغ میں وہ مصروف ہیں خود بخود ختم ہو جائے گی۔

مارچ ۱۹۵۱ء میں ایک سازش کا انکشاف ہوا جس میں بڑے بڑے فوجی افسر شریک تھے اور جس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت پاکستان کا تختہ الٹ دیا جائے۔ اس مقدمے کے ملزموں میں جسے بعد میں مقدمہ سازش راولپنڈی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ایک میجر جنرل نذیر احمد بھی تھے۔ جو احمدی ہیں۔ مولوی محمد علی جالندھری نے ۱۵۔ اپریل ۱۹۵۱ء کو منٹگمری کی جامع رشیدیہ کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا "کہ پاکستان کی ہوائی فوج میں اسی فیصدی پائلٹ احمدی ہیں۔ راولپنڈی کی سازش کے انکشاف سے احمدی افسروں کی غداری بے نقاب ہو چکی ہے۔ اس سازش نے حکومت کو حقائق کی طرف سے خبردار کر دیا ہے۔ میرے پاس تحریری شہادتیں موجود ہیں۔ جن سے اس سازش میں احمدیوں کی شمولیت ظاہر ہے۔ اور چودھری ظفر اللہ خاں نے مملکت پاکستان کے روپیہ سے امریکہ میں پریذیڈنٹ ٹرومن کے محل کے عین سامنے ایک عظیم الشان عمارت خرید کی ہے۔ تاکہ وہاں احمدیت کی تبلیغ کی جائے۔" جب اس تقریر کی روداد مسٹر انور علی ڈی۔ آئی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے سامنے آئی۔ تو انہوں نے لکھا کہ اس قسم کی تقریروں سے امن عامہ پر نہایت مضر اثر ہوگا اور احمدیوں کے خلاف غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ آپ نے یہ بھی لکھا۔ کہ اگر اس قسم کا پروپیگنڈا جاری رہا تو مجلس احرار کو ایک دفعہ رسمی تنبیہ کرنی پڑے گی۔ یہ یادداشت چیف سکرٹری اور پھر وزیر اعلیٰ کے ملاحظہ میں لائی گئی جنہوں نے اس پر دستخط کر دیئے۔ لیکن جب فائل واپس اے۔ ڈی۔ آئی جی کے پاس پہنچی تو انہوں نے یہ لکھا کہ اس کیس کے متعلق کوئی احکام تو صادر نہیں کئے گئے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کسی اقدام کا منشا نہیں رکھتی۔

یوم تشکّر

احرار نے اپنی قرار داد لاہور (جنوری ۱۹۴۹ء) کے رو سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ مجلس احرار ایک خالص مذہبی جماعت بن جائے اور تمام سیاسی معاملات میں مسلم لیگ کی امداد و اعانت کیا کرے۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کی حمایت کرینگے بشرطیکہ لیگ کا نامزد کردہ امیدوار احمدی نہ ہو۔ انتخابات کا ہنگامہ ابتدائے سرما ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا۔ اور نتائج مارچ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئے۔ مسلم لیگ نے بہت بڑی اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ مسلم لیگ نے بعض احمدیوں کو اپنے امیدواروں کی حیثیت سے نامزد کیا تھا۔ لیکن وہ سب کے سب ہار گئے۔ احرار کی اپنی سرگرمیاں دوران انتخاب میں کچھ اُلجھی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ مسٹر دولتانہ کی شہادت سے ظاہر ہے کہ اگرچہ احرار نے بعض مسلم لیگی امیدواروں کی تائید کی لیکن بعض کی مخالفت بھی کی۔ حالانکہ وہ احمدی نہ تھے۔ مسلم لیگی وزارت ابتدائے اپریل ۱۹۵۱ء میں برسر اقتدار آئی۔ مسٹر دولتانہ وزیر اعلیٰ قرار پائے۔

چونکہ مجلس قانون ساز میں کوئی احمدی منتخب نہ ہوا تھا۔ اس لیے احراریوں نے اعلان کیا کہ ایک یوم تشکر منایا جائے گا تاکہ اس فتح پر خوشی منائی جائے۔ جو ہم نے اپنے مخالفین پر حاصل کی ہے۔ یہ یوم" مارچ سے لیکر مئی ۱۹۵۱ء تک مختلف مقامات پر مختلف ایام میں منایا گیا۔ لائل پور میں یہ یوم ۲۰۔ اپریل ۱۹۵۱ء کو منایا گیا۔ جہاں ایک بہت بڑے جلسے میں غلام نبی جانباز نے ایک احمدی دکاندار فضل دین کو دھمکی دی۔ کہ تمہارا حشر بُرا ہوگا۔ چنانچہ ۷۔ مئی کو دن دہاڑے اس دکاندار پر اسکی دکان کے اندر ہی حملہ کیا گیا۔ ۱۳۔ مئی کو ایک ہجوم نے سمندری میں ایک احمدی مسجد کو آگ لگا دی اور نمازیوں کو زد و کوب کیا۔

گوجرانوالہ میں اس یوم کا اشتہار ۲۹۔ کو دیا گیا اور جلسہ ۳۰۔ مارچ ۱۹۵۱ء کو منعقد ہوا۔ جس انداز سے اس جلسے کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ اسکی وجہ سے ایک احمدی اور ایک غیر احمدی کے درمیان جھڑپ ہوگئی جس میں غیر احمدی زخمی ہوا۔

لاہور میں "یوم تشکر" ۲۵۔ ۲۶۔ مئی ۱۹۵۱ء کو منایا گیا۔ چونکہ اس سے قبل سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں اور محمد علی جالندھری نے جامع رشیدیہ منٹگمری میں احمدیوں پر سازش راولپنڈی میں شریک ہونے کا الزام لگایا تھا۔ اور اس سلسلے میں میجر جنرل نذیر احمد کا نام خاص طور پر لیا تھا۔ اسلیئے احرار لیڈروں کو یہ تنبیہ کی گئی۔ کہ اگر اس الزام کا اعادہ کیا گیا۔ تو ایک بے قصور جماعت کے خلاف متشدد مخالفت کا جذبہ بھڑک اٹھے گا اور جو مقرر اس موضوع کی طرف کوئی اشارہ کرے گا اس پر توہین عدالت کا مقدمہ چلایا جا سکے گا۔ چنانچہ مسٹر قربان علی خاں، انسپکٹر جنرل پولیس نے ۲۳۔ مئی ۱۹۵۱ء کو ماسٹر تاج الدین انصاری کو طلب کر کے تنبیہ کر دی۔ کہ اس موضوع پر کچھ کہا گیا تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

یوم منانے کے سلسلے میں پہلے دن تمام پنجاب اور صوبہ سرحد کے اضلاع پشاور و سرگودھا اور ہزارہ کے احراری رضاکاروں نے دستے لاہور کے بازاروں سے بشکل جلوس گزرے۔ ان کے ساتھ پانچ بینڈ باجے بھی تھے۔ شام کو جلسہ ہوا جس میں بہت سے معززین مثلاً مسلم لیگی۔ ایم۔ ایل۔ اے اور عہدہ دار بھی شامل تھے۔ احرار لیڈروں

نے تقریریں کیں ۔ صاحبزادہ فیض الحسن نے اپنی تقریر میں مطالبہ کیا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے ۔ یا انہیں مجبور کیا جائے کہ اس ملک کو چھوڑ دیں اور بھارت میں آباد ہو جائیں ۔ مولانا احمد علی نے جو جلسے کی صدارت کر رہے تھے ایک قرار داد پیش کی جس میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ احمدیوں کو ذمہ دار عہدوں سے موقوف کر دے ۔ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے میجر جنرل نذیر احمد کی گرفتاری کا ذکر کر کے کہا کہ اس گرفتاری نے "یوم تشکر" کو "یوم تفخر" بنا دیا ہے ۔ کیونکہ مملکت ایک بہت بڑے خطرے سے بچ گئی ہے ۔ بخاری نے حسب معمول اپنے مبتذل اور پست مزاح سے کام لیکر کہا کہ میجر جنرل نذیر احمد ننگا ہو گیا ہے ۔ اب احمدی اس کو نئی پتلون پہنائیں ۔ اس نے یہ بھی کہا ۔ کہ میجر جنرل نذیر احمد کو مرزا بشیر الدین محمود احمد نے اکسا کر سازش میں شامل کرایا ہے ۔ بخاری نے اس جلسے کے حاضرین سے جو نعرے لگوائے ۔ وہ حسب ذیل تھے :۔

"نمک حرامانِ پاکستان مردہ باد" "غدارانِ پاکستان مردہ باد" "پاکستان زندہ باد"
"مرزا بشیر الدین محمود احمد مردہ باد" "مرزائیت مردہ باد"

۲۶ ۔ مئی کے جلسے میں قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے پھر مقدمہ سازش راولپنڈی کا ذکر کیا اور شیخ حسام الدین نے اعلان کیا کہ احمدی جو مسلمانوں کے قومی اتحاد کے لئے ایک خطرہ ہیں ۔ کلیدی عہدوں سے موقوف کئے جانے چاہئیں ۔ شیخ حسام الدین اور علامہ علاؤ الدین صدیقی نے چودھری ظفر اللہ خاں کے متعلق توہین آمیز کلمات کہے اور ان کی موقوفی کا مطالبہ کیا ۔ اس دن بھی ایک جلوس نکالا گیا ۔

جب حسب معمول اس جلسے کی تقریروں کی روداد چیف منسٹر کی خدمت میں پیش کی گئی تو انہوں نے اس پر ذیل کی معنی خیز رائے لکھی :۔

"احرار ایک ایسے مسئلے سے فائدہ اٹھا کر جس کو پاکستانی عوام میں واضح مقبولیت حاصل ہے اپنے لئے محض سیاسی موقف و مقام پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ہمیں اس امر پر گہری نظر رکھنی چاہیئے کہ یہ معاملہ ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہو"

احمدیوں کی مسجد جلا دی گئی

امیر جماعت احمدیہ بھیرہ نے فضیلت مآب گورنر جنرل پاکستان کی خدمت میں ایک تار بھیجا جس میں شکایت کی کہ سمندری میں احمدیوں کی ایک مسجد جلا دی گئی ہے ۔ اور وہاں پر امن نمازیوں کو بیدردی سے زدو کوب کیا گیا ہے ۔ وزارت داخلہ نے اپنی چٹھی نمبری (1) 51/1/77-Poll مورخہ ۲۸ ۔ مئی ۱۹۵۱ء کے ساتھ اس تار کی ایک نقل چیف سکرٹری حکومت پنجاب کو بھیجکر استدعا کی کہ اس واقعہ کی روداد اور اس پر حکومت پنجاب کا تبصرہ جلد از جلد ارسال کیا جائے ۔ اس چٹھی کے جواب میں سید احمد علی ہوم سکرٹری حکومت پنجاب نے مندرجہ ذیل چٹھی نمبری BDSB - 7 - 8 مورخہ ۲۸ ۔ جون ۱۹۵۱ء لکھی :۔

"بحوالہ آپ کی چٹھی نمبری (1) Poll ۔ 51/1/77 مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۵۱ء مجھے یہ اطلاع دینے کی ہدایت کی گئی ہے کہ ۱۳ ۔ مئی ۱۹۵۱ء کی سہ پہر کو قصبہ سمندری ضلع لائل پور کے غیر احمدیوں (احراریوں) کا ایک ہجوم

جمع ہوا۔ اور اس نے ایک کچی مسجد کی چھت اور اسکی چٹائیوں کو آگ لگادی۔ یہ مسجد ایک کمرے اور ایک چبوترے پر مشتمل ہے۔ اور ڈسٹرکٹ بورڈ سکول کے نواح میں اراضی متروکہ پر بنائی گئی ہے۔ احمدی جماعت کے چند افراد اس وقت وہاں موجود تھے۔ جو نشانہ زدوکوب بنائے گئے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ سکول کے ایک چپراسی نے توہین مسجد اور آتش زنی کی اطلاع مقامی پولیس کو پہنچائی۔ اور پولیس فوراً موقع پر پہنچ گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی بلا تاخیر موقع پر پہنچ گئے۔ اور صورت حالات پر قابو پالیا گیا۔ چودہ قانون شکن اشخاص بحالت ارتکاب جرم گرفتار کرلئے گئے۔ کچھ دیر بعد چھ اور اشخاص گرفتار کئے گئے۔ اور تفتیش کی تکمیل کے بعد مقدمہ عدالت میں دائر کردیا گیا۔ مقامی حکام کی فوری اور مستعدانہ کارروائی نے صورت حالات کو بگڑنے سے بچالیا اور اب فضا بالکل پرسکون ہے۔

جن اشخاص نے پولیس کو ابتدائی رپورٹ دی انہوں نے واقعہ کے متعلق مبالغہ آمیز بیان دیا اور بعض بیگناہوں کو بھی لپیٹ لیا۔ جن میں سے دو محکمہ مال کے ملازم ہیں تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے ارتکاب جرم میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور انکے خلاف الزامات بے بنیاد ہیں۔ مزید حالات و کوائف سے مناسب وقت پر اطلاع دی جائے گی"۔

احراریوں کی دوسری تقریریں

۲۵۔ ۲۔ اگست ۱۹۵۱ء کو مسٹر بشیر احمد امیر جماعت احمدیہ لاہور نے ڈپٹی کمشنر لاہور کے نام ایک چٹھی لکھی جس میں سید عطا اللہ شاہ بخاری کی ایک تقریر کے متعلق شکایت کی۔ یہ تقریر ۱۹۔ اگست ۱۹۵۱ء کو بیرون موچی دروازہ لاہور ایک بہت بڑے جلسہ عام میں کی گئی تھی۔ جس میں مقرر نے بیان کیا تھا کہ :۔

(الف) چودھری ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ پاکستان مملکت کے وفادار نہیں ہیں۔

(ب) تقسیم سے قبل جماعت احمدیہ کے امام نے اپنے پیروؤں کو بتایا تھا کہ پاکستان وجود میں نہیں آئیگا اور اگر کوئی اس قسم کی مملکت پیدا کر بھی لی گئی تو تقسیم شدہ ملک دوبارہ متحد ہو جائے گا۔

(ج) احمدی بھارت کی حکومت کے جاسوس ہیں اگر بھارت کے ساتھ جنگ چھڑ جائے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر احمدیوں کی بیخکنی کر دینی چاہیئے جو مملکت کے دشمن ہیں۔

یہ چٹھی کمشنر کی یادداشت کے ساتھ ہوم سکرٹری (سید احمد علی) کو بھیجی گئی۔ جنھوں نے یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو اس پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا:۔

"میں نے اس معاملے کے متعلق چیف منسٹر صاحب سے گفتگو کی ہے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں انسپکٹر جنرل پولیس سے استدعا کردوں۔ کہ وہ احرار لیڈروں تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ اپنی تقریروں میں وزیر خارجہ کے متعلق" اور علے العموم جماعت احمدیہ کے متعلق اپنے حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ اب تک ایک بلوہ اور قتل ہو چکا ہے۔ ایک احمدی کے منہ پہ کالک مل کر اسے گدھے پر سوار کرایا گیا ہے اور ان کی ایک مسجد جلائی جا چکی ہے۔ اگر اب احراری اپنی اشتعال انگیز تقریریں بند نہ کردیں گے تو اس کا

نتیجہ یہ ہوگا کہ قانون و انتظام برباد ہو جائے گا۔ ماضی میں انہیں متعدد بار تنبیہ کی جا چکی ہے۔ اب انہیں آخری دفعہ یہ بتا دینا چاہیئے کہ حکومت انہیں ان اشتعال انگیز تقریروں سے روکنا چاہتی ہے جن سے صوبے کے امن و امان میں خلل پڑنے کا احتمال ہے۔ اگر انہوں نے اس تنبیہ پر عمل نہ کیا تو حکومت اپنے احکام کی تعمیل کرانے کے لئے تمام تدابیر اختیار کرے گی۔ اور نتائج کی ذمہ داری خود احرار ہی پر عائد ہوگی۔

میں نے ڈپٹی کمشنر سے درخواست کی ہے کہ وہ مسٹر بشیر احمد ایڈووکیٹ کو بتا دیں کہ انہیں وہ انتقامی جلسہ منعقد نہ کرنا چاہیئے جو وہ کل کرنا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ اس حکم کی تعمیل کریں گے۔ لیکن اگر نہ کریں تو اس جلسے کو روکنے کے لئے زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کارروائی کرنی ہوگی۔

جب یہ کیس مسٹر قربان علی خاں انسپکٹر جنرل پولیس کے پاس پہنچا تو انہوں نے لکھا:۔

"میں نے بالائی یادداشت میں بیان کردہ پوری صورت حالات شیخ حسام الدین جنرل سکرٹری مجلس احرار پاکستان کو سمجھا دی ہے۔ اور وہ سمجھ گئے ہیں کہ امن و انتظام کی حالت پر (خصوصاً اس مرحلے پر) اشتعال انگیز تقریروں سے کیا اثر مترتب ہونے کا احتمال ہے۔ اور انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ جس حالت میں ملک کو ایک بحران کا سامنا ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اہل پاکستان کے تمام طبقوں اور گروہوں کا اتحاد ضروری ہے ہماری یہ پالیسی ہرگز نہیں کہ نزاع و اختلاف کی صورت پیدا کریں۔ شیخ حسام الدین نے مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ جلد سے جلد مجلس عاملہ احرار کا ایک ضروری اجلاس طلب کر کے ان امور پر گفتگو کریں گے جو میں نے ان کو بتائے ہیں اور اپنے ممبروں کو اس ضرورت کا احساس دلائیں گے کہ انہیں اپنی عام تقریروں میں محتاط رہنا چاہیئے۔

یہ یادداشت شیخ حسام الدین کو پڑھ کر سنا دی گئی ہے۔ بلکہ یہ دراصل جزوی طور پر انہی کی لکھوائی ہوئی ہے۔"

یہ کیس ۲۔ستمبر ۱۹۵۱ء کو چیف منسٹر کی خدمت میں بغرض اطلاع ارسال کر دیا گیا۔

۴۔ستمبر ۱۹۵۱ء کو وزارت داخلہ نے چیف سکرٹری حکومت پنجاب کو ایک چٹھی ڈی۔او نمبر 51/(1)-S-720 ارسال کی جس میں لکھا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے گزشتہ اگست میں کسی دن موچی دروازے کے ایک جلسۂ عام میں . . . . . . تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ چودھری ظفر اللہ خاں وزیر امور خارجہ قادیان کی خاطر کشمیر کو حکومت ہند کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں"۔ آیا یہ اطلاع درست ہے؟ اس چٹھی میں یہ تجویز کیا گیا کہ بخاری اور دوسرے احراری لیڈروں کو صاف الفاظ میں تنبیہ کرنی چاہیئے کہ وہ وزیر امور خارجہ کو اور بالعموم احمدیوں کو بدنام کرنے سے اجتناب کریں۔ اس کے جواب میں چیف سکرٹری نے مندرجہ ذیل D.O نمبر 11794-BDSB مورخہ ۱۹۔ستمبر ۱۹۵۱ء وزارت امور خارجہ کو ارسال کی:۔

"بحوالہ آپ کی ڈی او چٹھی نمبری 51/(1)-S-720 مورخہ ۴۔ستمبر ۱۹۵۱ء عرض ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۱۹۔اگست ۱۹۵۱ء کو موچی دروازے کے باہر ایک جلسۂ عام میں تقریر کی تھی۔ اس نے جماعت احمدیہ کے خلاف توہین آمیز باتیں کیں اور کہا کہ مرزا بشیر الدین محمود پاکستان کے قیام کے مخالف تھے اور

انہوں نے علی الاعلان ہندوستان کو اکھنڈ بنانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ بیان عزت مآب چودھری ظفر اللہ خاں کے سامنے دیا گیا تھا لیکن انہوں نے اسکی تردید نہیں کی تھی۔ حکومت صوبہ اُن شرارت آمیز تقریروں کی طرف برابر متوجہ ہے جو احراری لیڈر کر رہے ہیں۔ ابھی یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو انسپکٹر جنرل پولیس نے شیخ حسام الدین جنرل سکرٹری مجلس احرار کو طلب کر کے واضح طور پر تنبیہ کی تھی۔ اور شیخ حسام الدین نے انسپکٹر جنرل پولیس کو یقین دلایا تھا کہ انکی جماعت کی پالیسی یہ نہیں کہ اختلافات پیدا کئے جائیں۔ خصوصاً اس موقع پر جب ملک ایک نازک حالت سے دوچار ہے۔ مزید براں انہوں نے ذمہ لیا کہ وہ جلد سے جلد مجلس عاملہ کا ایک اجلاس طلب کریں گے تاکہ ممبروں کو تقریروں میں ضبط و تحمل اختیار کرنے کی تلقین کریں۔ اس واضح اور قطعی یقین دہانی کے پیش نظر حکومت صوبہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو ایک دفعہ اور تنبیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ صورت حالات پر نگاہ رکھی جا رہی ہے۔ اور اگر معلوم ہوا کہ تنبیہ کی تعمیل نہیں ہوئی تو مناسب اقدام کیا جائے گا۔

۲۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کو سپرنٹنڈنٹ پولیس سرگودھا نے اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس کو اطلاع دی۔ کہ ۲۲ - اور ۲۳ ستمبر ۱۹۵۱ء کو جامع مسجد بھلوال کے اندر ایک جلسہ ہوا جس میں دو احراری کارکنوں نے جن کے نام حبیب الرحمن اور مولوی محمد حیات ہیں۔ فرقہ احمدیہ کے خلاف زہریلی تقریریں کیں۔ مسٹر انور علی ڈی۔ آئی جی۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے ان تقریروں کا معائنہ کرنے کے بعد ۳ - اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لکھا کہ یہ تقریریں صرف خلاف قانون ہی نہیں بلکہ قابل اعتراض بھی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی کمیٹی مجلس احرار کے کارکنوں نے اپنے اس وعدے کے مطابق جو شیخ حسام الدین نے مسٹر قربان علی سے کیا تھا۔ اپنے اضلاعی ورکروں کے نام کوئی ہدایات جاری نہیں کیں۔ مسٹر انور علی نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ہدایت کی کہ مقامی احرار پارٹی کے لیڈروں کو طلب کر کے انہیں تنبیہ کریں۔ مسٹر قربان علی خاں نے اس کارروائی کی تائید کی اور لکھا کہ

"اگر وہ لوگ تنبیہ پر عمل نہ کریں تو ان کے خلاف فوراً قانونی کارروائی کی جائے۔ ہمارا یہ اقدام اب بالکل حق بجانب ہوگا کیونکہ ان کے لیڈروں کے نام ضروری تنبیہات جاری کی جا چکی ہیں اور وہ وعدہ کر چکے ہیں کہ اس قسم کی تقریریں کر کے ملک کو تباہ نہ کرینگے"

پالیسی اور تدابیر

اس وقت تک چونکہ مرکزی حکومت کو شدید فرقہ دارانہ اختلافات اور احمدیوں۔ ان کے لیڈروں اور ان کے عقیدوں کے خلاف حملوں کے متعلق کافی اطلاعات پہنچ چکی تھیں اسلئے مرکزی حکومت خاصی مشوش ہو رہی تھی۔ چنانچہ وزارت داخلہ نے ۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کو مندرجہ ذیل چٹھی چیف سکرٹری حکومت پنجاب کو لکھی:-

"ایسے واقعات رونما ہو چکے ہیں کہ مختلف مسلمان فرقوں کے افراد نے ایک دوسرے کے خلاف قابل اعتراض پروپیگنڈا کیا ہے جس سے طرفین کی دل آزاری ہوئی ہے اور انتہائی صورتوں میں بعض اشخاص کے خلاف تشدد

بھی کیا گیا ہے۔ اس قسم کی شورش کا ایک نمونہ وہ ہے جو پنجاب میں احمدی و احراری نزاع کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ مرکزی حکومت کا خیال ہے کہ بلا شبہ کسی جماعت اور فرقے کے اس جائز حق پر نا واجب پابندی عاید نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے عقاید مذہبی کی تبلیغ کرے۔ اور اس معاملے میں مختلف عقاید کے مبلّغوں کے درمیان کسی قسم کا فرق و امتیاز ملحوظ نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن مذہبی مناظروں اور مناقشوں کو معقول حدود کے اندر محدود رکھنا چاہیئے۔ اور انہیں ایسے نقطہ پر پہنچنے کی اجازت نہ دینی چاہیئے کہ امن و سکون عامہ خطرے میں پڑ جائے۔ مرکزی حکومت کی رائے میں جنگجویانہ اور جارحانہ فرقہ آرائی کو سختی سے دبا دینا ضروری ہے۔

مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں کسی ایسے اقدام کے متعلق جو آپ اپنے دائرۂ نظم و نسق میں ضروری سمجھیں۔ مرکزی حکومت کے خیالات آپ تک پہنچا دوں"۔

اس چٹھی کے موصول ہونے پر مسٹر انور علی ڈی۔ آئی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے صوبے کی فرقہ وارانہ پوزیشن کے متعلق یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء کو حسب ذیل یادداشت لکھی:۔

"احراری شائستگی کے حدود سے تجاوز کر چکے ہیں اور احمدیوں کے خلاف ناپاک حملے کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ احمدیوں کے خلاف تشدد کے لئے اشتعال انگیزی کے بھی ذمہ دار ہیں۔ اوکاڑہ میں احرار کی تقریروں سے جو نفرت پیدا ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک احمدی ہلاک کر دیا گیا۔ اوکاڑہ کے قریب ایک گاؤں میں احمدی مبلّغین کو راستے میں روک کر ان کے چہروں پر کالک مل دی گئی۔ راولپنڈی میں بھی ایک احمدی مارا گیا۔ گو اب تک واضح طور پر یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ یہ قتل فرقہ وارانہ تھا۔ سمندری میں احمدیوں کی ایک مسجد آگ لگا کر خاکستر کر دی گئی۔ کوئی تین سال ہوئے ایک نوجوان P.A.M.C ڈاکٹر پر جو احمدی تھا کوئٹہ میں حملہ کیا گیا۔ اور اس کو سنگسار کر دیا گیا۔ تشدد کے ان تمام واقعات کی ذمہ داری احراریوں پر ہے۔

۲۔ شیعہ سنی اختلافات کی اطلاعات بھی صوبے کے مختلف حصوں سے موصول ہوئی ہیں۔ ضلع شاہ پور کا نجرا میں پہلا واقعہ جس میں شیعہ فرقہ وار تشدد کا شکار ہوئے۔ یہ تھا کہ ایک عورت اور تین سال کا ایک بچہ مارے گئے۔

۳۔ گوجرانوالہ میں اہل سنت اور وہابیوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی۔ اختلاف اس مسئلے پر تھا کہ ماہ رمضان میں تراویح کی کتنی رکعتیں پڑھنی چاہئیں۔

۴۔ فوری مسئلہ یہ ہے کہ احرار کے متعلق کیا کیا جائے۔ ان کو ایک دفعہ تنبیہ کی جا چکی ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ اگر وہ اس تنبیہ پر توجہ نہ کریں۔ تو ان کے خلاف مضبوط اقدام کرنا چاہیئے۔ حکومت کو یہ بھی چاہیئے کہ سنیوں اور شیعوں کے درمیان حسن تعلقات پیدا کرنے کے لئے ہر تدبیر عمل میں لائے"۔

اس مسئلہ پر ۴۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو مسٹر قربان علی خاں انسپکٹر جنرل پولیس نے حسب ذیل یادداشت لکھی:۔

"آج صبح ایک اور تحریک پر میں نے ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو مشورہ دیا ہے کہ اگر احرار بار بار کی تنبیہ کے باوجود اشتعال انگیز تقریریں کرنے سے باز نہ آئیں تو مقامی حکام حسب قانون ان کے خلاف کارروائی کریں۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اب حکومت کو فرقہ دار پروپیگنڈا کرنے والے تمام اشخاص اور گروہوں کے خلاف مضبوط اقدام کرنا چاہیئے"۔

اس مرحلے پر فرقہ وارانہ مناقشوں نے اور بھی زیادہ مکروہ شکل اختیار کر لی۔ کئی مقامات پر سُنی شیعہ اختلافات پیدا ہونے اور بڑھنے لگے مثلاً کرشن نگر لاہور میں ایک امام باڑے کی تعمیر پر جھگڑا ہوا۔ اور کھگڑ میں ایک تعزیے کے جلوس پر امن شکنی کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا۔ لاہور سے سات میل دور شاہ پور کانجرا میں شیعہ سُنی فساد ہو گیا جس میں دو شیعہ مارے گئے۔ ان میں ایک عورت تھی اور ایک تین سال کا بچہ تھا۔ جب حکومت کو ان مناقشوں کی اطلاع ملی تو سید احمد علی ہوم سکرٹری نے ۲۹ ستمبر ۱۹۵۱ء کو حسب ذیل یادداشت لکھی:۔

" اس قسم کی مذہبی دیوانگی کے متعلق موجودہ حکومت کی پالیسی سب پر ظاہر کی جا چکی ہے۔ اب اے عامہ کے رہنماؤں کا فرض ہے کہ اس کو روکنے کے لئے موثر تدابیر اختیار کریں۔ ہمارے سامنے بہت زیادہ اہم کام ہیں۔ اور ہم یقیناً روا نہیں رکھیں گے کہ لوگ اپنے آپ کو مذہبی جھگڑوں میں تباہ و برباد کر لیں۔ جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے اسے قدرت کی طرف سے ایک اشارہ سمجھنا چاہیئے۔ اگر ہم ان جاہل لوگوں کو ایک دوسرے کے گلے کاٹنے اور دشمنوں کو مسرور و مطمئن کرنے سے نہیں روکیں گے تو پھر ہمارا خدا ہی حافظ ہے۔"

چیف سیکرٹری نے پوری صورت حالات پر غور کرنے کے بعد ۳۔ نومبر ۱۹۵۱ء کو مندرجہ ذیل ڈی۔او نمبری 537613/اے-HG.7505 پنجاب کے تمام ڈپٹی کمشنروں کے نام بھیجی:۔

" مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ میں یہ عرض کروں کہ بہت سے ایسے واقعات حکومت کے علم میں آئے ہیں۔ جن میں مختلف فرقوں کے مسلمان افراد نے ایک دوسرے کے خلاف قابل اعتراض پروپیگنڈا کیا ہے جس سے ایک دوسرے کی دل آزاری مقصود ہے اور جس کا نتیجہ اکثر شخصی تشدد کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اسکی بیّن مثالیں شیعہ سنی اختلافات اور احمدی احراری نزاع میں پائی گئی ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ بعض اوقات بعض مقامی افسروں نے بھی ان نزاعات میں جانب داری کا ثبوت دیا ہے۔ مختلف فرقوں کے درمیان ان اختلافات کی وجہ سے صوبے میں اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ اور حکام کے لئے گہری تشویش کا باعث ہے۔ حکومت کا خیال ہے کہ بلاشبہ کسی جماعت اور فرقے کے اس جائز حق پر ناواجب پابندی عائد نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے عقائد مذہبی کی تبلیغ کرے۔ اور اس معاملے میں مختلف عقاید کے مبلّغوں کے درمیان کسی قسم کا فرق و امتیاز ملحوظ نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن مذہبی مناقشوں کو معقول حدود کے اندر محدود رکھنا چاہیئے۔ اور انہیں ایسے نقطے پر پہنچنے کی اجازت نہ دینی چاہیئے کہ امن و سکونِ عامہ خطرے میں پڑ جائے۔ لہٰذا حکومت ہدایت کرتی ہے کہ جھگڑا اور جارحانہ فرقہ آرائی کو ہر حال میں سختی سے دبایا جائے۔

۲۔ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ

(الف) جب کبھی اشتعال انگیز فرقہ دارانہ تقریروں کی وجہ سے فساد کا احتمال ہو یا کوئی ایسا رویہ علم میں آئے جس سے فرقہ دارانہ کشیدگی پیدا ہوتی ہو تو مقامی افسروں کو مضبوط اقدام کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے انہیں ان امتناعی احکام سے مدد لینی چاہیئے جو قانون فوجداری میں مہیا کئے گئے ہیں۔

(ب) اگر یہ معلوم ہو کہ بعض مقامی افسر خود کسی مناقشہ میں شامل ہیں اور تحقیقات سے ثابت ہو جائے کہ انہوں نے فساد انگیزی میں کسی فریق کے ساتھ شرکت کی ہے تو ایسے افسروں کے خلاف سخت

سے سخت کارروائی کی جائے۔
(ج ج) اضلاع کے افسروں کو چاہیئے کہ مذہبی جنون کے خلاف اور مذہبی رواداری کے حق میں جو اسلام نے سکھائی ہے تبلیغ وہدایت کرنے میں مقامی انجمنوں کی تائید اور ان کا تعاون حاصل کریں۔

اس چٹھی کی تاریخ سے پندرہ دن کے اندر اندر سپرنٹنڈنٹ پولیس لائل پور نے اپنے لاسلکی پیغام مورخہ ۱۸۔ نومبر ۱۹۵۱ء میں اطلاع دی کہ لائل پور میں احمدیوں نے سیرت النبیؐ کا جلسہ کیا جسکو احراریوں نے درہم برہم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریقوں میں فساد ہو گیا اور فریقین کے کئی آدمی زخمی ہو گئے۔

بخاری کی مزید تقریریں

احراریوں کی ایک کانفرنس جس کا نام صوبہ کانفرنس" یا "ختم نبوت کانفرنس" یا "دفاع کانفرنس" تھا اس کے متعلق اعلان کیا گیا کہ ۲۴۔ اور ۲۵ نومبر ۱۹۵۱ء کو اوکاڑہ ضلع منٹگمری میں ہو گی۔ مقامی پولیس افسروں نے تجویز کی کہ یہ جلسہ ممنوع قرار دیا جائے۔ چیف منسٹر نے یہ تجویز منظور کر لی۔ لیکن اسی اثنا میں ڈپٹی کمشنر مسٹر چیمہ نے احرار سے ایک تصفیہ کر لیا۔ اور نہ صرف انہیں جلسے کے انعقاد کی اجازت دے دی بلکہ خود اس کی صدارت کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر چیمہ نے اصرار کیا کہ اس کانفرنس کے انعقاد کی اجازت دے دی جائے چنانچہ حکومت نے بھی اُن سے اتفاق کر لیا۔ لیکن مقامی پولیس افسروں کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے۔ کیونکہ ایک اجلاس میں جو مسٹر چیمہ کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے یہ کہہ دیا کہ قائد ملت کے قتل میں (جو گزشتہ اکتوبر میں ہوا تھا) احمدیوں کا ہاتھ تھا۔ اس سے اگلے دن مسٹر فیض محمد خاں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی جلسے میں شامل ہو کر ایک مختصر تقریر کی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری نے حسب عادت ایک طول طویل تقریر کی جس میں اس نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کے اس بیان کا ذکر کیا کہ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد بھی ملک کو اکھنڈ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اور ساتھ ہی کہا کہ یہ کوشش غداری ہے اور ایک غدار ایک کروڑ خنزیروں سے بدتر ہے۔

مسٹر چیمہ کے عمل کو مثال بنا کر ڈپٹی کمشنر مظفر گڑھ بھی ۲۸۔ ۲۹۔ نومبر ۱۹۵۱ء کو مظفر گڑھ کی ایک دفاع کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اور ڈپٹی کمشنر گجرات نے بھی درخواست کی کہ انہیں اپنے ضلع میں ایک ایسے ہی جلسے کی صدارت کی اجازت دی جائے۔ لیکن یہ درخواست نامنظور کر دی گئی۔ مسٹر چیمہ کے عمل کو بھی حکومت نے پسندیدہ قرار نہ دیا۔ اور اس مسئلہ پر اُن کے اور حکومت کے درمیان طویل خط وکتابت جاری رہی۔

۲۲۔ نومبر ۱۹۵۱ء کو مسٹر بشیر احمد امیر جماعت احمدیہ لاہور نے چیف سکرٹری کو ایک چٹھی لکھی جس میں شکایت کی کہ گزشتہ ماہ ستمبر میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں ایک انتہائی شعلہ بار تقریر کی ہے۔ اسی چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ ملتان اور لاہور میں احمدی جماعت نے سیرت النبی کے دو جلسے منعقد کئے جن میں تمام فرقوں کے خطیبوں کو دعوت دی کہ آکر پیغمبر خدا صلعم کی حیات طیبہ پر تقریریں کریں لیکن ان جلسوں میں رکاوٹ پیدا کی گئی۔ مسٹر بشیر احمد نے یہ بھی لکھا کہ مذہبی عدم رواداری قائد ملت کے قتل کی شکل میں بھی ظاہر ہو چکی

ہے اور شیعہ سنی تصادم اور عیسائیوں پر حملے کے واقعات بھی اسی جذبے کی پیداوار ہیں۔ اگر اسکو روکا نہ گیا تو ناگوار واقعات اتنی وسعت اختیار کر لیں گے کہ کارکنانِ حکومت کے لئے مستقل دردِ سر کا باعث ہو جائیں گے مملکت کی رعایا کے ہر فرد کو اپنے مذہب کے اعلان اور اسکی تبلیغ کی آزادی ہونی چاہیئے۔ حکومت سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس معاملے میں ایک قطعی اور واضح پالیسی وضع کرے اور پھر اس پر عمل بھی کرائے۔ مسٹر بشیر احمد نے شکایت کی کہ یا تو حکومت اس مسئلے کے متعلق کوئی پالیسی ہی نہیں رکھتی یا اس پالیسی کے چلانے کے ذمہ دار حکام سنجیدگی سے عمل نہیں کرتے۔ اس لئے حکومت کو چاہیئے کہ اس تمام پوزیشن پر نہایت تحقیق کے ساتھ غور کرے۔

چیف سکرٹری نے اس درخواست پر مسٹر قربان علی خاں انسپکٹر جنرل پولیس کی رائے دریافت کی جس پر خان صاحب نے ایک مختصر لیکن واضح نوٹ لکھا۔ اور بیان کیا کہ مجھے مسٹر بشیر احمد کی عرضداشت کے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے۔ اور حکومت کا فرض ہے کہ بلا امتیاز عقیدہ مذہبی ہر شخص کو دوسروں کے جارحانہ عمل سے محفوظ رکھے۔ اور یہ مقصد صرف اس طریق سے حاصل ہو سکتا ہے کہ ایک مضبوط پالیسی کا فیصلہ کیا جائے۔ اضلاع کے افسروں کے نام واضح ہدایات صادر کی جائیں۔ اور جس قدر جلد یہ تدبیر اختیار کی جائے اسی قدر حکام و عوام دونوں کے لئے بہتر ہوگا۔

انہی دنوں میں سپرنٹنڈنٹ پولیس مظفر گڑھ نے اپنی ہفتہ وار خفیہ ڈائری (بابت ہفتہ مختتمہ ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء) میں ایک اور واقعہ کی اطلاع دی۔ اطلاع یہ تھی۔ کہ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو علی پور میں زیر اہتمام جماعت احرار ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں واحد مقرر سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ بخاری نے اپنی تقریر میں کہا کہ مرزائیوں نے تقسیم کو رضامندی سے قبول نہیں کیا۔ وہ ایک دفعہ پھر بھارت سے متحد ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔ یہ پاکستان کے غدار ہیں اور بھارت کے جاسوسوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مرزائی جاسوس لاہور میں پکڑا گیا ہے جو ایک ہندوستانی جاسوس گوپال داس سے ساز باز کر رہا تھا۔ مسٹر خدا بخش ایس پی (ر پی) نے اس اطلاع کو پڑھ کر ڈی۔ آئی۔ جی کے پاس بھیجدیا اور لکھا کہ جو تنبیہ ایک دفعہ صدر مجلس احرار ماسٹر تاج الدین انصاری کو اور پھر مولوی مظہر علی اظہر جنرل سکرٹری کو کی گئی تھی اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ڈی۔ آئی۔ جی مسٹر انور علی نے پھر ۷۔ نومبر ۱۹۵۱ء کو ایک لمبی یادداشت لکھی جس میں اُن تمام تنبیہات کا ذکر کیا جو گورنر صاحب۔ چیف سکرٹری۔ مشیر برائے قانون اور انسپکٹر جنرل پولیس نے احراری لیڈروں کو (بشمول شیخ حسام الدین) کی تھیں۔ پھر اُن غیر ذمہ دارانہ تقریروں کا حوالہ دیا۔ جو احرار نے اوکاڑہ میں کی تھیں جن کے نتیجے میں بعض احمدی مبلغین کے چہروں پر کالک مل دی گئی تھی اور ایک احمدی ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اسکے ساتھ ہی ذیل کی تجاویز بھی پیش کیں :۔

۱۔ ایک یا دو احراری لیڈروں کو جو مختلف جماعتوں کے درمیان نفرت پیدا کرتے رہے ہیں زبان بندی کا حکم دیا جائے۔ اور انہیں عام جلسوں میں تقریر کرنے سے روک دیا جائے۔

۲۔ متبادل تجویز یہ ہے کہ ایسے اشخاص کو اُن کے اپنے دیہات میں پابند مسکن کر دیا جائے۔ وہ حکومت

کی اجازت حاصل کئے بغیر کہیں باہر نہ جاسکیں۔

۳۔ ان پر قوموں کے درمیان منافرت انگیزی کے الزام میں زیر دفعہ ۱۵۳-الف مقدمات چلائے جائیں۔

آخر میں مسٹر انور علی نے بتا دیا۔ کہ جب تک کوئی شدید اقدام نہ کیا جائے گا۔ احراری لیڈر کسی شریفانہ سلوک سے متاثر نہ ہوں گے۔ جب یہ کیس مسٹر قربان علی خاں کے پاس پہنچا۔ تو انہوں نے ۱۴۔ نومبر ۱۹۵۱ء کو ساری صورت حال کا احتیاط سے جائزہ لیا اور لکھا کہ احرار نے اتنا کچھ کیا ہے کہ اب اُنکے خلاف شدید اقدام بالکل حق بجانب ہوگا۔ میں نے شیخ حسام الدین کو جو تنبیہ کی تھی اس کا کوئی اثر احرار پر نہیں ہوا۔ اب واضح ہے کہ تنبیہ بالکل بیکار ہے۔ اور اگر احرار بحیثیت جماعت کچھ مدت تک احمدیوں کو گالیاں دینے سے محترز بھی رہیں۔ تو بخاری ہرگز باز نہ آئے گا کیونکہ اس کا تو اس کے سوا اور کوئی وصف ہی نہیں۔ کہ وہ احمدیوں کو گالیاں دیتا ہے۔ اور ضدی اور ہٹیلا آدمی ہے۔ انہوں نے اپنا خیال حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا:۔

"لہٰذا جب تک بخاری کو عام جلسوں میں شرکت سے منع نہ کر دیا جائے۔ یا اسے کوئی اور شخص نہ بتا دیا جائے جسے وہ بر سرِ عام گالیاں دے کر اپنا شوق پورا کرے۔ وہ ہرگز احمدیوں کے خلاف اپنے معمول کو ترک نہ کرے گا۔ بلکہ اس سے بھی بدتر رویہ اختیار کرے گا۔ اگر اس کو عام جلسوں میں شامل ہونے اور تقریر کرنے سے روک دیا گیا۔ تو وہ اور اس کے رُفقا کوئی نہ کوئی نیا پلیٹ فارم پیدا کر کے پھر زندہ ہو جائیں گے اگر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ تو اس کی جماعت خواہ وہ آخری دموں ہی پر ہو۔ ایک نئی رُوح حیات حاصل کر لے گی۔ اربابِ سیاست کو فی الحقیقت اب یہ اندازہ کرنا چاہیئے۔ کہ ان دونوں میں سے کم درجے کی خرابی کونسی ہے۔ آیا احرار کے خلاف مضبوط اقدام کر کے ان کی ایجی ٹیشن کا سامنا کرنا بہتر ہوگا یا انہیں احمدیوں کے خلاف نفرت انگیز، خطرناک اور مکروہ پراپیگنڈا جاری رکھنے کی کُھلی چھٹی دے دینی چاہیئے۔ ذاتی طور پر میں اول الذکر طرز عمل اختیار کروں گا۔ اس سے نہ صرف احرار کا فتنہ رُک جائے گا۔ بلکہ قوم میں روا دارانہ کردار پیدا کرنے میں بہت بڑی مدد ملے گی"

یہ کیس چیف سکرٹری کے پاس گیا تو انہوں نے اسکو چیف منسٹر کی خدمت میں بھیجدیا۔ اور گزارش کی کہ انسپکٹر جنرل اور ڈی آئی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کو طلب کیجئے۔ اور میری موجودگی میں ان کے معروضات سُن لیجئے۔ چیف منسٹر صاحب کے سکرٹری نے یہ لکھکر فائل واپس بھیجدیا۔ کہ چیف منسٹر صاحب احراری لیڈروں سے خود گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب تک یہ گفتگو نہ ہولے کسی کارروائی کی ضرورت نہیں۔

۳۰۔ نومبر ۱۹۵۱ء کو احمدیوں کا ایک وفد مسٹر بشیر احمد کی درخواست کے سلسلے میں چیف سکرٹری سے ملا۔ مسٹر ایس عالمگیر نے جو اس ملاقات کے وقت موجود تھے۔ اس ملاقات کے واقعات کی ایک یادداشت تیار کی اور یکم دسمبر ۱۹۵۱ء کو چیف سکرٹری کے پاس بھیجدی۔ آپ نے لکھا کہ احرار احمدی نزاع روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اور اس میں مزید اضافہ ہونے کا احتمال ہے۔ لہٰذا گورنمنٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس اہم مسئلہ

کے مداوا کے لئے ایک قطعی پالیسی وضع کرے۔ کیونکہ قانون و انتظام پر اس کے اثرات نہایت سنگین ہیں۔ آپ نے چیف سکرٹری کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ چیف منسٹر صاحب احرار پارٹی کے لیڈروں سے گفتگو کرنے سے پیشتر چیف سکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈپٹی ہوم سکرٹری کو طلب کر کے اُن سے بات چیت کریں۔ چنانچہ ۶۔ دسمبر ۱۹۵۱ء کو چیف منسٹر چیف سکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈپٹی ہوم سکرٹری ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے تمام کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے نام ایک رسمی چٹھی صادر کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ وہ مستحکم انتظامی تدابیر اختیار کر کے احراریوں اور احمدیوں کو اپنے اپنے جلسے منعقد کرنے کا موقع دیں لیکن اس امر کا تیقن حاصل کر لیں کہ فریقین میں سے کوئی بھی تشدد کا طریق اختیار نہ کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۴۔ دسمبر ۱۹۵۱ء کو تمام ڈپٹی کمشنروں کے نام حسب ذیل ہدایت نامہ صادر کر دیا گیا:-

"جیسا کہ آپ کو علم ہے احراری احمدی نزاع کچھ مدت سے صوبے میں چھڑا ہوا ہے۔ اور شخصی تشددانہ حملوں کے بعض واقعات حال ہی میں رونما ہوئے ہیں جن سے نظم حکومت کے ذمہ داروں کو بے حد تشویش لاحق ہے۔ حکومت کی ہمیشہ ہی سے یہ مضبوط پالیسی رہی ہے کہ کسی جماعت یا فرقے کے اس جائز حق پر کوئی ناواجب پابندی عائد نہ کی جائے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد پر عمل کرے۔ اور اس معاملے میں دو مختلف جماعتوں کے درمیان کسی قسم کا فرق و امتیاز نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود یہ امر بے حد اہم ہے۔ کہ مذہبی نزاعات پسندیدہ نہ سمجھے جائیں یا کم از کم انہیں اتنا بڑھنے نہ دیا جائے۔ کہ امن و سکون عامہ خطرے میں پڑ جائے۔ اس چٹھی کا خاص مقصد یہ ہے۔ کہ حکام اضلاع کی توجہ احراریوں اور احمدیوں کے جلسوں کی طرف مبذول کرائی جائے۔

۲۔ حکومت کو اس امر کا احساس ہے کہ جہاں کہیں حکام ضلع چوکتے ہیں اور بر وقت انسدادی تدابیر نافذ کر دیتے ہیں وہاں احراری اور احمدی ایک دوسرے کے جلسوں میں گڑبڑ پیدا کرنے کا موقع بہت ہی کم پاتے ہیں یا بالکل ہی نہیں پاتے۔ تصادم کے واقعات صرف ایسے مقامات پر ہوئے ہیں جہاں مقامی حکام مضبوط رویہ اختیار کرنے میں ناکام رہے یا فریقین متعلقہ کی حرکات کے جواز یا عدم جواز کا جائزہ ٹھنڈے دل سے نہیں لے سکے۔ اگر دونوں جماعتوں کے ساتھ کسی فرق و امتیاز کے بغیر مضبوط اور منصفانہ طرز عمل اختیار کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ دو مسلمان فرقوں کی باہمی گالی گلوچ کا یہ روز افزوں خطرہ مناسب حد تک قابو میں نہ لایا جا سکے"۔

جماعت احمدیہ سیالکوٹ ۱۶۔ ۱۷۔ فروری ۱۹۵۲ء کو اپنی گراؤنڈ میں ایک تبلیغ کانفرنس منعقد کرنا چاہتی تھی لیکن احراریوں نے انتہائی کوشش کی کہ کسی نہ کسی طریقے سے یہ جلسہ ممنوع قرار دے دیا جائے۔ جب انہیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی۔ تو وہ ایک بہت بڑے ہجوم کے ساتھ جلسہ گاہ کو روانہ ہوئے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے۔ "بناسپتی نبی مردہ باد"۔ "مرزائیوں کا جلسہ بند کرو"۔ "کفر کا جلسہ بند کرو"۔ اور پولیس کے حلقے کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چونکہ ڈپٹی کمشنر سپرنٹنڈنٹ پولیس

اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو پہلے سے اس کشمکش کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس لئے وہ موقع پر پہنچ گئے اور احراری اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر جب جلسے کے بعد احمدی اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے تو احراریوں نے ان پر پتھر پھینک کر اپنے دل کا بخار نکالا۔ اس ہنگامے میں دو پیادہ کانسٹیبل زخمی ہوئے۔

احراریوں نے ۲۴-۲۵ مارچ ۱۹۵۲ء کو سرگودھا میں "استحکام پاکستان احرار کانفرنس" منعقد کی چونکہ اس کانفرنس کے واقعات مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے درمیان حکام اضلاع اور صوبائی حکومت کے درمیان۔ اور احمدیوں کے ایک وفد اور حکومت پنجاب کے درمیان مکاتبت اور مکالمت کا موضوع بنے رہے اور اس قسم کے واقعات کے اعادے کو روکنے کے لئے بعض فیصلے بھی کئے گئے اس لئے اس کا تفصیلی تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کانفرنس سے متعلق واقعات کی پوری کیفیت میمورنڈم نمبر 385-87 C مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۲ء میں موجود ہے جو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ڈی آئی جی سی آئی ڈی پنجاب کو بھیجا تھا۔ وَھُوَ ھٰذَا:-

"سرگودھا کے احرار نے ۲۴-۲۵ مارچ کو سرگودھا میں "استحکام پاکستان احرار کانفرنس" کے مشتہرہ نام سے ایک کانفرنس منعقد کی۔ یہ کانفرنس مولوی محمد عبداللہ احراری تاجر کتب سرگودھا کی تنظیمی کوششوں سے ہوئی۔ اس جلسے کے ممتاز مقررین مولوی عبدالرحمٰن میانوی، مولوی محمد علی جالندھری اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ مولوی محمد علی جالندھری نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ مرزائی زندیق ہیں، اور شرع اسلامی کے رُو سے زندیق واجب القتل ہیں۔ ایک اور مقرر چودھری محمد شریف بہاول نگری نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلمان کو نمازی بھی ہونا چاہئیے اور غازی بھی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی تقریر کے دوران میں یہ کہا کہ سر ظفر اللہ خاں جان بوجھ کر کشمیر کے مسئلے کو لاینحل چھوڑ رہا ہے اور پاکستان اور افغانستان کے درمیان تلخی اور منافرت کو بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے حاضرین کو یہ مشورہ بھی دیا کہ ایک جلوس نکالو جس میں سر ظفر اللہ خاں کی موقوفی کا مطالبہ کرو۔ اس کے بعد حاضرین سے یہ نعرے لگوائے "مرزائیت مُردہ باد۔ سر ظفر اللہ مردہ باد۔ مرزا بشیر احمد مُردہ باد۔"

۲۔ دوسری قراردادوں کے علاوہ اس کانفرنس میں ایک یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ مرزائی قوم کو ایک علیحدہ اقلیت والی قوم قرار دیا جائے۔ اور مرزائی سرکاری ملازموں کو تمام کلیدی اسامیوں سے موقوف کیا جائے۔ کیونکہ مرزائی ملازمان حکومت اپنے خلیفہ کی ہدایات کے ماتحت اپنی ایک علیحدہ تنظیم قائم کر رہے ہیں۔ اور مرزائیت ملک کے لئے خطرناک ثابت ہو رہی ہے۔

۳۔ استحکام پاکستان احرار کانفرنس ۲۴-۲۵ مارچ کو میونسپل گارڈنز میں منعقد ہوئی۔ اور اس کے حاضرین کی تعداد دونوں دنوں کی نشستوں میں ایک ہزار سے دو ہزار کے درمیان رہی۔

۴۔ میں نے ۲۴-۲۵ مارچ دونوں دنوں پر پولیس کے انتظامات کر رکھے تھے کیونکہ نقص امن کا خطرہ تھا۔ اور مقامی احمدیوں نے اس مقصد کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو عرضداشت بھی بھیجی تھی۔

۵۔ سرگودھا کے احراریوں نے آج نماز جمعہ کے بعد ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا اور یہ فیصلہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا محمد عبداللہ احراری کے ایما پر کیا گیا تھا جو مرزائیت کے خلاف۔ سر ظفر اللہ خاں کے خلاف

اور خلیفہ قادیان کے خلاف نعرے لگوانا چاہتے تھے۔ مجھے اس فیصلے کی اطلاع اس وقت ہوئی جب میں اپنے دورے سے دوپہر کے وقت واپس آیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی ٹیلیفون پر مجھ سے کہا کہ شہر میں پولیس کے مناسب انتظامات کر دیئے جائیں۔ میں نے فوراً اپنے جوانوں کو جمع کیا اور ڈیڑھ بجے بعد دوپہر شہر میں چلا گیا۔ خان عبدالہادی خاں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق وہاں پہنچ گئے۔ جب میں اور میرے رفقا گول چوک مسجد پہنچے تو کچہری بازار سے احرار کا ایک جلوس آرہا تھا جس کی رہنمائی مولوی محمد عبداللہ احراری، مولوی صالح محمد معلم سراج العلوم اور عبدالرشید اشک (ایک مقامی اخبار "شعلہ" کا ایڈیٹر) کر رہے تھے۔ یہ اشخاص جامع مسجد سے نماز جمعہ پڑھ کر آئے تھے۔ شرکائے جلوس کی تعداد تخمیناً دو سو تھی۔ میں نے مولوی محمد عبداللہ احراری، مولوی صالح محمد اور عبدالرشید اشک سے کہا کہ وہ جلوس کی رہنمائی نہ کریں کیونکہ اس جلوس سے مختلف جماعتوں کے درمیان منافرت پیدا ہونے اور امن عامہ کے خلل پذیر ہونے کا احتمال ہے۔ لیکن انہوں نے میرے مشورے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ جلوس نکالنے پر مُصر رہے اور کہنے لگے کہ سر ظفر اللہ خاں، مرزائیت اور احمدیوں کے امام کے خلاف احتجاج کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے۔ میری صلاح اور ترغیب کے باوجود ان تین اشخاص نے اپنے پیروؤں سے کہا کہ "سر ظفر اللہ مردہ باد، مرزا بشیر احمد مردہ باد۔ اور مرزائیت مردہ باد" کے نعرے لگائیں۔ چنانچہ ان کے تمام پیرووں نے زور شور سے یہ نعرے لگائے ان میں سے بعض اچھل کود رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ یہ جلوس جس قدر آگے بڑھتا گیا اس کے شرکا میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ یہ جلوس بلاک ۹ اور بانسانوالہ بازار سے گزرتا ہوا پھر کچہری بازار واپس آگیا۔ جہاں سے ایک اور جلوس اس میں شامل ہو گیا۔ جو تعداد نفوس کے اعتبار سے اتنا ہی بڑا تھا۔ پھر یہ پورا جلوس مولوی محمد عبداللہ احراری اور عبدالرشید اشک کے ایما پر میونسپل گارڈنز کی طرف چل دیا۔ عبدالرشید اشک نے گول چوک میں جلوس سے خطاب کیا۔ اور کہا کہ منتشر نہ ہوں۔ اور بے خوف ہو کر اپنے مجوزہ راستے پر چلے چلیں۔ شرکائے جلوس ظفر اللہ خاں اور مرزائیت کے خلاف بڑے جوش و خروش سے نعرے لگا رہے تھے۔ اور ایک وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قانون و انتظام کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ جمعہ کی وجہ سے تمام دکانیں بند تھیں۔ اور احراری لیڈروں نے دانستہ ایک چھٹی کا دن اپنے جلوس کے لئے منتخب کیا تھا۔ جب یہ جلوس کچہری بازار کے چوک میں پہنچا تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی اسکو دیکھا۔ احراریوں کا یہ جلوس ڈیڑھ بجے بعد دوپہر چلا اور ڈھائی بجے تک جاری رہا۔ جب جلوس میونسپل گارڈنز پہنچا تو اس نے ایک جلسہ عام کی صورت اختیار کر لی۔ اور مولوی محمد عبداللہ احراری اور عبدالرشید اشک نے یکے بعد دیگرے اس جلسے سے خطاب کیا۔ اس موقع پر حاضرین کی تعداد پانسو سے کم نہ تھی۔ دونوں مقرروں نے سر ظفر اللہ خاں، مرزا بشیر احمد اور مرزائیت کے خلاف اس کامیاب جلوس کے نکالنے پر حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس کے بعد پھر وہی نعرے لگائے گئے۔ "سر ظفر اللہ مردہ باد، مرزا بشیر احمد مردہ باد۔ اور مرزائیت مردہ باد"۔ اس کے بعد حاضرین منتشر ہونے لگے۔

۶۔ مولوی محمد عبداللہ احراری، مولوی صالح محمد اور عبدالرشید اشک کے ساتھ ساتھ ذیل کے اشخاص بھی جلوس کے نہایت سرگرم ممبر تھے۔ وہ جلوس کے آگے آگے چل رہے تھے اور ظفر اللہ اور مرزائیت کے خلاف نعروں کی رہنمائی کر رہے تھے:۔

(۱) عبدالمجید ولد محمد عمر ارائیں ساکن بلاک نمبر ۱۱ سرگودھا شہر
(۲) بہاء اللہ ولد عطاء اللہ کشمیری ساکن بلاک نمبر ۱۹۔ سرگودھا شہر
(۳) اللہ رحم ولد اللہ ماہی جھنگڑ چوب فروش بلاک نمبر ۱۷ سرگودھا شہر
(۴) مجید ولد اللہ بخش گجراتی۔ درزی۔ بلاک نمبر ۳۔ سرگودھا شہر
(۵) یونس ولد عبدالرحمن ارائیں ساکن بلاک نمبر ۳ سرگودھا شہر
(۶) احسان احمد دکاندار بلاک نمبر ۶۔ سرگودھا شہر

۷۔ اس میں شک نہیں کہ احراری لیڈر اور کارکن ہماری مملکت کی سلامتی اور اس کے امن وامان کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور احمدیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ان کا ظاہری مقصد تو احمدیوں کو اور ان کے خلیفہ اور سر ظفر اللہ خاں کو بدنام کرنا ہے۔ لیکن ان کا اندرونی مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بدنظمی اور لاقانونی پیدا کریں۔ احراری لیڈروں نے مسجدوں کی خاصی تعداد پر قبضہ کر رکھا ہے اور وہ اماموں اور خطیبوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے سرغنہ عام طور پر پس پردہ رہتے ہیں۔ اور دوسروں کو مذہب اور ہمارے نبی کریمؐ کے نام پر احمدیوں کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ ان کے لیڈروں میں ایک مولوی محمد شفیع احراری بھی ہے۔ جو سرگودھا کی جامع مسجد کا خطیب ہے احتمال اس امر کا ہے کہ بعض سادہ لوح مسلمان ان کے نعروں اور ان کی تقریروں سے طیش میں آکر سرگودھا شہر اور اس کے نواح میں جہاں احمدی قلیل تعداد میں آباد ہیں۔ احمدیوں پر حملے کرنے لگیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض بیگناہ احمدی قتل کر دیئے جائیں۔ میں نے آج شہر میں مسلح دستے گشت پر مقرر کر دیئے ہیں، لیکن تمام احمدیوں اور انکے مکانوں کی حفاظت کرنا ممکن نہیں ہے۔

۸۔ سب انسپکٹر سرگودھا شہر نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ سرگودھا شہر کے مقامی احراری لیڈر جن کے سرغنہ مولوی محمد عبداللہ مولوی صالح محمد اور عبدالرشید اشک ہیں فیصلہ کر چکے ہیں۔ کہ احمدیت۔ سر ظفر اللہ خاں اور احمدیوں کے امام کو ذلیل کرنے کی غرض سے ایسے جلوس بار بار نکالیں اور اس طریق سے لوگوں پر یہ اثر ڈالیں کہ یہ لوگ واقعی بہت بُرے ہیں اور ان کا مذہب نفرت انگیز ہے۔ اس قسم کے جلوسوں اور ان لوگوں کی مُضر سرگرمیوں کو روکنے کے لئے یہ لازم ہے کہ ان کے خلاف سخت اقدامات کئے جائیں ورنہ سلامتی عامہ اور نظم و قانون سخت خطرے میں پڑ جائینگے۔ اور نہ صرف سرگودھا شہر میں بلکہ پورے ضلع میں لاقانونی کا دَور دَورہ ہو جائے گا۔ چونکہ ان لوگوں کو ایک اور جلوس نکالنے میں غالباً چند روز لگ جائینگے اس لئے میرا خیال ہے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے پہلے مَیں حکومت سے احکام حاصل کر لوں اگر اس اثنا میں انہوں نے ایک اور جلوس نکال لیا۔ تو میں حکومت کے احکام کا انتظار کئے بغیر ان کے خلاف فوری اقدام کروں گا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس امر میں مجھ سے اتفاق کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے خلاف مضبوط اقدام کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انکی مضر سرگرمیوں کو روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

۹۔ اگر حکومت اس امر کو پسند کرے۔ تو میرا ارادہ ہے کہ میں پندرہ روز کے لئے مولوی محمد عبداللہ احراری

مولوی صالح محمد معلم سراج العلوم اور عبدالرشید اشک کو زیر دفعہ ۳۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ ۱۹۴۹ء زیر حراست لے لوں۔ اس پندرہ دن کے دوران میں اس امر پر غور کر لیا جائے گا کہ آیا حکومت ان کو مزید مدت تک زیر حراست رکھے۔ یا چھوڑ دے۔ یہ تینوں اشخاص کچھ زیادہ ذی اثر تو نہیں ہیں۔ لیکن کافی شرارت پیشہ ہیں اور اشتعال انگیز تقریریں کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ مندرجہ ذیل اشخاص کے خلاف جنھوں نے جلوس میں بہت نمایاں اور سرگرم حصہ لیا ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ زیر دفعات ۱۵۱/۱۰۷ ضابطہ فوجداری قیام امن کے لئے کارروائی کروں۔ یہ لوگ مندرجہ بالا تین احراری لیڈروں کے پُرجوش پیرو ہیں اور ان سے احتمال ہے۔ کہ احمدیوں کو حملے اور توہین کا نشانہ بنا کر امن عامہ میں خلل انداز ہوں گے:۔

(۱) عبدالحمید ولد محمد عمر ارائیں ساکن بلاک نمبر ۱۱۔ سرگودھا شہر

(۲) بہا اللہ ولد عطا اللہ کشمیری ساکن بلاک نمبر ۱۹۔ سرگودھا شہر

(۳) اللہ رحم ولد اللہ ماہی جنگڑ چوب فروش بلاک نمبر ۱۷۔ سرگودھا شہر

(۴) مجید ولد اللہ بخش گجراتی درزی ساکن بلاک نمبر ۳۔ سرگودھا شہر

(۵) یونس ولد عبدالرحمٰن ارائیں ساکن بلاک نمبر ۳ ۔ سرگودھا شہر

(۶) احسان احمد دوکاندار ساکن بلاک نمبر ۶ ۔ سرگودھا شہر

۱۱۔ اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ شرکائے جلوس نے مرزائیت کے خلاف نعرے لگانے کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ زندہ باد کے نعرے بھی لگائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ زندہ باد کا نعرہ جان بوجھ کر لگایا۔ تاکہ مقامی مسلم لیگی کارکنوں کی ہمدردی کو نہ کھو دیں۔ احراریوں نے اپنی اسنخکام پاکستان احرار کانفرنس میں جو ۲۴۔۲۵۔ مارچ کو سرگودھا میں منعقد ہوئی۔ میاں محمد سعید قریشی صدر ضلع مسلم لیگ۔ کو دعوت دی کہ وہ ان کے ایک اور اجلاس کی صدارت کریں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ دھوکے کی ٹٹی خاص مقصد کے لئے کھڑی کی تھی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ احراری اسی قسم کی کانفرنسیں صوبے بھر میں منعقد کر رہے ہیں۔ اور صوبے بھر ہی میں مرزائیت اور ظفر اللہ خاں کے خلاف جلوس نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کی یہ نہایت سوچی سمجھی ہوئی مہم ہے۔ اگر اس کو ابتدا ہی میں ناکام نہ کر دیا گیا۔ تو بدگوئی کی اس مہم کا نتیجہ لامحالہ لاقانونی کی صورت میں برآمد ہوگا۔

۱۲۔ پنجاب سی۔ آئی ڈی کے ایک اردو سٹینو گرافر نے ۲۴۔۲۵۔ مارچ کی سرگودھا احرار کانفرنس کی کارروائی قلمبند کی تھی جو غالباً اب تک وہ اپنے افسروں کی خدمت میں پیش کر چکا ہوگا۔"

جب یہ رپورٹ مسٹر انور علی ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی کو موصول ہوئی۔ تو انہوں نے اس پر مندرجہ ذیل یادداشت لکھی:۔

"انسپکٹر جنرل صاحب سرگودھا کی اس تشویش انگیز اطلاع کو ملاحظہ فرمائیں۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کل صبح مجھے ٹیلیفون پر اطلاع دی تھی۔ جو میں نے مختصر طور پر انسپکٹر جنرل صاحب تک پہنچا دی تھی۔

۲۔ احراریوں کا طرزِ عمل انتہائی شر انگیز ہے اور انہوں نے جان بوجھ کر یہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے تاکہ احمدیوں کے خون سے کھیل کر ارزاں ہر دلعزیزی حاصل کریں۔ یہ کہنا کہ احمدی زندیق ہیں لہذا مستوجب قتل ہیں اور مسلمانوں کو صرف نمازی ہی نہیں بلکہ غازی بھی بننا چاہیئے۔ اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں رکھتا کہ احمدیوں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔

۳۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے اقتدار کو کھلم کھلا چیلنج کرنا اور ظفر اللہ خاں مردہ باد جیسے نعرے لگانا نہایت افسوسناک ہے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی تجویز یہ ہے کہ وہ مولوی محمد عبداللہ۔ مولوی صالح محمد اور عبدالرشید اشک کے خلاف زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ اور دوسرے چھ اشخاص کے خلاف زیر دفعہ ۱۵۱/۱۰۷ ضابطہ فوجداری کارروائی کرینگے۔ لیکن اقدام سے پہلے انہوں نے حکومت سے مشورہ طلب کیا ہے۔ عبدالرشید اشک ایک دفعہ پہلے بھی پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت گرفتار کیا جا چکا ہے کیونکہ وہ سابق کانگرسی ہے اور اس پر مخالف پاکستان سرگرمیوں میں مصروف ہونے کا شبہ کیا گیا تھا۔ مولوی محمد عبداللہ حکومت کی مخالفت میں رسوائے عالم ہے۔

۴۔ میں کچھ مدت سے اس امر کی حمایت کر رہا ہوں کہ احراریوں کے خلاف خصوصاً انکی فرقہ دارانہ سرگرمیوں کی بنا پر سخت کارروائی کرنی چاہیئے۔ وہ احمدیوں کے خلاف متشددانہ تقریریں کرتے رہے ہیں اور ان کی ایسی ہی تقریروں کا یہ نتیجہ ہے کہ اوکاڑہ اور کوئٹہ میں احمدی ہلاک کر دیئے گئے۔ اگر پاکستان کو ایک جمہوری اور ترقی پسند مملکت کی حیثیت سے ترقی کرنا ہے تو فرقہ وار سرگرمیوں کو سختی سے دبانا ضروری ہے ورنہ پاکستان ازمنۂ وسطیٰ کی ایک رجعت پسند مملکت بن کر رہ جائے گا۔

۵۔ مولوی محمد عبداللہ۔ عطاء اللہ شاہ بخاری اور محمد علی جالندھری سب کے متعلق سیاسی ریکارڈ موجود ہے۔ اس وقت دفتر بند ہے اس لئے میں اس ریکارڈ کو شامل مسل نہیں کر سکا۔ چونکہ کیس بہت ضروری ہے۔ اس لئے میں اسکو انسپکٹر جنرل صاحب کی خدمت میں دستی بھیج رہا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں قیام امن و انتظام کے کام میں ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کی پوری حمایت کرنی چاہیئے اور انہیں اجازت دینی چاہیئے کہ مولوی محمد عبداللہ اور عبدالرشید اشک کے خلاف کارروائی کریں۔ فی الحال مولوی صالح محمد کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو زیر دفعات ۱۵۱/۱۰۷ ضابطہ فوجداری بھی کارروائی کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

۶۔ احراری آج رات لائل پور میں ایک اور کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔"

مسٹر انور علی ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی کے زیر ہدایت مسٹر عطا محمد نون اسسٹنٹ ڈی آئی جی نے یکم اپریل ۱۹۵۲ء کو سپرنٹنڈنٹ پولیس سرگودھا کو ٹیلیفون کیا اور ان کو اطلاع دی کہ اگر ان کے نزدیک بعض اشخاص کے خلاف زیر دفعات ۱۵۱/۱۰۷ ضابطہ فوجداری کارروائی ضروری ہے تو وہ کر سکتے ہیں لیکن سیفٹی ایکٹ کے ماتحت اقدام مناسب نہیں ہے۔ مسٹر نون نے سپرنٹنڈنٹ پولیس سے یہ بھی کہا کہ اگر وہ اس معاملے کے متعلق ڈی آئی جی سے مزید گفتگو کرنا چاہیں تو وہ لاہور آسکتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ مسٹر انور علی کے حکم مورخہ ۲۔ اپریل ۱۹۵۲ء کے ماتحت پی۔ آئی کو بھیجی گئی۔ تاکہ وہ رائے دے کہ آیا اس معاملے

میں کارروائی ہوسکتی ہے یا نہیں۔ پی آئی نے اسی دن رپورٹ کی کہ تقریریں اور نعرے دفعہ ۱۵۳۔الف اور دفعہ ۲۹۵ (قانون تعزیرات) دونوں کے ماتحت قانونی کارروائی کے مستوجب ہیں۔

یکم اپریل ۱۹۵۲ء کو سپرنٹنڈنٹ پولیس سرگودھا نے سپرنٹنڈنٹ پولیس (A) سی آئی ڈی کو ایک ڈی او نمبری 922-SSS لکھی۔ جس میں انہیں اطلاع دی کہ کانفرنس منعقدہ ۲۴-۲۵ مارچ ۱۹۵۲ء کی کارروائی سی آئی ڈی کے ایک اردو سٹینو گرافر نے قلمبند کی تھی۔ کانفرنس کے اجلاس کے خاتمے پر کوئی جلوس نہیں نکالا گیا۔ گو بعض افراد نے جلسے کے بعد اپنے گھروں کو جاتے ہوئے مرزائیت مُردہ باد، ظفر اللہ خان مُردہ باد جیسے نعرے لگائے تھے۔ اور جلوس احراری کارکنوں نے ۲۸ مارچ کو بعد نماز جمعہ نکالا تھا جس کی مفصل روداد ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو بھیجی جا چکی ہے۔

۴۔اپریل ۱۹۵۲ء کو کہ جمعہ کا دن تھا، سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اپنی خفیہ یادداشت مورخہ ۲۸ مارچ کے تسلسل میں ذیل کی ایک اور یادداشت ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو ارسال کی:۔

"۲۔ میں نے ۲۔اپریل کو مولوی عبداللہ احراری، مولوی جلیل الرحمٰن خطیب مسجد گول چوک اور مولوی سمیع اللہ ولد مولوی محمد شفیع خطیب جامع مسجد سرگودھا کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ اور ان سے طویل گفتگو کی۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ وہ احمدیوں کے خلاف شہر میں کوئی جلوس نہ نکالیں کیونکہ احمدیت اور ظفر اللہ اور مرزا محمود احمد کے خلاف نعرے لگا کر نہ تو وہ اپنے مذہب کو بہتر بنا سکتے ہیں نہ فرقہ احمدیہ کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ بلکہ اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ امن عامہ خلل پذیر ہو جائے اور ہمارا ملک اور ہماری حکومت دنیا کے دوسرے ملکوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا ہو جائے۔

۳۔اس امر کا اندیشہ تھا کہ شاید آج بھی بعد نماز جمعہ احراری لوگ احمدیوں کے خلاف جلوس نکالیں گے اس لئے میں نے شہر میں پولیس کی گشت کے انتظامات معقول پیمانے پر کر رکھے تھے۔ میں خود بھی کافی مسلح پولیس کے ساتھ شہر میں گیا۔ اور ہم پولیس کی گاڑیوں میں بڑے بڑے بازاروں کا چکر لگاتے رہے خان عبدالہادی خان ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق میرے ساتھ تھے۔ احراریوں نے آج کوئی جلوس نہ نکالا۔

۴۔اگر احراری کارکن اور ان کے حامی پُرامن رہیں گے اور احمدیوں کے خلاف مزید جلوس نہ نکالیں گے تو میں ان کے خلاف سیکیورٹی کی دفعات یا کسی دوسرے قانون کے ماتحت کارروائی کرنا فی الحال ملتوی کر دوں گا لیکن بہر حال صورت حالات پر نگاہ رکھوں گا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ مورخہ ۲۸۔مارچ ۱۹۵۲ء کو جو کانفرنس کی کارروائی پر مشتمل تھی چیف منسٹر صاحب بھی ۳۔اپریل سے پہلے کسی وقت ملاحظہ کر چکے تھے۔ اس وقت مسٹر انور علی نے فائل پر حسب ذیل یادداشت لکھی:۔

"سرگودھا کانفرنس میں جو تقریریں کی گئیں ان کو سی آئی ڈی کے ایک سٹینو گرافر نے قلمبند کیا تھا پراسیکیوٹنگ برانچ نے ان کا جائزہ لیا ہے۔ اور یہ رائے دی ہے کہ اُن کی بنا پر مقدمات

دائر نہیں کئے جا سکتے۔ تاہم وہ قابل اعتراض ضرور ہیں کیونکہ اُن سے احمدیوں کے خلاف منافرت انگیزی مقصود ہے۔"

پراسیکیوٹنگ برانچ کی ایک ہی رائے فائل پر موجود ہے۔ جو۔ پی۔ آئی نے ۲۔ اپریل ۱۹۵۲ء کو دی تھی۔ یہ امر بالکل واضح نہیں کہ بعد میں پراسیکیوٹنگ برانچ نے کس طرح اور کس وقت ایک متضاد رائے دے دی۔ بہر حال مسٹر انور علی نے لکھا کہ اگر حکومت مناسب سمجھے۔ تو صوبے کے تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو یہ ہدایت کی جا سکتی ہے کہ وہ چوکنے رہیں۔ اور اگر گڑبڑ کا اندیشہ ہو۔ تو احراریوں کی کانفرنسوں کو ممنوع قرار دے دیں۔ اس پر ہوم سکرٹری نے لکھا۔ کہ ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی نے احرار کانفرنسوں کو ممنوع قرار دینے کے متعلق جو تجویز کی ہے اس پر علیحدہ کارروائی کی جا رہی ہے۔

۱۷۔ اپریل ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی نے کیس پر یادداشت لکھی کہ چیف منسٹر صاحب سرگودھا جا رہے ہیں جب وہ واپس آئیں۔ تو سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کہا جائے کہ تمام متعلقہ کاغذات ساتھ لے کر لاہور آ جائے۔ اس وقت اس معاملے پر غور کرنے کے بعد حکومت کی خدمت میں تجاویز بھیجی جائیں گی۔

۶۔ مئی ۱۹۵۲ء کو ملک حبیب اللہ سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) نے لکھا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سرگودھا غالباً ۲۱۔ یا ۲۲۔ اپریل کو ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی اور انسپکٹر جنرل سے مل چکے ہیں۔ اور تجاویز پر بحث کی جا چکی ہے۔

فائل پر مسٹر بودھی کی یادداشت مورخہ ۲۴۔ اپریل ۱۹۵۲ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملے میں کوئی کارروائی نہ کی گئی کیونکہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سرگودھا اپنی یادداشت مورخہ ۴۔ اپریل ۱۹۵۲ء میں یہ لکھ چکے تھے کہ اگر احراریوں کا رویہ بہتر ہو گیا۔ تو وہ ان کے خلاف اقدام کو ملتوی رکھیں گے۔

ڈاکٹر حافظ مسعود احمد سکرٹری انجمن احمدیہ سرگودھا نے صوبائی حکومت اور حکومت مرکزی کو تار بھیجے جن میں سرگودھا کے احراریوں کے طرز عمل کی شکایت کی۔ انہوں نے اسی قسم کے کچھ اور تار اخباروں کو بھی بھیجے جو تار وزیر داخلہ کے نام ارسال کیا گیا اس میں یہ بیان کیا گیا کہ کانفرنس میں محمد علی جالندھری عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے مقررین نے لاقانونی کی تلقین کی۔ اور لوگوں کو بھڑکایا کہ احمدیوں کو قوت سے کام لیکر ختم کر دیں۔ اور ایک ہفتے کے اندر اندر چودھری ظفر اللہ خاں سے چھٹکارا حاصل کریں۔ چودھری ظفر اللہ خاں پاکستان کا خضر حیات خاں ٹوانہ سے بھی بدتر دشمن ہے۔ حاضرین جلسہ سے احمدیوں کو ختم کر دینے کے حلف لئے گئے۔ تقریروں کے بعد آدھی رات کو جوش میں بھرے ہوئے انسانوں کا ایک جلوس شہر کے مختلف حصوں میں نکالا گیا جس میں چودھری ظفر اللہ خاں، امام جماعت احمدیہ اور احمدیت کے خلاف نعرے لگائے گئے۔ احمدیوں کے جان و مال سخت خطرے میں ہیں۔ اور خوفناک نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ ہے۔ وزارت داخلہ نے یہ تار اپنی چٹھی نمبری 51/1/7-Poll (۱) مورخہ ۳۱۔ مارچ ۱۹۵۲ء کے ساتھ چیف سکرٹری حکومت پنجاب کو ارسال کی۔ اور استدعا کی کہ مذکورہ کانفرنس کی روداد وزارت داخلہ کو جلد از جلد ارسال کی جائے۔ جب ۵۔ اپریل ۱۹۵۲ء کو یہ تار مسٹر انور علی ڈی آئی جی۔ سی۔ آئی ڈی کے علم میں آیا تو انہوں نے قانون و انتظام

کے معاملے میں جو خالصتہً صوبائی مسئلہ ہے۔ مرکز کی مداخلت پر شدید برہمی کا اظہار کیا۔ اور لکھا:۔

"وزارت داخلہ کا میلان یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے معاملات کے متعلق رپورٹیں طلب کر لیتی ہے اس سے کام میں غیر ضروری اضافہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ مرکزی حکومت اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ کسی قسم کے احکام صادر کر سکے اس لئے محض مرکزی حکومت کی اطلاع کے لئے رپورٹیں تیار کرنے پر جو محنت صرف ہوتی ہے وہ بالکل رائیگاں جاتی ہے۔ . . . .

. . . .

. . . .

اس کیس میں مرکزی حکومت کے لئے مناسب طرز عمل یہ تھا۔ کہ وہ اس تار کو برائے کارروائی ضروری حکومت صوبہ کے پاس بھیجد یتی۔ قانون و انتظام کے شعبے میں صوبائی حکومت کاملاً مختار ہے۔ اگر اسی طرح رپورٹیں طلب ہوتی رہیں تو عوام کی غیر ضروری ہمت افزائی ہو گی۔ اور وہ ہمیشہ صوبائی حکومت کے رئیس کو نظرانداز کر کے مرکز سے مداخلت کا مطالبہ کیا کرینگے۔ . . . .

. . . .

چونکہ کچھ مدت سے مرکز کی طرف سے بہت ہی زیادہ مطالبات آرہے ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک چیف سکرٹری چیف منسٹر کو اسکی اطلاع دیکر ان سے احکام حاصل کریں"۔

تاہم مرکزی حکومت کے استفسار کے جواب میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے میمورنڈم نمبر C/87-385 مورخہ ۲۸۔ مارچ ۱۹۵۲ء کی ایک نقل مرکزی حکومت کو بھیجدی گئی۔ لیکن حافظ مسعود احمد نے ۲۹۔ مارچ ۱۹۵۲ء کو ایک اور تار وزیر داخلہ کے نام بھیجدیا جس میں لکھا کہ:۔

"میں نے اپنے گزشتہ تار میں احرار کانفرنس کے اثرات مابعد کے متعلق جو اندیشہ ظاہر کیا تھا وہ صحیح نکلا۔ جوش میں بھرے ہوئے عوام کے جلوس بعد نماز جمعہ نکالے گئے ہیں۔ احمدیوں کے خلاف ان کے معزز و محترم امام کے خلاف اور وزیر خارجہ پاکستان کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے ہیں۔ احمدیوں کے خلاف اور حکومت کے خلاف نفرت پیدا کی جا رہی ہے۔ مزید ابتری کا اندیشہ ہے۔ موثر انسدادی تدابیر لازمی ہیں"۔

مرکزی حکومت نے یہ تار بھی چیف سکرٹری حکومت پنجاب کو ارسال کر دیا تاکہ اطلاع ہو جائے۔ اور صوبائی حکومت جو تدابیر مناسب سمجھے اختیار کر سکے۔ احرار کانفرنس سرگودھا کی کارروائی اخبار "شعلہ" مورخہ ۲۸ مارچ میں ذیل کی سرخیوں سے شایع کی گئی:۔

جب تک سر ظفر اللہ وزیر خارجہ ہے کشمیر پاکستان کو نہیں مل سکتا۔ (مولانا محمد علی جالندھری بحوالہ تقریر اللہ رکھا ساغر)

ظفر اللہ پاکستان کا وفادار نہیں۔ حکومت کی مشینری کے پرزے مرزا محمود کی مرضی کے مطابق تبدیل کیے جاتے ہیں (مولانا محمد علی)

— ہم جان دے دیں گے۔ لیکن نبی علیہ السلام کی نبوت پر آنچ نہیں آنے دیں گے (امیر شریعت)"
— الفاظ کو قایم رکھکر اس کا مفہوم بدلنے والا زندیق ہے۔ اور زندیق اسلام میں واجب القتل ہے
ہر مرزائی حکومت کی ڈیوٹی بعد میں دیتا اور مرزا محمود کا حکم پہلے مانتا ہے۔ حکومت کا ہر وہ حکم
جو مرزا محمود کی پالیسی سے ٹکرا جائے۔ مرزائی ملازم اسکی تعمیل نہیں کرتا (مولانا محمد علی")

رپورٹ میں بیان کیا گیا کہ کانفرنس کے خاتمے پر دس ہزار نوجوانوں نے "سر ظفر اللہ مردہ باد" "مرزا بشیر احمد مردہ باد" "ظفر اللہ استعفا دو" کے نعرے لگاتے ہوئے شہر کا چکر لگایا۔ اگر حکومت نے ان دجالوں کی طرف فوری توجہ نہ کی تو اس ناکامی کی ذمہ داری حکومت پر عاید ہو گی۔ چودھری ظفر اللہ خاں جب پیرس سے واپس آ کر ربوہ کی کانفرنس میں شامل ہوا تھا تو اس نے اپنا پروگرام سرکاری طور پر شائع کرایا تھا۔ اس نے ربوہ ہی میں حکومت کے عہدہ داروں کو باریاب کیا۔ اس نے ربوہ کا سفر خرچ خزانۂ حکومت سے وصول کیا۔ وہ حکومت کا وفادار نہیں۔ اس نے قادیان کے بدلے میں کشمیر کو بھارت کے ہاتھ بیچنے کا سودا کر لیا ہے۔ عوام ایسی صورت حالات پیدا کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ جس سے یہ دجال ابن دجال اور اس کے پیرو پاکستان سے بھاگ جانے پر مجبور ہو جائیں۔ مرزا بشیر الدین محمود دجال اعظم اور چودھری ظفر اللہ جیسی کا مسیلمہ کذاب ہے۔ ہندوستان نے تو صرف ایک لاکھ مسلمان لڑکیوں کو محبوس کر رکھا ہے۔ لیکن اگر مرزائی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ تو وہ چار لاکھ لڑکیوں کو بے آبرو کر دینگے"

بعض احمدیوں کا ایک وفد کانفرنس کی کارروائی اور "شعلہ" میں اسکی رپورٹ کے خلاف گزارش کرنے کی غرض سے چیف سکرٹری سے ملا۔ جب ہوم سکرٹری بھی موجود تھے۔ اس کیس میں جو کچھ ہوا۔ اس کی روداد درج ذیل ہے :-

آج چار احمدی حضرات کا ایک وفد جس میں شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ شامل تھے۔ چیف سکرٹری سے ملا۔ تاکہ احراریوں کی سرگودھا کانفرنس کے سلسلے میں اپنی شکایات پیش کرے۔ میں اس ملاقات کے دوران میں موجود تھا۔ ان کی شکایت مختصراً یہ تھی۔ کہ اس کانفرنس میں جو تقریریں ہوئیں۔ ان کا لہجہ اور رجحان سخت قابل اعتراض اور بے حد مغلظات آمیز تھا۔ ایک مقرر نے یہ بھی کہا۔ کہ احمدی چونکہ زندیق ہیں اسلئے حکومت ان کو نابود کر دے — انہوں نے دو منسلکہ اخبار بھی چیف سکرٹری کو دئیے۔

۲۔ کیا ڈی آئی جی سی آئی ڈی ازراہ کرم حکومت کی اطلاع کے لئے وہ رپورٹ پیش کرینگے جو ان کے عملے نے انہیں سرگودھا سے ارسال کی ہو گی۔ اگر موقع پر ان تقریروں کی لفظ بلفظ رپورٹ قلمبند کی گئی تھی۔ تو کیا ڈی آئی جی ازراہ نوازش ان تقریروں کا پورا متن مہیا کرینگے؟ تاکہ ان کا جائزہ لے کر معلوم کیا جائے کہ وہ قابل اعتراض تھیں یا نہیں۔

۳۔ میں اس سلسلے میں یہ بھی بیان کر دوں کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سرگودھا نے ۱۳۔ مارچ کو جمعہ کے دن مجھے ٹیلیفون پر اطلاع دی تھی۔ کہ احراری ایک جلوس نکالنے کا ارادہ کر رہے ہیں جس کے دوران میں وہ احمدیوں کے خلاف نعرے لگائیں گے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ حکومت کا اس معاملے میں کیا منشا ہے

اور وہ ہم سے کس قسم کی پالیسی اختیار کرنے کی توقع رکھتی ہے۔ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بتایا کہ احراری احمدی نزاع کے متعلق حکومت کی پالیسی سے تمام ڈپٹی کمشنروں کو مطلع کیا جا چکا ہے۔ آپ کاغذات نکلوا کر ملاحظہ کر لیں۔ اور اس پالیسی کی روشنی میں اپنے اختیار تمیزی سے کام لیں۔ اب تک ڈپٹی کمشنر کی طرف سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

ایس۔ غیاث الدین احمد۔ یکم اپریل ۵۲ء

ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی (یو۔ او) نمبر HS 2 67 مورخہ ۲۔ اپریل ۱۹۵۲ء

میں نے کل اس کیس پر کارروائی کی تھی۔ جو اس کیس سے منسلک ہے۔

۲۔ یہ صحیح ہے کہ جو تقریریں کی گئیں وہ سخت اشتعال انگیز اور قابل اعتراض تھیں۔ مرزائیوں کو زندیق کہا گیا۔ ان کی ہر طرح تضحیک اور مخالفت کی گئی۔ حتٰی کہ وزیر خارجہ کو بھی نہ چھوڑا گیا۔ اور "سر ظفر اللہ مردہ باد" کے نعرے لگائے گئے۔ چیف منسٹر صاحب کی ہدایات کے ماتحت سپرنٹنڈنٹ پولیس کو زیر دفعہ 151/107 ضابطہ فوجداری کارروائی کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت اقدام کرنے کی تجویز بھی کی تھی لیکن چیف منسٹر صاحب اس کے حامی نہیں ہیں۔

۳۔ تقریریں شارٹ ہینڈ میں قلمبند کی گئی تھیں۔ اور پی آئی کی رائے میں وہ قابل مواخذہ قانونی نہیں ہیں۔

۴۔ "شعلہ" کا مضمون نہایت قابل اعتراض ہے۔ اس میں صرف احمدیوں ہی پر حملہ نہیں کیا گیا بلکہ حکام پر بھی نہایت ناواجب نکتہ چینی کی گئی ہے۔ سی آئی۔ ڈی اس اخبار کے ایڈیٹر عبد الرشید اشک سے واقف ہے۔ بہت سے دوسرے احراریوں کی طرح یہ بھی کانگرسی ہے ۱۹۴۷ء میں یہ شخص پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ یہ بھارت کے سیاسی ورکروں کے ساتھ ساز باز رکھتا تھا۔

۵۔ میری رائے یہ ہے کہ اگر اس ملک کو صحت مند اصولوں پر ترقی کرنی ہے تو ان سیاسی بہروپیوں اور غنڈوں کو جو ایک دوسرے کو گالیاں دے کر مقبول عام بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جو ملک کی سیاسی ترقی میں کوئی تعمیری حصہ نہیں لیتے بے دردی سے دبا دینا چاہیئے۔ احراریوں کو یہ احساس ہے کہ مسلم لیگ اُن کی پشت پر ہے۔ ورنہ ان کا ماضی اس قدر تاریک ہے کہ انہیں کبھی سیاسی میدان میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ یہ کانگرس کے پٹھو تھے۔ اور ان میں سے بعض اب بھی کانگرس ہی کے وفادار ہیں۔ مشہور احراری حبیب الرحمٰن تقسیم کے بعد اس صوبے کو چھوڑ کر بھارت چلا گیا۔ بعض احراری اپنے دلوں کی گہرائیوں میں اب تک پاکستان کے غدار ہیں۔ وہ بظاہر ایک مذہبی پلیٹ فارم پر کام کر رہے ہیں۔ لیکن ان کا مقصد اپنے ملک کی خدمت کرنا نہیں۔ بلکہ اپنی بگڑی ہوئی ساکھ کو از سر نو قائم کرنا ہے۔ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ احراریوں کا ایک گروہ شیخ حسام الدین کی سرکردگی میں سیاسی سرگرمیاں شروع کرنا چاہتا ہے اور اس کے ممبر ایک نئی پارٹی بنانے کا منصوبہ باندھ رہے ہیں۔

۶۔ میں تجویز کر چکا ہوں کہ ڈپٹی کمشنروں کو ایک گشتی مراسلت کے ذریعے سے یہ بتا دینا چاہیئے کہ صورت

حالات کے مقابلے میں ڈٹے رہیں۔ اور اگر انہیں ذرا بھی شبہ ہو کہ احراریوں کا جلسہ ہوا تو فرقہ وارانہ بدمزگی میں اضافہ ہو جائے گا۔ تو فوراً دفعہ ۱۴۴ ضابطۂ فوجداری نافذ کر دیں۔ دوسرا کام جو ہمیں کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ اس چیتھڑے (شعلہ) کے خلاف کارروائی کریں جس نے وزیر خارجہ کے خلاف بدآہنگ حملوں کی اشاعت بڑے درجے کی خیرہ چشمی سے کی۔ جب تک سر ظفر اللہ خاں اپنے عہدے پر فائز ہیں حکومت کا فرض ہے کہ اس قسم کے معاندانہ حملوں سے ان کی حفاظت کرے۔ احرار سر ظفر اللہ خاں کو گالیاں دے کر صرف ایک فرد پر حملہ نہیں کرتے بلکہ اس حکومت کی توہین کرتے ہیں جس کے وہ ایک جزو ہیں۔

۷۔ احراری بڑے چالاک مقرر ہیں۔ اور احتیاط کرتے ہیں کہ قانون کے جنگل میں نہ پھنسنے پائیں موجودہ کیس میں ان کے خلاف جماعتوں کے درمیان منافرت پھیلانے کی بنا پر زیر دفعہ ۱۵۳۔ الف مجموعہ تعزیرات پاکستان مقدمات چلانا امکان میں نہیں ہے۔ میری رائے میں ان کی سرگرمیاں اس قسم کی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک دو نمایاں آدمیوں کے خلاف پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت کارروائی کی جائے تو یہ بالکل حق بجانب ہوگا۔

۸۔ احمدیوں کی طرف سے دو تار موصول ہوئے ہیں جن میں انہوں نے احراریوں کے طرزعمل کے خلاف احتجاج کیا ہے۔

(دستخط) میاں انور علی ۴۔ اپریل ۵۲ء

آئی۔ جی / ایچ ایس (ڈی۔ او) نمبر 216 BDSB مورخہ ۵۔ اپریل ۱۹۵۲ء

احرار بجائے خود ایک مسئلہ ہیں۔ وہ حکومت کے مخالف نہیں۔ اور نہ براہ راست قانون و انتظام میں خلل ڈالنے کے درپے ہیں۔ ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ وہ محض اسلئے خاموش ہیں کہ وہ اتنے مضبوط نہیں ہیں۔ اور اگر حکومت کی مخالفت کریں تو چنداں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ جونہی وہ اس قابل ہو گئے کہ عوام کی کافی تعداد کو اپنے گرد جمع کر سکیں۔ وہ ضرور سر اٹھائیں گے۔ اور گڑبڑ پیدا کرنے کے لئے کسی اقدام میں بھی تامل نہ کریں گے۔ یہ لوگ کوئی اہمیت نہیں رکھتے نہ ان کے پیچھے کوئی جتھا ہے نہ ان کے پاس کوئی پروگرام ہے لیکن وہ حریص جاہ ضرور ہیں۔ اور مجھے بتایا گیا ہے کہ ان کی اس حرص کو مختلف سیاسی جماعتوں نے خصوصاً مسلم لیگ نے اکثر گدگدایا ہے۔ اس لئے وہ کسی ایسے دن کا انتظار کر رہے ہیں جب وہ اپنے اوصاف کی وجہ سے نہیں تو دوسرے لوگوں کی حماقت ہی کے باعث اگلی صف میں آ جائیں۔ اس دن کے لئے وہ احمدیوں کی مخالفت کی آگ کو برابر فروزاں رکھ رہے ہیں۔ اگر یہ آگ بجھ گئی تو احرار کے پاس کوئی ایسی چیز باقی نہ رہیگی جس سے کوئی شخص ان کی جماعت کی طرف مائل ہو سکے ان کا تنہا سرمایہ امید یہی ہے۔ لہذا وہ اس پر جمے رہیں گے۔ انہیں پاکستان کی کچھ پروا نہیں۔ نہ وہ اس کے باشندوں کے درمیان اتحاد کے لئے فکر مند ہیں کسی وقت کسی اور شخص کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اس مسئلے کو کیونکر حل کیا جائے یہ مسئلہ اب

قطعی طور پر ایک خطرہ بن چکا ہے۔ اب تک احرار کو کافی موقع دیا جا چکا ہے۔ ایک دفعہ حکومت کی طرف سے میں بھی ان کے ساتھ گفتگو کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ چنانچہ شیخ حسام الدین سے میری ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات اور میرے ان کے سمجھوتے کے متعلق یادداشت سیکرٹیریٹ میں ضرور محفوظ ہو گی۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ کہ ان کی جماعت آئندہ احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا نہ کرے گی۔ لیکن ہر ممکن موقع پر اس وعدے کی خلاف ورزی کی گئی۔ یاد رہے کہ احمدی بھی بھیڑ کے بچے نہیں ہیں۔ وہ اس وقت چپ چاپ ہیں۔ اور جوابی کارروائی نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ اپنی قلتِ تعداد سے آگاہ ہیں لیکن ہر شخص کے صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بہرحال حکومت کا اپنا فرض بالکل واضح ہے۔ آخر حکومت کب تک اس بیہودہ اشتعال انگیزی کو روا رکھے گی۔ اب تو قریب قریب ہی سمجھنا چاہیئے کہ احراری احمدیوں کو مبتلائے عذاب کر رہے ہیں سی آئی ڈی کو چاہیئے۔ ہمیں بتائے کہ (الف) سیفٹی ایکٹ کے علاوہ کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں (ب) احرار کی پوری طاقت اور تعداد کسقدر ہے۔ اور (ج) وہ کس حد تک حکومت کے خلاف مزاحمت یا نافرمانی کرنے کے قابل ہیں اور اگر احمدیوں کے مسئلے کو وجہ اقدام بنایا جائے۔ تو اس کا عام ردِ عمل کیا ہوگا۔ اس قسم کی قطعی معلومات فراہم کئے بغیر کوئی مستقل فیصلے نہیں کئے جا سکتے۔ محض ڈپٹی کمشنروں کو ایسی گشتی چٹھیاں بھیج دینا جن میں کوئی قطعی تدبیر نہ بتائی گئی ہو۔ آجکل کے زمانے میں چنداں مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

(دستخط) قربان علی

(ہوم سیکرٹری)

احراری احمدی نزاع (اگر اسے اس نام سے موسوم کیا جا سکے) تشویشناک حد تک وسیع ہو چکا ہے۔ اس صوبے میں جو گڑبڑ اس نزاع سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے سب سے بڑے ذمہ دار احراری ہیں۔ احمدی (انسپکٹر جنرل پولیس کے قول کے مطابق) بھیڑ کے بچے نہیں ہیں لیکن انہوں نے جو سخت رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہیں۔ اگر وہ احراریوں کے حملوں اور ہنگاموں پر بے فکری کا رویہ اختیار کریں۔ تو نہایت قلیل مدت میں بحیثیت جماعت ختم ہو جائیں۔ علاوہ بریں ان کے رویے کی سختی زیادہ تر مذہب کے دائرے تک محدود ہے۔ اگر وہ دوسرے اسلامی فرقوں کے افراد کو اپنے رسوم میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ یا خود غیر احمدی مسلمانوں کے ساتھ نماز یا دوسرے دینی وظائف میں شریک ہونے سے پورا اجتناب کرتے ہیں تو یہ خالصتہً ان کا ذاتی معاملہ ہے تاہم حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس نزاع کو جو مذہب پر مبنی ہے ملک کے قانون و انتظام کیلئے خطرناک نہ بننے دے۔

۲۔ مجھے انسپکٹر جنرل پولیس کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ جس پالیسی پر آجکل عمل ہو رہا ہے اور جو حالہی میں وضع کی گئی ہے (بحوالہ گشتی مراسلہ از چیف سیکرٹری نمبری 5/76135-51/II-7505 مورخہ ۲- نومبر ۱۹۵۱ء) اس کو ترمیم کرنے سے پیشتر حکومت کو کوئی زیادہ واضح اور قطعی بات پیش نظر رکھ لینی چاہیئے۔ اس فائل کی یادداشتوں سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ واضح اور قطعی نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے

کہ صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے موجودہ پالیسی کو نئی شکل دینے کی چنداں ضرورت نہیں ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس پالیسی پر عمل درآمد ڈٹ کر کیا جائے۔

۳۔ چیف سیکرٹری صاحب اس مرحلے پر توجہ فرمائیں۔ میرے نزدیک کیس چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں اسوقت پیش کیا جائے۔ جب تجاویز بالکل بین اور روشن صورت اختیار کر لیں۔

(دستخط) غیاث الدین احمد ۸۔ اپریل ۵۲ء

(چیف سیکرٹری)

مجھے اتفاق ہے۔ (دستخط) حافظ عبدالمجید۔ ۹۔ اپریل ۵۲ء

مسٹر قربان علی خاں کے استفسار کا جواب دینے کی غرض سے مسٹر محمد خدا بخش سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) سی آئی ڈی نے ۳ مئی ۱۹۵۲ء کو کیس کا جائزہ لیا اور احراریوں کی سرگرمیوں کے متعلق مندرجہ ذیل جامع یادداشت قلمبند کی :۔

"احرار نے قیام پاکستان کی مخالفت کر کے پنجاب کے مسلم عوام میں اپنی ساکھ کو کھو دیا تھا لیکن اب انہوں نے اپنا مقام قریب قریب دوبارہ حاصل کر لیا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سیاسی طور پر مسلم لیگ کی ہم زبانی اختیار کر لی۔ اور اسکے ساتھ مرزائیت کے خلاف ایک وسیع مہم جاری کر دی۔ اول الذکر سے انہیں ایک عوامی برسر اقتدار جماعت کی حمایت حاصل ہو گئی۔ اور آخر الذکر رویتے نے انہیں مسلمان عوام میں ہر دلعزیز بنا دیا۔ جو اسلام میں ایک نئی نبوت کے عقیدے کے خلاف تضحیک و طنز کو بے انتہا پسند کرتے ہیں

۲۔ مجلس احرار کی اُن شاخوں کی فہرست منسلک ہے۔ جو اب تک میرے علم میں آ چکی ہیں! ہر شاخ کو سالانہ چندہ ادا کرتی ہیں اب تک جو وردی پوش رضا کار درج رجسٹر ہو چکے ہیں انکی تعداد ۱۰۶ بتائی گئی ہے لیکن "فتنہ کالم" ان مولویوں پیش اماموں اور مذہبی دیوانوں پر مشتمل ہے۔ جو اپنے اپنے دائروں اور منبروں سے مذہبی مناقشات کو زندہ رکھنا موجب ثواب سمجھتے ہیں۔ یہی لوگ احرار لیڈروں کو ملک کے مختلف گوشوں میں دعوتیں دیتے ہیں۔ اور ان کی خاطر مدارات کرتے ہیں۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ تقریروں میں احمدیوں کے خلاف جسقدر زیادہ زہر چکانی کرتے ہیں۔ اتنا ہی زیادہ چندہ جمع ہوتا ہے۔ اب مجلس کی مالی حالت مستحکم ہے اور اسے بعض دولت مند مربی حاصل ہو گئے ہیں۔ جن میں زیادہ فیاضی سے امداد کرنے والے مندرجہ ذیل اشخاص سمجھے جاتے ہیں :۔

(۱) نوابزادہ نصر اللہ خاں ایم۔ ایل۔ اے خان گڑھ۔ ضلع مظفر گڑھ

(۲) حاجی دین محمد بادامی باغ لاہور (مالک کارخانہ)

(۳) میاں قمر الدین رئیس اچھرہ لاہور

(۴) رانا غلام صابر ایم۔ ایل۔ اے۔ اوکاڑہ

آجکل احرار لائل پور۔ سیالکوٹ۔ سرگودھا۔ راولپنڈی۔ گوجرانوالہ منٹگمری۔ ملتان اور مظفر گڑھ کے

اضلاع میں اور اوکاڑہ۔ چنیوٹ اور گوجرخاں میں زیادہ ذی اثر ہیں۔

۳۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ اس فرقہ دارانہ خطرے کے مقابلے کے لئے کیا کیا موثر تدابیر اختیار کی جائیں تو میری رائے مندرجہ ذیل ہے:۔

(الف) مسلم لیگ کو اس تحریک سے کاملاً علیحدگی اختیار کر لینی چاہئے۔ ان کے ایم۔ ایل اے اور عہدہ داروں کو چاہئے کہ نہ صرف احرار کے جلسوں کی صدارت نہ کریں۔ بلکہ اپنے رویے سے عوام کو اس امر کا واضح ثبوت دے دیں کہ وہ کسی طریقے سے بھی احراریوں کی مدد نہیں کرنا چاہتے۔ بدقسمتی سے عام مسلمانوں کا ذہنی رجحان احمدیوں کے خلاف ہے۔ اور مسلم لیگ کے کارکن بعض اوقات عوام میں اپنے اثر و نفوذ کو محفوظ رکھنے کی خاطر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کے جذبات سے کھلم کھلا ہم آہنگی اختیار کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ مل جانے کے باوجود کوئی احمدی اسمبلی کے انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہی سمجھی جاتی ہے کہ احراری مقررین کا عوام پر بہت اثر ہے۔

(ب) احرار کانفرنس (گو اس کا نام دفاع کانفرنس ہی رکھا گیا ہو) زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ممنوع ہونی چاہئے۔

(ج) ایسا انتظام ہونا چاہئے (اور بہتر ہے کہ مقامی مسلم لیگ کے ذی اثر ممبروں کے ذریعے سے ہو) کہ پبلک مقامات احرار کے جلسوں کے لئے عاریتہً نہ دئے جائیں۔

(د) احرار کے زیادہ متشدد مقررین مثلاً عطاء اللہ شاہ بخاری۔ مولوی محمد علی جالندھری۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور صاحبزادہ فیض الحسن پر اس قسم کے نوٹس کی تعمیل کرائی جائے کہ احمدیت کے خلاف تقریر کرتے ہوئے وہ اس بحث کی مذہبی حدود سے ہرگز تجاوز نہ کریں۔ اور کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے احمدی جماعت کے خلاف پاکستان کے دوسرے شہریوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو سکے۔ اور ان کے جذبات حب وطن کے بھڑک اٹھنے کا احتمال ہو۔ بہرحال اگر کوئی شخص یا کوئی طبقہ ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہو جن سے مملکت کی سلامتی کو نقصان پہنچانا مقصود ہو تو قاعدہ یہ ہے کہ حکام کو اطلاع دے کر ان لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کا مطالبہ کیا جائے نہ یہ کہ عوام کو بھڑکا کر اس امر پہ آمادہ کر دیا جائے کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

(ہ) مقامی مجسٹریٹ احراری مقررین اور ان کے مقامی میزبانوں کے خلاف خصوصاً ان مولویوں اور پیش اماموں کے خلاف جو انہیں اپنی مسجدوں میں تقریروں کے لئے بلاتے ہیں۔ زیر دفعہ ۱۰۷ ضابطہ فوجداری کارروائی کر سکتے ہیں۔ جو یقیناً مفید ہو گی۔

(و) میری رائے یہ ہے کہ زیادہ مکروہ حالات میں مثلاً جب عزت مآب وزیر خارجہ کو گالیاں دی جائیں اور ان کے جنازے نکالے جائیں یا پے در پے قانون شکنی اور حکومت کے خلاف بدگوئی کی جائے۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے استعمال میں بھی تامل نہ کرنا چاہئے۔ تنبیہات بارہا کی گئی ہیں۔ اور دیے گئے

ثابت ہوتی ہیں۔ اب احرار کو اس امر کا احساس دلا دینا چاہئے کہ حکومت اس دفعہ عمل پر تُل گئی ہے بحالت موجودہ ان کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلمان خواہ وہ حکام ضلع ہوں یا عام لوگ احرار کے بیان کردہ مقصد یعنی تحفظ ختم نبوت سے عملی ہمدردی رکھتے ہیں۔ وہ کم از کم چار ایسی مثالیں پیش کر سکتے ہیں کہ سال گزشتہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں نے ان کی کانفرنسوں کی صدارت کی ہے "

جن افسروں نے اس کیس پر یادداشتیں لکھنے کا موقع پایا۔ ان کے ظاہر کردہ خیالات کی روشنی میں ۱۹۔ مئی کو ہوم سیکرٹری انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے اس معاملے پر گفتگو کی۔ اس گفتگو کے بعد ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے مندرجہ ذیل یادداشت لکھی جس میں احرار کی تاریخ بیان کر کے ان کے خلاف بعض اقدامات تجویز کئے گئے :-

" حکومت کو وقتاً فوقتاً اس امر کی اطلاع دی جا چکی ہے کہ مجلس احرار نے احمدیوں کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ امن عامہ سخت خطرے میں پڑ جائے گا۔ حوالے کی سہولت کے لئے ان یادداشتوں کے نکات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

(۱) یادداشت مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۵۰ء جس میں یہ تجویز کی گئی کہ احرار لیڈروں کو تنبیہ کی جائے۔ اس یادداشت پر کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

(۲) یادداشت مورخہ ۳۔ فروری ۱۹۵۰ء جس میں وہ پروپیگنڈا حکومت کے علم میں لایا گیا جو ملتان کی ایک کانفرنس کے دوران میں کیا گیا۔ سابق گورنر صاحب نے قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولوی غلام غوث سرحدی سے گفتگو کی۔

(۳) یادداشت مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۵۰ء جس میں یہ تجویز کی گئی کہ ماسٹر تاج الدین اور دوسرے احرار لیڈروں کو طلب کر کے تنبیہ کی جائے۔ حکومت نے چیف سیکرٹری کو اس تنبیہ کا حکم دیا۔

(۴) یادداشت مورخہ ۲۸۔ مئی ۱۹۵۰ء جس میں یہ بیان کیا گیا کہ احرار نے جو فضا پیدا کی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ احمدیوں پر متشددانہ حملے کئے جائیں گے۔ اور دوسرے خطرات بھی پیدا ہوں گے۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے بعض قطعی طریقے بھی تجویز کئے گئے۔ لیکن حکومت نے صرف یہ فیصلہ کیا کہ لیڈروں کو تنبیہ کر دی جائے۔

(۵) یادداشت مورخہ ۴۔ اپریل ۱۹۵۱ء جس میں سرگودھا کے مقام پر احرار کی سرگرمیوں کا حوالہ دے کر تحریک احرار کے خطرات واضح کئے گئے۔ حکومت نے مزید قطعی تجاویز پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔

۲۔ کیس کو مناسب طور پر سمجھنے کے لئے اُن قابلِ اعتراض واقعات پر دوبارہ نظر ڈالنا ضروری ہے جو احراری کارکنوں کی اندھا دھند اور اشتعال انگیز تقریروں سے پیدا ہوئے۔ مختصر طور پر ان واقعات کی کیفیت یہ ہے :-

(۱) اوکاڑہ۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء۔ احمدی مبلغین کو راستے میں روک کر ان کے چہروں پر کالک مل دی گئی۔ احراری مقررین نے کشیدگی کی جو فضا پیدا کی تھی اس کی وجہ سے ایک احمدی مدرس قتل کر دیا گیا۔

(۲) راولپنڈی۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء احمدی جماعت کے خلاف نفرت پھیلانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک احمدی

قتل کر دیا گیا گو اسکی فوری وجہ مختلف تھی۔

(۳) سیالکوٹ۔ جنوری ۱۹۵۱ء احرار نے احمدیوں کے ایک جلسے کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ پولیس کے پہنچ جانے کی وجہ سے کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔

(۴) چک جھمرا۔ فروری ۱۹۵۱ء احرار کے تشدد کی وجہ سے ریلوے سٹیشن پر ایک شخص لیسپر ولوی عصمت اللہ احمدی، کو احراری ورکروں نے چھرا مار دیا۔

(۵) گوجرانوالہ۔ مارچ ۱۹۵۱ء جب ایک احمدی دکاندار نے مرزا غلام احمد کے خلاف نعرے لگانے پر اعتراض کیا تو اس پر حملہ کیا گیا۔ پولیس نے اسکی جان بچائی۔

(۶) لائل پور اپریل ۱۹۵۱ء غلام نبی جانباز کی دھمکی کے باعث ایک احمدی دکاندار پر حملہ کیا گیا۔

(۷) سمندری۔ مئی ۱۹۵۱ء ایک ہجوم نے جسکی رہنمائی احراری کارکن کر رہے تھے احمدیوں کی ایک مسجد جلا دی۔

(۸) لائل پور نومبر ۱۹۵۱ء احراری کارکنوں نے احمدیوں کے ایک جلسے میں خلل ڈالا جس میں طرفین کے آدمی مجروح ہوئے۔ پولیس کی مداخلت کے باعث مزید گڑ بڑ نہ ہوئی۔

(۹) ملتان۔ نومبر ۱۹۵۱ء پچاس احراریوں نے ایک احمدی جلسے کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ پولیس کے پہنچ جانے کی وجہ سے مزید گڑبڑ نہ ہوئی۔

(۱۰) سرگودھا۔ مارچ ۱۹۵۲ء ایک احرار کانفرنس کے بعد پولیس کے احکام کے خلاف ایک جلوس نکالا گیا شرکائے جلوس چھاتی پیٹ پیٹ کر "ظفر اللہ ہائے ہائے" کے نعرے لگا رہے تھے۔

(۱۱) راولپنڈی۔ اپریل ۱۹۵۲ء۔ احراریوں کے ایک جلسے میں اشتعال انگیز تقریریں سنکر ایک نوجوان اُٹھا اور نعرے لگانے لگا "ظفر اللہ مرزائی کو ہٹا یا جائے۔ وزیر ظفر اللہ کو قتل کیا جائے۔ مار دیا جائے" عطاء اللہ شاہ بخاری نے جو تقریر کر رہا تھا۔ اس نوجوان کے نعروں کے بعد حاضرین سے کہا کہ ایک جلوس نکالیں اور "ظفری وزارت" کو توڑنے پر اصرار کریں۔

(۱۲) گوجرانوالہ۔ اپریل ۱۹۵۲ء احراری کارکنوں نے ایک جلوس مرتب کیا۔ جس میں سر ظفر اللہ کے دو بناوٹی جنازے نکالے اور اس قسم کے نعرے لگائے گئے "ظفر اللہ بستر چور دا۔ نعرہ مارو زور دا"

(۱۳) لائل پور۔ مئی ۱۹۵۲ء عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ احمدیوں کے خلاف مظاہرے بڑے پیمانے پر کئے جائیں گے۔ اور صرف لائل پور جیسے مقامات تک محدود نہ رہیں گے بلکہ لاہور اور کراچی میں بھی ہوں گے۔ ایک جلوس بھی نکالا گیا۔ (اسکی پیشگوئی صحیح نکلی کیونکہ اس اعلان کے ایک ہفتہ بعد ۱۸۔ مئی کو کراچی میں ایک متشددانہ مظاہرہ ہوا جس کا نتیجہ بلوے کی صورت میں نکلا)

۱۴۔ ایک چٹھی میرے علم میں لائی گئی جسمیں لکھا تھا کہ جو شخص سر ظفر اللہ خاں کا گلا کاٹیگا وہ بہشت میں جائے گا

۳ میں نے یہاں صرف ان اہم واقعات کا ذکر کیا ہے جو احراری سرکشی کے

باعث حملوں اور نقض امن کی صورت میں رونما ہوئے۔ بے شمار ایسے جلسے منعقد کئے گئے ہیں۔ جن میں احمدیوں کے خلاف کھلم کھلا نفرت کی تلقین کی گئی ہے۔ اور عوامی ذہن کو مسموم کیا گیا ہے۔ احراری لیڈر جو تقسیم کے بعد مجمعوں کا سامنا کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اب پھر ہیرو بن گئے ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریباً دو سال تک ضلع مظفر گڑھ کے ایک دور دست گاؤں میں گوشہ نشین رہا اور عام جلسوں میں تقریریں کرنے کی دعوتوں کو رد کرتا رہا۔ لیکن اب صوبے بھر کے جلسوں میں تقریریں کرتا پھرتا ہے اور دفاع کے رویے کو ترک کر کے جارحانہ طرز عمل اختیار کر چکا ہے۔ اسکی فصاحت اور شیوا بیانی نے ایک دفعہ پھر اسے اہمیت دے دی ہے۔ اور جو لوگ احمدیوں کے خلاف برابر زہریلی تقریریں کرتے رہے ہیں۔ ان میں محمد علی جالندھری، احسان احمد شجاع آبادی اور صاحبزادہ فیض الحسن ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

۴۔ احرار لیڈروں کو گورنر صاحب چیف سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس یکے بعد دیگرے تنبیہ کر چکے ہیں۔ ان تنبیہات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مقررین کا رویہ زیادہ جارحانہ ہو گیا ہے۔

۵۔ ایک وقت پر احراری لیڈر یہ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے مسلم لیگ کے اعلیٰ اکابر سے صلح کر لی ہے اگر انکی تقریریں عام قانون کی دفعات کے ماتحت بھی آتی ہیں۔ جب بھی انہیں کوئی خوف نہیں۔

۶۔ مجلس احرار کا صدر دفتر لاہور میں ہے۔ اس کے پاس کافی سرمایہ موجود نہیں۔ چنانچہ کانفرنسوں کے مصارف کے لئے خاص چندے جمع کرنے پڑتے ہیں۔ پچھلے دنوں چندے کی اپیل کی گئی۔ تو صرف پانسو روپے وصول ہوئے۔ مندرجہ ذیل چار اشخاص باقاعدہ احرار کے سرمائے میں عطیات دے رہے ہیں:۔

(۱) نواب زادہ نصر اللہ خاں مظفر گڑھ

(۲) حاجی دین محمد کارخانہ دار بادامی باغ

(۳) میاں قمر الدین رئیس اچھرہ

(۴) رانا غلام صابر ایم۔ ایل۔ اے اوکاڑہ

۷۔ احرار کے پاس رضا کاروں کی ایک تنظیم ہے جس میں صوبے بھر سے ۱۰۶۴ ممبر شامل ہیں تقسیم کے وقت ممبروں کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی تھی۔ کیونکہ بہت سے رضا کار اس تنظیم سے مستعفی ہو گئے تھے ایک زمانے میں ممبروں کی تعداد اس سے زیادہ تھی۔ آجکل جماعت احرار کا کام صرف یہ ہے کہ احمدیوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کیا جائے۔ پچھلے دنوں سر ظفر اللہ خاں کو موقوف کرنے کے مطالبات نہایت قابل اعتراض طریقے پر کئے گئے ہیں۔ سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ احمدیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔

۸۔ جماعت احرار کا ایک اپنا اخبار ہے "آزاد" جو ہفتے میں تین دفعہ شائع ہوتا ہے۔ اسکی اشاعت قلیل

ہے۔ اس کا ایڈیٹر ڈاکٹر صابر ملتانی ہے۔

۹۔ آل پاکستان مجلس احرار کے انتخابات ۱۹۴۷ء سے اب تک نہیں ہوئے۔ پنجاب کے انتخابات نومبر ۱۹۵۱ء میں بمقام اوکاڑہ ہوئے جن کا نتیجہ یہ تھا:۔

پریزیڈنٹ ——— قاضی احسان احمد شجاع آبادی

وائس پریزیڈنٹ ——— مولوی عبدالرحمٰن میانوی

جنرل سکرٹری ——— مولوی محمد علی جالندھری

سیکرٹری ——— مہر عبدالرحیم جہلمی

خازن ——— محمد شفیع

سالار صوبہ ——— چودھری معراج دین

۱۰۔ یاد ہوگا کہ تقسیم کے فوراً بعد احراری لیڈر آئی این اے کے (جنرل) شاہ نواز سے ساز باز میں معروف تھے جو بعد میں بھارت چلا گیا۔ متحدہ پنجاب کی مجلس احرار کے ایک ممتاز رکن حبیب الرحمٰن نے بھی بھارت میں سکونت اختیار کر لی۔ ایک شخص پربودھ چندر نے جو بعد میں ایم ایل اے ہو گیا تھا اور ممتاز کانگرسی کارکن تھا اپنا ایک ہوٹل (ویرا ہوٹل میکلوڈ روڈ لاہور) آغا شورش کاشمیری اور نوابزادہ نصراللہ خاں کے حوالے کر دیا۔ آغا شورش نے ۱۹۴۹ء میں مجلس احرار سے استعفا دے دیا۔ اس سے قبل وہ مجلس عاملہ کے ممبر تھے۔

۱۱۔ احراریوں میں ایک ایسا گروہ موجود ہے۔ جو اپوزیشن پارٹیوں سے ملکر کام کرنے کا حامی ہے۔ اس گروہ کے لیڈر شیخ حسام الدین ہیں لیکن ماسٹر تاج الدین انصاری ہمیشہ اعتدال کا مشورہ دیتے ہیں اور موجودہ مرحلے پر مسلم لیگ سے کھلم کھلا علیحدگی کے خلاف ہیں۔ اب تک ماسٹر تاج الدین کا گروہ زیادہ قوی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب احرار کو معلوم ہوگا کہ اب وہ عوام میں کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں تو وہ علی الاعلان مسلم لیگ سے منقطع ہو کر اپنی آزاد پارٹی قائم کر لیں گے۔

۱۲۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ احراری کارکنوں کی شرانگیز تقریروں کا نتیجہ نقض امن اور جسمانی تشدد کے بے شمار واقعات کی شکل میں برآمد ہو چکا ہے۔ کراچی کے تازہ واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر احرار کی سرگرمیوں کو بے روک ٹوک جاری رہنے دیا گیا تو کس قسم کے واقعات رونما ہوں گے۔ مزید برآں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر احرار کو قوت اور حمایت عامہ حاصل کرنے کا موقع دیا گیا تو ان کے خلاف قانونی کارروائی زیادہ مشکل ہو جائے گی۔ اب وہ "مشتبہ" نہیں ہیں جیسے تقسیم کے وقت تھے۔

۱۳۔ مندرجہ بالا صورت حالات کے متعلق کل انسپکٹر جنرل صاحب اور ہوم سیکرٹری صاحب سے گفتگو ہوئی اب مندرجہ ذیل سفارشات حکومت کے غور کے لئے پیش کی جاتی ہیں:۔

(الف) مجلس احرار کو زیر دفعہ ۱۶۔ قانون فوجداری (ترمیمی) ایکٹ کے ماتحت خلاف قانون قرار دیا جائے (یہ تجویز میں نے مئی ۱۹۵۱ء ہی میں پیش کر دی تھی)

(ب) ذیل کے ممتاز کارکنوں کو گرفتار کر کے پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند کر دیا جائے:۔

۱۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری

۲۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی

۳۔ محمد علی جالندھری

عطاء اللہ شاہ بخاری کے خلاف مواد بہت مضبوط ہے۔ کیونکہ لائل پور میں اس نے جو کچھ بیان کیا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کراچی میں جو کچھ ہوا۔ وہ اس کے علم میں تھا۔

(ج) اگر نظر بندی مناسب نہ سمجھی جائے تو ان تینوں لیڈروں کو ان کے اپنے دیہات میں پابند مسکن کر دیا جائے آخر عطاء اللہ شاہ بخاری اپنی مرضی سے دو سال تک ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں مقیم رہ ہی چکا ہے۔ محمد علی جالندھری (جو مہاجر ہے۔ اور اب ضلع ملتان میں آباد ہو چکا ہے) اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی اس صورت میں ضلع ملتان میں پابند مسکن کئے جائیں گے۔

(د) اگر مجلس احرار کو خلاف قانون انجمن قرار دینا بھی مناسب خیال نہ کیا جائے تو اس کے جلسے کم از کم ایک سال یا دو سال کے لئے زیر دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری حکماً بند کر دینے چاہئیں۔

۴۔ اس گفتگو میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ عمل کی ہم آہنگی کی غرض سے ہمکو اپنی تجویزوں کی اطلاع مرکزی حکومت کو بھی دے دینی چاہیئے مرکزی حکومت کو تعاون کرنا چاہیئے۔ اور ایسا انتظام کر دینا چاہیئے کہ اسی قسم کے اقدامات پاکستان کے دوسرے صوبوں میں بھی کئے جائیں۔ اگر احرار کی سرگرمیوں پر صرف ایک ہی صوبے میں بعض قیود عائد کی گئیں تو یہ بات بالکل بے معنی ہو گی۔ ہماری رائے یہ بھی تھی کہ اگر مرکزی حکومت مندرجہ بالا اصول پر اقدام کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو حکومت پنجاب کے لئے تنہا۔ ہ کر ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا۔

۵۔ اگر حکومت کو مندرجہ بالا آرا سے اتفاق ہو تو ایک مناسب مسودہ تیار کر کے چیف سیکرٹری صاحب کی خدمت میں بغرض منظوری پیش کر دیا جائیگا"۔

یہ یادداشت مسٹر قربان علیخاں انسپکٹر جنرل پولیس کے سامنے رکھی گئی۔ انہوں نے اس پر جو تبصرہ کیا وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ یہ تبصرہ خاص توجہ کا مستحق ہے:۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کب تک یادداشتیں لکھ لکھ کر حکومت کو یہ اطلاع دیتے رہیں گے کہ احراری فلاں فلاں حرکات کر رہے ہیں اور اگر ان کو بروقت روکا نہ گیا تو ان سے کیا توقعات کی جا سکتی ہیں۔ احرار نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ بلاشبہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان کے کیمپ میں ہوا کا رخ کدھر ہے۔ میں اپنی جگہ یقین رکھتا ہوں کہ اگر حکومت نے احرار کو ہاتھ نہ لگانے کی موجودہ پالیسی کو جاری رکھا تو احرار جلد یا بدیر کسی ایسے ہولناک جرم کا ارتکاب کرینگے کہ حکومت کے لئے اس سوال کا جواب دینا دشوار ہو جائے گا کہ اس نے سی آئی ڈی کی مسلسل اور پرزور

رپورٹوں کے باوجود احرار کے خلاف کوئی اقدام کیوں نہ کیا۔

میں جانتا ہوں کہ اس قسم کا فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن آخر کسی کو تو یہ فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ مرکزی حکومت غالباً ایک ایسے مسئلے میں آلودہ ہونے کی ذمہ داری میں شریک ہونے کو تیار نہ ہوگی جس میں ذرا سا امکان بھی اس امر کا ہو کہ ایک اور اپوزیشن اُٹھ کھڑی ہوگی اور وہ عام مسلمانوں اور احمدیوں کے درمیان مذہبی نزاع کی شکل دے کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرے گی اس امر کا امکان موجود ہے حقیقت یہ ہے کہ جونہی احراریوں کو ہاتھ لگایا گیا وہ اس وسیع مذہبی نزاع کو نصب العین بنا لیں گے لیکن کسی نہ کسی حکومت کا فرض ہے کہ عوام کی صحیح رہنمائی کرے۔ اگر ہر پارٹی کو یہی خوف ہو کہ احرار اپوزیشن سے جا ملیں گے۔ تو کوئی قانون وانتظام کی حفاظت پر بھی قادر نہ ہو سکے گا اصل بات یہ ہے کہ آج احراری کوئی قوت نہیں ہیں لیکن ممکن ہے کہ کل وہ قوت بن جائیں۔ کوئی معقول انسان ان کی متشددانہ پالیسی کی تائید نہیں کر سکتا اگر حکومت کو یقین ہے کہ احراریوں کا طرز عمل حکومت کے اقدام کا متقاضی ہے تو میری گزارش ہے کہ آج اس اقدام کا موزوں ترین وقت ہے۔ چیف منسٹر صاحب کے مری روانہ ہونے سے پہلے یہ مناسب ہوگا۔ کہ عزت مآب وزرائے حکومت۔ چیف سیکرٹری۔ ہوم سیکرٹری۔ ڈی آئی جی سی آئی ڈی اور انسپکٹر جنرل پولیس کی ایک کانفرنس منعقد کر لی جائے۔"

چیف منسٹر نے ۲۵۔ مئی ۱۹۵۲ء کو ان تجاویز پر غور کرنے کے لئے افسروں کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اگرچہ مسٹر قربان علی خاں نے تجویز کی تھی کہ اس اجلاس میں وزرا کو بھی دعوت دی جائے لیکن چیف منسٹر نے اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ کوئی وزیر طلب نہ کیا گیا۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ موجودہ ہدایت نامہ جس کے ماتحت احراریوں یا احمدیوں کے جلسوں کو ممنوع قرار دینے کا معاملہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے تسلی بخش نہیں ہے۔ لہذا اب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ہدایت کی جائے کہ جب کبھی فریقین میں سے کوئی بھی جلسہ منعقد کرنا چاہے وہ ہر حال میں اس جلسے کو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ممنوع قرار دے دیں لہذا ۵۔ جون کو چیف سیکرٹری نے مندرجہ ذیل ڈی او گشتی تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے نام صادر کر دی :۔

"جناب من۔

مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کو ہوم سیکرٹری کی ڈی او چٹھی نمبری 10027-51/463-HG/۱ مورخہ ۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کے تسلسل میں جو مضمون محولہ بالا کے متعلق تمام ڈپٹی کمشنروں کو بھیجی گئی تھی یہ مکتوب ارسال کروں۔

۲۔ حکومت کو یہ معلوم کر کے تشویش ہوئی ہے کہ احراری احمدی نزاع میں تخفیف ہونے کے بجائے اس حد تک اضافہ ہو گیا ہے کہ اگر اسے فوراً سختی سے نہ دبا دیا گیا تو اس سے امن عامہ کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ احرار کی کانفرنسوں میں جو تقریریں کی جاتی ہیں۔ ان کے رجحان میں عموماً خود ضبطی

اور صحت مند لہجے کا افسوسناک فقدان نظر آتا ہے۔ ان کے بعض لیڈروں نے حال ہی میں جو تقریریں کی ہیں وہ خاص طور پر اشتعال انگیز تھیں۔ دوسری طرف احمدی جماعت عوام کے ایک طبقے کی واضح مخالفت کے باوجود یا غالباً اس مخالفت ہی کی وجہ سے اپنی تبلیغی کانفرنسیں اکثر اور علی الاعلان منعقد کرنے پر اصرار کر رہی ہے ان کے اس رویے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے خلاف مزید اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ حکومت نے نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ امن و سکون عامہ کی عمومی مصلحت کی خاطر احراری اور احمدی دونوں جماعتوں کو کسی نام اور کسی پردے میں بھی عام جلسوں کے انعقاد کی اجازت نہ دی جائے۔ اسلئے جب کبھی ان جماعتوں میں سے کوئی جماعت کوئی جلسہ عام منعقد کرنے کا ارادہ کرے تو آپ کو چاہئے کہ زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری انسدادی کارروائی کریں۔ اس ہدایت نامے سے ہدایت نامہ محولہ بالا منسوخ ہو گیا ہے جس میں انسدادی کارروائی کو ڈپٹی کمشنروں کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب احراریوں اور احمدیوں کے تمام جلسوں کے خلاف بلا استثنا انسدادی اقدام کیا جائے گا۔ تا آنکہ یہ حکم ترمیم نہ کر دیا جائے۔ یا واپس نہ لے لیا جائے۔ اس سلسلے میں آپ جو اقدام بھی کریں اور اس کا جو کچھ ردِ عمل ہو۔ آپ ہر حالت میں اسکی اطلاع حکومت کی معلومات کے لئے حتی الامکان جلد سے جلد ارسال کرتے رہیں۔"

جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں نے اس ہدایت نامے کے مطابق اقدامات کئے۔ تو احراریوں نے ایک عیّارانہ چال چلی۔ انہوں نے پبلک مقامات کو چھوڑ کر مساجد میں خصوصاً نماز جمعہ سے قبل یا بعد اپنے جلسے منعقد کرنے شروع کر دئے۔ جن میں حاضرین کی تعداد کثیر جمع ہو جاتی تھی۔ اس نئی صورت حالات پر غور کرنے کے لئے انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈی آئی جی سی آئی ڈی ہوم سیکرٹری اور لیگل ریممبرنسر کی ایک کانفرنس ۱۹۔ جون ۱۹۵۲ء کو منعقد کی گئی اس گفتگو میں جو فیصلے کئے گئے۔ ان کے مطابق مندرجہ ذیل ہدایات چیف سیکرٹری کے ملاحظہ اور منظوری کے بعد تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور کمشنروں کو بذریعہ لاسلکی ارسال کی گئیں۔

"حکومت کو اطلاع موصول ہوئی ہے کہ احرار مسجدوں کے اندر نماز جمعہ سے پہلے یا بعد میں احمدیوں کے خلاف اپنے جلسے منعقد کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس قسم کے جلسوں کو ممنوع قرار نہیں دیں گے۔ اگر احراری آپ کے ضلع کی حدود کے اندر اس قسم کے جلسوں کے انعقاد کا ارادہ کر رہے ہیں تو آپ کو فی الفور ایک حکم زیر دفعہ ۱۴۴۔ الف ضابطہ فوجداری صادر کر کے اس دن کے تمام جلسوں کو ممنوع قرار دے دینا چاہئے۔ اس حکم میں مقام جلسہ کا ذکر نہ کیا جائے اس کے بعد آپ کو چاہئے کہ اس مسجد کے امام کو اور ان اشخاص کو جو مسجد کے انتظام سے تعلق رکھتے ہوں طلب کر کے ان کو سمجھائیں کہ وہ آپ کے احکام کی خلاف ورزی میں شریک نہ ہوں اور کسی سیاسی جماعت کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی غرض سے کسی عبادت گاہ کا غلط استعمال نہ ہونے دیں۔ آپ ان لوگوں پر واضح کر دیجئے۔ کہ اگر آپ کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی۔ تو آپ جلسے کے حقیقی منتظمین۔ کارکنوں اور مقررین کے ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کو بھی ماخوذ کرنے

میں تامل نہ کریں گے جن کا تعلق مسجد کے انتظام سے ہوگا۔ کیونکہ وہ اعانت مجرمانہ کے ذمے دار سمجھے جائیں گے حکومت اس امر سے آگاہ ہے کہ ممکن ہے جلسۂ عام کو نماز کی جماعت میں گڈمڈ کر دیا جائے۔ یا نمازیوں کا مجمع نماز یا خطبے سے قبل ہونے والی تقریروں کے نتیجے کی وجہ سے ایک جلسۂ عام کی شکل اختیار کرلے۔ لیکن حکومت کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ ایسے واقعات سے ذمہ داران جلسہ کو جو آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرینگے کسی

قسم کی قانونی حفاظت مہیا نہ ہوگی۔ چنانچہ آج ہی ایک جریدۂ غیر معمولی شائع کیا جارہا ہے جس میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ زیر دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری جلسوں کے امتناع کے جو احکام صادر کئے جائیں گے۔ ان کی خلاف ورزی ایک ایسا جرم سمجھی جائے گی جو ناقابل ضمانت اور قابل دست اندازی پولیس ہوگا عنقریب آپ کو اس جریدہ غیر معمولی کی کاپیاں پہنچ جائیں گی۔ اس دوران میں آپ اسی بنیاد پر اپنا کام شروع کر دیں۔ حکومت بھی عنقریب آپ کو ایک نمونے کا حکم زیر دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری ارسال کر دیگی۔ جو آپ ایسے موقعوں پر صادر کر سکیں گے۔ آخر میں یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ حکومت اُن عام جلسوں کو جو مساجد یا دوسرے مقدس مقامات یا عبادت گاہوں میں منعقد ہوں بزور منتشر کرنے کی خواہش نہیں رکھتی اور یہ بھی نہیں چاہتی کہ ان جلسوں کے دوران انعقاد میں کسی قسم کی مداخلت کی جائے۔ حکومت کی یہ بھی خواہش نہیں کہ جس وقت لوگ ان جلسوں میں شریک ہونیکے لئے جمع ہو رہے ہوں۔ یا ان کے خاتمہ پر منتشر ہو رہے ہوں تو ان میں سے کسی کو گرفتار کیا جائے۔ مناسب طرزِ عمل یہی ہوگا کہ ایک مقدمہ درج کیا جائے اور جب جلسے کا جوش و خروش فرو ہو جائے تو مناسب وقت اور مقام پر ملزموں کو زیرِ حراست لے لیا جائے جتنے مقدمات درج ہوں ان کی پیروی نہایت زور شور سے کی جائے۔ آپ کو اور آپ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو چاہئے کہ جمعہ کے دن بھی اور ایسے اوقات میں بھی جن پر گرفتاریاں کرنا مقصود ہو صدر مقام میں حاضر رہیں"۔

اس کے ساتھ ہی جریدہ غیر معمولی میں ایک آرڈیننس بھی نافذ کیا گیا جس میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری کے ماتحت صادر شدہ احکام کی خلاف ورزی ایک ناقابل ضمانت اور قابل دست اندازی پولیس جرم قرار دی گئی ہے۔

۲۷۔ جون ۱۹۵۲ء کو چیف منسٹر، ہوم سیکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے آپس میں بات چیت کر کے فیصلہ کیا کہ احراریوں کو دوسروں سے الگ تھلگ کرنیکی غرض سے حسب ذیل گشتی ڈی او تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ارسال کی جائے:-

"خفیہ"

ڈی او نمبری 176-St (HS) / 52
پنجاب سول سیکرٹیریٹ
ہوم ڈیپارٹمنٹ لاہور
۲۸۔ جون ۱۹۵۲ء

جناب من ۔

مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں چیف سیکرٹری کے لاسلکی پیغام نمبر 52(HS) ٹا St-168 مورخہ ۱۹ جون ۱۹۵۲ء کے سلسلہ میں جو احراری احمدی نزاع کے متعلق ارسال کیا گیا تھا آپ کو یہ مکتوب لکھوں اور حکومت کی یہ خواہش آپ تک پہنچاؤں کہ اگر احراری آپ کے حکم زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کی خلاف ورزی کریں۔ تو آپ صرف اُن ممتاز احراری لیڈروں کے خلاف کارروائی کریں۔ جو اس خلاف ورزی میں شامل ہوں اور کم اہمیت رکھنے والے اشخاص کو اور ان لوگوں کو جو جماعت احرار سے تعلق نہیں رکھتے۔ نظر انداز کر دیں۔ مقامی اشخاص خاص طور پر نظر انداز کئے جائیں۔ سوائے اس حالت کے کہ وہ تنظیم احرار کے عہدہ داروں میں شامل ہوں اس سے مقصود یہ ہے کہ ہم احراری لیڈروں کو باقی عوام سے الگ تھلگ کر دیں۔ اگر ہم اپنا جال دور دور تک بچھا دیں گے اور دوسرے طبقوں کے اُن اشخاص کو بھی لپیٹ لیں گے۔ جن کو احراریوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے جلسوں میں شریک ہونے پر آمادہ کر لیا تھا۔ تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ عوام کا ایک وسیع طبقہ ذمہ داران حکومت کے خلاف صف آرا ہو جائے گا۔ اگر ان لوگوں کے خلاف جو جوش و خروش سے متاثر ہو کر احراریوں کے آلۂ کار بن گئے۔ اور بعض حالت میں بالکل ہی نادانستہ ان کے جال میں پھنس گئے۔ کوئی کارروائی کی گئی تو گویا ہم ان کو مجبور کریں گے کہ وہ سچ مچ ہی احراریوں سے جا ملیں۔ اگر اس قسم کے آدمیوں میں سے بعض پشیمانی محسوس کریں اور معافی مانگیں تو آپ کو انہیں بلا تامل معاف کر دینا چاہیئے۔ اگر ایسے لوگ معافی نہ بھی مانگیں۔ جب بھی ان کے خلاف مقدمات دائر نہ کئے جائیں اور اگر دائر کئے جا چکے ہوں تو فوراً واپس لے لئے جائیں۔ جب عوام کو یہ معلوم ہو جائے گا۔ کہ صرف اہم اور نمایاں احراری لیڈروں ہی کے خلاف قانونی کارروائی کی جا رہی ہے۔ تو وہ فوراً حکومت کی طرف مائل ہو جائیں گے اور کارکنان حکومت کے اقدامات عام طور پر پسند کئے جائیں گے۔

آپ اپنے احکام کی خلاف ورزی کی بنا پر احرار کے خلاف جو مقدمات دائر کریں۔ ان کی پیروی نہایت شدت سے ہونی چاہئے۔ اور عوام اور اخبارات میں ان کا مسلسل چرچا ہونا چاہیئے حکومت کے مقصود اور آپ کے اقدام کی صحت اور اس کا جواز صرف ان مقدمات کی کامیابی پر منحصر ہے۔ اس لئے ان کو عدالتوں میں دائر کرنے سے پہلے آپ اپنے عہدہ داران قانون کو قانونی اور واقعاتی دونوں پہلوؤں سے ان کا مکمل جائزہ لینے کی ہدایت کریں۔

آپ کا مخلص

دستخط/ غیاث الدین احمد

مسجدوں میں عام جلسوں کے خلاف دفعہ ۱۴۴ کے احکام کا نفاذ

سرگودھا اور گوجرانوالہ کے کیس

صوبائی حکومت کی صادر کردہ ہدایات کے ماتحت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں نے جو احکام صادر کئے ان کا نفاذ بعض مقامات پر ملزموں کی دارو گیر سے کیا گیا۔

۱۲- جون ۱۹۵۲ء کو احراریوں نے اعلان کیا کہ کل بروز جمعہ میونسپل پارک سرگودھا میں ۸ بجے صبح ایک جلسۂ عام منعقد ہوگا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک حکم زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری صادر کر کے جلسے کو ممنوع قرار دے دیا۔ یہ حکم اس پالیسی کے ماتحت دیا گیا جو حکومت نے اپنی مراسلت مورخہ ۵ جون ۱۹۵۲ء میں تجویز کی تھی۔ اس پر احراریوں نے ایک اور اعلانِ عام کیا کہ یہ جلسہ تاریخ مقررہ پر جمعہ مسجد میں منعقد ہوگا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بلا تاخیر یہ اعلان کرایا کہ جو حکم زیر دفعہ ۱۴۴ صادر کیا گیا ہے۔ اس کا اطلاق مساجد کے اندر عام جلسوں پر بھی مساوی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اس لئے مجوزہ جلسے کا انعقاد اس حکم کی خلاف ورزی کا مترادف سمجھا جائے گا۔ لیکن اسکے باوجود ۱۰ بجے یہ جلسہ زیر صدارت شیخ حسام الدین منعقد ہوا۔ ماسٹر تاج الدین انصاری صدر مجلس احرار پاکستان شیخ حسام الدین جنرل سیکرٹری مجلس احرار پاکستان۔ محمد عبداللہ صدر مجلس احرار ضلع سرگودھا نے حسب معمول احمدیوں کے خلاف تقریریں کیں اور دورانِ جلسہ میں "ظفر اللہ مردہ باد"، "مرزائیت مردہ باد" وغیرہ کے نعرے برابر لگائے گئے۔ میاں محمد اسحاق مجسٹریٹ (اون ڈیوٹی) نے حاضرین کو اور منتظمین جلسہ کو آگاہ کیا کہ اس جلسے میں ان کی شرکت خلافِ قانون ہے لیکن اس تنبیہ کی کسی شخص نے پروا نہ کی۔ اور جلسہ پونے بارہ بجے تک برابر جاری رہا۔ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی خلاف ورزی کے جرم میں ماسٹر تاج الدین انصاری۔ شیخ حسام الدین اور محمد عبداللہ کے خلاف ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمات دائر کئے گئے۔ عدالت نے ۱۴- جولائی ۱۹۵۲ء کو انہیں زیر دفعہ ۱۸۸ مجرم قرار دے کر چھ چھ ماہ قید با مشقت کی سزا دے دی۔ اسی واقعہ کی بنا پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے زیر دفعہ ۱۸۸ الف تعزیرات پاکستان دو علیحدہ استغاثے بھی ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں دائر کئے جن کی سماعت ۱۴- جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوئی۔ لیکن آغاز ہی میں پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ہدایات کے ماتحت ان مقدمات کو واپس لے لیا۔

دفعہ ۱۴۴ کے حکم کی دوسری خلاف ورزی گوجرانوالہ میں کی گئی۔ وہاں جمعہ مسجد شیرانوالہ باغ میں ۲۰- جون ۱۹۵۲ء کو بعد نماز جمعہ ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا۔ اس جلسے کا اعلان ایک روز قبل قصبے کے بازاروں میں مطبوعہ اشتہارات اور لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے سے کیا گیا تھا۔ خطبہ پڑھا جا رہا تھا کہ محمد امین جنرل سیکرٹری مجلس احرار نے اعلان کیا کہ ماسٹر تاج الدین انصاری اور شیخ حسام الدین لاہور سے آ گئے ہیں اور وہ اس جلسے میں تقریریں کریں گے۔ جلسہ نماز کے بعد شروع ہوا۔ اس وقت بہت سے لوگ جا چکے تھے۔ جلسے کی صدارت صاحبزادہ فیض الحسن نے کی۔ کارروائی کا آغاز "مرزائیت مردہ باد، ظفر اللہ

کو ہٹا دو اور مرزائیوں کو اقلیت قرار دو" کے نعروں سے ہوا۔ اور دو قرار دادیں منظور کی گئیں۔ اس خلاف ورزی کی بنا پر نو اشخاص کے خلاف جن میں ماسٹر تاج الدین انصاری۔ شیخ حسام الدین اور صاحبزادہ فیض الحسن شامل تھے مقدمات دائر کئے گئے۔ لیکن ۱۶۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو جب سماعت شروع ہونے لگی تو پراسیکیوٹنگ افسر نے حسب الحکم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ان مقدمات کو واپس لینے کی درخواست کی جو عدالت نے منظور کر لی۔ اور تمام ملزمین اسی دن رہا کر دیئے گئے۔

اب احراریوں نے مسئلے کو گڈمڈ کرنے کے لیے اس شکایت پر زور دینا شروع کیا کہ مساجد کے اندر خالص دینی سرگرمیوں کی پاداش میں نمازیوں کو گرفتار اور ماخوذ کیا جاتا ہے۔ اور حکومت لوگوں کے مذہبی عقائد و اعمال میں دست اندازی کر رہی ہے۔ ذیل میں ایک پُرلطف قصہ بیان کیا جاتا ہے جس سے اس پروپیگنڈے کی نوعیت معلوم ہو گی جو حکومت کے خلاف جاری کیا گیا تھا:۔

ایک شخص مولوی محمد شفیع خطیب جامع مسجد سرگودھا اور بعض دوسرے اشخاص زیر دفعہ ۱۴۴ گرفتار کیے گئے کیونکہ انہوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم زیر دفعہ ۱۴۴۔ کی خلاف ورزی کی تھی۔ مولوی شفیع نے ضمانت داخل کر دی اور رہا کر دیا گیا۔ اس شخص نے اپنی رہائی سے فائدہ اٹھا کر ۲۲۔ جون ۱۹۵۲ء کو عیدگاہ سرگودھا میں بصورت خطبہ ایک زہریلی تقریر کر ڈالی۔ جس میں یہ دعویٰ کیا کہ مرزا غلام احمد جو مدعی نبوت تھا وہ خود اور اس کے ماننے والے کافر ہیں۔ اس کا دعوائے نبوت جھوٹا تھا۔ گزشتہ زمانے میں جھوٹے نبی ہلاک کر دیئے جاتے تھے۔ حکومت کو اعلان کرنا چاہیئے کہ آیا پاکستان کی حکومت اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ اگر یہ اسلامی حکومت ہے تو مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ مسجدوں میں مذہبی معاملات پر بحث کریں۔ لیکن اگر یہ حکومت اسلامی نہیں تو مسلمان مسجدوں میں اس قسم کے مسائل پر بحث کرنا بند کر دیں گے۔ اور اس حالت میں مساجد کو بند کر دینا پڑے گا۔ مولوی شفیع برابر یہ کہتا رہا کہ مجھے سیاسیات سے کوئی سروکار نہیں لیکن جہاں تک میرے دینی عقائد کا معاملہ ہے میں ان باتوں کے بیان سے ہرگز باز نہ رہوں گا جو مذہب سے تعلق رکھتی ہیں ہم اس کیس کا ذکر اس لیئے نہیں کر رہے ہیں کہ بجائے خود اسکی کوئی اہمیت ہے۔ بلکہ ہمارا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ احرار نے مساجد کے اندر مذہب کے پردے میں من مانی کرنے کا پورا حق قائم کرنے کی غرض سے ایسی دلیل اختیار کی تھی جو بظاہر معقول نظر آتی تھی۔ اور جس سے استغاثہ کا موقف بہت ہی کمزور اور مضحکہ خیز ہو جاتا تھا۔ جب مساجد پر دفعہ ۱۴۴ کے اطلاق کا مسئلہ سامنے آیا۔ تو سیکرٹریٹ میں اس پر جو یادداشتیں لکھی گئیں۔ ان میں بھی اس دلیل کا اثر واضح تھا۔ مولوی محمد شفیع نے جب یہ تقریر کی تو وہ پہلے ہی دفعہ ۱۴۴۔ کی خلاف ورزی کے ایک مقدمے میں زیر ضمانت تھا۔ مندرجہ بالا تقریر کی بنا پر وہ دوبارہ ایک نئے جرم کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا لیکن پھر ضمانت دے کر رہا ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر مجلس احرار کی ہدایت یہ تھی کہ مساجد میں تقریریں کر کے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے والے ملزمین کو ضمانت پر جیل کو ترجیح دینی چاہیئے۔ چنانچہ اسی ہدایت کے مطابق مولوی محمد شفیع نے مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنی ضمانت منسوخ کرا لی۔ مولوی محمد شفیع احرار کا کوئی نمایاں ممبر نہ تھا۔ اور اس نمونے کے

مولویوں کے متعلق حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ اگر وہ معافی مانگ لیں تو انہیں رہا کر دیا جائے۔ لیکن اس مولوی نے نہ معافی مانگی نہ ضمانت داخل کی۔ جب مسجدوں پر دفعہ ۱۴۴ کے اطلاق سے پیدا ہونے والی پریشان کن صورت حال کے متعلق مسٹر قربان علی خاں سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے اس واضح صورت کو سامنے رکھ دیا جس کا حکومت کو بہر حال سامنا کرنا تھا۔ خان صاحب نے اپنی یادداشت مورخہ ۲۔ جولائی میں لکھا کہ جب تک حکومت یہ نہ مان لے کہ مسجد قانون شکنوں کے لئے مامن اور جائے پناہ ہے اس وقت تک اپنی اس ذمہ داری سے آزاد نہیں ہو سکتی کہ اسے ہر حال میں قانون کو نافذ کرنا ہے۔

میاں انور علی نے دو اشتہار دیکھے۔ جن میں مساجد پر دفعہ ۱۴۴ کے اطلاق کے خلاف اظہار برہمی کیا گیا تھا۔ اور اعلان کیا گیا تھا کہ ۱۳۔ جولائی کو برکت علی محمڈن ہال میں اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہو گا۔ اس پر مسٹر انور علی نے ۳۔ جولائی کو ایک یادداشت لکھی جس میں شکایت کی کہ حکومت کے خلاف اس قسم کا شرارت آمیز پروپیگنڈا احراری اور ان کے دوست کر رہے ہیں۔ یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ دفعہ ۱۴۴ مساجد پر نافذ کی گئی ہے۔ اور حق عبادت منسوخ کر دیا گیا ہے۔ جب تک محکمہ تعلقات عامہ اس پروپیگنڈا کو بے اثر کرنے کے لئے بہت بڑے پیمانے پر کام نہ کریگا حکومت کے خلاف لوگوں کے دلوں میں عام نفرت کا پھیلنا طبعی ہے۔ مسٹر قربان علی خاں نے اس سے اتفاق کیا اور لکھا کہ ہمارا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ محکمہ تعلقات عامہ ہے۔ ہوم سیکرٹری نے ۴۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا:۔

"۲۔ میرے خیال میں اب یہ امر اشد ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اپنے پروپیگنڈا کو تیز تر کر دیں۔ ورنہ ہم کوتاہی کی وجہ سے اپنا مقدمہ ہار جائیں گے۔ بے حد ضروری بات یہ ہے کہ ہم عوام کو بار بار یہ بتائیں کہ حقیقت میں ہم نے کیا کیا ہے اور ہمارے مختلف افعال کے وجوہ و اسباب کیا ہیں۔

۳۔ آج صبح میں نے ڈائرکٹر تعلقات عامہ کو طلب کر کے ان سے کہا ہے کہ وہ اپنی مشینری کی رفتار کو تیز کریں اور صوبے بھر میں پروپیگنڈا کے مواد کا سیلاب بہا دیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ ایک دو پریس نوٹ شائع کر دینے سے صورت حالات کا تقاضا پورا نہ ہو گا کیونکہ احراریوں نے عوام کی تائید حاصل کرنے کے لئے مسئلے کو گڈمڈ کرنے کی چال اختیار کر لی ہے۔

۴۔ چیف سیکرٹری کی ہدایت کے مطابق میں نے یکم جولائی کو مولانا اختر علی خاں اور ان کے گروہ کے ایڈیٹروں سے بات چیت کی۔ ان کو صورت حال سمجھائی۔ اور انہوں نے اپنے خطروں اور اندیشوں کے متعلق جتنے سوالات کئے میں نے ان کے جوابات دئے۔ یہ لوگ کاملاً مطمئن ہو کر واپس گئے لیکن مجھے افسوس ہے کہ ایک اخبار کے سوا باقی کسی نے حکومت کے اقدام کی حمایت میں کلمۂ خیر نہیں کہا ٹیلیفون پر چیف منسٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے کل پھر مولانا اختر علی خاں سے بات چیت کی۔ انہوں نے حکومت کے اقدامات کے جواز پر ایک دفعہ پھر یقین و اطمینان کا اظہار کیا۔ لیکن آج کے پرچے میں انہوں نے احراریوں کے تمام اقوال و دعاوی کی پھر تائید کی ہے۔ اس

گروہ کے دوسرے اخباروں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا (ان اخباروں کے متعلقہ تراشے شامل کر رہا ہوں) کل میں نے مسٹر حمید نظامی اور مسٹر مظہر علی خاں کو بھی طلب کیا اور آغاز ہی میں ان پر واضح کر دیا کہ ان کو طلب کرنے سے میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں پوری پوزیشن سمجھا دوں اس کے بعد وہ آزاد ہیں کہ میری باتوں کی جو تاویل و توجیہ چاہیں کر لیں۔ ان دونوں کا خیال یہ تھا کہ حکومت نے جو کچھ کیا وہ عوام کی تائید وحمایت کا مستحق ہے۔ اور اس سے ملک کی سالمیت کو تقویت پہنچے گی۔ لیکن مسٹر حمید نظامی نے کہا کہ اگر میں اپنے اخبار میں اس خیال کا اظہار کر دوں تو سب سے پہلے حکومت کے منظور نظر اور مسلم لیگی اخبارات ہی مجھے احمدی قرار دے کر بدنام کرینگے تاکہ اس طریقے سے اپنی اشاعت میں اضافہ کر لیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جس مقصد سے حکومت نے احرار کے خلاف انسدادی اقدام کیا ہے وہ بالکل فوت ہو جائے گا۔ تاوقتیکہ اخبارات بھی حکومت سے تعاون نہ کریں۔ اور اپنے کالموں کے ذریعے سے زہر پھیلانا بند نہ کر دیں۔ مسٹر مظہر علی خاں نے کہا کہ اس تمام مصیبت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حکومت نے خود مذہب کو اپنے نعروں کا موضوع اور اپنی قوت کا سرچشمہ بنا رکھا ہے اور اگر ایک گروہ اپنے مقاصد کے لئے مذہب کو استعمال کر سکتا ہے تو دوسروں سے کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کی خاطر مذہب کو آلۂ کار نہ بنائیں۔

چونکہ اس معاملے کا زیادہ تعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں سے ہے اس لئے کل ان کی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس کے بعد تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے نام ایک ہدایت نامہ جاری کیا جائے گا تاکہ وہ اپنے اضلاع میں عام نشر و اشاعت کا کام منظم کریں جس میں ڈائرکٹر تعلقات عامہ انکی ضروری امداد و رہنمائی کرینگے۔ اس کانفرنس میں جو دوسری سفارشات تجویز ہوں گی وہ فی الفور بغرض احکام چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی جائیں گی"۔

ہوم سیکرٹری نے یکم اور ۳۔ جولائی کو بھی بعض اخباروں کے ایڈیٹروں کو طلب کر کے ان سے گفتگو کی۔ اور بتایا کہ حکومت کے لئے مساجد کے اندر احراریوں کے جلسوں کو ممنوع قرار دینا کیوں ضروری ہو گیا تھا ہوم سیکرٹری صاحب نے اخباروں سے تعاون کی استدعا کی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ انہوں نے پوزیشن بالکل واضح کر دی ہے لیکن چند ہی روز کے اندر انہیں یہ دیکھکر بے حد مایوسی ہوئی کہ ان کی توقعات نقش بر آب ثابت ہوئی ہیں اصل بات یہ تھی کہ ہوم سیکرٹری صاحب کو بعض اخبار نویسوں کی بے ضمیری کا علم نہ تھا۔

اس مرحلے پر احراریوں نے علما کی تائید حاصل کرنے کے لئے ۱۳۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور میں تمام مسلمان پارٹیوں کی ایک کنونشن منعقد کی اور ظاہر کیا کہ عقیدۂ ختم نبوت تمام مسلمانوں کا مشترکہ عقیدہ ہے اور اس میں مختلف مذہبوں اور فرقوں کا کوئی امتیاز نہیں۔ اس کنونشن کے اعلان سے جو صورت حالات پیدا ہوئی اس پر غور کرنے کے لئے ۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو تمام اہم اضلاع کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں

کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت چیف سیکرٹری نے کی۔ اور جس میں ہوم سیکرٹری انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈی آئی جی سی آئی ڈی اور ڈائرکٹر تعلقات عامہ شامل ہوئے۔ اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل فیصلے کئے گئے :۔

"(۱) جس جگہ ضروری ہو دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے ماتحت صادر ہونے والے احکام میں ایسی ترمیم کر لی جائے کہ ان کا اطلاق مخصوص طور پر صرف ان جلسوں پر ہو جو احراریوں یا احمدیوں کی طرف سے کئے جائیں۔ جلسے کے مقام کا ذکر نہ کیا جائے۔ حکومت نے نمونے کے جس حکم کا وعدہ کیا تھا وہ حتی الامکان جلد سے جلد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو بھیج دیا جائے گا لیکن متعلقہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو حکومت کے مسودے کے انتظار میں ترمیم شدہ احکام کا اجرا ملتوی رکھنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) اگر احرار پارٹی یا احمدی جماعت کے کوئی ممبر کسی ایسے جلسہ عام میں جو ان کی تنظیمات کی طرف سے منعقد نہ کیا گیا ہو تیز و تند یا اشتعال انگیز تقریریں کریں تو زیر دفعہ ۱۵۳-الف یا پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت کارروائی کرنے کے لئے حکومت سے استصواب کیا جائے۔ جب تک حکومت کے احکام موصول نہ ہوں ملزموں کو گرفتار نہ کیا جائے سوائے اس حالت کے کہ گرفتاری اشد ضروری ہو جائے۔

(۳) احراری اور احمدی جماعتوں کے جو جلسے مساجد سے باہر منعقد ہوں ان کو بھی منتشر کرنے کے لئے کوئی اقدام نہ کیا جائے سوائے اس حالت کے کہ قانون و انتظام کے قیام کے لئے یہ امر اشد ضروری ہو جائے۔ مساجد کے اندر منعقد ہونے والے جلسوں میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے اور تمام جلسوں کے متعلق خواہ وہ کسی عبادت گاہ میں ہوں خواہ کسی دوسرے پبلک مقام پر منعقد کئے جائیں اقدام کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ صرف ان دو گروہوں کے سرکردہ لیڈروں کے خلاف باقاعدہ مقدمات دائر کئے جائیں۔

(۴) حکومت کے پروپیگنڈا کی مشینری کی رفتار تیز کر دی جائے تاکہ غرضمند جماعتیں عوام کو دھوکا نہ دے سکیں اور حکومت کے اقدامات کی صحیح حیثیت اور نوعیت عامۃ الناس کو واضح طور پر سمجھائی جاسکے۔ کتابچے۔ دستی اشتہار اور پوسٹر تیار کر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو تقسیم کئے جائیں تاکہ وہ ان کو اپنے اپنے اضلاع میں پھیلا دیں اخباروں کے ذریعے سے پروپیگنڈا بھی تیز تر کر دیا جائے اور جو اخبارات علی العموم حکومت کے حامی ہیں ان سے بھی اس معاملے میں تعاون طلب کیا جائے کیونکہ ان کا موجودہ رویہ اس امر میں حکومت کے حق میں نہیں ہے۔

(۵) ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو چاہیئے کہ مختلف مساجد کے مولویوں اور خطیبوں سے مل کر صورت حالات کی صحیح تصویر ان کے سامنے پیش کریں تاکہ غرضمند جماعتیں ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر انہیں حکومت کے خلاف گمراہ نہ کر سکیں۔

(۶) ۱۳-جولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور میں جو کنونشن ہو رہی ہے اس میں کسی طریقے سے مداخلت نہ کی جائے۔

اس کنونشن میں جو تقریریں کی جائیں اور جو فیصلے کیے جائیں ان کا جائزہ بعد میں لیا جائے کہ آیا ان کے خلاف کوئی کارروائی ضروری ہے اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا ڈائرکٹر تعلقات عامہ اس کنونشن میں شریک ہونے کا ارادہ کرنے والوں سے بات چیت کر کے انہیں تلقین تشدد اور قانون شکنی کی مخالفت پر آمادہ کر سکیں تو یہ کنونشن حکومت کے نقطۂ نگاہ سے حقیقتہً مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ڈی آئی جی سی آئی ڈی کوشش کرینگے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ان اشخاص کے ناموں کی فہرست مہیا کر دیں جو اس کنونشن میں شریک ہونے والے ہیں۔

(۷) اس سلسلے میں خواہ حکام بجائے خود کوئی کارروائی کریں یا حکومت کی وقتاً فوقتاً جاری کی ہوئی ہدایات کے مطابق اقدام کریں انہیں ہر حالت میں یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ حکومت کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ احراری احمدی نزاع کی وجہ سے قانون و انتظام کو جو خطرہ لاحق ہے اس کو نابود کرنے کے لئے ان دو جماعتوں کو باقی عوام سے منقطع اور الگ تھلگ کر دیا جائے اس سے یہ نتیجہ ہوگا کہ احراریوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش میں جو یہ بے بنیاد ہوا کھڑا کر دیا ہے کہ حکومت عوام کے مذہبی اور سیاسی حقوق میں مداخلت کر رہی ہے وہ بالکل ختم ہو جائے گا۔"

اسی دن بعض احراری لیڈروں نے مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی سے ملاقات کر کے ان کے سامنے یہ طعمہ پھینکا کہ ہم ایسی تقریریں بند کرنے پر آمادہ ہیں جن سے نقض امن کا احتمال ہو بشرطیکہ دفعہ ۱۴۴ کے احکام اور ان احکام کی خلاف ورزی کے مقدمات واپس لے لیئے جائیں۔ مسٹر انور علی نے اس پیشکش کے متعلق اپنا تاثر ذیل کے الفاظ میں قلمبند کیا:۔

"آج صبح مولانا اختر علی خاں مجھ سے ملنے آئے مجلس احرار کے نئے صدر مولوی غلام غوث سرحدی بھی انکے ساتھ تھے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے اب احرار محسوس کر رہے ہیں کہ ان کی تقدیر پر مہر لگ چکی ہے اور اگر انہوں نے فوراً عامۃ المسلمین کی ہمدردی حاصل نہ کی تو وہ بحیثیت ایک سیاسی جماعت کے ختم ہو جائیں گے۔ ان کی اس ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس امر کا یقین دلائیں کہ احرار من حیث الجماعت ایک بیان شائع کرنے پر آمادہ ہیں جس میں یہ اعلان کیا جائے گا کہ آئندہ ایسی تقریریں نہیں ہونگی جن سے امن و سکون عامہ کے خلل پذیر ہونے کا احتمال ہو۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت اس کے ساتھ ہی گرفتار شدہ اشخاص کو رہا کر دے اور احکام زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری واپس لے لئے جائیں میں نے ان کو آج کے اجلاس کے فیصلے سمجھائے اور کہا کہ اگر وہ دونوں لیڈر تحریری معافی نامے داخل کر دیں تو غالباً حکومت احکام کو واپس لینے اور تمام احراریوں کو رہا کرنے کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے گی۔ مولوی غلام غوث نے کوئی جواب نہ دیا اور کہا کہ جہاں تک ہماری پارٹی کا خیال ہے ماسٹر تاج الدین انصاری نے کوئی قصور نہیں کیا۔ مجھے اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر ایک دفعہ احرار پر یہ واضح ہو جائے کہ حکومت حقیقتہً آمادۂ عمل ہے اور اپنے فیصلوں کو نہیں بدلے گی تو وہ تصفیہ پر بیش از بیش

آمادہ ہو جائیں گے"۔

مسٹر قربان علی خاں کی حقیقت بینی ان کے اس فقرے سے ظاہر ہے:۔

"میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ حکومت اس فیصلے کو بدلے کہ قانون و انتظام ہر حال میں قائم رکھا جائے گا۔ جو چیز بھی ایسی صورت حالات پیدا کرنے پر مائل ہو جس کا انجام نقض امن کی صورت میں نکلے اس پر نہایت زور دار اور موثر ضرب لگانا ضروری ہے"۔

ہوم سیکرٹری نے اپنے آپ کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا:۔

"جہاں تک بنیادی مسئلے کا تعلق ہے اب معلوم ہوتا ہے احرار محسوس کر چکے ہیں کہ حکومت نے ان کی ان کوششوں کو ناکام کر دیا ہے جو وہ مسائل کو گڈ مڈ کرنے کے لئے کر رہے تھے اور اُن کو امن عامہ میں خلل اندازی کے ناقابل بنانے کے لئے منقطع اور الگ تھلگ کیا جا رہا ہے"!

۵۔ جولائی کی کانفرنس میں جو فیصلے کئے گئے تھے ان کو موثر طور پر نافذ کرنے کے لئے مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے ۱۹۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو پنجاب کے تمام پولیس سپرنٹنڈنٹوں کے نام ہدایات صادر کیں کہ مساجد میں یا ان کے باہر جو تقریریں کی جائیں ان کے متعلق پوری معلومات محفوظ رکھیں اور ذہین آدمیوں کو اس کام پر مقرر کریں جو ان تقریروں کو اپنے حافظے کی مدد سے قلمبند کر سکیں۔

چیف منسٹر صاحب نے ۸۔ جولائی کو اس کانفرنس کے فیصلوں پر منظوری دے دی۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں جب چیف منسٹر صاحب نتھیا گلی میں مقیم تھے مولانا سلیمان ندوی نے (جو ایک دستوری کمیٹی کے سلسلے میں نتھیا گلی آئے ہوئے تھے) ان سے مساجد پر دفعہ ۱۴۴ کے اطلاق کے متعلق تشویش کا اظہار کیا

۱۰۔ جولائی کو تین مولویوں نے ہوم سیکرٹری سے ان کے دفتر میں ملاقات کی اور ان سے چند سوالات کئے اور اس کے بعد مولوی محمد علی جالندھری نے بھی ۱۱۔ جولائی کو ایک چٹھی میں ان سوالات کو دہرا کر مندرجہ ذیل چار نکات کی صراحت کی استدعا کی:۔

(۱) دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے ماتحت جو قیود نافذ کی گئی ہیں آیا وہ مساجد میں تردید مرزائیت پر عائد کی گئی ہیں۔

(۲) آیا یہ قیود پچھلے دنوں مساجد پر سے اٹھالی گئی ہیں۔

(۳) آیا مسلمانوں کو مسجدوں میں تردید مرزائیت اور مسئلہ ختم نبوت پر تقریریں کرنے کی اجازت ہے۔

(۴) آیا مسلمانوں کو مسجدوں سے باہر ان دو مسئلوں کے متعلق جلسے منعقد کرنے کی اجازت ہے۔

ہوم سیکرٹری نے انسپکٹر جنرل پولیس سے مشورہ کرنے کے بعد اس چٹھی کا جواب دیا جس میں بتایا کہ جو احکام زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری صادر کئے گئے ہیں۔ ان کا اطلاق صرف ان عام جلسوں پر ہوتا ہے جن کے انعقاد کا انتظام مجلس احرار پاکستان یا احمدی جماعت کے افراد کی طرف سے کیا گیا ہو۔ اس کے سوا حکومت نے مساجد یا دوسری عبادت گاہوں پر یا عبادت اور ادائے رسوم مذہبی پر کبھی کوئی قید عائد نہیں کی۔

ہوم سیکرٹری نے یہ بھی کہا کہ احراریوں اور احمدیوں کے سوا دوسری تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو عام جلسے

منعقد کرنے کی آزادی ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ڈائرکٹر تعلقات عامہ کو بھی ہدایت کی جا چکی ہے کہ وہ اپنا پروپیگنڈا تیز تر کر دیں تاکہ مساجد کے اجتماعات پر ان احکام کے اطلاق کے متعلق صحیح پوزیشن عوام پر واضح کی جا سکے لیکن اس سلسلے میں جو کچھ اب تک معلوم ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب جولائی کے پہلے ہفتے میں ہوم سیکرٹری بعض اخبار نویسوں سے گفتگو کر چکے تو ڈائرکٹر نے بھی بعض ایڈیٹروں سے خطاب کر لیا اور ۱۱۔جولائی سے پہلے کسی وقت احترام مساجد کے عنوان سے ایک پوسٹر شائع کیا جس میں اس امر کی صراحت کی کہ نہ مساجد میں جانے پر کوئی پابندی ہے نہ رسوم مذہبی کی بجا آوری پر مسجدوں کے اندر یا باہر کوئی قید ہے اور نہ مذہبی تقریروں اور خطبوں پر یا عقیدۂ ختم نبوت یا کسی دوسرے مذہبی عقیدے کی توضیح کا امتناع کیا گیا ہے۔ دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت احکام کے نفاذ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو تشدد اور لاقانونی کی تلقین سے روکا جائے اور مذہب کے پردے میں مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان بدنظمی۔ تشدد اور نقض امن کی اشتعال انگیزی سے باز رکھا جائے۔

مسٹر چیمہ ڈپٹی کمشنر منٹگمری نے ایک تجویز پیش کی جس کی تائید ۵ جولائی ۱۹۵۲ء کی کانفرنس میں دوسرے ڈپٹی کمشنروں نے بھی کی۔ وہ تجویز یہ تھی کہ مرکزی حکومت سے استدعا کی جائے کہ اس موضوع پر ایک مختارانہ بیان جاری کر کے صورت حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ حکام کو یہ احساس تھا کہ اس قسم کے بیان سے صورت حالات بالکل واضح ہو جائے گی اور مرکز کی تجویز کردہ پالیسی کے عملدرآمد میں صوبائی حکومت کے ہاتھ بڑی حد تک مضبوط ہو جائیں گے لیکن اس وقت تک ایک چٹھی بصیغۂ راز نمبری (۱) .S-۵۲/۱/۷ مورخہ ۲۔جولائی ۱۹۵۲ء منجانب سیکرٹری وزارت داخلہ حکومت پاکستان تمام صوبائی حکومتوں اور مقامی نظامتوں کے نام موصول ہو چکی تھی۔ جو درج ذیل ہے:۔

"مجھے آپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانے کی ہدایت کی گئی ہے کہ گزشتہ چند مہینوں کے اندر پاکستان کے بعض حصوں میں مذہبی اور فرقہ وارانہ تنازعات بہت نمایاں طور پر بڑھ گئے ہیں یہ تنازعات خصوصاً احراریوں اور احمدیوں کے درمیان برپا ہیں اور بعض مقامات پر نقض امن کا باعث ہوئے ہیں حکومت پاکستان کا خیال ہے کہ اگر اس صورت حال کو بدستور بے روک ٹوک چلنے دیا گیا تو اس سے نہایت سنگین نتائج برآمد ہونے کا احتمال ہے لہٰذا صوبائی حکومتوں اور مقامی نظامتوں کی توجہ وزارت داخلہ کی چٹھی نمبری (۱) .S .8 73 مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جو موجودہ بیتوں ہی پر ارسال کی گئی تھی یہ چٹھی سہولت حوالہ کی غرض سے ذیل میں نقل کی جاتی ہے:۔

'ایسے واقعات رونما ہو چکے ہیں کہ مختلف مسلمان فرقوں نے ایک دوسرے کے خلاف قابل اعتراض پروپیگنڈا کیا ہے جس سے طرفین کی دل آزاری ہوئی ہے اور انتہائی صورتوں میں بعض اشخاص کے خلاف تشدد بھی کیا گیا ہے اس قسم کی شورش کا ایک نمونہ وہ ہے جو پنجاب میں

احراری احمدی نزاع کی صورت میں ظاہر ہوا ہے مرکزی حکومت کا خیال ہے کہ بلاشبہ کسی جماعت اور فرقے کے اس جائز حق پر نا واجب پابندی عاید نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے عقاید مذہبی کی تبلیغ کرے اور اس معاملے میں مختلف عقاید کے مبلغوں کے درمیان کسی قسم کا فرق و امتیاز ملحوظ نہ ہونا چاہیئے لیکن مذہبی مناظروں اور مناقشوں کو معقول حدود کے اندر محدود رکھنا چاہیئے اور انہیں ایسے نقطے پر پہنچنے کی اجازت نہ دینی چاہیئے کہ امن و سکون عامہ خطرے میں پڑ جائے۔ مرکزی حکومت کی رائے میں جنگجویانہ اور جارحانہ فرقہ آرائی کو سختی سے دبا دینا ضروری ہے۔

۲۔ مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں کسی ایسے اقدام کے متعلق جو آپ اپنے دائرہ نظم و نسق میں ضروری سمجھیں مرکزی حکومت کے خیالات آپ تک پہنچا دوں'۔

اگر صوبائی حکومتیں اور مقامی نظامتیں اس پالیسی کو جو مندرجہ بالا چھٹی میں واضح کی گئی ہے پوری پابندی اور غیر جانب داری سے نافذ کرینگی تو حکومت پاکستان کو خوشی ہوگی۔ اس پالیسی کا اطلاق ان اخباروں اور رسالوں پر بھی مساوی حیثیت سے ہوگا جو فرقہ وارانہ تحریرات شائع کرنے کے عادی ہیں۔

حکومت پاکستان کو اس اقدام پر اطمینان ہے جو پچھلے دنوں حکومت پنجاب نے فرقہ وارانہ شورش کے خلاف کیا ہے۔ ہوم سیکرٹری کا خیال بھی یہی تھا کہ مرکزی حکومت سے استصواب ضروری ہو گیا ہے چنانچہ انہوں نے ۴۔ جولائی کو حسب ذیل یادداشت قلمبند کی:-

"(بصیغہ راز)

میں احراری احمدی نزاع کے متعلق بنیادی پالیسی کی فائل چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کیونکہ میرے نزدیک وقت آگیا ہے کہ بلند سطح پر مرکزی حکومت سے استدعا کی جائے کہ اس مسئلے کے متعلق اپنی پالیسی وضع کرے (بشرطیکہ اب تک وضع نہ کر چکی ہو) اور عمل اور ہدایت سے ہم پر اور اہل ملک پر اس پالیسی کا اظہار کرے۔

۲۔ بلاشبہ یہ صوبہ احراریوں کا گڑھ ہے اور پاکستان بھر کے صوبوں میں سے اسی صوبے میں احمدیوں کی بڑی سے بڑی تعداد آباد ہے لیکن احراری اپنی سیاسی "بحالی" کی غرض سے مذہب کے پردے میں جس مذہبی دیوانگی اور فلسفۂ نفرت کی تلقین و تبلیغ کر رہے ہیں اسکو اگر آج روکا اور ختم نہ کیا گیا تو یہ صورت نہ اس صوبے کے حدود تک اور نہ احراریوں اور احمدیوں تک محدود رہے گی۔ حکومت نے بعض تدابیر اس مقصد سے اختیار کی ہیں کہ احراری یا احمدی ایسے حالات پیدا نہ کرنے پائیں جن سے امن و انتظام عامہ خطرے میں پڑ جائے ان تدابیر کے اختیار کرنے سے پہلے پوری طرح غور و خوض کر لیا گیا ہے اور تمام دوسرے طریقے آزمائے جا چکے ہیں جن سے احراریوں کو ان کے طرز عمل سے روکنا مقصود تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس معاملے

میں جارحیت کے ذمہ دار احرار ہیں اور اس پورے مناقشے کے بانی مبانی بھی وہی ہیں۔ اب وہ اپنی ناکامی کو محسوس کر رہے ہیں اور انہیں اپنا سیاسی حشر سامنے نظر آرہا ہے چنانچہ وہ واقعات کو توڑ مروڑ کر اور حکومت کے عزائم و اعمال کے خلاف غلط بیانیاں کر کے مسلمانوں کے جذبات سے فائدہ اٹھانے کی اندھا دھند کوشش کر رہے ہیں۔ عنقریب یہ حقیقت ہر شخص پر واضح ہو جائیگی کہ حکومت صرف احرار کی برپا کی ہوئی شورش کو روکنے کی غرض سے احرار ہی کو لگام دینا چاہتی ہے اور عوام کی کسی جماعت یا گروہ کی جائز، سیاسی یا مذہبی سرگرمیوں میں حکومت کی مداخلت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حکومت کی دیانت اور نیک نیتی کسی حمایت کی محتاج نہیں لیکن میرے نزدیک ہمیں مرکزی حکومت سے تعاون کی استدعا کرنے کا حق ہے تاکہ ہمیں اس صوبے کے نظم حکومت کے فرائض کی بجا آوری میں سہولت ہو۔ خصوصاً ایسے معاملات میں جو مرکزی حکومت کے دائرہ عمل کے اندر ہیں۔

۳۔ احرار اب عوام کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے تین نعرے استعمال کر رہے ہیں:۔

(۱) مسئلہ ختم نبوت کی تبلیغ و اشاعت

(۲) احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا اعلان

(۳) چودھری ظفراللہ خان کی موقوفی

۴۔ جہاں تک نمبر ۱ کا تعلق ہے مرکزی حکومت ہمیں واضح طور پر بتائے کہ ہمیں کیا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس مطالبے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں جسے احرار اور بعض دوسرے مسلمان "ردِ مرزائیت" کہتے ہیں کیا ہمیں اُن سرگرمیوں کی اجازت دینی چاہیئے یا انکی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے یا اُن سے چشم پوشی کرنی چاہیئے جن کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک کے باشندوں کی ایک قلیل سی جماعت کو جسمانی یا مذہبی اعتبار سے نابود کر دیا جائے؟ احمدیوں کی جماعت مسلّمہ عقائد پر قائم ہے اور غیر احمدیوں کے عقاید رنگا رنگ ہیں اگر آخرالذکر کو احمدیوں کے خلاف جوش و خروش کے اظہار کی اجازت دی جائے تو کیا احمدیوں کو بھی یہ حق دیا جائے گا کہ وہ منبر اور پلیٹ فارم سے صرف اپنے عقاید کو صحیح اور دوسرے تمام عقاید کو کفر قرار دیں؟ اگر ہم یہ حق جمہور کے کسی ایک طبقے کو دے دیں تو کیا ہم عیسائیوں کو یہ اجازت دینے کے لئے تیار ہوں گے کہ وہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے خیالات کی اشاعت کریں؟ اور آیا ہم شیعوں کو بعض نامور ترین صحابہ کرام کے متعلق اپنے جذبات کے عام مظاہرے کا موقع دینے پر آمادہ ہوں گے؟ کیا مقصود یہ ہے کہ اس ملک کو متخاصم گروہوں اور مذہبوں کا میدانِ جنگ بنا دیا جائے تاکہ جو لوگ شکست کھا جائیں وہ یا تباہ ہو جائیں یا مذہب بدلنے پر مجبور کر دیئے جائیں جس اژدہا کو احرار منظر عام پر لانا چاہتے ہیں اسکو اس کے خروج سے پہلے ہی ہلاک کر دینا چاہیئے ورنہ وہ ہماری آزادی اور ہمارے تمام مالوفات و محبوبات کو نگل جائے گا یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں مرکز کو ہماری رہنمائی کرنی چاہیئے

اگر احرار اور دوسرے غیر احمدی کسی مذہبی عقیدے کو احمدیوں سے زبردستی منوانا چاہیں گے۔ تو قانون و انتظام کے مسائل لازماً پیدا ہوں گے اس لئے ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ آیا ہمیں قانون و انتظام کی مصلحتوں کو سب سے زیادہ اہمیت دینی چاہیئے یا عوام کی اکثریت کے مذہبی عقائد و جذبات کو ہر حال میں مقدم رکھنا چاہیئے۔ ان تمام نکات کے تصفیے اور سوالات کے جواب کی اہلیت انہی لوگوں میں ہے جو ہمارا دستور وضع کر رہے ہیں اور جن کا دائرہ عمل صوبائی حکومت کی طرح محدود نہیں ہے۔

۵۔ احراریوں کا دوسرا منصوبہ یہ ہے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ اس امر کا فیصلہ قطعی طور پر مرکزی حکومت کا کام ہے اور اسے اس میں مزید تاخیر سے کام نہ لینا چاہیئے اگر حکومت مرکزی کے ارکان محسوس کرتے ہیں کہ یہ مطالبہ قرین انصاف ہے اور ان اصولوں کے مطابق ہے جو اس ملک کی آئندہ تقدیر کے متعلق ان کے دماغوں میں موجود ہیں تو ان کو یہ مطالبہ بلا تامل منظور کر لینا چاہیئے اور اگر اس کے برعکس وہ اس مطالبہ کو بیہودہ سمجھتے ہیں تو انہیں نہایت واضح الفاظ میں ایک مختارانہ بیان جاری کر دینا چاہیئے۔ ارکان مرکز کو اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیئے کہ احرار نے جو آخری دم تک پاکستان کے قیام کی مخالفت کرتے رہے اب پاکستان کو ختم کرنے کے لئے جو دباؤ ڈالنا شروع کیا ہے آیا وہ اس سے مغلوب ہو جائیں گے؟ مرکز کا جو کچھ بھی فیصلہ ہو اس سے حتی الامکان جلد سے جلد ہر شخص کو مطلع کر دینا چاہیئے۔

۶۔ احراریوں کا تیسرا مطالبہ بھی ایک ایسا امر ہے جس کے متعلق ارکان مرکز کو اپنا خیال عوام کو بتا دینا چاہیئے اگر وہ اب تک عزت مآب وزیر امور خارجہ پر اعتماد رکھتے ہیں (اور مجھے یقین ہے کہ رکھتے ہیں) تو انہیں موصوف کے خلاف بدگوئی کے مہم کو فرو کرنے کے لئے اس حقیقت کا اعلان کرنے میں کون سی چیز مانع ہے؟ اب عوام الناس کا احساس یہ ہے (گو یہ احساس ہرگز حق بجانب نہیں) کہ عزت مآب وزیر خارجہ کے بعض رفقائے کار اس شورش کی پشت پر ہیں ورنہ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ ان کے خلاف توہین و دشنام کو نہایت بے فکری سے نظر انداز کر رہے ہیں۔

۷۔ اگر چیف منسٹر صاحب میری اس تجویز کو پسند کرتے ہیں کہ مرکزی حکومت کو لکھا جائے تو وہ از راہ نوازش مناسب الفاظ میں ایک چٹھی عزت مآب وزیر اعظم پاکستان کو لکھیں۔ عزت مآب چیف منسٹر صاحب جناب گورنر صاحب سے بھی پوری صورت حالات پر گفتگو کر لیں تو مناسب ہو گا۔

۸۔ میں ان اقدامات کا تذکرہ کر کے اس یادداشت کو زیادہ بوجھل نہیں بنانا چاہتا جو ہم اپنے پروپیگنڈا کو تیز کرنے کے سلسلے میں کر رہے ہیں تاکہ ہم محض کوتاہی کی وجہ سے اپنا مقدمہ نہ ہار جائیں اور عوام کو صحیح اور اصلی واقعات معلوم ہو جائیں ہم حکومت کی اس پالیسی کے مطابق عمل درآمد کی تدبیریں بھی کر رہے ہیں کہ احراری احمدی نزاع صوبے کے قانون و انتظام کے لئے خطرے کا

باعث نہ رہے۔ عزت مآب چیف منسٹر صاحب کو زبانی اور دوسرے ذریعوں سے برابر تازہ ترین صورت سے مطلع رکھا جا رہا ہے لیکن میں یہاں اس امر کا تذکرہ کر دینا چاہتا ہوں کہ احراری نہایت چالاکی سے کام لیکر اس ماہ کی ۱۳- تاریخ کو مسئلہ ختم نبوت پر غور کرنے کے لئے مختلف مذہبی انجمنوں کی ایک کنونشن منعقد کر رہے ہیں۔ میں نے بھی کل ان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کی ایک کانفرنس طلب کی ہے جن کا زیادہ تر تعلق اس مسئلے سے ہے۔ ہماری کانفرنس میں جو سفارشات وضع کی جائیں گی وہ فی الفور عزت مآب چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی جائینگی۔ چونکہ کنونشن ۱۳- کو منعقد ہو رہی ہے اس لئے میں چیف منسٹر صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ چیف سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس کو مجبور کریں کہ اس موقع پر وہ اپنی رخصت ملتوی کر دیں۔ اس شورش کے فرو ہو جانے کے بعد وہ شوق سے رخصت پر جا سکتے ہیں۔

۹۔ پیشتر اس کے کہ یہ فائل سی آئی ڈی کے خاص قاصد کے ہاتھ چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں منتھیا گلی بھیجی جائے میں چیف سیکرٹری صاحب سے استدعا کروں گا کہ وہ اس کا معائنہ کریں۔"

اس پر چیف سیکرٹری صاحب کے خیالات حسب ذیل تھے:-

"چیف منسٹر صاحب ازراہ کرم ہوم سیکرٹری کی مندرجہ بالا یادداشت صفحہ اول سے ملاحظہ فرمائیں

۲۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہمیں اس اقدام کے متعلق جو ہم نے اپنے صوبے میں قانون و انتظام کے قیام کے لئے کیا ہے مرکزی حکومت سے تائید و حمایت طلب کرنے کی ضرورت ہے۔ عام حالات میں ہمیں ان سے کسی ایسے بیان کے اجرا کی استدعا نہ کرنی چاہیئے جس میں ہمارے اقدامات کی حمایت کی گئی ہو لیکن اس کیس میں احرار نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ ان کی شورش کو مرکزی حکومت یا اس حکومت کے بعض وزرا و حکام کی تائید حاصل ہے سی آئی ڈی کی رپورٹ مظہر ہے کہ شہروں میں یہ بات سرگوشیوں کے ذریعے سے پھیلائی جا رہی ہے اس لئے یہ مناسب ہے کہ ہم مرکزی حکومت کو اس صورت سے مطلع کر دیں اور اُن سے اس مطلب کا بیان جاری کرنے کی خواہش کریں کہ اس افواہ میں کوئی صداقت نہیں ہے اور مرکزی حکومت صوبائی حکومت کے اقدامات کی پوری پوری تائید کرتی ہے۔

۳۔ اگر چیف منسٹر صاحب عزت مآب وزیر اعظم پاکستان کو ذاتی سطح پر ایک مکتوب بھیجیں تو ہمیں بہترین نتائج حاصل ہونے کی توقع ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جس مسئلے کا اوپر ذکر کیا ہے اس کے متعلق رسمی خط و کتابت بھی موزوں و مناسب رہے گی۔

۴۔ ہوم سیکرٹری صاحب اس ذکر کو حذف کر گئے ہیں کہ اس موضوع پر مرکزی حکومت کی پالیسی کی تشریح ہمارے سامنے C - 11/M1 میں کی جا چکی ہے پالیسی یہ ہے کہ مذہبی نزاعات معقول حدود سے متجاوز نہ ہونے چاہئیں اور انہیں ایسے نقطے پر پہنچنے کا موقع نہ دینا چاہیئے جہاں

امن و سکونِ عامہ خطرے میں پڑ جائے مرکز والوں نے لکھ دیا ہے کہ جنگجو یانہ اور جارحانہ فرقہ آرائی کو شدت سے دبا دینا ضروری ہے۔ اسی پالیسی کا اعادہ اس چھٹی میں کیا گیا ہے جو کل موصول ہوئی ہے: اور جو P U C کی حیثیت سے شامل ہے اس چھٹی میں اہل مرکز نے اس اقدام پر اظہار اطمینان کیا ہے جو حکومت پنجاب نے فرقہ دار شورش کو فرو کرنے کے لئے کیا ہے۔ ان حالات میں میں ہوم سیکرٹری کے اس بیان سے اتفاق نہیں کرتا کہ حکومت مرکزی نے ہم پر اپنی پالیسی کا اظہار نہیں کیا۔

۵۔ یہ سوالات کہ آیا احمدی کبھی اقلیت قرار دیئے جائیں گے یا عزت مآب چودھری ظفر اللہ خاں عہدۂ وزارت خارجہ سے برطرف کئے جائیں گے صوبائی حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ پہلے مضمون کے متعلق اعلان کرنا بھی حکومت مرکزی کا کام نہیں۔ بلکہ میرے نزدیک اس کا فیصلہ کرنا دستور ساز اسمبلی کا کام ہے ہماری طرف سے وزیر اعظم پاکستان کو یہ سمجھانا واضح طور پر نامناسب ہے کہ وہ ایک اعلان کر کے بتائیں کہ انہیں عزت مآب وزیر خارجہ پر اعتماد ہے۔ لیکن مرکزی حکومت کو مراسلہ بھیجتے وقت ہم اس امر کا تذکرہ کر سکتے ہیں کہ یہ دو مطالبے احرار پارٹی کی طرف سے پیش کئے جا رہے ہیں۔

۶۔ یہ سوال کہ انسپکٹر جنرل پولیس اور میں رخصت پر جائیں یا نہ جائیں اسکا فیصلہ چیف منسٹر صاحب کا کام ہے۔ میں نے انسپکٹر جنرل اور ہوم سیکرٹری سے بات چیت کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر میں ۷۔ تاریخ کو سولہ دن کے لئے رخصت پر چلا جاؤں تو کوئی حرج نہ ہوگا۔ انسپکٹر جنرل کا ارادہ ۱۵۔ کو رخصت پر جانے کا ہے لیکن اگر صورت حالات کسی اعتبار سے بگڑنے لگے تو وہ نہیں جائیں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ رخصت سے میری واپسی تک کوئی سنگین واقعات پیش آنے کا احتمال ہے۔"

جب یہ فائل نتھیا گلی کے مقام پر چیف منسٹر کے پاس پہنچی تو انہوں نے لکھا:-

"میں خود بھی ایسی تدبیر اختیار کر رہا ہوں کہ احراری احمدی نزاع کے مسئلہ کی نسبت بلکہ دوسری تمام شورشوں اور تحریکوں کے متعلق بھی مرکزی حکومت سے ایک قطعی اور معقول پالیسی وضع کراؤں تاکہ معلوم ہو کہ ایسے حالات میں عموماً کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اغلب ہے کہ اس ماہ کے اواخر میں ایک بلند ترین سطح کی کانفرنس اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے کراچی میں منعقد ہوگی۔

اس اثنا میں میرے نزدیک ہوم سیکرٹری کے تجویز کردہ نکتہ کے متعلق مرکز سے رسمی استصواب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ:-

(الف) مرکزی حکومت کی طرف سے حال ہی میں ایک مراسلہ وصول ہو چکا ہے (جو ذیل میں P. U. C کی حیثیت سے شامل ہے)

(ب) یہ بالکل واضح اور بیّن حقیقت ہے کہ ہمیں صوبے میں تحفظ قانون و انتظام کے ابتدائی فرض کی بجا آوری میں کسی ہدایت یا مشورے کی احتیاج نہیں۔

احراریوں اور احدیوں کے متعلق ہماری عمومی پالیسی قطعی طور پر واضح ہے صوبائی حکومت کی حیثیت سے ہمیں نہ مذہبی اختلاف رائے سے کوئی واسطہ ہے نہ اس سے کوئی سروکار ہے کہ ایک خاص جماعت کا سیاسی درجہ کیا ہونا چاہیئے اور نہ اس امر سے کوئی تعلق ہے کہ مرکزی حکومت اور اس کے بعض وزیروں کے درمیان باہمی اعتماد یا بے اعتمادی کے روابط کی کیا کیفیت ہے۔
ہمارا فرض صرف یہ دیکھنا ہے کہ قانون ملکی کی خلاف ورزی نہ ہو اور تمام شہریوں کی سلامتی اور حفاظت کا بندوبست قائم رہے۔

ہمیں اپنے آپ کو تمام مذہبی اور سیاسی نزاعات اور ان کے مالہٗ وماعلیہ کی بحث سے قطعی طور پر الگ تھلگ رکھنا چاہیئے۔ ہمارے کارکنان نشر و اشاعت کو اس امر کی وضاحت کر دینی چاہیئے۔
مخصوص و معیّن باتیں یہ ہیں :۔

۱۔ ہمیں تلقینِ تشدد کرنے والے تمام لوگوں کا تعاقب شدت سے کرنا چاہیئے۔

۲۔ فرقہ دار جلسوں پر موجودہ پابندی برابر جاری رہنی چاہیئے۔

۳۔ چونکہ مساجد کا معاملہ مسلمانوں کے تمام طبقوں اور فرقوں کے نازک احساسات سے تعلق رکھتا ہے اسلئے مساجد میں ہر قسم کی مداخلت سے پورا پرہیز کرنا ضروری ہے۔

مجھے اس پوزیشن کی منطقی مشکلات کا احساس ہے لیکن خالص اصطلاحی اور قانونی رویّے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اشتعال پیدا ہوگا اس کے علاوہ میں ان جلسوں کی شورش انگیزی کا زیادہ قائل نہیں ہوں جو صرف مساجد میں منعقد ہوں۔
میرا خیال ہے کہ اگر صورت حالات ایسی ہی غیر یقینی رہی جیسی آجکل ہے تو انسپکٹر جنرل پولیس کو چند روز کے لئے رخصت پر جانا ملتوی کر دینا چاہیئے چیف سیکرٹری جا سکتے ہیں لیکن انہیں دوران رخصت میں ہر وقت تیار رہنا چاہیئے کہ مختصر سے مختصر نوٹس پر کراچی سے واپس آسکیں"۔
یہ معاملات کی صورت تھی جب ۱۳۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو آل مسلم پارٹیز کنونشن کے لئے علما لاہور میں جمع ہوئے۔

جہانگیر پارک میں چودھری ظفراللہ خاں کی تقریر

کراچی میں اشتہار دیا گیا کہ انجمن احمدیہ۔ کراچی کا ایک جلسہ ۱۷۔۱۸ مئی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک میں منعقد ہوگا اور اس میں دوسرے مقررین کے علاوہ چودھری ظفراللہ خاں بھی تقریر کریں گے اگرچہ یہ جلسہ انجمن احمدیہ کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا تھا لیکن یہ جلسۂ عام تھا جس میں جمہور کا کوئی فرد بھی تقریریں سننے کے لئے شریک ہو سکتا تھا اس جلسے سے چند روز پہلے خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم نے اس امر کے خلاف اپنی ناپسندی کا اظہار کیا کہ چودھری ظفراللہ خاں نے ایک فرقہ دار جلسۂ عام میں شرکت کا

ارادہ کیا ہے لیکن چودھری ظفراللہ خاں نے خواجہ ناظم الدین سے کہا کہ میں انجمن سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اگر چند روز پہلے مجھے یہ مشورہ دیا جاتا تو میں جلسے میں شریک نہ ہوتا۔ لیکن وعدہ کر لینے کے بعد میں اس جلسے میں تقریر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور اگر اس کے باوجود بھی وزیر اعظم اس بات پر مُصِر ہوں کہ مجھے جلسے میں شامل نہ ہونا چاہیئے تو میں اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کو تیار ہوں۔

اس جلسے کے پہلے اجلاس پر عوام کی طرف سے ناراضی کا مظاہرہ کیا گیا اور اجلاس کی کارروائی میں مداخلت کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں لیکن ۱۸۔ مئی کو قیام امن کے لئے خاص انتظامات کئے گئے اور چودھری ظفراللہ خاں۔ نے اس عنوان پر تقریر کی کہ "اسلام زندہ مذہب ہے"۔ ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت سے اسلام کی برتری اور ختمیت کے مسئلے پر یہ ایک فاضلانہ تقریر تھی مقرر نے واضح کیا کہ قرآن آخری الہامی کتاب ہے جس میں عالم انسانیت کے لئے آخری ضابطہ حیات مہیا کیا گیا ہے۔ کوئی بعد میں آنے والا ضابطہ اس کو موقوف نہیں کر سکتا پیغمبر اسلام صلعم خاتم النبیین ہیں جنھوں نے عالم انسانی کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام پہنچایا ہے اور اس کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا جو نئی شریعت کا حامل ہو یا قرآنی شریعت کے کسی قانون کو منسوخ کر سکے۔ احمدیوں کے مسلک کے متعلق پوری تقریر میں صرف اتنا اشارہ کیا گیا تھا کہ (رسول اللہ کے) وعدے کے مطابق ایسے اشخاص آتے رہیں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجدید دین پر مامور ہوں گے تاکہ اصلی دین اسلام کی پاکیزگی کو محفوظ کرنے کی غرض سے اسکی اصلاح و تجدید کریں اور اگر اس میں کوئی غلطی۔ فروگزاشت یا بدعت راہ پا گئی ہو تو اس کو دور کر دیں۔ مقرر نے دعویٰ کیا کہ مرزا غلام احمد اسی قسم کے مجدد تھے۔ تقریر کے آخر میں انہوں نے کہا کہ احمدیت ایک ایسا پودا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود لگایا ہے اور اب جڑ پکڑ گیا ہے تاکہ قرآن کے وعدے کی تکمیل میں اسلام کی حفاظت کا ضامن ہو۔ اور اگر یہ پودا اکھیڑ دیا گیا تو اسلام ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی نہ رہے گا بلکہ ایک سوکھے ہوئے درخت کی مانند ہو جائے گا اور دوسرے مذاہب پر اپنی برتری کے ثبوت مہیا نہ کر سکے گا۔

انجمن احمدیہ کے جلسے نے کراچی میں فسادات کو پھوٹ پڑنے کا موقع دے دیا۔ حکام کو پیشتر اطلاع مل چکی تھی کہ جلسے میں ابتری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ انتظام قائم رکھنے کی ضروری تدابیر کی جا چکی تھیں۔ ۱۷۔ مئی کو بعض اشخاص نے جلسے میں گڑبڑ پیدا کرنے کی غرض سے حاضرین پر پتھر پھینکنے شروع کئے پولیس کے بندرہ کانسٹیبلوں کو چوٹیں آئیں۔ لیکن صورت حالات پر قابو پا لیا گیا۔ بلوائی گرفتار کر لئے گئے اور جلسے کی کارروائی جاری رہی۔ بلوائیوں کا ایک گروہ شیزان ہوٹل (جسکے مالک احمدی ہیں) پہنچا اسکی کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے اور عمارت کو آگ لگا دینے کی کوشش کی۔ شاہنواز موٹرز (جسکے مالک احمدی ہیں) کے شوروم پر اینٹیں برسائی گئیں جن سے ایک نئی موٹر کو نقصان پہنچا۔ بندر روڈ پر احمدیہ لائبریری اور ایک احمدی کی فرنیچر کی دکان کو آگ لگانے کی کوشش بھی کی گئی۔ اس دن ساٹھ آدمی گرفتار کئے گئے۔ ان بلووں کے بعد مسٹر اے ٹی نقوی چیف کمشنر

نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس میں انہوں نے اپنی انتظامی پالیسی کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے ہر شہری کو مذہبی عقاید کی آزادی حاصل ہے اور اگر آیندہ اس آزادی میں مداخلت کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

چودھری ظفر اللہ خاں کے قتل پر کراچی اور پنجاب کے مسلمانوں میں شدید ناراضی اور برہمی پھیل گئی اور اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ کراچی کے ہفتہ وار اخبار "سٹار" نے ۲۴۔مئی ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں صفحہ اول پر ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا "غیر ملکی ہاتھ" "کراچی کا بلوہ کس نے کرایا"؟ اشارے کا مطلب یہ تھا کہ یہ بلوہ کسی بیرونی طاقت کی سازش کا نتیجہ ہے۔ لاہور کے بعض احمدی حضرات نے جن میں مسٹر بشیر احمد اور مسٹر صدیقی (برادر نسبتی مرزا بشیر الدین محمود احمد) بھی شامل تھے۔ اپنی نجی بات چیت میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ان واقعات کی ذمہ داری خواجہ ناظم الدین پر ہے مسٹر ذوالقرنین خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس (A) نے اپنی رپورٹ مورخہ ۲۸۔مئی ۱۹۵۲ء میں لکھا کہ کراچی سے آنے والے لوگوں نے جن میں برطانوی مشن کے عبداللہ بٹ بھی شامل ہیں بیان کیا ہے کہ یہ فسادات امریکنوں نے کرائے ہیں کیونکہ چودھری ظفر اللہ خاں برطانیہ کے حامی اور امریکہ کے مخالف ہیں۔ اور "سٹار" میں جو مضمون چھپا ہے وہ برطانوی مشن کے ایما پر عبداللہ بٹ نے لکھوایا ہے مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یکم جون ۱۹۵۲ء کو ان افواہوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ احراری لیڈر کچھ مدت سے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ چودھری ظفر اللہ خاں کے خلاف جو شورش برپا کر رہے ہیں اس میں انہیں حکومت اور مسلم لیگ کی بعض اونچی شخصیتوں کی حمایت حاصل ہے اور حکومت نے مضبوط اور مصمم تدابیر اختیار کرنے میں جو تامل کیا اسکی وجہ سے لوگ یقین کرنے لگے کہ اس پر جوش تحریک کی حمایت حکومت کے بعض ممبر کر رہے ہیں مسٹر قربان علی خان نے اس مسئلے پر جو حقیقت بینی کا رویہ اختیار کیا وہ ان کے ذیل کے الفاظ سے ظاہر ہے:۔

"میں نہیں سمجھتا کوئی بیرونی طاقت پاکستان کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت محسوس کرے گی کہ اس کے گھریلو معاملات میں مداخلت کی ذمہ داری لے کر اس راز کے فاش ہو جانے کا خطرہ مول لے۔ نہ میرے نزدیک یہ درست ہے کہ کسی مقامی سیاست دان کو سر ظفر اللہ خاں کے خلاف شورش برپا کرنے سے کوئی خاص فائدہ ہو سکتا ہے۔ وہ سب تجربہ کار لوگ ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ جو لوگ آج سر ظفر اللہ خاں کے خلاف یہ کچھ کر رہے ہیں وہ کل خود ان کے خلاف اس سے بھی بدتر ہنگامہ آرائی کر سکتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی قابل ذکر سیاست دان عوام میں اس قسم کی خفیف حرکتوں کا مذاق پیدا کرنا روا رکھے گا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سیاست دان اس خوف میں مبتلا ہوں کہ اگر انہوں نے ایک ایسے مسئلے پر احراریوں کو چیلنج کیا جس میں انہیں عوام کی حمایت حاصل نہ ہوئی تو وہ عامتہ المسلمین میں سخت غیر ہردلعزیز ہو

جائیں گے۔ لیکن ایسا ہی وقت ہوتا ہے جب ملک میں ایک اعلیٰ قائد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو عوام کی رہنمائی کرے نہ کہ ہمیشہ ایک ریوڑ کے آگے آگے مجبوراً بڑھتا چلا جائے۔

حکومت پنجاب نے حال ہی میں تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے نام جو یہ حکم بھیجا ہے کہ احراریوں اور احمدیوں کے جلسوں پر پورا قابو رکھیں اس سے ممکن ہے کہ حسب منشا نتیجہ نکلے اور بدنظمی کی قوتیں کچلی جائیں لیکن اگر یہ کوشش بھی ناکام رہے تو ضروری ہوگا کہ زیادہ سر توڑ قسم کے اقدامات کئے جائیں"۔

ہوم سیکرٹری نے بھی امید ظاہر کی کہ حکومت نے پچھلے دنوں اپنے جس فیصلے سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو مطلع کیا ہے اس سے صورت حالات بہتر ہو جائے گی لیکن اگر نہ ہوئی تو زیادہ شدید تدابیر اختیار کرنی ہونگی۔

مرکزی حکومت نے کراچی کے واقعات پر غور کیا۔ اور انٹیلی جنس بیورو نے اپنی چٹھی نمبری (ڈی) 9/B/52 مورخہ ۲۲-مئی ۱۹۵۲ء میں ڈی آئی جی سی آئی ڈی پنجاب (لاہور) کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ واقعات کی رفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ احراری برابر احمدیوں کے خلاف دشمنی اور عداوت کی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔ اور ۱۷-۱۸-مئی ۱۹۵۲ء کو احمدیوں کے سالانہ جلسے میں فساد پیدا کرنے والے گروہ پر جو لاٹھی چارج کیا گیا۔ اس سے احراریوں کے احساسات اور بھی زیادہ شدید ہو گئے ہیں۔ اس چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ نئے حالات کسی اعتبار سے بھی تسلی بخش نہیں ہیں۔ شعلوں کو ہوا دینے والے اشخاص کی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے خاص تدابیر کی ضرورت ہے اور ایسی سرگرمیاں واضح طور پر دفعہ ۱۵۳-الف تعزیرات پاکستان کے ماتحت آتی ہیں اس چٹھی کے جواب میں چیف سیکرٹری حکومت پنجاب نے اپنی چٹھی مورخہ ۴-جولائی ۱۹۵۲ء میں وزارت داخلہ کو اطلاع دی کہ حکومت پنجاب نے گشتی مراسلت نمبر 6769-84/BDSB مورخہ ۵-جون ۱۹۵۲ء کے ذریعے سے تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ہدایت کر دی ہے کہ ان تمام جلسوں کو ممنوع قرار دیں جو احراریوں یا احمدیوں کی طرف سے منعقد کئے جائیں۔

کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن

جب ۱۸-مئی کو جہانگیر پارک میں چودھری ظفر اللہ خاں کی تقریر ہو چکی تو مولانا لال حسین اختر نے تھیوسوفیکل ہال کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کی ایک کانفرنس طلب کی۔ اس کانفرنس کے دعوت ناموں پر اہم مسلم جماعتوں کے ایک (مبینہ) نمائندہ اجتماع کے فیصلے کے مطابق مولانا احتشام الحق تھانوی۔ مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا جعفر حسین مجتہد، مولانا محمد یوسف اور مولانا لال حسین اختر نے دستخط کئے۔ کانفرنس ۲-جون کو لال حسین اختر کے مکان پر منعقد ہوئی اس کانفرنس کی کارروائی ہمارے سامنے پیش نہیں کی گئی لیکن مولانا احتشام الحق کے پیش کردہ کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کانفرنس میں ذیل کے مطالبات کی تشکیل کی گئی:-

(۱) کہ احمدی ایک غیر مسلم اقلیت قرار دئیے جائیں۔

(۲) کہ چودھری ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ کے عہدے سے الگ کر دئیے جائیں۔

(۳) کہ احمدی تمام کلیدی اسامیوں سے ہٹا دیئے جائیں۔ اور

(۴) ان مقاصد کے حصول کی غرض سے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن طلب کی جائے۔

اس کانفرنس کی صدارت مولانا سید سلیمان ندوی نے کی۔ ایک بورڈ بنایا گیا جو کنونشن کے آیندہ اجلاس کے انتظامات کا ذمہ دار ٹھیرایا گیا۔ اس بورڈ کے صدر بھی مولانا سلیمان ندوی قرار پائے۔ جو قرار دادیں اس کانفرنس میں منظور ہوئیں۔ ان کی تصدیق کراچی کے ایک جلسۂ عام سے کرائی گئی۔

بورڈ کے ممبر حضرات ذیل تھے:۔

(۱) سید سلیمان صاحب ندوی صدر تعلیمات اسلامی بورڈ

(۲) مفتی محمد شفیع صاحب ممبر تعلیمات اسلامی بورڈ

(۳) مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی

(۴) علامہ محمد یوسف صاحب کلکتوی

(۵) علامہ مفتی صاحب داد صاحب

(۶) علامہ سلطان احمد صاحب

(۷) علامہ احمد نورانی صاحب

(۸) مولانا لال حسین اختر صاحب

(۹) الحاج ہاشم گزدر صاحب

(۱۰) مولانا جعفر حسین صاحب مجتہد ممبر تعلیمات اسلامی بورڈ

(۱۱) مولانا احتشام الحق صاحب (کنوینر)

۱۳۔ جولائی کو مسٹر محمد ہاشم گزدر کے مکان پر بورڈ کا ایک اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ کنونشن کے لئے دعوت نامے مندرجہ ذیل جماعتوں کے نام جاری کئے جائیں:۔

(۱) جمعیۃ العلمائے پاکستان

(۲) جمعیۃ العلمائے اسلام

(۳) جماعت اسلامی

(۴) تنظیم اہل السنت والجماعت

(۵) جمعیۃ اہل سنت

(۶) جمعیۃ اہل حدیث

(۷) موتمر اہل حدیث پنجاب

(۸) ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پنجاب

(۹) سفینۃ المسلمین

(۱۰) حزب اللہ مشرقی پاکستان

(۱۱) مجلس تحفظ ختم نبوت

(۱۲) مجلس احرار

(۱۳) جمعیۃ الفلاح

(۱۴) جمعیۃ العربیۃ

جماعت اسلامی کے جن نمایندوں کے نام دعوت نامے جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، نعیم صدیقی، چودھری غلام محمد اور سلطان احمد تھے۔ کنونشن کی تاریخیں ۱۶-۱۷-۱۸ اگست مقرر کی گئیں لیکن جیسا کہ بعد میں بتایا جائے گا کنونشن حقیقۃً ۱۶ سے ۱۸۔ جنوری ۱۹۵۳ء تک منعقد ہوئی۔

آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور

چودھری ظفر اللہ خان کی تقریر کراچی نے واقعات کی رفتار کو تیز کر دیا۔ اور احراریوں نے اس موقع سے جس کا وہ مدت سے انتظار کر رہے تھے انتہائی فائدہ اٹھایا۔ ۳۔ جولائی کے زمیندار میں ایک اشتہار شائع ہوا کہ ۱۳۔ جولائی کو برکت علی محمڈن ہال میں تمام مذہبی جماعتوں کی ایک کنونشن

منعقد ہو گی جس میں علماء خطیب۔ پیر، سجادہ نشین اور مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈر اور کارکن شامل ہونگے تاکہ عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے ابتدائی لائحہ عمل تیار کر لیا جائے اس جلسے کا دعوت نامہ (فرد شہادت ڈی ۔ای ۱۳۸) غلام غوث ہزاروی نے جاری کیا جس کے نیچے حسب ذیل اشخاص کے دستخط تھے :۔

(۱) مولانا غلام محمد ترنمؒ صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان پنجاب لاہور (۲) مولانا مفتی محمد حسن صدر جمعیۃ العلمائے اسلام پنجاب لاہور (۳) مولانا احمد علی امیر انجمن خدام الدین۔ لاہور (۴) مولانا محمد علی جالندھری ناظم اعلیٰ مجلس احرار پنجاب ملتان (۵) مولانا سید محمدؐ داؤد غزنوی صدر جمعیۃ اہل حدیث پنجاب لاہور (۶) مولانا سید نور الحسن بخاری ناظم اعلیٰ تنظیم اہل السنت والجماعت پاکستان لاہور (۷) سید مظفر علی شمسی ایڈیٹر اخبار شہید و سابق جنرل سیکرٹری ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان لاہور

اگرچہ اس دعوت نامے کے دستخط کنندوں میں سے صرف ایک شخص مولوی محمد علی جالندھری نے اپنے آپکو ناظم اعلیٰ مجلس احرار بتایا ہے لیکن مولانا اختر علی خاں کی شہادت سے ظاہر ہے کہ داعی کمیٹی میں جس نے دعوت نامہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا تھا احراریوں کی غالب اکثریت تھی اور غلام غوث ہزاروی جس نے دعوت نامہ جاری کیا وہی شخص معلوم ہوتا ہے جو جماعت احرار کا سرگرم ممبر تھا اور جس کو گورنر صاحب پنجاب نے اسکی سرگرمیوں پر تنبیہ کی تھی۔ احرار اور مجلس عمل دونوں میں سے کسی نے بھی اپنے تحریری بیانات میں اس طریقے کی تفصیل بیان نہیں کی جس سے داعی کمیٹی مرتب کی گئی نہ یہ بتایا ہے کہ اس کنونشن کے مدعوئین کے ناموں کا فیصلہ کس نے کیا تھا لیکن مسٹر انور علی ڈی آئی جی ۔سی آئی ڈی نے سی آئی ڈی کے کاغذات سے معلومات حاصل کر کے "مجلس احرار پاکستان" کے نام سے جو کتابچہ مرتب کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت نامے کوئی ساٹھ علمائے دین کے نام جاری کئے گئے تھے اور کنونشن میں دوسروں کے علاوہ کراچی سے مولانا احتشام الحق تھانوی. مولانا عبدالحامد بدایونی اور سید سلیمان ندوی بھی شامل ہوئے تھے۔

جن دنوں کنونشن کا انعقاد ہوا لاہور میں زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری عام جلسے حکماً ممنوع تھے لیکن ۵۔ جولائی کو چیف سیکرٹری کے زیر صدارت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں یہ فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ کنونشن کو ہونے دیا جائے اور اسکی کارروائی میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ اس کنونشن میں تین مطالبات منظور کئے گئے یعنی احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ چودھری ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کئے جائیں اور احمدیوں کو مملکت کے کلیدی عہدوں سے ہٹا دیا جائے ۔مندرجہ ذیل ارکان کی ایک "مجلس عمل" مرتب کی گئی تاکہ آئندہ لائحہ عمل کا فیصلہ کرے :۔

(۱) مولانا ابوالحسنات محمد احمد (جمعیت العلمائے پاکستان) صدر (۲) مولانا امین احسن اصلاحی (جماعت اسلامی) نائب صدر (۳) ماسٹر تاج الدین انصاری (مجلس احرار) (۴) شیخ حسام الدین (مجلس احرار) (۵) مولانا عبدالحلیم قاسمی (جمعیۃ العلمائے اسلام) (۶) مولانا محمد طفیل (جمعیۃ العلمائے اسلام) (۷) مولانا محمد بخش مسلم (جمعیۃ العلمائے پاکستان) (۸) مولانا غلام محمد ترنمؒ (حزب الاحناف) (۹) مولانا غلام دین (حزب الاحناف) (۱۰) مولانا داؤد غزنوی (جمعیۃ اہل حدیث) (۱۱) مولانا عطاء اللہ حنیف (جمعیۃ اہل حدیث) (۱۲) مولانا نصر اللہ خاں عزیز (جماعت اسلامی) (۱۳) حافظ کفایت حسین (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ) (۱۴) مظفر علی شمسی (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ) (۱۵) مولوی نور الحسن بخاری (تنظیم اہل السنت والجماعت) (۱۶) صاحبزادہ فیض الحسن (انجمن سجادہ نشینان پنجاب) (۱۷) مولانا عبدالغفار ہزاروی (انجمن سجادہ نشینان پنجاب) (۱۸) علامہ علاؤ الدین صدیقی (نامزد) (۱۹) مولانا اختر علی خان (نامزد) (۲۰) مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش (نامزد)

حکام نے کنونشن کی تاریخ کے اعلان کے بعد لیکن اسکے انعقاد سے پہلے انتظامی پوزیشن پر غور کیا۔ مسٹر قربان علی خان نے ۱۴۔جولائی ۱۹۵۲ء کو اپنی یاد داشت میں احراریوں کی نیت کا بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ اور لکھا کہ۔

"یہ سب حلقوں میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ احرار کو کسی نہ کسی سے امداد مل رہی ہے احرار بجائے خود اتنے طاقتور نہیں ہیں کہ اس مطالبہ کو پیش کر سکتے لیکن ان میں سے یا ان کی پشت پناہی کرنے والوں میں سے بعض لوگوں نے اپنی چالاکی کی وجہ سے یہ اندازہ کر رکھا ہے کہ وہ جماعتیں جو مذہبی کہلاتی ہیں ان میں سے کوئی ایسی احمق نہ ہو گی کہ جس مسئلے پر ہر مسلمان احمدیوں کے خلاف شدید ترین جذبات رکھتا ہے اس میں کسی سے پیچھے رہ جائیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر مسلمان اس مسئلے پر اٹھ کھڑا ہو گا احرار جانتے ہیں کہ جس مسلکِ تشدد سے انہوں نے اس شورش کا آغاز کیا تھا اور جس کی وجہ سے حکومت مداخلت پر مجبور ہوئی اسکو عوام کا معقول اور سنجیدہ طبقہ پسند نہیں کرتا۔ احراریوں نے اس امر کو محسوس کر لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ کسی ایسے اقدام کی حمایت نہ کریں گے جس سے ان کا مقابلہ قانون سے آن پڑے لیکن وہ حتی الامکان اس بات کی کوشش ضرور کرینگے کہ احمدیوں کے خلاف اپنے دو مشکل مطالبات میں باقی تمام جماعتوں کو اپنے ساتھ لے لیں اب انکی اولیں کوشش یہی ہو گی کہ اس مسئلے کو لیکر مسلم لیگ اور اسکی حکومت کا سامنا کریں اور ان سے پالیسی کے اعلان کا مطالبہ کریں اب اکثر لوگ یہ محسوس کر چکے ہیں کہ کوئی حکومت خواہ وہ کسی پارٹی کی ہو ان مطالبات کو تسلیم نہیں کر سکتی اسکے باوجود قیام پاکستان کے بعد یہ سب سے زیادہ قومی مسئلہ ہے جس پر لیگ کو چیلنج دیا جا رہا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ اگر حکومت متذکرہ ان مطالبات کو رد کر دیگی تو مسلمانوں کی اکثریت لیگ کے خلاف ہو جائے گی اگر اس اثنا میں حکومت نے اس شرارت کا مقابلہ کرنے کیلئے جو اب لازماً شروع ہو جائیگی کوئی ذرائع و وسائل اختیار نہ کئے تو ہمیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اسے مسلمانوں کی اکثریت کی مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا اس امر کا جائزہ لینا صرف حکومت ہی کے امکان میں ہے کہ وہ فو ذرائع و وسائل کیا ہوں اب وقت بالکل ضائع نہ کرنا چاہئے۔ یہ ایک دوڑ ہے جس میں حکومت کو سر توڑ مقابلہ کرنا ہے۔ اس لئے اسے فی الفور آمادہ عمل ہونا چاہئے۔ اور حالات کو بگڑنے کا موقع نہ دینا چاہئے۔"

ہوم سیکرٹری نے اس خیال کا اظہار کیا کہ احراری لوگوں کے جذبات کو بھڑکا کر اپنا الّو سیدھا کرنے میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں وہ عوام سے منقطع ہونے اور ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانے سے بچ گئے ہیں لیکن حکومت بھی ان کو لگام دینے میں کامیاب ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بیرونی وسائل حفاظت حاصل کرنیکے لئے بیتابانہ کوشش کر رہے ہیں۔ ہوم سیکرٹری نے تجویز پیش کی کہ بعض فیصلوں کے ہو جانے سے پیشتر چیف منسٹر صاحب کو چاہئے کہ انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈی آئی جی سی آئی ڈی اور ہوم سیکرٹری کو جمع کر کے ان سے بات چیت کریں (چیف سیکرٹری رخصت پر کراچی میں گئے ہوئے ہیں)۔ چنانچہ ۱۶۔جولائی ۱۹۵۲ء کو یہ کانفرنس ہوئی جس میں معاملے پہ بحث کی گئی۔ لیکن فیصلوں کے متعلق کوئی یادداشت دستیاب نہیں ہو سکی۔ جب کنونشن ہو چکی تو اسکی تقریروں کا جائزہ لیا گیا جس سے یہ دیکھنا مقصود تھا کہ آیا کسی مقرر کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ضروری ہے یا نہیں۔ مسٹر ولی اللہ خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) سی آئی ڈی پنجاب نے ۲۱۔جولائی ۱۹۵۲ء کو یہ رائے ظاہر کی کہ پانچ تقریریں قابل اقدام ہیں۔ لیکن اگرچہ بہاء الحق قاسمی اور علامہ علاء الدین صدیقی نے زیر دفعہ ۲۱(i) پبلک سیفٹی ایکٹ ارتکاب جرم کیا ہے لیکن ان کے خلاف مقدمہ نہ چلانا چاہئے کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو انکو عدالت میں مزید کیچڑ اچھالنے کا موقع مل جائیگا۔ انہوں نے لکھا کہ

عبدالغفار ہزاروی بالکل بے حیثیت آدمی ہے۔ اس لئے اسکی تقریر سے اسی حقارت کا سلوک ہونا چاہئے جسکی وہ مستحق ہے۔ مولوی محمد علی جالندھری نے حکومت کو "بے ایمان" کہا لیکن چونکہ یہ ایک ہی ریمارک تھا۔ اس لئے اس کو بھی نظرانداز کر دینا چاہئے۔ عبدالستار نیازی کے متعلق ان کی رائے یہ تھی کہ اسے فی الحال چھوڑ دیا جائے آئندہ کسی موقع پر اسکی گوشمالی کر دی جائے گی۔ ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ کیس ہوم سیکرٹری کو بھیجا اور ان کی توجہ خاص طور پر عبدالستار خاں نیازی کی تقریر کی طرف مبذول کرائی۔ ہوم سیکرٹری نے یہ کیس چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ جنھوں نے ۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو اس پر اپنے مختصر دستخط ثبت کر دیئے۔

اخبارات

لاہور میں اہم اخبارات یہ ہیں: "پاکستان ٹائمز"، "سول اینڈ ملٹری گزٹ"، "نوائے وقت"، "امروز"، "زمیندار"، "احسان"، "مغربی پاکستان"، "آفاق"، جماعت اسلامی کا اخبار "تسنیم" اور احرار کا اخبار "آزاد"۔ ان میں سے پہلے چار اخباروں نے احمدی غیر احمدی مناقشے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ "تسنیم" اس مسئلے پر گاہے ماہے لکھتا تھا باقی پرچوں میں سے ۱۹۵۲ء کے نصف اول میں "مغربی پاکستان" نے صرف تین دفعہ اس مسئلے کا ذکر کیا۔ اور "آفاق" نے صرف دو دفعہ لکھا لیکن "آزاد" اور "زمیندار" از سرتا پا اس نزاع میں مصروف تھے اور احمدیوں کے خلاف ان کے عقائد کے خلاف۔ ان کے لیڈروں اور چودھری ظفراللہ خاں کے خلاف برابر ایک مسلسل مہم چلا رہے تھے۔ "آفاق" عملاً مسٹر دولتانہ کا اخبار تھا۔ اور "زمیندار"، "احسان" اور "مغربی پاکستان" سب حکومت کے امداد یافتہ اخبارات تھے۔ اس امداد اور سرپرستی کی تاریخ اور اسکی تفصیلات بجائے خود ایک نہایت دلچسپ موضوع ہے جس کا ذکر ہم ذیل میں کر رہے ہیں:۔

صوبے کی حکومت نے پنجاب ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی سفارشات پر ۱۹۴۷ء میں تعلیم بالغاں کا ایک نظام رائج کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ صوبے میں ناخواندگی کو کم کیا جائے اس فنڈ کے مقاصد حسب ذیل تھے:۔

(۱) دیہات میں لائبریریوں کا قیام (۲) ریڈیو اور فلموں کا استعمال (۳) موزوں قسم کا لٹریچر مہیا کرنا اور (۴) خواندگی کے مرکز قائم کرنا جن کو کل وقتی اور جزوی وقت پڑھانے والے مدرسین اور سوشل ورکر جاری رکھیں۔

یہ نظام سررشتہ تعلیم کے سپرد تھا اور اس کے لئے ۵۰-۱۹۴۹ء میں دو لاکھ پچیس ہزار ۵۱-۱۹۵۰ء میں دس لاکھ ۵۲-۱۹۵۱ء میں چھ لاکھ اور ۵۳-۱۹۵۲ء میں بھی چھ لاکھ روپے کی رقوم منظور کی گئیں۔

۱۸ مئی ۱۹۵۱ء کو میر نور احمد ڈائرکٹر تعلقات عامہ نے چیف سیکرٹری کی خدمت میں ایک تجویز پیش کی کہ مختلف اداروں مثلاً ہسپتالوں، جیلوں، سکولوں اور کالجوں کیلئے موزوں اخباروں کے پرچے خریدے جائیں اور اس مقصد کیلئے پچاس ہزار روپے کی رقم منظور کی جائے۔ تجویز پیش کرتے ہوئے میر نور احمد نے لکھا:۔

"اگر چیف منسٹر صاحب اور وزیر تعلیم میری رائے سے اتفاق کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس سکیم کے اخراجات کی منظوری سررشتہ تعلیم کی گرانٹ سے دے دی جائے کیونکہ نشر و اشاعت کے مقاصد کے علاوہ اس سکیم کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ پنجاب کے جیلوں، تعلیمی محکموں، تعلیم بالغاں کے مرکزوں وغیرہ میں مطالعہ کا ایسا مواد مہیا کیا جائے جو تعلیم بالغاں کے لئے ذریعہ امداد ثابت ہو۔ اگر اس سکیم کے مصارف کو شعبہ تعلیم کی مد سے ادا کرنا قبول ہو تو ضروری ہوگا کہ یہ رقم میری تحویل میں دے دی جائے۔"

میر نور احمد نے یہ بھی لکھا گو اسکی وجہ نہیں بتائی کہ اس سکیم کی مزید تفصیلات صیغۂ راز میں رکھی جائیں چیف سیکرٹری نے اس تجویز کی تائید کی اور چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی تاکہ وہ وزیر تعلیم سے مشورہ کرنیکے بعد احکام صادر فرمادیں لیکن سررشتہ تعلیم نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور لکھا کہ اخبارات صرف خواندہ لوگوں کے لئے مفید ہو سکتے ہیں نہ کہ ان لوگوں کیلئے جنھیں خواندہ بنانا مقصود ہے۔ سررشتہ تعلیم کے یادداشت نویس افسر نے اس کیس پہ یہ بھی لکھا کہ مجوزہ خرچ کو تعلیم بالغاں کی سکیم میں سے ادا کرنا جائز بھی نہیں ہے۔ تاہم سررشتہ تعلیم کے اس احتجاج کے باوجود دونوں منسٹروں نے ۲۶ مئی ۱۹۵۱ء کو فیصلہ کر دیا کہ رقم منظور کی جاتی ہے۔ جو ڈائرکٹر تعلقات عامہ کیلئے محفوظ رکھی جائے چنانچہ ڈائرکٹر تعلقات عامہ نے وقتاً فوقتاً سررشتہ تعلیم سے ۱۹۵۱-۵۲ء اور ۱۹۵۲-۵۳ء میں مزید رقوم طلب اور وصول کیں۔ جن کی مجموعی مقدار دو لاکھ تین ہزار روپے ہوتی ہے۔

یہ روپیہ مندرجہ ذیل طریق پر صرف کیا گیا:۔

I۔ پچاس ہزار روپے موصولہ جون ۱۹۵۱ء

"آفاق" کو	۴۲۰۰۰
"زمیندار" کو	۴۰۰۰
دوبارہ "زمیندار" کو	۴۰۰۰
میزان پچاس ہزار	

II۔ پچاس ہزار روپے موصولہ دسمبر ۱۹۵۱ء

"احسان" کو	۱۸۰۰۰
"آفاق" کو	۱۸۰۰۰
"زمیندار" کو	۵۰۰۰
"مغربی پاکستان" کو	۷۰۰۰
میزان اڑتالیس ہزار	
بقایا	۲۰۰۰

III ایک لاکھ روپے موصولہ جون ۱۹۵۲ء

"زمیندار" کو	۱۰۰۰۰
"آفاق" کو	۴۰۰۰۰
"احسان" کو	۴۰۰۰۰
"مغربی پاکستان" کو	۴۰۰۰
"زمیندار" کو	۷۰۰۰
"مغربی پاکستان" کو	۱۰۰۰
میزان ایک لاکھ دو ہزار	

IV تین ہزار روپے موصولہ دسمبر ۱۹۵۲ء

"مغربی پاکستان" کو	۳۰۰۰

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ مجموعی حیثیت سے ایک لاکھ روپیہ "آفاق" کو۔ اٹھاون ہزار "احسان" کو۔ پندرہ ہزار "مغربی پاکستان" کو اور تیس ہزار "زمیندار" کو دیا گیا ان اخباروں کیلئے جن میں سے دو اخباروں کی اشاعتیں بہت کم تھیں یہ عطیات امداد غیبی سے کم نہ تھے اور وہ اسقدر ممنون اور زیر بار احسان تھے کہ اگر حکومت چاہتی تو جس پالیسی پر انکو چلانا چاہتی وہ فوراً اسی پہ کاربند ہو جاتے لیکن ان اخبارات کے تراشوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب اس تنازع میں سرگرمی سے مصروف تھے اور جن دنوں میں انہیں یہ رقوم دی جارہی تھیں ان دنوں میں بھی برابر اس شورش کی آگ کو ہوا دے رہے تھے ان اخباروں کی سرگرمیوں پہ سررشتہ تعلیم کی توجہ مبذول ہوئی چنانچہ مسٹر ثناء اللہ خان (آفیسر سپیشل ڈیوٹی سررشتہ تعلیم) نے لکھا یہ اخبارات مفید ہونیکے بجائے سخت مضر ثابت ہو رہے ہیں اور فرقہ دارانہ اور سیاسی نزاعات میں حصہ لینے والے اخباروں پر روپیہ صرف کرنا سرکاری روپے کا افسوسناک ضیاع ہے "آفاق" کا معاملہ خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ دستاویزی شہادتوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس اخبار پر میر نور احمد کی نگرانی قائم تھی اور اگر اس کے ایڈیٹر پروفیسر محمد سرور کی شہادت پر یقین کیا جائے تو یہ اخبار خود مسٹر دولتانہ کا اخبار تھا۔ اس اخبار کو پہلی رقم بیالیس ہزار دی گئی جب یہ ہفتہ وار سے روزانہ ہونے والا تھا یا ابھی ہو چکا تھا میر نور احمد کا بیٹا میر اقبال احمد اس اخبار میں منیجر اشتہارات تھا وہ برابر کسی نہ کسی حیثیت میں اس اخبار

کے عملے میں شامل رہا اور اب اس کا منیجنگ ڈائرکٹر ہے خود مسٹر دولتانہ نے اس اخبار کو پانچہزار روپے کی رقم پیش کی جو انہوں نے لائلپور کے بعض مسلم لیگیوں سے جمع کی تھی اس رقم سے بالآخر میر افضال احمد نے اس اخبار کے کچھ حصے خرید لئے جب ان اخباروں کو یہ معقول مالی عطیات دئے گئے جو ان کی اہمیت کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ تھے تو ۱۹۵۲ء کے موسم گرما میں دنیائے صحافت میں ان کا بڑا چرچا ہوا کیونکہ ان اخباروں نے حکومت سے امداد و اعانت پانے کے باوجود اس مکروہ تنازع میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا اور لوگوں کو یہ شبہ لاحق ہوگیا کہ حکومت خود ان اخباروں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ نفرت پھیلانے میں اپنی قوتیں صرف کریں۔ اگرچہ "آفاق" نے اپنی اشاعت مورخہ یکم جون ۱۹۵۲ء میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہر قسم کی فرقہ پرستی کا مخالف ہے لیکن ۲۰ جولائی ۱۹۵۲ء کے پرچے میں یعنی حکومت کے عطیے کی پہلی قسط وصول ہونے پر اس نے یہ لکھ دیا کہ وہ قادیانی مسئلہ کی طرف خاص توجہ کرے گا اور خاص مضامین شائع کر کے یہ بتائے گا کہ قادیانی پاکستان کے استحکام کے لئے ایک خطرہ ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر پہلا مضمون ۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو شائع کیا گیا اور اس اشاعت کے ایک پرچے کے ساتھ ایک منسلکہ سلپ سے یہ معلوم ہوا کہ اس اشاعت کی کاپیاں مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرنے والوں کو مفت تقسیم کی گئیں اس مضمون میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ قادیانی فرقہ اسلامی فرقہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک مرزا غلام احمد کی نبوت پر ایمان لانا لازمی اور بنیادی عقیدہ ہے اور اس کے خلاف عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا کہ قادیانی ایک بالکل علیحدہ قوم ہیں انہوں نے اپنی علیحدہ حکومت قائم کر رکھی ہے انکی اپنی عدالتیں۔ اپنی پولیس اور اپنے مجسٹریٹ ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کے تمام محکموں پر قابو پالیں۔ قادیانیوں کو ایک علیحدہ قوم ثابت کرنے کی کوشش کے بعد اس مضمون میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ تمام مسلم جماعتوں کو اس مسئلے پر جمع ہو جانا چاہئے اور ایک لائحہ عمل تیار کرنا چاہیئے جس سے اس قوم کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دلایا جا سکے۔ اس مضمون میں اس امر پر خاص زور دیا گیا تھا کہ حصولِ مقصد کی کوششوں میں قوت کے استعمال، غنڈا پن۔ بلوے حملے۔ گالی گلوچ منہ کالا کرنے اور جلسوں کو درہم برہم کرنے کے طریقوں پر عمل نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس قسم کے افعال سے مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ اس معاملے میں تمام سرگرمیوں کو آئینی حدود کے اندر رکھنا چاہئے۔

اس کے بعد صرف ماہ جولائی کے اندر "آفاق" نے اس موضوع پر چودہ مضامین شائع کئے۔ ان سب مضامین کا انداز یہی تھا کہ فلاں فلاں وجوہ کی بنا پر قادیانی ایک علیحدہ قوم ہیں۔ انکو اقلیت قرار دلانے کے لئے ایک مہم منظم کرنی چاہئے۔ لیکن اس مہم کی تمام سرگرمیاں آئینی طریق پر انجام دی جائیں اور تشدد اور قانون شکنی سے کام نہ لیا جائے۔

۵۔ جولائی کے مضمون کے بعد دوسرے ہی دن کے پرچے میں ایک اور مضمون شائع ہوا۔ جس کا عنوان تھا "دفعہ ۱۴۴ اور ختم نبوت" اس مضمون میں احرار کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ ایسی متشددانہ تقریریں کرنے سے اجتناب کریں جن سے نقض امن کا احتمال ہو اور لاقانونی کی حرکات سے بھی باز رہیں۔ اسی تاریخ کے پرچے میں دو اور مضمون بھی درج تھے ایک مضمون میں ان تقریروں کی رپورٹیں درج تھیں جو مختلف مقامات پر کی گئیں۔ اور جن میں احمدیوں کو اقلیت قرار دینے اور چودھری ظفر اللہ خاں کو برطرف کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا اور دوسرے مضمون میں احرار کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اگر انہوں نے لاقانونی اور اشتعال انگیزی کی حرکات سے اجتناب کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس مسئلے میں حکومت اور مسلمانوں کے درمیان جو افسوسناک بیگانگی پیدا ہوگئی ہے وہ ایک لمحے کے لئے بھی باقی رہے اس مضمون میں مرزا بشیر الدین محمود احمد

کے بعض اشتعال انگیز خطبات بھی نقل کئے گئے تھے۔

۹۔ جولائی کے مضمون میں جس کا عنوان تھا "لاقانونی کو روک دو" لوگوں کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اس مطالبہ کو تمام مسلمانوں کا مشترکہ مطالبہ بنائیں اور دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی خلاف ورزی نہ کریں نہ کسی دوسرے طریق سے قانون کو توڑیں۔ اسی اشاعت میں ایک اور مضمون بھی درج تھا۔ جس میں ستر ہ سال پرانی تحریک احمدیت کے متعلق علامہ اقبال کے خیالات نقل کئے گئے تھے۔

۱۰۔ جولائی کی اشاعت میں مولانا محمد علی کا ایک بیان شائع کیا گیا جس میں حکومت کے اس تقریری اعلان کا خیر مقدم کیا گیا تھا جس کے ذریعے سے حکومت نے دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت احکام کے نفاذ کی وجوہ واضح کی تھیں اور مساجد میں عام جلسوں پر ان احکام کے اطلاق کی بھی صراحت کر دی تھی اس بیان میں یہ بھی لکھا تھا کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ حکومت پنجاب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور اس مطالبہ کو خلاف ورزی قانون کے بغیر آئینی طریق سے پیش کرنا چاہیے اسی اشاعت میں ایک اور بیان مولانا ابو الحسنات کی طرف سے شائع کیا گیا۔ جنھوں نے حکومت پنجاب کے سرکاری اعلان کا خیر مقدم کیا تھا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا تھا کہ میں کسی جماعت کو اس امر کی اجازت نہ دونگا کہ اپنے سیاسی مقاصد کیلئے مذہب کو استعمال کرے اور جو لوگ خلاف ورزی قانون کی حمایت کریں گے انکو میرا تعاون حاصل نہ ہوگا مولانا نے بدنظمی، لاقانونی اور اشتعال انگیز تقریروں کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ پُرامن اور آئین پسندانہ طریق ہی سے پیش کر کے کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے اسی پرچے میں ایک مراسلہ بھی درج تھا جس میں ختم نبوت کی تحریک کے متعلق اس اخبار کی خدمات کو سراہا گیا تھا اور اس خیال کا اعادہ کیا تھا کہ یہ شورش آئین کے مطابق جاری رکھنی چاہیے اور قانون شکنی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ۱۱۔ جولائی کے پرچے میں مولانا غلام مرشد کا یہ خیال شائع کیا گیا کہ قادیانیوں کے متعلق اعلان کرنا پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا کام ہے۔ ۱۳۔ جولائی کی اشاعت میں اُن تقریروں کی رپورٹیں شائع کی گئیں جو بروز جمعہ لاہور کی چالیس مسجدوں میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے متعلق کی گئی تھیں۔

اس وقت تک وہ علما لاہور پہنچ چکے تھے جنہیں ۱۳۔ جولائی کی کانفرنس میں شریک ہونا تھا۔ "آفاق" نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۲۔ جولائی میں ان علما میں سے بعض کا یہ خیال شائع کیا کہ غالباً اس کانفرنس میں یہی قرارداد منظور کی جائے گی کہ احمدیوں کے متعلق مطالبات پر آئینی طریق سے زور دیا جائے۔

۱۵۔ جولائی کی اشاعت میں دو خاص اہمیت کے مضمون شائع کئے گئے جن میں سے ایک میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کی کارروائی درج کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ احراری کنونشن کی پوری کارروائی پر حاوی رہے اور کنونشن میں جو بیندرہ قراردادیں منظور ہوئیں۔ ان میں سے بعض کا مقصد احرار کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا دوسرے مضمون میں بعض قراردادوں پر تنقید کی گئی اور بتایا گیا کہ اس تحریک کو اپنے بعض رہنماؤں کی حماقت اور خود غرضی سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض ناکام سیاست دان اور پاکستان کے پرانے مخالف صرف اپنے مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہیں اور علمائے دین کی مقدس قباؤں کے سائے میں اپنے کھوئے ہوئے سیاسی اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس مضمون میں یہ بھی لکھا گیا کہ تحفظ ختم نبوت کو اپنے ذاتی یا سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنا جرم ہے اور سیاسی منافقت ہے۔ اسی سلسلے میں بعض علما کے اعلانات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ وہ سیاسی اغراض کے لئے مذہب کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دینگے اس مضمون میں مطالبات کی تائید کی گئی لیکن یہ بھی بتایا گیا کہ بعض قراردادوں سے ایک بدنام سیاسی جماعت کو اہمیت دینا

اور بدنظمی پیدا کرنا مقصود ہے ایک قرارداد میں دفعہ ۱۴۴ کے احکام کے نفاذ کو مداخلت فی الدین قرار دیا گیا تھا اور ایک اور قرارداد کا منشا یہ تھا کہ احرار لیڈروں کے خلاف ان احکام کی خلاف ورزی کی بنا پر جو مقدمات دائر ہیں وہ واپس لے لئے جائیں اس مضمون میں یہ ظاہر کیا گیا کہ ان قراردادوں سے احرار کو ضرور مقبولیت حاصل ہو گی ایک اور قرارداد کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا جس میں گجرات کے مقام پر لاٹھی چارج کی مذمت کی گئی تھی ایک اور قرارداد میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ۱۸۔ جولائی کو "یوم مطالبات" منایا جائے۔ اس پر بھی مضمون میں سخت نکتہ چینی کی گئی اور کہا گیا کہ "یوم مطالبہ" منانے کا کوئی موقع نہیں کیونکہ یہ مطالبات دستور ساز اسمبلی کے دائرۂ اختیار میں ہیں اور قرارداد میں جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے۔ اس سے حکومت اور رہنمایانِ تحریک کے درمیان تصادم کا امکان ہے۔

"مغربی پاکستان" نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۰۔ جولائی میں "مبصر" کی طرف سے ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا "ختم نبوت اور تحریک مرزائیت"۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ قادیانی کافر ہیں اور ان کا سوشل مقاطعہ کرنا چاہئے۔

"آزاد" احراریوں کا اخبار ہے جس کے ایڈیٹر ماسٹر تاج الدین انصاری ہیں اس اخبار نے اپنے آغاز ہی سے اپنے کالموں میں احمدیوں اور ان کے عقائد اور ان کے لیڈروں کے خلاف نہایت بازاری۔ ناشائستہ اور زہریلی مہم جاری کر رکھی تھی۔ چونکہ حکومت پنجاب نے اسکی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا تھا اس لئے مرکزی حکومت نے اپنی چٹھی نمبری ۱-PM 51/1/77 مورخہ ۲۴۔ مئی ۱۹۵۲ء میں اس اخبار کے بعض مضامین کے تراشے منسلک کر کے انکی طرف حکومت پنجاب کی توجہ مبذول کرائی اور پوچھا کہ آیا وہ ان مضامین کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ڈائرکٹر تعلقات عامہ نے حکم دیا کہ اس اخبار کے ان مضامین اور ان سے پہلے شائع ہونیوالے مضامین کا جائزہ لیا جائے جس افسر نے ان مضامین کا جائزہ لیا اسکی رپورٹ یہ تھی کہ ان مضامین میں ایسے حصے موجود ہیں۔ جو شر انگیز ہیں اور جن میں احمدیوں کے خلاف بدگوئی اور دشنام طرازی کی گئی ہے۔ ڈائرکٹر تعلقات عامہ نے اپنی یادداشت مورخہ ۲۲۔ اگست ۱۹۵۲ء میں لکھا کہ یہ اخبار احمدیوں کے خلاف جو پروپیگنڈا کر تا رہا ہے وہ از سرتاپا نفرت و عناد سے لبریز ہے اور اسکے خلاف زیر دفعہ ۴ (۱) (ک) پریس (ایمرجنسی پاورز) ایکٹ کارروائی کی جا سکتی ہے لیکن اسکے باوجود ڈائرکٹر نے لکھا کہ میرے نزدیک کوئی کارروائی نہ کرنی چاہئے اور مزید سمجھانے بجھانے اور تنبیہ کرنے کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ یہ طریقہ اب تک بالکل بے اثر ثابت ہوا ہے۔ لہٰذا کوئی زیادہ موثر طریقہ سوچنا چاہئے لیکن انہوں نے بھی کوئی موثر طریقہ تجویز نہ کیا اور اگرچہ چیف منسٹر صاحب ۲۸۔ اگست کو اس کیس کا معائنہ کر چکے تھے۔ لیکن اس اخبار کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی اور حکومت پنجاب نے اپنی چٹھی ڈی او نمبری۔ 748 PR 52 مورخہ ۳۔ اگست ۱۹۵۲ء میں مرکزی حکومت کو صرف یہ اطلاع دے دی کہ اخبار مذکور کو شدید تنبیہ کر دی گئی ہے۔

ایک اردو اخبار "مزدور" ملتان سے شائع ہوتا ہے جس کا ایڈیٹر سید ابوذر بخاری ہے جو مشہور احراری لیڈر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیٹا ہے اس اخبار کی غالب توجہ صرف احمدیوں کے خلاف تحریک پر مرتکز رہی ہے۔ اس نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۳۔ جون ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون شائع کیا۔ جس میں جماعت احمدیہ کے امام کے متعلق عربی خط میں ایک ایسی لسیت اور بازاری بات لکھی کہ ہماری شائستگی ہمیں اسکی تصریح کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر یہ الفاظ احمدی جماعت کے کسی فرد کے سامنے کہے جاتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ کسی کی کھوپڑی توڑ دی جاتی تو ہمیں اس پر ذرا بھی تعجب نہ ہوتا جو الفاظ

استعمال کئے گئے وہ پرلے درجے کے مکروہ اور مبتذل ذوق کا ثبوت ہیں اور ان میں اس مقدس زبان کی نہایت گستاخانہ تضحیک کی گئی ہے جو قرآن مجید اور نبی کریم صلعم کی زبان ہے اس مضمون کو بھی ڈائرکٹر تعلقات عامہ نے پڑھا اور صرف یہی فیصلہ کیا کہ اخبار کو تنبیہ کر دی جائے۔ تین دن بعد اس اخبار نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۶۔ جون ۱۹۵۲ء میں مرکزی حکومت کو گالیاں دیں اگرچہ اس موقع پر اس اخبار سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ لیکن چیف منسٹر نے ایک وفد کی عرض معروض پر ضمانت کا حکم منسوخ کر دیا۔

محکمۂ اسلامیات

۱۴۔ مئی ۱۹۵۱ء کو ایک اجلاس ہوا جس میں چیف منسٹر، چیف سیکرٹری، فنانس سیکرٹری اور ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں قرار پایا کہ ایک محکمۂ اسلامیات قائم کیا جائے چھ علما کا ایک بورڈ مرتب کیا گیا اور چیف سیکرٹری اس محکمے کے حاکم اعلیٰ قرار پائے اسکی نگرانی اور مصارف کا انتظام ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ کے سپرد کیا گیا۔ اور مولوی ابراہیم علی چشتی چھ سو پچاس روپے ماہانہ پر ڈپٹی سیکرٹری مقرر کئے گئے۔ اس محکمے کے حقیقی اخراجات ۵۳-۱۹۵۲ء میں ۴۹۸۱۵ روپے اور ۵۳-۱۹۵۲ء میں ۱۰۵۲۳۵ روپے ہوئے۔ ستمبر ۱۹۵۱ء سے لیکر فروری ۱۹۵۳ء تک بہتّر اشخاص کو مختلف اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھنے کے لئے معاوضے پیش کئے گئے۔ ان اشخاص میں سے مولانا ابوالحسنات محمد احمد اور مولانا محمد بخش مُسلم نے احمدیوں کے خلاف تحریک میں نمایاں حصہ لیا کیونکہ اوّل الذکر پنجاب کی مجلس عمل کے صدر اور آخر الذکر ممبر تھے۔ اس محکمے نے اٹھارہ اشخاص کو اس کام پر مقرر کیا کہ سکولوں، کالجوں اور جیلوں میں دینیات پر لکچر دیا کریں۔ ان میں ذیل کے گیارہ افراد نے تحریک میں نہایت سرگرم حصہ لیا:-

(۱) مولانا محمد بخش مُسلم (۲) مولوی غلام دین (۳) مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری (۴) صاحبزادہ فیض الحسن (۵) علامہ علاؤ الدین صدیقی (۶) مولانا غلام محمد ترنّم (۷) قاضی مرید احمد (۸) حافظ کفایت حسین (۹) پروفیسر عبد الحمید (۱۰) مولانا سلیم اللہ (۱۱) مفتی محمد حسن۔

ان حضرات میں سے چھ شورش کے سلسلے میں اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار کئے گئے۔ قاضی مرید احمد۔ پروفیسر عبد الحمید اور مفتی محمد حسن کے سوا باقی سب مجلس عمل کے ممبر تھے جو اس شورش کی سربراہ تھی۔ قاضی مرید احمد مجلس عمل ضلع سرگودھا اور حافظ کفایت حسین مجلس عمل ضلع لاہور کے صدر تھے۔ ممبروں کے بورڈ میں سے مندرجہ ذیل چار اشخاص نے تحریک میں نمایاں حصہ لیا ان میں سے پہلے دو اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار بھی ہوئے:

(۱) مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری

(۲) مولانا غلام محمد ترنّم

(۳) مولانا محمد بخش مُسلم

(۴) مفتی محمد حسن

حصّۂ دوم

لاہور کنونشن سے لے کر کراچی اور پنجاب میں علما کی گرفتاری تک

از ۱۴۔ جولائی ۱۹۵۲ء تا ۲۷۔ فروری ۱۹۵۳ء

دفعہ ۱۴۴ کے احکام واپس لے لئے گئے

سرگودھا میں جو مقدمات احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی بنا پر دائر کئے گئے تھے ان کی پیروی محنت سے کی گئی اور ہم بتا چکے ہیں کہ ان میں سے ایک میں ملزموں کو سزا ہو گئی۔ ایک مقدمہ گوجرانوالہ میں اور دوسرا سرگودھا میں زیر سماعت تھا۔ یہ دونوں بعد میں واپس لے لئے گئے اور جن ملزموں کو مقدمہ سرگودھا میں سزا ہو گئی تھی۔ ان کی رہائی کے احکام صادر کر دئے گئے۔

ہوم سکرٹری کی دو یادداشتیں ہیں۔ ایک مورخہ ۱۷۔ جولائی ۱۹۵۲ء بر صفحہ ۷، فائل نمبر 99 (2) 16 جلد اوّل اور دوسری مورخہ ۱۸۔ جولائی ۱۹۵۲ء بر صفحہ ۷۴ فائل نمبر 93 (2) 16۔ جلد اول۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گوجرانوالہ کا مقدمہ واپس لینے کا فیصلہ یقیناً چیف منسٹر کے حکم سے کیا گیا ہوگا اول الذکر یادداشت کے الفاظ یہ ہیں :-

"اجلاس منعقدہ ۱۵ جولائی ۱۹۵۲ء کے فیصلے کے مطابق میں نے منسلکہ لاسلکی پیغام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گوجرانوالہ کو بھیجا۔ وہ کل مجھ سے ملے ہیں نے ان کو بتایا کہ احرار کے دو بڑے سرغنے یعنی ماسٹر تاج الدین اور شیخ حسام الدین چونکہ مقدمہ سرگودھا میں سزایاب ہو چکے ہیں اس لئے حکومت نے گوجرانوالہ کے مقدمہ کو واپس لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے گوجرانوالہ واپس پہنچنے پر کل یا آج یہ مقدمہ ضرور واپس لے لیا ہوگا۔"

دوسری یادداشت کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں :-

"گوجرانوالہ کا مقدمہ کل واپس لے لیا گیا میں نے چیف منسٹر صاحب کے ساتھ گفتگو کے فوراً بعد ۱۵ تاریخ کو ڈپٹی کمشنر کو بلا بھیجا تھا جب وہ ۱۶۔ کو مجھ سے ملنے آئے تو میں نے حکومت کا فیصلہ اُن کو بتا دیا تھا۔"

اگرچہ مسٹر دولتانہ تسلیم نہیں کرتے کہ مقدمے کی واپسی کا فیصلہ انہوں نے کیا تھا لیکن مذکورہ بالا دو یادداشتوں سے یہ بالکل واضح ہے کہ مقدمے کی واپسی کا فیصلہ حکام کے اس اجلاس میں کیا گیا تھا جس میں چیف منسٹر موجود تھے ایک تو بڑی عجلت کے ساتھ مقدمے کی واپسی کا فیصلہ ڈپٹی کمشنر تک پہنچایا گیا۔ اور پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ

اتنا اہم فیصلہ کوئی افسر بھی اپنی ذمہ داری پر نہیں کرسکتا تھا - ان دو باتوں سے یہ بالکل واضح ہے - کہ مقدمہ واپس لینے کا فیصلہ چیف منسٹر صاحب نے خود ہی کیا تھا - فائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵ - جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوم سکرٹری نے دفعتہً ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ کو ایک لاسلکی پیغام بھیجا جس میں ان سے کہا کہ وہ دوسرے ہی دن ہوم سکرٹری سے ملیں - ڈپٹی کمشنر نے آکر ۱۶ - جولائی کو ہوم سکرٹری سے ملاقات کی جنھوں نے ان کو بتایا کہ حکومت نے اس مقدمے کو واپس لینے کا فیصلہ کیا ہے - ان سب واقعات سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مقدمہ چیف منسٹر کے حکم سے واپس لیا گیا -

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ مولانا اختر علی خاں اور مولوی غلام غوث سرحدی (مجلس احرار کے نئے صدر) نے ۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی سے ملاقات کرکے ان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اگر وہ لوگ جو احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی بنا پر گرفتار کیے گئے ہیں - رہا کر دیئے جائیں اور احکام زیر دفعہ ۱۴۴ واپس لے لئے جائیں تو احرار من حیث الجماعت ایک اعلانِ عام کر دینگے کہ وہ آئندہ ایسی تقریریں نہیں کرینگے جن سے صوبے کے امن و سکون میں خلل پڑنے کا احتمال ہو - یہ پیشکش بعد میں چیف منسٹر کے سامنے دہرائی گئی جس پر چیف منسٹر نے ڈائرکٹر تعلقات عامہ کو ہدایت کی کہ احراری لیڈروں سے مل کر معلوم کریں کہ وہ کیا چاہتے ہیں - میر نور احمد نے چیف منسٹر کو اطلاع دی کہ احراری لیڈر حکومت کے ساتھ تصادم سے بچنے اور اپنی تحریک کو آئینی طریقے سے جاری رکھنے کے خواہشمند ہیں - نتیجہ یہ ہوا کہ بعض احراری لیڈر ۱۹ - جولائی کو چیف منسٹر سے ملے اور ایک ایسا اعلان عام شائع کرنے پر رضامند ہو گئے جس میں یہ یقین دلایا جائے کہ وہ لاقانونی اور تشدد کو روا نہ رکھینگے اور قانون شکنی نہیں کرینگے - دوسری طرف چیف منسٹر نے کہا کہ اگر اس قسم کا اعلان شائع کر دیا گیا تو وہ اس مسئلے پر ہمدردانہ غور کرینگے کہ احرار کے جلسوں پر زیر دفعہ ۱۴۴ جو پابندی عائد کی گئی ہے - وہ اٹھالی جائے - اور ان کے سزایاب لیڈروں کو رہا کر دیا جائے - اس گفت و شنید کے مطابق "آفاق" مورخہ ۲۱ - جولائی ۱۹۵۲ء میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مولوی محمد علی جالندھری ناظم اعلیٰ مجلس احرار - صاحبزادہ فیض الحسن ممبر مجلس عاملہ احرار اور مولانا محمد حسین غازی سالار اعلیٰ جیوش احرار اسلام کی طرف سے ایک بیان شائع کیا گیا - جس کا مفاد یہ تھا کہ احرار نے احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دلانے اور چودھری ظفر اللہ خاں کو وزارت خارجہ سے برطرف کرانے کی جدوجہد کے دوران میں اب تک کوئی خلاف قانون حرکت نہیں کی - اور وہ آئندہ بھی ایسا کوئی اقدام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے جس سے تشدد - بدنظمی اور قانون شکنی کا خطرہ پیدا ہونے کا احتمال ہو - وہ حکومت پنجاب کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں اور اس حکومت پر قانون و انتظام کے قیام کی جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے - وہ احرار کی اپنی ذمہ داری ہے جس کو پورا کرنے میں وہ حکومت سے مکمل تعاون کرینگے - یہ احرار کا نہ صرف شہری بلکہ مذہبی فرض ہے کہ بلا امتیاز مذہب و ملت پاکستان کے تمام شہریوں کی جان - مال - آبرو اور آزادی کی حفاظت کریں - اس بیان کے شائع ہونے پر چیف منسٹر نے ۲۲ - جولائی ۱۹۵۲ء کے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں مندرجہ ذیل بیان شائع کرایا :-

"مجلس احرار پنجاب کے لیڈروں نے اپنی پالیسی کے متعلق ایک تازہ اعلان کیا ہے جس میں یقین دلایا ہے کہ وہ قانون و انتظام کے قیام میں میری حکومت کے ساتھ مکمل تعاون کرینگے ہیں اس کا

خیر مقدم کرتا ہوں -

مجلس احرار کے لیڈروں نے اس حقیقت پر بجا زور دیا ہے - کہ پاکستان میں مسلم اکثریت کا قومی ہی نہیں بلکہ مذہبی فرض بھی ہے کہ وہ بلا امتیاز عقیدہ و ذات اس ملک کے ہر شہری کے جان و مال - آبرو اور شہری حقوق کے تحفظ کے ضامن ہوں -

کچھ مدت سے پنجاب کے مختلف اضلاع میں احراری کارکنوں کے عام جلسوں اور مظاہروں پر قیود عائد ہیں - ان قیود کے عائد کرنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ صوبے میں امن عامہ اور انتظام محفوظ رہے - اب احراری لیڈروں کے اعلان کے پیش نظر یہ ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ جہاں تک اس جماعت کے ممبروں کا تعلق ہے ان قیود کو جاری رکھا جائے - لہذا متعلقہ حکام اضلاع کے نام ہدایات جاری کی جا رہی ہیں کہ وہ احکام زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کو واپس لے لیں یا ان میں مناسب ترمیم کر دیں "-

عین اسی وقت ہوم سکرٹری کی طرف سے ایک برقی پیغام تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے نام بھیجا گیا جس میں انہیں ۲۱ - جولائی ۱۹۵۲ء کو اطلاع دی گئی کہ چونکہ مجلس احرار پاکستان نے چیف منسٹر صاحب سے ایک وعدہ کیا ہے اور چیف منسٹر صاحب نے اس وعدے کو قبول کر لیا ہے - اس لئے عام جلسوں کے امتناع کے جو احکام زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری صادر کئے گئے تھے - واپس لے لئے جائیں - ۲۶ - جولائی کو ہوم سکرٹری نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ جیل میانوالی کو ایک لاسلکی پیغام کے ذریعے سے اطلاع دی کہ حکومت نے ماسٹر تاج الدین کی باقی سزائے قید کو معاف کر دیا ہے - اس لئے ان کو فوراً رہا کر دیا جائے - اسی دن اسی قسم کا ایک پیغام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ جیل جھنگ کو بھیجا گیا جس میں شیخ حسام الدین کو رہا کر دینے کی ہدایت کی گئی -

۵ جولائی کی کانفرنس میں جو فیصلہ کیا گیا وہ گویا اس امر کا اعتراف تھا کہ حکومت اس مسئلے کو حل کرنے سے عاجز ہے کہ آیا مسلمان مسجدوں میں ختم نبوت پر کھلم کھلا تقریریں کرنے کے حقدار ہیں یا نہیں - اسی طرح اب جو فیصلہ کیا گیا کہ دفعہ ۱۴۴ کے احکام منسوخ کئے جائیں - ان کی خلاف ورزی کی بنا پر جو مقدمات زیر سماعت ہیں وہ واپس لے لئے جائیں - اور جو لوگ ان احکام کی خلاف ورزی کے مرتکب ثابت ہو چکے ہیں - ان کو رہا کر دیا جائے تو اس فیصلے کا اثر یہ ہوا کہ اس سے پیشتر جو فیصلے کئے گئے تھے کہ احرار کو جمہور سے منقطع کر دیا جائے اور ان کے خلاف جو کیس قابل دست اندازی پولیس اور ناقابل ضمانت قرار دئے جا چکے ہیں - ان کی پیروی زور شور سے کی جائے وہ فیصلے بھی بیکار ہو گئے - ۵ - جولائی کے فیصلوں کے ماتحت مساجد کے اندر گرفتاریاں کرنے یا مساجد کے اندر اور باہر جلسوں کو منتشر کرنے کے متعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے اختیارات محدود کر دیئے گئے تھے - اور ۲۱ - جولائی کے فیصلے سے گویا سرکاری طور پر یہ پوزیشن تسلیم کر لی گئی کہ اگر احراری احمدیوں پر حملہ کرنے - ان کا مال لوٹنے اور ان کی بے آبروئی کرنے سے محترز رہیں تو ان کو پوری آزادی ہے کہ اپنے مطالبات کو مقبول عام بنانے کے لئے سو جتن کریں - اور احمدیوں کے خلاف اور ان کے رہنماؤں اور عقیدوں کے خلاف جتنی شدت سے چاہیں تقریریں کرتے رہیں اس کے بعد یہ سوال ہی باقی نہ رہا کہ نفرت کے اس سیلاب کو جو احمدیوں کے خلاف جاری ہے روکا جائے یا اس طوفان کے انسداد کے لئے کوئی تدبیر اختیار کی جائے -

شہادت میں اُس تاریخ کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے جس پر احراریوں نے وہ اقرار کیا تھا جو ۲۱۔جولائی کے اخباروں میں شائع ہوا مسٹر دولتانہ کا بیان ہے کہ احراریوں کا ایک وفد مولوی محمد علی جالندھری کی سرکردگی میں غالباً ۱۸۔جولائی کو مسٹر دولتانہ کے دفتر میں ان سے ملا جب بعض حکام بھی موجود تھے لیکن ایک سوال سے جو مسٹر یعقوب علی نے میر نور احمد سے کیا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وفد نے چیف منسٹر سے ۱۹۔جولائی کو ملاقات کی تھی۔جب حکومت اور ارکانِ وفد کے درمیان سمجھوتا ہو چکا۔ تو ایک موزوں مسودہ تیار کرنے کا مسئلہ سامنے آیا۔میر نور احمد اور مسٹر ابراہیم علی چشتی کا بیان ہے۔ کہ انہوں نے احراری رہنماؤں سے گفتگو کر کے سمجھوتے کا مسودہ تیار کیا۔جو بعد میں اخبارات میں شائع کیا گیا مولانا محمد بخش مسلم کا بیان ہے کہ اس کانفرنس میں مولانا ابوالحسنات۔سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحبزادہ فیض الحسن۔مولانا غلام محمد ترنم اور خود مولانا محمد بخش مُسلم شامل تھے۔اور یہ کانفرنس ملتان میں گولی چلنے کے بعد یعنی ۱۹۔جولائی کو یا اس کے بعد ہوئی تھی۔یہ کانفرنس بادامی باغ کے ایک کارخانے کے احاطے میں منعقد ہوئی تھی چونکہ نہ چیف منسٹر سے لیڈروں کی ملاقات کا اور نہ اس کے بعد ہونے والی کانفرنس کا کوئی ریکارڈ محفوظ ہے اور مسٹر دولتانہ بھی تاریخ کے متعلق متیقن نہیں ہیں۔اس لئے ہم مولانا محمد بخش مُسلم کے اس بیان کو تسلیم کر لینے پر مائل ہیں کہ میر نور احمد اور مولوی ابراہیم علی چشتی کی ملاقات لیڈروں کے ساتھ ملتان فائرنگ کے بعد ہوئی۔یہ نہ صرف اغلب ہے۔بلکہ اس کی تصدیق حکومت پنجاب کی اس چٹھی سے بھی ہوتی ہے جو کُپ کے واقعہ کے متعلق وزیر اعظم پاکستان کے استفسار پر یہاں سے بھیجی گئی تھی۔چونکہ احرار کے ساتھ تصفیہ کا اعلان واقعہ کُپ کے بعد ہوا تھا۔اس لئے اس کا مطلب یہی تھا۔کہ حکومت ہر قیمت پر احرار سے سمجھوتا کرنے کی خواہش مند ہے۔

کُپ کا واقعہ

اس مقام پر واقعۂ کُپ کا مختصر حال بیان کرنا ضروری ہے۔اگرچہ حکام ضلع کا عام خیال یہ تھا کہ گو دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت عام جلسے اور جلوس ممنوع ہیں لیکن ان کو منتشر کرنے کی اجازت نہیں۔تاہم ملتان کے تھانہ کُپ کے ایک سب انسپکٹر پولیس نے یہ محسوس کیا کہ احکام کا نفاذ اور پھر ان کی مسلسل خلاف ورزی نہایت لغو بات ہے۔چنانچہ اس نے ۱۸۔جولائی کو ملتان میں ایک جلسہ عام اور جلوس کو بزور منتشر کر دیا اس پر عام احساس یہ ہوا کہ یہ سب انسپکٹر نہایت گستاخ اور بے ادب ہے۔اور اس نے رسول پاک صلعم کی توہین کی ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے اگلے دن پانچ ہزار انسانوں کے غضبناک ہجوم نے تھانہ کُپ کو گھیر لیا۔اور اس گستاخ افسر کے تبادلے کا مطالبہ کیا۔جو اعلیٰ حکام اس وقت موجود تھے۔انہوں نے ہجوم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔تھانے کا جنگلہ ہجوم کے بوجھ سے ٹوٹ گیا۔اور یہ مجمع تھانے کے احاطے کے اندر داخل ہو گیا۔پندرہ پیدل کانسٹیبلوں کا ایک دستہ مداخلت بیجا کرنے والے مجمع پر لاٹھی چارج کرنے کے لئے باہر نکلا۔لیکن اس پر اینٹوں کی بوچھاڑ برسا دی گئی اور وہ واپس ہو گیا۔اس کے بعد کسی نے عمارت کو آگ لگا دینے کی کوشش کی جس پر پولیس نے گولی چلا دی تین ہلاک اور تیرہ زخمی ہوئے اور ان زخمیوں میں سے تین ہسپتال میں فوت ہو گئے +

ملتان فائرنگ کے خلاف احتجاج اور مقتول و مجروح لوگوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لئے متعدد مقامات

پر جلسے منعقد ہوئے اور بالآخر ہائیکورٹ کے ایک جج صاحب نے اس واقعہ کی تحقیقات کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ گولی چلانا حق بجانب تھا۔ اگرچہ مقتول و مجروح اشخاص ایک مجمع خلاف قانون کے ممبر تھے اور قانون ملکی کے رُو سے مجرم تھے لیکن وہ بہت سے جلسوں میں علی الاعلان "شہدا" قرار دیے گئے۔ اور احرار نے اشتہار دیا کہ ۲۹۔ اگست ۱۹۵۲ء کو ملتان میں ایک جلسہ ہوگا جس میں شہدا کا چہلم منایا جائیگا۔ ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی نے تجویز پیش کی کہ یہ جلسہ ممنوع قرار دیا جائے لیکن چیف منسٹر صاحب نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور صرف اس امر پر رضامند ہوئے کہ احراریوں کو ایک تنبیہ کر دی جائے۔ تجویز کی گئی کہ تنبیہ کرنے کے بعد حکومت کو ایک پریس نوٹ شائع کرنا چاہیئے لیکن اس کو بھی چیف منسٹر نے منظور نہ کیا۔ پھر جب ہوم سکرٹری نے دریافت کیا کہ آیا احراری لیڈروں کو ایک عام تنبیہ کر دی جائے تو چیف منسٹر نے جواب دیا کہ حکومت کو اس مرحلے پر کسی عام تنبیہ کے متعلق کوئی فکر نہ کرنی چاہیے۔

مسلم لیگ

اب مسلم لیگ بھی علی الاعلان مطالبات کی حمایت کرنے لگی۔ اور بہت سے پوسٹر اور دستی اشتہارات جن پر لیگ کے ممبروں اور عہدہ داروں کے دستخط ثبت تھے۔ لاہور۔ لائل پور۔ جھنگ اور شیخوپورہ کے اضلاع میں شائع ہوئے۔ احرار ختم نبوت کے متعلق جو جلسے منعقد کرتے تھے۔ ان کی صدارت بھی مسلم لیگیوں نے شروع کر دی تھی۔

پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے صدر صاحب کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ لیگ کے ممبر دوسری سیاسی جماعتوں کے جلسوں کی صدارت کر رہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اس بارے میں مسلم لیگ کی پالیسی کو معین کرنا ضروری سمجھا اور یکم اپریل ۱۹۵۲ء کو ذیل کا بیان جاری کیا:۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ صوبے کے اندر بعض مقامات پر مسلم لیگ کے ممتاز ارکان نے جن میں بعض ضلعی مسلم لیگوں کے صدر بھی شامل ہیں۔ احرار کی کانفرنسوں کی صدارت کی ہے۔ میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دوسری انجمنوں کی کانفرنسوں کی صدارت کرنا مسلم لیگ کے نظم و ضبط کی خلاف ورزی ہے۔ لہٰذا میں ہدایت کرتا ہوں کہ آئندہ مسلم لیگ کا کوئی ممبر مسلم لیگ کے سوا کسی دوسری جماعت کے منعقد کئے ہوئے جلسوں کی صدارت نہ کرے۔ بلاشبہ اس میں اُن تقریبات میں شرکت شامل نہیں ہے جن کی نوعیت خالص مجلسی یا غیر سیاسی ہو لیکن "سیاسی" کی تعریف ڈھیلی ڈھالی نہیں بلکہ کڑی ہونی چاہیئے۔ یہ قطعی طور پر ضروری ہے کہ مسلم لیگ کے ممبر کسی ایسی سرگرمی میں حصہ نہ لیں جس سے پاکستان کے شہریوں کے درمیان منافرت و مخالفت پیدا ہونے کا احتمال ہو یا جس میں پاکستانی شہریوں کے بعض خاص طبقوں یا گروہوں کو دشنام و ملامت کا نشانہ بنایا جائے۔"

اس بیان کی بنیاد پر ۳۔ اپریل ۱۹۵۲ء کو ایک گشتی مراسلہ تمام ضلعی اور شہری مسلم لیگوں کے نام بھیجا گیا جس

میں مسلم لیگ کے ممبروں کو غیر مسلم لیگی جلسوں کی صدارت سے منع کیا گیا۔ (مجلسی اور غیر سیاسی جلسے اس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے) اور اس امر پر زور دیا گیا کہ مسلم لیگیوں کو ایسی سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیئے۔ جن سے پاکستانی شہریوں کے مختلف طبقات کے درمیان بیگانگی یا عداوت پیدا ہونے کا احتمال ہو یا جن کا رُخ پاکستانی رعایا کے کسی خاص گروہ یا طبقے کے خلاف ہو۔

لیکن اس ہدایت کے باوجود اضلاع اور شہروں میں مسلم لیگ کی شاخیں اس تحریک کی معاون بننے لگیں جو نہایت سرعت سے پھیل رہی تھی۔ اس سے پیشتر بتایا جا چکا ہے کہ سرگودھا اور گوجرانوالہ میں بعض اشخاص کے خلاف احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی اور مساجد میں احراریوں کے منعقد کردہ جلسوں میں شرکت کے الزام میں مقدمات دائر تھے۔ ۱۷ جولائی ۱۹۵۲ء کو سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ نے ایک جلسہ منعقد کر کے ذیل کی قراردادیں منظور کیں:۔

(۱) کہ عقیدۂ ختم نبوت مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہے۔

(۲) کہ سٹی مسلم لیگ اس امر کی سخت مذمت کرتی ہے کہ احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کا اطلاق مساجد پر کیا گیا اور اس قسم کے احکام کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ عوام کے فرائض مذہبی کی بجا آوری میں مداخلت خیال کرتی ہے۔ اور پُرزور مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت ایسے احکام کو واپس لے لے۔

(۳) کہ سٹی مسلم لیگ حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی خلاف ورزی کے تمام مقدمات واپس لے لے اور جو لوگ اس خلاف ورزی کی بنا پر گرفتار ہیں ان کو رہا کر دے۔

(۴) کہ سٹی مسلم لیگ ان لوگوں کو قانونی امداد دے۔ جو احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں مساجد کے اندر جمع ہونے کی وجہ سے گرفتار کئے گئے ہیں۔

اس سے تین دن بعد یعنی ۲۰ جولائی ۱۹۵۲ء کو سٹی مسلم لیگ سرگودھا نے بھی ذیل کی قراردادیں منظور کیں۔

(۱) کہ سٹی مسلم لیگ اتفاق آرا سے اس مطالبہ کی تائید کرتی ہے کہ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

(۲) کہ سٹی مسلم لیگ صوبہ مسلم لیگ اور آل پاکستان مسلم لیگ سے استدعا کرتی ہے کہ وہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لیں تاکہ ملت میں مزید انتشار پیدا نہ ہو۔

(۳) کہ ان مطالبات کی اہمیت۔ ان کے متعلق اتفاق آرا۔ ان کی نازک نوعیت اور ملک کے عام احساس کے پیش نظر مرکزی اور صوبائی مسلم لیگوں کو اس معاملے میں کچھ عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔

سٹی مسلم لیگ کاموکے نے بھی اس مطلب کی ایک قرارداد منظور کی۔ کہ چونکہ پنجاب کے عُلما نے اتفاق آرا سے احمدیوں کو خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ اس لئے اب احمدی مسلم لیگ کے ممبر نہیں بن سکتے۔ لہٰذا مسلم لیگ کے احمدی ممبروں کو خارج کر دیا جائے اور آئندہ کوئی احمدی مسلم لیگ کی ممبری کا مستحق نہ سمجھا جائے۔

مسٹر دولتانہ صدر پنجاب مسلم لیگ نے ایک بیان دیا۔ جو "آفاق" مورخہ ۱۸ جولائی میں شائع ہوا۔

اس بیان میں آپ نے لیگ کے ممبروں سے اپیل کی۔ کہ وہ اُن مذہبی اور سیاسی مسائل کے حل میں لیگ کی امداد کریں۔ جو مسئلہ ختم نبوت کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ نے مسلم لیگیوں کو صبر و سکون کی تلقین کی۔ تاکہ صوبہ لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل ان مسئلوں پر غور کر سکے۔ کیونکہ یہی وہ تنظیمات ہیں جو صوبہ لیگ کے آئندہ اجلاس میں جمہور کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہیں۔ یہ اجلاس ۲۶۔ ۲۷ جولائی کو منعقد ہوگا۔

پنجاب صوبہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ ۲۸ جون ۱۹۵۲ء میں فیصلہ کیا گیا کہ لیگ کا آئندہ اجلاس ۲۶۔ ۲۷ جولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور میں کیا جائے۔ یکم جولائی ۱۹۵۲ء کو اس مطلب کے لئے ایک عارضی ایجنڈا مرتب کر لیا گیا لیکن اس میں مسئلہ ختم نبوت شامل نہ تھا۔ یہ ایجنڈا کونسل کے تمام ممبروں کے نام بھیج کر ان سے استدعا کی گئی کہ جو قرار دادیں وہ پیش کرنا چاہیں۔ ۱۵ جولائی تک ارسال کر دیں چنانچہ مندرجہ ذیل قرار دادیں لیگ کے جائنٹ سیکرٹری کو وصول ہوئیں:۔

۱۔ قرار داد مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۵۲ء **محرک** قاضی مرید احمد ایم۔ ایل۔ اے کونسلر پنجاب مسلم لیگ **موید**۔ صاحبزادہ محمود شاہ گجراتی کونسلر پنجاب مسلم لیگ۔

کہ پنجاب مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ مرزائی ایک علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں۔ اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ جلد از جلد پنجاب اسمبلی میں ایک قرار داد منظور کرے جس میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کیا گیا ہو۔ کہ مرزائی ایک علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں۔

۲۔ قرار داد۔ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۵۲ء۔ **محرک**۔ صاحبزادہ سید محمود شاہ گجراتی کونسلر پنجاب مسلم لیگ **موید**۔ قاضی مرید احمد کونسلر پنجاب مسلم لیگ

کہ پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے اس اجلاس کو شبہ ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان مملکت کے وفادار نہیں ہیں۔ اور یہ اجلاس یقین کرتا ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان نے وزیر خارجہ کے عہدے سے فائدہ اٹھا کر عقیدۂ مرزائیت کی تبلیغ کی ہے اور سرکاری عہدوں پر مرزائیوں کو مقرر کیا ہے اس جلسے کی رائے میں کشمیر کے مسئلے کے حل میں ہماری ناکامی کا باعث صرف چودھری ظفر اللہ خان کی نا قابلیت ہی نہیں۔ بلکہ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ ان کی اور ان کی جماعت کی روایتی وفاداری بھی اس ناکامی کی ذمہ دار ہے۔ لہذا پاکستان۔ ممالک اسلامی اور کشمیر کے مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان کو حتی الامکان جلد سے جلد ان کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے۔

۳۔ قرار داد۔ مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۵۲ء **محرک**۔ محمد اسلام الدین ایم ایل اے وہاڑی ضلع ملتان

کہ چونکہ مرزائی پیغمبر اسلام صلعم کی خاتمیت پر یقین نہیں رکھتے۔ بلکہ اس کے برعکس اس خاتمیت کے ماننے والوں کو کافر خیال کرتے ہیں۔ اس لئے ان کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ یہ مطالبہ مذہبی۔ جمہوری اور دستوری اصولوں کا تقاضا ہے۔

کہ پنجاب صوبہ مسلم لیگ مرکزی حکومت پر عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت واضح کرے اور اس حکومت

سے مطالبہ کرے کہ اس عقیدے کے مخالفین کو اقلیت قرار دے۔

۴۔ قرارداد مورخہ ۱۲ جون ۱۹۵۲ء۔ محرک :۔ مولانا سید احمد سعید کاظمی ممبر صوبہ مسلم لیگ کونسل۔ ملتان۔ مؤید۔ خواجہ عبدالحکیم صدیقی صدر سٹی مسلم لیگ ملتان۔ مؤید ثانی۔ صوفی محمد عبدالغفور لدھیانوی۔ اعزازی آفس سیکرٹری ضلع مسلم لیگ ملتان۔ کونسلر صوبہ مسلم لیگ۔

کہ چونکہ قادیانی بالاتفاق خارج از اسلام سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور حکومت کو اس اعلان میں تاخیر نہ کرنی چاہئے۔

کہ چونکہ چودھری ظفر اللہ خان قادیانی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے نمائندہ نہیں ہیں اس لئے پنجاب صوبہ مسلم لیگ کی کونسل کو حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنے عہدے سے برطرف کر دیئے جائیں اور ان کی جگہ کوئی قابل اعتبار مسلمان مقرر کیا جائے۔

۵۔ قرارداد۔ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۵۲ء۔ محرک :۔ محمد ابراہیم قریشی جنرل سیکرٹری سٹی مسلم لیگ جھنگ۔ کونسلر پنجاب مسلم لیگ

کہ کونسل کو یہ اعلان کرنا چاہئے۔ کہ احمدیوں کو ان کے اپنے اظہارات اور تحریرات کی بنا پر ایک علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ لیکن ان کے ساتھ حتی الامکان فیاضانہ سلوک کیا جائے۔

کہ کونسل کو پیغمبر اسلام صلعم پر ختم نبوت کے عقیدے کی حفاظت کے لئے ضروری تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور آیندہ جماعت احمدیہ کے کسی ممبر کو کسی کلیدی عہدے پر مقرر نہ کرنا چاہئے۔

کہ مسلم لیگ کو عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہئے تاکہ آیندہ کوئی ظلی یا بروزی اس عقیدے کے خلاف کوئی نظریہ پیش کر کے مملکت کی سالمیت کو خطرے میں نہ ڈال سکے۔

مجلس عاملہ کا دوسرا اجلاس ۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو مسٹر دولتانہ صدر پنجاب صوبہ مسلم لیگ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں صاحب صدر نے اعلان کیا کہ میں نے اور دوسرے عہدہ داروں نے ۱۵ جولائی تک وصول ہونے والی قراردادوں کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کونسل میں صرف آٹھ قراردادیں پیش کی جائیں گی۔ کمیٹی نے اس کو قبول کیا اور منظورہ قراردادوں کی فہرست میں نمبر ۳ "قرارداد ختم نبوت" کے متعلق فیصلہ کیا کہ اس کو سید مصطفےٰ شاہ خالد گیلانی پیش کریں گے۔

کونسل کا دوسرا اجلاس ۲۷ جولائی کو آٹھ بجے صبح شروع ہوا جس میں ذیل کی قرارداد آٹھ ووٹوں کے مقابلے میں ۲۸۴ ووٹوں کی اکثریت سے منظور ہوئی :۔

"پنجاب مسلم لیگ کونسل اس صداقت کا پورا شعور رکھتی ہے کہ ختم نبوت دین اسلام کے بنیادی عقاید میں سے ہے جس نے مسلمانان عالم کو ایک روحانی اخوت کے رشتے میں جکڑ رکھا ہے اور جو پاکستان میں ملت مسلمہ کے اتحاد و سالمیت کی مستحکم بنیاد کا حکم رکھتا ہے۔ اس صداقت کا یہ واضح اور طبعی نتیجہ ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت کے نہ ماننے والے اسلام کے دینی عقاید سے بنیادی اختلاف رکھتے ہیں۔

اس موقف کی بنیاد پر جس کے متعلق نہ کوئی اختلاف موجود ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ایک تجویز پیش کی گئی ہے جو سیاسی اقدام اور دستوری قانون سازی کے دائرے سے تعلق رکھتی ہے کہ احمدی جو ایک دینی مسئلے پر اساسی اختلافی رویہ رکھتے ہیں دستور پاکستان میں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں۔ کونسل کی رائے میں یہ تجویز کسی حد تک مسلمانوں کے اس ردّ عمل کو ظاہر کرتی ہے جو احمدیوں کے رویے سے پیدا ہوا ہے کیونکہ احمدیوں نے نہ صرف مذہبی معاملات میں بلکہ شہری اور مجلسی زندگی میں بھی اکثر علیحدگی کے قوی رجحانات کا اظہار کیا ہے۔

تاہم اس تجویز میں دستوری اور قانونی نوعیت کے بعض سنگین اور اہم امور شامل ہیں جو پاکستان کے شہریوں کے حقوق و فرائض پر اثر انداز ہوں گے۔ اور اس دستوری نظام کی نوعیت کو معین کریگی جو پاکستان کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ ان امور پر طبعاً پُرسکون اور غیر جانبدارانہ انداز سے نہایت محتاط اور گہرا غور و خوض ضروری ہے۔ جو جذباتیت اور شورش انگیزی سے بالکل غیر متاثر ہو اس لئے پنجاب مسلم لیگ کونسل کی رائے یہ ہے کہ اس دستوری مسئلے کو پورے اعتماد کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ کے لیڈروں اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبروں کی پختہ اور صائب دانشمندی پر چھوڑ دیا جائے۔ اور اس اثنا میں مسلم لیگ کی تنظیم کے ہر ممبر کو چاہئے کہ سکون و سنجیدگی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ ایسی ہی فضا میں بنیادی دستوری پالیسی پر اثر ڈالنے والے فیصلے بوجہ احسن کئے جا سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی کونسل اس اصول پر اپنے غیر متزلزل ثبات کا اظہار کرتی ہے کہ مسلمانان پاکستان کا نہ صرف جمہوری بلکہ دینی فرض یہ ہے کہ اس مملکت کے ہر شہری کے جان و مال۔ آبرو اور شہری حقوق کی حفاظت بلا امتیاز مسلک و عقیدہ بلکہ اپنے حقوق کی مانند کریں۔ یہ کونسل پنجاب کی مسلم لیگی وزارت سے توقع رکھتی ہے کہ وہ تمام حالات میں اس اصول کی تائید و حمایت کرے گی۔"

اس کے بعد مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ۲۲۔ اگست ۱۹۵۲ء کو ہوا جس میں قرار دیا گیا کہ مسلم لیگ کا کوئی ممبر یا عہدہ دار آل مسلم پارٹیز کنونشن کی مجلس عمل کے جلسوں کی صدارت نہیں کرے گا۔

اب مسٹر دولتانہ اس رویے کی تصریح میں مصروف ہو گئے۔ جو صوبہ مسلم لیگ نے اپنی قرارداد مورخہ ۲۷۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں اختیار کیا تھا چنانچہ ۳۰۔ اگست ۱۹۵۲ء کو حضوری باغ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"آج دنیا بھر میں پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جو اسلامی حکومت قائم کرنے کا دعویدار ہے۔ تمام دنیا ہمارے اس تجربے کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ اور اگر ہم اس ذمہ داری کی تکمیل میں ناکام رہ گئے تو دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ دنیا میں حکومت کی اسلامی ہیئت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ختم نبوت کے مسئلے میں میرا وہی عقیدہ ہے جو ایک مسلمان کا ہونا چاہئے میرے نزدیک وہ تمام لوگ خارج از اسلام ہیں جو رسول کریم صلعم کو آخری نبی نہیں مانتے۔ میں اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں۔ کہ عقیدہ ختم نبوت پر کوئی بحث اٹھانا خود کفر کے مترادف ہے۔ کیونکہ بحث

کی گنجائش صرف اس مسئلے میں ممکن ہے جس میں کسی قسم کا شبہ وارد ہوتا ہو عقیدۂ ختم نبوت ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ اس لئے ہر بحث اور ہر منطق سے بالاتر ہے۔ مرزائیوں کے خلاف جو نفرت پیدا کی گئی ہے اس کی ذمہ داری خود انہی پر ہے کیونکہ ان کے رحجانات علیحدگی پسندانہ ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ہم سے علیحدہ ہیں۔ اور انہوں نے اپنی ذاتی سیاسی اور مجلسی سرگرمیوں کو صرف اپنی جماعت تک محدود کر رکھا ہے۔ قادیانی افسر اپنی جماعت کے آدمیوں کی طرفداری کے مجرم ہیں کیونکہ انہوں نے بہت سی الاٹمنٹیں محض اس بنیاد پر کی ہیں کہ الاٹی مرزائی تھا۔ گویا انہوں نے اپنی سرکاری حیثیت کا ناجائز استعمال کیا۔

اس صورت حالات کا علاج جذباتی تقریروں اور عام جلسوں سے نہیں ہو سکتا جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے میں فرقہ وارانہ وجوہ کی بنا پر جانبداری کے مجرموں کے خلاف شدید کارروائی کروں گا! اور جہاں اس قسم کی کوئی شکایت کی جائے گی۔ اس کی پوری تحقیقات کراؤنگا۔ میں آپ لوگوں سے احکام اسلام کا واسطہ دے کر اور ملت کی آبرو کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ ہر اس شخص کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کیجئے جو اپنے آپ کو پاکستانی شہری کہتا ہے۔ جب تک میں چیف منسٹر ہوں۔ میں اپنے صوبے میں بے گناہوں کا خون گرانا ہرگز برداشت نہ کرونگا۔ ہر شہری کی آبرو کے تحفظ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔ اور ہر قیمت پر اپنا یہ دینی۔ اخلاقی اور سرکاری فرض بجا لاؤنگا۔ مرزائیوں کو اقلیت قرار دینا ایک دستوری مسئلہ ہے۔ ہمارا دستور اب تک وضع نہیں کیا گیا۔ اور دستور ساز اسمبلی نے اب تک اس امر کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ اکثریت اور اقلیتوں کے درمیان کیا فرق و امتیاز ملحوظ رکھا جائیگا لہٰذا اس مسئلے کو دستور ساز اسمبلی پر چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن اگر بحث کی غرض سے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دے دیا گیا۔ اگر اس کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو مرزائی کہنا بند کر دیا تو پوزیشن کیا ہو گی؟ کسی قوم یا گروہ کو اقلیت قرار دینے کا مقصد تو یہ ہوتا ہے۔ کہ نہ صرف اس قوم یا گروہ کے حقوق معین کئے جائیں۔ بلکہ اُن حقوق کی حفاظت بھی کی جائے۔ اور ان کو سرکاری ملازمتوں اور قانون ساز اسمبلیوں میں رعایات دی جائیں۔ اگر مرزائی اقلیت قرار دے دیئے گئے تو ہم مجبور ہوں گے کہ ان کو وہ تمام رعایات و حقوق دیں جو بحالت موجودہ ہم اُنہیں نہیں دینا چاہتے۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر گہرے اور سنجیدہ غور و خوض کی ضرورت ہے۔ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کو عام جلسے منعقد کرنے۔ فساد مچانے پتھر پھینکنے اور اسی قسم کی دوسری ناواجب حرکات سے حل کیا جا سکے۔ میں اُن لوگوں سے جو ختم نبوت کی تحریک کے سلسلے میں جلسے منعقد کر رہے ہیں۔ یہ سوال کرتا ہوں کہ جس حالت میں ہم سب عقیدۂ ختم نبوت پر قائم ہیں ان جلسوں کی کیا ضرورت ہے۔ ان غیر ضروری جلسوں کو دیکھ کر بعض اوقات میرے دل میں جلسے منعقد کرنے والوں کی نیت پر شبہ پیدا ہو جاتا ہے"۔

"سول اینڈ ملٹری گزٹ" مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۵۲ء میں مسٹر دولتانہ کی اس تقریر کی رپورٹ درج ہے۔

جو انہوں نے راولپنڈی میں کی۔ آپ نے کہا :۔

"میں اس ملک کو ایک صحیح اسلامی جمہوریہ بنانا چاہتا ہوں جس میں ہر شخص بلا امتیاز عقیدہ سیاسی مساوی حقوق رکھتا ہو جس میں ہر چیز کا فیصلہ بہترین عدل و انصاف سے کیا جائے۔ جس میں لوگوں کی اقتصادی اور اخلاقی حالت بہت اچھی ہو اور جس کے لوگ ملک کی مشترکہ بہبود کے حصول کے لئے سنجیدگی۔ ہوشمندی اور خلوص سے کام کریں۔

. . . .

میرا پختہ ایمان ہے کہ نبی کریم صلعم آخری نبی ہیں جس شخص کا یہ عقیدہ نہیں وہ مسلمان نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو شخص یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو اسے اس ملک میں رہنے کا حق نہیں۔ تمام وہ لوگ جو پاکستان میں رہتے ہیں اور پاکستان کے وفادار ہیں۔ خواہ وہ ہندو ہوں۔ عیسائی ہوں یا کسی اور فرقے یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس ملک کی حکومت اور اس ملک کے باشندوں کی حفاظت میں ہیں۔ اہل وطن میں سے ایک ایک فرد کی حفاظت مسلمان کا اور حکومت کا بھی اولین فریضہ ہے۔ جب تک امور حکومت کی عنان میرے ہاتھ میں ہے میں پورا انتظام کرونگا کہ کسی وفادار پاکستانی کو محض اس بنا پر کوئی ضرر نہ پہنچے پائے کہ اس کا مذہب اس کی ذات پات یا اس کا مسلک ہم سے جداگانہ ہے۔

احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا مسئلہ کوئی دینی مسئلہ نہیں۔ بلکہ ایک دستوری معاملہ ہے۔ جس کو یہی حیثیت دینی چاہئے اور اس پر ٹھنڈے دل سے بحث کرنی چاہئے۔ میں احرار اور دوسری مذہبی انجمنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر غور و خوض کے لئے پُرسکون فضا پیدا کریں۔"

نظام آباد کے مقام پر ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۵۲ئہ کو مسٹر دولتانہ نے فرقہ بندی کی مخالفت کی اور کہا۔ کہ جو لوگ مسلمانوں کے درمیان افتراق پیدا کر رہے ہیں وہ نہ صرف اتحاد اسلامی کو بلکہ پاکستان کی سالمیت کو برباد کر رہے ہیں۔ آپ نے عوام کو مشورہ دیا کہ فرقہ پرستوں کی افتراق انگیز سرگرمیوں میں شریک ہونے سے اجتناب کریں ان تقریروں میں جن نکات پر زور دیا گیا۔ وہ یہ ہیں کہ جو شخص عقیدۂ ختم نبوت پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ مسلمان نہیں۔ احمدیوں کے متعلق جو مطالبہ ہے وہ اسی دینی موقف کا تقاضا ہے۔ مطالبات کی نوعیت دستوری اور سیاسی ہے جس پر صرف مرکزی ارباب اختیار دستوری یا مسلم لیگی، ہی غور کر سکتے ہیں۔ صوبے کو ان مطالبات سے کوئی تعلق نہیں اور احرار کو اس معاملے پر پنجاب میں کوئی گڑبڑ نہ کرنی چاہئے۔

بعد کے واقعات

جب تمام امتناعی احکام واپس لے لئے گئے۔ ان کی خلاف ورزی کے مقدمات بھی ختم کر دیئے گئے۔ اس خلاف ورزی کے ماخوذین کی سزائیں بھی معاف کر دی گئیں اور مطالبات کا وجود سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا۔

تو احرار اور ان کے رفقا کو کھلی چھٹی مل گئی۔ کہ وہ اپنے مطالبات پر زور دینے اور ان کی حمایت میں پروپیگنڈا جاری رکھنے کے لئے جن طریقوں کو آئینی سمجھیں۔ ان کو اختیار کر لیں چنانچہ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی مہم کو تیز تر کر کے اپنے پروپیگنڈا کی شدت و وسعت میں اضافہ کر دیا۔ سیکرٹ انٹیلی جنس ایبسٹرکٹ (خلاصۂ اطلاعات خفیہ) ایک سرکاری تحریر ہے۔ جو چیف منسٹر کو بغرض اطلاع ارسال ہوا کرتی تھی۔ اس تحریر سے معلوم ہوا کہ مارشل لا کے اعلان مورخہ ۶ مارچ سے پہلے صوبے بھر میں ۳۹۰ جلسے منعقد ہوئے جن میں سے ۱۶۷ ایسے تھے جن کا اہتمام خالصۃً احراریوں نے کیا تھا۔ سید مظفر علی شمسی۔ شیخ حسام الدین۔ صاحبزادہ فیض الحسن۔ ماسٹر تاج الدین انصاری اور محمد علی جالندھری نے جو مجلس احرار کے ممتاز ممبر تھے۔ اپنے آپ کو اس تحریک کا دائمی مبلغ بنا دیا۔ گویا احمدیوں کی مخالفت ہی ان کی زندگیوں کا واحد مقصد تھا۔ جلسوں میں احمدیوں کے خلاف ہر قسم کے دلائل دُہرائے جاتے تھے۔ اور احمدیوں اور ان کے لیڈروں کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ تقریری مہم کے ساتھ ہی ساتھ پوسٹر۔ اشتہار۔ کتابچے۔ اخباروں میں مضامین اور جلوس بھی جاری تھے۔ ۲۴ جولائی ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے حکومت کو اطلاع دی کہ صوبے کے مختلف مقامات پر چودھری ظفر اللہ خان کے جنازے نکالے جا رہے ہیں۔ لہٰذا پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۳ کے ماتحت کارروائی کرنی چاہئے لیکن ہوم سیکرٹری نے کہا کہ یہ ایکٹ ایسے معاملات میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بجائے یہ تجویز کی کہ چیف منسٹر صاحب احراری لیڈروں سے بات چیت کریں۔ اور انہیں اس وعدے کی پابندی کی طرف متوجہ کریں جو انہوں نے کر رکھا ہے۔ یہ تجویز چیف سیکرٹری کی وساطت سے چیف منسٹر کی خدمت میں پیش کی گئی جس پر انہوں نے ۳۰۔ جولائی کو اپنے مختصر دستخط ثبت کر دیئے۔

ایم بی ہائی سکول وزیر آباد کے طالب علموں نے ایک جلوس نکالا جس میں ایک چارپائی کے ساتھ کُتا بندھا ہوا تھا۔ اور اس کو چودھری ظفر اللہ خان ظاہر کیا گیا تھا۔

ایک اور جلوس ۲۵۔ جون ۱۹۵۲ء کو قصور کے بازاروں میں بعد نماز جمعہ نکلا جس کی رپورٹ ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس قصور نے اپنی ڈائری مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۵۲ء میں قلمبند کی۔ اور وہ بھی چیف منسٹر صاحب کے علم میں لائی گئی۔ اس جلوس میں جو نعرے لگائے گئے ان میں چودھری ظفر اللہ خان کو نہایت ذلیل گالیاں دی گئیں۔ مثلاً ظفر اللہ کنجر"۔ "ظفر اللہ کتا"۔ "ظفر اللہ سُوّر"۔ اور بعد میں شرکائے جلوس ایک گدھی کو پکڑ لائے جس پر "بیگم ظفر اللہ" لکھا تھا۔ اس گدھی پر ایک آدمی سوار تھا جس کے سر پر ٹاپ ہیٹ اور گلے میں جوتیوں کا ہار تھا اور اس پر مرزا غلام احمد کا نام لکھا تھا۔ جب مسٹر قربان علی خان کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے لکھا کہ یہ واقعہ اس شورش کا قدرتی نتیجہ ہے جو قانون کے خلاف جاری ہے۔ ایک لاقانونی حرکت سے دوسری لاقانونی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ اور اگر کوئی انسدادی طریقہ دریافت نہ کیا گیا تو اس کا انجام انقلاب ہو گا اور یہ تاریخ کا وہ سبق ہے جس میں تاخیر تو ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ چیف منسٹر صاحب نے اس کیس کا معائنہ تو کیا لیکن اس واقعہ پر کوئی توجہ نہ کی گئی۔

اس دوران میں لاقانونی کے متعدد اور واقعات کی اطلاعات بھی موصول ہوئیں۔ ان سب کا ذکر

سرکاری کاغذات میں موجود ہے۔ اور وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) ۲۰ جولائی ۱۹۵۲ء کو لائلپور میں ایک احمدی کی دکان پر رائفل چلائی گئی اور احمدیوں کی ایک مسجد پر پتھر پھینکے گئے۔

(۲) ۵ راگست ۱۹۵۲ء کو مصری شاہ لاہور میں ایک احمدی پر حملہ کیا گیا۔

(۳) چک ۹۷/۴ جھنگ میں احمدیوں اور غیر احمدیوں میں لڑائی ہو گئی۔

(۴) ۲ ستمبر ۱۹۵۲ء کو ایک جھگڑنے کے دوران میں مسماۃ طالع بی بی پر حملہ کیا گیا کیونکہ وہ احمدی عورت تھی۔

(۵) ۱۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کو منڈی جڑانوالہ میں ڈاکٹر محمد حسین خان احمدی پر ایک شخص نے حملہ کیا جو احمدیت کے خلاف ایک کم بچے سے قابل اعتراض اشعار پڑھ رہا تھا اور ڈاکٹر نے اس کو اس حرکت سے روکا تھا

(۶) ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء کو جب خواجہ ناظم الدین لاہور آئے تو ہڑتال ہوئی جو لوگ ہڑتال کرنے کے خلاف تھے ان کے منہ کالے کئے گئے۔ دیال سنگھ کالج کا محاصرہ کرکے اس پر خشت باری کی گئی تعلیم الاسلام کالج پر پتھر پھینکے گئے اور اس کا بڑا دروازہ توڑ دیا گیا۔

(۷) ۲۷ جولائی کو مسلم لیگ کے دفتر کے باہر بلوہ ہو گیا جس میں ۱۴ پولیس کے آدمی زخمی ہوئے اور کاریں توڑ دی گئیں۔

(۸) محلہ اراضی یعقوب سیالکوٹ میں احمدیوں کی ایک مسجد کو آگ لگانے کی کوشش کی گئی۔

اخبارات

اس زمانے میں اخبارات کے ذریعے مسلسل و متواتر پروپیگنڈا جاری رہا۔ "زمیندار" جو اُن چار اخباروں میں سے ایک تھا جن کی مربّی گری حکومت کر رہی تھی اور جن کو بعض معاملات کے ماتحت حکومت سے بہت بڑی رقم مل چکی تھی۔ مطالبات کی حمایت اور احمدیت کی مخالفت میں برابر لکھ رہا تھا۔ احراریوں کے اخبار "آزاد" کا بھی یہی حال تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ احمدیوں کی مخالفت اس اخبار کے کالموں کا واحد موضوع تھا۔

"آزاد"

اس اخبار کی اشاعت مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون چھپا جس کا جائزہ لینے پر خیال کیا گیا کہ اخبار کے خلاف مقدمہ چلایا جانا ضروری ہے۔ لیکن ہوم سکرٹری چیف سیکرٹری اور چیف منسٹر نے یہ رائے دی کہ اخبار کو ایک اور تنبیہ کی جائے اور دیکھا جائے کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔

اس اخبار کی اشاعت مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۲ء کا نام "مطالبہ نمبر" تھا۔ یہ پرچہ کاملاً احمدیوں کی مخالفت کے لئے وقف کیا گیا تھا۔ اس میں ایک اہم چیز ایک نظم تھی۔ "ملتان پوچھتا ہے" جس میں اُن اشخاص کی مدح سرائی کی گئی تھی جو کُپ کے واقعہ میں مارے گئے تھے۔ ڈائرکٹر تعلقات عامہ نے ۱۲ ستمبر ۱۹۵۲ء کو اور لیگل ریممبرنسر نے ۱۷ ستمبر ۱۹۵۲ء کو اس نظم کا جائزہ لیا۔ اور دونوں نے اتفاق کیا کہ اس کے خلاف کارروائی ہونی چاہیے۔

لیکن اس کے متعلق کچھ بھی نہ کیا گیا۔

اس اخبار نے اپنے صفحہ اول پر ایک کارٹون شائع کیا۔ اس کا جائزہ لینے والے افسر نے اس کی حسب ذیل تصریح کی :۔

"سرورق پر اس اخبار نے ایک رنگا رنگ کارٹون شائع کیا ہے جس میں جان بُل کو ایک سپیرا ظاہر کیا گیا ہے جو احمدیت کی ٹوکری سے سانپ نکال رہا ہے۔ ایک بڑا سانپ اس ٹوکری سے اُٹھ کر قادیان پر (جس کو ایک بلند مینار سے ظاہر کیا گیا ہے ۔) چھا گیا ہے۔ وہاں سے وہ ایک سوراخ میں داخل ہو کر ربوہ میں مرزا بشیر الدین محمود احمد کی صورت میں نمودار ہو گیا ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد کو اپنے منہ سے تین سانپ خارج کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان سانپوں میں سے ایک تو راولپنڈی میں قائد ملت مرحوم کو ڈس رہا ہے۔ دوسرا ایک ہوائی جہاز کو تباہ کر رہا ہے۔ (جنگشاہی کے ہوائی حادثے کی طرف اشارہ) اور تیسرا چودھری ظفر اللہ خان کی شکل میں وزیر اعظم پاکستان کو ڈسنے کے در پے ہے۔"

مرکزی حکومت نے اپنی چٹھی نمبری (۱) P011 28/43/52 مورخہ ۱۱۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں حکومت پنجاب کی توجہ اس کارٹون کی طرف مبذول کرائی۔ اس چٹھی میں لکھا تھا کہ غالباً حکومت پنجاب اس کارٹون کو ملاحظہ کر چکی ہے اور اس کے خلاف مناسب کارروائی کر کے مرکزی حکومت کو اطلاع دے گی۔ اس کے جواب میں ڈائرکٹر تعلقات عامہ نے اپنی چٹھی نمبری P.B-52/985-3754 مورخہ ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں مرکزی حکومت کو صرف یہ اطلاع دی کہ حکومت صوبہ نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہدایت کی ہے۔ کہ اس اخبار کے پرنٹر پبلشر کو طلب کر کے تنبیہ کر دیں کہ اگر وہ اس قسم کا مواد شائع کرنے سے باز نہ آئیگا تو حکومت اس کے اخبار کو بند کر دیگی۔

اس اخبار نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۲۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں ایک افتتاحیہ شائع کیا جس کا عنوان صرف ایک استفہامی علامت (؟) تھی اس مضمون میں جماعت احمدیہ کے موجودہ امام کو گندی گالیاں دی گئی تھیں اور حکومت پر یہ الزام لگایا گیا تھا۔ کہ وہ کفر و ارتداد کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ اس اخبار نے جو الفاظ اس سلسلے میں استعمال کئے۔ وہ ہو بہو درج ذیل ہیں :۔

"آخر کب تک ایک زانی و شرابی۔ ایک غنڈے اور بدمعاش، مفتری و کاذب اور دجال کو اس ملک میں ہمارے کان۔ نبی۔ مسیح موعود اور احمد و محمد کے نام سے پکارے جاتے سنتے رہیں گے۔ اور کب تک اُمت کی مقدس و مطہر ماؤں کو ایک ننگ انسانیت عورت کے لئے اپنی قبروں میں بے چین ہونا پڑے گا اور کب تک انبیا اولیا کی توہین و تذلیل اور عقائد و شعائر دین کی رسوائی کا تماشائے بے حمیتی جاری رہے گا۔ آخر یہ زندگی بے حیائی و بے غیرتی اور دیوثی کی زندگی نہیں۔ تو اور کیا ہے؟ قوم آج مجسم طور پر ایک سوالیہ نشان بن کر خداوندانِ حکومت اور قومی ذمہ داروں کا منہ تک رہی ہے۔ لہذا ان کا فرض ہے۔ کہ وہ ان کے جانے پہچانے سوال کا جلد از جلد کوئی مفصل و مدلل اور دوٹوک جواب دیں۔ ورنہ سمجھ لیں کہ یہ خاموشی۔ یہ بے اعتنائی و بے نیازی۔ یہ مداہنت و تغافل۔

یہ کفر و ارتداد پروری اور غدار نوازی کا سوچا سمجھا ہوا شرمناک رویہ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکے گا"۔

مرکزی حکومت نے اپنی چٹھی مورخہ ۲۱۔ نومبر ۱۹۵۲ء کے ذریعے سے حکومت صوبہ کو اس مضمون کی طرف توجہ دلائی اور اس کے متعلق منٹگمری کی احمدی جماعت کی شکایتی قرارداد بھی بغرض کارروائی منسلک کر دی جو مرکزی حکومت کو موصول ہوئی تھی۔ یہ مضمون زیر دفعہ ۱۵۳۔الف تعزیرات پاکستان اور زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قابل اقدام سمجھا گیا۔ لیکن مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ عجیب رائے ظاہر کی کہ مرکزی حکومت نے اس بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کی اور حکومت پنجاب کچھ مدت سے مرکزی حکومت کے اس رویے پر اظہار تاسف کر رہی ہے۔ آپ نے کہا کہ مرکزی حکومت کی اس بے پروائی کے پیش نظر حکومت صوبہ کو چاہیے کہ کوئی کارروائی نہ کرے۔ اور میں خود اس اخبار کے ایڈیٹر ماسٹر تاج الدین انصاری سے بات چیت کرونگا۔ ہوم سکرٹری نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اور چیف منسٹر صاحب نے کیس پر دستخط کر دیئے۔

پھر ۱۰ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو وزارت داخلہ نے اپنی ڈی او نمبری (۱) 44/9/52 Poll بنام ہوم سکریٹری حکومت پنجاب میں حکومت پنجاب کو اس اخبار کی سرگرمیوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس چٹھی میں ہوم سیکرٹری کی سابقہ چٹھی ڈی او نمبری 52 (H S) ST - 273 مورخہ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۵۲ء اور مسٹر نور احمد کی چٹھی بجواب چٹھی وزارت داخلہ نمبری (۱) Poll - 52/43/28 مورخہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کا حوالہ دے کر یہ لکھا گیا کہ حکومت پنجاب کے بیان کے مطابق اس اخبار کو کئی دفعہ تنبیہ کی جا چکی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایسا مواد شائع کر رہا ہے جس سے پاکستانیوں کے ایک طبقے کے مذہبی جذبات کو قطعی طور پر صدمہ پہنچتا ہے اور جس کا مقصد ہی یہ ہے۔ کہ جمہور کے مختلف طبقات کے درمیان دشمنی پیدا ہو۔ ایسی حالت میں مرکزی حکومت کی رائے یہ ہے کہ چونکہ گذشتہ تنبیہات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ لہٰذا حکومت صوبہ دوسرے متبادل طریق کو اختیار کرنے میں تامل نہ کرے۔ یعنی اس اخبار کے خلاف مقدمہ چلائے۔ حکومت صوبہ سے یہ بھی التماس کی گئی کہ وہ جلد سے جلد مرکزی حکومت کو اطلاع دے کہ اس بارے میں کیا اقدام کیا گیا ہے۔ اس چٹھی پر بھی کوئی اقدام نہ کیا گیا۔ اور وزارت داخلہ نے اپنی چٹھی نمبری (۱) Poll - 52/9/44 مورخہ ۲۷۔ دسمبر ۱۹۵۲ء میں ہوم سکرٹری کو دوبارہ یاد دہانی کرائی اس چٹھی میں وزارت کی سابقہ چٹھی مورخہ ۱۰۔ دسمبر ۱۹۵۲ء کا حوالہ دے کر یہ بتایا گیا تھا کہ اس چٹھی کے ارسال کے بعد بھی اس اخبار کی اشاعت مورخہ ۲۱ دسمبر ۱۹۵۲ء میں ایک اور قابل اعتراض نظم "دردمندان قوم" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جو نہ صرف پریس ایکٹ (ایمرجنسی پاورز) اور پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت بلکہ ملک کے مستقل قانون فوجداری کے ماتحت بھی قابل اقدام ہے۔ اس چٹھی میں حکومت صوبہ سے دوبارہ التماس کی گئی کہ اس مضمون پر جو کارروائی کی جائے اس سے مرکزی حکومت کو مطلع کیا جائے۔ یہ چٹھی چیف سیکرٹری اور ڈائرکٹر تعلقات عامہ کی نظر سے گزری لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

"آفاق"

"آفاق" مورخہ ۱۹ جولائی میں "قادیانیوں کے امام کی ایک نہایت افسوسناک تقریر" کے عنوان سے امام جماعت احمدیہ کا ایک خطبہ نقل کیا گیا۔ جو "الفضل" مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ "آفاق" نے اس خطبے پر مخالفانہ تبصرہ کیا اور ۲۰ جولائی کے پرچے میں صوبے کے مختلف مقامات پر "یوم مطالبہ" منانے کی اطلاعات درج کیں۔

اس اخبار نے اپنی اشاعت مورخہ ۳۰ جولائی میں ایک افتتاحیہ لکھا جس میں ختم نبوت کے متعلق مسلم لیگ کی قرارداد پر بحث کی۔ اس مضمون میں بتایا گیا کہ صوبہ مسلم لیگ سے ایک مطالبہ یہ کیا گیا ہے۔ کہ مرزائیوں کے خارج از اسلام ہونے کا اعلان کیا جائے مسلم لیگ اس مطالبہ کی صحت کو تسلیم کر چکی ہے۔ اور مسٹر دولتانہ اپنی تقریر میں صاف صاف اعلان کر چکے ہیں کہ مسلم لیگ میں اس معاملے پر اتفاق رائے ہے کہ مرزائی مسلمان نہیں ہیں کیونکہ وہ عقیدہ ختم نبوت کے منکر ہیں۔ اس مضمون میں اس اعلان کی تعریف کی گئی اور کہا گیا کہ اور کسی ذمہ دار لیڈر نے ایسا واضح اعلان نہیں کیا۔ اور اس معاملے میں پنجاب مسلم لیگ اور اس کے صدر محترم قابل تحسین ہیں۔ مضمون میں تصریح کی گئی کہ مسلم لیگ نے مطالبات کی حمایت کرنے کے باوجود اس موضوع پر کوئی فیصلہ اس لئے نہیں کیا کہ یہ مسئلہ دستوری ہے جس کا تعلق صرف پنجاب سے نہیں بلکہ پورے پاکستان سے ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے کا فیصلہ آل پاکستان مسلم لیگ اور دستور ساز اسمبلی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مضمون میں یہ امید ظاہر کی گئی کہ اب پاکستان مسلم لیگ اور دستور ساز اسمبلی قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے میں تامل نہ کریگی اور قرارداد کے اس حصے کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی جس میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی تھی کہ پاکستان کے تمام شہریوں کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت ان کا مذہبی فریضہ ہے۔

۱۹ جولائی ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں ایک اور مضمون شائع ہوا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ آج کل ملک میں جو تشویش انگیز اور خطرناک صورت حالات پیدا ہو رہی ہے یہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کی تقریروں اور خطبوں اور احمدیوں کے جارحانہ منصوبوں کی پیدا وار ہے۔

۱۸۔ اگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں "الفضل" کے قابل اعتراض اقتباسات کا ایک انتخاب شائع کیا گیا جس میں موجودہ امام جماعت احمدیہ کے بعض بیانات شامل تھے۔ یکم ستمبر کے پرچے میں مسٹر دولتانہ کی حضوری باغ والی تقریر درج کی گئی۔

۲۸۔ فروری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں ایک نامہ نگار اکبر مراد پوری کا ایک مراسلہ شائع ہوا جس میں بعض سوالات اور احمدی تحریروں سے ان کے جوابات شائع کر کے

یہ ظاہر کیا گیا تھا۔ کہ احمدی ایک علیحدہ اُمت ہیں۔

"احسان"

۲۱۔ جولائی ۱۹۵۲ء کے "احسان" میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کی مجلس عمل کی طرف سے ایک اپیل شائع ہوئی۔ جس میں لوگوں کو تلقین کی گئی تھی کہ احمدیوں کی اشتعال انگیزی کے باوجود پرامن رہیں۔ اور مساجد کے اماموں سے استدعا کی گئی تھی کہ آئندہ نماز جمعہ کے موقع پر نمازیوں کو ہر قسم کی بدنظمی پیدا کرنے سے اجتناب کی نصیحت کریں۔ اس اپیل میں یہ بتایا گیا تھا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے اور چودھری ظفر اللہ خاں کو برطرف کرنے کے مطالبات بالکل آئینی ہیں۔ ان پر ایسی فضا میں زور دینا چاہیئے جو قانون شکنی سے بالکل پاک ہو۔

۳۔ اگست ۱۹۵۲ء کے "احسان" میں اُن قراردادوں کی رپورٹ شائع ہوئی۔ جو یکم اگست کو جمعہ کے دن مختلف مساجد میں منظور کی گئی تھیں۔ ان قراردادوں میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کے موقف کی حمایت کی گئی تحریک کو کاملاً پرامن رکھنے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ اور مطالبات کی تکمیل پر اصرار کیا گیا۔ مساجد میں جو تقریریں کی گئیں۔ ان میں بھی پنجاب مسلم لیگ کی اس قرارداد کی تعریف کی گئی جس میں مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔ لیکن قرارداد کے اس حصے کے متعلق بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا جس میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں یہ تشویش انگیز خبر بھی درج کی گئی کہ ایک چٹھی موصول ہوئی ہے جس میں مولانا ابوالحسنات مولانا مودودی۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری۔ مولانا احمد علی اور مولانا مُسلم کو قتل کی دھمکی دی گئی ہے۔

۸۔ اگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں "قادیانی نبوت" کے عنوان سے سید فقیر حسین بخاری ایم اے بی ٹی پروفیسر اسلامیہ کالج کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں احمدیہ عقائد پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اور وعدہ کیا گیا تھا کہ آئندہ اشاعت میں ایک اور جامع مقالہ درج کیا جائے گا۔

۱۰۔ اگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں جماعت احمدیہ اور چودھری ظفر اللہ خاں کے خلاف ایک نہایت شدت آمیز افتتاحیہ درج کیا گیا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ قادیانی پاکستان کے لئے حقیقی خطرہ ہیں اور وہ ملت مسلمہ کے ممبر نہیں ہیں۔ اس میں یہ خبر بھی درج تھی کہ خواجہ ناظم الدین نے وعدہ کیا ہے۔ کہ وہ یوم پاکستان یعنی ۱۴۔ اگست کی تقریر میں ان مطالبات کو تسلیم کر لیں گے۔ جو مرزائیوں کے خلاف کئے گئے ہیں۔ اور لوگ اس تاریخی اعلان کا نہایت بیتابی سے انتظار کر رہے ہیں۔

۱۸۔ اگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں وزیر اعظم کی تقریر (یوم پاکستان) پر تبصرہ کیا گیا۔ اور اس امر پر مایوسی کا اظہار کیا گیا کہ وزیر اعظم مسئلہ مرزائیت کا ذکر حذف کر گئے۔ حالانکہ یہ مسئلہ پاکستان کے لئے حقیقی داخلی خطرہ بن چکا ہے۔ حکومت پاکستان کے اس سرکاری اعلان کی تعریف کی گئی کہ کوئی مرکزی یا صوبائی وزیر اپنے ماتحتوں میں فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کرنے کا مجاز نہیں۔ ان جلسوں جلوسوں اور ہنگاموں کی مذمت کی گئی جو مرزائیوں کے خلاف جاری ہیں۔ تجویز کی گئی کہ یہ مسئلہ آئینی طریقے سے مجلس دستور ساز پاکستان

ہیں اور ایک قرارداد کی شکل میں آل پاکستان مسلم لیگ کی کونسل کے آئندہ اجلاس ڈھاکہ میں پیش کرنا چاہئے۔
۳۱ جنوری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں ایک شخص عتیق الرحمن چشتی کی کتاب "قادیانی فتنہ" پر ریویو شائع کیا گیا۔ اس ریویو میں بیان کیا گیا کہ مرزائیت کو انگریزوں نے دانستہ پیدا کیا تھا۔ اور اب یہ اسلام کو تباہ کر رہی ہے۔ اور اس کتاب میں ایک مرتد فرقے کے غلط عقائد کی قلعی کھولی گئی ہے۔ اور اس فرقے کے جھوٹے نبی کے چال چلن کی نفرت انگیز تصویر کھینچی گئی ہے۔ اسی طرح ۵ فروری کی اشاعت میں پروفیسر الیاس برنی کی کتاب "قادیانی مذہب" پر ایک کالم کا ریویو درج کیا گیا۔ یہ کتاب درحقیقت قادیانی عقاید پر ایک بلاواسطہ تبصرہ ہے۔

"مغربی پاکستان"

اس اخبار نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۵۲ء میں حکومت پاکستان کی خارجہ حکمت عملی پر تنقید کی اور بتایا کہ یہ چودھری ظفر اللہ خاں کی ذاتی حکمت عملی ہے اور چودھری ظفر اللہ خاں تنازعہ کشمیر کے سلجھانے میں ناکام رہے ہیں۔ "سنگ و خشت" کے عنوان سے اس اخبار نے چودھری ظفر اللہ خاں کو از راہ طعن یہ مشورہ دیا کہ آئندہ جب وہ لاہور آئیں۔ تو پولیس کی حفاظت طلب کرنے کے بجائے حضرت صاحب (امام جماعت احمدیہ) سے کہیں کہ وہ ان کی سلامتی کی دعا مانگیں۔ پھر ۱۰ اگست کی اشاعت میں چودھری ظفر اللہ خاں کے استعفے کی خبر پر طنزیہ اشارے کئے گئے کہ انہوں نے غالباً "پیغمبر زادے" (امام جماعت احمدیہ) کے مشورے کے بعد استعفا دیا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے اپنی وزارت کے دوران میں جو کچھ کیا ہے ہمیشہ اپنے امام جماعت کے مشورے کے بعد کیا ہے۔ اسی اشاعت میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کا ایک بیان شائع کیا گیا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ کنونشن کی مساعی بارآور ہو رہی ہیں اور اپیل کی گئی تھی کہ تبلیغ کانفرنسوں کے انعقاد، وفود کی ترسیل اور سرمائے کی فراہمی کے ذریعے وسیع پروپیگنڈا کر کے اس کی تائید و حمایت کی جائے۔ اس اشاعت میں زیر اہتمام مجلس عمل ایک جلسے کا اعلان بھی کیا گیا۔ جس میں مقررین کے نام درج کئے گئے۔ اور لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ جوق در جوق اس جلسے میں شامل ہوں۔

اشاعت مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۵۲ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی یہ رائے درج کی گئی کہ مرزا غلام احمد نبوت کا دعویٰ کرنے کی وجہ سے مرتد ہے۔

۱۸ اگست کی اشاعت میں حکومت پاکستان کے سرکاری اعلان مورخہ ۱۴ اگست پر تبصرہ کیا گیا اور کہا گیا کہ حکومت نے احمدیوں کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات کو غلط سمجھا ہے۔ مسلمانوں کو اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ چودھری ظفر اللہ خاں اپنے ماتحتوں کو قادیانی مذہب میں شامل کرنے کی کوشش کریں گے۔ بلکہ ان کی برطرفی کے مطالبہ کی یہ وجوہ ہیں۔ اول کہ وہ مرزائی ہیں۔ دوم کہ وہ کاملاً خلیفہ قادیان کے قبضے میں ہیں۔ سوم کہ وہ پاکستان کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ چہارم کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے کوئی روابط نہیں ہیں۔

یکم ستمبر کی اشاعت میں مسٹر دولتانہ کی اس تقریر کی رپورٹ درج ہے جو انہوں نے ۳۰۔ اگست کو حضوری باغ میں کی تھی۔ اور جس میں دوسرے امور کے علاوہ انہوں نے عقیدہ ختم نبوت کے متعلق یہ اعلان کیا تھا۔ کہ ان کا اس عقیدے پر ایمان ہے۔ بلکہ ان کا یہ عقیدہ بھی ہے۔ کہ جو شخص پیغمبر اسلام صلعم کو آخری نبی نہیں مانتا۔ وہ مسلمان نہیں ہے۔

۲۷۔ ستمبر کی اشاعت میں ایک نظم شائع کی گئی جس میں شاعر نے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ختم نبوت کے پاکیزہ مقصد کے لئے جدوجہد کرنے کی غرض سے کفر اور دشمن کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں۔

۲۹ ستمبر کی اشاعت میں مجلس عمل کے بعض ارکان اور چیف منسٹر کی ایک ملاقات کا حال درج کیا گیا جس کے دوران میں وفد مجلس نے مولانا ابوالحسنات کی سرکردگی میں ایک تحریری عرضداشت پیش کی تھی جس میں یہ شکایات مندرج تھیں کہ ربوہ کی زمین مرزائیوں کے ہاتھ فروخت کی گئی ہے۔ مرزائیوں کے حق میں اندھا دھند الاٹمنٹیں کی گئی ہیں۔ مرزائیوں کی تبلیغی سرگرمیاں قابل اعتراض ہیں۔ ان کا لٹریچر اشتعال انگیز ہے۔ اور وہ اسلام کی وہ خاص اصطلاحات اپنے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ جواب تک صرف اسلام کی بعض مخصوص مقدس ہستیوں ہی کے لئے مخصوص رہی ہیں۔

مسٹر دولتانہ نے دعویٰ کیا ہے کہ جولائی کے قریباً تیسرے ہفتے سے "آفاق"۔ "احسان" اور "مغربی پاکستان" نے جن میں سے ہر ایک کو حکومت سے بڑی بڑی رقمیں وصول ہوئی تھیں۔ احمدیوں کے خلاف شورش کی کوئی خبر نہیں چھاپی۔ لیکن جو کچھ ہم نے اب تک لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تینوں اخبار اس عرصے میں برابر اس موضوع پر لکھتے رہے۔ جب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر اطلاعات و نشریات جولائی ۱۹۵۲ء کے نصف آخر میں لاہور آئے تو ان سے شکایت کی گئی کہ حکومت پنجاب خود احمدیوں کے خلاف شورش کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ اور مسٹر حمید نظامی ایڈیٹر "نوائے وقت" نے کھلم کھلا میر نور احمد ڈائرکٹر تعلقات عامہ پر اس سازش میں شریک ہونے کا الزام عائد کیا۔ مسٹر نظامی کا بیان ہے کہ جب ڈاکٹر قریشی جولائی یا اگست میں لاہور آئے تو انہوں نے بعض مقامی اخباروں کے ایڈیٹروں کو ایک پرائیویٹ چائے پر دعوت دی جس میں بعض افسر جن میں میر نور احمد بھی شامل تھے اور لاہور کے تمام اہم روزناموں کے ایڈیٹر بھی شریک ہوئے۔ اس پارٹی میں احمدیوں کے خلاف شورش پر گفتگو ہوئی اور ڈاکٹر قریشی نے کہا کہ چودھری ظفراللہ خاں کے خلاف جو مہم اخبارات میں جاری ہے۔ وہ ملک کے مفاد کے لئے مضرت رساں ہے۔ اور اس سے سنگین نتائج کا احتمال ہے۔ پارٹی میں جو مہمان شریک تھے۔ انہوں نے اس معاملے کے متعلق اپنی آرا کا اظہار کیا۔ مسٹر نظامی خاموش رہے۔ ڈاکٹر قریشی نے ان سے پوچھا۔ کہ آپ اپنی رائے کیوں ظاہر نہیں کرتے۔ مسٹر نظامی نے جواب دیا کہ میرا کوئی رائے ظاہر کرنا بالکل بے کار ہے۔ کیونکہ یہ مہم ان اخباروں نے جاری کر رکھی ہے جن کو حکومت سے مالی امداد مل رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ اپنا مطلب واضح طور پر بیان کیجئے۔ اس پر مسٹر نظامی نے کہا کہ یہ پوری شورش حکومت کے ایما سے ہو رہی ہے۔ اور اگر حکومت چاہے تو یہ شورش ایک لمحے کے اندر بند ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جو اخبارات اس مہم میں مصروف ہیں۔ وہ حکومت

کی ہدایات کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر قریشی نے کہا میں نے اس قسم کی افواہیں پہلے بھی سُنی ہیں لیکن مجھے اس سلسلے میں حقائق میسر نہیں ہو سکے مسٹر نظامی نے اس پر میر نور احمد کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ کہ اس معاملے میں سب سے بڑے مجرم یہ ہیں۔ کیونکہ یہی اس تحریک کے متعلق تمام مضامین لکھوا رہے ہیں۔ ڈاکٹر قریشی نے مسٹر نظامی سے پوچھا کہ کیا آپ اپنے اس بیان کا کوئی ثبوت مہیا کر سکتے ہیں۔ مسٹر نظامی نے کہا۔ کہ اگر میر نور احمد میرے الزام کی صحت سے انکار کر دیں گے۔ تو میں ثبوت مہیا کر دونگا۔ میر نور احمد نے یہ سب کچھ سُنا۔ اور خاموش رہے۔ ڈاکٹر قریشی نے حمید نظامی سے پوچھا کہ آیا آپ اس الزام کو وزیر اعظم پاکستان کے سامنے دہرانے پر آمادہ ہیں مسٹر نظامی نے کہا کہ میں بالکل آمادہ ہوں اس کے ایک ماہ بعد مسٹر نظامی کراچی گئے اور وزیر اعظم سے ملے۔ وزیر اعظم نے ان سے پوچھا۔ آیا آپ ان مضامین کی فہرست مہیا کرنے کو تیار ہیں۔ جو میر نور احمد نے لکھوائے تھے مسٹر نظامی نے کہا کہ میں آئندہ کراچی آؤنگا۔ تو فہرست پیش کر دونگا۔ جب مسٹر نظامی ایک ماہ بعد دوبارہ کراچی گئے۔ تو اپنے ساتھ ان مضامین کی ایک فائل لیتے گئے۔ جو ان کے نزدیک میر نور احمد نے لکھوائے تھے مسٹر نظامی نے یہ فائل مسٹر مشتاق احمد گورمانی کے حوالے کر دی۔ تاکہ وہ اسے وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کر دیں جب اس کے بعد ایک موقع پر ہوم سیکرٹری نے مسٹر نظامی کو طلب کیا۔ تو انہوں نے ہوم سیکرٹری کے سامنے بھی اس الزام کا اعادہ کر دیا۔ ایک یا دو دن بعد انہوں نے مسٹر قربان علی خان کے سامنے بھی یہی الزام دہرایا اور یہ بھی کہا کہ اگر حالات بدستور جاری رہے تو صوبہ بالکل تباہ ہو جائے گا۔ جب ہوم سیکرٹری نے ۲۸۔ فروری کو اخباروں کے ایڈیٹروں کا ایک اجلاس طلب کیا۔ تو مسٹر نظامی نے دوبارہ یہی شکایت ہوم سیکرٹری سے بیان کر دی۔ مسٹر نظامی نے گورنر صاحب کے سامنے بھی اپنے الزام کا اعادہ کیا۔

مسٹر نظامی نے اس موضوع پر ستمبر ۱۹۵۲ء میں مسٹر دولتانہ سے بھی بات چیت کی۔ مسٹر دولتانہ نے کہا۔ کہ میر نور احمد حکومت کو تباہ کر رہا ہے اور میں چند ہی روز میں اس کو برطرف کرنے والا ہوں۔ لیکن مسٹر نظامی نے جواب دیا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے اور میں مسٹر دولتانہ کے بیان پر یقین نہیں کرتا۔ کیونکہ میر نور احمد جو کچھ کر رہے ہیں۔ خود مسٹر دولتانہ ہی کے ایماء پر کر رہے ہیں +

ڈاکٹر قریشی کی شہادت سے مسٹر نظامی کی شہادت کی پوری تائید ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ میں جولائی ۱۹۵۲ء کے نصف آخر میں لاہور آیا۔ کیونکہ مجھے یہاں الیکشن پٹیشن کی سماعت کی غرض سے دستور ساز اسمبلی کی کریڈنشل کمیٹی کے ایک اجلاس میں شامل ہونا تھا۔ وزیر اطلاعات و نشریات کی حیثیت سے میرا معمول ہے کہ غیر رسمی طور پر اخباروں کے ایڈیٹروں سے ضرور ملاقات کیا کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ ایک ملاقاتی نے مجھ سے بیان کیا کہ ڈائرکٹر تعلقات عامہ اخباروں کو ایسے مضامین مہیا کرتے ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ احمدیوں کے خلاف شورش کی آگ کو ہوا دی جائے۔ ملاقاتی نے یہ بھی کہا کہ میں کسی اخبار کے دفتر سے ایک مضمون لا کر آپ کو دونگا۔ جو مسٹر چشتی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہوگا۔ جو محکمہ تعلقات عامہ کے ایک ملازم ہیں۔ اس سے

ثابت ہو جائے گا کہ حکومت خود اخباروں کو مضامین مہیا کرتی رہی ہے۔ مجھے اخلاقی طور پر تو اس اطلاع کی صداقت پر پورا یقین تھا لیکن میں نے سوچا کہ میرے لئے یہ زیبا نہ ہوگا کہ اپنے اطلاع دہندہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کروں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے لئے کسی اخبار کے دفتر سے کاغذات چوری کر کے لائے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد میر نور احمد مجھ سے ملنے آئے میں نے میر نور احمد سے کہا کہ محکمہ اسلامیات جو ان کے ماتحت کام کر رہا ہے۔ اخباروں کو احمدیوں کے خلاف مضامین مہیا کر رہا ہے اور اس کے بعد میں نے یہ حقیقت بھی ان کے سامنے پیش کر دی۔ کہ "آفاق" جو عملاً ڈائرکٹر تعلقات عامہ کے ماتحت ہے۔ اپنے کالموں میں برابر اس مطالبہ پر زور دے رہا ہے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ میر نور احمد نے سوال کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اصرار کیا۔ اور بالآخر میر نور احمد نے اعتراف کیا کہ میں نے اس شورش کو خاص راستوں پر لگانے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اس پر میں نے میر نور احمد سے کہا کہ یہ "راستے پر لگانا" نہیں۔ بلکہ "بھڑکانا" ہے۔ چونکہ یہ ایک سنگین معاملہ تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اس کا ذکر مسٹر دولتانہ سے کرنا چاہیئے۔ مسٹر دولتانہ نے ۱۹- جولائی کو مجھے چائے پر بلایا۔ میں نے مسٹر دولتانہ سے اس شکایت کا ذکر کیا۔ اور کہا کہ اگر صوبائی حکومت نے ایک خاص طرز عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جو نشر و اشاعت کی سابقہ پالیسی سے مختلف تھا تو آپ کے لئے مناسب تھا کہ جب ہم آپ چند روز پہلے نتھیا گلی میں تھے۔ آپ اس معاملے کے متعلق مجھ سے گفتگو کر لیتے۔ مسٹر دولتانہ نے کہا کہ میر نور احمد نے تحریک کو "راستے پر لگانے" کے لئے جو کچھ کیا ہے۔ وہ میرے علم کے بغیر کیا ہے۔ مجھے یہ بات بہت ہی عجیب معلوم ہوئی کہ مسٹر دولتانہ اس امر سے بے خبر تھے کہ ڈائرکٹر تعلقات عامہ شورش کو بھڑکا رہے ہیں۔ کیونکہ اس اہم مسئلے کے متعلق اخباروں کے تراشے ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہوں گے۔ اور انہوں نے دیکھا ہوگا۔ کہ جو اخبارات براہِ راست حکومت کے زیر اقتدار ہیں۔ وہ بھی اس نزاع میں مصروف ہیں۔ اور انہوں نے بھی ایک خاص راہ عمل اختیار کر رکھی ہے۔ اس لئے جب مسٹر دولتانہ نے مجھ سے کہا کہ ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ نے یہ رویہ ان کے علم کے بغیر اختیار کیا ہے تو مجھے بے انتہا تعجب ہوا +

ڈاکٹر قریشی نے مسٹر نظامی کے اس بیان کی بھی تصدیق کی ہے۔ جو انہوں نے ٹی پارٹی کے واقعہ کے متعلق دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ حمید نظامی نے اس پارٹی میں میر نور احمد پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اخبارات میں مہم کے جاری کرنے کی ذمہ داری اُن پر ہے۔ اور میر نور احمد نے اس الزام کی تردید میں خاموشی اختیار کی تھی +

جب ڈاکٹر قریشی کراچی واپس گئے تو انہوں نے اس واقعہ کا ذکر وزیر اعظم سے کیا۔ اور یہ رائے ظاہر کی کہ پنجاب کی شورش کو ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ بھڑکا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس گفتگو کا ذکر بھی کیا۔ جو مسٹر دولتانہ سے ہوئی تھی۔ اور اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ صوبائی حکومت کا ایک محکمہ ایک ایسے اہم مسئلے میں ایک خاص پالیسی اختیار کرے۔ اور مرکزی حکومت کے احکام کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرے۔ ڈاکٹر قریشی نے اس واقعہ کا ذکر ارکانِ کابینہ سے بھی کیا +

اس شہادت کی تصدیق خواجہ ناظم الدین کی شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ مسٹر دولتانہ نے ان سے پہلی ۲۸ اگست کو قادیانی مسئلہ کے متعلق گفتگو کی۔ اس بحث کے دوران میں خواجہ صاحب نے مسٹر دولتانہ کو بتایا کہ وزیر اطلاعات سے مجھے جو رپورٹ ملی ہے۔ اس کے مطابق میر نور احمد قادیانیوں کے خلاف تحریک کی حمایت میں مختلف اخباروں کو مواد مہیا کرتے رہے ہیں خواجہ ناظم الدین نے مسٹر دولتانہ کو یہ بھی بتایا کہ اپوزیشن کے تمام اخبارات یعنی "پاکستان ٹائمز"۔ "امروز"۔ "نوائے وقت" اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اس مسئلہ کے متعلق خاموش ہیں لیکن جن اخباروں پر حکومت کا اور خود مسٹر دولتانہ کا اقتدار ہے وہ اس شورش کو بھڑکانے میں مصروف ہیں۔ اور ان میں بدترین مجرم "زمیندار" ہے جس کو اگر دولتانہ صاحب چاہتے۔ تو اپنے قابو میں لا سکتے تھے۔ مسٹر دولتانہ نے کہا۔ کہ اردو اخباروں کی ہستی کا دارومدار ان کی اشاعت پر ہے اور چونکہ یہ موضوع مقبول عام ہے۔ اور اس سے ان کی اشاعت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان کو اس سے روکنا بے حد مشکل ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا۔ کہ ان کے محکمہ نشرواشاعت کا مقصد یہ ہے کہ اخبارات میں جو مہم جاری ہے اس کی رفتار اور اسکے زہریلے پن کو اپنے مشورے سے ضبط اور قاعدے کے ماتحت لائے۔ خواجہ ناظم الدین نے مسٹر دولتانہ کو اچھی طرح سمجھایا کہ صورت حالات کے مداوا کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اخباروں کو شورش کے بھڑکانے سے باز رکھا جائے اور مسٹر دولتانہ یہ کام آسانی سے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اخبارات ان کی امداد و اعانت پر انحصار رکھتے ہیں۔

مسٹر مشتاق احمد گورمانی کا بیان ہے کہ ایک موقع پر ڈاکٹر قریشی نے ارکان کابینہ سے ذکر کیا۔ کہ انہیں شکایات موصول ہوئی ہیں۔ جن کا مفاد یہ ہے کہ پنجاب کے اخباروں میں جو مختلف مضامین شائع ہو رہے ہیں وہ ایسے ذرائع سے مہیا کئے گئے ہیں۔ جو حکومت کے زیر اقتدار یا ممنون اعانت ہیں۔ گواہ نے اخباروں کا ایک فائل بھی پیش کیا۔ جس میں احمدیوں کے خلاف شورش کی حمایت میں متعدد مضامین شامل تھے۔ گواہ کا بیان ہے کہ یہ فائل انہیں کراچی میں مسٹر نظامی نے دیا تھا۔

مسٹر دولتانہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے کبھی خواجہ ناظم الدین کے سامنے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ حکومت پنجاب کا محکمہ نشرواشاعت اخبارات کی تحریروں کے لہجے کو ضبط کے ماتحت لانے کی غرض سے انہیں مضامین مہیا کرتا رہا ہے۔ مسٹر نور احمد اس امر سے خاص طور پر انکار نہیں کرتے کہ انہوں نے ڈاکٹر قریشی سے گفتگو کرتے ہوئے "راستے پر لگانے" کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ لیکن وہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ احمدیوں کے خلاف تحریک کے موضوع پر انہوں نے اخباروں کو کوئی مضمون بھیجا یا اپنے محکمے کے کسی آدمی کو ایسے مضامین لکھنے کی ہدایت کی۔ اُن وجوہ کی بنا پر جن کو ہم اپنے آخری نتائج کے سلسلے میں کالم بند کریں گے۔ ہمیں اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ میر نور احمد نے تحریک کو "راستے پر لگانے" کی یقیناً کوشش کی۔ اور مسٹر دولتانہ ان کی اس پالیسی سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے۔

اب شورش کی رفتار سرعت سے تیز ہو گئی۔ اور اس نے تشویش انگیز وسعت اختیار کر لی۔ اب حکومت حملے کا نشانہ بن گئی۔ اور اس کی رشوت ستانی نااہلیت اور عوام کے حالات سے بے پروائی

کے متعلق بالواسطہ اور مبہم اشارات کئے جانے لگے۔ حکومت پنجاب کے ہوم سیکرٹری نے ڈی او نمبری BDSB-14682 مورخہ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کے ذریعے موجودہ صورت حالات کی مندرجہ ذیل کیفیت ڈپٹی سیکرٹری وزارت داخلہ کو ارسال کی :-

"سابقہ یادداشت تیار کردہ ملک حبیب اللہ مورخہ ۳۰ جولائی ۱۹۵۲ء کے تسلسل میں پنجاب کی احراری احمدی شورش کے متعلق یکم اگست ۱۹۵۲ء سے اب تک کے حالات کے متعلق یادداشت ارسال ہے :۔

۲۰ جولائی ۱۹۵۲ء کو ملتان میں جو گولی چلائی گئی۔ اس سے احراری شورش پسندوں اور ان کے حامیوں کو مزید موقع مل گیا کہ مسئلہ ختم نبوت پر احمدیوں کے خلاف شورش کو شدید تر کر دیں۔ چنانچہ صوبے بھر میں ان کے جلسوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ جب دوسری جماعتوں مثلاً جماعت اسلامی۔ اسلام لیگ اور فرقہ شیعہ نے دیکھا کہ احرار ختم نبوت کے مسئلے پر رائے عامہ کو اپنے حق میں کر کے ان جماعتوں پر بازی لے جا رہے ہیں تو گزشتہ اگست کے آغاز میں وہ بھی احمدیوں کی مذمت و مخالفت میں ان کے ساتھ بدل و جان شامل ہو گئے۔ جماعت اسلامی نے اپنے آٹھ مطالبات پر ایک نویں مطالبہ کا اضافہ کر دیا کہ مرزائیوں کو ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے اور چودھری ظفر اللہ خاں کو ان کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔ اسلام لیگ کے کارکنوں نے بھی اپنی تقریروں میں اس پر زور دینا شروع کیا۔ کہ مرزائی علیحدہ اقلیت قرار دئے جائیں اور چودھری ظفر اللہ خاں کو برطرف کیا جائے۔ شیعہ لیڈر بھی اپنے جلسوں میں یہی کہنے لگے کہ وہ مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے اور چودھری ظفر اللہ خاں کو برطرف کرنے کے مطالبے میں احراریوں کے ہم زبان ہیں ۔

۲۔ شہروں اور قصبوں کی تمام مساجد کے خطیبوں نے اپنا معمول بنا لیا کہ جمعہ کے خطبات میں احمدیوں کے خلاف ان مطالبات کا اعادہ کریں کہ مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ چودھری ظفر اللہ خاں کو ان کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔ ربوہ تمام مسلمانوں کے لئے کھلا شہر قرار دیا جائے۔ اور اس کی اراضی مہاجرین میں تقسیم کر دی جائے کوئی ایسی اہم مسجد باقی نہ تھی جس میں نماز جمعہ کے موقع پر یہ مطالبات دہرائے نہ جاتے ہوں ۔

۳۔ مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری۔ شیخ حسام الدین۔ ماسٹر تاج الدین۔ مظفر علی شمسی اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش ۱۶۔ اگست کو کراچی میں عزت مآب وزیر اعظم کی خدمت میں بصورت وفد حاضر ہوئے اور احمدیوں کے متعلق اپنے مطالبات سے ان کو مطلع کیا۔ واپسی پر انہوں نے ۱۹۔ اگست کو ملتان میں اور ۲۳۔ اگست کو لاہور میں عام جلسے منعقد کئے۔ جن میں یہ انکشاف کیا کہ وزیر اعظم نے ان سے کہا تھا کہ احمدیوں کے خلاف شورش صرف پنجاب تک محدود ہے اور دوسرے صوبے اس سے بالکل پاک ہیں۔ چنانچہ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل نے فیصلہ کیا۔

کہ مزید سرمایہ فراہم کیا جائے اور احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا صوبہ سرحد، سندھ اور مشرقی بنگال میں بھی پھیلا دیا جائے۔ تاکہ مرکزی حکومت کو ان مطالبات کی منظوری پر مجبور کیا جا سکے۔ اس فیصلے کے مطابق ماہ اگست میں سید عطا اللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا۔ اور احمدیوں کے خلاف مسلسل تقریریں کیں۔ شورش کی اس گرما گرمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمدی بدحواس ہونے لگے۔ اور انہیں اپنا موقف بہت دشوار معلوم ہونے لگا۔ احراری کارکنوں اور مُلّاؤں نے اپنی تقریروں اور وعظوں میں احمدیوں کے مجلسی اور تجارتی مقاطعہ پر بھی زور دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مرحلے پر احراریوں کی جاری کی ہوئی تحریک مُلّاؤں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔ اور انہوں نے مسئلہ ختم نبوت کو اپنی مسجدوں میں خطبات جمعہ کا نہایت محبوب موضوع بنا لیا۔

۴۔ جب گزشتہ اگست کے نصفِ اول میں احمدیوں کے خلاف احرار کی شورش درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی تو ایک خفیہ اطلاع موصول ہوئی کہ احراری شورش کے دباؤ اور جان و مال کے خطرات کی وجہ سے بعض احمدی اپنے فرقے سے قطع تعلق کر رہے ہیں۔ اور اس صوبے کے اضلاع سے جو اطلاعات موصول ہوئیں۔ وہ مظہر تھیں کہ جولائی اور اگست کے دوران میں ۱۱۵ احمدیوں نے اپنے فرقے کو ترک کر کے سُنّی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ اور گیارہ احمدی اپنے گھروں کو چھوڑ کر ربوہ یا دوسرے مقامات کو منتقل ہو گئے ہیں۔ احمدیوں کو زبردستی غیر احمدی بنانے کے واقعات اگست کے آخر تک کم ہو گئے۔

۵۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس گوجرانوالہ کی مرسلہ رپورٹ سے معلوم ہوا۔ کہ دو احمدی مرد مدرس اور چار احمدی استانیاں یہ چھ افراد وزیر آباد کے میونسپل بورڈ ہائی سکول اور مڈل سکول میں ملازمت کر رہے تھے۔ ۲۷۔ جولائی کو انہیں وزیر آباد میونسپلٹی نے نوٹس دے دیا کہ ان کی ملازمت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ احراری شورش کا نتیجہ تھا لیکن ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ نے ۴۔ مارچ ۱۹۵۲ء کو وزیر آباد میونسپل کمیٹی کی اس قرارداد کو معطل کر دیا۔

۶۔ احمدیوں کے خلاف احراری شورش کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اہم شہروں اور قصبوں میں متعدد نئی انجمنیں "مجلس تحفظ ختم نبوت"، "مجلس خدام رسول" اور "آل مسلم پارٹیز کنونشن" کے نام سے قائم ہو گئیں۔ تاکہ مسئلہ ختم نبوت پر احمدیوں کے خلاف شورش کو تیز تر کیا جائے اس کے ساتھ ہی ساتھ ان تمام انجمنوں کا یہ مقصد بھی تھا کہ تحریک کے سرمائے کے لئے چندہ فراہم کیا جائے۔ "زمیندار" کے مولانا اختر علی خاں نے اپنے وطن کرم آباد میں عید الاضحیٰ کے موقع پر حاضرین سے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کی اپیل کی۔ تاکہ تحریک ختم نبوت کو کامیاب بنایا جائے۔ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل (لاہور) تحریک ختم نبوت کو چلانے کے لئے گزشتہ جولائی میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے نام پر گزشتہ ستمبر میں ۲۴۲۱۱ روپے ۲ آنے کی رقم انڈسٹریل

کوآپریٹو بنک لاہور میں موجود تھی +

۷- احراریوں اور ان کے حامیوں نے اپنی شورش کی مالی تقویت کے لئے گزشتہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر پورے صوبے میں قربانی کے جانوروں کی بے شمار کھالیں جمع کیں جن کی مالیت ۴۴۶۴۰.۲ روپے تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے ذرائع سے انہوں نے گزشتہ چھ ماہ کے دوران میں کوئی ۵۱۱۰۷ روپے جمع کئے +

۸- احراریوں اور ان کے حامیوں کو بڑی امیدیں تھیں کہ ان کی شورش بارآور ہوگی اور عزت مآب وزیراعظم پاکستان ۱۴ اگست کی تقریر میں اعلان کر دیں گے کہ احمدیوں کے خلاف ان کے مطالبات تسلیم کر لئے گئے ہیں لیکن جب عزت مآب وزیراعظم نے اپنے نشریہ مورخہ ۱۴ اگست میں یہ اعلان کیا کہ مملکت پاکستان کی سالمیت اور اس کے استحکام کا تقاضا ہے۔ کہ طبقہ آرائی اور فرقہ بندی سے کامل اجتناب کیا جائے۔ تو احراری اور ان کے حامی بے حد دل شکستہ ہوئے۔ احراریوں اور ان کے حامیوں کو مزید مایوسی اس وقت ہوئی جب عزت مآب وزیراعلیٰ پنجاب نے لاہور میں ۳۰۔ اگست کو اور پھر راولپنڈی میں ۱۱ ستمبر کو تقریریں کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ احمدیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے کے لئے کوئی دلیل جواز نہیں۔ اور طبقہ آرائی اور فرقہ بندی سے انتشار پیدا ہوتا ہے۔ لہذا ایسے رجحانات کو دبا دینا چاہئے +

۹- مسٹر جسٹس کیانی نے ملتان فائرنگ پر جو رائے ظاہر کی۔ اس سے احراری اور ان کے حامی اور بھی زیادہ دل شکستہ ہوئے۔ اور عوام الناس اور حکام پر اس کا نہایت صحت مند اثر ہوا +

۱۰- موجودہ صورت یہ ہے۔ کہ احمدیوں کے خلاف احرار نے جس شورش کی قیادت کی تھی۔ اس میں پہلے کا سا زور باقی نہیں رہا۔ نہ عوام میں اس تحریک کی دلکشی باقی ہے۔ اور مُلّا لوگ جو اس تحریک کے بڑے علم بردار تھے۔ مایوسی و ناکامی محسوس کر رہے ہیں۔ تاہم احرار آج کل صوبے بھر میں مسلسل کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں۔ تاکہ اپنی تحریک کو زندہ رکھیں۔ اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کر لیں۔ تاکہ انہیں اِدھر اُدھر گھومنے اور مزے اُڑانے کی سہولت حاصل رہے۔ اطلاعات کے مطابق بعض احراری مقررین نے اپنی تقریروں میں کہا ہے کہ مرزائی مرتد ہیں۔ اور احکام اسلامی کے مطابق واجب القتل ہیں +

۱۱- منٹگمری کے ایک رسوائے عام احراری کارکن مفتی ضیاء الحسن نے جو حبیب الرحمٰن لودھیانوی کا چچیرا بھائی ہے۔ ۳۰۔ مارچ ۱۹۵۲ء کو اے ڈی ایم منٹگمری کی عدالت میں مرزا محمود احمد۔ امام جماعت احمدیہ روشن دین تنویر ایڈیٹر روزنامہ "الفضل" اور مسعود احمد پرنٹر پبلشر "الفضل" کے خلاف ایک استغاثہ دائر کیا کہ انہوں نے "الفضل" مورخہ ۱۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون "خونی مُلّا کے آخری دن" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ جو دفعات ۳۰۲- ۱۱۵ ۵۰۵ تعزیرات پاکستان کے ماتحت آتا ہے۔ یہ مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اب

تک چھ گواہان استغاثہ پیش ہو چکے ہیں۔ اور اس کی آخری پیشی ۸۔اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ہوئی تھی +

۱۲۔احراریوں اور ان کے حامیوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مرزا غلام احمد کذاب اور جھوٹا نبی تھا۔ گزشتہ دو مہینے کے دوران میں کثیر التعداد کتابچے اور پوسٹر شائع کئے ہیں۔ اسی طرح احمدیوں نے بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ رسول پاک صلعم کے خاتم النبیین ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور احراری پاکستان کے دشمن ہیں بے شمار پوسٹر اور کتابچے شائع کئے +

۱۳۔۱۱۔اور ۱۳ستمبر کو جناح عوامی مسلم لیگ کے زیر اہتمام لاہور اور لائل پور میں دو عام جلسے منعقد ہوئے جن میں بعض مقررین نے فرقہ احمدیہ کے خلاف نکتہ چینی کی چودھری ظفر اللہ خان کی پالیسی بحیثیت وزیر خارجہ کو ناکام بتایا۔ اور ان کو وزارت سے برطرف کرنے پر زور دیا۔ لیکن صاف لفظوں میں مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے کی حمایت نہیں کی +

۱۴۔ایک تازہ خفیہ اطلاع مظہر ہے کہ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل لاہور کے سرگرم ارکان مستقبل کی راہ عمل پر متفق نہیں ہیں۔ جو گروہ حکومت کے خلاف براہ راست اقدام کرکے اس کو مطالبات کی منظوری پر مجبور کرنے کا حامی ہے۔ اس میں آل پاکستان مجلس احرار کے شیخ حسام الدین۔ جماعت اسلامی کے نصر اللہ خاں عزیز اور امین احسن اصلاحی۔ اہلحدیث کے مولانا داؤد غزنوی اور جمعیتہ علمائے اسلام کے عبدالحلیم قاسمی شامل ہیں۔ دوسرا گروہ جو آئینی اور پرامن طریق سے تحریک کو جاری رکھنے کا حامی ہے۔ اس میں آل پاکستان مجلس احرار کے ماسٹر تاج الدین انصاری جمعیتہ العلمائے پاکستان کے مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری اور غلام محمد ترنم۔ حزب الاحناف کے مولانا محمد ارشد بتاہوی شیعہ جماعت کے حافظ کفایت حسین اور مظفر علی شمسی اور "زمیندار" کے مالک مولانا اختر علی شریک ہیں۔ شیخ حسام الدین نے ۲۸۔اگست کو اس مسئلہ پر ماسٹر تاج الدین سے گفتگو کی۔ اور ان کو اپنے گروہ کے ممبروں کے خیالات بتائے۔ انہوں نے ماسٹر تاج الدین کو بتایا۔ کہ جماعت اسلامی جمعیتہ العلمائے اسلام اور انجمن اہل حدیث کے ممبر آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کی موجودہ پالیسی کو پسند نہیں کرتے۔ اور صاف طور پر کہہ دیا۔ کہ اگر آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کسی کمزور پالیسی پر کاربند ہونا چاہتی ہے تو ہمارا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ ماسٹر تاج الدین نے جواب دیا کہ اگر احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا پاکستان کے دوسرے صوبوں تک وسیع کر دیا جائے تو مرکزی حکومت احمدیوں کے خلاف ہمارے مطالبات منظور کرے گی۔ ماسٹر تاج الدین نے شیخ حسام الدین کو یہ بھی بتایا کہ مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری کسی راست اقدام کے حامی نہیں ہیں۔ وہ بہت ذی اثر بزرگ ہیں۔ اور ان کی رائے کا احترام کرنا چاہئے۔ ماسٹر تاج الدین نے شیخ حسام الدین سے یہ بھی کہا کہ ہم کو جماعت اسلامی کی ہدایات سے دھوکے میں آکر احمق نہیں بننا چاہئے۔ کیونکہ اس جماعت کی تو پالیسی یہ ہے۔ کہ حکومت وقت کے لئے

مشکلات پیدا کی جائیں۔ شیخ حسام الدین کی رائے یہ تھی کہ حکومت کو فیصلے پر مجبور کرنے کے لئے جلوس نکالنے چاہئیں اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا چاہیئے۔ آخر دونوں اس پر متفق ہوئے کہ نیا پروگرام مجلس عمل کے سامنے بغرض غور پیش کر دیا جائے۔ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کے ممبروں کی اکثریت کو ماسٹر تاج الدین پر اعتماد ہے۔ اس مقام پر یہ بھی بیان کر دینا چاہئے کہ شیخ حسام الدین ایک شعلہ مزاج آدمی ہے۔ اور پاکستان مجلس احرار کے اس گروہ کا نمائندہ ہے جو مسلم لیگ سے انقطاع اور کھلم کھلا مخالفت کا حامی ہے۔ جو عناصر راست اقدام کے حامی ہیں۔ ان کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھی جائے گی۔ کیونکہ ان کا سب سے بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ برسر اقتدار سیاسی جماعت کو بدنام کریں۔ اور اس کی قیمت پر اپنی ساکھ میں اضافہ کریں۔ کسی قسم کی آئینی سرگرمی کے خلاف خواہ وہ کتنی ہی لاحاصل اور بیہودہ ہو۔ کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کوئی حکومت اس امر کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اختیار حکومت کو چیلنج دیا جائے۔ اور راست اقدام کی دھمکیاں دی جائیں۔ موجودہ پالیسی کے مطابق ان احراری مقررین اور مُلاؤں کے خلاف قانونی اقدام نہیں کیا جا رہا ہے۔ جو مساجد کے اندر گھناؤنی اور اشتعال انگیز تقریریں کرتے ہیں۔

۱۵۔ بحالات موجودہ عام خیال یہی ہے۔ کہ احراری شورش کی تندی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے علمبردار جلسے منعقد کر کر کے اور اپنے پامال دلائل اور مطالبات دُہرا دُہرا کر اس کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مولانا اختر علی خاں مالک "زمیندار"۔ ماسٹر تاج الدین اور شیخ حسام الدین آج کل اس سکیم سے کھیل رہے ہیں کہ تحریک ختم نبوت کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے ایک کروڑ روپیہ جمع کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک ایک روپے کی مطبوعہ رسیدیں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا کے سب کام روپے سے چلتے ہیں اور تحریک احرار بھی روپے ہی سے جاری رہ سکتی ہے۔ جب تک اس کے لیڈر لوگوں سے پیسہ جمع کرتے رہیں گے۔ ان کی شورش ختم نہ ہو گی۔

۱۶۔ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کی ہدایت کے ماتحت ۳ / اکتوبر ۱۹۵۲ء کو بروز جمعہ پورے پنجاب میں "یوم احتجاج" منایا گیا اور اہم مساجد کے خطیبوں نے اپنے خطبات جمعہ میں ان مطالبات کو دُہرایا کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ چودھری ظفر اللہ خاں اپنے موجودہ عہدے سے برطرف کئے جائیں۔ اور انہیں کوئی دوسرا اہم عہدہ بھی نہ دیا جائے۔ ربوہ تمام مسلمانوں کے لئے کھلا قصبہ قرار دیا جائے۔ ربوہ کی اراضی مہاجرین میں تقسیم کی جائے مرزائی بڑے عہدوں سے علیحدہ کر دیئے جائیں۔ اور قابل اعتراض مرزائی لٹریچر ضبط کیا جائے۔ یہی مطالبات اُن عام جلسوں میں دُہرائے گئے جو ۲۰ / اکتوبر کو لاہور میں زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کونشن منعقد ہوئے۔

۱۷۔ احراری اخبار "آزاد" اور "زمیندار" (لاہور) احمدیوں اور ان کے فرقے کے خلاف برابر دشنام آمیز مضامین لکھ رہے ہیں۔"

۲۲۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے صورت حالات کا خلاصہ ذیل کے الفاظ میں پیش کیا:۔

"اس شورش کے نمایاں خط و خال حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مولانا اختر علی خاں اس شورش کی مادی اور موثر حمایت کر رہے ہیں۔ انہی کے ایماء پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ایک کروڑ روپے کے "نوٹ" چھاپے جائیں جن کو عوام کے ہاتھ فروخت کر کے احمدیوں کے خلاف شورش کے لئے ایک فنڈ قائم کیا جائے۔

(۲) تقریروں کے لہجے کی یہ عام کیفیت ہے کہ ان میں احمدیوں کے خلاف فحش، دشنام آمیز اور ناشائستہ باتیں کہی جاتی ہیں۔

(۳) مجلسی مقاطعہ اور دوسرے طریقوں سے ایذا پہنچانے کی تائید بھی کی گئی ہے۔ کبیر والہ میں مقامی نائب تحصیلدار کے نوکروں کو روزانہ ضرورت کی چیزیں خریدنے سے روک دیا گیا۔ وزیر آباد کی میونسپلٹی نے احرار کے اکسانے پر دو احمدی استانیوں کو موقوف کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر اس قرارداد کی منسوخی کے لئے تدبیر کر رہے ہیں۔

(۴) جماعت احمدیہ کے خلاف جو نفرت پھیلائی گئی۔ اس کی وجہ سے متعدد احمدیوں نے مجبور ہو کر اپنے بال بچوں کو ربوہ بھیج دیا ہے۔ اور ایک خاصی تعداد احمدیت کو ترک بھی کر چکی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ ان کے یہ فیصلے کس حد تک رضا کارانہ اور کس حد تک مجبورانہ تھے۔

(۵) اضلاع کے جاہل اور ناخواندہ ملاؤں نے جرات پا کر صوبے کے دور دست مقامات پر بھی احمدیوں پر حملے شروع کر دیئے ہیں۔ یہ تحریک آئینی نہیں ہے۔ اور اس کے پھیلانے کے لئے قابل اعتراض طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں۔

(۶) چند احمدی عورتوں اور بچوں نے انڈین ڈپٹی ہائی کمشنر سے بھارت میں مستقل طور پر آباد ہونے کے پرمٹ حاصل کر لیے ہیں اور وہ پاکستان سے ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔ یہ عورتیں اور بچے اُن احمدیوں کے پاس پہنچنا چاہتے ہیں۔ جو بعد تقسیم کے بلووں کے باوجود قادیان میں رہ گئے تھے۔ حکومت ہند نے ان کے لئے بلا تامل مستقل آبادی کے پرمٹ جاری کر دیئے۔

(۷) حکومت کے مخالف عناصر مثلاً جماعت اسلامی (جس نے اپنے آٹھ مطالبات پر نویں مطالبے کا اضافہ کر دیا ہے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے) اور اسلام لیگ (جس کا راولپنڈی میں خاص زور ہے) اور حکومت کے مخالف افراد مثلاً عبدالستار نیازی نے شورش پسندوں کی تائید و حمایت اختیار کر لی ہے۔

(۸) تحریک کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اکثر مقررین احمدیوں پر حملہ کرنے کے بعد حکومت

کی مذمت کرتے ہیں۔ اور اس کو نا قابلیت۔ رشوت خواری اور خوراک کی کمی وغیرہ کے لئے مورد الزام قرار دیتے ہیں۔ {یہ بات بہت اہم اور قابل توجہ ہے (دستخط) قربان علی خاں ۲۳۔ اکتوبر}

اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ احمدیوں کے خلاف شورش کو محض رائے عامہ کو منظم کرنے کے لئے ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ تاکہ بالآخر حکومت کے خلاف نفرت وحقارت کی آگ مشتعل کی جا سکے۔

(۹) راولپنڈی میں پچھلے دنوں بہت شرارت برپا کی گئی۔ کیونکہ ایک خفیہ چٹھی جس میں ایک خاص کمانڈنگ آفیسر نے احمدیوں پر نکتہ چینی کی تھی۔ دفتر سے چرا کر کھلم کھلا شائع کر دی گئی۔ ایک کلرک نے (جو ڈی ڈی ایم آئی کے دفتر سے تعلق رکھتا ہے) اپنے بیان میں احمدی افسروں کے خلاف نہایت اوٹ پٹانگ الزامات لگائے۔ {یہ رجحانات پھیلیں گے۔ اور اپنے ساتھ تباہی و بربادی لائیں گے۔ ہماری ساری شیرازہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگی (دستخط) قربان علی خاں}

(۱۰) اگرچہ تازہ ترین اطلاعات یہ ہیں کہ احراری لیڈر اپنی تحریک سے کسی قدر تھک چکے ہیں۔ لیکن بیرونجات کے جن جلسوں میں وہ تقریریں کر رہے ہیں ان کی تعداد میں ابھی کوئی کمی نہیں آئی۔

۲ میری رائے یہ ہے کہ احراری شورش میں نہایت خطرناک ممکنات پوشیدہ ہیں اس نے سادہ لوح اور بے علم عوام کی توجہ کو اُن بنیادی مسئلوں کی طرف سے منحرف کر دیا ہے، جو پاکستان کو درپیش ہیں۔ یہ شورش قطعی طور پر تخریبی ہے۔ اس نے ایک ایسے وقت میں فرقہ وار اختلافات کو نمایاں کیا ہے۔ جب قوم کی تمام صفوں کو ایک دوسرے سے قریب تر آجانا چاہئے۔"

مسٹر قربان علی خاں انسپکٹر جنرل نے اس یادداشت پر بعض اہم تبصرے کئے۔ جو حاشیے پر درج ہیں۔ اور اس کے بعد اس کو یہ لکھ کر گورنر صاحب کی خدمت میں بھیج دیا کہ اگر اس شورش کو اسی طریق سے جاری رہنے دیا گیا۔ تو حکومت کو ایک دن سخت ابتری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آج اس ابتری پر قابو پانا آسان ہے۔ لیکن بعد میں یہ مسئلہ سخت دشوار ہو جائے گا۔ گورنر صاحب نے اس یادداشت کو ملاحظہ کیا۔ اس پر دستخط بھی کئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

مسٹر انور علی نے لاہور کے روزنامچہ مورخہ ۱۵۔ دسمبر ۱۹۵۲ء پر تبصرہ کرتے ہوئے دوبارہ صورت حالات کا جائزہ لیا اور بتایا کہ جو صورت حالات اس روزنامچے میں ظاہر کی گئی ہے۔ وہی سارے ملک میں جاری و ساری ہے۔ انہوں نے لکھا:۔

"لاہور کی روزانہ ڈائری مورخہ ۱۵۔ دسمبر ۱۹۵۲ء غالباً اب تک حکومت کی نظر سے گزر چکی ہوگی۔ یہ نمونہ ہے ان واقعات کا جو اس وقت پورے ملک میں پیش آرہے ہیں کچھ عرصے

سے حکومت کے خلاف پروپیگنڈا تیز تر کر دیا گیا ہے۔ اور غذائی صورت حال کو شدت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ حکومت کو نہایت سختی سے بدگوئی۔ دشنام طرازی اور رسوائی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ عوام کے اطمینان و اعتماد کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہر طرف ابتری اور اضطراب کا دور دورہ ہے۔ تمام حلقوں میں (کاروبار، ملازمت وغیرہ) حکومت کے خلاف شدید نکتہ چینی جاری ہے۔ ریلوے ٹرینوں میں۔ پرائیویٹ مجمعوں میں معاشرتی تقریبوں میں صرف ایک ہی موضوع ہے جس سے لوگوں کو گہری دلچسپی ہے۔ اور وہ موضوع حکومت کے خلاف باتیں کرنا ہے۔ لیگ کے ممبر یا سرکاری ملازم بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ اور خود کھلم کھلا اس قسم کی گفتگو میں شامل ہوتے ہیں۔ کراچی سے واپس آنے والے لوگ نہایت مہیب تصویر کھینچتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ سیکرٹریٹ کے افسروں اور دوسرے حکام اعلیٰ کو مستقبل پر کوئی ایمان نہیں رہا۔ اور وہ اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں۔ گویا حکومت کا خاتمہ قریب ہے۔ صورت حال سخت مایوس کن ہے۔ اور اگر قوم کو بربادی اور انارکی سے بچانا ہے۔ تو جلد سے جلد نہایت موثر تدابیر کرنی چاہئیں۔ یہ صحیح ہے کہ ملک کے سامنے بعض مسائل ایسے بھی ہیں۔ جو بے حد دشوار معلوم ہوتے ہیں لیکن بہر کیف کوشش کرنا اشد ضروری ہے۔ صورت حالات اتنی مایوس کن نہیں ہے جیسی بعض لوگ سمجھے بیٹھے ہیں۔ . . .

. . . .

(۳) **مستقبل پر ایمان:** اگر کسی مریض کو معلوم ہو کہ اس کا مرض قابل علاج ہے۔ اور اس کو جلد سے جلد بیماری سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ تو اس کی ہمت بندھ جاتی ہے۔ اور وہ مرض کا بہتر مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے لیکن اگر اس کے برعکس مریض کو یہ احساس ہو کہ اس کا مرض ناقابل علاج بھی ہے۔ اور اس کے مناسب علاج کی کوئی تدبیر بھی نہیں کی جا رہی ہے۔ تو وہ جلد موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ حکومت کے خلاف جو پراپیگنڈا حکومت کے مخالفین اور دوسرے تخریبی عناصر نے جاری کر رکھا ہے۔ اس نے "مستقبل پر ایمان" کو تباہ کر دیا ہے۔ عوام کا خاصا حصہ امید سے بیگانہ ہو رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ صورت حال حد سے زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ اور اب اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لیکن نشر و اشاعت کی مدد سے امید افزا پروپیگنڈا آسانی سے منظم کیا جا سکتا ہے اور "مستقبل پر ایمان" دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے۔

(۶) **مُلّائیت:** اس میں شک نہیں کہ مُلّا زیادہ تر ایسے طبقے سے پیدا ہوتے ہیں جن کو تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اور جن کا دائرہ نظر انتہائی طور پر تنگ ہوتا ہے۔ مُلّاؤں کو دراصل ارباب سیاست ہی نے بنایا ہے۔ لیکن اب وہ ان کی حمایت کرنے کے بجائے ان قوتوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں جنھوں نے اُن کو پیدا کیا تھا۔ وہ اب خود اقتدار حکومت پر قابض ہونے کے

در پے ہیں۔ اور ترقی کے دشمن بھی ہیں۔ اس لئے مُلاّؤں کی ایک ذہین و فطین اور تعلیم یافتہ جماعت پیدا کرنی چاہئے۔ اور اس اثنا میں لیڈروں کو چاہئے کہ تقریریں کرتے ہوئے مذہبی دوائر کے متعلق کوئی وعدے نہ کیا کریں جن کا ایفا ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔"

مزید تقریریں : پالیسی پر نظر ثانی

اس مرحلے پر بعض مقدمات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کو افسروں کی ایک کانفرنس میں ایک ہی حکم کے ماتحت ان تمام مقدمات کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ مقدمات یہ ہیں: مقدمہ میلہ گلو شاہ فائل نمبر [145 (19) 16] مقدمہ لائل پور اور مقدمہ سمندری فائل نمبر [27 (2) 16] مقدمہ راولپنڈی فائل نمبر [29 (2) 16] اور مقدمہ شجاع آباد فائل نمبر [130 (2) 16]

ضلع سیالکوٹ کے تھانہ ستراہ کے علاقے میں ایک گاؤں ہے کوریکے۔ اس گاؤں میں ہر سال ایک میلہ مویشیاں ہوتا ہے۔ جسے گلو شاہ کا میلہ کہتے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں یہ میلہ ۳ اکتوبر سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء تک ہوا جس میں بہت سے لوگ اپنے مویشیوں کے ساتھ جمع ہوئے۔ احراریوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہاں آل مسلم پارٹیز کنونشن کا ایک جلسہ منعقد کر لیا جس میں میلے کے مجمع کے سامنے حسب معمول زہر چکانی کی۔ بعض لیڈروں نے ۳ کو اور بعض نے ۷ اکتوبر کو تقریریں کیں۔ تقریروں کا موضوع وہی احمدیت تھا اور چونکہ ان سے فرقہ وارانہ منافرت پھیلانا ہی مقصود تھا۔ اور یہ تقریریں قابل اقدام تھیں۔ اس لئے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مسٹر عبدالسعید ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو حکم دیا کہ ان کا جائزہ لیں مسٹر عبدالسعید نے نہایت احتیاط سے ہر تقریر کو دیکھ پرکھ کر حسب ذیل رائے پیش کی:-

(۱) مولوی کرامت علی نے ۷ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ایک تقریر کی جس میں یہ کہا کہ مرزا غلام احمد نے مسلمانوں کو فاحشہ عورتوں کی اولاد۔ ان کی عورتوں کو کتیاں اور مرزا کو نہ ماننے والوں کو طوائفوں کی اولاد بتایا ہے۔ یہ تقریر زیر دفعہ ۲۱ (۳) پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قابل اقدام ہے۔ کیونکہ اس سے غیر احمدی مسلمانوں کی طرف سے مزید ایسی سرگرمیوں کا احتمال ہے۔ جو سلامتی عامہ اور قیام امن و انتظام کے لئے مُضر ہونگی۔

(۲) اسی موقع پر مولانا بشیر احمد صدر مجلس احرار پسرور نے تقریر کی جس میں انہوں نے ایک مبیّنہ واقعہ کا ذکر کیا کہ ایک شخص ڈاکٹر احسان علی نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی سالی سلمٰی بیگم کے ساتھ زنا بالجبر کیا۔ اور اس کو مرزا بشیر الدین محمود احمد کے حکم سے دس ضرب پاپوش کی سزا دی گئی۔ اس تقریر کے دوران میں یہ بھی کہا گیا کہ آیا کسی اور شخص کو بھی اس جرم میں دس جوتوں کی سزا دینا مناسب ہوگا کہ اس نے ایک اور شخص کے کُنبے کی ایک عورت سے زنا بالجبر کیا تھا۔ مقرر نے مرزائیوں کو مرتد قرار دیا۔ جو شرع اسلام کے رُو سے واجب القتل ہیں۔ یہ تقریر

پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کی شق (۱) (۳) کے ماتحت مستوجب سزا ہے +

(۳۱) اس موقع پر ۳۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو قاضی منظور احمد نے ایک تقریر کی جس میں اس نے مرزا غلام احمد کے بعض اقوال کو کسی قدر بگاڑ کر نقل کیا۔ جن میں ایک قول یہ بھی تھا کہ مرزا غلام احمد کو اللہ کی طرف سے حمل ہوا تھا۔ اور جو مسلمان ان کو نہیں مانتے۔ وہ سؤر ہیں اور جو عورتیں ان کے دعوے کو تسلیم نہیں کرتیں۔ وہ کتیاں ہیں۔ اس تقریر میں مقرر نے یہ بھی کہا کہ موجودہ قحط کے ذمہ دار خواجہ ناظم الدین ہیں۔ اور وہ مرزائیوں کے حامی ہیں۔ یہ تقریر پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کی شق (۱)۔ (۲) اور (۳) کے ماتحت قابل اقدام ہے +

مسٹر عبدالسمیع پبلک پراسیکیوٹر نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اس قانونی رائے کو حاصل کر لینے کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ معاملہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے ان سے درخواست کی کہ ۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو چیف سیکرٹری کے زیر صدارت حکام کی کانفرنس میں جو فیصلے ہوئے تھے۔ ان کے پیراگراف ۲ اور ۷ کی مشمولہ ہدایات کے مطابق آپ حکومت پنجاب سے ان تقریروں کے خلاف مقدمات دائر کرنے کی منظوری حاصل کریں مسٹر غلام سرور خاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنی چٹھی مورخہ ۱۸۔ نومبر ۱۹۵۲ء کے ذریعے سے بوساطت کمشنر صاحب یہ تجویز حکومت کو بھیج دی۔ مسٹر نذیر احمد سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) نے اس کیس کا جائزہ لیا۔ اور اپنی یادداشت مورخہ ۱۸۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں یہ تجویز پیش کی کہ بشیر احمد اور منظور احمد کے خلاف مقدمات دائر کرنے کے بجائے ان کو زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کر لینا چاہئے۔ مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے ان دونوں آدمیوں کے ریکارڈ کا معائنہ کیا۔ اور ۲۲۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو یہ کیس ہوم سیکرٹری کو بھیج دیا۔ مسٹر انور علی نے یہ رائے ظاہر کی کہ جو تفرقہ انگیز لوگ مملکت کے استحکام کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ان کے خلاف مقدمات دائر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔ اور اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ خلاف قانون تقریروں کے متعلق کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور کی جائے گی۔ تو وہ آئندہ مزید ضبط کا ثبوت دینگے۔ اس پر ہوم سیکرٹری نے ۲۱۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو لکھا کہ چیف منسٹر صاحب کراچی سے واپسی پر احمدیوں کے خلاف شورش کے متعلق پوری صورت حالات پر حکام سے گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کیس پر بھی اسی موقع پر بات چیت ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی لکھا کہ اس سلسلے میں اور بھی بہت سی قابل اعتراض تقریریں ہمارے علم میں آ چکی ہیں۔ جن کے متعلق یہی مناسب سمجھا گیا ہے کہ ان کو نہ چھیڑا جائے"

لائل پور میں ۲۶۔ ۲۷ ستمبر کو زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کنونشن ایک ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی اور کنونشن ہی کے زیر اہتمام ۲۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کو سمندری میں بھی ایک جلسہ عام کیا گیا۔ لائل پور کے مقررین میں مرزا غلام نبی جانباز۔ ماسٹر تاج الدین انصاری۔ صاحبزادہ فیض الحسن۔ شیخ حسام الدین۔ تاج محمد لائلپوری مظفر علی شمسی اور مولانا داؤد غزنوی شامل تھے۔ صاحبزادہ فیض الحسن نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ مرزا غلام احمد نہایت پست اخلاق کا آدمی تھا۔ اس نے حضرت بی بی فاطمہ کی پاکیزگی پر حملہ کیا جس کی بنا پر وہ اس امر کا

مستحق تھا کہ اس کے خلاف غنڈا ایکٹ کے ماتحت مقدمہ چلایا جاتا۔ اس مقرر نے چودھری ظفراللہ خاں کو بھی غنڈا کہا۔ اور یہ بھی کہا کہ مرزا مظفر احمد جو احمدی ہے اور مرزا محمود احمد کا داماد ہے حکومت پنجاب کا فنانس سیکرٹری مقرر نہ ہونا چاہیئے۔ شیخ حسام الدین نے کہا کہ چودھری ظفراللہ خاں خبیث ہے اور جب تک وہ وزیر خارجہ ہے۔ پاکستان کی بہتری کی کوئی صورت نہیں۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ کے متعلق جو کچھ کہا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس نے کہا کہ لاہور چھاؤنی کے پاس اور جنگ شاہی کے قریب ہوائی جہازوں کے جو حادثے پیش آئے اور جن میں جنرل افتخار خاں اور جنرل شیر خاں ہلاک ہو گئے۔ ان کی ذمہ داری مرزائیوں پر ہے۔ سمندری کانفرنس میں سید مظفر علی شمسی ماسٹر تاج الدین شیخ حسام الدین۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری۔ غلام نبی جانباز اور چک ۴۳۳ کے غازی محمد حسین نے تقریریں کیں۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے بیان کیا کہ مرزا غلام احمد کے والد حکیم غلام مرتضےٰ نے بالاکوٹ کی لڑائی میں مسلمان بادشاہ بہادر شاہ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے سردار نونہال سنگھ کو پچاس سوار مہیا کئے تھے۔

مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ان تقریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ کا ذکر قابل اعتراض ہے اور یہ بیان بالکل جھوٹ ہے کہ جنگشاہی یا لاہور چھاؤنی کے ہوائی حادثوں میں مرزائیوں کا ہاتھ تھا کیونکہ جنگشاہی کے حادثے میں جو اشخاص ہلاک ہوئے ان میں جنرل شیر خاں بھی تھے جو خود مرزائی تھے احرار کی تقریریں صرف زہریلی ہی نہیں بلکہ ناشائستہ اور مکروہ ہیں۔ کانفرنسوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ نفرت کی اشاعت برابر جاری ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان شر انگیز تقریروں کی بنا پر سید عطاءاللہ شاہ بخاری پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے مسٹر انور علی نے یہ بھی لکھا کہ پڑھا لکھا طبقہ ان تقریروں سے بہت بیزار ہو رہا ہے جو پوری قوم کے خیالات کو خراب کر رہی ہیں۔ ہوم سیکرٹری نے ۲۹۔ اکتوبر کو رائے دی کہ اب وقت آگیا ہے کہ حکومت پوری صورت حال پر نظر ثانی کرے۔ کیونکہ احراری لیڈروں کی تقریریں اب شر انگیزی اور سخت قابل اعتراض نوعیت کے اعتبار سے بہت نمایاں ہو رہی ہیں۔ آپ نے تجویز پیش کی کہ چیف منسٹر صاحب کو لائل پور کی مسلم لیگ کانفرنس سے فراغت پانے ہی حکام کی ایک کانفرنس منعقد کرنی چاہیئے اور اس وقت تک ہر قسم کا اقدام ملتوی رکھا جائے۔ ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو چیف منسٹر کے سیکرٹری نے فائل پر لکھا کہ چیف منسٹر صاحب کی خواہش ہے کہ لائل پور سے ان کی واپسی پر یہ کیس ان کے سامنے پیش کیا جائے۔

۱۴ سے ۱۶۔ نومبر ۱۹۵۲ء تک راولپنڈی میں زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کنونشن ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس کے ممتاز مقررین ماسٹر تاج الدین انصاری شیخ حسام الدین۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری احسان احمد شجاع آبادی اور محمد علی جالندھری تھے۔

ماسٹر تاج الدین انصاری نے اپنی تقریر میں چودھری ظفراللہ خاں پر یہ الزام لگایا کہ ان کی سرگرمیاں مملکت اور اسلام کے خلاف ہیں اور کہا کہ ان کو عدالت میں ان الزامات کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ مقرر نے یہ بھی کہا کہ

چودھری ظفراللہ خاں انگریزوں کا ایجنٹ اور مرتد ہے۔ وہ خواجہ ناظم الدین کا مخلص رفیق نہیں۔ اور مرزائیوں کا مجلسی اور اقتصادی مقاطعہ ہونا چاہئے۔ احسان احمد شجاع آبادی نے کہا کہ یہ تحریک وفاداروں اور غداروں کے درمیان اور صداقت اور کفر کے مابین جنگ ہے اور یہ رائے بھی ظاہر کی کہ اگرچہ تبلیغ اسلام کے لئے تشدد کا استعمال جائز نہیں لیکن حفاظت اسلام کے لئے جائز ہے۔ حافظ محمد سعید نے کہا کہ خواجہ ناظم الدین بھی میری طرح "ہاتو" (کشمیریوں کے لئے تحقیری لفظ) ہے۔ وہ انگریزوں کی تائید کر کے اس مقام پر پہنچا ہے۔ اور بنگال کے قحط میں ڈھائی لاکھ جانوں کی تباہی کا ذمہ وار ہے۔ اس مقرر نے چودھری ظفراللہ خاں کو کافر بھی کہا۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ پاکستان میں شراب خواری۔ بد دیانتی۔ بداخلاقی اور رشوت روز بروز ترقی پر ہیں اور وزرا بلا ٹکٹ سفر کر رہے ہیں۔ اس نے حکام کو تنبیہ کی کہ اگر مسلمانوں کے متفقہ مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو روز قیامت ان کا حشر مرزا غلام احمد کے ساتھ ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے فرعون کو خنزیر کی سواری کرنی پڑیگی۔ شیخ حسام الدین نے کہا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں مرزائیوں نے ہتھیاروں اور سواروں سے انگریزوں کی امداد کی تھی۔ اور مرزا غلام احمد کے آباؤ اجداد بالاکوٹ کے مقام پر شاہ اسمٰعیل شہید کے خلاف سکھوں کے لشکر میں شامل ہوئے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کہا کہ مرزائی بھارت اور پاکستان کو دوبارہ متحد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ محمد علی جالندھری نے بیان کیا کہ مرزا غلام احمد اور اس کے پیرو زندیق ہیں جن کے متعلق رسول پاک کا ارشاد ہے کہ جو شخص زندیقوں کو قتل کریگا اسے سو شہیدوں کے برابر ثواب ملے گا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ مرزا غلام احمد کے نام کے ساتھ "کذاب" کا لقب استعمال کرنا چاہئے۔ یہ بھی کہا کہ جس زمانے میں چودھری ظفراللہ خاں حکومت ہند کے ریلوے ممبر تھے ۲۲ مسلمان مرزائی ہو گئے تھے۔ اور مسٹر اعجاز احمد افسر درآمد و برآمد کراچی اور مسٹر فاروقی چیف سیکرٹری حکومت سندھ اپنے سرکاری فرائض کے دوران میں مرزائیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔

جب یہ کیس مسٹر نذیر احمد سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) کے سامنے آیا تو انہوں نے ۲۴۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو لکھا کہ محمد علی جالندھری نے ضلع منٹگمری میں ایک تقریر کی تھی جس کی بنا پر اس کے خلاف زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ ایک کیس زیر تفتیش ہے۔ اور میں ایس پی منٹگمری سے دریافت کر رہا ہوں کہ اس کیس کا کیا ہوا۔ کیونکہ ایک بد آہنگ سیاسی مقرر کے خلاف کیس درج کرنا اور مدت دراز تک اس کا چالان عدالت میں نہ بھیجنا نظم حکومت کی امداد کرنا نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ محمد علی جالندھری کے خلاف جو احراریوں میں بدترین مقرر ہے مقدمہ دائر کیا جائے۔ یا اس کو پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند کیا جائے۔ ۲۵۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ کیس حکومت کو بغرض اطلاع ارسال کیا اور لکھا کہ چیف منسٹر صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ کراچی سے واپسی پر اس مسئلے کے متعلق گفتگو کرینگے کہ فرقہ بندی کے متعلق جنگجویانہ تقریریں کرنے والوں کے متعلق کیا اقدام کیا جائے۔

شجاع آباد ضلع ملتان میں ۱۹:۔ ۲۰ نومبر ۱۹۵۲ء کو ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر اہم مقررین یہ تھے: مولوی محمد علی جالندھری۔ مرزا غلام نبی جانباز۔ شیخ حسام الدین۔ مولوی غلام غوث سرحدی۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور سید عطا اللہ شاہ بخاری مولوی غلام غوث نے اپنی تقریر میں کہا کہ مرزا غلام احمد عورتوں سے ٹانگیں دبوایا کرتے تھے - ان عورتوں میں سے ایک کا نام بھانو تھا - مرزا صاحب ننگی عورتوں کو دیکھنے کے بہت مشتاق تھے - اور یہ تو اُن کا بیٹا (مرزا بشیر الدین محمود احمد) بھی تسلیم کر چکا ہے کہ وہ شراب پیا کرتے تھے - مولوی محمد علی جالندھری نے مرزا غلام احمد کو "اُلو کا پٹھا" بتایا اور کہا کہ خواجہ ناظم الدین کی ماں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ سکتی ہے کہ اس کا بیٹا وزیراعظم بن گیا لیکن ملک بد قسمت ہے کیونکہ وزیراعظم امور و معاملات کو سمجھنے سے قاصر ہیں - سید عطا اللہ شاہ بخاری نے یہاں پھر ملکہ وکٹوریہ کے متعلق اشارات کئے -

یہ کیس مسٹر انور علی کے پاس پہنچا تو انہوں نے ۸- دسمبر ۱۹۵۲ء کو اس پر مندرجہ ذیل یادداشت لکھی :-

(۱) "میں ایک دفعہ پہلے بھی حکومت کے علم میں لا چکا ہوں کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری نے لائل پور میں تقریر کرتے ہوئے ملکہ وکٹوریہ کے خلاف ناشائستہ اور بدتمیزانہ باتیں کیں - اب شجاع آباد میں بھی اس نے ملکہ وکٹوریہ کے متعلق فحش اور مکروہ اشارات کئے ہیں -

(۲) محمد علی جالندھری یہاں تک پہنچ گئے کہ انہوں نے جماعت احمدیہ کے بانی کو "اُلو کا پٹھا" کہہ دیا - اگر احمدی ایسی باتوں پر برہم ہوں اور جوش میں آجائیں تو کیا ہم انہیں الزام دے سکتے ہیں؟ اگر وہ غصے میں بھر کر کچھ کر بیٹھیں تو احراری احمدیوں کی آزار رسانی میں اور بھی زیادہ شدت اختیار کریں گے - ایک واقعہ سے مزید تلخی پیدا ہوگی اور یہ چکر کبھی ختم نہ ہوگا۔

(۳) حکومت ایک دفعہ اور احراری لیڈروں خصوصاً سید عطا اللہ شاہ بخاری اور محمد علی جالندھری کو تنبیہ کرنے پر آمادہ ہو جائے گی - حکومت کو اس قسم کی فتنہ انگیز تقریریں ہرگز برداشت نہ کرنی چاہئیں - کیونکہ عوام کے خیالات مسموم کئے جا رہے ہیں - مناسب طرز عمل تو یہی ہے کہ ان دونوں لیڈروں کے خلاف مقدمات چلائے جائیں - لیکن چونکہ مرکزی حکومت احراریوں کے متعلق اپنے رویے کو متعین کرنے سے انکار کر رہی ہے اور حکومت پنجاب یکطرفہ اقدام نہیں کر سکتی - اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہوم سیکرٹری یا چیف سیکرٹری ان مقرروں کو تنبیہ کر دیں ۔

روز بروز اس امر کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ احراری پاکستان اور اسلام کی امداد کرنے میں فعال نہیں ہیں - ان کا مقصد یہ ہے کہ آئندہ انتخابات کے لئے زمین تیار کریں - اس وقت یہ لوگ یا تو لیگ کی مخالف پارٹی کی حیثیت اختیار کر لیں گے یا لیگ کے اندر ایک علیحدہ گروپ بنائیں گے۔"

ہوم سیکرٹری نے یہ کیس بغرض اطلاع چیف منسٹر کو بھیجا اور لکھا کہ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کی غرض سے حکام کے ایک اجلاس کا انعقاد قرار پا چکا ہے - جب فائل میاں انور علی کو

موصول ہوئی تو انہوں نے ایس پی (A) اور ایس پی (B) کو گفتگو کے لئے طلب کیا تاکہ حکام کے اس اجلاس کے لئے جو چند روز میں ہونے والا تھا ضروری نکات کی ایک فہرست تیار کرلی جائے، اس حکم کی تعمیل میں مسٹر نذیر احمد ایس پی (B) نے مندرجہ ذیل یادداشت لکھی :-

"اس فائل کے ساتھ ایک اور فائل ذیل میں منسلک ہے جس کے ساتھ دو اشتہار شامل ہیں۔ ان اشتہاروں میں مرزائیوں کے بائیکاٹ اور ان کے لئے الگ برتن رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل فائلیں بھی شامل کی گئی ہیں :-

(۱) وہ فائل جس میں ضلع سیالکوٹ کے بشیر احمد منظور احمد اور کرامت علی کی تقریریں مندرج ہیں جن میں بشیر احمد نے یہ کہا تھا کہ ڈاکٹر احسان علی نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی سالی سے زنا بالجبر کیا جس پر اسے صرف دس جوتوں کی سزا دی گئی اور اگر دولتانہ احمدیوں کی مدد کریگا تو اس کو بھی جوتوں کا سامنا کرنا پڑے گا دوسرے مقررین نے مرزا غلام احمد کو کھلم کھلا گالیاں دیں۔

(۲) وہ فائل جس میں افتخار الحسن لائلپوری کی تقریریں شامل ہیں۔ اس نے اپنی ۸۔ اگست کی تقریر میں کہا کہ ہم کو ممتاز محمد دولتانہ۔ سر ظفر اللہ خاں اور خواجہ ناظم الدین جیسوں کی غدار حکومت کے افسروں پر کوئی اعتماد نہیں۔ ۲۹۔ اگست کو مولوی افتخار الحسن نے اپنی تقریر میں کہا کہ شمس الحق۔ خان لیاقت علی خان اور صاحبزادہ اعزاز الدین احمد خاں تینوں کے قتل کا ذمہ دار نجف خاں ہے۔ ہوم سیکرٹری کی تجویز پر افتخار الحسن کو ڈپٹی کمشنر لائل پور نے تنبیہ کی۔

(۳) وہ فائل جس میں ضلع کیمبل پور کے مولوی عبدالحنان کی تقریر درج ہے جس میں اس نے کہا کہ مرزائی واجب القتل ہیں۔ اور خواجہ ناظم الدین کافر مرتد احمق اور جاہل آدمی ہے۔ اس مولوی کو بھی ڈپٹی کمشنر کیمبل پور کی وساطت سے تنبیہ کی گئی۔

(۴) وہ فائل جس میں خان عبدالستار خاں نیازی ایم۔ ایل۔ اے کی وہ تقریر شامل ہے جو اس نے ۲۰ ستمبر ۱۹۵۲ء کو جھنگ میں کی تھی۔ اس نے نہ صرف احمدیوں پر نکتہ چینی کی بلکہ یہ بھی کہا کہ پولیس کانسٹیبلوں اور سرکاری کلرکوں کی تنخواہیں بہت کم ہیں جن میں ان کا گزارا نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی کہا کہ دولتانہ ڈاکو ہے اور ملت کو لوٹ رہا ہے۔ حکومت کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ خان عبدالستار خاں نیازی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

(۵) وہ فائل جس میں اس جلسہ عام کی کارروائی درج ہے جو راولپنڈی میں زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کنونشن ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو منعقد ہوا۔ اس جلسے میں ماسٹر تاج الدین اور محمد علی جالندھری نے تیز و تند تقریریں کیں۔ اور محمد علی جالندھری نے کہا کہ مرزا غلام احمد

اور اس کے تمام پیرو زندیق ہیں۔ اور جو شخص نبوت کے جھوٹے دعویدار کو قتل کرتا ہے اسے ستّر شہیدوں کے برابر ثواب ملتا ہے ۔

۲۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ احرار مقررین کو چودھری ظفراللہ خاں اور بانی جماعت احمدیہ کے خلاف علی الاعلان توہین آمیز باتیں کہنے سے روکا جائے۔ وہ عام طور پر اپنی تقریروں میں مرزا غلام احمد کو دجال۔ کذاب اور زانی اور چودھری ظفراللہ خاں کو غدار اور دشمن پاکستان کہتے ہیں ۔

۳۔ احرار مقررین عوام پر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر بعض لوگ مثلاً احمدی مرزا غلام احمد کو نبی خیال کریں تو یہ رسول پاک صلعم کی سخت توہین ہے۔ اس طریقے سے عام آدمی کے جذبات سے کھیلا جاتا ہے اور اس کو احمدیوں کے خلاف متشددانہ اقدام پر مشتعل کیا جاتا ہے ۔

۴۔ اب احراری مقررین اپنی توجہات اس امر پر صرف کر رہے ہیں کہ احمدیوں کا مجلسی اور اقتصادی بائیکاٹ کیا جائے۔ کیونکہ وہ غیر مسلم ہیں۔ یہ لوگ دکانداروں سے کہتے ہیں کہ اپنی دکانوں پر مرزائیوں کے لئے علیحدہ برتن رکھو۔ اور اس کا اعلان بورڈ لگا کر کرو۔

۵۔ احرار مقررین مسلمانوں کو اس امر پر بھی اکسا رہے ہیں کہ وہ اپنے قبرستانوں میں احمدیوں کی نعشوں کو دفن ہونے کی اجازت نہ دیں ۔

۶۔ احرار مقررین عوام کے ذہنوں میں یہ نقش بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وزیر اعظم پاکستان اور وزیر اعلیٰ پنجاب احمدیوں کے حامی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اب تک احمدیوں کو علیحدہ قوم قرار نہیں دیا اور چودھری ظفراللہ خاں کو کابینہ پاکستان سے موقوف نہیں کیا ۔

۷۔ احرار مقررین اپنی تقریروں میں اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مرزائیوں کو پاکستانی فوج اور دوسری ملازمتوں میں کلیدی عہدے ہرگز نہ دیئے جائیں۔ اس طریقے سے وہ ملازمتوں کے اندر احمدیوں اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان فرقہ واری پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

۸۔ احراری مقررین کھلم کھلا یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ ربوہ کے مرزا محمود احمد اور ان کے پیرو مملکت پاکستان کے وفادار نہیں ہیں اور وہ بھارت اور پاکستان کو دوبارہ متحد کر دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ قادیان جہاں ان کا بانی مدفون ہے بھارت میں واقع ہے اور مرزائی واپس قادیان جانے کے بے حد خواہاں ہیں ۔

۹۔ احراری مقررین کئی دفعہ اپنی تقریروں میں کہہ چکے ہیں کہ مرزا محمود احمد اور چودھری ظفراللہ خاں کی غداری ہی کی وجہ سے ضلع گورداسپور بھارت میں شامل ہوگیا اور پاکستان

کو نہ مل سکا۔

۱۰۔ احراری مقررین یہ بھی کہتے رہے ہیں کہ مسئلہ کشمیر صرف چودھری ظفراللہ خاں کے عدم خلوص کی وجہ سے اب تک حل نہیں ہو سکا۔ اور پاکستان و افغانستان کے تعلقات کی کشیدگی کا باعث بھی یہی ہے کہ چودھری ظفراللہ خاں کابینۂ پاکستان میں شامل ہیں۔

۱۱۔ احراری مقررین اپنی تقریروں میں اس امر کی اشاعت بھی کرتے رہے ہیں کہ چودھری ظفراللہ خاں انگریزوں کے ایجنٹ ہیں۔ اور فرقہ احمدیہ کی حوصلہ افزائی اور ترقی بھی حکومت برطانیہ ہی نے کی تھی کیونکہ اس فرقے کا بانی "جہاد" کا مخالف تھا۔ روزنامہ "زمیندار" اور "آزاد" (احرار کا اخبار) دونوں قریب قریب روزانہ ایسے مضامین شائع کر رہے ہیں جو احمدیوں کے خلاف فرقہ احمدیہ کے بانی کے خلاف اور چودھری ظفراللہ خاں کے خلاف شدید بدگوئی اور دشنام طرازی سے لبریز ہوتے ہیں۔

۱۲۔ احراریوں کی اس شورش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں اور احمدیوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے ہیں اور عام لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس ملک کے ارباب اختیار کو لوگوں کے احساسات سے کوئی ہمدردی نہیں اور وہ احمدیوں کے حامی ہیں۔ اس طریقے سے مملکت کو نقصان پہنچا ہے اور احراری لیڈروں کی حیثیت عوام کی نظروں میں بہتر ہو گئی ہے۔ اس شورش کا ایک اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ملاؤں کا پورا طبقہ اپنی روزانہ تقریروں اور جمعہ کے خطبوں میں بے حد تیز و تند لہجہ اختیار کر چکا ہے۔ وہ اپنے وعظوں کو دینی معاملات تک محدود رکھنے کے بجائے اب خالص سیاسیات کے لئے وقف کئے ہوتے ہیں۔ خصوصاً ان کے خطبات جمعہ اسی موضوع سے لبریز ہوتے ہیں"۔

۴۔ ۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو چیف منسٹر صاحب کے کمرے میں کانفرنس ہوئی جس میں مسٹر قربان علی خاں انسپکٹر جنرل پولیس۔ ہوم سیکرٹری اور مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے حصہ لیا۔ اس گفتگو میں صرف ایک فیصلہ کیا گیا کہ جہاں کوئی تقریر قانون کے خلاف ہو وہاں قانونی کارروائی کی جائے اور کسی مزید اقدام کی ضرورت نہیں۔ اس حکم کی تعمیل میں سپرنٹنڈنٹ پولیس سیالکوٹ کو ایک چٹھی لکھی گئی جس میں انہیں بتایا گیا کہ منظور احمد۔ کرامت علی اور بشیر احمد جن کے خلاف میلہ گلو شاہ پر تقریریں کرنے کی وجہ سے مقدمہ چلانے کی تجویز ایس پی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کر رکھی ہے بے حقیقت سے آدمی ہیں۔ اس لئے ان کے خلاف اس موقع پر مقدمہ چلانا مفید نہ ہوگا۔

۹-۱۰ فروری ۱۹۵۳ء کو سیالکوٹ میں زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کنونشن ایک کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔ اگرچہ کانفرنس کا اشتہار ایک شخص علامہ محمد یعقوب خاں نے دیا تھا۔ لیکن اس کے پس پشت احراری تھے۔ ۶ نومبر ۱۹۵۲ء کو مسٹر غلام سرور خاں ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ نے کمشنر کو لکھا کہ اگرچہ ڈی او چٹھی نمبری 6467-84-BDSB مورخہ ۵ جون ۱۹۵۲ء میں حکومت کی واضح ہدایات موجود ہیں کہ دفعہ ۱۴۴ ضابطہ

فوجداری نافذ کر دینی چاہئے۔ لیکن چونکہ اس کے بعد ۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو ہفتے کے دن چیف سیکرٹری کے دفتر میں ان کے زیر صدارت حکام کی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ۱۳ ؍ جولائی کی کنونشن منعقدہ لاہور میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ اس لئے میں اس فیصلے کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ حکام اضلاع کو اس قسم کے جلسوں میں کوئی مداخلت نہ کرنی چاہئے۔ ایسی کانفرنسیں گوجرانوالہ اور لاہور میں منعقد ہو چکی ہیں۔ جن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس لئے میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا ضلع سیالکوٹ میں بھی اسی پالیسی پر عمل کرنا مقصود ہے۔ اس چٹھی کی ایک نقل نیم سرکاری حیثیت سے چیف سیکرٹری حکومت پنجاب کو بھیجی گئی۔ جو ۹۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو ہوم سیکرٹری کے سامنے پیش کی گئی۔ کمشنر نے ڈپٹی کمشنر کی یہ یادداشت ۹۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو چیف سیکرٹری کے پاس بھیجی اور لکھا کہ ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی یہ تجویز صحیح معلوم ہوتی ہے کہ کانفرنس میں مداخلت نہ کی جائے۔ ہوم سیکرٹری نے لکھا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جو کچھ کرنا چاہیں اس کے خلاف حکومت کوئی احکام صادر کرنے کی خواہش نہیں رکھتی۔ اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی چٹھی کے آخری فقرے کے پیش نظر کوئی کارروائی ضروری نہیں۔

علما کی سرگرمیاں اور وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ سے ان کی ملاقاتیں

پہلا شخص جس نے خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم کی توجہ قادیانی تحریک کی سنگینی کی طرف مبذول کرائی وہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی تھا۔ قادیانیت کی مخالفت اس شخص کی زندگی کا واحد مقصد معلوم ہوتا ہے اور وہ جہاں کہیں جاتا ہے اپنے ساتھ ایک بڑا چوبی صندوق لے جاتا ہے جس میں احمدیوں کا اور احمدیوں کے خلاف لٹریچر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ زیادہ اہم سیاسی واقعات کا ذکر تو درکنار پاکستان یا کسی اور شخص کو کوئی آفت پیش آ جائے کوئی افسوسناک واقعہ رونما ہو جائے۔ قائد ملت قتل کر دئے جائیں یا ہوائی جہاز گر پڑیں۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے نزدیک وہ ہمیشہ احمدیوں ہی کی سازش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں شجاع آبادی کراچی کے ایک اور عالم مولانا احتشام الحق تھانوی کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر کے خواجہ ناظم الدین کے پاس لے گیا تاکہ وہ ان کو اس غیظ و غضب سے مطلع کریں جو احمدیوں کے خلاف ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ دونوں ۳۔ مارچ ۱۹۵۰ء کو خواجہ ناظم الدین سے ملے شجاع آبادی کا چوبی صندوق اس کے ساتھ ہی تھا اس نے اس صندوق میں سے کچھ قادیانی لٹریچر نکالا جس کو پڑھ کر خواجہ ناظم الدین سخت پریشان ہوئے۔

اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ احمدیوں کے خلاف مطالبات علما نے جون ۱۹۵۲ء میں بمقام کراچی اور ۱۳۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو بمقام لاہور وضع کئے تھے اور اسی وقت ان مطالبات کی منظوری کے لئے تدابیر سوچنے کی غرض سے مجلس عمل مرتب کی گئی تھی مجلس عمل کے ارکان نے جو طریقے اختیار کئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم سے ایک وفد ملاقات کرے۔ اور ان کو مطالبات کی معقولیت کا قائل بنائے۔ وزیر اعظم سے پہلی ملاقات مولانا اختر علی خاں نے جولائی ۱۹۵۲ء میں

کی۔جب وہ ایک پریس کانفرنس کی غرض سے کراچی میں مقیم تھے مولانا نے خواجہ ناظم الدین سے مطالبات کا ذکر کیا اور دیکھنے لگے کہ خواجہ صاحب پر ان کا ردّ عمل کیا ہوتا ہے۔مولانا نے ایک میمورنڈم (E x D.E 16) پیش کرکے دعوےٰ کیا ہے کہ خواجہ ناظم الدین نے ان سے جو کچھ کہا تھا وہ بے کم و کاست اس میں درج ہے:۔

"مجھے ملک کے جذبات اور احساسات کا پورا علم ہے۔میں جانتا ہوں کہ مسلمان کیا چاہتے ہیں لیکن میں انہیں کہوں گا کہ حکومت ان کے جذبات کا پورا پورا احترام کرتی ہے لیکن ان کے مطالبات کو پورا کرنے کے راستے میں کچھ آئینی دشواریاں ہیں۔ان دشواریوں کو دور کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔اس لئے مسلمانوں کو توقف اور اطمینان سے کام لینا چاہئے۔امن اور قانون کو برقرار رکھنے میں حکومت سے تعاون کرنا چاہئے۔ہم جو بھی فیصلہ کریںگے وہ مسلمانوں کو قابل قبول ہوگا۔آپ نے کہا کہ یہ فیصلہ علمائے کرام کی عین مرضی کے مطابق ہوگا میری حکومت ۱۴ اگست کو بنیادی حکمت عملی کا اعلان کردیگی۔مجھے امید ہے کہ یہ وضاحت ملک کی رائے عامہ کو مطمئن کردیگی"۔

خواجہ ناظم الدین کا بیان اس ملاقات کے واقعات کے متعلق مختلف ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ میں نے تو مولانا اختر علی خان سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں اس مسئلے کے متعلق یوم پاکستان مورخہ ۱۴ اگست کو اپنی تقریر میں کچھ بیان کرونگا۔

مولانا اختر علی خاں نے کراچی سے واپس آکر "زمیندار" مورخہ ۴ اگست میں جلی قلم اعلان شائع کیا کہ قادیانیوں کے متعلق مرکزی حکومت کی پالیسی کا اعلان وزیراعظم صاحب یوم پاکستان پر اپنی تقریر میں کردینگے اور یہ اعلان شریعت اور علما کی خواہش کے مطابق ہوگا۔مولانا نے اس خبر میں یہ غلط بیانی کی کہ انہوں نے وزیراعظم کی خدمت میں تحریک ختم نبوت کے ایک وفد کی قیادت کی تھی۔حالانکہ واقعہ صرف اتنا تھا کہ مولانا کسی پریس کانفرنس کے ممبر کی حیثیت سے کراچی گئے تھے اور اسی سلسلے میں کانفرنس کے بعض دیگر ممبروں کی معیت میں وزیراعظم سے ملے تھے۔احمدیوں کے مسئلے کا ذکر صرف ضمنی حیثیت سے ہوا تھا۔

۱۳۔اگست ۱۹۵۲ء کو ایک وفد وزیراعظم کی خدمت میں حاضر ہوا جس کے ارکان یہ تھے! ماسٹر تاج الدین انصاری۔مولانا ابوالحسنات محمد احمد۔مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش۔شیخ حسام الدین۔مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا عبدالحامد بدایونی۔اس وفد نے ایک تحریری یادداشت پیش کی جس میں احمدیوں کے خلاف شکایات درج تھیں اور ان کے متعلق مندرجہ ذیل مطالبات کئے گئے تھے:

(۱) احمدیوں کو ایک اقلیت قرار دیا جائے۔

(۲) چودھری ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کئے جائیں۔

(۳) احمدیوں کو مملکت کے کلیدی عہدوں سے موقوف کردیا جائے۔

خواجہ ناظم الدین نے بیان کیا کہ وہ اس وقت دوسرے دن کے لئے (جو یوم پاکستان تھا) بعض مصروفیتوں میں الجھے ہوئے ہیں اس لئے اس مسئلے پر گفتگو کے لئے وقت نہیں نکال سکتے اس لئے انہوں نے تجویز کی کہ

ارکان وفد اُن سے اس وقت ملیں جب یوم پاکستان کی مصروفیتوں سے فراغت ہوجانے۔ یوم پاکستان کی تقریر میں وزیر اعظم نے احمدیوں کے متعلق یا ان کے خلاف مطالبات کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا۔ بلکہ اس کے برعکس اس تقریر میں اخبارات کی غلط افواہوں کا اشارتاً ذکر کرکے ان کی مذمت کی گئی۔ اور ان اندرونی افتراق انگیز عناصر کا تذکرہ بھی کیا گیا جن کو اگر روکا نہ گیا تو ملک پارہ پارہ ہوجائے گا۔

تاہم اُسی دن مرکزی حکومت نے یہ پُراسرار سرکاری اعلان شائع کیا:۔

"حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ صوبائی یا مرکزی وزارتوں کا کوئی رکن اُن اشخاص میں جن کے ساتھ اس کا واسطہ پڑتا ہے کسی فرقہ وار عقیدے کی تبلیغ کے لئے اپنی سرکاری پوزیشن کو استعمال نہ کریگا۔ ہر گورنر کو ہدایت کی گئی ہے کہ یہ فیصلہ تمام متعلقہ وزیروں تک پہنچا دیں اور حکومت توقع رکھتی ہے کہ آئندہ کوئی وزیر اس قاعدے کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔

حکومت پاکستان کو اکثر اس امر کی شکایات موصول ہوئی ہیں کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے بعض افسر جو ایک خاص فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے ماتحتوں اور اُن دوسرے اشخاص کے درمیان جن کے ساتھ سرکاری حیثیت میں ان کا واسطہ پڑتا ہے۔ اپنے فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کے لئے اپنی سرکاری حیثیت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ حکومت اس معاملے کو سخت نامناسب خیال کرتی ہے۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپسندیدہ سرگرمی کو فی الفور ختم کر دیا جائے اور آئندہ کے لئے اس قابل اعتراض طریقے سے فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کو ممنوع قرار دیا جائے۔ گورنمنٹ سروس کانڈکٹ رولز (قواعد کردار ملازمان سرکاری) میں اس منشا کے مطابق ترمیم کر دی گئی ہے۔

حکومت اعلانِ عام کر دینا چاہتی ہے کہ جو شخص خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو اس قاعدے کی خلاف ورزی کریگا اس کے خلاف شدید کارروائی کی جائے گی۔ پاکستان کی صوبائی اور ریاستی حکومتوں کو بھی اسی قسم کے اقدام کی ہدایت کی گئی ہے"۔

چونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سرکاری اعلان کا روئے سخن چودھری ظفر اللہ خاں اور دوسرے احمدی افسروں کی طرف ہے اس لئے چودھری ظفر اللہ خاں نے فوراً مندرجہ ذیل بیان اخبارات میں شائع کرایا:۔

"میں ان تعلیمات اسلامی کے مطابق جو قرآن مجید میں مندرج ہیں اور جن کا نمونہ رسول پاک کی حیات طیبہ میں موجود ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے آزادی ضمیر پر پورا اعتقاد رکھتا ہوں میرے خیال میں سرکاری اثر و نفوذ کا استعمال بھی براہ راست دباؤ یا تشدد ہی کی مانند آزادی ضمیر میں مداخلت کا حکم رکھتا ہے۔ بلکہ اسلام نے تو ہر مسلمان پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں قول و فعل سے احکام اسلامی کی تعمیل کا ثبوت دے۔ یہ وہ فرض ہے جس کی طرف سے مسلمانوں نے اپنے دور زوال میں افسوسناک غفلت برتی جس کے نتائج ان کی انفرادی اور قومی زندگیوں پر بالکل واضح ہیں۔

خود میرے عقائد میرے جاننے والوں سے (خواہ وہ مجھے شخصاً جانتے ہوں یا میری شہرت کی وجہ سے واقف ہوں) کبھی پوشیدہ نہیں رہے۔ گو پچھلے دنوں بعض حلقوں میں ان کو بگاڑ کر پیش کرنے اور ان کے متعلق غلط بیانی کرنے کی مسلسل کوششیں کی گئی ہیں۔ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں میں اس امر کو خلافِ دیانت اور خلافِ تعلیماتِ اسلامی سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص اپنے سرکاری عہدہ و اختیار کو بالواسطہ یا بلاواسطہ استعمال کرکے اپنے مذہبی عقائد کو دوسروں پر زبردستی منڈھ دے۔ یا اسی قسم کے اثر و نفوذ سے کام لے کر کسی شخص کو اس کے حقیقی عقائد کے ترک پر مجبور کرے۔ میں جس جماعت سے تعلق رکھتا ہوں اس میں اس اصول کی وسیع تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس کو مسلمہ اصول سمجھا جاتا ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ اس جماعت کا کوئی فرد اس صحیح اور مفید اصول کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو مجھے یقیناً بے حد حیرت اور انتہائی اذیت ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ جہاں تک ہمارے محدود وسائل اجازت دیتے ہیں ہمارے خیالات و عقائد کی وسیع تبلیغ کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس فریضے کی بجا آوری میں کیا جاتا ہے جو سب صحیح الخیال لوگوں پر عائد ہوتا ہے کہ وہ جن عقائد کو تہہ دل سے صحیح سمجھیں ان کی مسلسل اور مخلصانہ نشر و اشاعت اپنے قول و فعل سے کرتے رہیں تاکہ راستبازی پھیل جائے اور نیکیاں قائم ہو جائیں۔ اگر اس مقصد کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائیگا جس سے جبر اور دباؤ اور ناواجب وسائل کے استعمال کی بو آتی ہو تو خود یہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ جس شخص کے متعلق ایسا طریقہ استعمال کیا جائیگا اس کا ردِّ عمل لازماً مخالفانہ ہوگا اور وہ محسوس کریگا۔ کہ اس کو آزادی اور خوشدلی سے بنیادی صداقتوں کے مطالعہ اور ان پر غور و خوض کرنے کی دعوت نہیں دی جارہی ہے بلکہ ایک ایسے عقیدے کے ظاہری قبول پر مجبور کیا جا رہا ہے جس کو اس کا ضمیر تسلیم نہیں کرتا۔

اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ جس جماعت کے خلاف بعض حلقے جو عظیم اکثریت ہونے کے دعویدار ہیں برابر غلط بیانی اور جبر و ظلم میں مصروف ہیں۔ اس جماعت کے ارکان اس قسم کے طور طریقے اختیار ہی نہیں کر سکتے۔ جب انہیں ایسی باتوں کے لئے اتہام، استہزا اور نفرت کا نشانہ بنایا جارہا ہے جو ان کے عقائد میں بھی شامل نہیں اور جن پر انہوں نے کبھی عمل بھی نہیں کیا تو پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ ان طور طریقوں کو اختیار اور استعمال کرنا شروع کر دیں گے جو نہ صرف اسلام کے بلکہ عقلِ صحیح کے بھی خلاف ہیں۔ اور جن سے ان کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ پھر ایسی حالت میں وہ شدید سزا اور شدید مذمت سے بچنے کی کیونکر توقع رکھ سکتے ہیں۔

حکومت کی طرف سے جو اعلان کیا گیا ہے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ باشندگانِ پاکستان کے تمام طبقے اس اعلان کو ہر دم پیشِ نظر رکھیں گے اور دین و ایمان

کے متعلقہ امور میں سکون و متانت اور سنجیدگی و رواداری کی فضا قائم کرنے میں معاون ہونگے۔

جن موضوعات سے انسانی ذہن کا تعلق ہے اور جن کا اثر ذہن قبول کرتا ہے ان میں بلند ترین موضوعات ایمان و اعتقاد ہیں۔ اس دائرے میں انتہائی حزم و احتیاط لازمی ہے مبادا اللہ کی نظروں میں ہم اس گناہ کے مرتکب قرار پائیں کہ ہم نے کسی شخص کو ایسے عقیدے کے اعلان پر مجبور کیا جسے اس کا ضمیر قبول نہیں کرتا تھا۔ اور اُن عقائد سے انکار کی ترغیب دی جن کو اس کا قلب و ضمیر مخلصانہ قبول کرتا تھا کوئی شخص جو اس قسم کے فعل کا مرتکب ہے وہ وزیر ہو حاکم ہو۔ یا کوئی غیر سرکاری فرد ہو حقیقت میں مومنینِ مخلصین کی نہیں بلکہ منافقین کی جماعت پیدا کرنے کا خواہاں ہے"۔

مجلس عمل کے وہی ممبر جو ۱۳۔ اگست کو خواجہ ناظم الدین سے ملے تھے۔ ۱۶۔ اگست کو پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس موقع پر سردار عبدالرب نشتر۔ مسٹر گورمانی اور مسٹر فضل الرحمٰن بھی موجود تھے۔ اس ملاقات کا نتیجہ ارکانِ وفد کے لئے واضح طور پر دل شکن تھا خواجہ ناظم الدین نے کہا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مسئلہ دستور ساز اسمبلی کے دائرہ اختیار میں ہے اور میں اس معاملے میں کسی اقدام پر آمادہ نہیں ہوں آپ نے یہ بھی کہا کہ چودھری ظفراللہ خاں کو خود قائداعظم نے مقرر کیا تھا۔ اس لئے میں انہیں برطرف کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ احمدی افسروں کو کلیدی عہدوں سے الگ کیا جائے۔ تو اس کے متعلق ارکانِ وفد کو دلائل و براہین کی مدد سے کیس تیار کرنا چاہئے اور ربوہ کے متعلق جو شکایات ہیں وہ صوبائی حکومت کے سامنے پیش کرنی چاہئیں۔

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری۔ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش۔ شیخ حسام الدین اور مولانا داؤد غزنوی نے ۲۹۔ ستمبر ۱۹۵۲ء کو چیف منسٹر پنجاب سے ملاقات کی۔ اور احمدیوں کے خلاف اپنی شکایات ان کے سامنے پیش کیں۔ جن میں یہ امور شامل تھے: ربوہ میں خالص احمدی بستی کے لئے اراضی کا عطیہ۔ ناواجب الاٹمنٹیں اور وہ مسئلہ جس کو ارکان وفد گولی بارود کی سازش سے موسوم کرتے تھے چیف منسٹر نے ان امور پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جہانگیر پارک کراچی میں چودھری ظفراللہ خاں کی تقریر (مئی ۱۹۵۲ء) کے بعد مختلف مکاتبِ خیال کے علما کا ایک اجلاس ۲۔ جون کو بمقام کراچی منعقد ہوا جس میں احمدیوں کے خلاف مطالبات مرتب کئے گئے۔ اور علما کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا۔ ۱۵۔ اگست کو اس بورڈ کا ایک اجلاس ہُوا جس میں خاص دعوت پر شیخ حسام الدین۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد۔ ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش بھی شریک ہوئے۔ یہ پنجاب سے آنے والے ایک وفد کے ارکان تھے۔ بورڈ نے فیصلہ کیا کہ آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن ۱۵-۱۶ اور ۱۷ ستمبر کو منعقد کی جائے معلوم

ہوتا ہے کہ ستمبر میں اس کنونشن کے انعقاد کی کوئی تدبیر نہ کی گئی - اور بورڈ کے بعض ممبر اضطراب کا اظہار کرنے لگے - ۱۵ دسمبر ۱۹۵۲ء کو بورڈ کا ایک اجلاس ہوا جس میں خاص دعوت پر شیخ حسام الدین - سید مظفر علی شمسی اور سید منور علی شاہ بھی شریک ہوئے - اس اجلاس کے فیصلوں کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے -

۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو مولانا داؤد غزنوی نے مولانا احتشام الحق کو ایک چٹھی لکھی جس میں کنونشن کے انعقاد میں تاخیر ہونے کی شکایت کی اور بتایا کہ اس کا جلد سے جلد منعقد ہونا اشد ضروری ہے - انہوں نے اس چٹھی میں یہ بھی لکھا کہ اگر کنونشن کے انتظامات میں کچھ مالی مشکلات حائل ہوں تو پنجاب کی مجلس عمل پوری مالی ذمہ داری اٹھانے پر آمادہ ہے - مولانا محمد شفیع نے بھی ۲۲ - اکتوبر کو مولانا داؤد غزنوی ہی کی طرح مولانا احتشام الحق کو مکتوب لکھا جس میں یہ تجویز پیش کی کہ کنونشن کی تاریخ ان ایام میں مقرر کرنی چاہیے جن میں علما اس علما کانفرنس کے سلسلے میں جو مجلس اصول اساسی کی تجاویز پر غور کرنے کے لیے منعقد ہو رہی ہے کراچی میں موجود ہوں گے - چنانچہ مولانا احتشام الحق (کنوینر) نے ۱۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کو دعوت نامے جاری کر دیئے کہ آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کا اجلاس ۱۶ - ۱۷ - اور ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو منعقد ہوگا -

اس کنونشن کی کارروائی کے متعلق دو بیانات ہیں - ایک طرف مجلس عمل اور احرار کا بیان ہے اور دوسری طرف جماعت اسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا اور دونوں میں کچھ فرق ہے مجلس عمل کے تحریری بیان میں یہ لکھا ہے کہ کنونشن کا اجلاس ۱۶ - جنوری ۱۹۵۳ء کو بعد نماز جمعہ منعقد ہوا جس میں پاکستان کے بڑے بڑے علما شریک ہوئے - مسئلہ احمدیت پر بحث ہوئی اور سبجکٹس کمیٹی مرتب کی گئی - اس تحریری بیان میں مندرجہ ذیل علما کے نام درج ہیں جو اس اجلاس میں شریک تھے :-

(۱) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صدر جماعت اسلامی لاہور
(۲) حاجی محمد امین امیر جماعت ناجیہ
(۳) خلیفہ حاجی ترنگ زئی - پشاور
(۴) حضرت پیر سرسینہ شریف امیر حزب اللہ ڈھاکہ - بنگال
(۵) مولانا راغب احسن ایم - اے - ڈھاکہ
(۶) مولانا عزیز الرحمٰن ناظم حزب اللہ - ڈھاکہ
(۷) مولانا اطہر علی - ڈھاکہ
(۸) مولانا سخاوت الانبیا - ڈھاکہ
(۹) مولانا محمد یوسف بنوری صدر مدرس دار العلوم ٹنڈو الہ یار
(۱۰) مولانا شمس الحق وزیر معارف - قلات
(۱۱) مولانا ابراہیم میر سیالکوٹ
(۱۲) مولانا احمد علی صدر جمعیتہ العلمائے اسلام - شیرانوالہ گیٹ - لاہور

(۱۳) مولانا محمد حسن جامع اشرفیہ - نیلا گنبد - لاہور

(۱۴) مولانا محمد ادریس صدر مدرس جامع اشرفیہ - نیلا گنبد - لاہور

(۱۵) مولانا ظفر احمد عثمانی سیکرٹری تعلیمات اسلامی بورڈ - کراچی

(۱۶) مولانا سید سلیمان ندوی صدر تعلیمات اسلامی بورڈ - کراچی

(۱۷) مولانا محمد شفیع مفتی دیوبند ممبر تعلیمات اسلامی بورڈ - کراچی

(۱۸) مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی و سندھ

(۱۹) مولانا مفتی صاحب داد خاں مدرس عربی - سندھ مدرسہ - کراچی

(۲۰) مولانا عبد الحامد بدایونی صدر جمعیت العلمائے کراچی و سندھ

(۲۱) مولانا محمد یوسف کلکتوی صدر جمعیت اہل حدیث - کراچی

(۲۲) مولانا محمد اسماعیل ناظم جمعیت اہل حدیث

(۲۳) مولانا سید داؤد غزنوی ایم ایل اے صدر جمعیت اہل حدیث - مغربی پاکستان

(۲۴) مولوی محمد علی جالندھری جنرل سکرٹری مجلس احرار پنجاب - ملتان

(۲۵) مولانا سید عطا اللہ شاہ بخاری امیر شریعت

(۲۶) مولانا تمین - ناظم جمعیت العلمائے اسلام کراچی

(۲۷) مولانا احتشام الحق کنوینر آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن - کراچی

(۲۸) مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت العلمائے پاکستان و صدر مجلس عمل -

۱۷ - جنوری ۱۹۵۳ء کو نماز مغرب کے بعد سبجکٹس کمیٹی کا ایک اجلاس ہوا - اور ۱۸ - جنوری کو کنونشن کی دوسری نشست ہوئی جس میں حسب ذیل قرار دادیں منظور کی گئیں :-

(۱) چونکہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کے رویے کے پیش نظر اس امر کی کوئی امید نہیں کہ مرزائیوں کے متعلق مطالبات تسلیم کر لئے جائینگے - اس لئے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ان حالات میں مطالبات کو تسلیم کرانے کی غرض سے "راست اقدام" ناگزیر ہو گیا ہے -

(۲) چونکہ حکومت مرزائیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں ہے - اس لئے ایسی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ فرقہ مرزائیہ کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیا جائے - ان تدابیر میں سے ایک یہ ہے کہ اس فرقے سے کامل مقاطعہ کیا جائے -

(۳) چونکہ مرزائی وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں کی برطرفی کا مطالبہ اب تک منظور نہیں کیا گیا - اس لئے کنونشن خواجہ ناظم الدین سے استعفے کا مطالبہ کرتی ہے تاکہ مسلمانان پاکستان اپنے دینی عقائد پر عمل کرنے اور اسلامی روایات کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں -

(۴) مذکورہ بالا مطالبات کو عملی صورت دینے کی غرض سے کنونشن تجویز کرتی ہے کہ وہ معزز و مقتدر مسلمانوں اور مختلف مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کو جنرل کونسل کا ممبر بنائے۔

(۵) جنرل کونسل اپنے پندرہ ممبروں کو منتخب کرے۔ جو مجلس عمل کے ممبر قرار پائیں۔

(۶) جنرل کونسل مندرجہ ذیل آٹھ اصحاب کو مجلس عمل کا ممبر منتخب کرتی ہے:-

(۱) مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد قادری

(۲) امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری

(۳) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

(۴) مولانا عبدالحامد بدایونی

(۵) حافظ کفایت حسین

(۶) مولانا احتشام الحق تھانوی

(۷) ابو صالح محمد جعفر پیر صاحب سرسینہ شریف مشرقی پاکستان

(۸) مولانا محمد یوسف کلکتوی

اور ان ممبروں کو اختیار دیتی ہے کہ بقیہ سات ممبروں کو اپنی مرضی سے نامزد کرلیں۔

(۷) مجلس عمل کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ مطالبات کو منظور کرانے کے لئے لائحہ عمل مرتب کرے۔

(۸) مجلس عمل کو ہدایت دی جاتی ہے کہ کوئی عملی پروگرام اختیار کرنے سے بیشتر ایک نمائندہ وفد مرتب کرے جو مرکزی حکومت سے ملاقات کرکے اس کو لوگوں کے آخری فیصلے سے مطلع کردے۔ اس وفد کو اختیار ہوگا کہ کابینہ کو آخری جواب کے لئے مزید وقت دے دے۔

اسی دن نماز مغرب کے بعد مجلس عمل کے آٹھ ممبروں کا اجلاس ہؤا اور مندرجہ ذیل سات مزید ممبر شامل کر لئے گئے:-

(۱) پیر غلام مجدد سرہندی

(۲) مولانا نور الحسن

(۳) ماسٹر تاج الدین انصاری

(۴) مولانا اختر علی خاں

(۵) مولانا اسماعیل گوجرانوالوی

(۶) صاحبزادہ فیض الحسن

(۷) حاجی محمد امین سرحدی

اسی اجلاس میں مجلس عمل نے ایک وفد مرتب کیا تاکہ خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کرے۔ چنانچہ ایک وفد جس کے رئیس مولانا عبدالحامد بدایونی اور جس کے شرکا (۱) پیر صاحب سرسینہ شریف (۲) سید

مظفر علی شمسی سیکرٹری ادارہ تحفظ حقوق شیعہ لاہور اور (۳) ماسٹر تاج الدین انصاری صدر مجلس احرار تھے۔ ۲۲۔جنوری ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین سے ملاقی ہُوا خواجہ صاحب نے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن یہ کہا کہ میں ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہوں۔

مجلس احرار کے تحریری بیان کا مطلب بھی یہی ہے۔ بجز اس کے کہ مجلس احرار کے نزدیک وہ وفد ۶ ۔جنوری کو مرتب کیا گیا تھا۔ جو ۲۱۔جنوری کو خواجہ ناظم الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تحریری بیان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ آٹھ منتخب ممبروں کا اجلاس ۱۸ جنوری کی شام کو ہونا قرار پایا تھا اور اس دن کے دوران میں ایک کھانے کی دعوت پر جو مفتی محمد شفیع کے ایک دوست نے دی تھی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے دوسرے ممبروں کو بتایا کہ وہ شام کے اجلاس میں شریک نہ ہو سکیں گے کیونکہ انہیں مجوزہ دستوری تجاویز کی ترمیمات کو مکمل کرنا ہے۔ اور دوسرے دن کی صبح کو لاہور جانا ہے آپ نے مشورہ دیا کہ منتخب ممبر شام کو اپنا اجلاس منعقد کر لیں۔ اور باقی سات ممبروں کو نامزد کر کے شامل کر لیں۔ ایک اور نکتہ جس پر مجلس کا تحریری بیان مختلف ہے یہ ہے کہ ماسٹر تاج الدین انصاری مولانا محمد یوسف کلکتوی کے عوض میں نہیں بلکہ بنگال کے مولانا اطہر علی کے بجائے شامل کئے گئے تھے۔

جماعت اسلامی کا بیان حسب ذیل ہے:-

جنوری ۱۹۵۳ء میں کراچی کے مقام پر مجلس اصول اساسی کی دستوری سفارشات پر غور کرنے کے لئے ایک کنونشن منعقد ہوئی جس میں مختلف خیالات و عقائد کے تینتیس مقتدر علما شریک ہوئے اس کنونشن کے فوراً بعد ایک آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقد کی گئی تاکہ تحریک تحفظ ختم نبوت سے پیدا ہونے والی صورت حالات پر غور کرے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کنونشن میں حصہ لیا۔ اور سبجکٹس کمیٹی میں یہ تجویز پیش کی کہ علما نے چونکہ قادیانی مسئلے کو اپنی اُن ترمیمات میں شامل کر لیا ہے جو انہوں نے مجلس اصول اساسی کی رپورٹ میں تجویز کی ہیں۔ اس لئے اس معاملے پر اب کسی علیحدہ اقدام کی ضرورت نہیں۔ طویل بحث و مباحثہ کے بعد مولانا کی تجویز منظور کر لی گئی لیکن بدقسمتی سے اس کو کھلے اجلاس میں پیش کرنے کی اجازت نہ مل سکی۔ کیونکہ اس کے متعلق صدر اجلاس نے ایک اصطلاحی رولنگ دے دیا تھا۔ مولانا نے اس کوشش میں ناکام رہنے کے بعد یہ تحریک پیش کی کہ ایک مرکزی مجلس عمل مرتب کی جائے جس کو قادیانی مسئلے کے آئینی حل کے لئے پروگرام وضع کرنے کا واحد مختار قرار دیا جائے اور کسی دوسرے فرد یا ادارے کو اس مسئلے کے متعلق کوئی طرز عمل اختیار کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ بدقسمتی سے مجلس عمل کے ارکان کی فہرست مکمل نہ ہوئی۔ اور مجوزہ مجلس رسماً وجود میں نہ آ سکی۔ لہٰذا جماعت کی رائے یہ ہے کہ کنونشن کی ممبر انجمنوں کی تمام سرگرمیاں ۱۷۔جنوری سے ۲۶۔فروری ۱۹۵۳ء تک خلاف آئین اور بے اثر تھیں۔ اس لئے جس وفد نے ۲۲۔جنوری کو وزیر اعظم سے ملاقات کر کے انہیں راست اقدام کا الٹی میٹم دیا وہ غیر مستند و غیر مختار تھا۔ اور بہر حال کنونشن کا صحیح نمائندہ نہ تھا۔ اس وفد نے ایک مہینے کا جو نوٹس وزیر اعظم کو دیا اس کا اختیار بھی انہیں کسی آئینی جماعت نے

نہ دیا تھا۔ جماعت اسلامی نے اپنے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی وساطت سے ان غیر آئینی حرکات پر نکتہ چینی کی اور ۱۳۔ فروری کو مجلس عمل پنجاب سے مطالبہ کیا کہ فوراً مرکزی مجلس عمل کا اجلاس طلب کیا جائے اور اس معاملے میں تمام سرگرمیاں روک دی جائیں۔ یہ مطالبہ پہلے ملک نصر اللہ خاں عزیز کے ذریعے سے اور اس کے بعد اُن کے اور میاں طفیل محمد جنرل سیکرٹری جماعت اسلامی کے توسط سے کیا گیا۔ ۱۹ فروری ۱۹۵۳ء کو جماعت کے سیکرٹری نے ممبروں کے نام ہدایت جاری کی کہ ان فارموں پر دستخط نہ کریں جو مجلس عمل نے راست اقدام کے لئے رضا کاروں کی بھرتی کی غرض سے جاری کئے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ جب تک مرکزی مجلس عمل کسی پروگرام کی منظوری نہ دے جماعت کے کسی ممبر کو ان سرگرمیوں میں حصہ نہ لینا چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ دو ممبران ہدایات کی خلاف ورزی کی پاداش میں جماعت سے خارج کر دئے گئے۔ ۲۶۔ فروری ۱۹۵۳ء کو مرکزی مجلس عمل کا اجلاس کراچی میں ہوا جس میں مولانا مودودی نے اپنے نمائندہ مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی و سندھ کی وساطت سے یہ واضح کر دیا کہ راست اقدام کے پروگرام کا فیصلہ چونکہ غیر آئینی طریقے سے کیا گیا ہے اس لئے اس سلسلے میں تمام سرگرمیاں روک دی جائیں اور اس معاملے کے متعلق صرف مرکزی مجلس عمل کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ مولانا سلطان احمد کو اختیار دیا گیا کہ اگر مرکزی مجلس عمل مولانا مودودی کی تجویز کو قبول نہ کرے تو وہ جماعت اسلامی کو اس مجلس عمل سے منقطع کر لیں۔ بہ تقدیر کی ستم ظریفی ہے کہ عقل کی بات سننے کے بجائے خود مرکزی مجلس عمل ہی ختم کر دی گئی۔ اور ایک بالکل نئی راست اقدام کمیٹی قائم کر دی گئی جس نے دوسرے ہی دن راست اقدام شروع کر دیا۔ جماعت اسلامی من حیث الجماعت اس نئی کمیٹی یا کسی اور راست اقدام کمیٹی کی ممبر نہ تھی۔ نہ جماعت کے کسی فرد کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ راست اقدام کے ورکر کی حیثیت سے بھرتی ہو۔ مولانا نے اپنے احکام سے اور اس عمل سے کہ انہوں نے جماعت کے دو ممبروں کو اس حکم کی خلاف ورزی کی پاداش میں خارج کر دیا۔ بہ حقیقت ہر شخص پر روشن کر دی کہ جماعت کسی اعتبار سے نہ راست اقدام پر یقین رکھتی ہے نہ اس کی حمایت کرتی ہے اور اپنے آپ کو ایسی تمام سرگرمیوں سے کاملاً منقطع کر چکی ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا تحریری بیان مظہر ہے کہ احراریوں نے مئی ۱۹۵۲ء میں قادیانی مسئلے پر شورش کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت جماعت اسلامی کی رائے یہ تھی کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ صحیح ہے لیکن چونکہ دستور وضع کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اپنی توجہ کو کسی غیر آئینی شورش کی طرف منعطف کر لیں۔ اس وقت تمام کوششیں اس امر پر مرتکز کر دینی چاہئیں کہ ایک صحیح اسلامی دستور منظور ہو جائے۔ اور قادیانیوں کا مسئلہ بھی ترتیب دستور کے دوران ہی میں حل کر لیا جائے۔ جماعت کے اس خیال کا اظہار مجلس شوریٰ کی قرارداد مورخہ ۲۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں کر دیا گیا تھا۔ احرار نے جولائی ۱۹۵۲ء میں تمام مذہبی جماعتوں کی ایک کنونشن منعقد کی جس کا دعوت نامہ جماعت اسلامی کو بھی موصول ہوا جس نے مولانا امین احسن اصلاحی اور ملک نصر اللہ خاں عزیز کو اس کام پر مقرر کیا کہ کنونشن میں شامل ہو کر جماعت کے نقطۂ نگاہ کو پیش کریں۔ کنونشن میں ایک مجلسِ عمل

مرتب کی گئی جس میں دو نشستیں جماعت اسلامی کو پیش کی گئیں۔ لیکن جماعت نے ان کو قبول نہ کیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اُن تینتیس علما میں شامل تھے جو مجلس اصول اساسی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لئے جنوری ۱۹۵۳ء میں کراچی جمع ہوئے تھے۔ اس رپورٹ کی ترمیمات میں ایک ترمیم یہ تھی کہ قادیانی بھی ان اقلیتوں میں شامل کئے جائیں جن کے لئے جداگانہ انتخاب اور جداگانہ نشستیں محفوظ کی جائیں گی۔ جنوری کے وسط میں ایک آل مسلم پارٹیز کنونشن بمقام کراچی منعقد کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ تحفظ ختم نبوت کے مسئلے پر غور کیا جائے۔ اس میں ایک مرکزی مجلس کے قیام کی تجویز خود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے پیش کی تھی لیکن ۲۶ فروری تک مجلس عمل کا کوئی اجلاس نہ ہوا۔ باقی سات ممبر بھی شامل نہ کئے گئے۔ اس لئے کنونشن کی ممبر جماعتوں نے ۱۷ جنوری سے ۲۷ فروری تک جو کارروائی بھی کی وہ سب ناجائز تھی۔ چنانچہ اُس وفد کی ترتیب جو ۲۲ جنوری کو وزیر اعظم سے ملا۔ پھر ایک مہینے کا نوٹس۔ پھر راست اقدام کا اعلان اور پھر وہ قدم جو پنجاب میں راست اقدام کے سلسلے میں اٹھائے گئے۔ یہ سب کارروائیاں ناجائز اور خلاف آئین تھیں۔ جب ۱۳ فروری کو لاہور میں پنجاب کی مجلس عمل کا اجلاس ہوا۔ تو مولانا نے ملک نصراللہ خاں عزیز کی وساطت سے تحریری اعتراضات بھیج کر ان بے ضابطگیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ اور مطالبہ کیا کہ مرکزی مجلس عمل کا اجلاس طلب کیا جائے۔ اور اس اثنا میں تمام کارروائیاں معطل رکھی جائیں۔ اس پر یہ فیصلہ ہوا کہ مرکزی مجلس عمل کا ایک اجلاس ۱۷ فروری کو طلب کیا جائے لیکن کوئی اجلاس منعقد نہ ہوا۔ اور مولانا نے دوبارہ میاں طفیل محمد اور ملک نصراللہ خاں عزیز کی وساطت سے مجلس عمل کے پاس تحریری اعتراض ارسال کیا۔ اس کے بعد ۲۶ فروری کو مرکزی مجلس عمل کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں جماعت کی طرف سے مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی وسندھ شامل ہوئے۔ مولانا نے ان کو حکم دیا کہ بے ضابطگیوں کے خلاف ان کے تحریری اعتراضات اس مجلس کو پہنچا دیں اور راست اقدام کے پروگرام کو منسوخ کر دینے کا مطالبہ کریں۔ مولانا سلطان احمد کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ اگر مرکزی مجلس عمل اس کو منظور نہ کرے تو وہ جماعت اسلامی کو اس کی کارروائی سے علیحدہ کر لیں لیکن کراچی میں خود مرکزی مجلس عمل ہی توڑ دی گئی اور اس کی جگہ ایک راست اقدام کمیٹی بنائی گئی جس نے دوسرے ہی دن راست اقدام کا اعلان کر دیا۔ جماعت اسلامی کا کوئی ممبر اس راست اقدام کمیٹی کا ممبر نہ تھا۔ جماعت نے مجلس شوریٰ منعقدہ ۴ - ۵ مارچ میں ایک قرارداد منظور کی جس میں اپنے آپ کو راست اقدام سے بے تعلق ظاہر کیا۔ مولانا کے تحریری بیان کا باقی حصہ وہی ہے جو جماعت کا ہے۔

اب گویا مجلس عمل پنجاب اور احرار ایک طرف اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی دوسری طرف ہیں اور فریقین کے درمیان امر تنقیح طلب یہ ہے کہ آیا جماعت اسلامی راست اقدام کی قرارداد میں اور پھر اس قرارداد کے مطابق اقدام میں شامل تھی یا نہیں۔ ہم نے اس مرحلے پر دونوں فریقوں کے درمیان صرف نکاتِ اختلاف کو بیان کر دیا ہے جس وقت ہم ذمہ داری کے مسئلے کو لینگے تو کیس کے اس حصے کی پوری شہادت پر بحث کرینگے۔ تاکہ یہ امر متعین ہو جائے کہ راست اقدام کی قرارداد اور اس کے پروگرام کی وجہ سے جو فسادات ہوئے۔ ان کی ذمہ داری جماعت اسلامی پر کس حد تک عائد ہوتی ہے۔

وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ سے مزید ملاقاتیں

خواجہ ناظم الدین ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور آئے۔ اس وقت ایک وفد اُن سے یہ دریافت کرنے کے لئے ملا کہ وہ مطالبات کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس وفد میں مولانا اختر علی خاں، مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، سید مظفر علی شمسی، ماسٹر تاج الدین انصاری اور حافظ خادم حسین شامل تھے خواجہ ناظم الدین نے جواب دیا کہ ان کی راہ میں بعض مشکلات حائل ہیں جن کا علم ارکانِ وفد کو نہیں۔ اور اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ مطالبات تسلیم نہیں کئے جا سکتے۔ تاہم انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر وہ مزید گفت و شنید کے خواہاں ہوں۔ تو کراچی آ سکتے ہیں۔

۲۰ فروری کو ایک اور وفد جس میں مولانا محمد بخش مسلم، صوفی غلام محمد ترنم، سید مظفر علی شمسی اور حافظ کفایت حسین شریک تھے وزیر اعلیٰ پنجاب سے ملا اور انہیں احمدیوں کے خلاف وہ شکایات یاد دلائیں جن کا تدارک صوبائی حکومت کر سکتی ہے۔ وزیر اعلیٰ نے جواب دیا کہ وہ اس معاملے کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں۔

۲۱ فروری ۱۹۵۳ء کو علما کا ایک اور وفد خواجہ ناظم الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس میں مولانا سلیمان ندوی۔ مولانا احتشام الحق تھانوی، مفتی محمد شفیع۔ مولانا اختر علی خاں اور مولانا عبدالحامد بدایونی شامل تھے۔ ارکان وفد نے خواجہ صاحب کو بتایا کہ الٹی میٹم کا ایک مہینہ گزر چکا ہے اور انہوں نے مطالبات کے متعلق اب تک کوئی جواب نہیں دیا۔ اس ملاقات میں سردار عبدالرب نشتر بھی موجود تھے۔ گفتگو کے دوران میں مولانا احتشام الحق نے کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھ کر دوسروں کو دکھایا جس پر مولانا عبدالحامد بدایونی کے سوا باقی سب نے قبولیت کے اظہار کے طور پر سر ہلائے۔

دوسرے دن مولانا عبدالحامد بدایونی کی طرف سے خواجہ ناظم الدین کو ایک ٹیلیفون موصول ہوا۔ جس میں مولانا نے بتایا کہ پنجاب کے بعض علما خواجہ صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ اور جو علما اس سے پہلے دن خواجہ صاحب سے مل چکے ہیں۔ ان کو علمائے پنجاب کی ملاقات کے وقت طلب نہ کیا جائے۔ اسی دن کسی دوسرے وقت پر مولانا عبدالحامد بدایونی خواجہ ناظم الدین کے ہاں پہنچے۔ اس وقت ماسٹر تاج الدین انصاری۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری اور سید مظفر علی شمسی ان کے ساتھ تھے۔ سردار عبدالرب نشتر اس ملاقات کے وقت بھی موجود تھے۔ مولانا اختر علی خاں بہاولپور جا چکے تھے۔ جب ان سے کراچی آنے کے لئے ٹیلیفون کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں کراچی صرف اس صورت میں آ سکتا ہوں کہ میرے لئے گورنر جنرل کا ڈائیکنگ طیارہ بھیجا جائے۔ اس ملاقات میں بھی مطالبات کا اعادہ کیا گیا لیکن اس دفعہ ارکانِ وفد کو زیادہ واضح طور پر بتا دیا گیا کہ نہ مطالبات تسلیم کئے جا سکتے ہیں اور نہ خواجہ ناظم الدین ان کو دستور ساز اسمبلی میں پیش کرنے پر آمادہ ہیں۔

ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ

۲۶ فروری ۱۹۵۳ء کو مرکزی مجلس عمل کا ایک اجلاس کراچی میں ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل اشخاص حاضر تھے

(۱) ماسٹر تاج الدین انصاری (۲) صاحبزادہ فیض الحسن (۳) سید نور الحسن بخاری
(۴) مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی سندھ و کراچی (۵) مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد قادری
(۶) مولانا محمد عبدالحامد بدایونی (۷) مولانا احتشام الحق تھانوی (۸) سید عطاء اللہ شاہ بخاری
(۹) مولانا محمد یوسف کلکتوی (۱۰) سید مظفر علی شمسی

اس اجلاس کی صدارت مولانا ابوالحسنات نے کی۔ اس میں اس مطلب کی ایک قرارداد منظور کی گئی کہ ۱۸ جنوری کی کنونشن میں مرکزی حکومت کو جو نوٹس دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ وہ چونکہ مجلس عمل کے ایک وفد نے اس حکومت کے حوالے کر دیا تھا اور ۲۲ فروری کو اس نوٹس کی میعاد ختم ہو گئی ہے ، بلکہ مزید چار دن بھی گزر چکے ہیں۔ اس لئے اب پُرامن راست اقدام کی شکل کا فیصلہ کیا جانا ضروری ہے راست اقدام کی شکل کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ پانچ رضا کار جو ایسے جھنڈے اُٹھائے ہوئے ہونگے جن پر مطالبات ثبت ہونگے ، شارع عام پر سے نہیں ، بلکہ چھوٹی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے وزیر اعظم کی کوٹھی پر جائیں گے اگر وہاں سنتری ان رضا کاروں کو روکے گا تو وہ اس سے کہیں گے کہ وہ وزیر اعظم کی خدمت میں مطالبات پیش کرنے اور ان کو تسلیم کرنے کی درخواست کرنے آئے ہیں اور وہ اسی صورت میں واپس جائیں گے کہ وزیر اعظم ان مطالبات کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیں۔ اگر یہ رضا کار گرفتار کر لئے جائینگے تو مجلس عمل پانچ رضا کاروں کا ایک اور دستہ بھیج دیگی۔ اور یہ سلسلہ پُرامن طریقے پر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک مطالبات تسلیم نہ کئے جائیں گے۔ گورنر جنرل کی کوٹھی پر بھی اسی قسم کا پہرہ لگایا جائے گا۔ تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس تحریک کا رُخ خواجہ ناظم الدین کی طرف محض اس لئے ہے کہ وہ بنگالی ہیں۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد اس متبرک تحریک کے ڈکٹیٹر مقرر کئے گئے۔ اور انہیں گرفتاری کی صورت میں اپنے جانشین کی نامزدگی کا اختیار دیا گیا۔ یہ بھی قرار دیا گیا کہ اسی دن شام کو آرام باغ میں جو جلسہ عام ہو رہا ہے اس میں عوام کو یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ حسب معمول اپنے کاروبار میں مصروف رہیں۔ اور رضا کاروں کے ساتھ نہ جائیں۔

ڈائرکٹ ایکشن کی دھمکی کے مقابلے کی تیاریاں

پنجاب میں یہ اطلاعات موصول ہونے لگیں کہ ڈائرکٹ ایکشن کی دھمکی عمل میں لائی جا رہی ہے اور عنقریب سول نافرمانی کی پوری تحریک کا آغاز ہونے والا ہے۔ ۱۶ فروری یا اس کے لگ بھگ سی آئی ڈی برانچ پنجاب کو انٹیلی جنس بیورو کراچی کی طرف سے مندرجہ ذیل اطلاع موصول ہوئی :-

"انٹیلی جنس بیورو حکومت پاکستان
کراچی - ۱۴- فروری ۱۹۵۳ء

گشتی یادداشت

ذرائع خبر رسانی کی ایک رپورٹ جو کسی قدر قرین حقیقت معلوم ہوتی ہے مظہر ہے

کہ تحریک ختم نبوت کے علم بردار پنجاب اور کراچی میں ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء سے اپنے پانچ مطالبات کے سلسلے میں سول نافرمانی کی ایک تحریک جاری کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ان کے مطالبات یہ ہیں: (۱) عزت مآب چودھری ظفراللہ خاں کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے (۲) قادیانیوں کو ایک اقلیت قرار دیا جائے (۳) قادیانیوں کو جو اراضی ربوہ میں دی گئی ہے وہ ان سے واپس لے کر مہاجرین کی آبادکاری میں صرف کی جائے (۴) قادیانیوں کو حکومت کے کلیدی عہدوں سے الگ کر کے ان کی جگہ مسلمان مقرر کئے جائیں (۵) دستور پاکستان خالص اسلامی خطوط پر وضع کیا جائے۔

۲۔ اس شورش کے سلسلے میں پہلا شخص جو پنجاب میں اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریگا وہ غالباً صاحبزادہ پیر فیض الحسن ہوگا جس کے تیس ہزار مرید ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے تمام مرید اس تحریک میں اس کی پیروی کریں گے۔

۳۔ کراچی میں لال حسین اختر کے بجائے جو ایک اطلاع کے مطابق اب نامقبول ہو چکا ہے کیونکہ اس نے پچھلے سال کوئی چوبیس ہزار روپیہ صرف کر دینے کے باوجود کوئی کامیابی حاصل نہیں کی۔ ایک شخص محمد جوہر نائب ناظم اعلیٰ جماعت ختم نبوت اس شورش کے آغاز کے منصوبوں کی تکمیل کریگا لیکن محمد جوہر اس عمل کو شروع کرنے میں مشکلات محسوس کر رہا ہے کیونکہ رضاکار کافی تعداد میں دستیاب نہیں ہوتے۔ آئندہ چند روز کے دوران میں اس کی واحد کوشش یہی ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ رضاکار بھرتی کرے۔ جو اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر سکیں۔ کل اس نے ایک شخص نیاز احمد کو بولٹن مارکٹ کی میمن مسجد میں جمعہ کے نمازیوں کے سامنے تقریر کرنے کے لئے بھیجا لیکن نیاز احمد تقریر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ خداداد اور قائد آباد کالونیوں کے بعض باشندوں کے متعلق اطلاع ملی ہے کہ وہ بطور رضاکار بھرتی ہوئے ہیں لیکن ان کی پوری تعداد اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔ تجویز یہ ہے کہ آئندہ چند روز کے اندر جہانگیر آباد میں جو عثمانیہ کالونی کے قریب ہے رضاکاروں کو بھرتی کرنے کی غرض سے ایک جلسہ منعقد کیا جائے۔

۴۔ معلوم ہوا ہے کہ محمد علی جالندھری نے ہدایت جاری کی ہے۔ اور رضاکاروں کو حکم دیا ہے کہ ۲۱ اور ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء کی درمیانی نصف شب کے وقت روانگی کے لئے تیار ہو جائیں۔

۵۔ ذریعہ خبررسانی کی اطلاع مذکورہ بالا ان اقدامات کے متعلق ہے جن کا منصوبہ کراچی میں تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوا کہ پاکستان کے دوسرے مقامات پر کیا منصوبے تیار کئے گئے ہیں لہذا استدعا کی جاتی ہے کہ تمام صوبوں کی سی آئی ڈی ازراہ نوازش ضروری اقدام کی غرض سے فوری تحقیقات کرے۔

مندرجہ ذیل "انتہائی خفیہ" "نہایت فوری" اور مرموز حروف میں ایک تار "فارن کراچی" کی طرف سے ۱۹ فروری ۱۹۵۳ء کو پنجاب میں موصول ہوا:۔

"زمیندار" اور "آزاد" لاہور میں عنوانات مضامین اور تبصروں کے ذریعے سے احمدیوں کے

۱۴۷

خلاف شورش کو برابر تیز کیا جارہا ہے بعض تازہ مثالیں یہ ہیں: "زمیندار" مورخہ ۱۶ و ۱۷ فروری میں علی الترتیب، مقالہ افتتاحیہ اور احمدیوں کے خلاف مضامین درج ہیں اور ۴، ۸ اور ۱۱ فروری کے "آزاد" میں ایک سلسلہ مضامین اور نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ اس سے قبل "آزاد" میں جو قابل اعتراض مضامین شائع ہو چکے ہیں ان کی طرف صوبائی حکومت کو توجہ دلائی جا چکی ہے۔

۲۔ اب ایک اطلاع ہمارے علم میں آئی ہے کہ احمدیوں کے مخالف عناصر پنجاب میں اپنی شورش کو تیز تر کرنے کی غرض سے ۲۲ فروری سے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں گے۔ مرکزی حکومت کو مسرت ہوگی اگر صوبائی حکومت اس اطلاع پر اپنے خیالات ظاہر کرے۔ اور مرکزی حکومت کو یقین ہے کہ اخبارات کو شورش کی آگ بھڑکانے سے روکنے کی ضروری تدابیر اختیار کی جائیں گی"۔

اس تار کے موصول ہونے پر چیف منسٹر، ہوم سیکرٹری اور مسٹر انور علی نے (جو اب مسٹر قربان علی خان کی جگہ انسپکٹر جنرل پولیس تھے) گفت و شنید کی جس کا نتیجہ ۲۰ فروری ۱۹۵۳ء کو مسٹر انور علی نے ان الفاظ میں قلمبند کیا:-

"اس کیس پر آج صبح میں نے اور ہوم سیکرٹری نے چیف منسٹر صاحب سے گفتگو کی۔ چیف منسٹر صاحب نے مسودے میں جو ترمیمات تجویز کیں وہ کر دی گئی ہیں۔ کیا چیف سیکرٹری صاحب از راہ کرم اس پر دستخط کر دیں گے۔ تا کہ اسے فوراً جاری کر دیا جائے؟

۲۔ چونکہ پرسوں اتوار ہے۔ اس لئے ممکن ہے کراچی میں مسودے پر کارروائی میں تاخیر ہو جائے اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ تار موصولہ ۱۹ فروری ۱۹۵۳ء کے جواب میں ایک مرقومہ تار بھیج دیا جائے۔ مسودہ شامل ہے۔

۳۔ چیف منسٹر صاحب کی تجویز ہے کہ ذیل کے خطوط پر مزید کارروائی کی جائے:-

(۱) گزشتہ مہینے دو مہینے کے اندر صوبے میں جو مکروہ واقعات رونما ہوئے ہیں اور جن کا ذکر حکومت پاکستان کی چٹھی میں کیا گیا ہے ان کی مناسب اشاعت ہونی چاہئے۔ چیف منسٹر کی خواہش ہے کہ ہوم سیکرٹری "آفاق" "مغربی پاکستان" اور "احسان" کے ایڈیٹروں کو طلب کر کے انہیں مناسب ہدایات دیں۔ ان کی یہ بھی خواہش ہے کہ ڈی پی آر صاحب "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے ایڈیٹر سے بات کر کے ان کو مشورہ دیں کہ وہ صورت حالات کے متعلق زیادہ مقصدی انداز میں ایسے مضامین لکھیں جن سے عوام بہت زیادہ بے رخی کا اظہار نہ کریں۔

(۲) آل پارٹیز مسلم کنونشن کے جن کارکنوں نے اس شورش کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ان کو ہوم سیکرٹری صاحب طلب کریں اور بتائیں کہ ان کی شورش اب پُرامن نہیں رہی اور ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن سے عوام کے دلوں میں حقیقتاً خوف و دہشت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔

ان کو یہ بھی بتا دیا جائے کہ اگر امن و قانون کی حدود کو توڑا گیا تو صوبائی حکومت اس کے لئے براہِ راست اس شورش کے علم برداروں کو ذمہ دار قرار دیگی۔

(iii) چیف سیکرٹری صاحب ڈائرکٹر تعلقات عامہ کو ہدایت دیں کہ وہ مولانا ابوالحسنات مولانا ترنم اور مولانا محمد بخش مسلم کو طلب کر کے انہیں ایسی تقریریں کرنے سے پرہیز کا مشورہ دیں جن میں عوام کو قانون و انتظام کی خلاف ورزی پر اکسایا گیا ہو۔ ڈائرکٹر تعلقات عامہ مولانا اختر علی خاں کو علیحدہ طلب کر کے اُن سے مناسب گفتگو کریں۔

۴۔ ہوم سیکرٹری نے اس یادداشت کو پڑھ لیا ہے اور وہ اس کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ چیف سیکرٹری صاحب ازراہ کرم ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ کو ہدایات دے دیں"۔

جو مرموز (سائیفر) تار ۱۹۔ فروری کو کراچی سے موصول ہوا تھا۔ اس کے جواب میں چیف سیکرٹری نے ۲۱۔ فروری کو مندرجہ ذیل تار ارسال کیا:۔

"جس شورش کی دھمکی دی گئی ہے وہ غالباً کراچی میں شروع کی جائیگی لیکن اس کے اثرات اس صوبے (پنجاب) اور دوسرے صوبوں میں بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ صوبائی حکومت صورت حالات سے برابر مطلع ہے۔ آپ کی رہنمائی حاصل کرنے کی غرض سے مفصل چٹھی آج ارسال کی جا رہی ہے"۔

اس تار کے ساتھ چیف منسٹر کی منظوری سے مندرجہ ذیل چٹھی بھی ارسال کی گئی:۔

"نمبر 2249-BDSB
پنجاب سول سیکرٹریٹ لاہور
۲۱۔ فروری ۱۹۵۳ء

مکرمی احمد صاحب

ازراہ کرم غیاث الدین احمد کی ڈی او چٹھی نمبر BDSB-14682 مورخہ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء بنام حمید الدین احمد جو احمدی احرار شورش کے موضوع پر لکھی گئی تھی بغرض حوالہ پیش نظر رکھ لیجئے۔

۲۔ کچھ وقت کے لئے شورش کی رفتار نرم پڑ گئی تھی لیکن حال ہی میں عوام کی دلچسپی کو تیز کرنے کی کوششیں خاصی شدت کے ساتھ دوبارہ جاری کر دی گئی ہیں۔ صوبے بھر میں بے شمار کانفرنسیں اور جلسے منعقد کئے گئے ہیں اور آتش ریز تقریریں کی گئی ہیں۔ ملاؤں کی تائید و حمایت حاصل کر لی گئی ہے اور احمدیوں کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے۔ گوجرانوالہ میں مطبوعہ اشتہارات نشر کئے گئے جن میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ احمدیوں سے اچھوتوں کا سا سلوک کیا جائے اور کھانے پینے کی چیزوں کی دکانوں پر ان کے لئے علیحدہ برتن رکھے جائیں۔ کچھ مدت تک ضلع گوجرانوالہ میں اس امر پر بھی زور دیا گیا ہے کہ احمدیوں کو مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ صرف پولیس کی مداخلت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایسے واقعات نہ ہونے پائے۔ احمدیوں نے جو اس نئی حرکت سے بہت زیادہ مضطرب ہو گئے تھے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو درخواست دی کہ انہیں اپنا علیحدہ قبرستان بنانے کے لئے زمین الاٹ کی جائے۔ یکم فروری ۱۹۵۳ء کو سرگودھا میں مسلمانوں کے قبرستان میں ایک احمدی میت کی تدفین کے خلاف مزاحمت کی گئی۔ پولیس موقع پر پہنچ گئی

جس سے صورت حالات پر قابو پا لیا گیا۔ احمدیوں کے مجلسی مقاطعہ کی تلقین کھلم کھلا کی جا رہی ہے منٹگمری میں ایک مقرر نے کہا کہ احمدیوں کی دکانوں پر پکٹنگ کیا جائے اور ان کو عوامی کنوؤں سے پانی بھرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ شورش کا لہجہ قطعی طور پر نہایت پست اور مبتذل صورت اختیار کر گیا ہے۔ صوبے بھر میں رضا کاروں کی بھرتی کے لئے ایک مہم کا آغاز کر دیا گیا ہے اور صاحبزادہ فیض الحسن پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا ہے۔ رضا کاروں سے ایک حلف نامے پر دستخط کرائے جاتے ہیں کہ اگر رسول پاک کی عزت کے لئے جان دینے کی ضرورت پڑیگی۔ تو وہ اس میں دریغ نہ کرینگے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض رضا کاروں نے حلف نامہ اپنے خون سے لکھ کر پیش کیا ہے۔ لاہور میں کوئی ڈیڑھ سو اشخاص بھرتی ہوئے ہیں صوبے کے دوسرے حصوں میں اب تک جو رضا کار بھرتی ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد کا اندازہ پانسو کے قریب کیا جاتا ہے۔ صوبے بھر میں پچاس ہزار رضا کاروں کو بھرتی کرنا مقصود ہے۔ ماسٹر تاج الدین انصاری (صدر آل پاکستان مجلس احرار) سید مظفر علی شمسی (سکرٹری ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ) اور صاحبزادہ فیض الحسن کا رویہ خصوصاً جارحانہ ہو رہا ہے۔

۳۔ آل مسلم پارٹیز کنونشن جو گزشتہ ماہ جولائی میں احراریوں نے مرتب کی تھی۔ اس کا ایک اجلاس ۱۶۔ جنوری سے ۱۸ جنوری تک کراچی میں منعقد ہوا جس میں حسب معمول مطالبات کی قرار دادیں منظور کی گئیں۔ اس کنونشن کے مندوب جب سے پنجاب واپس آئے ہیں۔ ان کا طرز عمل پہلے کی نسبت زیادہ سرکشانہ ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کراچی میں علما کی کانفرنس نے احمدیوں کو ایک اقلیت قرار دینے کی جو حمایت کی۔ اس سے ان لوگوں کو بہت تقویت پہنچی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وزیر اعظم نے جن سے وہ ملاقات کر چکے ہیں۔ ان کے مطالبات سے ہمدردی نہیں کی۔ لہٰذا انہوں نے صاحب موصوف کو الٹی میٹم دے دیا ہے کہ وہ ۲۳ فروری کو راست اقدام کرینگے وہ ظاہر کر رہے ہیں کہ کراچی کے عوام ان کے حامی ہیں اور اگر تحریک شروع کی گئی تو وہ جوق در جوق اس کی حمایت کرینگے۔ وہ مرکزی حکومت کے ارکان پر الزام عائد کر رہے ہیں کہ انہوں نے وعدے کئے لیکن ان کا ایفا نہ کیا۔ کراچی سے مندوبین کی واپسی کے بعد اس شورش میں ایک نئے پہلو کا اضافہ ہو گیا ہے یعنی عزت مآب وزیر اعظم پاکستان کے خلاف بدگوئی اور دشنام طرازی کی مہم شروع کر دی گئی ہے۔ شورش کے ابتدائی مرحلوں میں سر ظفر اللہ خاں کی موقوفی کا مطالبہ کیا جاتا تھا لیکن اب بعض مقررین یہ کہہ رہے ہیں کہ عزت مآب وزیر اعظم کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانا چاہئے۔

۴۔ کہا جاتا ہے کہ "ڈائرکٹ ایکشن" کراچی میں شروع کیا جائیگا اور اس کے لئے رضا کار پنجاب اور دوسرے صوبوں سے بھیجے جائینگے "ڈائرکٹ ایکشن" احمدیوں کی دکانوں پر پکٹنگ کی شکل اختیار کریگا۔ یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت احکام جاری کئے گئے تو ان کی خلاف ورزی کی جائے گی۔ مطالبات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سر ظفر اللہ خاں کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔

(ii) احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔
(iii) جو احمدی حکومت کے کلیدی عہدوں پر قابض ہیں ان کو ان عہدوں سے موقوف کیا جائے۔

۵۔ اس شورش کو جماعت اسلامی۔ اہلسنت والجماعت، اہلحدیث اور شیعوں کی حمایت حاصل ہے پیر صاحب گولڑہ شریف (ضلع راولپنڈی) پیر صاحب سیال شریف (ضلع سرگودھا) پیر صاحب علی پور سیداں (ضلع سیالکوٹ) پیر شوکت حسین (سجادہ نشین پیر صاحب ملتان) اور بعض دیگر حضرات نے اس شورش کو برکت کی دعا دی ہے سرمایہ جمع کیا جا رہا ہے۔ اور ایک روپے کے نوٹ چھاپ کر فروخت کئے جا رہے ہیں۔ بازاری اور غنڈا عناصر نے بھی شورش پسندوں کی تائید و حمایت اختیار کر لی ہے۔ آزاد پاکستان پارٹی کی شاخ بہاولپور نے شورش پسندوں کو ایک ہزار روپے کی رقم عطا کی ہے۔

۶۔ جب یہ معلوم ہوا کہ عزت مآب وزیر اعظم ۱۶۔ تاریخ کو لاہور آ رہے ہیں تو ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جس میں اعلان کیا گیا کہ وزیر اعظم کے ورود کی تاریخ کو ہڑتال کی جائے اور مکانوں کی چھتوں پر کالی جھنڈیاں لگائی جائیں مقررین نے احتیاطاً اس بات پر زور دیا کہ تشدد سے کام نہ لیا جائے لیکن علاوہ عوام کے احساسات کو مشتعل کرنے میں برابر مصروف رہے بعض مقررین نے اپنی تقریروں میں کہا کہ نافرمانی شروع ہونے کی حالت میں پولیس کے جن ملازموں کو گرفتاریاں کرنے کا حکم دیا جائے انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ روز قیامت انہیں اُن افعال کیلئے جوابدہی کرنی پڑیگی جو ان کے فرائض مذہبی کے منافی ہونگے۔ ۱۶۔ تاریخ کی صبح کو سکولوں کے لڑکوں اور بازار کے لونڈوں کے دستے اِدھر اُدھر بھیجدئے گئے اور دکانداروں کو دکانیں بند کرنے کی ہدایت کی گئی۔ بہت سے لوگ اپنی دکانیں کھلی رکھنا چاہتے تھے لیکن ان کو دھمکایا گیا۔ اور وہ غریب اُن لڑکوں اور دوسرے لوگوں کے سامنے جو بازاروں میں چکر کاٹ رہے تھے عاجز آ کر دکانیں بند کرنے پر مجبور ہوگئے۔ چند سکول بھی بند کر دئے گئے۔ دو ایسے واقعات بھی ہوئے جن میں تشدد اور خونریزی تک نوبت پہنچ گئی۔ ایک واقعہ دیال سنگھ کالج کے باہر اور دوسرا تعلیم الاسلام کالج (احمدیوں کی درسگاہ) میں رونما ہوا۔ جب ان کالجوں کے طلبہ نے ہڑتال کرنے سے انکار کیا۔ تو طرفین کی طرف سے خشت باری ہوئی اور لوگ زخمی ہوئے۔ سر ظفر اللہ خاں کا ایک جنازہ بھی نکالا گیا اور متعدد چھوٹے چھوٹے جلوس بازاروں میں چکر لگانے لگے۔ پابندِ قانون شہری ان مظاہروں کو پسند نہ کرتے تھے لیکن محض اس خوف سے ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرتے تھے کہ مبادا ان کو بھی احمدی قرار دیدیا جائے۔

۷۔ کہا گیا ہے کہ کراچی میں "ڈائرکٹ ایکشن" شروع کرنے کیلئے آخری تاریخ ۲۳۔ مقرر کی گئی تھی۔ احراری لیڈروں نے عوام کے غیظ و غضب کو اس حد تک مشتعل کر دیا ہے کہ اب ان کیلئے پیچھے ہٹنا بعد مشکل ہے وہ بڑی تیز و تند اور جنگجویانہ تقریریں کرتے رہے ہیں اور انہیں محض اپنی عزت سلامت رکھنے کی خاطر بھی ۲۳ تاریخ کو کوئی نہ کوئی ڈرامائی اقدام کرنا پڑے گا۔

۸۔ لاہور میں قریب قریب ہر شب کو جلسے ہو رہے ہیں جن میں احمدیوں کے خلاف عوام کے احساسات کو

مشتعل کرنے کے لئے تقریریں کی جاتی ہیں۔ ۱۶ تاریخ کو بعض دکانداروں کے منہ کالے کر دئے گئے کیونکہ انہوں نے دکانیں بند کرنے سے انکار کیا تھا۔ دیال سنگھ کالج کے قریب مظاہرین نے ایک موٹر کار کو بھی کسی قدر نقصان پہنچایا۔ ۱۸ تاریخ کو نارتھ ویسٹرن ریلوے کی ورکشاپ میں ایک احمدی جو کئی روز سے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ غصے میں بھر گیا اور اس نے ایک غیر احمدی کو لوہے کی ایک سلاخ مار کر بیہوش کر دیا۔ اُس وقت سے یہ احمدی مفرور ہے۔ اور اس کا کوئی نام پتہ معلوم نہیں۔ لاہور میں ایک ڈپو ہولڈر نے ایک احمدی عورت کے ہاتھ گیہوں فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور آخر اُس وقت مہربان ہوا جب عورت نے یہ وعدہ کر لیا۔ کہ احمدیوں کے خلاف جو تحریک شروع کی جائیگی وہ اس میں شامل ہو گی سنت نگر کے پرائمری سکول کے ایک طالب علم کو اس کے ہم جماعتوں نے گھیر لیا۔ اس کو تھپڑ مارے۔ اور 'مرزائی کتا' کے نعرے لگائے۔

۹۔ یہ شورش صرف اسی صوبے تک محدود نہیں۔ نہ وہ مطالبات جن پر بظاہر یہ شورش مبنی ہے صوبائی حکومت کے دائرہ اختیار میں داخل ہیں۔ اس لئے حکومت کو اس صورت حالات کا مداوا کرنے میں سخت دقت محسوس ہو رہی ہے۔ اور وہ سمجھتی ہے کہ اگر مرکزی حکومت ان مطالبات کے متعلق ایک مضبوط پالیسی اختیار کرنے کا اعلان کرے۔ تو صوبائی حکومت کے ہاتھ کافی مضبوط ہو جائینگے۔ وہ پالیسی کچھ بھی ہو لیکن اس کے اعلان کے بعد کسی کو اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔ کہ حکومت پاکستان کا ارادہ کیا ہے۔ اور وہ کیا رویہ اختیار کرنا چاہتی ہے صوبائی حکومت محسوس کرتی ہے۔ کہ وہ صوبے کے اندر اس پالیسی پر عمل درآمد کرنے کے لئے کافی طاقتور ہے۔

آپ کا مخلص

(دستخط) ایچ۔ اے۔ مجید

بخدمت جی۔ احمد۔ اسکوائر

سیکرٹری حکومت پاکستان۔ وزارت داخلہ۔ کراچی"

اسی دن مسٹر انور علی انسپکٹر جنرل پولیس نے چیف سیکرٹری کو یہ یادداشت لکھ کر ارسال کی:۔

"حکومت غالباً اس تقریر کی روداد پر مطلع ہونے کی خواہاں ہو گی۔ جو مولوی محمد علی جالندھری نے ۱۵ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور کے ایک جلسے میں کی۔ ایک بات خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے۔ کہ ایک دفعہ زور فصاحت میں اس مقرر نے اعتراف کیا۔ کہ وہ اور ان کی جماعت تقسیم ملک کے مخالف تھے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جن وجوہ کی بنا پر وہ تقسیم کے خلاف تھے۔ وہ لوگوں پر ظاہر ہو جانے چاہئیں لیکن اگر اب تک انہیں ان کا شعور حاصل نہیں ہوا تو ایک یا دو سال کے اندر انہیں سب معلوم ہو جائیگا۔ اس نے حکومت کی شدید مذمت کی۔ اور اس کے حملوں کا سب سے بڑا ہدف وزیر اعظم پاکستان تھے۔ اس جلسے میں مقررین نے پنجاب اور صوبہ سرحد کے چیف منسٹروں کو بھی برا بھلا کہا۔ وزیر اعظم پاکستان کو کھلم کھلا مرزائی کہا جا رہا ہے۔ ایک اور جلسے میں عطاء اللہ شاہ بخاری نے اُن کو 'ہم الذین الحمقون' کہا۔ ان تقریروں کی خصوصیت صرف تحقیر تھی۔

۲۔ جس زمانے میں غذا کی کمی ہو۔ بیروزگاری عام ہو۔ کاروبار کی کساد بازاری ہو اور کشمیر کے متعلق عام خیال یہ ہو کہ اس کو ہم کھو چکے ہیں۔ جو شخص بدنظمی اور ابتری پھیلانے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دوست نہیں ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ احرار اور دیگر علما جو ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں عوام کی توجہ کو ان سنگین مسائل کی طرف سے جو آج ملک کو درپیش ہیں منحرف کرنے میں خاص طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔ اس ابتری کی وجہ سے عوام کا وہ عزم کمزور ہو جائیگا جو ان مسائل کا مقابلہ اور ان کا مداوا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ہمارے پاس اس امر کی شہادت موجود ہے کہ احرار نے آزاد پاکستان پارٹی کی شاخ بہاولپور سے روپیہ لیا۔ یہ لوگ پاکستان کی بیخ کنی کر رہے ہیں حکومت کو کمر ہمت باندھ کر اس خطرے کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ حکومت پڑھے لکھے طبقے کی ہمدردی کھو چکی ہے اور اب غیر ملکی لوگ بھی یہ ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ حکومت غالباً اس بحران کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ جو علماء نے پیدا کر رکھا ہے۔ "لندن ٹائمز" کے نمائندے نے حکومت پنجاب کے ایک افسر سے یہ کہا۔ کہ مرکزی حکومت کمزور ہے اور موجودہ مسائل کے موثر مداوا کی قوت نہیں رکھتی۔ رات لاہور کے برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس ایسی اطلاعات موصول ہوئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کی صورت حالات بیحد تشویش انگیز ہے۔ اور ایک عام ہنگامہ عنقریب برپا ہونے والا ہے۔ حسین شہید سہروردی۔ ملک خضر حیات خان۔ اور نواب ممدوٹ برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر سے ملاقات کر چکے ہیں ہم نے مرکزی حکومت کو صورت حالات کی نزاکت سے مطلع کر دیا ہے۔ امید ہے کہ وہ کوئی مضبوط طرز عمل اختیار کرے گی۔

۳۔ مولوی محمد علی جالندھری پہلے بھی قابل اعتراض تقریریں کرتا رہا ہے۔ اور اس منشا کے احکام جاری کئے گئے تھے کہ اس نے منٹگمری میں جو تقریر کی تھی اس کی بنا پر اس کے خلاف زیر دفعہ ۱۲۴۔ الف مقدمہ چلایا جائے۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ کیس اب کس مرحلے میں ہے"۔

چونکہ اب یہ واضح تھا۔ کہ "ڈائرکٹ ایکشن" کسی وقت بھی عملی صورت اختیار کر لیگا۔ اسلئے مسٹر انور علی نے پولیس کے تمام سپرنٹنڈنٹوں اور سی آئی ڈی کے گروپ افسروں کو حکم دے دیا تھا کہ چوکنے رہیں۔ اور صورت حالات کا مطالعہ احتیاط سے کرتے رہیں۔ ان افسروں سے یہ استدعا بھی کی گئی تھی کہ رضاکاروں کی بھرتی کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ بعد میں جو اعداد و شمار موصول ہوئے۔ وہ مظہر تھے۔ کہ صوبے بھر میں پچپن ہزار سے زیادہ رضاکار بھرتی ہو چکے ہیں۔

جب وزیر اعظم پر یہ حقیقت واضح ہو گئی۔ کہ صورت حالات روز بروز نازک ہوتی جا رہی ہے۔ اور قانون و انتظام کو جو خطرہ درپیش ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ تدابیر فوری طور پر اختیار کرنی چاہئیں۔ تو انہوں نے مرکزی کابینہ کا ایک اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ پنجاب اور صوبہ سرحد کے نمائندوں کو بھی اس اجلاس میں شامل ہونے کی ہدایت کی گئی۔ چنانچہ یہ اجلاس ۲۶۔ فروری کی شام کو منعقد ہوا اور اس میں صوبہ سرحد سے خواجہ شہاب الدین گورنر اور خان عبدالقیوم خان وزیر اعلیٰ اور پنجاب سے مسٹر محمد حسین چٹھہ وزیر مال مسٹر غیاث الدین احمد ہوم سیکرٹری۔ اور مسٹر انور علی انسپکٹر جنرل پولیس شامل ہوئے مسٹر آئی آئی چندریگر گورنر پنجاب اور مسٹر ممتاز محمد خان دولتانہ وزیر اعلیٰ دونوں اس اجلاس میں مدعو کئے گئے تھے لیکن چونکہ انہیں لاہور میں بعض دوسری مصروفیتیں لاحق تھیں اس لئے وہ کراچی نہ جا سکے۔ لیکن انہوں نے وزیر مال پنجاب اور افسروں کو پوری ہدایات دے دیں۔ اور وہ پرواز کر کے کراچی پہنچ گئے۔ اس اجلاس کے مسائل زیر بحث یہ تھے: ایک تو وہ تین مطالبات جو ۲۲ جنوری ۱۹۵۳ء کو وزیر اعظم تک پہنچائے گئے تھے۔ دوسرے وہ خطرہ جو قانون و انتظام کو "ڈائرکٹ ایکشن" کے اس پروگرام سے لاحق ہو رہا تھا جو مرکزی مجلس عمل نے تجویز کر رکھا تھا پنجاب کے نمائندوں کو یہ

ہدایت کی گئی تھی۔ کہ مرکزی حکومت کو بتادیں کہ حکومت پنجاب کی رائے میں مطالبات غیر معقول ہیں۔ اور سختی سے ان کی مزاحمت ہونی چاہئے۔ کابینہ کا اجلاس ۹ بجے شب تک جاری رہا لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ بعد کی صبح کو دو بجے کابینہ کا ایک اور اجلاس طلب کیا گیا۔ کیونکہ یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ اسی دن صبح کو رضا کار گورنر جنرل اور وزیر اعظم کی کوٹھیوں پر پکٹنگ کریں گے۔ اس اجلاس میں گورنر سندھ۔ گورنر صوبہ سرحد۔ وزیر اعظم صوبہ سرحد چیف کمشنر اور انسپکٹر جنرل پولیس کراچی۔ سیکرٹری وزارت داخلہ اور ڈپٹی چیف آف سٹاف شریک تھے۔ اس میں مندرجہ ذیل فیصلے کئے گئے:۔

(۱) اس شورش کے تمام نمایاں لیڈر بشمول مولانا اختر علی خان مالک "زمیندار" گرفتار کر لئے جائیں۔

(۲) "آزاد"۔ "زمیندار" اور "الفضل" کی اشاعت روک دی جائے۔

(۳) مرزا بشیر الدین محمود احمد کو تنبیہ کی جائے کہ وہ ربوہ سے باہر نہ جائیں نہ کوئی ایسا فعل کریں جس سے ہیجان و اشتعال پیدا ہونے کا احتمال ہو۔

(۴) رضا کاروں کو کراچی آنے سے روکا جائے اور ان کے خلاف اسی سٹیشن پر کارروائی کی جائے جہاں سے وہ سوار ہوئے ہوں۔

ان فیصلوں سے مسلح ہونے کے بعد مسٹر چیمہ وزیر مال۔ مسٹر غیاث الدین احمد ہوم سیکرٹری اور مسٹر انور علی انسپکٹر جنرل پولیس اُسی دن لاہور واپس چلے آئے۔

ابتدائی تدابیر

مجلس عمل پنجاب جس دن سے قائم ہوئی تھی۔ اس نے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ تاکہ اگر حکومت سے تصادم ناگزیر ہو جائے تو بڑے پیمانے پر مقابلہ کیا جا سکے۔ چنانچہ جب ۲۲ جنوری کو وزیر اعظم کے سامنے الٹی میٹم پیش کیا گیا۔ اس وقت سول نافرمانی کا سارا ساز و سامان تیار تھا۔ رضا کار۔ سرمایہ۔ مورچے کے مقامات۔ مجالس عمل۔ ڈکٹیٹروں کی فہرست ہر چیز مکمل تھی۔ عوام حکومت اور احمدیوں کی نفرت سے لبریز تھے اور کسی قسم کی نظریاتی مزاحمت کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ڈائرکٹ ایکشن شروع کرنے کا اصلی فیصلہ ۲۶۔ جنوری کی رات کو کراچی میں علما نے کیا تھا۔ اور آدھی رات کے بعد صبح سے پہلے مرکزی حکومت نے اپنے آپ کو مجبور پایا کہ اس فیصلے کا مقابلہ کرے۔

جب پنجاب کے نمائندے ۲۷۔ فروری کو لاہور واپس آئے تو انہوں نے اپنی حکومت کو کراچی کے فیصلوں سے آگاہ کیا۔ مسٹر انور علی انسپکٹر جنرل پولیس نے ان فیصلوں اور مرکزی حکومت کی اختیار کردہ پالیسی کو عمل میں لانے کیلئے اپنی تجاویز کا مسودہ تیار کیا۔ یہ تجاویز ایک اجلاس میں پیش ہو کر منظور ہوئیں جس میں چیف منسٹر۔ وزیر مال۔ ہوم سیکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس۔ اے ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی اور سپرنٹنڈنٹ پولیس (A) سی آئی ڈی شریک تھے۔ تجاویز حسب ذیل ہیں:۔

"(۱) احراریوں کے تمام سرگرم کارکن اور دوسرے افراد جو ڈائرکٹ ایکشن کی حمایت کے ذمے دار ہیں (بروئے فہرست منسلکہ) آج رات صوبے بھر میں گرفتار کر لئے جائیں۔

(۲) لاہور کے سوا دوسرے اضلاع میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو اپنی صوابدید کے مطابق زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ یہ گرفتاریاں کرنی چاہئیں۔ لاہور میں نظر بندی کے احکام حکومت پنجاب کے حکم کے ماتحت جاری ہونے چاہئیں۔ بیرونی اضلاع کے افراد کی مزید نظر بندیوں کے احکام مناسب وقت کے اندر اندر حکومت کی طرف سے بھیج دئے جائیں گے۔

(iii) ذیل کے اخباروں کی اشاعت ممنوع قرار دی جائے :۔
(الف) 'زمیندار' (ب) 'آزاد' (ج) 'الفضل'

(iv) ہوم سیکرٹری خواجہ نذیر احمد کو جو سول اینڈ ملٹری گزٹ کی پالیسی کے نگران ہیں طلب کر کے یہ سمجھا دیں کہ ان گرفتاریوں پر اظہار مسرت نہ کیا جائے۔ اور آئندہ ایک یا دو ماہ کے دوران میں انتہائی ضبط سے کام لیا جائے۔

(v) ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جھنگ اصالتاً خلیفہ بشیر الدین محمود کو تنبیہ کر دیں کہ وہ اپنی جماعت کے ممبروں کو خصوصاً اپنی سیکریٹریٹ کے عملے کو ہر قسم کی اشتعال انگیزی سے باز رہنے کی تلقین کریں۔

(vi) جو رضا کار لاہور سے روانہ ہوں ان کے متعلق سندھ پولیس اور کراچی پولیس دونوں کو اطلاع دی جائے تاکہ بر سر راہ اُن کی گرفتاریوں کا انتظام کیا جا سکے۔

(vii) ہوم سیکرٹری ۲۸۔ تاریخ کو ایک پریس کانفرنس منعقد کریں جس میں اخباروں کو حکومت کا نقطۂ نگاہ سمجھائیں اور ان سے اپیل کریں کہ وہ لوگوں کو صبر و سکون اور ضبط کی تلقین کریں۔

(viii) ایک گشتی مراسلہ تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو بھیجا جائے جس میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اس اقدام کا پس منظر واضح کیا جائے۔ ان افسروں سے یہ بھی کہا جائے کہ وہ معقول و سنجیدہ عناصر کی امداد سے عوام کو قانون و انتظام کی اہمیت کا قائل بنائیں"۔

ہوم سیکرٹری نے مندرجہ ذیل لاسلکی پیغام فی الفور اضلاع راولپنڈی۔ گجرات۔ سیالکوٹ۔ لائل پور۔ منٹگمری۔ ملتان۔ سرگودھا اور شیخوپورہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو ارسال کر دیا :۔

"چونکہ احمدیوں کے خلاف شورش بدتر صورت اختیار کر گئی ہے۔ اس لئے ذیل کے اشخاص کو زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ چودہ دن کیلئے گرفتار کر لیجئے۔ مزید نظر بندی کے احکام حکومت جاری کریگی اور مناسب وقت کے اندر اندر ارسال کر دیگی۔ آپ دونوں میں سے جو صاحب بھی صدر مقام پر موجود ہوں وہ ۲۷۔ ۲۸۔ فروری کی درمیانی رات کو یہ کارروائی کر کے تعمیل کی رپورٹ بھیج دیں جیسی اس پیغام کے ساتھ بھیجی جا رہی ہے۔ صرف پولیس سپرنٹنڈنٹوں کیلئے :۔ تا احکام ثانی آپ روزانہ ضمنیاں ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو لاسلکی کے ذریعے سے بھیجا کریں۔ یہ ضمنیاں مختصر ہونی چاہئیں۔ ان میں ہر قسم کی اہم معلومات جو دستیاب ہو سکے درج ہونی چاہئے۔ یہ بھی بتایا جائے کہ حکومت کے اقدام کا عام ردعمل کیا ہے۔ خصوصاً اگر لاہور یا کراچی کو رضا کار بھیجے یا مقامی طور پر سول نافرمانی کرنے یا اس سلسلے میں سرمایہ فراہم کرنے کی سرگرم کوشش نظر آئے تو اس کی پوری اطلاع دی جائے۔

راولپنڈی: مولوی غلام اللہ خاں خطیب مسجد پرانا قلعہ۔ راولپنڈی

گوجرانوالہ: مولوی محمد اسمٰعیل گوجرانوالہ شہر

سیالکوٹ: (۱) قاضی منظور احمد رنگپورہ سیالکوٹ شہر (۲) ولی محمد جنیل سیالکوٹ شہر

لائل پور: (۱) غلام نبی جانباز لائلپور (۲) غازی محمد حسین سالار تاندلیانوالہ (۳) مولوی عبید اللہ لائل پور۔

منٹگمری: (۱) مولوی عبید اللہ جامعہ رشیدیہ منٹگمری (۲) مولوی لطف اللہ خاں منٹگمری۔

ملتان: (۱) محمد علی جالندھری ملتان (۲) قاضی احسان احمد شجاع آبادی ضلع ملتان (۳) شیخ محمد سعید خانیوال ضلع ملتان

سرگودھا :- مولوی عبداللہ - سرگودھا۔ شیخوپورہ : قاضی محمد امین - شیخوپورہ"

ایک اور لاسلکی پیغام کے ذریعے سے اضلاع گجرات جہلم کیمبل پور جھنگ - ڈیرہ غازیخاں میانوالی مظفر گڑھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو اطلاع دی گئی کہ دوسرے اضلاع میں احمدیوں کے خلاف شورش کے سلسلے میں جماعت احرار کے بعض ممبروں اور بعض غیر احراریوں کی گرفتاری کے احکام صادر کئے گئے ہیں۔ لہٰذا آپ لوگ چوکنے رہیئے اور اگر آپ کے اضلاع میں کوئی اہم واقعہ رونما ہو یا ہونے کی توقع ہو تو فی الفور حکومت کو اطلاع دیجئے۔

ایک "نہایت فوری" "انتہائی مرجح" "خفیہ" او ٹی پی مرموز تار مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء مرکزی حکومت کی طرف سے حکومت پنجاب کو موصول ہوا جس میں اول الذکر نے مطالبات کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا تھا :-

"۲ - (۱) احمدی ہوں یا پاکستانیوں کا کوئی دوسرا طبقہ ہو اس کو اسکی خواہشات کے خلاف اقلیت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ امر حکومت کے وظائف میں داخل نہیں ہے کہ وہ کسی گروہ کو زبردستی اقلیت بن جانے پر مجبور کرے۔

(۲) احمدیوں کو صرف اس بنا پر کہ وہ احمدی ہیں حکومت کے کلیدی عہدوں سے برطرف نہیں کیا جاسکتا۔ نہ عزت مآب وزیر خارجہ کی برطرفی کا مطالبہ محض اس بنا پر کہ وہ احمدی ہیں قابل توجہ ہوسکتا ہے۔ کسی وزیر کو عہدے سے برطرف کرنے کیلئے ایک آئینی مشینری مہیا ہے۔ جب تک کسی وزیر کو اپنے رفقائے کار کا اور مرکزی اسمبلی میں منتخب نمائندگانِ جمہور کا اعتماد حاصل رہے اس کو عہدے سے برطرف نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی وزیر محض اس لئے عہدے سے برطرف نہیں ہوسکتا کہ عوام کا ایک طبقہ "ڈائرکٹ ایکشن" کی دھمکی دے کر اس کی برطرفی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ کوئی سرکاری ملازم خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم حکومت کے کسی ماتحت عہدے سے محض اپنے مذہب کی وجہ سے موقوف نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) حکومت کے کلیدی عہدوں سے احمدیوں کی برطرفی کا مطالبہ بظاہر اس اندیشے کی بنا پر کیا جارہا ہے کہ غالباً وہ لوگ اپنے مخصوص فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کی غرض سے اپنی پوزیشن کا ناجائز استعمال کریں۔ اس اندیشے کو دور کرنے کے لئے حکومت نے سخت ہدایات جاری کر دی ہیں کہ کوئی وزیر یا سرکاری افسر اپنے فرقے کے عقائد کی تبلیغ نہ کرے۔

۳ - مرکزی حکومت پیراگراف ۲ کے مطابق کوئی سرکاری اعلان کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تاوقتیکہ صورت حالات اس قسم کے اعلان کی متقاضی نہ ہو۔ لیکن صوبائی حکومتوں سے استدعا کی جاتی ہے کہ فی الفور ان خطوط پر نشر و اشاعت کا وسیع انتظام کریں اور اخبارات کی مناسب رہنمائی کریں۔

۴ - کراچی میں اس شورش کے نمایاں لیڈروں کی گرفتاری کے بعد آج ایک سرکاری اعلان جاری کیا جارہا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ احراریوں کو شورش کے ان حامیوں سے جو نسبتاً کم جوشیلے ہیں علیحدہ اور منقطع کر دیا جائے اور فی الحال حملے کو احراریوں ہی پر مرکز کیا جائے۔ سرکاری اعلان میں احراریوں کے متعلق جو طریق اظہار اختیار کیا گیا ہے اس کو تقویت دینے کے لئے احراریوں کی گزشتہ بدافعالیوں اور موجودہ افتراق انگیز سرگرمیوں کی پُرزور اشاعت کی جائے"۔

مرکزی حکومت کے سرکاری اعلان میں بصراحت کی گئی کہ احمدیوں کے خلاف شورش کو احراریوں نے منظم کیا ہے

اور ان کے ماضی سے ظاہر ہے کہ وہ تقسیم سے پیشتر کانگرس اور ان دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے جو قائداعظم کی اس جدوجہد کے خلاف صف آرا ہو رہی تھیں ۔ جو مرحوم نے مسلمانوں کی آزادی کیلئے جاری کر رکھی تھی ۔ اس جماعت نے اب تک پاکستان کے قیام کو دل سے گوارا نہیں کیا ۔ ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کریں ۔ اور پاکستان کے استحکام کے متعلق عوام کے اعتماد کو نقصان پہنچائیں ۔ اس شورش کا یہ مقصد بالکل واضح ہے کہ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر فرقہ وارانہ اختلاف کی آگ کو بھڑکایا جائے ۔ اور مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کر دیا جائے ۔ اب اس شورش کے علمبرداروں نے فیصلہ کیا ہے کہ "ڈائرکٹ ایکشن" کیا جائے اور اسکے ساتھ ہی بڑے پیمانے پر فسادات برپا کرنے کا منصوبہ بھی تیار کر لیا ہے ۔ تاکہ اس طریقے سے حکومت انکے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جائے ۔ کوئی قابل ذکر حکومت ملت کے کسی طبقے کے "ڈائرکٹ ایکشن" سے مرعوب نہیں ہو سکتی ۔ حکومت نے عزم مصمم کر لیا ہے کہ اپنے تمام ذرائع و وسائل سے کام لے کر قانون و انتظام کو برقرار رکھے گی ۔ اگر امن عامہ میں خلل ڈالا گیا تو قانون اپنا کام کریگا اور اس کو توڑنے والے اس کے نتائج کو بھگتیں گے ۔ اس سرکاری اعلان میں جمہور کے تمام طبقوں سے اپیل کی گئی کہ خلاف قانون سرگرمیوں کو ہرگز روا نہ رکھیں ۔ اور کوئی ایسا فعل نہ ہونے دیں جس سے پاکستان کی سلامتی یا استواری کو کسی اعتبار سے بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو ۔

اس سرکاری اعلان کی نقول چیف سیکرٹری نے ۲۸ ۔ فروری ۱۹۵۳ء کو تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور ڈویژنل کمشنروں کے نام ارسال کیں ۔ اور ان کو اطلاع دی کہ حکومت نے جماعت احرار کے سرغنوں اور بعض دوسرے اشخاص کو جو اس شورش میں سرگرم حصہ لے رہے تھے گرفتار کرنے کا حکم صادر کیا ہے ۔ "آزاد" اور "الفضل" جو علی الترتیب احراریوں اور احمدیوں کے جماعتی آرگن ہیں ۔ ممنوع الاشاعت قرار دئے گئے ہیں ۔ اور "ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو چاہئے کہ اپنے اپنے اضلاع کی صورت حالات پر چوکنے ہو کر نگاہ رکھیں ۔ اس منسلکہ چٹھی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ مرکزی حکومت کے سرکاری اعلان کی بنیادوں پر حکومت کا نقطہ نگاہ جمہور پر واضح کریں ۔ اور اس حقیقت پر خاص زور دیں کہ یہ شورش احراریوں نے صرف اپنے اغراض و مقاصد کے لئے برپا کی ہے اور حکومت کے اقدامات کا رخ زیادہ تر انہی کی طرف ہے ۔ اس چٹھی میں حکام اضلاع پر حکومت کا یہ منشا بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ کوئی مزید گرفتاریاں نہ کی جائیں تاوقتیکہ مقامی حالات کے ماتحت ایسا اقدام قطعی طور پر ضروری نہ ہو جائے ۔ اور ظاہر ہے کہ اب اتنا وقت نہیں کہ ایسے اقدامات کے لئے پہلے صوبائی حکومت سے مشورہ کیا جائے ۔ چونکہ اس امر کا اندیشہ تھا کہ شورش پسند لاہور یا کراچی کو رضاکاروں کے دستے بغرض گرفتاری بھیجنا شروع کر دینگے ۔ لہٰذا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو مندرجہ ذیل فوری تدابیر اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی :-

"(الف) آپ کو چاہئے کہ رائے عامہ پر اثر ڈالنے اور عام خیالات کو صحیح راستے پر لگانے کی غرض سے اپنے ضلع کے سنجیدہ عناصر کی امداد حاصل کریں ۔ ان کو اچھی طرح سمجھا دینا چاہئے کہ حکومت شہریوں کے جائز مذہبی یا غیر مذہبی حقوق میں کسی اعتبار سے بھی مداخلت یا ممانعت کی خواہاں نہیں لیکن جو لوگ امن عامہ میں خلل ڈالنے یا حکومت کو پریشان کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ان کو حکومت ہرگز بچنے کا موقع نہ دیگی ۔

(ب) آپ کو چاہئے کہ اپنے ضلع میں احمدی جماعت کے مقتدر ارکان کو بھی تنبیہ کر دیں کہ وہ ایسی تحریر یا تقریر سے قطعی طور پر اجتناب کریں جس سے صورت حالات کے بدتر ہوتے یا دوسرے فرقوں کے اشخاص کے بھڑک اٹھنے کا احتمال ہو۔ ان سے خاص طور پر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ حکومت کے موجودہ اقدامات پر اظہار مسرت سے بھی محترز رہیں۔ کیونکہ ایسے اظہار سے حکومت کے خلاف جانب داری کا غلط احساس پیدا ہو سکتا ہے +

(ج) پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ روزانہ صورت حالات کی رپورٹ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس سی آئی ڈی کو ارسال کیا کریں۔ اگر اس سلسلے میں کوئی اہم اور غیر معمولی نوعیت کا واقعہ آپ کے علم میں آئے تو ان رپورٹوں کے علاوہ آپ فی الفور پولیس کی لاسلکی یا ٹیلیفون کے ذریعے سے اس کی اطلاع ہوم سیکرٹری کو دیں۔

(د) جب تک صورت حالات کافی حد تک پُرسکون نہ ہو جائے۔ آپ کو چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے صدر مقام ہی پر مقیم رہیں"۔

یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو ہوم سیکرٹری نے (سینیر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کے سوا) تمام پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کے سوا) تمام ڈپٹی کمشنروں کو۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس لاہور رینج۔ (لاہور ڈویژن کے سوا) دوسرے ڈویژنل کمشنروں کو اور (لاہور کے سوا) باقی رینجوں کے ڈپٹی انسپکٹر جنرلوں کو حسب ذیل چٹھی بمراد اطلاع ارسال کی :-

"احرار کی شورش اب یہ شکل اختیار کر رہی ہے کہ بیرونی اضلاع سے رضا کاروں کو "ڈائرکٹ ایکشن" کے لئے لاہور بھیجا جا رہا ہے۔ حکومت کا منشا یہ ہے کہ اس شورش کو بیرونی اضلاع سے لاہور کی طرف پھیلنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اور اس کو ابتدائی سرچشمے ہی پر دبا دینے کے لئے مقامی اقدام کیا جائے۔ لہذا آپ مضبوط اقدام کریں تاکہ رضا کار لاہور نہ آنے پائیں۔ اس امر کو حکومت آپ کے اختیار تمیزی پر چھوڑتی ہے کہ اپنی صوابدید کے مطابق ضروری تدابیر اختیار کریں جن میں زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری احکام امتناعی صادر کرنا بھی شامل ہے۔ کثیر تعداد میں رضا کاروں کی اکٹھی گرفتاریوں سے حتی الوسع پرہیز کیا جائے۔ سابقہ ہدایت کے مطابق آپ کو چاہئے کہ حکومت کے اقدام کی حمایت میں رائے عامہ پر اثر ڈالنے کے لئے اپنے ضلع کے صحیح الدماغ عناصر کی تائید حاصل کریں"۔

اس چٹھی کی نقول ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کو "بغرض تعمیل حسب بیان" اور ڈی آئی جی لاہور کو "بغرض اطلاع" ارسال کی گئیں۔

اسی دن ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے ایک لاسلکی پیغام نمبر 2563-82/BDSB تمام پولیس سپرنٹنڈنٹوں اور رینج ڈپٹی انسپکٹر جنرلوں کو بھیجا جس میں دوسرے امور کے علاوہ یہ ہدایت بھی کی گئی تھی :-

"رضا کاروں کو کراچی کی طرف۔ اور ممکن ہو۔ تو لاہور کی طرف بھی روانہ ہونے کی اجازت

نہ دی جائے"۔

۲ مارچ ۱۹۵۳ء کو ملک حبیب اللہ اے ڈی آئی جی ۔ سی آئی ڈی نے رضاکاروں کے متعلق ذیل کا ہدایت نامہ صادر کیا :۔

"انسپکٹر جنرل پولیس کی ہدایت کے مطابق میں نے گوجرانوالہ ۔ راولپنڈی ۔ سرگودھا ۔ لائل پور ۔ منٹگمری اور ملتان کے پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو ٹیلیفون پر اطلاع دی ہے کہ رضاکاروں کو کراچی جانے سے روکنے کے لئے افہام تفہیم سے کام لیا جائے ۔ لیکن اگر سمجھانا بجھانا بیکار ثابت ہو ۔ تو ان کو گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں ۔ .... تجویز یہ ہے کہ بیرونی اضلاع سے رضاکاروں کے جو دستے لاہور کو آرہے ہوں ان کو لاہور سے خاصے دور فاصلے پر جہاں ممکن ہو روکا جائے ۔ اور وہیں ان کے متعلق ضروری کارروائی کر لی جائے ۔ اگر یہ طرز عمل کامیاب ہو گیا ۔ تو شہر لاہور میں جلسوں اور جلوسوں کا دباؤ کافی حد تک کم ہو جائے گا ۔ گزشتہ دو دن سے راولپنڈی ۔ گجرات ۔ سیالکوٹ ۔ گوجرانوالہ ۔ سرگودھا ۔ لائل پور اور منٹگمری کے اضلاع سے کثیر التعداد رضاکار لاہور میں آرہے ہیں ۔ اسی قسم کے انتظامات رضاکاروں کو الگ تھلگ کرنے کی غرض سے لاہور ریلوے سٹیشن پر بھی کئے جائیں گے ۔ ٹرین سے سفر کرنے والے رضاکاروں کو کسی درمیانی سٹیشن پر روک لینا شاید ممکن نہ ہو"۔

۴ ۔ مارچ ۱۹۵۳ء کو ہوم سیکرٹری نے لاسلکی پیغام نمبر BDSB/ 82-2563 مورخہ یکم مارچ ۱۹۵۳ء کے تسلسل میں جو ڈی آئی جی ۔ سی آئی ڈی نے تمام پولیس سپرنٹنڈنٹوں اور رینج ڈپٹی انسپکٹر جنرلوں کو بھیجا تھا ۔ مندرجہ ذیل ہدایات رضاکاروں کے متعلق تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں ۔ پولیس سپرنٹنڈنٹوں اور رینج ڈپٹی انسپکٹر جنرلوں کو ارسال کیں :۔

"سب سے پہلے تو رضاکاروں کے دستوں کو کراچی یا لاہور جانے سے باز رکھنے کے لئے نصیحت و ترغیب سے کام لیا جائے ۔ لیکن اگر سمجھانے بجھانے کا کوئی نتیجہ نہ نکلے تو پھر مناسب انسدادی کارروائی عمل میں لائی جائے"۔

حصّہ سوم

فسادات

(۲۷- فروری سے فسادات کے خاتمے تک)

فسادات کا حال

مجلس عمل کے ممبر ۲۷- فروری کو کراچی میں گرفتار کر لئے گئے۔ تحریک کے جو لیڈر کراچی میں تھے ان کی طرف سے ٹیلیفون پر لاہور میں ہدایات موصول ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس وقت تک رضاکاروں کے چند دستے لاہور سے کراچی کو روانہ ہو چکے تھے۔ جو دستہ ۲۷- فروری کو غازی علم الدین کی سرکردگی میں روانہ ہوا تھا۔ اس کو پنجاب پولیس نے لودھراں ریلوے سٹیشن پر روک کر ٹرین سے اُتار لیا۔ باقی دو دستے جن میں سے ایک ۲۵- کو زیر سرکردگی معراج الدین سالار اور دوسرا ۲۶- کو زیر سرکردگی صاحبزادہ فیض الحسن روانہ ہوا تھا کراچی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور وہاں گرفتار کر لئے گئے۔

۲۶-۲۷- فروری کی درمیانی رات کو کراچی میں جس اقدام کا فیصلہ ہوا تھا اس پر حکومت پنجاب نے عمل کیا۔ اور وہ اشخاص جن کی فہرست انسپکٹر جنرل پولیس نے کراچی سے واپسی پر تیار کی تھی گرفتار کر لئے گئے۔ ان گرفتاریوں سے صوبے بھر میں اور بالخصوص لاہور میں اور سیالکوٹ۔ گوجرانوالہ۔ راولپنڈی۔ لائل پور اور منٹگمری کے شہروں میں برہمی اور لاقانونی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور لاہور میں بدنظمی اور ابتری کا سیلاب اس قدر قابو سے باہر ہو گیا۔ کہ ۶- مارچ کو فوج شہر میں داخل ہو گئی اور مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا۔

لاہور

۲۷- فروری ۱۹۵۳ء کراچی کے فیصلے کی تعمیل میں مولانا اختر علی خان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا۔ لیکن جب پولیس افسر نے جو اس وارنٹ کی تعمیل پر مامور تھا یہ وارنٹ مولانا کو دکھایا تو انہوں نے کہا کہ اگر مجھے گرفتار نہ کیا جائے تو مَیں لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ اس شورش سے قطع تعلق کر لوں گا۔ پولیس افسر انہیں سول لائنز کے تھانے میں لے گیا۔ وہاں مولانا نے یہ معافی نامہ لکھ کر دے دیا:-

"مَیں سمجھتا ہوں۔ کہ موجودہ تحریک نے اب جو شکل اختیار کی ہے وہ پاکستان کی سالمیت کے لئے نقصان رساں ہے۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ اگر یہ تحریک اس طریقے سے جاری رہی تو پاکستان کے دشمن اس سے ناواجب فائدہ اٹھائیں گے۔ اور ہر پاکستانی ایسی تحریک کو ناپسند کرے گا جس سے پاکستان کی سالمیّت تباہ ہو جائے۔ اس تحریک کا موجودہ رُجحان

ملک میں افتراق اور ابتری پیدا کرنے کا موجب ہو گا۔ اگر خدانخواستہ فسادات بڑھ گئے اور حکومت قوت استعمال کرنے پر مجبور ہو گئی تو یہ امر فریقین کے لئے سخت ذلت کا باعث ہو گا میری رائے میں مسلمان کے خون کا ایک قطرہ پوری کائنات سے بھی زیادہ بیش بہا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس معاملے پر مزید غور کرنا چاہئیے۔ تاکہ صورت حالات کو درست کیا جا سکے۔ میرا کوئی تعلق موجودہ "ڈائرکٹ ایکشن" سے نہیں ہے۔ میں نے نہ کبھی تشدد کی حمایت کی ہے نہ میں گورنر جنرل وزیر اعظم اور دوسرے اکابرِ پاکستان کو ملامت و دشنام کا نشانہ بنانے ان کے جنازوں کے جلوس نکالنے یا ان کی کوٹھیوں پر پکٹنگ کرنے کا حامی رہا ہوں۔ اس قسم کے افعال کا ارتکاب تو درکنار میری رائے میں ایسے افعال کا تصور بھی کسی صحیح الخیال پاکستانی کے لئے زیبا نہیں۔ ہمیں چاہئیے کہ اپنے ملک کے داخلی نظم و نسق کو مستحکم کرنے اور غیر ممالک کی نظروں میں حکومت کی ساکھ اور عزت کو بلند تر کرنے کے لئے ایسے افعال کے ارتکاب سے اجتناب کریں جن کا نتیجہ یہ ہو کہ ہم دنیا کی نگاہوں میں اضحوکہ بن جائیں"۔

اس تحریر کی رو سے مولانا کے نزدیک مسلمان کے خون کا ایک قطرہ پوری کائنات سے زیادہ قیمتی تھا "ڈائرکٹ ایکشن" کے ساتھ مولانا کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تحریک نے جو صورت اختیار کر لی تھی وہ پاکستان کے استحکام کے لئے خطرناک تھی۔ مولانا ہر قسم کے تشدد اور بدنظمی کے خلاف تھے۔ وہ ایسی باتوں کو روا رکھنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ وزیر اعظم یا دوسرے رہنماؤں کے جنازے نکالے جائیں یا ان کی کوٹھیوں پر پکٹنگ کیا جائے۔ اور وہ ہر اس شے کے مخالف تھے جس سے پاکستان اور اس کے باشندے اضحوکہ روزگار بن جائیں۔ اس ذلت آمیز معافی نامے کی بنا پر مولانا اختر علی خان گرفتار نہ کئے گئے نہ ان کے اخبار "زمیندار" کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی تا آنکہ ۲۸ فروری کو اس نے پھر مکروہ رویہ اختیار کیا۔

۲۸ فروری ۱۹۵۳ء: جونہی ۲۷ فروری کو کراچی میں اور ۲۷ - ۲۸ فروری کی شب کو لاہور میں لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں لاہور میں دکانیں بند ہو گئیں۔ اور بعض اشخاص کی ٹولیاں غیر رضامند دکانداروں کو دکانیں بند کرنے پر مجبور کرنے کے لئے بازاروں میں چکر کاٹنے لگیں۔ تیسرے پہر باغ بیرون دہلی دروازہ میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جہاں گرفتاری کے لئے تیار ہونے والے بعض رضاکاروں کو ہار پہنائے گئے۔ اور ان کا ایک جلوس نکالا گیا جو سول سیکرٹیریٹ کی طرف روانہ ہوا لیکن راستے میں ہجوم نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ اور گورنمنٹ ہاؤس پہنچنے کے لئے مال روڈ پر چل دیا۔ ہجوم کی تعداد پانچ اور چھ ہزار کے درمیان تھی اور اس کا رجحان بظاہر تشدد کی طرف نہ تھا شرکائے جلوس صرف حکومت کے خلاف پولیس کے خلاف اور احمدیوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ چیرنگ کراس کے قریب جلوس کو روکا گیا اور اس کو منتشر ہونے کی ہدایت دی گئی۔ اس وقت وہاں کمشنر۔ انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینیر سپرنٹنڈنٹ پولیس پہنچ چکے تھے ہار پہنے ہوئے رضاکاروں نے باہر نکل کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ لیکن ان سے کہا گیا کہ عام جلسوں اور جلوسوں

پر چونکہ کوئی پابندی نہیں۔ اور انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اس لئے وہ گرفتار نہیں کئے جا سکتے تاہم رضاکاروں نے گرفتاری پر اصرار کیا۔ اس پر ٹریفک کے لئے سڑک صاف کرنے کی غرض سے زیر دفعہ $\frac{107}{151}$ ضابطہ فوجداری چونتیس اشخاص گرفتار کر لئے گئے۔ ان کو ٹرک میں بٹھایا گیا اور شہر سے کچھ فاصلے پر لے جا کر چھوڑ دیا گیا اس کے بعد ہجوم منتشر ہو کر مختلف اطراف کو روانہ ہو گیا۔ اس سے کچھ دیر بعد کمشنر، ہوم سکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس سول لائینز کے تھانے میں جمع ہوئے۔ اور انہوں نے صورت حالات پر گفتگو کرنے کے بعد عام جلسوں اور جلوسوں کو ممنوع قرار دینے کا فیصلہ کیا۔

یکم مارچ :۔ یہ جلوسوں اور گرفتاریوں کا دن تھا۔

مولانا اختر علی خان کے معافی مانگ لینے کی خبر شہر بھر میں پھیل گئی۔ عوام غضبناک ہو گئے اور انہوں نے میکلوڈ روڈ پر مولانا کے مکان کو گھیر لیا۔ پولیس کا ایک دستہ وہاں پہنچ گیا اور جب مولانا کے بیٹے نے ہجوم کو یقین دلایا کہ مولانا اپنے گاؤں کرم آباد (ضلع گوجرانوالہ) میں ہیں تو ہجوم منتشر ہو گیا۔ تقریباً اسی وقت مولانا احمد علی نے دہلی دروازے کے باہر ایک بڑا جلوس مرتب کیا یہاں ہجوم تشدد پر آمادہ معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے خشت باری کر کے پولیس کی ایک گاڑی کو نقصان پہنچایا مولانا احمد علی زیر دفعہ ۳۔ پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کر لئے گئے۔ اور تینتیس دیگر اشخاص کی گرفتاری زیر دفعہ $\frac{107}{151}$ ضابطۂ فوجداری عمل میں آئی۔ ایک اور جلوس ہائی کورٹ کی عمارت کے نزدیک نمودار ہوا جو گورنمنٹ ہاؤس کی طرف جانا چاہتا تھا۔ یہ جلوس روک دیا گیا۔ اور ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ۲۹ اشخاص کو گرفتار کر لیا۔ اسی افسر نے مال روڈ پر ایک اور جلوس کا سامنا کیا۔ اور ۲۳ مزید اشخاص کو گرفتار کیا۔ تیسرے پہر ایک بڑا جلوس دہلی دروازے سے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہوا۔ جس کو چیرنگ کراس کے قریب روکا گیا۔ اس وقت کمشنر۔ ہوم سکرٹری انسپکٹر جنرل پولیس ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ موجود تھے۔ بہت سے لوگوں نے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ وہ بھی ٹرکوں میں سوار کرائے گئے۔ اور یوم گزشتہ کی طرح لاہور سے کچھ فاصلے پر لے جا کر اتار دیئے گئے۔ اس کے بعد ہجوم تشدد کے کوئی آثار ظاہر کئے بغیر منتشر ہو گیا۔

۲۔ مارچ : معلوم ہوتا ہے کہ جب بعض لوگوں نے سنا کہ مولانا اختر علی خاں نے معافی مانگ لی ہے اور اب کرم آباد جا کر اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو چکے ہیں تو بعض مقامی آدمی ان کے پاس وہاں گئے اور انہیں بزدلی کا طعنہ دیا۔ مولانا نے الزام کی صحت سے انکار کیا۔ اور یکم مارچ کی شام کو یا ۲۔ مارچ کی صبح کو لاہور پہنچ گئے انہوں نے وزیر خان کی مسجد میں جا کر لوگوں پر اپنا موقف واضح کرنے کی کوشش کی۔ اور کہا کہ میں اس تحریک کا اسی طرح وفادار ہوں جیسے پہلے تھا۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ میں تیسرے پہر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کروں گا چنانچہ شام کے وقت دس ہزار کا ایک جلوس مسجد سے نکلا۔ یہ ہجوم نہایت تند اور سرکش تھا

یہ جلوس چیرنگ کراس پر روکا گیا۔ جہاں کمشنر، ہوم سیکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈی آئی جی پولیس اور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس موجود تھے۔ یہ مجمع خلاف قانون قرار دیا گیا۔ مولانا اور بعض دوسرے اشخاص گرفتار کر لئے گئے۔ اور ایک ایسی جگہ جمع کئے گئے جس کے گرد پولیس نے حلقہ باندھ لیا تھا۔ دفعتہً کوئی ایک ہزار اشخاص کے ہجوم نے اینٹوں۔ ڈبوں۔ بوتلوں اور دوسری چیزوں سے پولیس کے حلقے پر حملہ کیا۔ اس حملے میں گیارہ پولیس افسر جن میں دو سپرنٹنڈنٹ پولیس یعنی مسٹر ذوالقرنین خاں اور مسٹر ٹیلر بھی تھے مجروح ہو گئے۔ اور ہجوم پر لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ مولانا جیل پہنچا دئے گئے اور اکتالیس اشخاص حملے اور بلوے کی بنا پر گرفتار کئے گئے جو اشخاص اس سے پہلے مولانا اختر علی خان کے ساتھ گرفتار کئے گئے تھے ان کو حسب معمول لاہور سے دور لے جا کر چھوڑ دیا گیا اس پر ہجوم منتشر ہو گیا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو کمشنر، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی نے سول لائینز کے تھانے میں اپنی کانفرنس منعقد کی۔ چونکہ صورت حالات نہایت تیزی سے بدتر ہو رہی تھی اسلئے فیصلہ کیا گیا۔ کہ جنرل آفیسر کمانڈنگ دہم ڈویژن کو اطلاع دی جائے اور استدعا کی جائے کہ وہ فوج کو لے کر آئیں۔ اور سول حکام کی امداد کے لئے موجود رہیں۔ جنرل آفیسر کمانڈنگ خود تو نہ آئے لیکن انہوں نے اپنے جی ایس او آئی (لفٹننٹ کرنل شیریں خاں) اور دو دوسرے افسروں کو بھیجا۔ جنہوں نے یہ سمجھایا کہ اگر فوجی امداد کی ضرورت ہے تو اس کے لئے صوبائی حکومت کی طرف سے مطالبہ ضروری ہے۔ اس پر کچھ بحث ہوگئی۔ سول کے حکام کا دعوےٰ تھا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ حکومت کو کسی قسم کی اطلاع دئے بغیر یہ اختیار رکھتے ہیں کہ فوج سے امداد طلب کریں۔ لیکن فوجی افسر اسی موقف پر ڈٹے ہوئے تھے کہ اس معاملے میں چونکہ فوج کے مصارف کا سوال بھی شامل ہے۔ اسلئے فوجی امداد کا مطالبہ رسماً صوبائی حکومت کی طرف سے آنا چاہئے۔ بحث کے دوران میں انسپکٹر جنرل پولیس نے کہا کہ میں حکومت پنجاب کی جانب سے تحریری مطالبہ پیش کئے دیتا ہوں۔ لہذا ایک چٹھی کا مسودہ تیار کیا گیا جو ہوم سیکرٹری نے فوجی افسروں کے حوالے کر دیا چٹھی میں یہ لکھا تھا۔ کہ لاہور میں چونکہ سخت فساد کے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے اور یہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ کہ شاید سول حکام اس صورت حالات کا کامیاب مقابلہ نہ کر سکیں۔ لہذا حکومت پنجاب نے ہوم سیکرٹری کو ہدایت کی ہے کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس بدنظمی کے سدِّباب اور سرکوبی میں مدد دینے کے لئے فوجی امداد طلب کریں۔ اس تحریری مطالبہ میں یہ امور درج نہ کئے گئے۔ کہ فوج کی کتنی تعداد مطلوب ہے۔ کتنی مدت تک اس کی ضرورت ہوگی اور اس کی ڈیوٹیاں کس طریق پر لگائی جائیں گی۔ اور کہا گیا۔ کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مناسب وقت کے اندر ان امور سے جی او سی صاحب کو مطلع کر دیں گے۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ زیر دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری ایک حکم صادر کر کے لاہور کارپوریشن کے مخصوص حصوں میں جلوسوں کا نکالنا ممنوع قرار دیا جائے۔ اسی شام کو چیف منسٹر کے مکان پر کابینہ کا ایک اجلاس ہوا جس میں چیف سیکرٹری اور

وہ سب افسر بھی شامل ہوئے جو سول لائینز کے تھانے میں اجلاس کر چکے تھے۔ سول لائنز کے تھانے میں جو فیصلے کئے گئے تھے ان کو کابینہ نے منظور کر لیا۔ اور آدھی رات سے کچھ بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے زیر دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری ایک حکم صادر کیا کہ لاہور شہر کی کارپوریشن کے حدود کے اندر پانچ یا پانچ سے زیادہ آدمیوں کا اجتماع ممنوع ہے وہ رقبہ اس سے مستثنےٰ رکھا گیا جس کے گرد سرکلر روڈ واقع ہے۔

۳۔ مارچ: اس دن نسبتہً خاموشی رہی۔ کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ فوج جناح گارڈن میں پہنچ گئی۔ اور اس نے صبح کو سول لائینز اور کارپوریشن کے رقبہ شہر میں گشت لگانا شروع کیا۔ اندرونِ فصیل کا شہر مستثنےٰ رکھا گیا۔ بارڈر پولیس بھی حرکت میں آ گئی تھی۔ بعض غیر اہم سے جلوس اندرون فصیل اور بعض ایسے رقبوں میں بھی نکالے گئے۔ جو حکم زیر دفعہ ۱۴۴ میں آتے تھے۔ انارکلی میں اکتیس آدمی دفعہ ۱۴۴ کے احکام کو توڑنے کی وجہ سے گرفتار کئے گئے۔ اور ایک پُرشور و سرکش جلوس جو نیلا گنبد سے مال روڈ کی طرف آ رہا تھا ٹالینٹن مارکیٹ کے قریب لاٹھی چارج سے منتشر کیا گیا جس کا حکم مسٹر ایم اے کے چودھری اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے دیا تھا۔ دو اور ہجوم بھی روکے گئے۔ اور ان کو انسپکٹر جنرل پولیس نے خود ایک پولیس کے دستے سے لاٹھی چارج کرا کر منتشر کر دیا۔ اس دن صرف ایک ہی سنگین واقعہ ہوا۔ کوئی ایک سو آدمیوں کا ہجوم میکلوڈ روڈ سے منٹگمری روڈ کے راستے چیرنگ کراس کی طرف بڑھ رہا تھا اس ہجوم نے پولیس کی ایک پارٹی پر پتھر برسائے۔ جو زیر سرکردگی آغا سلطان احمد انسپکٹر نولکھا مامور تھی پولیس نے ہجوم پر تین راؤنڈ چلائے جن سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

شام کو یہ دیکھا گیا کہ فوج نے گشت کرنا بند کر دیا ہے۔

۴۔ مارچ: اس دن کابینہ کا ایک اجلاس ہوا جس میں چیف سیکرٹری۔ ہوم سیکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس بھی شریک ہوئے۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے ایک تقریر کی رپورٹ پڑھ کر سنائی جو شب گزشتہ مولانا عبدالستار خان نیازی نے مسجد وزیر خان میں کی تھی۔ یہ تقریر سخت اشتعال انگیز تھی اور مقرر کی گرفتاری کے لئے ہوم سیکرٹری نے زیر دفعہ ۳۔ پبلک سیفٹی ایکٹ ایک حکم صادر کیا تھا۔ لیکن اس کی تعمیل نہ ہو سکی تھی کیونکہ جس مسجد میں نیازی نے اپنے آپ کو مسند نشین کر رکھا تھا۔ وہ شورش پسندوں کا ایک مضبوط گڑھ بن چکی تھی جس میں داخلہ محال تھا۔

فوج نے بظاہر ہیڈ کوارٹر کے احکام کے ماتحت گشت لگانا بند کر دیا تھا۔ بلکہ ایک یا دو کمپنیاں جناح گارڈن سے واپس چھاؤنی بھی چلی گئی تھیں۔ بہت سے جلوس نکالے گئے اور منتشر کئے گئے۔ ان میں سے ایک جلوس نے احمدیہ بلڈنگز کا محاصرہ کر لیا۔ جس کو اسسٹنٹ سب انسپکٹر محمد اکرم نے ہلکے لاٹھی چارج سے منتشر کر دیا۔ اب ٹرینوں سے اور لاریوں سے رضاکاروں کے بے شمار دستے لاہور میں داخل ہو رہے تھے۔ سرگودھا کے رضاکاروں کے ایک دستے کو سب انسپکٹر محمد حامد نے نولکھا تھانہ کے قریب منتشر کیا۔ برانڈرتھ روڈ پر ایک سو دس رضاکاروں کے ایک اور دستے نے سید حسنات احمد

سٹی مجسٹریٹ ۔ ملک خان بہادر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا سامنا کیا۔ رضاکاروں نے منتشر ہونے سے انکار کیا۔ اور چوک دال گراں پہنچے۔ جہاں ان پر اشک آور گیس چھوڑی گئی۔ وہ پھر بھی منتشر نہ ہوئے اور زمین پر بیٹھ گئے۔ جب لاٹھی چارج بھی غیر مؤثر ثابت ہوا تو پولیس والوں نے ان کو ایک ایک کر کے اٹھایا۔ ٹرکوں میں ڈالا اور لے گئے۔ اس واقعہ کے متعلق غلط افواہیں فوراً پھیلنے لگیں۔ ظاہر کیا گیا کہ پولیس نے رضاکاروں کو منتشر کرتے ہوئے قرآن مجید کی توہین کی۔ اس کو ٹھوکریں لگائیں۔ اس کے اوراق پھاڑ دیئے۔ اور ایک چھوٹے سے لڑکے کو ہلاک کر دیا۔ دہلی دروازے کے باہر جلسہ ہوا جس میں ایک لڑکا پیش کیا گیا۔ جو اپنے ہاتھ میں قرآن مجید کے چند پھٹے ہوئے اوراق لئے ہوئے تھا۔ اس نے بیان کیا کہ میں کلام الٰہی کی اس توہین کا عینی گواہ ہوں۔ ایک مولوی (غالباً مولوی محمد یوسف) نے یہ اوراق ہاتھ میں لے کر حاضرین کو دکھائے اور ایک نہایت پُر تشدد تقریر کی جس سے غصے میں بھرا ہوا مجمع اور بھی زیادہ غضبناک ہو گیا۔ واقعہ کی یہ بنا دٹی کہانی ہر جگہ جوش میں بھرے ہوئے لوگوں کا موضوع گفتگو بن گئی۔ اور چند ہی گھنٹوں کے اندر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی جس سے پولیس کے خلاف غیظ و نفرت کے جذبات برانگیختہ ہو گئے۔

ہم نے دال گراں کے واقعہ کا مذکورہ حال تحریری بیانات اور افسروں کی شہادت سے اخذ کیا ہے لیکن اس کے متعلق احراریوں اور مجلس عمل والوں نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ وہ قطعاً مختلف ہے۔ ان کا قول یہ ہے کہ اس واقعہ کے دوران میں ایک پولیس افسر نے قرآن کو ٹھوکر ماری۔ اور ایک چھوٹے سے لڑکے کو زدوکوب کر کے مار ڈالا۔ اس قول کی تائید میں محمد نذیر گواہ نمبر ۳۲۔ محمد حنیف گواہ نمبر ۳۳۔ شیخ محمد رفیق گواہ نمبر ۳۴ اور سراج دین گواہ نمبر ۳۷ نے بیان دیئے ہیں۔ عدالت نے سید حسنات احمد سٹی مجسٹریٹ اور ملک خان بہادر خان سپرنٹنڈنٹ پولیس (پنجاب کنسٹیبلری) کی شہادت بھی قلمبند کی ہے جو موقع پر موجود تھے۔ غیر سرکاری گواہوں کا بیان ہے کہ رضاکاروں کا ایک دستہ چوک دال گراں کی طرف سے ریلوے سٹیشن کی طرف آ رہا تھا کہ پولیس نے اس کو روکا۔ رضاکاروں سے منتشر ہونے کے لئے کہا گیا لیکن وہ بیٹھ گئے اور جب انہیں پاس کھڑے ہوئے ٹرکوں کی طرف لے جانے کی کوشش کی گئی۔ تو وہ زمین پر لیٹ گئے۔ اور انہیں گھسیٹ کر لے جانا پڑا۔ جو لوگ اس طرح گھسیٹے گئے ان میں ایک بوڑھا آدمی بھی تھا جس کے پاس ایک حمائل تھی۔ جب وہ گھسیٹا جا رہا تھا تو حمائل گر پڑی اور ایک پست قامت پولیس افسر نے جس کے گلے میں گلبھرا تھا اس کو ٹھوکر ماری۔ اس معاملے کے متعلق گواہوں میں اختلاف ہے کہ آیا وہ حمائل ٹھکرا کر نالی میں پھینک دی گئی یا وہیں زمین پر پڑی رہی اور آیا وہ جزدان میں ملفوف تھی۔ یا بغیر جزدان کے تھی جو شخص یہ حمائل پہنے ہوئے تھا۔ وہ طلب نہیں کیا گیا۔ نہ اس شخص کا کوئی اتا پتا دیا گیا ہے اور نہ اس لڑکے کے متعلق کوئی تفصیلات بتائی گئی ہیں۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کو مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ہم تصور نہیں کر سکتے کہ کوئی مسلمان

پولیس آفیسر خواہ وہ کتنا ہی لامذہب کیوں نہ ہو کتاب اللہ کو ٹھوکر مار سکتا ہے اور اس شدید ترین کافرانہ حرکت کا مجرم بن سکتا ہے۔ ہمارے سامنے بحث میں اس امر کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ ممکن ہے کتاب اللہ نادانستگی کی حالت میں پامال کر دی گئی ہو۔ سید حسنات احمد اور ملک خان بہادر خان دونوں نے اس الزام کی صحت سے انکار کیا ہے اور چونکہ اس بارے میں غیر سرکاری شہادت مایوس کن حد تک ناکافی اور قلیل ہے اسلئے ہم قبول نہیں کر سکتے کہ کسی نے قرآن مجید کو ٹھوکر ماری تھی یا کسی لڑکے کو مار مار کے ہلاک کر دیا تھا۔

شورش پسندوں نے حکام کے خلاف نفرت پھیلانے کے لئے جو دوسری چالیں اختیار کیں وہ حسب ذیل تھیں:

(۱) اس مضمون کے اشتہار شائع کئے گئے کہ جھنگ اور سرگودھا میں ایک ہزار سے زیادہ اشخاص گولیاں مار مار کر ہلاک کر دئیے گئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس دن ان مقامات پر ایک گولی بھی نہیں چلائی گئی۔

(۲) یہ افواہ پھیلائی گئی کہ احمدی موٹر کاروں میں سوار ہو کر اندھا دھند لوگوں پر گولیاں چلا رہے ہیں۔

(۳) مسجد وزیر خان سے یہ اعلان کیا گیا کہ سرکاری ملازموں نے دفتروں میں ہڑتال کر دی ہے اور تحریک میں شامل ہو گئے ہیں۔

(۴) یہ خبریں پھیلائی گئیں کہ ضلع کی پولیس نے گولی چلانے سے انکار کر دیا ہے اور اب صرف بارڈر پولیس اور کنسٹیبلری پولیس گولیاں چلا رہی ہے۔

یہ بیان کہ بعض احمدی فوجی وردیاں پہنے ایک جیپ میں سوار ہو کر لوگوں کو اندھا دھند گولیوں کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ہمارے سامنے موضوع ثبوت بنایا گیا۔ اور اس کی تائید میں متعدد گواہ پیش کئے گئے۔ اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پُر اسرار گاڑی میں بعض نامعلوم آدمی اس دن شہر میں گھومتے رہے لیکن ہمارے سامنے اس امر کی کوئی شہادت نہیں کہ اس گاڑی میں احمدی سوار تھے یا وہ گاڑی کسی احمدی کی ملکیت تھی۔

ساڑھے چار بجے شام دہلی دروازے کے باہر ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس کے حاضرین کی تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی۔ اس جلسے میں بھی یہ بیان کیا گیا کہ چوک دال گراں میں پولیس نے ایک لڑکے کو گولی مار دی ہے اور قرآن مجید کو پامال کیا ہے۔ جلسے کے بعد ایک جلوس مرتب کیا گیا جو مسجد وزیر خان کی طرف روانہ ہوا۔ منظور الحق اور محمد صادق اسسٹنٹ سب انسپکٹروں نے مسجد کے قریب اس ہجوم کو روکا۔ سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ لوگ ان اسسٹنٹ سب انسپکٹروں کو اٹھا کر مسجد میں لے گئے ہیں اور یہ دونوں ہلاک کر دئیے گئے ہیں، یا عنقریب کئے جانے والے ہیں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایک مسلح ریزرو دستہ زیر سرکردگی سب انسپکٹر مظفر خان (تھانہ کوتوالی) ساتھ لیا اور مسجد کی طرف چل دئیے۔ مسجد کے عین باہر اُن کا سامنا ایک غضبناک ہجوم سے ہوا جب ڈی ایس پی

نے پوچھا کہ وہ دو پولیس افسر کہاں ہیں۔ تو اُن کو بلوائیوں نے گھیر لیا اور ان پر چھروں اور لاٹھیوں سے حملہ کر کے وہیں ہلاک کر دیا۔ سید فردوس شاہ کے جسم پر باون زخموں کے نشان تھے۔ ان کا اپنا ریوالور اور ان کے ساتھی پولیسمینوں کی دو بندوقیں چھین لی گئیں۔ اور سب انسپکٹر مظفر خان زخمی ہو گیا۔ ڈی ایس پی کی نعش کو کسی نے کوتوالی پہنچا دیا۔ جہاں ہوم سکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس موجود تھے۔ کرنل عالم آفیسر کمانڈنگ فرسٹ بلوچ رجمنٹ بھی بعض دوسرے افسروں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ اور بعد میں جنرل آفیسر کمانڈنگ بھی اُن سے آن ملے۔ جس وقت یہ افسر صورت حالات پر غور کر رہے تھے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بتایا۔ کہ ڈی ایس پی کے قتل کی خبر سن کر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شہر کو فوج کے حوالے کر دوں۔ اس کے بعد انہوں نے فوجی افسروں پر اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے اس اقدام کو پسند نہ کیا اور کہا کہ اس مرحلے پر شہر کو فوج کے حوالے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ انتظام کو سچ مچ فوج کے حوالے کر دیتے تو ہم اُن کے اس فعل کو معقول اور دانشمندانہ خیال کرتے۔ لیکن یہ صاحب خود ہی اس امر کی نیکنامی لینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہمارے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا ہے کہ میں نے تو فوج کے حوالے کرنے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا ؛

جو افسر اس وقت موجود تھے انہوں نے کرفیو عائد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس کے متعلق حکم نافذ کر دیا۔ پولیس نے شہر میں گشت کی۔ اس کا سابقہ کئی مجمعوں سے پڑا۔ جن کو اس نے گولی چلا کر منتشر کر دیا۔ اسی طرح ایک ہجوم جو کرفیو کے احکام کی خلاف ورزی کر رہا تھا بھاٹی دروازے کے قریب ملا اور چند گولیاں چلانے سے منتشر ہو گیا۔ نولکھا بازار میں بھی ایک مجمع کرفیو کو توڑنے کے لئے اپنے گھروں سے نکل آیا تھا۔ اس پر بھی گولی چلائی گئی۔ احراری رضاکاروں کا ایک ہجوم جو دفتر احرار کے قریب سرکلر روڈ پر جمع ہو گیا تھا کوتوالی کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ اس کو ضروری تنبیہ کی گئی۔ اور پھر اس پر گولی چلائی گئی۔ جس سے ایک شخص ہلاک اور ایک مجروح ہوا۔ ایک اور ہجوم کو چودھری محمد حسین سپرنٹنڈنٹ پولیس نے میکلوڈ روڈ پر رائفل فائر سے منتشر کیا۔ جس سے کچھ جانی نقصانات ہوئے۔ نسبت روڈ پر انسپکٹر آغا سلطان احمد نے چار راؤنڈ چلائے۔ سب انسپکٹر نے گوالمنڈی میں دو دفعہ گولی چلائی خود انسپکٹر جنرل نے ایک مجمع پر گولی چلوائی۔ جو کوتوالی کی طرف بڑھ رہا تھا اس میں کچھ جانی نقصانات ہوئے۔ اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس چوکی موچی دروازہ نے ان بلوائیوں پر گولی چلائی۔ جو پولیس چوکی پر خشت باری کر رہے تھے غرض پورا شہر شور و غوغا کا ایک ہنگامہ زار بنا ہوا تھا۔ رات بھر دُور دُور تک مہیب و ہولناک شور کی آوازیں سنائی دیتی رہیں ؛

آدھی رات سے کچھ بعد چیف منسٹر کی کوٹھی پر ایک اجلاس ہوا۔ جس میں ہوم سکرٹری انسپکٹر جنرل پولیس ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ جنرل آفیسر کمانڈنگ اور بعض دوسرے فوجی افسر شریک تھے یہ اجلاس تین بجے شب تک جاری رہا۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے

جنرل آفیسر کمانڈنگ کو بتایا کہ کون کون سے واقعات ہو چکے ہیں۔ اور کن کن حوادث کا اندیشہ ہے تا کہ اس امر کا فیصلہ کیا جاسکے کہ فوج سے کیونکر موثر کام لیا جا سکتا ہے ۔

۵۔ مارچ : جو واقعات سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے قتل کے بعد رونما ہوئے اور ہولناک شور کی جو آوازیں ۴۔ مارچ کی رات کو سُنی گئیں۔ آئندہ صبح کے منحوس حوادث کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اگرچہ ہر شخص اندازہ لگا رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ کسی کے تصور میں بھی نہ آیا تھا۔ اول یہ امر کہ حکم زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری جس کی رُو سے لوگوں کا اجتماع ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اس کا اطلاق اندرون فصیل کے شہر پر نہ ہوتا تھا دوم یہ امر کہ کوئی ذمہ دار افسر مسجد وزیر خان تک نہیں جاسکتا تھا جہاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس قتل کر دیا گیا تھا۔ ان دونوں امور سے گویا اس حقیقت کا اعتراف کر لیا گیا تھا۔ کہ شہر اُن حکام کی رسائی سے باہر ہو چکا ہے۔ جو امن و نظم کے قیام کے ذمہ دار تھے ۔

۵۔ مارچ کی صبح کو نو بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے معززین شہر کا ایک اجلاس طلب کیا۔ تا کہ اُن کو یہ ترغیب دی جائے کہ وہ عوام کو پُر امن رہنے کی تلقین کریں۔ اور ان پر اپنے ذاتی اثر سے دباؤ ڈالیں لیکن کسی نے اس راہ عمل پر گامزن ہونے کی ہامی نہ بھری۔ اور صرف چند عورتیں مسجد وزیر خان میں جانے کے لئے آمادہ ہوئیں جتنا دن چڑھتا گیا۔ حادثے پر حادثہ رونما ہوتا گیا۔ پولیس اور احمدیوں پر حملے کئے گئے۔ اور حکومت یا احمدیوں کے اموال و جائداد کو آگ لگانے اور لوٹنے کا ہنگامہ جاری رہا۔ زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری جو حکم صادر کیا گیا تھا کہ پانچ یا پانچ سے زیادہ اشخاص ایک جگہ جمع نہ ہوں۔ وہ شہر بھر میں توڑ دیا گیا تھا۔ ہجوم ہر جگہ جمع ہو رہے تھے۔ لوگ اُن لوگوں کو گالیاں اور دھمکیاں دے رہے تھے جو گاڑیوں میں سوار نظر آتے تھے۔ بعض حالات میں ان لوگوں کو گھسیٹ کر سواریوں سے اُتار دیا گیا۔ باغبانپورہ کا ایک احمدی مدرس منظور احمد چھرے کی ضرب سے ہلاک کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد قتل۔ لوٹ اور آتش زنی کے مزید واقعات ہوئے۔ حکومت کی بعض اومنی بسیں بالکل جلا کر خاکستر کر دی گئیں۔ اور دو ڈاک خانے پہلے لوٹے گئے۔ اور پھر جلا دئے گئے۔ پولیس کی ایک گاڑی کو آگ لگا دی گئی۔ اور چھ اور گاڑیاں توڑ پھوڑ دی گئیں۔ بہت سے پرائیویٹ کاروباری مرکز بھی لوٹ لئے گئے۔ پولیس کا ایک دستہ چند نعشوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے میو ہسپتال لے جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک ہجوم آن پہنچا جس نے ان نعشوں کو چھیننے کی کوشش کی تاکہ عوام کے سامنے اُن کا مظاہرہ کیا جاسکے۔ اس کشمکش میں دو کانسٹیبل مجروح ہو گئے۔ کئی مقامات پر پولیس پر خشت باری کی گئی۔ اور دو جگہ اس پر گولی بھی چلائی گئی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل گولی سے زخمی ہوا۔ لوہاری دروازے کے باہر فوج کے ایک گشتی دستے پر بھی اینٹیں پھینکی گئیں۔ چنانچہ اس دستے کو بھی گولی چلانی پڑی۔ پولیس کو دن بھر میں کئی مقامات پر گولی چلانی پڑی۔ سکریٹریٹ اور دوسرے کئی دفتروں کے کلرکوں نے کام چھوڑ دیا۔ اور باہر نکل آئے۔ اسلامیہ کالج کے طالب علم بھی کلاسیں چھوڑ کر دیال سنگھ کالج کو روانہ ہو گئے۔ اور اس کالج کے طالب علموں کو اپنے میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا۔ انہوں نے خشت باری کر کے دروازوں

اور کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے۔ اور پرنسپل کی موٹر کار کو بھی توڑ پھوڑ دیا۔ دیال سنگھ کالج سے وہ یونیورسٹی ہال پہنچے اور وہاں سے گورنمنٹ کالج جا نکلے۔ ان کو بزور منتشر کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ کیونکہ پولیس طلبہ سے تصادم پیدا کرنے پر آمادہ معلوم نہ ہوتی تھی ٭

سائیکلوسٹائل سے چھاپے ہوئے اشتہار دیواروں پر چسپاں کئے گئے۔ جن میں پولیس کے آدمیوں سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہتھیار ڈال دیں۔ کیونکہ حکومت کے خلاف جدوجہد ایک "جہاد" ہے جس میں کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان پر گولی نہ چلانی چاہیئے ٭

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کرفیو لگا کر حکم دیا کہ ۵ اور ۶ مارچ کی درمیانی شب کو ساڑھے تین بجے شام سے چھ بجے صبح تک اور ۶ سے ۱۱ مارچ تک ۶ بجے شام سے ۶ بجے صبح تک کوئی شخص کسی سڑک بازار۔ گلی۔ چھوٹی گلی شارع عام یا کسی پبلک مقام پر باہر نہ نکلے۔ اس حکم کا اطلاق پورے شہر پر ہوتا تھا۔ صرف سول لائنز کا ایک حصہ مستثنےٰ قرار دیا گیا تھا۔ اس رقبے کے اندر کسی پبلک مقام پر پانچ یا پانچ سے زیادہ اشخاص کا اجتماع اور دن اور رات کے کسی حصے میں بھی اسلحہ اُٹھا کر چلنا بھی دو مہینے کے لئے ممنوع قرار دیا گیا تھا ٭

صبح کو گورنر نے کابینہ کا ایک اجلاس منعقد کیا جس میں چیف سکرٹری۔ ہوم سکرٹری۔ جنرل آفیسر کمانڈنگ دہم ڈویژن بعض سٹاف افسر۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی طلب کئے گئے۔ اس جلسے میں جو وزرا و حکام شریک ہوئے۔ ان سے گورنر نے کہا کہ قوت کا استعمال نہایت مضبوطی سے کرو۔ کیونکہ میرا بمبئی کا تجربہ یہی ہے کہ اگر فساد کے اولین مرحلوں پر بلوائی کثیر تعداد میں ہلاک کر دئے جائیں تو بلوہ وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ اس اجلاس میں طویل بحث مباحثہ کے بعد مندرجہ ذیل فیصلے کئے گئے:۔

(۱) چونکہ لاہور کی صورت حالات بدتر ہو چکی ہے۔ اور شہر بھر میں عام ہنگامہ برپا ہے۔ اسلیئے اولاً پولیس کو چاہیئے کہ فسادات کو فرو کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ جتنی قوت کا استعمال ضروری ہو۔ اس سے کام لے کر شدید اقدام کرے۔ پولیس کے گشتی دستوں کی امداد کے لئے فوجی دستے بھی مامور رہیں گے۔ جو اپنے کمانڈروں کے ماتحت رہیں گے۔

(۲) اگر پولیس کسی خاص حصہ شہر کی حالت پر قابو پانے سے عاجز ہو۔ تو جو سینیئر پولیس افسر وہاں موجود ہو اس کو چاہیئے۔ کہ اس حصے کی صورت حالات کا انتظام اپنے ساتھ کے فوجی کمانڈر کے حوالے کر دے ٭

(۳) اگر مندرجہ بالا تدابیر قانون و انتظام کی بحالی میں ناکام رہیں اور پولیس فوج کی اس جزوی امداد سے بھی عام صورت حالات پر قابو نہ پا سکے۔ تو فوج سے کہا جائے گا کہ شہر کا چارج لے لے ٭

(۴) پولیس کے حوصلوں کو بلند رکھنے کی ہر تدبیر عمل میں لائی جائے۔ پولیس کے آدمیوں کو

بتا دیا جائے کہ جو لوگ بہادری کا ثبوت دیں گے۔ اور اپنے فرائض کو امتیاز اور دیانتداری سے انجام دیں گے۔ ان کو مناسب انعامات دیئے جائیں گے ان کو یہ بھی بتا دیا جائے کہ اگر ادائے فرض کے دوران میں کوئی جانی نقصان ہو گیا تو وارث کو کافی معاوضہ عطا کیا جائے گا۔ سید فردوس شاہ مرحوم کے وارثوں کو حکومت کسی کالونی کے ضلع میں دو مربعے اراضی عطا کرے گی ؛

(۵) جہاں تک ممکن ہو طالب علموں کو بلوائیوں سے الگ رکھنے کی کوشش کی جائے ؛

(۶) ہز اکسیلینسی گورنر آج تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندہ معزز شہریوں سے خطاب کرینگے۔ کہ وہ شہر میں عقل و ہوش کو بحال کرنے میں اپنے اثر کو استعمال کریں ؛

چیف سیکرٹری سے کہا گیا کہ وہ ایک بیان کا مسودہ تیار کریں جو ان معزز شہریوں کے دستخطوں سے جاری کیا جائے۔ جو آج سہ پہر کے وقت مدعو کئے گئے ہیں لیکن چونکہ چیف سیکرٹری صاحب سیکرٹریٹ میں بلائے گئے تھے جہاں کلرکوں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔ اسلئے اس بیان کا مسودہ ہوم سیکرٹری نے تیار کیا۔ ہوم سیکرٹری کے لکھے ہوئے مسودے کے متعلق گورنر نے یہ رائے دی کہ اس میں مطالبات کی اس قدر زیادہ مذمت کی گئی ہے کہ نمائندگانِ عوام سے اس کی منظوری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ سیکرٹریٹ سے واپسی پر چیف سیکرٹری نے بھی مسودہ تیار کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر یہ خیال ترک کر دیا گیا ؛

سہ پہر کے جلسے میں گورنر اور چیف منسٹر کے ایما پر انسپکٹر جنرل پولیس نے صورت حالات کی مفصل کیفیت بیان کی ان کے بعد دو اور مقررین یعنی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مسٹر احمد سعید کرمانی ایم ایل اے نے تقریریں کیں۔ مولانا نے صورت حالات کو حکومت اور عوام کے درمیان خانہ جنگی سے تعبیر کیا۔ اور بتایا کہ جب تک حکومت عوام کے مطالبات کے متعلق غور کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کریگی۔ میں کسی اپیل میں شریک نہیں ہو سکتا۔ مسٹر کرمانی نے کہا کہ اس تحریک کی قیادت اب زیادہ تر بازاری غنڈوں اور دوسرے غیر ذمہ دار اشخاص کے ہاتھ میں ہے اور تعلیم یافتہ لوگ اس کے ساتھ نہیں ہیں۔ جب مسٹر کرمانی تقریر کر چکے۔ تو چیف سیکرٹری۔ ہوم سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس نے باہر جانے کی اجازت طلب کی۔ تاہم یہ اجلاس جاری رہا۔ اور مولانا مودودی ایک اپیل کا مسودہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن وہ مسودہ گورنر اور چیف منسٹر نے قبول نہ کیا ؛

گورنمنٹ ہاؤس میں شام کو ایک اور اجلاس ہوا جس میں وزرا۔ جنرل آفیسر کمانڈنگ۔ برگیڈیر حق نواز۔ برگیڈیر ایف آر کاد۔ چیف سیکرٹری۔ ہوم سیکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اور ملک حبیب اللہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی شامل تھے۔ صورت حالات پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ لاقانونی کا آخری واقعہ ڈھائی بجے بعد دوپہر ہوا تھا۔ جس میں پولیس کے ایک دستے پر حملہ کیا گیا تھا۔ اور پولیس کی ایک گاڑی جلا دی گئی تھی۔ اسلئے جہاں تک ممکن ہو اب گولی

چلانے سے پرہیز کیا جائے۔ گورنر نے کہا کہ کرفیو کی خلاف ورزی کے معمولی واقعات پر توجہ نہ کی جائے اور حکام میں سے ایک نے یا خود گورنر نے یہ تجویز بھی کی کہ گولی چلانا بند کر دیا جائے۔ فائرنگ کو نرم کر دینے کا فیصلہ ان پولیس افسروں کے لئے بیحد پریشان کن ثابت ہوا جو صورت حالات پر قابو پانے میں مصروف تھے۔ صبح کے احکام تو یہ تھے کہ پولیس کو مضبوط تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ چنانچہ مسٹر ایس این عالم اور ملک حبیب اللہ کی کمان میں پولیس کے گشتی دستے انہی ہدایات کے ساتھ بھیج دئے گئے تھے جب شام کے احکام کوتوالی کے مرکز میں پہنچے۔ اور وہاں سے ان افسروں کو پہنچائے گئے۔ جو عملی اقدامات میں مصروف تھے تو وہ بالکل ششدر و مبہوت رہ گئے۔ اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اب کیا کریں پولیس کی بکھری ہوئی ٹولیاں بالکل پریشانی کی حالت میں تھیں۔ رات کے وقت صرف ایک موقع پر گولی چلائی گئی جب ریلوے ملازمین کے ایک ہجوم نے ہڑتال کر دی تھی اور ایک سگنل اور ایک ٹرین کو تباہ کرنے میں مصروف تھا ۔

۵- مارچ کے دو ایسے واقعات ہیں جو ہمارے سامنے بحث و مناقشہ کا موضوع بنے رہے۔ اس میں پہلا واقعہ تو یہ تھا۔ کہ دوپہر کے وقت گوال منڈی میں گولی چلائی گئی۔ جس میں (بیان کیا جاتا ہے کہ) بہت سے اشخاص ہلاک ہوئے جن میں عبد العزیز۔ مودی۔ نظام دین اور محمد حبیب بھی شامل تھے۔ احرار اور مجلس عمل کا بیان ہے کہ ان لوگوں کو ملک خان بہادر خان سپرنٹنڈنٹ پولیس پنجاب کنسٹیبلری اور اے ایس آئی عبد الکریم نے ہلاک کیا۔ جو ان دنوں تھانہ گوالمنڈی میں تعینات تھا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ عبد العزیز اور مودی کو عبد الکریم نے اور نظام دین اور محمد حبیب کو ملک خان بہادر خان نے رائفل کی گولیوں سے ہلاک کیا۔ اس بیان کو ثابت کرنے کے لئے جو گواہ طلب کئے گئے۔ وہ یہ ہیں :-

ہدایت اللہ نمبر ۴۵ حسین بخش نمبر ۴۶۔ غلام احمد نمبر ۴۸۔ چراغ دین نمبر ۴۹۔ عبد الرؤف نمبر ۵۰
ماسٹر عبد المجید نمبر ۵۱۔ حکیم محمد جمیل نمبر ۵۳۔ مہر دین نمبر ۵۴۔ سراج دین نمبر ۵۵۔ محمد حنیف نمبر ۵۶
غلام حسین نمبر ۵۷۔ تاج دین نمبر ۵۸۔ علاؤ الدین نمبر ۵۹۔ سردار محمد نمبر ۶۰ اور مقبول احمد نمبر ۶۱

اس واقعہ کی علیحدہ تفتیش مسٹر عطا محمد خان نون ڈی آئی جی۔ مسٹر عبد الحی مجسٹریٹ اور ایک فوجی افسر نے بھی کی۔ اس تفتیش میں بھی ان دونوں افسروں میں سے کسی کے خلاف کسی چیز کا ثبوت فراہم نہیں ہو سکا۔ حالانکہ ہمارے سامنے شہادت میں ان دونوں پر بیگناہوں کے خون ناحق کا الزام لگایا گیا تھا۔

اس فائرنگ کا سراغ اس سے پیشتر کے ایک واقعہ میں معلوم ہوتا ہے۔ جس کی رپورٹ ابتدائی نمبر ۷ تھانہ گوال منڈی میں لکھوائی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں یہ لکھا تھا۔ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ کئی سو آدمی گوال منڈی میں اے ایس آئی عبد الکریم کے گھر کو آگ لگا رہے ہیں جس نے اس دن میو ہسپتال کے قریب گولی چلائی تھی۔ یہ اطلاع موصول ہوتے ہی اے ایس آئی فیض احمد۔ اے ایس آئی سلطان احمد اور ہیڈ کانسٹیبل عبد القادر پولیس کا ایک دستہ ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچے۔ انہوں نے ہجوم کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان پر ایک مکان کی چھت پر سے گولی چلائی گئی جو ہیڈ کانسٹیبل عبد القادر کے لگی

ایک کانسٹیبل کو چھری سے پیٹا گیا *

متنازعہ واقعہ غالباً اس سے کچھ دیر بعد رونما ہوا۔ اور یہ بالکل ممکن ہے کہ پولیس نے عبدالقادر ہیڈ کانسٹیبل اور ایک پیادہ کانسٹیبل کے زخمی ہو جانے کی وجہ سے انتقاماً گولی چلائی ہو۔ اے ایس آئی عبدالکریم قطعی طور پر منکر ہے کہ وہ اس فائرنگ کے وقت موجود تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اُس دن اس نے اپنے ریوالور سے صرف تین راؤنڈ چلائے۔ ایک گندے انجن کے پاس۔ دوسرا چوک امیر علی کے پاس اور تیسرا اپنے گھر کے قریب۔ لیکن ان فائروں سے کوئی ہلاک نہیں ہوا۔ تاہم وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس دن ملک خان بہادر خان سپرنٹنڈنٹ پولیس پنجاب کانسٹیبلری کے حکم سے گوال منڈی میں کوئی دوسری فائرنگ ہوئی تھی۔ جس کا واقعہ متنازعہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہم اس واقعہ کے متعلق اپنی کوئی رائے ظاہر کرنے سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ ہماری شرائط تحقیقات کا دائرہ اس کا متقضی ہے کہ ہم صرف اختیار کردہ تدابیر کے کافی یا ناکافی ہونے کے متعلق رپورٹ کریں۔ حد سے زیادہ فائرنگ ہمارے دائرہ تحقیقات سے باہر ہے۔ بجز اس حالت کے کہ ایسی فائرنگ فسادات میں اضافہ کرنے کا باعث ہوئی ہو *

۵۔ مارچ کے واقعات کے متعلق دوسرا متنازعہ فیہ امر کابینہ کا وہ اجلاس تھا جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ساڑھے چھ بجے شام گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا تھا۔ جس کی صدارت گورنر نے کی تھی۔ اور جس میں میجر جنرل محمد اعظم خان جی او سی۔ برگیڈیر حق نواز۔ برگیڈیر کلو۔ چیف سیکرٹری۔ ہوم سیکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس اور ملک حبیب اللہ اے ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی بھی شامل ہوئے تھے۔ اس اجلاس کے فیصلوں میں ایک مبینہ فیصلہ یہ تھا کہ فائرنگ کو نرم کر دیا جائے۔ گورنر اور جی او سی دونوں اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ کوئی ایسا اجلاس ہوا تھا۔ لیکن چیف سیکرٹری۔ ہوم سیکرٹری انسپکٹر جنرل پولیس اور ملک حبیب اللہ قطعی طور پر کہتے ہیں کہ ایسا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس کی کارروائی ملک حبیب اللہ نے کاغذ کے ایک پرزے پر نوٹ کی تھی (EX.D.E 231) وہ پرزہ انہوں نے جلسے کے کچھ دیر بعد ہوم سیکرٹری کے حوالے کر دیا تھا۔ اور ہوم سیکرٹری نے اس کو اپنے تحریری بیان کے ساتھ عدالت میں پیش کیا تھا۔ اس تحریر کے اندر اس کے صحیح ہونے کی شہادت موجود ہے کیونکہ یہ بہت عجلت میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اس کے بعض فقرے واضح طور پر نامکمل ہیں۔ اس میں اجلاس کا وقت ساڑھے چھ بجے شام لکھا ہے۔ حاضر اشخاص کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ اور اجلاس کے پانچ فیصلے بھی درج ہیں۔ جن میں ایک یہ تھا: "ہز ایکسیلنسی نے کہا۔ کہ کرفیو کی معمولی اصطلاحی خلاف ورزیوں پر کوئی کارروائی نہ کی جائے" اس تحریر میں نہ فائرنگ میں کمی کرتے" کے الفاظ درج ہیں نہ "let up" کا لفظ لکھا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ نہ مسٹر چندریگر کو اور نہ میجر جنرل محمد اعظم خان کو واضح طور پر وہ باتیں یاد رہی ہوں جو اس وقت کی پریشانی اور گڑبڑ میں ہوئی تھیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکام نے جس کو رسمی اجلاس بتایا ہے وہ

محض ایک بحث و مشورہ کی مجلس ہو جس میں حاضرین نے بعض ایسے خیالات ظاہر کیے ہوں جن پر عمومی حیثیت سے اتفاق ہو گیا ہو اور ملک حبیب اللہ ان کو ایک رسمی اجلاس کے فیصلہ جات قرار دے رہے ہوں۔ یہ نکتہ کچھ ایسی اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ مسٹر چندریگر خود تسلیم کرتے ہیں کہ اس دن گفت و شنید کے دوران میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی۔ کہ کرفیو کی اصطلاحی خلاف ورزی کی حالت میں کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے۔ کہ صبح کے فیصلوں میں کچھ تبدیلیاں تجویز کی گئیں اور قبول بھی کر لی گئیں۔ اور ان تبدیلیوں کو پولیس نے خدا جانے کیوں اس امر کی ہدایت سمجھ لیا کہ وہ صبح کے فیصلوں کے مطابق فساد کو دبانے کے لیے قوت کا استعمال جس حد تک کر رہے ہیں اُس حد تک نہ کریں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس اجلاس کے بعد پولیس نے اکوریا پل کے سوا اور کسی مقام پر کوئی گولی نہیں چلائی۔ اس سے قطعی طور پر ظاہر ہے کہ پولیس کو فائرنگ کے نرم کرنے کی ہدایت ضرور دی گئی ہو گی۔

۶۔ مارچ : ۶ مارچ کو جمعہ کا دن تھا۔ اور صبح سویرے ہی سے تمام اطراف سے جلوس مسجد وزیر خان میں دھڑا دھڑ پہنچ رہے تھے۔ حکومت کے دفاتر نے کام بند کر دیا۔ لوکو اور کیرج کی ورکشاپیں بند ہو گئیں۔ اور مزدور پوری تعداد میں تحریک سے اظہار ہمدردی کے طور پر باہر نکل آئے۔ غیظ میں بھرے ہوئے ہجوم نے کوتوالی کا محاصرہ کر لیا۔ لوگ اس عمارت پر پتھر پھینک رہے تھے۔ اور مطالبہ کر رہے تھے کہ جن سینئر پولیس افسروں نے گولی چلائی ہے وہ ان کے حوالے کر دئے جائیں۔ چونکہ تازہ ترین احکام یہ تھے کہ گولی چلانے سے حتی الامکان احتراز کیا جائے۔ اسلئے ہجوم کو دُور رکھنے کی غرض سے اشک آور گیس کے بم کوتوالی کی چھت سے پھینکے گئے۔ لیکن جونہی اشک آور گیس ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ ہجوم دوبارہ کوتوالی پر یورش کرنے لگا۔ جس وقت انسپکٹر جنرل پولیس کوتوالی کی طرف آ رہے تھے۔ ایک ہجوم نے جو کاروں۔ تانگوں اور سائیکلوں پر سوار اشخاص کو روک رہا تھا ان کی موٹر کار کو بھی ریلوے سٹیشن کے قریب روکا۔ انہوں نے نولکھا تھانہ کے قریب ایک ٹینک دیکھا جس کے گرد کوئی محافظ حلقہ نہ تھا لیکن کچھ فوجی سپاہی موجود تھے۔ اور لوگ اس ٹینک کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ سرکلر روڈ کے ایک زیریں پل کے پاس ان کو ایک اور ہجوم نے روکا۔ جس کی قیادت ایک ڈاڑھی والا آدمی کر رہا تھا۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح آگے نکل گئے۔ انہوں نے ایک اور ہجوم کو دیکھا جو ایک گھوڑا گاڑی کا تعاقب لاٹھیوں سے کر رہا تھا۔ آخر اس نے گاڑی کو جا لیا۔ اور گھوڑے کو کھول دیا۔ کوتوالی کے قریب پہنچ کر انہوں نے سُنا۔ کہ ہجوم یہ نعرے لگا رہا ہے۔ شاہی پولیس زندہ باد پاکستانی فوج زندہ باد۔ پولیس کانسٹیبلری اور بارڈر پولیس مردہ باد۔ کوتوالی میں آئی جی نے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس مرزا نعیم الدین سے ملاقات کی۔ اور دونوں نے واقعات کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔ مرزا نعیم الدین نے اس گفتگو کے دوران میں کیا کہا۔ اس کے متعلق میاں انور علی انسپکٹر جنرل پولیس اور مرزا نعیم الدین سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بیانوں میں ایک شدید اختلاف ہے۔ اس نکتہ پر میاں انور علی کی شہادت درج ذیل ہے :-

"انہوں نے (مرزا نعیم الدین نے) کہا کہ لوگوں کا کسی نہ کسی وجہ سے یہ خیال ہے کہ حکومت غلطی پر ہے۔ اور نہ صرف غیر ہمدرد ہے۔ بلکہ عملاً مخالف ہے۔ ان حالات میں قوت کا استعمال عام احساسات کو تیز و تند کر رہا ہے۔ اور تلخ کامی میں اضافے کا باعث ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب تک حکومت نے مطالبات کے متعلق اپنا رویہ معیّن نہیں کیا۔ نہ اس امر کے آثار نظر آتے ہیں کہ حکومت ان پر غور کرنے کے لئے تیار ہے مرزا نعیم الدین کے نزدیک اس وجہ سے صورت حالات زیادہ دشوار ہو رہی ہے۔ وہ اس امر کے خواہاں تھے کہ اپنا خیال چیف منسٹر کی خدمت میں پیش کریں۔ اور کہیں کہ محض سختی کرنے سے صورت حالات پر قابو پانے کی کوئی صورت نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت پنجاب لوگوں کو اس بات کا یقین دلائے کہ وہ اتنی غیر ہمدرد اور سنگدل نہیں جتنا اس کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اور وہ مطالبات کا فیصلہ کرانے کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کر رہی ہے۔ ان کے نزدیک اس قسم کی اپیل سے حکومت کے خلاف تلخی اور عناد کے جذبات فرو ہو جائیں گے جو بحالت موجودہ واضح طور پر تیز تر ہو رہے ہیں...... (گورنمنٹ ہاؤس پہنچنے کے بعد) میں نے سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کو چیف منسٹر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور انہوں نے وہاں بھی وہی باتیں دہرائیں جو مجھ سے کی تھیں۔"

لیکن مرزا نعیم الدین نے آئی جی سے اپنی گفت و شنید کے متعلق جو بیان دیا وہ درج ذیل ہے:۔

"میں کوئی سات بجے صبح کوتوالی پہنچا۔ اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد انسپکٹر جنرل پولیس بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں نے صورت حالات کے متعلق انسپکٹر جنرل سے بات چیت کی اور ان کو بتایا کہ صورت حالات نہایت خطرناک ہے اور حکومت کی کمزور پالیسی اب پولیس کے حوصلوں کو بھی پست کر رہی ہے حالانکہ حکومت کی مشینری کا یہی پرزہ (یعنی پولیس) اب اس کی حمایت میں کھڑا ہے۔ میں نے ان پر زور دیا کہ وہ ہز ایکسیلینسی اور عزت مآب چیف منسٹر صاحب پر اس امر کی صراحت کر دیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ اگر حکومت اپنی پالیسی میں ترمیم نہ کرے گی۔ تو میں استعفےٰ دے دوں گا انسپکٹر جنرل نے مجھ سے اتفاق کیا۔ اور ہم دونوں گورنمنٹ ہاؤس کو گئے"۔

ان دونوں بیانوں کا مقابلہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں مسٹر انور علی کے بیان کے مطابق مرزا نعیم الدین قوت کے استعمال کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ حکومت مطالبات کے متعلق اپنے رویّے کی وضاحت کرے۔ اور اعلان کرے کہ وہ غیر ہمدرد اور سنگدل نہیں۔ اور حتی الوسع کوشش کر رہی ہے کہ مطالبات کے متعلق کوئی فیصلہ کرے۔ وہاں مرزا نعیم الدین کا بیان یہ ہے کہ میرے نزدیک حکومت کمزور پالیسی پر عمل کر رہی ہے جس سے پولیس کا حوصلہ پست ہو رہا ہے اور اگر یہ پالیسی تبدیل نہ کر دی گئی۔ تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔ علاوہ بریں مرزا نعیم الدین نے اس

بات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ کہ وہ گورنمنٹ ہاؤس میں چیف منسٹر کے سامنے طلب کئے گئے اور انہوں نے چیف منسٹر سے کیا کہا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر انور علی کے قول کے مطابق مرزا نعیم الدین نے کوئی ایسی بات ضرور کی تھی۔ اگرچہ مرزا نعیم الدین اس سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن مسٹر چندریگر اور مسٹر دولتانہ کی شہادتوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔

اب سلسلہ حکایت پھر شروع ہوتا ہے۔ انسپکٹر جنرل پولیس اور سینیر سپرنٹنڈنٹ پولیس کوتوالی سے چیف منسٹر کی کوٹھی پر پہنچے۔ جہاں انہیں معلوم ہوا کہ وہ گورنمنٹ ہاؤس چلے گئے ہیں۔ راستے میں انہوں نے دیکھا کہ تمام دکانیں بند ہیں اور آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں شرارت کی نیت سے اِدھر اُدھر گھوم رہی ہیں۔ چیف منسٹر کی کوٹھی سے یہ دونوں گورنمنٹ ہاؤس گئے۔ گورنمنٹ ہاؤس پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ چیف منسٹر اور دوسرے تمام وزراء وہاں موجود تھے ان کے علاوہ لاہور کارپوریشن کے ممبر جن میں بعض خواتین مثلاً بیگم تصدق حسین اور بیگم جی اے خان بھی تھیں۔ کارپوریشن کے میئر اور نواب مظفر علی خاں قزلباش بھی حاضر تھے۔ عطا اللہ جہانیاں بھی بعض طالب علم ورکروں کے ساتھ وہاں موجود تھے ۔

چیف سیکرٹری اور ہوم سیکرٹری صبح سکرٹیریٹ گئے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ سیکرٹیریٹ کے ملازم احاطے میں جمع ہیں۔ اور فائرنگ کو روکنے اور مطالبات کو تسلیم کرنے کا مطالبہ بلند آہنگی سے کر رہے ہیں۔ مسٹر عالم ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس بھی وہاں پہنچ گئے تھے ان تینوں نے کلرکوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان میں سے کسی نے ان کی ایک نہ سُنی۔ وہ ہر دلیل کے جواب میں یہی کہتے رہے کہ ہمارا مطالبہ پورا کیا جائے۔ یعنی فائرنگ بند کیا جائے اور مطالبات پورے کئے جائیں اور یہ مطالبہ ٹیلیفون پر گورنر اور چیف منسٹر کو پہنچا دیا جائے جب چیف سیکرٹری نے یہ وعدہ کیا۔ کہ وہ ان کے کیس کی پوری نمائندگی حکومت سے کر دیں گے۔ اور ہوم سیکرٹری نے یہ دھمکی دی کہ اگر انہیں باہر نکلنے کی اجازت نہ دی گئی تو فوج اور پولیس آکر کارروائی کرے گی۔ جب جاکر ان سیکرٹریوں کی موٹر کاروں کو چلنے کا موقع دیا گیا۔ جن کو کلرکوں نے گھیر کر روک رکھا تھا۔ جب سیکرٹری گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچے تو انہوں نے اس کو شور و شغب کا ہنگامہ زار پایا۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا۔ اس کی کیفیت ہوم سیکرٹری نے ذیل کے الفاظ میں بیان کی ہے :-

"کثیر التعداد لوگ جن میں لاہور کے کونسلر بھی شامل تھے۔ وہاں موجود تھے۔ اور جو شائستگی کی فضا گورنمنٹ ہاؤس میں ہوا کرتی ہے۔ وہ بالکل مفقود تھی۔ ہز ایکسیلنسی گورنر۔ چیف منسٹر اور ارکان کابینہ ہز ایکسیلنسی کے دفتر میں جمع تھے میں نے اندر جاکر مختصراً ان کو بتایا۔ کہ سیکرٹیریٹ میں کیا واقعات پیش آئے تھے۔ شہر میں جو مختلف واقعات رونما ہو رہے تھے ان کی اطلاعات موصول ہونے لگیں۔ گورنر کی کوٹھی کی بجلی کاٹ دی گئی تھی۔ اور کسی نے ٹیلیفون پر مسٹر ایس ایس جعفری سی ایس پی کا یہ پیغام وصول کیا کہ انارکلی کی بعض دکانیں جل رہی

ہیں یہ اطلاع بھی ملی کہ ٹیلیگراف آفس اور ٹیلیگراف ایکسچینج کے ملازموں نے ہڑتال کر دی ہے انسپکٹر جنرل پولیس اور سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جو کوتوالی سے آئے تھے۔ یہ بتایا کہ کوتوالی کم وبیش محاصرے میں ہے اور صورت حالات نہایت تشویش انگیز ہے۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے مجھے سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی یہ رائے بتائی کہ شہر کا انتظام صرف قوت کے استعمال سے بحال نہ کیا جا سکے گا۔ اسلئے عوام کی تسکین کے لئے بھی کچھ کرنا چاہئے۔ اور حکومت کو ایک بیان شائع کرنا چاہئے۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے یہ بھی کہا کہ میں اس رائے کو گورنر صاحب اور چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس لاہور رینج بھی گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گئے "۔

شہر کی صورت حالات نہایت سرعت کے ساتھ نازک نقطے پر پہنچ رہی تھی۔ ریلوے کے ملازمین نے انجن شیڈ میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا اور کسی انجن کو باہر نکلنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ لاہور اور مغلپورہ کے درمیان ریلوے کی پٹڑی توڑ دی گئی تھی۔ اور شاہدرہ سے آنے والی ایک ٹرین راستے میں روک لی گئی تھی۔ وائی ایم سی اے کی عمارت کے قریب آٹومیٹک ٹریفک سگنل کو ایک ہجوم نے جلا دیا تھا۔ اور اب کمرشل بلڈنگ کو لوٹنے والا تھا۔ کچھ مزید سرکاری بسیں جلا دی گئی تھیں۔ چیف انجنیئر الیکٹرسٹی کو کارکنوں نے ایک رسمی نوٹس دے دیا تھا۔ کہ اگر گورنمنٹ ہاؤس اور جی او آر اسٹیٹ میں رہنے والے وزیروں اور افسروں نے رضامندی کے ساتھ بجلی نہ کاٹ دی تو شہر بھر میں اندھیرا کر دیا جائے گا۔ ایک شخص چیف انجنیئر کی طرف سے یہ اطلاع لے کر آیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ اس نوٹس کا فوری جواب دیا جائے۔ عین اس وقت گورنمنٹ ہاؤس کی بجلی کاٹ دی گئی۔ اور سیکروفون بیکار ہو گیا ؛

جب ہوم سیکرٹری گورنر کے سیکرٹری کے کمرے میں گئے تو انہوں نے دیکھا کہ گورنر۔ چیف منسٹر اور بعض وزرا کراچی کو ٹیلیفون کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہوم سیکرٹری نے اس کمرے کے حاضرین سے بات چیت کی اور ان کو بتایا کہ صورت حالات پر اسی صورت میں قابو پایا جا سکتا ہے۔ کہ مندرجہ ذیل کارروائی کی جائے :-

(۱) مجلس احرار پاکستان اور جماعت اسلامی خلاف قانون انجمنیں قرار دی جائیں ؛

(۲) ایسے علما اور مولویوں کو جو عقل کی بات سن سکیں۔ اور قانون وانتظام کی بحالی میں حکومت کی امداد کرنے پر آمادہ ہوں۔ ترغیب دی جائے۔ کہ باہر نکلیں۔ اور ختم نبوت کے نام سے جو لاقانونی پھیل رہی ہے۔ اس کی علی الاعلان مذمت کریں ؛

(۳) مرکزی کابینہ سے استدعا کی جائے کہ وہ اپنے ایک وزیر کو فی الفور لاہور بھیجیں ؛

(۴) شہر مکمل طور پر فوج کے حوالے کر دیا جائے ؛

ہوم سیکرٹری نے مشورہ دیا کہ مرکز سے فی الفور گفتگو کی جائے۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ

ٹیلیفون کسی وقت بھی بیکار ہو جائے۔ انہوں نے ملٹری ٹرنک لائن پر کراچی سے ٹیلیفون کا رابطہ قائم کر دیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ دفعتہً منقطع ہو گیا۔ ہوم سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس بھی جو کمرے میں آ گئے تھے۔ اس وقت باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد گورنر نے ہوم سیکرٹری کو طلب کیا۔ اور اُن کو انگریزی میں کچھ نکات بتا کر کہا کہ ان کے مطابق اردو میں ایک بیان کا مسودہ تیار کریں۔ ہوم سیکرٹری نے جواب دیا۔ کہ میں اُردو میں مسودات لکھنے کی مہارت نہیں رکھتا اسلئے یہ کام مسٹر ذوالقرنین خان سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ چیف منسٹر کی ہدایات کا مفاد ہوم سیکرٹری نے گورنر اور چیف منسٹر کے سامنے مسٹر ذوالقرنین خان کو سمجھا دیا چیف منسٹر نے کہا کہ یہ مسودہ فوراً لکھ کر پیش کیا جائے۔ کیونکہ وہ کراچی سے ٹیلیفون پر بات کرنے والے ہیں مسٹر ذوالقرنین خان نے بیان کا جو ابتدائی مسودہ تیار کیا۔ وہ یہ تھا:۔

"وزیر اعلیٰ پنجاب اپنی اور اپنی وزارت کی جانب سے یہ اعلان کرتے ہیں۔ کہ ان کی حکومت تحفظ ختم نبوت کے لیڈران سے فوری گفت و شنید کے لئے تیار ہے۔ اور وہ عوام سے درخواست کرتے ہیں کہ ملک میں امن وامان قائم کرنے میں وہ ان کا ہاتھ بٹائیں۔ وہ عوام کو اطمینان دلاتے ہیں کہ پولیس اور فوج کوئی متشددانہ کارروائی بالخصوص فائرنگ نہیں کریگی۔ تاوقتیکہ ان کو کسی کے جان و مال کی حفاظت کے لئے ایسا کرنا نہ پڑے۔ صوبائی حکومت مرکزی حکومت سے گفت و شنید کر رہی ہے اور میاں ممتاز محمد خان دولتانہ بہ حیثیت صدر صوبہ مسلم لیگ۔ پاکستان کے صدر کے سامنے پنجاب کے عوام کی طرف سے یہ مطالبات فوری توجہ کے لئے پیش کر رہے ہیں"۔

جب چیف منسٹر نے اس بیان کو پڑھا تو انہوں نے کہا کہ یہ بالکل غیر موثر ثابت ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ذیل کے الفاظ بڑھا دینے کا حکم دیا:۔

"پنجاب کے عوام کی طرف سے" کے بعد "اپنی تائید کے ساتھ" اور آخر میں "کیونکہ یہ قوم کے متفقہ مطالبات ہیں" کے الفاظ بڑھا دئے جائیں۔

یہ بیان سائیکلوسٹائل کیا جا رہا تھا کہ چیف منسٹر نے اس میں ذیل کے الفاظ کا اضافہ کرنے کی خواہش کی:۔

"صوبائی حکومت کا ایک وزیر طیارے کے ذریعے ان مطالبات اور ہماری تائید کے ساتھ آج ہی کراچی بھیجا جا رہا ہے۔ ہماری پُرزور سفارش ہے کہ چودھری ظفراللہ خان کو وزارت سے مستعفی ہونے پر فوراً مجبور کیا جائے"۔

گورنر اور چیف منسٹر دونوں کی خواہش یہ تھی کہ یہ بیان نماز جمعہ سے پہلے ہوائی جہاز سے مسجدوں میں گرایا جائے۔ گورنر نے چیف منسٹر اور کابینہ کی موجودگی میں ہوم سیکرٹری کو حکم دیا کہ یہ بیان ٹیلیفون پر خلیفہ شجاع الدین کو سُنادیں۔ جو اُسی دن یا ایک دن قبل کے ایک منتخبہ

اشتہار کے رُو سے مجلس عمل کے چوتھے ڈکٹیٹر مقرر کئے گئے تھے، ہوم سیکرٹری نے حکم کی تعمیل میں یہ بیان خلیفہ شجاع الدین کو پڑھ کر سنا دیا۔ اور گورنر کی خواہش کے مطابق اس کی نقلیں بھی خلیفہ صاحب کی کوٹھی پر بھجوا دیں۔ گورنر صاحب خلیفہ صاحب کو مطمئن کرنے کے لئے بہت فکر مند معلوم ہوتے تھے کیونکہ انہوں نے کئی دفعہ دریافت کیا۔ کہ آیا خلیفہ صاحب کو بیان کی کاپیاں ارسال کر دی گئی ہیں یا نہیں۔ گورنر نے انسپکٹر جنرل پولیس کو ہدایت کی۔ کہ اس بیان کو لاوڈ سپیکر والی گاڑیوں سے شہر بھر میں نشر کیا جائے۔ گورنر اور چیف منسٹر کے حکم کے مطابق اس بیان کا ترجمہ فی الفور اضلاع میں بھی پہنچا دیا گیا:۔

اس دن کے واقعات کو دیکھ کر "سینٹ بار تھولومیوڈے" یاد آتا تھا حتیٰ کہ ڈیڑھ بجے بعد دوپہر مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں، کہ ایک دن قبل ایک احمدی مُدرّس قتل کر دیا گیا تھا ۶۔ مارچ کو ایک احمدی محمد شفیع برما والا مغلپورہ میں ہلاک کر دیا گیا اور کالج کے ایک احمدی طالب علم کو بھاٹی دروازے کے اندر لوگوں نے چھرے مار مار کر قتل کر دیا۔ ایک اور احمدی (یا مفروضہ احمدی) مرزا کریم بیگ کو فلیمنگ روڈ پر چھرا مار دیا گیا۔ اور اس کی نعش ایک چتا میں پھینک دی گئی جو فرنیچر کو آگ لگا کر تیار کی گئی تھی۔ احمدیوں کی جو جائدادیں اور دکانیں اس دن لوٹی یا جلائی گئیں۔ وہ یہ تھیں:۔ پاک ریز۔ شفا میڈیکل۔ اور سوکو۔ موسٹی اینڈ سنز کی دکان۔ راجپوت سائیکل ورکس۔ ملک محمد طفیل اور ملک برکت علی کے چوب عمارتی کے احاطے اور گودام مبین روڈ پر ملک عبد الرحمٰن کا مکان اور مزنگ روڈ اور ٹمپل روڈ پر پانچ احمدیوں کے مکان جن میں شیخ نور احمد ایڈووکیٹ کا مکان بھی شامل تھا تیسرے پہر ایک ممتاز ایڈووکیٹ مسٹر بشیر احمد امیر جماعت احمدیہ لاہور کا مکان گھیر لیا گیا۔ ہجوم اس مکان میں داخل ہونے ہی والا تھا۔ کہ مسٹر بشیر احمد نے اپنے دفاع میں چند گولیاں چلائیں ایک خاص فوجی عدالت نے ان کے اس فعل پر مقدمہ چلایا لیکن وہ بری کر دیئے گئے۔ ۶۔ ۷ مارچ کی رات کو عبد الحکیم مالک پائیونیر الیکٹرک اینڈ بیٹری سٹیشن کے مکان پر چھاپا مارا گیا۔ اور ان کی بوڑھی والدہ قتل کر دی گئی ✤

مسٹر دولتانہ کی رہنمائی اور بیرونجات کی لیگوں کی پیروی

جب ۶۔ مارچ کو چیف منسٹر کا بیان شائع ہو گیا تو اس کے بعد صوبے کی بہت سی مسلم لیگوں نے مطالبات کی تائید میں قرار دادیں منظور کیں۔ اسی طرح ۶۔ مارچ کو میاں چنوں مسلم لیگ نے ایک قرار داد منظور کی۔ کہ اس مطلب کا ایک قانون منظور ہونا چاہئے کہ کوئی شخص اپنے لئے نبی کا لفظ استعمال نہ کرے گا اور اگر کرے گا تو جرم کا مرتکب ہو گا۔ ۷۔ مارچ ۱۹۵۳ء کو سٹی مسلم لیگ وزیر آباد نے دو قرار دادیں منظور کیں۔ جن میں سے ایک قرار داد میں ہر کونسلر کا فرض قرار دیا گیا کہ وہ مقامی مجلس عمل کی مالی امداد کرے گا۔ اور بوقت ضرورت تحریک ختم نبوت کی حمایت میں اپنی جان تک دینے سے دریغ نہ کرے گا۔ قرار داد میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ سٹی مسلم لیگ من حیث الجماعت مجلس عمل کے

پروگرام اور اس کی سرگرمیوں میں مداخلت نہ کرے گی۔ دوسری قراردادوں میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بذریعہ تار وزیر اعظم پاکستان اور وزیر اعلیٰ پنجاب کو اطلاع دی جائے کہ مجلس عمل کے مطالبات تین دن کے اندر تسلیم کئے جائیں۔ ورنہ سٹی مسلم لیگ کے ممبر متحدہ طور پر مستعفی ہو جائیں گے۔ اور اپنے اپنے حلقہ انتخاب کے ایم ایل اے حضرات سے درخواست کریں گے کہ چودھری ظفراللہ خان کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد کے حق میں حمایت حاصل کرنے کی تحریک شروع کر دیں۔ اسی قرارداد میں یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ حکومت نے مسلمانوں کے مذہبی مطالبات کو دبانے کے لئے جو جابرانہ تدابیر اختیار کی ہیں وہ سخت قابل مذمت ہیں۔ اسی دن سٹی مسلم لیگ جلال پور جٹاں نے ایک قرارداد منظور کی جس میں تحریک ختم نبوت کی اور وزیر اعلیٰ کے بیان مورخہ ۶ مارچ کی غیر مشروط حمایت کی گئی۔ اور کہا گیا کہ اس بیان کے مطابق وہ جو بھی قدم اٹھائیں گے۔ لیگ اس کی تائید کرے گی۔ قرارداد میں یہ بھی بیان کیا گیا کہ لیگ کے ممبر اپنے ہائی کمان کے احکام کے منتظر ہیں اور حصول مقصد کے لئے عملی قدم اٹھانے پر آمادہ ہیں۔ دوسری قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ مجلس عمل کے مطالبات کو حتی الامکان جلد سے جلد تسلیم کرے۔ ۸ مارچ کو مسلم لیگ گکھڑ نے تین قراردادیں منظور کیں۔ ایک کا مطلب یہ تھا کہ لیگ کے وقار کو قائم رکھنے کے لئے اس کے ممبروں کا فرض ہے کہ عوام کا ساتھ دیں۔ اور ختم نبوت کی تحریک میں حصہ لیں۔ دوسری قرارداد میں لیگ نے اپنے صدر میر محمد بشیر کا شکریہ ادا کیا تھا۔ جنہوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ اور تمام کونسلروں سے بھی اسی مطلب کی اپیل کی۔ اور تیسری قرارداد میں حاکم علی ٹھیکیدار کو صدر مقرر کیا گیا۔ اور ان سے کہا گیا کہ وہ میر محمد بشیر کی گرفتاری کے بعد رضاکاروں کے مہیا کرنے کے لئے ضروری انتظامات کریں۔ سٹی مسلم لیگ کاموکے نے ۱۰ مارچ ۱۹۵۳ء کو احمدیوں کو اقلیت قرار دینے اور چودھری ظفراللہ خان کو برطرف کرنے کے مطالبات کی حمایت کی۔

مسٹر دولتانہ نے ۶ مارچ کا بیان واپس لے لیا

۱۰ مارچ ۱۹۵۳ء کو مسٹر دولتانہ نے حسب ذیل اعلان کیا:-

"اس مہینے کی ۶ تاریخ کو میں نے اپنی اور اپنی وزارت کی طرف سے اہل پنجاب سے اپیل کی تھی۔ کہ قانون وانتظام کے قیام میں امداد دیں۔

میں نے ان کو یقین دلایا تھا کہ میری حکومت تحریک تحفظ ختم نبوت کے لیڈروں سے فی الفور گفت و شنید شروع کرنے پر آمادہ ہے۔ اور میرے وزرا مطالبات کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر کے سفارش کریں گے۔ کہ ان کو تسلیم کر لیا جائے۔

یہ اپیل اس وقت کی گئی تھی جب لاہور میں قانون کے دشمن لوٹ۔ آتش زنی اور ضروری سروسوں کو ملیامیٹ کرنے میں مصروف تھے۔ پاکستان کے مخالف تفرقہ پرداز گروہ پاکستان

کی سلامتی اور استواری کو نقصان پہنچانے کی غرض سے تحریک تحفظ ختم نبوت سے فائدہ اُٹھا کر نظم حکومت کو درہم برہم کرنے اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے کے لئے بدنظمی کی آگ کو بھڑکا رہے تھے ٭

میری اپیل کا مقصد یہ تھا کہ صوبے کے باشندے قانون وانتظام کے قیام کے لئے کوشش کریں۔ تاکہ دشمنان پاکستان اس قابل نہ رہیں کہ پاکستان کی سلامتی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے ایک مذہبی تحریک کے پردے میں اندرونی تفرقوں کو مشتعل کر کے لاقانونی پھیلا دیں لیکن بدقسمتی سے نتیجہ یہ ہوا کہ میری اپیل کے باوجود لاقانونی جاری رہی اور لاہور میں صورت حالات پر قابو پانے کے لئے مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔

موجودہ حالات میں تحریک تحفظ ختم نبوت کے لیڈروں سے گفت وشنید کرنے اور مطالبات پر غور کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہر حکومت کا پہلا فرض یہ ہے کہ قانون کی اطاعت اور شہریوں کے جان ومال کی حفاظت کا پختہ بندوبست کرے ٭

صوبائی حکومت اور مرکزی حکومت دونوں کا عزم یہ ہے۔ کہ لاقانونی جہاں بھی سر اٹھائے گی اسے دبا دیا جائے گا۔ اور صوبے میں قانون وانتظام کو بحال کیا جائے گا۔ حکومت موجودہ خطرے کو جو ملک کی سلامتی اور سالمیت کو درپیش ہے ہر ممکن ذریعے سے کام لے کر دبائے گی ٭

میں اس صوبے کے لوگوں سے اپیل کرتا ہوں، کہ جہاں کہیں قانون وانتظام کو خطرہ درپیش ہو۔ وہاں اس کی بحالی کے لئے حکومت سے تعاون کریں اور ایسا انتظام کریں کہ دشمنانِ پاکستان ملک کی سلامتی اور سالمیت کو نقصان پہنچانے کے لئے مسئلہ ختم نبوت کو استعمال نہ کر سکیں ٭"

مجلس عاملہ پنجاب مسلم لیگ نے اس بیان کی تائید کی اور اپنے اجلاس منعقدہ ۸ مارچ ۱۹۵۳ء میں یہ اعلان کیا کہ مجلس عاملہ اس اپیل کی دلی حمایت کرتی ہے۔ جو باشندگانِ پنجاب سے کی گئی ہے اور مزید برآں پنجاب کے ہر مسلم لیگی کارکن کو ہدایت کرتی ہے کہ اس بیان کی ہدایات پر وفاداری سے عمل کرے ٭

سیالکوٹ

سیالکوٹ کے واقعات کی کیفیت کے متعلق سرکاری بیان ان تحریری بیانات میں درج ہے۔ جو مسٹر آئی یو خان کمشنر، مسٹر ایس این عالم ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، مسٹر غلام سرور خان ڈپٹی کمشنر، اور سید عبدالرؤف سپرنٹنڈنٹ پولیس نے داخل کئے۔ اور جو شہادت لفٹننٹ کرنل نوشی محمد نے دی جب مسٹر غلام سرور ڈپٹی کمشنر جن کے خلاف عوام کو بعض شکایات تھیں۔ تبدیل کر دئے گئے تو ہم نے اپنے چند اجلاس سیالکوٹ میں منعقد کر کے کافی غیر سرکاری شہادت قلمبند کی ٭

جب سے مسٹر مظہر علی اظہر ۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر میں احراری رضاکاروں کا ایک دستہ لے کر جموں میں داخل ہوئے تھے سیالکوٹ اسی زمانے سے احراریوں کا ایک ہدایتی مرکز چلا آتا ہے۔ یہ ایک اہم احمدی مرکز بھی رہا ہے جس کی اہمیت قادیان سے دوسرے درجے پر تھی۔ احراری احمدی نزاع کے سلسلے میں یہاں پہلا اہم واقعہ یہ ہوا۔ کہ غلام محمد شاہ نے احمدیوں کے خلاف ایک تیز و تند تقریر کی جس کی پاداش میں وہ زیر دفعہ ۲۹۵۔ الف تعزیرات ہند۔ ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو سزایاب ہوا۔ یہ نزاع کسی نہ کسی شکل میں ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ لیکن ان برسوں کے دوران میں کوئی بڑا واقعہ رونما نہ ہوا۔ ۲۶۔ نومبر ۱۹۴۹ء کو احراریوں نے ایک تبلیغ کانفرنس اس مقصد سے منعقد کی۔ کہ باؤنڈری کمیشن میں احمدیوں کے رویے کے خلاف نکتہ چینی کریں۔ اس کے جواب میں احمدیوں نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لئے۔ ۱۵۔ جنوری ۱۹۵۰ء کو اپنا ایک جلسہ منعقد کیا۔ عین اس وقت جب یہ جلسہ ہو رہا تھا۔ احراریوں نے ہنگامہ برپا کیا۔ اور ایک لڑکے کے چھرا مار دیا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ایک حکم صادر کیا جس کے رو سے ایک ہفتے کے لئے جلسے ممنوع قرار دے گئے۔ نومبر ۱۹۵۱ء میں احمدی اپنا عام سالانہ اجلاس منعقد کرنا چاہتے تھے لیکن جو جذبات اس وقت پھیل رہے تھے ان کے پیش نظر حکام ضلع نے ان کو سمجھا بجھا کر یہ اجلاس ملتوی کرا دیا۔ پھر یہ اجلاس نومبر ۱۹۵۲ء میں احمدیوں نے اپنے جلسہ گاہ میں منعقد کیا لیکن احراریوں نے حاضرین پر خشت باری کی۔

فروری ۱۹۵۲ء تک احراری احمدیوں کے خلاف رائے عامہ کو منظم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب احمدیوں کے خلاف شورش نے تحفظ ختم نبوت کی تشکل اختیار کی۔ اور ۲۱۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو اس شہر میں ایک آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقد کی گئی۔ اس کنونشن کے بعد تحریک تحفظ ختم نبوت زیادہ مقبول عام ہو گئی۔ اور تمام فرقوں کے مذہبی مبلغ اس میں شامل ہو گئے۔ تحریک روز بروز زیادہ قوی ہوتی گئی۔ مساجد کے اندر جمعہ کے ہر خطبے میں احمدیوں کے متعلق دشنام و بدگوئی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اور تین مطالبات زور شور سے پیش کئے جانے لگے ۲۰۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو پسرور کے مقام پر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کنونشن میں چیف منسٹر نے ایک تقریر کی۔ جس میں انہوں نے اعلان کیا۔ کہ وہ "تحریک ختم نبوت کی پوری حمایت کرتے ہیں۔ بشرطیکہ قانون و انتظام کو کوئی خطرہ در پیش نہ ہو"۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں عرس گلو شاہ کے موقع پر مولوی بشیر احمد خطیب جامع مسجد پسرور۔ کرامت علی شاہ اور منظور احمد نے احمدیوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان لوگوں کے خلاف زیر دفعہ ۲۱۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کارروائی کی سفارش کی۔ لیکن حکومت نے اُن سے اتفاق نہ کیا۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں ایک اور آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں تین مطالبات بیشتر زور شور سے دہرائے گئے۔ صوبائی حکومت اب احراری احمدی نزاع کی وسعت اور شدت کا احساس کر چکی تھی چنانچہ اس نے اس معاملے کے متعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے نام عام ہدایات کا ایک سلسلہ جاری کر دیا۔ ان ہدایات کا مفاد یہ تھا کہ قابل اقدام تقریروں کے خلاف صرف مقدمات دائر کئے جائیں مسجدوں

میں گرفتاریاں نہ کی جائیں۔ نہ مساجد کے اجتماعات کو منتشر کیا جائے۔ ایک اور ہدایت یہ تھی کہ کارروائی صرف احراریوں اور احمدیوں تک محدود رکھی جائے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احراری مولویوں نے ہر مسجد کے منبر سے احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا جاری رکھنے میں اپنے آپ کو بالکل آزاد محسوس کیا ؀

مجلس عمل پنجاب کی ہدایت کے مطابق اس ضلع میں ایک مجلس عمل مرتب کی گئی۔ اس مجلس عمل نے رضاکاروں کی بھرتی اور سرمائے کی فراہمی کا کام شروع کر دیا۔ صاحبزادہ فیض الحسن ضلع میں جلسوں کا ایک سلسلہ جاری کر کے شدید پروپیگنڈا کرنے میں مصروف رہے۔ ۲۰۔ فروری ۱۹۵۳ء کو جناح پارک میں ہزارہا آدمی نماز جمعہ کے لئے جمع ہوئے۔ جن سے مولوی محمد علی کاندھوی۔ پروفیسر خالد محمود۔ مولوی محمد یعقوب اور مولوی فضل حق نے خطاب کیا۔ احمدی عقائد کے خلاف رسالے اور کتابچے فروخت کئے گئے اور آٹھ آنے کے ٹکٹ بیچ کر ہزاروں روپے جمع کئے گئے ؀

کراچی میں ۲۷۔ فروری ۱۹۵۳ء کو جو فیصلے کئے گئے تھے۔ ان کے مطابق ہوم سیکرٹری نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک لاسلکی پیغام بھیجا جس میں قاضی منظور احمد اور ولی محمد جرنیل کو گرفتار کرنے کی ہدایت کی۔ یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو شہر نے کامل ہڑتال کی۔ اور دس ہزار اشخاص کا ایک ہجوم ریلوے سٹیشن پر رضاکاروں کے اس پہلے دستے کو الوداع کہنے کے لئے جمع ہوا جو زیر سرکردگی مولوی محمد یوسف "ڈائرکٹ ایکشن" میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ اس ہجوم نے بازاروں میں گشت لگایا۔ احمدیوں کے خلاف نعرے لگائے اور حکومت بالخصوص وزیر اعظم پاکستان کو گالیاں دیں۔ یہ ہجوم اس قدر سرکش تھا کہ اس نے ٹرین کی روانگی میں تاخیر کرا دی۔ اور ٹرین کے بعض ڈبوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ بعض آدمی رضاکاروں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہو گئے۔ اور نارووال پہنچ کر اتر گئے۔ واپس آتے ہوئے انہوں نے ٹرینوں کو روکا۔ سٹیشن کے دکانداروں کو لوٹا۔ اور ریل کی پٹڑی کے آس پاس گنے کی فصلوں کو برباد کیا ؀

۲۔ مارچ ۱۹۵۳ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس ڈی او چٹھی نمبری 2514-29-BDSB مورخہ ۲۸۔ فروری ۱۹۵۳ء موصول ہوئی جس میں حکومت کا یہ فیصلہ بتایا گیا تھا کہ اس شورش کو سختی سے دبایا جائے۔ انہوں نے پولیس اور مجسٹریٹوں کا اجلاس طلب کیا۔ اور فیصلہ کیا کہ:-

(۱) ۲-۳۔ مارچ ۱۹۵۳ء کی درمیانی رات کو شورش کے سرغنہ زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کر لئے جائیں (اس کے لئے ہوم سیکرٹری کی منظوری ٹیلیفون پر حاصل کر لی گئی) ؀

(۲) جو لوگ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں۔ ان کو حراست میں لے لیا جائے۔ اور پھر کسی دور دست مقام پر لے جا کر چھوڑ دیا جائے۔

(۳) فوج سے استدعا کی جائے کہ بوقت ضرورت امداد کے لئے موجود رہے ؀

۲۔ مارچ ۱۹۵۳ء کی شام کو رام تلائی میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں مولوی سلطان محمود پروفیسر خالد محمود۔ مولوی حبیب احمد اور مولوی محمد یعقوب نے تقریریں کیں۔ ان تقریروں کا لہجہ واضح طور پر حکومت کے خلاف تھا اور پروفیسر خالد محمود نے خواجہ ناظم الدین کو آگاہ کیا کہ ان کا انجام بھی مسٹر لیاقت علی خان کا سا ہوگا۔ اعلان کیا گیا کہ کل رضا کاروں کے دو دستے کراچی روانہ کئے جائیں گے ٭

مولوی محمد حسین۔ مولوی محمد علی کاندھلوی۔ محمد صادق ولد بھولا۔ مولوی حبیب احمد۔ عبدالغفور بٹ اور بشیر احمد ولد چراغ دین ۲۔۳ مارچ کی درمیانی رات گرفتار کر لئے گئے۔ ۳ مارچ کی صبح کو فوج اور پولیس کے دستوں کی گشت کے باوجود چھوٹے چھوٹے ہجوم بازاروں میں نمودار ہوئے۔ یہ ہجوم سرکشی پر مائل تھے۔ لیکن ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے بعض کو فوج نے اور بعض کو پولیس نے منتشر کر دیا۔ جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کوئی سوا دس بجے قبل دوپہر دارالشہابیہ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ اس عمارت کے اندر اور اردگرد کے مکانوں کی چھتوں پر ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہے۔ اور حکومت کے خلاف نعرے لگا رہا ہے جب ان سے منتشر ہونے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے شہابیہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس کو مجمع خلاف قانون قرار دیا اور مسٹر خلیل الرحمٰن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور خواجہ اقبال احمد مجسٹریٹ کو حکم دیا کہ اس مجمع کو منتشر کر دیں۔ جب مسٹر خلیل الرحمٰن اس عمارت میں داخل ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کا ریوالور کسی نے ان کی پیٹی سے نکال لیا ہے تاہم وہ اور خواجہ اقبال احمد چار اشخاص کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ہار پہنے ہوئے تھے۔ اور ان میں سے ایک مولوی محمد یعقوب تھا۔ جو ۲۔۳ مارچ کی درمیانی رات گرفتار نہیں ہو سکا تھا۔ گرفتاریوں کے بعد ہجوم دارالشہابیہ اور ملحقہ عمارتوں کی چھتوں پر چڑھ گیا۔ اور منڈیروں پر سے اینٹیں پھینکنے لگا۔ جن کی وجہ سے پولیس نے ان گاڑیوں کے پیچھے پناہ لی۔ جو دارالشہابیہ کے سامنے سڑک پر کھڑی تھیں خشت باری کی وجہ سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے چوٹیں آئیں۔ ایک سب انسپکٹر کے چھرا گھونپ دیا گیا۔ ایک تنبیہ کی گئی۔ جس کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ لیکن اس کے باوجود ہجوم برابر منڈیروں پر سے اینٹیں پھینکتا رہا ٭

اس مرحلے پر ایک اور ہجوم دفعتہً دارالشہابیہ کے عقب میں سڑک پر نمودار ہوا۔ اور اس نے بھی پولیس پر خشت باری شروع کر دی۔ ان کو منتشر ہونے کے لئے کہا گیا لیکن چونکہ انہوں نے خشت باری جاری رکھی اسلئے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا گیا۔ اس پر ہجوم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک آدمی ہلاک پایا گیا۔ اس موقع پر کل اکیس گولیاں چلائی گئیں۔ پولیس نے نعش کو اٹھا لیا لیکن ہجوم

پولیس پر غالب آیا۔ اس نے نعش بھی چھین لی۔ اور مولوی محمد یعقوب کو بھی حراست سے چھڑا لیا۔ چونکہ صورت حالات بالکل ہی قابو سے باہر ہو گئی تھی اسلئے اس کو فوج کے حوالے کر دیا گیا جس کی کمان لفٹنٹ کرنل خوشی محمد (ہشتم پنجاب رجمنٹ) کر رہے تھے۔ ہجوم نے سول کے افسروں کو گھیر لیا جو ایک بند گلی میں بھاگے۔ جہاں سے وہ اس گلی کے ایک مکان کی چھت پر پہنچ گئے کچھ دیر بعد وہاں غلام حسن اے ایس آئی کو لایا گیا جن کے پیٹ میں چھرا مارا گیا تھا۔ اور جن کا ریوالور چھین لیا گیا تھا۔ اس اثنا میں ہجوم نے پولیس کی دو گاڑیوں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی جیپ کو آگ لگا دی۔ میونسپل فائر بریگیڈ طلب کیا گیا۔ لیکن وہ بھی جلا دیا گیا۔ اس مرحلے پر یہ اطلاع موصول ہوئی کہ ہجوم ضلع کچہری کی عمارتوں۔ پولیس کے دفتر اور بعض دوسری سرکاری عمارتوں کو آگ لگانے کے درپے ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کسی نہ کسی طرح باہر نکلے اور انہوں نے پولیس لائن سے ایک گارد ساتھ لی۔ تاکہ سرکاری عمارتوں اور سٹیٹ بنک کی عمارت کو بچائیں ؛

جس وقت دار الشہابیہ کا واقعہ ہو رہا تھا سٹی انسپکٹر اور سٹی مجسٹریٹ کو رنگپورہ کے چوک سنت سنگھ میں ایک اور ہجوم کا سامنا کرنا پڑا۔ جو دار الشہابیہ کی طرف آ رہا تھا۔ اس ہجوم کو روکا گیا۔ لیکن وہ تشدد پر اُتر آیا اور اس نے سٹی مجسٹریٹ، سٹی انسپکٹر، اے ایس آئی ثنا اللہ اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو زخمی کر دیا۔ لیکن فوج ان کی مدد کو پہنچ گئی اور انہیں مزید نقصان سے بچایا ؛

دوپہر تک ہجوم بے انتہا بڑھ گیا اور ٹریفک ڈیوٹی کے پولیس کانسٹیبلوں پر حملے کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ایک جلوس کی صورت اختیار کر لی اور اس شخص کی نعش کو ساتھ لے کر جو دار الشہابیہ میں مارا گیا تھا۔ گشت کرنے لگا۔ یہ ہجوم سٹی مسلم لیگ کے دفتر میں پہنچا اور اس کی لائبریری لوٹ لی۔ خواجہ محمد صفدر ایم ایل اے صدر سٹی مسلم لیگ کو ان کے دفتر سے نکالا گیا۔ ان کا منہ کالا کیا گیا۔ اور ان کو بازاروں میں پھرایا گیا۔ آخر کرنل خوشی محمد نے ان کو چھڑایا۔ اس کے بعد ہجوم جناح پارک میں پہنچا۔ جہاں کوئی پچاس ہزار اشخاص نے مولوی محمد یعقوب کی امامت میں متوفی آدمی کے جنازے کی نماز ادا کی۔ اس موقع پر مولوی نے حسب توقع ایک پُر زور تقریر کی ؛

کمشنر کو ٹیلیفون پر صورت حالات کے متعلق اطلاع دے دی گئی۔ چنانچہ وہ اسی دن شام کو پہنچ گئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ۳۔ تاریخ کے ایک بجے بعد دوپہر سے لے کر ۴۔ تاریخ کے ایک بجے بعد دوپہر تک چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ پولیس اور فوج کی نفری کم تھی۔ اسلئے یہ کرفیو عمل میں نہ لایا جا سکا۔ اور کمشنر نے اس کے اوقات تبدیل کر کے دس بجے شب سے ساڑھے چار بجے صبح تک کر دئے۔ اسی شام کو ایک غیر احمدی عبدالحی قریشی کو جس نے ہجوم کو تشدد سے منع کیا تھا۔ زدوکوب کیا گیا اور اس کا گھر لوٹ لیا گیا ؛

۴ مارچ کو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ایک حکم نافذ کیا گیا۔ جس کے رو سے عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دے گئے۔ اس دن ڈائرکٹ ایکشن کمیٹی نے اپنا مرکز دار الشہابیہ سے مسجد مولوی نور حسین

میں منتقل کر دیا۔ جو تحصیل اور تھانہ صدر کے قریب واقع ہے۔ ایک بڑا ہجوم اس مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ اس کو راستے میں روک لیا گیا۔ کمشنر کی ہدایت کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہجوم کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ لیکن وہ افسروں پر پل پڑا۔ پولیس کو اس ہجوم پر لاٹھی چارج کا حکم دیا گیا۔ جس کے جواب میں آس پاس کے مکانوں سے اینٹیں برسائی گئیں۔ مسٹر خلیل الرحمٰن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سر پہ شدید زخم آیا۔ اور پولیس کی ایک گاڑی توڑ پھوڑ دی گئی۔ لہٰذا صورت حالات کا انتظام فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ جس نے گولی چلا کر قابو پا لیا تھوڑی دیر بعد ایک ہجوم پھر مسجد کے سامنے جمع ہو گیا۔ فوج کے افسروں نے ان لوگوں سے بات چیت کی۔ اور ان سے منتشر ہو جانے کی استدعا کی لیکن جب اس کا کچھ اثر نہ ہوا تو بازار میں ایک طرف سے دوسری طرف تک ایک فیتہ کھینچ دیا گیا۔ اور ہجوم کو تنبیہ کی گئی۔ کہ اس فیتے کی حد سے آگے نہ بڑھیں۔ لیکن کسی نے فیتہ توڑ دیا۔ اور فوج کا جھنڈا جلا دیا۔ بعض لوگ تلواریں اور چھرے گھماتے ہوئے ناچنے لگے اور اس روک سے آگے بڑھنے لگے۔ اس پر فوج نے بریگیڈیر اے کے اکبر کے حکم سے گولی چلائی۔ جس سے چار آدمی ہلاک اور دس مجروح ہوئے۔ اس ہنگامے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ جو لفٹنٹ کرنل خوشی محمد کی زبان سے سنئے :۔

"ایک آدمی چھرے گھماتا اور ناچتا ہوا باہر نکلا۔ اور گولی کھانے کے لئے سینہ تان کے کھڑا ہو گیا۔ لیکن میں نے اس کو بتایا کہ جب تک وہ فیتے کی دوسری طرف رہے گا۔ اس کو گولی نہیں ماری جائے گی۔ لیکن جونہی اس نے فیتہ عبور کیا۔ اسے گولی ماردی جائے گی۔ جب گولی چلنی شروع ہوئی۔ تو مجھے وہ کہیں نظر نہ آیا۔ وہ کہیں ہجوم میں غائب ہو گیا تھا۔ پہلی فائرنگ کے بعد ایک مولوی نے سامنے آکر فوج اور پولیس کو گالیاں دیں۔ اور ان کو کافر کہا۔ میں نے بگلر سے کہا کہ بگل بجائے۔ چنانچہ جونہی اس مولوی نے بگل کی آواز سنی وہ ہجوم پر سے پھلانگتا ہوا پیچھے کی طرف بھاگ گیا "۔

تیسرے پہر ایک ہجوم نے ایک اے ایس آئی۔ اور ایک کانسٹیبل پر یورش کی۔ اے ایس آئی کا ریوالور اور کنسٹیبل کی بندوق چھین لی۔ اور ان کی وردیاں جلا دیں۔ ایک اور پیادہ کانسٹیبل کسی کیس کی مملوکات لئے جا رہا تھا۔ اس پر حملہ کیا گیا اور مملوکات چھین لی گئیں۔ دو احمدیوں کے چھرا گھونپ دیا گیا اور تین دوسرے احمدیوں کے مکانات ہجوم نے لوٹ لئے۔

جب مسٹر ایس این عالم ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس شام کو پہنچے۔ تو انہیں معلوم ہوا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے معاملات فوج کے حوالے کر رکھے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ حوالگی حق بجانب نہ تھی چنانچہ انہوں نے کمشنر سے مشورہ کر کے صورت حالات کو دوبارہ فوج سے واپس لے لینے کا فیصلہ کر لیا انہوں نے پولیس سے جو ۳ اور ۴ مارچ کے واقعات سے پست حوصلہ ہو چکی تھی۔ خطاب کیا۔ اور

شہر کی گشت کے انتظامات کئے۔ فوج نے اپنا برگیڈ ہیڈ کوارٹر سٹی کوتوالی میں منتقل کر لیا ؛

۵ ۔ مارچ کو فوج نے شہر بھر میں "فلیگ مارچ" کیا۔ اور وسیع پیمانے پر گشت لگایا ۔ بعض جلوس منتشر کئے گئے اور کچھ رضاکار گرفتار کئے گئے ؛

۶ ۔ مارچ کو مسٹر دولتانہ کی اپیل ریڈیو پر نشر کی گئی ۔ اور لاسلکی پیغام کے ذریعے سے بھی پہنچائی گئی ۔ اس سے یہ خیال پھیل گیا کہ حکومت نے ہتیار ڈال دیئے ہیں ۔ چنانچہ حکام ضلع کی پوزیشن ناقابل رشک ہو گئی ۔ جو جلسے اور جلوس ممنوع قرار دئے گئے تھے وہ جاری ہو گئے اور روزانہ بے شمار اشخاص گرفتار ہونے لگے ۔ ۷ ۔ تاریخ کو ۹۸ ۔ ۸ تاریخ کو ۱۲۱ اور ۹ ۔ تاریخ کو ۱۴۹ رضاکار گرفتار کئے گئے ۔ جس سے ظاہر تھا کہ عوام پر چیف منسٹر کی اپیل کا کوئی اثر نہیں ہوا ؛

۷ ۔ مارچ کو پروفیسر خالد محمود اور فضل حق نے تقریریں کیں ۔ جن میں پولیس اور فوج سے مطالبہ کیا کہ ہتیار ڈال دیں ۔ اور دوسرے سرکاری ملازموں کو تلقین کی کہ ہڑتال کر دیں اور تحریک میں شامل ہو جائیں ؛

۱۰ ۔ مارچ تک صورت حالات یہی رہی ۔ یہاں تک کہ چیف سکرٹری کی طرف سے ایک لاسلکی پیغام پہنچا کہ حکام ضلع ہر قسم کی لاقانونی کو سختی سے کچل دیں ۔ اس سے لوگوں کو معلوم ہو گیا ۔ کہ اب حکام ضلع کسی قسم کی لاقانونی کو روا نہ رکھیں گے ۔ لہذا دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی تعمیل ہونے لگی ۔ پروفیسر خالد محمود ۔ فضل حق ۔ مولوی سلطان محمود اور دیگر اشخاص مسجدوں میں منتقل ہو چکے تھے ۔ جہاں سے وہ لاؤڈ سپیکر اور خفیہ پیغامات کے ذریعے سے احکام و ہدایات جاری کر کے تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے ۔ ان کو مسجدوں کے اندر گرفتار کرنا مناسب نہ سمجھا گیا ۔ البتہ ان کے خلاف زیر دفعہ ۸۷ و ۸۸ ۔ ضابطہ فوجداری کارروائی کی گئی ۔ اس سے بہت اچھا اثر ہوا ۔ اور ۱۲ ۔ مارچ کو ان لوگوں نے مسجدوں سے نکل کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا ۔ ان کی گرفتاری کے بعد شورش عملاً ختم ہو گئی ۔ اور ۱۶ ۔ مارچ کو شہر کے حالات بالکل معمول پر آ گئے ؛

مذکورہ بالا ماجرا افسروں کے تحریری بیانات اور شہادتوں سے اخذ کیا گیا ہے ۔ غیر سرکاری گواہوں کی جو شہادت سیالکوٹ میں قلمبند کی گئی ۔ اس سے اس ماجرا کے کسی حصے کی تردید نہیں ہوئی شہادت میں جس بات پر زور دیا گیا وہ یہ تھی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایسے آدمیوں کو پیٹا یا پٹوایا ۔ جو گرفتار ہونے کے بعد جیل میں بند کئے جا چکے تھے ۔ انہوں نے خود ایک پولیس کانسٹیبل سے کہہ کر اپنی جیپ کو آگ لگوائی ۔ اور خود ہی اس جلوس کی حوصلہ افزائی کی جو یکم مارچ کو ریلوے سٹیشن پر گیا تھا ۔ پہلے الزام سے ہمارا کوئی متعلق نہیں ۔ گو اس کی تائید میں کافی شہادت موجود ہے ۔ دوسرا الزام عام عقل و ہوش کی توہین ہے ۔ اور تیسرے الزام کی صحت سے خود مولوی محمد علی کاندھلوی نے انکار کیا ہے ۔ ہماری یہ سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے کہ ایک سے زیادہ دفعہ صورت حالات کو فوج کے حوالے کر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دانشمندی اور جرأت کا ثبوت دیا

اور قانون اور اس کی پشت پناہ قوت کو عام تضحیک و استہزا سے بچا لیا۔ اس کے بعد جو خونریزی ہوئی اس کی ذمہ داری اگر اشخاص متعلقہ پر عائد نہیں ہوتی تو اس کا بار پولیس اور ملٹری پر بھی نہیں بلکہ یہ ذمہ داری کسی اور پر عائد ہوتی ہے۔

گوجرانوالہ

گوجرانوالہ احراریوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ اوّل اسلئے کہ گوجرانوالہ سیالکوٹ کے قریب ہے۔ دوم اسلئے کہ یہ ایک مقبول عام احراری مقرر صاحبزادہ فیض الحسن کا وطن ہے۔

احراریوں نے ۱۹۴۹ء میں یہاں ایک تبلیغ کانفرنس منعقد کی۔ لیکن چونکہ اس وقت تک پاکستان کی نئی مملکت کے متعلق احراریوں کی نیک نیتی پر سخت شبہات موجود تھے۔ اسلئے یہ کانفرنس کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئی۔ ۱۹۵۱ء میں انہوں نے "دفاع کانفرنس" کے پردے میں ایک اور کانفرنس منعقد کی۔ یہ اجتماع بہت کامیاب ہوا کیونکہ اس کے انتظامات سٹی مسلم لیگ کے صدر نے کئے تھے۔ اس کانفرنس میں سید عطا اللہ شاہ بخاری نے تقریر کی اور اپنا یہ عقیدہ ظاہر کیا کہ احمدیوں کو قتل کرنا اور ان کی جائیدادوں کو جلا دینا کار ثواب ہے۔ اسی سال میں ایک اور کانفرنس بھی ہوئی۔ جس میں احمدیوں کو کافر قرار دیا گیا اور ان کے مجلسی اور اقتصادی مقاطعہ کی حمایت کی گئی۔

۲۰۔ جون ۱۹۵۲ء "یوم مطالبات" تھا۔ احراریوں نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کر کے مسجد شیرانوالہ باغ کے اندر ایک جلسۂ عام منعقد کیا۔ اس جلسے میں صاحبزادہ فیض الحسن۔ شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین نے تقریریں کیں جو سب کے سب گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن بعد میں چیف منسٹر کے حکم سے رہا کر دئیے گئے۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک اور کانفرنس ہوئی جس میں صاحبزادہ فیض الحسن نے یہ اعلان کیا کہ کسی احمدی کو قتل کرنا رضائے الٰہی کا موجب ہے۔ جب کانفرنس ختم ہوئی تو مولانا اختر علی خاں کے اعزاز میں ایک دعوت چائے دی گئی جس میں ڈپٹی کمشنر اور مسلم لیگی لیڈر بھی شامل ہوئے۔ بعد میں احمدیوں نے ڈپٹی کمشنر سے شکایت کی کہ اس کانفرنس میں ایک مقرر نے حاضرین کو امام جماعت احمدیہ کے قتل پر اکسایا تھا احمدیوں کے خلاف جذبات کی برانگیختگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر آباد میونسپل کمیٹی نے دو احمدی مدرسوں اور چار احمدی استانیوں کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ صاحبزادہ فیض الحسن۔ مولوی عبدالواحد خطیب مسجد شیرانوالہ باغ اور مولوی محمد اسماعیل نے احمدیوں کے خلاف شورش میں نمایاں حصہ لیا اور دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ۲۔ ۳۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو گوجرانوالہ میں مجلس عمل کے زیر اہتمام ایک جلسۂ عام منعقد ہوا۔ جس میں جماعت اسلامی کے ایک نمائندہ میاں طفیل محمد نے بھی شرکت کی۔ مجلس نے احمدیوں کے مجلسی اور اقتصادی

مقاطعہ کی حمایت کی چنانچہ اس کے بعد اشیائے خورونوش کی دکانوں پر اس مطلب کے بورڈ لگائے گئے کہ یہاں احمدیوں کو علیحدہ برتنوں میں کھانا دیا جاسکتا ہے۔ ایک شخص عبدالغفار اثری اے جو اس سے قبل بازاری عورتوں کے خلاف تحریک میں کامیاب ہوا تھا۔ اس تحریک میں بھی شامل ہو گیا تاکہ اس کا اپنا دائرہ اثر وسیع ہو جائے۔ روزنامہ "زمیندار" کے مالک مولانا اختر علی خان نے تین عام جلسوں میں تقریریں کیں جن میں انہوں نے تحریک کے لئے دو ہزار روپیہ جمع کیا۔ ایک اور جلسے میں جو ان کے گاؤں کرم آباد میں ہوا تھا انہوں نے اس تحریک کے لئے ایک کروڑ روپیہ چندہ جمع کرنے کی اپیل کی۔ جب کراچی میں وزیر اعظم کو الٹی میٹم دیا جا چکا تو ڈائرکٹ ایکشن کی وسیع تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اور مولویوں نے ضلع کے مختلف شہروں میں اپنا پروپیگنڈا بہت تیز کر دیا کامریڈ عبدالکریم اور مولوی عبدالغفور ہزاروی وزیر آباد میں۔ مولوی ابوالحسن محمد یحیٰی اور مولوی فضل احمد حافظ آباد میں۔ لطیف احمد چشتی اور حافظ عبدالشکور کاموکے میں اور مولوی عبدالواحد اور مولوی محمد اسماعیل گوجرانوالہ میں مصروف عمل ہو گئے۔ رضا کاروں کی بھرتی جاری ہو گئی حافظ آباد کے لئے پانسو رضا کاروں کا کوٹا مقرر کیا گیا تھا۔ جو مجلس عمل کی ترتیب سے ایک ہفتے کے اندر اندر پورا ہو گیا۔ پورے ضلع کی بھرتی کا کوٹا ساڑھے چار ہزار تھا۔ اور جن لوگوں نے رضا کاروں کے حلف نامے پر دستخط کئے ان میں مسٹر منظور حسن سیکرٹری سٹی مسلم لیگ بھی شامل تھے۔

شورش اس وقت شروع ہوئی جب صوبائی حکومت کے احکام کے ماتحت مولوی محمد اسماعیل خطیب مسجد اہل حدیث گرفتار کر لئے گئے۔ یہ روز کا معمول ہو گیا کہ لاہور جانے سے پہلے رضا کاروں کے جلوس نکالے جاتے۔ اور جلسے منعقد کئے جاتے۔ مجلس عمل ختم کر دی گئی اور حکیم عبدالرحمٰن نائب صدر مجلس احرار گوجرانوالہ تحریک کے ڈکٹیٹر مقرر کئے گئے۔

۲۔ مارچ کو چیف سیکرٹری کی طرف سے ایک ڈی او چٹھی نمبری 2514-29 BDSB مورخہ ۲۸۔ فروری ۱۹۵۳ء ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو موصول ہوئی۔ جس میں مزید گرفتاریوں سے منع کیا گیا تھا لیکن یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو اے ڈی آئی جی۔ سی آئی ڈی کی طرف سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ ہدایات پہنچیں کہ رضا کاروں کے دستوں کو لاہور اور کراچی کی طرف روانہ ہونے سے روکا جائے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں گوجرانوالہ میں گرفتار کیا جائے۔ دونوں ہدایات ایک دوسرے کے متضاد تھیں۔ اور چونکہ مجسٹریٹوں اور پولیس نفری کی کمی اور جیل میں جگہ کی قلت کے باعث حکام ضلع گرفتاریوں کے حق میں نہ تھے اور ایک آدھ دن اور صورت حالات کو دیکھنا چاہتے تھے لہٰذا لاہور کے حکام اعلیٰ پولیس سے استفسار کیا گیا۔ کہ ان حالات میں کیا کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ملا۔ کہ اس سے قبل رضا کاروں کی گرفتاری کے متعلق جو حکم دیا جا چکا ہے۔ اس کی تعمیل کی جائے۔ اور اگر جیل میں کافی جگہ نہ ہو۔ تو گرفتار شدہ اشخاص کو دور دست دیہات میں جمع کر دیا جائے۔

۲۔ مارچ کو دس بجے ڈپٹی کمشنر کے کمرہ عدالت میں سرکاری اور غیر سرکاری آدمیوں کا

ایک اجلاس ہوا ۔ سٹی مسلم لیگ کے عہدہ داروں نے اس اجلاس میں موقع پا کر لیگ کے اندر اپنے مخالفین کی مذمت کی۔ اور حکام ضلع کے ساتھ سرگرم تعاون کرنے سے انکار کر دیا ۔ اس مرحلے پر لاہور جانے والی ٹرینوں کو اُن ہجوموں نے روکنا شروع کیا ۔ جو لاہور جانے والے رضاکاروں کی مشایعت کے لئے ریلوے سٹیشن پر جمع ہو جاتے تھے ۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پولیس کا ایک دستہ ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن پر گئے ۔ اور انہوں نے پچاس رضاکاروں کے ایک دستے کو ٹرین سے اتار کر گرفتار کر لیا اس پر ہجوم میں جوش پھیل گیا ۔ اور اس نے دو دفعہ ٹرین کو روکا ۔ جب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ٹرین کو روانہ کر دینے کی دوسری کوشش کی تو ان پر حملہ کیا گیا جس سے وہ اور چار پولیس مین زخمی ہو گئے ۔ جن میں ایک سب انسپکٹر بھی تھا ۔ اسی دن شام کو پانچ ہزار کے ایک جوش میں بھرے ہوئے ہجوم نے ریلوے سٹیشن سے کچھ فاصلے پر سندھ ایکسپریس کو روک لیا ۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس چھ پیادہ کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچے لیکن ان پر اینٹوں اور پتھروں کی بوچھاڑ کی گئی ۔ چونکہ اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا ۔ اور اگر ہجوم منتشر نہ ہوتا ۔ تو تشدد پر اُتر آتا اور ٹرین کے مسافروں کی پریشانی کا باعث ہوتا ۔ اسلئے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے تین پیادہ کانسٹیبلوں کو حکم دیا ۔ کہ بارہ راؤنڈ ہوا میں چلائیں ۔ اس سے ہجوم منتشر ہو گیا اور کسی قسم کا جانی نقصان نہ ہوا ۔ اس کے بعد معززین شہر کا ایک اجلاس ریلوے سٹیشن پر طلب کیا گیا ۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک اس غنڈے پن کی مذمت کر رہا تھا لیکن کسی قسم کی عملی امداد کرنے پر آمادہ نہ تھا ۔ کہ مبادا وہ کافر یا مرزائی قرار دیا جائے ۔

چونکہ مجلس عمل کے عہدہ داروں نے مجلس عمل کی حمایت کا عہد کر رکھا تھا اسلئے مجلس عمل کے ڈکٹیٹر نے مسٹر منظور حسن ایم ایل اے سیکرٹری سٹی مسلم لیگ سے مطالبہ کیا ۔ کہ وہ ایک دستے کی قیادت کر کے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں لیگ کے صدر شیخ آفتاب احمد نے تجویز کی کہ شیخ منظور حسن کی فرضی اور بناوٹی گرفتاری کا انتظام کیا جائے ۔ تا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ تحریک کو لیگ کی حمایت حاصل ہے ۔ اس پر اتفاق ہو گیا ۔ شیخ منظور حسن گرفتار کئے گئے ۔ اور انہیں پولیس کی ایک جیپ میں بٹھا کر ضلع کے ایک دور دست گوشے میں اتار دیا گیا اور کہا گیا ۔ کہ وہ چند روز تک گوجرانوالہ واپس نہ آئیں لیکن لوگ اس چال کو سمجھ گئے اور دوسرے دن کوئی دو سو آدمی شیخ آفتاب احمد کے مکان پر پہنچے ۔ اور ان سے کہنے لگے کہ ایک جلوس میں شامل ہوں ۔ وہ زبردستی مکان سے باہر نکالے گئے ۔ اور ان کو ایک جلوس کے ساتھ چلنے پر مجبور کیا گیا ۔ جو مسجد شیرانوالہ باغ کو جا رہا تھا ۔ اس وقت تک مسٹر منظور حسن گوجرانوالہ واپس آ چکے تھے ۔ اور مسجد شیرانوالہ باغ میں پہنچ کر شورش پسندوں میں شامل ہو چکے تھے ۔ انہوں نے احمدیوں اور حکومت کے خلاف کئی تقریریں کیں ۔ اور سات مسلم لیگی کونسلروں کو ساتھ لے کر ایک جلوس کی قیادت کی یہ سب لوگ گرفتار کر لئے گئے ۔

چیف منسٹر کا بیان مورخہ ۶-مارچ لاہور کی ہدایات کے مطابق شہر بھر میں نشر کر دیا گیا۔
سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اطلاع ملی کہ ۷-مارچ کو احمدیوں کے جان و مال پر حملوں کا خطرہ ہے۔ اس صورت حالات پر فوج سے گفتگو کی گئی۔ فوج نے تجویز کی کہ دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دئے جائیں لیکن سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈپٹی کمشنر نے اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ اور اس کے بجائے فیصلہ کیا کہ فوج اور پولیس مل کر شہر میں گشت کریں۔ اس کے بعد شہر میں لاقانونی کے کسی واقعہ کی اطلاع نہیں آئی سوائے اس کے کہ ایک احمدی کی دکان کو لوٹنے کی کوشش کی گئی۔

۷-مارچ کو موضع نند پور میں شورش پسندوں کے ایک پُر غیظ ہجوم نے ایک شخص محمد حسین کو یہ سمجھ کر قتل کر دیا کہ وہ احمدی ہے تفتیش سے معلوم ہوا کہ متوفی کے ایک دشمن نے اس کو قتل کرانے کے لئے چال چلی تھی۔

۸-مارچ کو مقامی ایم ایل اے مسجد شیرانوالہ باغ میں طلب کئے گئے۔ اور ان سے درخواست کی گئی کہ لاہور جا کر ہدایات لائیں۔ یہ ایم ایل اے چیف منسٹر صاحب سے ملے لیکن کوئی قطعی ہدایات نہ لائے۔
گوجرانوالہ میں فوج کی ایک کمپنی ۵-مارچ کو، دو بٹالین ۶-مارچ کو اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب کنسٹیبلری کے دو ریزرو دستوں کو ساتھ لے کر ۸-مارچ کو پہنچ گئے۔
جب فوج آئی تو ان نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا گیا "پاکستانی فوج نے سیالکوٹ گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ زندہ باد پاکستانی فوج زندہ باد" شورش پسند ہر جگہ یہ اعلان کر رہے تھے۔ کہ وہ کفر کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں۔ اور کئی مقامات پر ایسے پوسٹر لگائے گئے۔ جن میں پولیس اور فوج سے اپیل کی گئی تھی کہ گولی نہ چلائیں۔ بلکہ جہاد میں شامل ہو جائیں۔
ضلع میں کوئی ایک درجن احمدیوں کو مجبور کر دیا گیا کہ اپنے عقیدے سے توبہ کریں۔
اس ضلع میں مسلم لیگ اس تحریک سے عملی رابطہ رکھتی تھی۔ گوجرانوالہ کی سٹی مسلم لیگ نے تحریک ختم نبوت کی حمایت میں قرارداد منظور کی۔ اور اس کے سیکرٹری مسٹر منظور حسن نے اسی مطلب کی ایک قرارداد صوبہ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لاہور میں پیش کرنے کے لئے ارسال کی۔ انہوں نے اسی قسم کی ایک قرارداد آل پاکستان مسلم لیگ کے اجلاس ڈھاکہ میں پیش کرنے کی بھی کوشش کی۔
احمدیوں کا ایک وفد ۲۰-مارچ کو سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے پہلے دن میں نے چیف منسٹر سے ہدایات طلب کی تھیں۔ اور انہوں نے ہدایات دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ مرکز نے اس معاملے کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔
کمک پہنچنے کے بعد غنڈوں کی گرفتاریاں اور ناجائز اسلحہ کے لئے تلاشیاں شروع ہو گئیں مولوی عبدالواحد جو تحریک کی پشت پر تھے۔ اور حکیم عبدالرحمن ڈکٹیٹر علی الترتیب ۱۱ اور ۱۲ مارچ کو گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد چند اور مولوی آگے آئے۔ اور وہ بھی گرفتار کر لئے گئے۔ بالآخر

یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ فوج کی امداد سے مسجد شیرانوالہ باغ پر چھاپا مارا جائے۔ چھاپا مارا گیا۔ مسجد شورش پسندوں سے پاک کر دی گئی۔ اور دس ہزار ایک سو روپیے کی رقم قاری عبدالکریم سے حاصل کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رقم شیخ آفتاب احمد۔ مرزا شریف بیگ۔ محمد دین ایم۔ اے عزیز انصاری اور گوجرانوالہ مسلم لیگ کے بعض کونسلروں نے فراہم کی تھی ٭

صفدر علی اور نصیر دین عرف نصیر یا غنڈوں کے دو مشہور لیڈر تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان کی گرفتاری کا حکم صادر کیا۔ اول الذکر کسی نہ کسی طرح ضلع سے باہر نکل گیا۔ اور ازاں بعد جھنگ میں گرفتار کیا گیا۔ نصیریا بھی کچھ مدت تک گرفتاری سے بچتا بچاتا رہا لیکن آخر اس کا سراغ لگا کر اس کو بھی گرفتار کر لیا گیا ٭

ضلع میں شورش کے دوسرے مرکز حسب ذیل تھے :۔

(۱) کاموکے: یہاں احمدیوں اور حکومت کے خلاف مظاہرے اور جلوس مرتب کرنے والے لطیف احمد چشتی اور حافظ عبدالشکور تھے۔ جو سرمایہ ضبط کیا گیا اس کی مقدار دس ہزار سات سو بہتر روپے تھی ٭

(۲) وزیر آباد: یہاں تحریک کی تنظیم کرنے والے مولوی عبدالغفور ہزاروی اور کامریڈ عبدالکریم تھے۔ یہاں ریل کی پٹڑی پر لکڑی کا ایک لٹھا رکھ کر ایک ٹرین روکی گئی۔ جو سرمایہ یہاں ضبط کیا گیا۔ اس کی مقدار دو ہزار پانسو ساٹھ روپے تھی ٭

(۳) حافظ آباد: یہاں ابوالحسن محمد یحییٰ اور مولوی فضل الٰہی نے عوام کے جذبات کو بھڑکایا ٭

(۴) گکھڑ: یہاں ٹرینیں روکی گئیں۔ میر محمد بشیر صدر گکھڑ مسلم لیگ نے مع چند کونسلروں کے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا ٭

(۵) نوشہرہ ورکاں: ایک پرانا کانگرسی ڈاکٹر محمد اشرف یہاں گڑبڑ کا ذمہ دار تھا ٭

(۶) سوہدرہ: یہاں مولوی عبدالمجید اہل حدیث نے عام جلسوں کا اہتمام کیا ٭

راولپنڈی

یہاں بھی فسادات کے آغاز سے پیشتر واقعات کی رفتار بالکل صوبے کے دوسرے قصبوں ہی کی مانند تھی۔ احراریوں نے احمدیوں اور ان کے مذہب کی مذمت سے کام کا آغاز کیا۔ اس کے جواب میں احمدیوں نے احراریوں کے ماضی کو اجاگر کرنا شروع کیا۔ تاکہ پاکستان کے متعلق ان کی نیت کی نسبت جو شبہات تھے۔ وہ قوی ہو جائیں۔ آل پارٹیز مسلم کنونشن کے بعد احراری دوسرے مذہبی فرقوں، مُبلّغوں اور پیروں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مساجد احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا کا مرکز بن گئیں۔ اور جمعہ کے خطبات تو احمدی عقائد

کی مذمت و مخالفت کے لئے وقف ہی کر دیئے گئے۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے جو احراریوں کے بڑے لیڈروں میں سے ہیں۔ لیاقت باغ کے ایک جلسہ عام میں تقریریں کیں۔ اس کے بعد رضا کاروں کی بھرتی اور سرمائے کی فراہمی کی مہم شدت سے شروع کر دی گئی ؛

جب کراچی میں تحریک کے لیڈر گرفتار کر لئے گئے اور مولوی غلام اللہ خان کو بھی ۲۷ فروری کو حکومت پنجاب نے گرفتار کر لیا۔ تو دھڑا دھڑ جلوس اور جلسے منعقد ہونے لگے۔ ایک جلسہ عام جو لیاقت باغ میں پیر صاحب گولڑہ شریف کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ وہ سب سے بڑا جلسہ تھا جس کی نظیر ماضی میں نہ مل سکتی تھی۔ جب ۶۔ مارچ کو سیالکوٹ اور لاہور کے واقعات کے متعلق مبالغہ آمیز افواہیں پھیلیں۔ اور یہ اطلاع موصول ہوئی۔ کہ حکومت پنجاب نے مطالبات منظور کر لئے ہیں۔ اور کراچی کو اس منظوری کی اطلاع دے دی ہے۔ تو صورت حالات بے حد نازک ہو گئی۔ فوری نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا۔ حکومت نے ہتیار ڈال دیئے ہیں چنانچہ جلوس زیادہ جارحانہ ہو گئے۔ ان کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ اور ان کو لاٹھی چارج سے منتشر کرنا پڑا ؛

۶۔ مارچ کو لیاقت باغ میں ایک اور جلسہ منعقد ہوا۔ ایک ہجوم نے جلسے کے بعد منتشر ہو کر مری روڈ کا رخ کیا۔ اور احمدیوں کی ایک مسجد کو اور ایک چھوٹی موٹر کار کو آگ لگا دی۔ اسی شام کو کچھ دیر بعد لوٹ مار اور آتش زنی کے مزید واقعات بھی رونما ہوئے۔ احمدیہ کمرشل کالج۔ نور آرٹ پریس اور پاک ریسٹوران شہر کے مختلف حصوں میں واقع تھے۔ لیکن لوگ زبردستی ان میں گھس گئے اور انہوں نے مختلف اشیا کو لوٹنے۔ جلانے اور تباہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک غیر احمدی نوجوان نور آرٹ پریس میں ملازم تھا۔ اس کو احمدی سمجھ کر چھرا مارا گیا۔ اور وہ اسی زخم کی وجہ سے ہلاک ہو گیا۔ جب صورت حالات سخت خطرناک ہو گئی۔ تو ۷۔ مارچ کو فوج طلب کر لی گئی۔ اس دن تھانہ گولڑہ اور تھانہ سنگجانی کے علاقوں میں ٹیلیفون کے تار کاٹ دئیے گئے۔ شہر کے موڑوں اور اہم مقامات پر فوج متعین کر دی گئی ؛

۸۔ مارچ کو گورنمنٹ کالج راولپنڈی کے ایک کمیونسٹ طالب علم مسعود ملک اور مولوی عبدالقدوس پونچھی کی سرکردگی میں ایک غضبناک ہجوم پولیس کوتوالی کے سامنے جمع ہو گیا۔ اور خشت باری کرنے لگا۔ سٹی مجسٹریٹ نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ جس سے ایک بلوائی ہلاک ہو گیا۔ اور چھ مجروح ہوئے۔ اس کے بعد دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت حکم صادر کیا گیا۔ جس کے رو سے جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیئے گئے۔ اور رات کے وقت کرفیو عائد کر دیا گیا۔ ۲۳۹ اشخاص کو کرفیو کی پابندیاں توڑنے کی پاداش میں سزائیں دی گئیں۔ اس کے بعد شورش کی تنظیم کرنے والوں نے جامع مسجد میں پناہ لی۔ جہاں سے وہ رضا کاروں کو گرفتاری کے لئے بھیجتے رہے۔ ایک ہزار تینتیس رضا کار گرفتار کئے گئے۔ اور ان کے خلاف زیر دفعہ ۱۸۸۔ تعزیرات پاکستان مقدمات

دائر کئے گئے یہ سب سزایاب ہوئے سوائے اُن چونسٹھ اشخاص کے جنہوں نے معافی مانگ لی اور رہا کر دئے گئے۔

شورش کی نوعیت کی وجہ سے پولیس اور فوج کے ادنیٰ ملازمین کے حوصلے اور وفاداری پر اثر پڑنے لگا مسلم لیگ کے اکثر لیڈر اور مقامی ایم ایل اے کہیں روپوش ہو گئے اور انہوں نے عوام کا سامنا کرنے سے انکار کر دیا حقیقت میں وہ دو رُخی پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ بظاہر حکام کے حامی تھے لیکن اندرونی طور پر شورش کی تائید و اعانت کر رہے تھے۔ پورے ضلع میں ایک مولوی بھی ایسا نہ تھا جو شورش کی حمایت نہ کر رہا ہو جو مولوی گرفتار کئے گئے۔ ان میں عارف اللہ شاہ۔ محمد مسکین۔ محمد اسماعیل زاہدی اور عبدالحنان شامل تھے۔ اور یہ تمام آل پارٹیز مسلم کنونشن کے ممبر تھے۔

نواحی اضلاع سے بھی کثیر التعداد لوگ شورش میں حصہ لینے کے لئے آ گئے اطلاع موصول ہوئی کہ ضلع ہزارہ سے دو ہزار پٹھان راولپنڈی کی طرف آ رہے ہیں۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پیر صاحب گولڑہ شریف کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ان لوگوں کو واپس چلے جانے کی ہدایت دے دیں اسی طرح ایک کہن سال مگر مقبول عام مولوی محمد اسحاق مانسہروی بھی تحریک کی قیادت کے لئے نکل آئے۔ لیکن حکام ضلع ان کو سمجھانے بجھانے میں کامیاب ہو گئے بلکہ ان سے ایک تحریری اپیل جاری کرائی کہ لوگ لاقانونی اور بدنظمی پیدا کرنے سے پرہیز کریں۔ اس ضلع میں شورش مارچ کے تیسرے ہفتے میں ختم ہو گئی۔

لائل پور

یہ ضلع احراریوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ اُن میں سے اکثر جالندھر گورداسپور۔ ہوشیار پور۔ لودھیانہ اور امرتسر کے اضلاع سے آئے ہیں۔ اور یہی اضلاع بہت سے آبادکاروں کے اصلی وطن ہیں۔ جنوری ۱۹۵۳ء تک اس ضلع میں بھی احراری احمدی نزاع کی کیفیت دوسرے اضلاع ہی کی مانند تھی۔ یکم دسمبر کو یوم میلاد النبیؐ کے موقع پر احراریوں نے ایسے جھنڈے بلند کئے جن پر یہ دو مطالبات لکھے تھے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ اور چودھری ظفر اللہ خان کابینہ سے برطرف کئے جائیں اس کے بعد یہ باقاعدہ معمول ہو گیا کہ قبل نماز اور بعد نماز کی تقریروں میں بھی مطالبات دہرائے جانے لگے تقریریں نہ صرف احمدیوں کے بلکہ حکومت کے بھی خلاف تھیں۔ جڑانوالہ کے ایک جلسہ عام میں مولوی فیروز الدین۔ حافظ عبدالقدیر۔ مولوی عنایت اللہ مجاہد۔ مولوی میر داد اور مولوی عبدالرحیم نے تقریریں کیں۔ جن میں مطالبات دُہرائے۔ اسی قسم کے جلسے لائل پور۔ سمندری۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ناندلیانوالہ اور گوجرہ میں منعقد ہوئے۔ اس دوران میں رضاکار بھرتی کئے جاتے رہے جو قرآن پر حلف اُٹھاتے تھے۔ اور اپنے خون سے ڈائرکٹ ایکشن

کے عہدنامے پر دستخط کرتے تھے۔ تحریک کے لیئے چندہ آسانی سے جمع ہو رہا تھا۔ رضاکاروں کی تعداد نو ہزار تک اور فراہم شدہ سرمائے کی مقدار تیس ہزار روپے تک پہنچ گئی تھی ؛

اس تحریک کو بہت سے مسلم لیگیوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ حقیقت میں لیگ کے بہت سے کونسلر جماعت احرار سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس تحریک کی حمایت میں عوام پر اثر ڈال رہے تھے ؛

لائل پور کے غلام نبی جانباز، ناندلیانوالہ کے قاضی محمد حسین اور لائل پور کے مولوی عبیداللہ ۲۷۔ فروری کو صوبائی حکومت کی ہدایت کے ماتحت گرفتار کر لیئے گئے۔ یکم مارچ کو جامع مسجد سے ایک جلوس پندرہ رضاکاروں کے اس دستے کی مشایعت کے لیئے ریلوے سٹیشن کو روانہ ہوا جو مولوی محمد یوسف خطیب جامع مسجد کی سرکردگی میں کراچی جا رہا تھا۔ کوئی گرفتاری نہ کی گئی کیونکہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو لاہور سے ٹیلیفون پر ہدایات موصول ہوئی تھیں کہ کراچی کو جانے والے رضاکاروں کو گرفتار نہ کیا جائے۔ دوسرے دن صاحبزادہ افتخار الحق نے ریلوے سٹیشن لائل پور کے سامنے ایک نہایت اشتعال انگیز تقریر کی۔ وہ ایک سو رضاکاروں کو ساتھ لے کر لاہور روانہ ہو رہے تھے۔ اور تقریباً چھ ہزار کا ایک ہجوم ان کو ایک جلوس کے ساتھ ریلوے سٹیشن پر لے گیا تھا۔ وہ سالار والہ ریلوے سٹیشن پر اتار لیئے گئے اور گرفتار کر لیئے گئے۔ ۳ مارچ کو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ایک حکم صادر کر کے عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دے دیئے گئے۔ لیکن اس کے باوجود جب سیالکوٹ میں گولی چلنے کی خبر یہاں پہنچی۔ تو چار پانچ ہزار انسانوں کا ایک جلوس جامع مسجد سے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کو روانہ ہوا۔ ابھی وہ اپنی منزل مقصود پر نہیں پہنچا تھا کہ ۱۳ آدمی گرفتار کر لیئے گئے۔ اور جلوس منتشر کر دیا گیا۔ زراعتی کالج بند ہو گیا۔ اور دیہات سے رضاکار دھڑا دھڑ شہر میں آنے لگے۔ شام کے وقت ڈپٹی کمشنر نے معززین شہر کا ایک اجلاس طلب کیا جس میں ضلع مسلم لیگ اور سٹی مسلم لیگ کے صدر بھی شامل ہوئے۔ ان حضرات کا رویہ ہرگز تعاون کی طرف مائل نہ تھا۔ بلکہ آخر الذکر نے تو یہاں تک کہ دیا کہ میرا رویہ صدر صوبائی مسلم لیگ سے ملاقات کرنے کے بعد معین ہوا ہے جنہیں کچھ مدت پہلے میں لاہور میں مل آیا ہوں ؛

۴۔ مارچ کو شہر میں مکمل ہڑتال رہی۔ جامع مسجد میں سات ہزار آدمیوں کا اجتماع ہوا۔ جس میں بہت سے مولویوں نے تقریریں کر کے سیالکوٹ میں گولی چلانے کی مذمت کی۔ جلسے کے بعد تین الگ الگ جلوس روانہ ہوئے۔ جو بالآخر باہم مخلوط ہو گئے۔ اور ان کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد وہ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر گئے۔ وہاں انہوں نے اپنے مطالبات دہرائے۔ اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لیئے پیش کیا۔ لیکن ڈپٹی کمشنر نے دانائی سے کام لے کر اس جلوس کا رخ بدل دیا۔ بلکہ جیل تک خود اس کی رہنمائی کی۔ جہاں پہنچ کر جلوس کے لیڈر اور ۱۲۴ دوسرے اشخاص گرفتار کر لیئے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی جلوس کے ساتھ تھے۔ جب ڈپٹی کمشنر نے ہوم سیکرٹری سے فوج مہیا کرنے کی درخواست کی تو ۴۔ اور ۵ کی

درمیانی رات ۹/۸ پنجاب رجمنٹ کی بٹالین یہاں پہنچ گئی ؛

۵۔ مارچ کو پچاس رضاکار گرفتار کئے گئے۔ اور بیس میل دور لے جا کر چھوڑ دئے گئے ان کے علاوہ ایک جلوس کے ۵۵ شرکا زیر دفعہ ۱۸۸ تعزیرات پاکستان گرفتار کئے گئے۔ جب لاہور فائرنگ کی خبر ۶۔ مارچ کو لائل پور میں پہنچی۔ تو بطور احتجاج کئی جلوس نکل آئے۔ اور کوئی ۱۲۵ اشخاص گرفتار کئے گئے۔ چک جھمرا سے آنے والے رضاکاروں نے چناب ایکسپریس کو ریلوے سٹیشن لائل پور کے قریب روک لیا۔ یہ خبر بھی موصول ہوئی کہ لاہور میں مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ شام کو چیف منسٹر کا یہ اعلان پہنچا کہ حکومت پنجاب نے شورش پسندوں کے مطالبات کو تسلیم کر دیا ہے۔ ان کو حکومت پنجاب کی رائے کے ساتھ مرکز میں بھیج دیا ہے۔ اور صوبے کا ایک وزیر ان مطالبات کو کابینہ کے سامنے بوجہ احسن پیش کرنے کی غرض سے کراچی جا رہا ہے۔ شورش پسندوں نے اس اعلان سے یہ سمجھ لیا کہ حکومت نے ہتیار ڈال دئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مہم تیز کر دی۔ اور اس کے بعد بعض مسلم لیگی ایم ایل اے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے لگے ؛

۷۔ مارچ غنڈے پن اور لاقانونی کا دن تھا۔ تین مختلف جلوس نکالے گئے۔ اور ایک سو سات اشخاص گرفتار کئے گئے۔ جن میں شیخ بشیر احمد صدر سٹی مسلم لیگ بھی شامل تھے جنہوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا تھا۔ دس ہزار کے ایک ہجوم نے ضلع کی کچہریوں پر حملہ کر دیا۔ کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ مجسٹریٹوں کو عدالتیں بند کرنے پر مجبور کر دیا اور پھر ڈپٹی کمشنر کے گھر میں گھس گئے۔ لائل پور کاٹن ملز کی ایک خوردہ فروشی کی دکان لوٹ لی گئی ریل کی پٹڑی توڑ دی گئی۔ اور تین ٹرینیں ریلوے سٹیشن کے قریب روک لی گئیں۔ ریلوے سٹیشن پر دکانوں اور مسافروں کو لوٹا گیا۔ ٹرین میں بعض عورتیں بے آبرو کی گئیں۔ اور ایک کیپٹن بری طرح زخمی کیا گیا۔ ہجوم کو منتشر ہونے کے لئے کہا گیا۔ اور جب اس نے تعمیل سے انکار کیا۔ تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ سینتالیس راؤنڈ چلائے گئے۔ چار آدمی ہلاک اور چار زخمی ہوئے۔ اس کے بعد کرفیو نافذ کر دیا گیا ؛

اسی دن بعض مسلم لیگی ایم ایل اے سمندری میں ایک جلوس لے کر نکلے۔

۸۔ مارچ کو دیروزہ ہلاک شدہ اشخاص کی نماز جنازہ ادا کرنے کے لئے بیس ہزار کا ہجوم جمع ہوا۔ نماز کے بعد جلوس مرتب کیا گیا۔ جس نے بازاروں میں گشت لگایا۔ ایک اور جلوس زرعی کالج سے نکالا گیا۔ دن بھر کرفیو کی خلاف ورزی ہوتی رہی اور کوئی ایک سو دس آدمی گرفتار کئے گئے۔ جب ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس نے سنا کہ ایک ہجوم چنیوٹ بازار کی طرف جا رہا ہے۔ تو وہ دونوں فوج کے ایک گشتی دستے کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ ہجوم کا رویہ جارحانہ تھا۔ ہجوم کو مجمع خلاف قانون قرار دیا گیا۔ اور منتشر ہونے کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس حکم کی تعمیل

نہ کی گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوج کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ تین آدمی مارے گئے۔ اور ایک زخمی ہوا۔ کچھ احراری رضاکار گوجرانوالہ سے ایک ٹرک میں آئے جس میں مائیکروفون لگا ہوا تھا۔ یہاں وہ گرفتاری سے بچ کر نکل گئے۔ اور جھنگ کو چل دیئے۔ چنانچہ وہ وہاں گرفتار کئے گئے۔ یہ اپنے ساتھ تین ریوالور۔ کافی گولی بارود اور تیس ہزار روپیہ نقد لئے جا رہے تھے۔

اسی دن شام کے وقت ہجوم نے شہر کے اندرونی ٹرانسمشن سسٹم کے تار کاٹ ڈالے۔

۹۔ مارچ کو ایک پورے دن کا کرفیو عائد کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود زراعتی کالج کے طلبہ نے ایک لمبا جلوس نکال لیا۔ رضاکار دیہات سے برابر شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک سو بیس جامع مسجد میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ وہ سب گرفتار کر لئے گئے۔ شام کے وقت ڈپٹی کمشنر نے معززین شہر کا ایک اجلاس طلب کیا۔ جس میں ضلع مسلم لیگ کے صدر نے محض مجلس عمل کے نمائندے کا پارٹ ادا کیا۔

۱۰۔ مارچ کو چیف منسٹر کی دوسری اپیل آ گئی۔ جس میں شورش پسندوں کے خلاف مضبوط کارروائی کی ہدایت دی گئی تھی اس کا اثر اچھا ہوا۔ اسلئے کہ حکام ضلع کو اس سے واضح ہدایت حاصل ہوئی۔ چنانچہ تحریک ٹھنڈی پڑنے لگی۔ ۱۷۔ مارچ کو جامع مسجد سے رضاکاروں کا ایک جلوس نکلا۔ ۱۹۔ مارچ کو متولی کی مدد سے مسجد خالی کرائی گئی۔ اور ۲۰۔ مارچ کو ضلع کی حالت پھر اپنے معمول پر آ گئی۔

اس تمام دوران میں کسی احمدی کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ نہ شہر میں اور نہ صنعتی رقبے میں کسی جائداد کی توڑ پھوڑ کی گئی۔ پرائیویٹ طور پر گولی چلانے کے صرف دو واقعات ہوئے دونوں میں احمدیوں نے غلط فہمی کے ماتحت گولی چلا دی تھی۔ اور دونوں موقعوں پر بعض بچے زخمی ہوئے۔

ضلع کے جن دوسرے قصبوں پر شورش کا اثر ہوا۔ وہ یہ تھے: چک جھمرا۔ جڑانوالہ۔ ڈجکوٹ سمندری۔ تاندلیانوالہ۔ گوجرہ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ اور کمالیہ۔ لیکن ان مقامات پر قوت کے استعمال کی ہرگز ضرورت نہیں پڑی۔ اور احمدیوں کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔

شورش پسندوں سے جو سرمایہ چھینا گیا۔ اس کی مقدار چار ہزار دو سو تینتیس روپے دو آنے تین پائی تھی۔

منٹگمری

منٹگمری بھی احراریوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ کیونکہ (۱) بہت سے احراری یہاں آباد ہو گئے ہیں (۲) احمدیوں کے خلاف تحریک کے ذمہ داروں اور احراریوں کے خلاف بہت سے مقدمات اسی ضلع میں دائر ہوئے (۳) احراری یہاں ایک ادارہ چلا رہے ہیں جس کا نام جامع رشیدیہ ہے اور یہ ادارہ احراریوں کی مذہبی سیاسی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس ضلع کے پانچ بڑے بڑے احراری یہ ہیں: مفتی ضیاء الحسن (احراری لیڈر مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا بھتیجا) جو

منٹگمری میں آباد ہو گیا ہے۔ مولوی حبیب اللہ۔ مولوی لطف اللہ اور مولوی عبداللہ تینوں بھائی جو منٹگمری میں جامع رشیدیہ کے بانی ہیں۔ اور مولوی بشیر احمد رضوانی جو اوکاڑے میں آباد ہو گیا ہے ؛

یہاں جو واقعات فسادات سے پہلے یا ان کے دوران میں رونما ہوئے۔ ان کی کہانی اُس جامع تحریری بیان میں درج ہے۔ جو مسٹر حق نواز سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مرتب کیا۔ واقعات ویسے ہی ہیں جیسے دوسرے مقامات پر پیش آئے۔ احراریوں اور احمدیوں کی ایک دوسرے کے خلاف تقریریں۔ جب آل پارٹیز مسلم کنونشن نے جولائی ۱۹۵۲ء میں مطالبات مرتب کر لئے۔ اس کے بعد مسجدوں سے احمدیوں کے خلاف پر زور پروپیگنڈا۔ سرمائے کی فراہمی اور ڈائرکٹ ایکشن کے لئے رضاکاروں کی بھرتی۔ اور ۲۷۔ فروری کی گرفتاریوں کے بعد عام جلسے اور جلوس اور زیر دفعہ ۷ ضابطہ فوجداری یا زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتاریاں۔ جماعت اسلامی کے مقامی ارکان اور دوسرے مولوی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اور مسجدیں رضاکاروں کا ہیڈ کوارٹر بنا دی گئیں مختلف جماعتوں کے اشخاص نے جن میں مجلس احرار۔ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ والے بھی شامل ہیں۔ مظاہروں میں سرگرم حصہ لیا۔ ان اشخاص کے نام سپرنٹنڈنٹ پولیس کے تحریری بیان کے ساتھ بطور ضمیمہ ا مندرج ہیں۔ بھرتی ہونے والے رضاکاروں کی تعداد منٹگمری میں دو ہزار۔ اوکاڑہ میں ڈیڑھ ہزار۔ عارف والا میں سات سو۔ اور چیچا وطنی میں دو سو تھی ؛

مولوی لطف اللہ اور حبیب اللہ کی گرفتاری کے احکام صوبائی حکومت کی طرف سے ۲۷۔ فروری کو موصول ہوئے۔ آخر الذکر اس وقت بھی ہائیکورٹ کے حکم کے ماتحت توہین عدالت کے جرم میں سزائے قید کاٹ رہا تھا۔ حکام ضلع مزید گرفتاریاں بھی کرنی چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے مفتی ضیا الحسن اور مولوی عبداللہ اول اور مولوی عبداللہ ثانی کو گرفتار کرنے کی اجازت حکومت سے حاصل کر لی تھی۔ ۲۔ مارچ کو اے ڈی آئی جی کی طرف سے یہ ہدایت موصول ہوئی کہ کراچی جانے والے رضاکاروں کو گرفتار نہ کیا جائے ؛

چیف منسٹر کی اپیل مورخہ ۶۔ مارچ کا اثر یہاں بھی وہی ہوا۔ جو دوسرے مقامات پر ہوا تھا۔ یعنی شورش کو مزید تقویت پہنچ گئی ؛

اس ضلع میں کسی قدر اہمیت کے واقعات صرف وہ تھے۔ جو اوکاڑہ میں پیش آئے ۶ مارچ کو تین ہزار کا ایک ہجوم ریلوے سٹیشن پر پہنچا۔ اور اس نے ڈاؤن پاکستان میل کو تین گھنٹے تک روکے رکھا۔ ہجوم نے ڈبّوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ ٹرین کو روکنے والی ویکیوم کی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ اور مسافر عورتوں کو بے آبرو کیا۔ ۸۔ مارچ کو اوکاڑہ کے قریب ٹیلیگراف کے تار کاٹ دئے گئے ۳۔ اپریل کو جامع مسجد میں چند آتش انگیز تقریروں کے بعد عورتوں کا ایک جلوس نکلا۔ جو کچھ کتبے اور جھنڈے اٹھائے ہوئے تھیں۔ پولیس نے کتبے

چھیننے کی کوشش کی جس پر پانسو آدمیوں کا ایک پُر غیظ ہجوم پولیس پر پل پڑا۔ پولیس اس ہجوم کو پیچھے ہٹا رہی تھی کہ ستر سال کا ایک بوڑھا آدمی زخمی ہوا۔ اور پھر ہسپتال میں فوت ہو گیا ۸۔ مارچ کا ایک اور واقعہ بھی ہے۔ اگرچہ اس کا ذکر کسی سرکاری بیان میں موجود نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کے باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کہ حافظ محمد بخش سکرٹری جماعت احمدیہ چک ۲/۴ L (نزد اوکاڑہ) اور ان کے کنبے کے اشخاص کو جن میں ایک بی اے اور دوسرا بی اے ایل ایل بی ہے۔ مجبور کیا گیا کہ اپنے عقیدے سے توبہ کریں۔ اور تحریک احمدیہ کے بانی کو گالیاں دیں۔ پھر چار پانچ ہزار کا ایک ہجوم ان کو ان کے گاؤں سے جامع ملیہ اوکاڑہ میں لایا۔ جہاں وہ مولوی ضیاالدین اور مولوی معین الدین کے سامنے پیش کئے گئے اور ان سے کہا گیا کہ ان مولویوں کے سامنے اپنے عقائد سے منحرف ہونے کا اعلان کریں *

سرغنوں کو آسانی سے گرفتار کرنے کے لئے ۱۴۔ مارچ کو اوکاڑہ میں چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۷۔ مارچ کو منٹگمری میں ڈھائی بجے بعد دوپہر سے ۶ بجے صبح تک کرفیو عائد رکھا گیا۔ ۱۳۔ مارچ کو منٹگمری اور اوکاڑہ میں ۱۷ دن کے لئے عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دئے گئے *

اوکاڑہ میں ۳۔ اپریل کا واقعہ پیش آنے کے بعد ضلع کے حالات پھر اپنے معمول پر آ گئے *

حصّہ چہارم

وہ کوائف جن کا نتیجہ مارشل لا کے اعلان کی صورت میں نکلا

یہ اس کیس کا کم و بیش تاریخ وار بیان ہے جس میں ہم نے مختلف واقعات و حقائق بیان کرنے کے علاوہ ان نکات پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جو بعض فریقوں کے درمیان مابہ النزاع تھے۔ اب ہم اپنے اخذ کردہ نتائج کو یکجا پیش کرینگے۔ اور اپنے دائرہ تحقیقات کی شروط کی تکمیل کریں گے۔ ہم زیر دفعہ ۳۔ پنجاب ایکٹ ۲ ۱۹۵۴ء اس کام پر مامور کئے گئے تھے۔ کہ مندرجہ ذیل دوائر تحقیقات کے مطابق فسادات کے متعلقہ کوائف اور اس کی ذمہ داری کے تعین کی غرض سے تحقیقات کریں :-

(الف) فسادات کی ذمہ داری ؛

(ب) وہ کوائف جو ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لا کے اعلان کا موجب ہوئے ؛

(ج) صوبائی سول حکام نے فسادات کی روک تھام اور اس کے بعد ان کے تدارک کے لئے جو تدابیر اختیار کیں۔ وہ کافی تھیں یا ناکافی ؛

فقرہ (ب) میں کوائف کے متعلق جو ہدایت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم محض اُن واقعات کے بیان پر اکتفا کریں۔ جو فسادات سے پہلے یا ان کے دوران میں رونما ہوئے ہوں۔ ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ فسادات سے اور لاہور میں مارشل لا کے اعلان سے پہلے اور ان کے دوران میں جو واقعات و حوادث پیش آئے۔ ان کے درمیان سببی تعلق کا پتہ چلانا ہمارا کام ہے۔ ایکٹ ہم سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ ہم اس امر کا پتہ چلائیں کہ فسادات کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا تحقیقات کی نوعیت کا تقاضا یہ ہے کہ فسادات کی ذمہ داری کے متعلق اُن کوائف کی نسبت جو مارشل لا کے اعلان کا باعث ہوئے۔ اور ان تدبیروں کے متعلق جو فسادات کی روک تھام اور ان کے تدارک کے لئے اختیار کی گئیں۔ بحث و نظر۔ حوالہ جات اور اظہار رائے کے عملیات باہم گڈمڈ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے۔ کہ ان موضوعوں کو الگ الگ رکھیں۔ اور حتی الوسع اعادے سے بچیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ موضوعات آپس میں ایک دوسرے سے بے حد مربوط اور مخلوط ہیں۔ اگرچہ ذمہ داری کا ذکر فقرہ (الف) میں اور کوائف کا فقرہ (ب) میں ہوا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک زیادہ آسان اور منطقیانہ بات یہی ہے کہ ہم پہلے آخر الذکر فسق کو لیں ؛

یہ امر تمام جماعتوں کے نزدیک مُسلّم ہے کہ ۶ مارچ کو جو کوائف موجود تھے۔ ان میں حالات کو فوج کے حوالے اور سول اقتدار کو فوج کے ماتحت کر دینا بالکل ناگزیر ہو چکا تھا۔ سول کے حکام

جو عام حالات میں قانون و انتظام کے قیام کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ کاملاً بے بس ہو چکے تھے۔ اور ان میں ۶۔ مارچ کو پیدا ہونے والی صورت حالات کا مقابلہ کرنے کی کوئی خواہش اور اہلیت باقی نہ رہی تھی۔ نظم حکومت کی مشینری بالکل بگڑ چکی تھی۔ اور کوئی شخص مجرموں کو گرفتار کر کے یا ازتکاب جرم کو روک کر قانون کو نافذ العمل کرنے کی ذمہ داری لینے پر آمادہ یا خواہاں نہ تھا۔ انسانوں کے بڑے بڑے مجمعوں نے جو معمولی حالات میں معقول اور سنجیدہ شہریوں پر مشتمل تھے۔ ایسے سرکش اور جنوں زدہ ہجوموں کی شکل اختیار کر لی تھی جن کا واحد جذبہ یہ تھا کہ قانون کی نافرمانی کریں۔ اور حکومت وقت کو جھکنے پر مجبور کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی معاشرے کے ادنیٰ اور ذلیل عناصر موجودہ بدنظمی اور ابتری سے فائدہ اٹھا کر جنگل کے درندوں کی طرح لوگوں کو قتل کر رہے تھے۔ ان کی املاک کو لوٹ رہے تھے اور قیمتی جائداد کو نذر آتش کر رہے تھے محض اسلئے کہ یہ ایک دلچسپ تماشا تھا۔ یا کسی خیالی دشمن سے بدلہ لیا جا رہا تھا۔ پوری مشینری جو معاشرے کو زندہ رکھتی ہے۔ پُرزہ پُرزہ ہو چکی تھی۔ اور مجنون انسانوں کو دوبارہ ہوش میں لانے اور بے بس شہریوں کی حفاظت کرنے کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ سخت سے سخت تدابیر اختیار کی جائیں۔ گویا مارشل لا کے نفاذ کے براہ راست ذمہ دار فسادات تھے۔ لیکن خود فسادات کیونکر وجود میں آئے؟ آیا کوئی فوری اور غیر متوقع واقعہ ان کا باعث ہوا تھا۔ یا بعض افراد یا گروہ مدت سے دانستہ ان کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ یہاں پھر یہ امر مسلم ہے کہ فسادات اُن احتجاجوں اور مظاہروں کا نتیجہ تھے جو پنجاب کے مختلف قصبوں میں اس وقت شروع ہوئے۔ جب کراچی میں ۲۷۔ فروری کی صبح کو اور پنجاب کے بعض قصبوں میں ۲۷ فروری کی شب کو یا اس کے بعد مجلس عمل کے بعض ممبر گرفتار کر لئے گئے۔ یہ گرفتاریاں اسلئے عمل میں لائی گئیں کہ ڈائرکٹ ایکشن کی وہ دھمکی جس کا نوٹس یہ لوگ ایک ماہ قبل وزیر اعظم پاکستان کو دے چکے تھے۔ اب عمل میں آنے والی تھی۔ اور ۲۷۔ فروری کی صبح سے گورنر جنرل اور وزیر اعظم کی کوٹھیوں پر رضاکاروں کے دستے بھیجے جانے والے تھے۔ ہم کو یہ یقین دلایا جاتا ہے۔ کہ اگر اجازت دی جاتی تو یہ دستے پورے نظم و ضبط کے ساتھ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتے۔ اور مطالبات کے متعلق حکومت کی بے پروائی کے خلاف عوام کی ناراضی کا کوئی اظہار نہ کیا جاتا۔ اور یہ پانچ پانچ آدمیوں کے دستے محض ایک قسم کی ستیا گرہ پیش کرنے والے تھے۔ لیکن جس شخص کو یہ تجربہ ہے کہ ایسے موقعوں پر کیا ہوا کرتا ہے۔ وہ اس قسم کی توقع کو محض خوش خیالی اور کھلی دلیل سمجھ کر رد کر دے گا۔ اگر کراچی یا دوسرے مقامات پر کوئی گرفتاری نہ کی جاتی تو وہاں کیسے واقعات رونما ہوتے اور شورش کیا صورت اختیار کرتی۔ یہ محض قیاس و تخیل کا معاملہ نہیں۔ بلکہ ایسے موقعوں پر نفسیات اجتماع اور انتظامی مشکلات کے تجربے کی روشنی میں ہر ذہین شخص صحیح حکم لگا سکتا ہے۔ اور مستقبل کے واقعات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ لہذا اگر ۲۷۔ فروری کی صبح کو گرفتاریاں نہ بھی کی جاتیں تو فسادات ضرور رونما ہوتے۔ صرف اتنا فرق ہوتا کہ تھوڑی دیر بعد کراچی میں اور پنجاب کے اہم قصبوں

میں گرفتاریاں اشد ضروری ہو جاتیں۔ جہاں رضاکاروں کے جیوش کی ترتیب۔ ڈائرکٹ ایکشن کی کمیٹیوں کے قیام اور ڈکٹیٹروں کے تقرر کے متعلق طویل تیاریاں کی جا چکی تھیں۔ جب ہم ذمہ داری کے مسئلے پر بحث کریں گے اس وقت بتائیں گے کہ جن جماعتوں نے ڈائرکٹ ایکشن کا تصور قائم کیا اس کی بنیاد رکھی۔ اور اس کا منصوبہ تیار کیا انہیں اس قسم کے اقدام کے قدرتی نتائج کا اندازہ تھا اور مجلس عمل کا ہر ممبر اگر وہ احمق نہیں تھا تو بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ جو راہِ عمل مجلس نے اختیار کی ہے۔ اس میں شہریوں کے جان و مال اور حکومت کی مشینری کے وجود کے لئے شدید خطرات مضمر ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ وزیر اعظم کو جو نوٹس دیا گیا۔ اس میں صاف لکھا تھا کہ اگر وہ مطالبات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ تو اپنے عہدے سے استعفا دے دیں اور "ڈائرکٹ ایکشن" کی دھمکی صرف اس صورت میں دی گئی کہ وہ اپنی ضد پر قائم رہیں۔ اور مطالبات کو منظور نہ کریں۔ اس دھمکی میں اس امر کا صاف اعتراف شامل ہے کہ اگر وزیر اعظم مستعفی نہ ہوں گے تو ان کی جگہ کوئی دوسرا آدمی رئیس حکومت مقرر کیا جائے گا۔ جو مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو۔ اس بحث کے رو سے بعد میں رونما ہونے والے فسادات کا براہ راست باعث مطالبات ہی کو قرار دیا جائے گا:

مطالبات تین تھے۔ پہلے مطالبہ میں حکومت سے کہا گیا تھا کہ احمدیوں کے قادیانی فرقے کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ دوسرے مطالبے کا منشا یہ تھا۔ کہ چودھری ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔ اور تیسرا یہ تھا۔ کہ دوسرے احمدی جو مملکت کے کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔ موقوف کر دئیے جائیں ہمارے سامنے سب جماعتوں نے تسلیم کیا ہے کہ ان تینوں مطالبات کی نوعیت سیاسی نہیں۔ بلکہ قطعی طور پر مذہبی ہے۔ اس کلیے کا استثنا صرف حافظ کفایت حسین (شیعہ عالم) ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک مطالبہ جس میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی خواہش کی گئی ہے۔ مذہبی نوعیت رکھتا ہے۔ باقی دو مطالبات کی نوعیت سیاسی ہے۔ ان مطالبات کی لازمی دینی نوعیت سے نہ جماعت اسلامی نے اور نہ اس کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے انکار کیا ہے۔ گو مولانا نے ان کے لئے چند مزید وجوہ بھی پیش کی ہیں۔ تمام دوسرے علما نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ تینوں کے تینوں مذہبی مطالبات ہیں۔ اور ان میں سے ایک بھی سیاسی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کوئی شخص جو ڈائرکٹ ایکشن میں شامل تھا۔ ان مطالبات کی سیاسی نوعیت کو تسلیم ہی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا۔ تو براہِ راست فسادات کا ذمہ دار ٹھیرتا۔ ہر متعلقہ شخص نے ان مطالبات کی مذہبی نوعیت پر غالباً اسلئے زور دیا کہ اس پر کہیں ایک دنیاوی مقصد کی خاطر فسادات برپا کرنے کی ذمہ داری عائد نہ ہو جائے۔ کیس کے اس حصے پر بعض اہم گروہ مثلاً احرار اور جماعت اسلامی اور بعض علما جو ایک زمانے میں احرار یا کانگرس سے وابستہ تھے۔ اور تقسیم سے پہلے

علی الاعلان قومیت پرستی اور غیر مذہبی مملکت کے حامی اور تقسیم اور مسلم لیگ کے مخالف تھے۔ واضح طور پر پریشان و بدحواس ہوئے۔ اور اپنی سابقہ تقریروں کے پیش نظر انہیں اپنی عدم مطابقت اور تضاد کا احساس ہوا کیونکہ اگر مطالبات کی نوعیت مذہبی تھی اور مذہب ایک حقیقت قائمہ و ثابتہ ہے تو یہ سمجھنا بے انتہا مشکل ہو جاتا ہے کہ جو نظریہ مذہب پر مبنی ہو۔ وہ ایک وقت سے دوسرے وقت اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر تبدیل کیونکر ہو سکتا ہے۔ انہیں اس موقف کے عواقب کا پورا شعور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام کے سامنے اس پوزیشن پر قائم رہے کہ یہ مطالبات ان کے مذہبی عقائد پر مبنی ہیں ؎

ہم مطالبات کے متعلق ایک اور نکتہ اس موقع پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ مطالبات صرف ان اشخاص کے تہیں بنائے جاتے جو آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور کی قرار دادیں منظور کرنے میں شریک تھے۔ بلکہ ان کو اسلام کے تمام فرقوں کے متفقہ مطالبات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے یہ دعویٰ کسی نے نہیں کیا کہ ہر مذہبی گروہ یا انجمن نے جن میں سے بعض کے اپنے آئین و دستور موجود ہیں۔ الگ الگ اس موضوع پر بحث کی ہے۔ اور اس کے متعلق اپنے آئین کے ماتحت قرار دادیں منظور کی ہیں۔ جو کچھ ہوا وہ یہ ہے کہ ہر مذہبی گروہ کا کوئی رکن یا بعض ارکان (خواہ وہ عہدہ دار ہوں یا نہ ہوں) کنونشن میں اس گروہ کی نمایندگی کے لئے چن لئے گئے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مطالبات تمام مذہبی گروہوں کے متفقہ مطالبات ہیں۔ تو یہ دعویٰ صرف اس حد تک صحیح ہے۔ کہ ملک کے نہایت اہم مذہبی گروہوں میں کسی رکن یا چند ارکان نے مطالبات کے متعلق استحسان ظاہر کیا ہے لہٰذا صرف ان معنوں میں ان مطالبات کو تمام مسلم فرقوں کے مطالبات کہا جا سکتا ہے ؎

جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ مطالبات متفقہ ہیں۔ اور ان کی نوعیت مذہبی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ یہ مطالبات تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک بعض دینی مسلّمات و عقائد کی بنا پر واضح طور پر ثابت ہیں۔ جن علما سے ہم نے اس موضوع پر سوالات کئے۔ قریب قریب ان سب نے بیان کیا کہ یہ مطالبات اس قرار داد مقاصد کا جو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ۱۲۔ مارچ ۱۹۴۹ء کو منظور کی تھی۔ اور دین و سیاست کے اس مجموعے کا قدرتی نتیجہ ہیں جس کو اسلام کہتے ہیں بہت زور شور سے بیان کیا گیا ہے۔ کہ پاکستان کا مطالبہ اور قیام محض اس غرض سے عمل میں آیا تھا۔ کہ نئی مملکت کا آیندہ سیاسی نظام قرآن اور سنت پر مبنی ہوگا۔ اور جب پاکستان کا مطالبہ حقیقتاً پورا ہو گیا اور قرار داد مقاصد نے اس مطالبہ کی بنیاد کو واضح طور پر تسلیم کر لیا۔ تو علما اور پاکستانی شہریوں کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ ہر مطالبہ جو مذہبی دلائل کے رو سے صحیح ثابت کر دیا جائے اس کو مملکت کے ارباب اختیار نہ صرف قبول ہی نہ کریں گے بلکہ اس کا پُر جوش خیر مقدم کریں گے کیونکہ وہ خود کئی سال سے پاکستان میں ایک ایسی اسلامی مملکت قائم کرنے کے لئے چیخ پکار

کرتے رہے ہیں جس میں اسلامی نمونے کے سیاسی۔ معاشرتی اور اخلاقی ادارات قائم کئے جا سکیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ بعض لیڈروں نے علی الاعلان اس نصب العین کے حصول کو اپنی زندگی کا واحد مقصد قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان مطالبات کو تسلیم کرانے کے لئے علما کو وہ بنیادی دلائل سے صرف یہ ثابت کر دینے کی ضرورت ہے کہ احمدی ایک علیحدہ قوم اور خارج از اسلام ہیں۔ اور اس ملک کے امور عامہ میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ جس کا نظم ونسق قطعی طور پر احکام اسلامی کے مطابق چلایا جائے گا۔ مطالبات کی حقیقی نوعیت کا اندازہ لگانے کے لئے اس موقع پر یہ بیان کرنا ضروری ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام دین وسیاست کا مجموعہ ہے تو اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اسلام ایک ثقافتی مجموعہ ہے جو سیاسی ساخت اور قانونی و معاشرتی روایات پر حاوی ہے۔ اور جو اسلامی عقائد و عبادات۔ اخلاقیات اور ادارت عائلی سے الگ اور ممتاز ہے۔ اسلام کا یہ تصور جزوی طور پر یورپی اصطلاحات سے مستعار لیا گیا ہے۔ لیکن اس کی بنا "دارالاسلام" کے نظریئے پر بھی ہے۔ یعنی وہ ملک جو زندگی کے متعلق ایک مخصوص اور علیحدہ زاویۂ نگاہ رکھتا ہو۔ اور اپنے تمام ادارات کی بنیاد اور اپنی تمام سرگرمیوں کی اساس ان مقاصد کے حصول پر رکھتا ہو جن کی ہدایت الہام الٰہی سے ملی ہے۔ ہم اس موضوع پر دوبارہ توجہ کریں گے۔ لیکن موجودہ مرحلے پر یہ سمجھ لینا بے حد اہم ہے کہ ان مطالبات کو اسلامی مملکت کے نظریئے پر مبنی بتایا جاتا ہے۔ ان ابتدائی تصریحات کے بعد ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ مذہب پر ان مطالبات کے مبنی ہونے کے معنی کیا ہیں۔ اس مقصد کے لئے نہ صرف یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائد میں کیا کیا فرق ہے۔ بلکہ دین وسیاست کے اس متحدہ نظام کا جس کو اسلام کہتے ہیں۔ اور اسلامی مملکت کے اس نظریئے کا جس کا لازمی نتیجہ ان مطالبات کو بتایا جاتا ہے صحیح اور واضح تصور کیا ہے!

مسلمانوں اور احمدیوں کے درمیان عقائدی اختلافات

اس سے پیشتر رپورٹ کے حصہ اول میں ہم احمدی تحریک کے آغاز کا مختصر حال بیان کر چکے ہیں۔ اور اس تحریک کے پیروؤں کے مخصوص عقائد ومسلمات کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے۔ اب ہم ان عقائد پر زیادہ جامعیت کے ساتھ نظر ڈالیں گے۔ تاکہ مسلمانوں اور احمدیوں کے دینی اختلافات کو بہتر طور سے سمجھ سکیں۔

ختم نبوت

پہلا اختلاف احمدی جماعت کے بانی مرزا غلام احمد کے مقام سے تعلق رکھتا ہے۔ مرزا غلام احمد کا دعویٰ ہے۔ کہ وہ نبی ہیں۔ اور مسلمانوں کے نزدیک وہ اس دعوے کی وجہ سے بالکل خارج از اسلام

ہو گئے ہیں۔ ایک متفق علیہ حدیث میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے نوع بشر کی ہدایت کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے ہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہ انبیا کا سلسلہ جن میں سے بعض کا ذکر قرآن مجید اور بائیبل میں خاص طور سے آیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلعم پر ختم ہو جاتا ہے۔ عقیدہ ختم نبوت ان معنوں میں کہ نبوت رسول پاک کے وصال پر ختم ہو گئی۔ اور اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے ماخوذ بتایا جاتا ہے :-

سورہ ۳۳ - آیت ۴۰ :-

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۔

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں۔ اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے ؛

سورہ ۳ - آیت ۸۱ :-

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ؛

اور جب اللہ نے عہد لیا انبیا سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں اور پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے۔ جو مصداق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے۔ تو تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی طرفداری بھی کرنا۔ فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا۔ وہ بولے۔ ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا کہ تو گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

سورہ ۵ - آیت ۴ :-

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

آج کے دن کافر لوگ تمہارے دین سے ناامید ہو گئے سو ان سے مت ڈرنا۔ اور مجھ سے ڈرتے رہنا۔ آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا۔ اور میں نے تم پر انعام ختم کر دیا۔ اور اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا

اس کے علاوہ متعدد احادیث سے اور آیات مندرجہ کی مستند تفاسیر سے جو متقدمین کے زمانے سے چلی آتی ہیں۔ یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ ہمارے نبی کریمؐ کے بعد کوئی نیا نبی مبعوث نہ ہوگا۔ عربی فارسی اور اردو کے بعض مشہور شعرا کے اشعار اور اس موضوع پر بعض رسالوں اور کتابچوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ جماعت احمدیہ کے فاضل وکیل مسٹر عبدالرحمان خادم نے اس کے برعکس سورہ ۴ آیت ۶۹

سورہ ۵۷ آیت ۱۹، سورہ ۷ ۔آیت ۳۵ ، اور سورہ ۲۳ ۔آیت ۵۱ کے حوالے دئے ہیں ۔جو درج ذیل ہیں :۔

سورہ ۴ ۔آیت ۶۹ :۔

وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِينَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيقًا

اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے ۔یعنی انبیا ۔صدیقین ۔شہدا اور صلحا اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں

سورہ ۵۷ ۔ آیت ۱۹ :۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَحِيمِ

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں ۔ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں ۔ان کے لئے ان کا اجر اور ان کا نور ہوگا اور جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ۔یہی لوگ جہنمی ہیں ؛

سورہ ۲۳ آیت ۵۱ :۔

يَا اَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا اِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ

اے پیغمبرو نفیس چیزیں کھاؤ ۔اور نیک کام کرو میں تم سب کے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتا ہوں ۔

استدلال کا ایک خاص طریقہ ہے جس کی تصریح کرنا ہمارے لئے ضروری نہیں ۔کیونکہ ہمارا فرض یہ نہیں ہے کہ کسی خاص تاویل کی صحت کے مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کریں ۔ استدلال کے اس طریقے کے ماتحت قرآن مجید کی ان آیات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مستقبل میں یعنی ہمارے رسول پاکؐ کے بعد ایسے اشخاص پیدا ہوں گے جن پر نبی یا رسول کی اصطلاح کا اطلاق ہو سکے گا ۔اس دلیل کو تقویت پہنچانے کے لئے بعض احادیث بھی نقل کی گئی ہیں ۔ اور بعض ایسے مفسرین اور دوسرے حضرات کی تصانیف کے حوالے بھی دئے گئے ہیں ۔جن کی روحانی برتری عام طور پر مسلّم ہے ۔ اگرچہ اس امر سے انکار نہیں کیا جاتا کہ مرزا غلام احمد نے نبی کا لفظ اپنے لئے استعمال کیا ہے لیکن یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ لفظ ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے ۔ اور وہ اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے نبی نہ تھے ۔یعنی وہ اللہ کی طرف سے کوئی ایسا پیغام نہ لائے تھے جس سے سابقہ پیغام کی تنسیخ ۔ترمیم یا ایزادی لازم آتی ہو ۔اور ان کا دعویٰ تشریعی نبوت

کا نہیں ۔ بلکہ ظلّی یا بروزی نبوت کا ہے ۔ فریق ثانی کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ ظِل اور برُوز کا تصور (جسے حلول یا ہندی میں اوتار کہنا چاہیئے) عقائد اسلامی کے منافی ہے ۔ اور ہر شخص جو وحی نبوت کا مورد ہونے کا دعوے کرتا ہے ۔ وہ ایک نئی اُمّت کی بنیاد رکھتا ہے ۔ لہٰذا ملّت اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے ۔ مرزا غلام احمد ۔ موجودہ امام جماعت احمدیہ ۔ اور اس جماعت کے ممتاز مصنفین کی تحریروں کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا غلام احمد نے ایسی وحی اور ایسے الہام کے مورد ہونے کا دعوٰی کیا تھا جس سے اب تک اللہ تعالیٰ مخصوص طور پر صرف انبیا ہی کو نوازتا رہا ہے ۔ لہٰذا یہ مسئلہ صرف اس ایک سوال پر محدود ہو جاتا ہے ۔ کہ آیا مرزا غلام احمد نے کبھی ایسی وحی کے مورد ہونے کا دعوے کیا ہے ۔ جو "وحی نبوت" کہلا سکتی ہو ۔ زمانہ ماضی میں جب کبھی کوئی نبی آیا ۔ اس نے اپنی قوم کو یہ حکم دیا (ہمارے نبی کریم نے پوری نوعِ بشر کو مخاطب فرمایا تھا) کہ میرے دعوے پر غور کرو ۔ اور مجھ پر ایمان لاؤ ۔ اگر تم میری نبوت کے متعلق شک وشبہ اور بے یقینی میں مبتلا ہو گئے ۔ تو عاقبت میں سزا کے مستوجب ہو گے ۔ لہٰذا لوگ محسوس کرتے ہیں ۔ کہ یا اس دعوے کو ماننا ہو گا یا اس سے انکار کرنا ہو گا ۔ پھر جو لوگ اس دعوے کو تسلیم کر لیتے ہیں ان کی ایک علیحدہ مذہبی جماعت بن جاتی ہے ۔ جس کو اصلی قوم اچھوت سمجھنے لگتی ہے ۔ اور نئی جماعت اُن لوگوں کو جو نئے نبی کی تصدیق نہیں کرتے ۔ اپنے سے منقطع سمجھتی ہے ۔ اگرچہ مرزا غلام احمد نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور لوگوں کو تلقین کی کہ وہ اس ہاتھ پر بیعت کر لیں لیکن یہ سوال بدستور قائم رہا ۔ کہ آیا انہوں نے اپنی وحی کو "وحی نبوت" کا مرتبہ دیا ہے ۔ جس پر ایمان نہ لانا آخرت میں عذاب وعتاب الٰہی کا موجب ہو گا ۔ احمدیوں نے اور ان کے موجودہ امام نے بڑے غور وخوض کے بعد ہمارے سامنے یہی موقف اختیار کیا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنی وحی کو "وحی نبوت" کے برابر قرار نہیں دیا ۔ لیکن فریق ثانی کا پُر زور دعوٰی ہے ۔ کہ انہوں نے یقیناً قرار دیا ہے احمدی لٹریچر میں جس میں خود مرزا غلام احمد اور موجودہ امام جماعت احمدیہ کی تحریریں بھی شامل ہیں ۔ ایسے قرائن موجود ہیں ۔ جن سے فریق ثانی کے دعوے کی تائید ہوتی ہے ۔ لیکن ہمارے سامنے جو موقف اختیار کیا گیا ہے ۔ وہ واضح طور پر یہ ہے کہ مرزا غلام احمد اپنے آپ کو محض اسلیئے نبی کہتے تھے کہ ان کو ایک الہام میں اللہ تعالیٰ نے نبی کر کے مخاطب کیا تھا ۔ وہ کوئی نیا قانون یا ضابطہ نہیں لائے ۔ انہوں نے اصلی اور پرانی شریعت میں نہ کوئی تنسیخ کی ہے ۔ نہ اضافہ کیا ہے ۔ اور مرزا صاحب کی وحی پر ایمان نہ لانے سے کوئی شخص خارج از اسلام قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس معاملے میں رائے دینا ہمارا کام نہیں کہ احمدی دائرہ اسلام سے خارج ہیں یا نہیں ہم نے اس نکتہ کا ذکر محض اسلیئے کیا ہے کہ احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان جو اختلافات بتائے جاتے ہیں ۔ ان کی تصریح کر دیں ۔ اب یہ قرار دینا غیر احمدیوں کا کام ہے کہ احمدیوں کو مسلمان سمجھا جائے ۔ یا نہ سمجھا جائے ؟

مسیحیات

فریقین کے درمیان دوسرا اہم اختلاف یسوع مسیح کے صلیب دئے جانے اور یوم قیامت سے پہلے ان کے ظہور ثانی کے متعلق ہے۔ مسیح کے مصلوب ہونے اور دوبارہ ظہور کرنے کے متعلق کم ازکم چار مختلف عقیدے موجود ہیں :۔

(۱) ایک عقیدہ جس پر اکثر مسلمان فرقے متفق ہیں۔ یہ ہے کہ مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے بلکہ چوتھے آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ روز قیامت سے پہلے زمین پر اُتریں گے۔ اور ان کا ظہور قیامت کی نشانیوں میں سے ہوگا۔

(۲) ایک عقیدہ احمدیوں کا ہے کہ مسیح صلیب پر وفات پانے سے بچ گئے۔ شاگردوں نے ان کا علاج معالجہ کیا جب ان کے زخم اچھے ہوگئے تو وہ کشمیر چلے گئے جہاں طبعی موت مر گئے۔ روز قیامت سے پہلے جس شخص کے ظہور کا وعدہ کیا گیا ہے وہ اپنے خصائل میں مسیح کا مثیل ہوگا۔ اور وہ شخص مرزا غلام احمد ہے +

(۳) ایک عقیدہ یہ ہے کہ مسیح صلیب پر فوت ہو گئے تھے۔ لیکن روز قیامت سے پیشتر اپنی قبروں سے جی اُٹھیں گے۔ اور

(۴) ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ مسیح صلیب پر فوت ہوگئے تھے اور اب نہ وہ خود ظاہر ہونگے نہ ان کا کوئی مثیل آئیگا۔

قرآن مجید کی جن آیات میں اس قصے کا ذکر ہے وہ حسب ذیل ہیں :۔

سورہ ۴۳ ۔ آیات ۵۷ تا ۶۱

(۵۷) وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ	اور جب ابن مریم کے متعلق ایک عجیب مضمون بیان کیا گیا تو یکایک آپ کی قوم کے لوگ چلانے لگے (تحقیر سے)
(۵۸) وَقَالُوٓا ءَأٰلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ	کہنے لگے ہمارے معبود بہتر ہیں یا عیسیٰ۔ یہ جو کچھ ان لوگوں نے بیان کیا محض جھگڑے کے لئے۔ اور یہ لوگ جھگڑالو ہیں +
(۵۹) إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ	عیسیٰ تو محض ایک ایسے بندے ہیں۔ جن پر ہم نے فضل کیا۔ اور ان کو بنی اسرائیل کے لئے ایک نمونہ بنایا +
(۶۰) وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ	اگر ہم چاہتے تو ہم تم سے فرشتوں کو پیدا کر دیتے کہ وہ زمین پر رہا کرتے +
(۶۱) وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ	وہ قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں۔ پس تم لوگ

بِهَا وَاتَّبِعُونِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۔

اس میں شک نہ کرو۔ اور میرا اتباع کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے ۔

سورہ ۵ - آیت ۱۲۰ :-

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِي بِهٖ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَ رَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا سوائے اس کے جو آپ نے مجھ سے کہنے کو کہا تھا۔ کہ تم اللہ کی بندگی اختیار کرو۔ جو میرا اور تمہارا رب ہے میں ان پر مطلع رہا جب تک ان میں رہا۔ پھر جب آپ نے مجھے وفات دی۔ تو آپ ان پر مطلع رہے اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں

سورہ ۳ - آیت ۵۵ و ۱۴۴ :

(۵۵) اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسٰى اِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ

اور جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ بیشک میں تجھ کو وفات دینے والا ہوں۔ اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ اور تجھ کو ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں۔ جو منکر ہیں اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں۔ ان کو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو منکر ہیں روز قیامت تک۔ پھر سب کی واپسی میری طرف ہوگی۔ سو میں تمہارے درمیان ان امور میں فیصلہ کروں گا۔ جن میں تم اختلاف کرتے تھے ۔

(۱۴۴) وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشَّاكِرِينَ

محمدؐ صرف رسول ہی تو ہیں۔ آپ سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہو جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے۔ اور جو شخص پیٹھ دکھا جائے گا۔ وہ خدا کا کوئی نقصان نہ کرے گا اور خدا حق شناس لوگوں کو جلد ہی جزا دے گا

سورہ ۴ - آیت ۱۵۷ و ۱۵۸ :

(۱۵۷) وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ

اور ان کا قول ہے کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو جو خدا کے رسول ہیں قتل کر دیا۔ حالانکہ نہ انہوں نے ان کو قتل کیا۔ نہ سولی پر چڑھایا۔ بلکہ ان کو

شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا

(۱۵۸) بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔

اشتباہ ہو گیا۔ اور جو لوگ ان کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں ہیں۔ ان کے پاس سوائے ظنی باتوں کے کوئی دلیل نہیں انہوں نے ان کو یقیناً قتل نہیں کیا۔

بلکہ خدا نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اور اللہ بڑا زبردست حکمت والا ہے۔

غیر احمدی مسلمان ان آیات کی تفسیر کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ معجزانہ طور پر نظر کا ایک دھوکا واقع ہو گیا تھا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے مسیح کو اپنی طرف اٹھا لیا تھا۔ وہ اب تک چوتھے آسمان پر موجود ہیں اور روز قیامت سے پہلے وہاں سے نازل ہوں گے۔ اس عقیدے کی تائید میں بے شمار حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن احمدی انہی آیات کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ مسیح صلیب پر نہیں بلکہ عام حالات میں طبعی موت مرے تھے۔ ان کے خصائل رکھنے والا ایک اور آدمی موعود تھا۔ چنانچہ وہ مرزا غلام احمد کی شخصیت میں ظہور کر چکا ہے۔ وہ نامور علماء و ائمہ کی کئی تحریرات اپنے اس عقیدے کی تائید میں پیش کرتے ہیں کہ روز قیامت سے پیشتر جو مسیح موعود ظاہر ہونے والا تھا خود مسیح نہیں بلکہ مثیل مسیح ہوگا۔ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش نے مجلس عمل کی جانب سے یہ دعویٰ کیا کہ ان آیات اور بعض دوسری آیات قرآنی کی احمدی تفسیر "تاویل و تحریف" ہے۔ جو کفر و ارتداد کی مترادف ہے اور جو شخص اس قسم کی غلط تاویل کا مرتکب ہو۔ وہ حلال الدم والمال ہو جاتا ہے (یعنی اس کے جان و مال کی حفاظت نہیں کی جاتی) اس بحث میں ایک متنازعہ فیہ معاملہ یہ ہے کہ سورہ ۴۳ کی آیت ۵۷ میں لفظ "مثلاً" کے کیا معنی ہیں۔ اور آیات محولہ بالا میں جو لفظ "وفی" آیا ہے۔ اس کے مشتقات کیا کیا ہیں۔ اور سورہ ۴۳ کی آیت ۶۱ میں لفظ "اِنّہٗ" کی ضمیر کس طرف راجع ہوتی ہے لیکن یہ ہمارا کام نہیں کہ اس بحث کے مالہٗ و ما علیہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔

جہاد

فریقین کے درمیان تیسرا اختلاف عقیدۂ جہاد کے حدود کے متعلق ہے۔ جن کا ذکر سورہ ۲۲ کی آیات ۳۹-۴۰۔ سورہ ۲ کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۴۔ سورہ ۶۰ کی آیت ۸۔ سورہ ۴ کی آیات ۷۴ و ۷۵۔ سورہ ۹ کی آیت ۵۔ اور سورہ ۲۵ کی آیت ۵۲ میں پایا جاتا ہے۔ آیات درج ذیل ہیں:-

سورہ ۲۲۔ آیات ۳۹-۴۰:-

(۳۹) اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ

ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی گئی کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا۔ اور اللہ یقیناً ان کو غالب کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے

(۴۰) الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم
بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا
اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ
بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ
صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَ
مَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ
اللَّهِ كَثِيرًا ط وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ
مَن يَنصُرُهُ ط إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ
عَزِيزٌ

جو لوگ اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اگر اللہ تعالیٰ ایک دوسرے کے ہاتھوں لوگوں کا زور نہ گھٹاتا رہتا تو نصاریٰ کے خلوت خانے، عبادت خانے یہود کے صومعے اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، سب منہدم ہو گئے ہوتے بے شک اللہ اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا بے شک اللہ قوت اور غلبے والا ہے۔

سورہ ۲ - آیات ۱۹۰ سے ۱۹۴ تک

(۱۹۰) وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ
يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ
اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑنے لگیں اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ واقعی اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۱۹۱) وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ
وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ
وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ
وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ
فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذَٰلِكَ
جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۔

اور ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ۔ اور ان کو نکال باہر کرو جہاں سے انہوں نے تم کو نکال باہر کیا ہے۔ اور شرارت قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور ان کے ساتھ مسجد حرام کے قریب قتال نہ کرو۔ جب تک وہ لوگ خود تم سے وہاں نہ لڑ پڑیں۔ اگر وہ خود ہی لڑنے لگیں تو تم بھی ان کو قتل کرو۔ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔

(۱۹۲) فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
رَّحِيمٌ

پھر اگر وہ لوگ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(۱۹۳) وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ
وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انتَهَوْا
فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ

اور ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فتنہ و شرارت باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے اور اگر وہ لوگ باز آجائیں تو بے انصافی کرنے والوں کے سوا سختی کسی پر بھی نہیں ہوتی۔

(۱۹۴) الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ
وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ
عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے عوض میں اور یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں پس جو تم پر زیادتی کرے، اس پر تم بھی زیادتی کرو۔ جیسی

مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ
وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ

زیادتی اس نے کی ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے

سورہ ۶۰ - آیت ۸ :

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ
یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ
مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا
اِلَیْھِمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ انصاف اور احسان کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے ؏

سورہ ۴ - آیت ۷۴ و ۷۵

(۷۴) فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ
یَشْرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ ؕ
وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ
فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ
نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ؕ

اس شخص کو چاہیئے کہ اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑے جو آخرت کے بدلے دنیوی زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے پھر جان سے مارا جائے یا غالب آجائے تو ہم اسے اجر عظیم دیں گے ۔

(۷۵) وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ
وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ
الظَّالِمِ اَھْلُھَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ
لَّدُنْکَ وَلِیًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ
لَّدُنْکَ نَصِیْرًا

اور تم کو کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزوروں کی خاطر جہاد نہیں کرتے جن میں کچھ مرد ہیں کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں اور جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں۔ اے خدا ہمارے لئے غیب سے کوئی دوست بھیج اور کوئی حامی بھیج ۔

سورہ ۹ - آیت ۵ :

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْھُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا
الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ وَ
خُذُوْھُمْ وَاحْصُرُوْھُمْ وَاقْعُدُوْا
لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ
اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا
سَبِیْلَھُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ مارو۔ پکڑو، باندھو اور ان کی گھات میں بیٹھو۔ پھر اگر توبہ کرلیں نماز پڑھیں۔ زکوٰۃ دیں تو ان کا رستہ چھوڑ دو اور اللہ بیشک بہت بخشش کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے ؏

سورۃ ۲۵ - آیت ۵۲

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا

پس کافروں کی خوشی کا کام نہ کرو۔ اور قرآن سے ان کا زور شور سے مقابلہ کرو ⁘

جہاں تک عقیدۂ جہاد کا تعلق ہے۔ احمدیوں کا خیال یہ ہے کہ جس جہاد کو "جہاد بالسیف" کہتے ہیں وہ صرف اپنے دفاع میں جائز ہے اور مرزا غلام احمد نے اس مسئلہ پر اپنا خیال پیش کرتے ہوئے محض ایک عقیدہ مرتب کر لیا ہے جو قرآن مجید ہی کی متعدد آیات پر مبنی اور براہ راست اسی سے ماخوذ ہے اور مرزا صاحب قرآن مجید کے کسی قاعدے یا کسی ہدایت کو منسوخ و موقوف کرنے کے مدعی نہیں ہیں۔ دوسری جماعتوں کا جواب یہ ہے کہ اس معاملے کے متعلق مرزا صاحب نے جن الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے ان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کسی قرآنی عقیدے کو پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ قرآن کے موجودہ قانون کو منسوخ کر رہے ہیں اس سلسلے میں مندرجہ ذیل فقروں وغیرہ کو بطور ثبوت پیش کیا جا رہا ہے :-

"مَیں ایک حکم لے کر آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں وہ یہ ہے کہ اب سے تلوار کے جہاد کا خاتمہ ہے۔"

"اب جہاد دین کے لئے حرام ہے"

"دین کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے۔"

"مسیح کے آنے کا یہ نشان ہے کہ وہ دین کی لڑائیاں ختم کر دے گا"

"مَیں نے جہاد کی ممانعت کے بارے میں نہایت مؤثر تقریریں کیں۔"

"مَیں نے جہاد کے خلاف صدہا کتابیں تحریر کر کے عرب اور مصر اور بلادِ شام اور افغانستان میں گورنمنٹ کی تائید میں شائع کی ہیں۔"

"مسیح موعود کے وقت جہاد کا حکم قطعیً منسوخ کر دیا گیا"۔

"اب زمین کے فساد بند کئے گئے۔"

"اب جو دین کے لئے تلوار اُٹھاتا ہے اور غازی نام رکھ کر کافروں کو قتل کرتا ہے وہ خداوند تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کا نافرمان ہے"۔

"میرے فرقے میں جس کا خدا نے مجھے امام اور رہبر مقرر فرمایا ہے تلوار کا جہاد بالکل نہیں۔ یہ فرقہ اس بات کو قطعاً حرام جانتا ہے کہ دین کے لئے لڑائیاں کی جائیں"۔

"اسلام میں جو جہاد کا مسئلہ ہے میری نگاہ میں اس سے بدتر اسلام کو بدنام کرنے والا اور کوئی مسئلہ نہیں"۔

"مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے"۔

یہ فقرے مرزا صاحب۔ ان کے جانشینوں اور پیروؤں کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ ان فقروں پر اور اس دعوے پر کہ "میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی" (اربعین نمبر ۴ صفحہ ۷) انحصار کر کے یہ پُر زور طریق پر کہا گیا ہے کہ ان میں جو اعلانات کئے گئے ہیں۔ اُن سے قرآن مجید کے موجودہ قانون

کی ترمیم یا تنسیخ لازم آتی ہے۔ احمدیوں کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جو الفاظ و تصریحات استعمال کی گئی ہیں۔ ان میں تنسیخ کا مفہوم نہیں، بلکہ قرآن مجید کے ایک عقیدے کی تعبیر و توجیہ ہے جو صدیوں سے غلط فہمی کا شکار بنا رہا ہے۔ اور بہر کیف ان الفاظ کی تعبیر دوسرے لوگ کچھ بھی کریں احمدیوں نے اس کا مطلب ہمیشہ یہی سمجھا ہے کہ ان میں کوئی نیا عقیدہ رائج نہیں کیا گیا، بلکہ اسی اصلی اور ابتدائی عقیدے کا اعادہ ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے اور مرزا غلام احمد نے صرف پرانے عقیدے کی پاکیزگی کو میل کچیل سے پاک کر دیا ہے۔ جماعت احمدیہ نے اس سلسلے میں "یضع الحرب" کی حدیث بھی پیش کی ہے اور کہا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنی تحریرات میں کسی قانون کو منسوخ نہیں کیا بلکہ اس حدیث کے مطابق صرف قتال کو معطّل کر دیا ہے۔ یہ نکتہ بے حد اہم ہے۔ کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ مرزا صاحب کا مقصد ان خیالات کے اظہار سے یہ ہے کہ قرآن مجید کے اصلی عقیدے کو منسوخ کر کے یا جزوی طور پر ترمیم کر کے ایک نیا عقیدہ قائم کریں اور ان کے پیرو یہی سمجھیں کہ انہوں نے یہ نیا عقیدہ قائم کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرزا صاحب کا دعوٰے نبوتِ "تشریعی نبی" کی حیثیت سے ہے اور اس اعتبار سے یہ دعوے "آیہ خاتم النبیین" کی اس تفسیر کے بھی منافی ہوگا جو خود احمدی کرتے ہیں۔ اور اگر اس عقیدے کی تاویل وحی یا الہام پر مبنی ہے تو اس سے اور بھی زیادہ یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ غیر احمدی جماعتیں اس دلیل کو اور بھی آگے بڑھا کر یہ کہتی ہیں کہ اگر ان تحریروں میں ظاہر کردہ خیال محض اصلی اور ابتدائی عقیدے کے اثبات و تائید ہی پر مشتمل ہے جب بھی مرزا صاحب کی حیثیت تشریعی نبی کی ٹھیرتی ہے۔ کیونکہ اگر اثبات کرنے والا حقِ تاویل کے بجائے حقِ اعلان و اثبات کا دعوےٰ کرے تو اصولاً اثباتی تشریح بھی بجائے خود اصلی عقیدے کی تشریح کے برابر ہے۔ احمدی ان تحریروں کی صحیح اہمیت واضح کرنے کی کوشش میں قرآن مجید کی ان متعلقہ آیات کو پیش کرتے ہیں جو ہم نے اوپر نقل کی ہیں اور اس عام رائے کی صحت پر اعتراض کرتے ہیں کہ "آیت السیف" نے (نویں سورت کی پانچویں آیت جو مدنی ہے) ان مکی آیات کو منسوخ کر دیا ہے جن میں حفظ و دفاع کی غرض سے یا ان مومنین کو ظلم سے نجات دلانے کے لئے جنگ و قتال کا ذکر کیا گیا ہے جو عرب کے اس حصے میں آباد تھے جو کفار کے زیر اثر تھا کہا گیا ہے کہ یہ امر احمدیوں کے بنیادی عقیدوں میں شامل ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت کسی بعد کی آیت کی وجہ سے منسوخ نہیں کی گئی اور ان کا دعوٰے ہے کہ "آیت السیف" کسی اعتبار سے بھی مکی آیات کے منافی یا غیر مطابق نہیں ہے وہ ناسخ و منسوخ کے پورے نظریّے کی تردید کرتے ہیں اور انہوں نے مندرجہ ذیل دو آیتوں کی (جن کا تعلق اس نظریّے سے ہے) دوسری وجوہ کی بنا پر صراحت و وضاحت کی کوشش کی ہے :-

سورہ ۲ - آیت ۱۰۶ :

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا — ہم کسی آیت کا حکم موقوف کر دیتے ہیں یا اس کو

يَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

بُھلا دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا ویسی ہی آیت بھیج دیتے ہیں کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ٭

سورۃ ۱۶ - آیت ۱۰۱ :

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ ۙ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ

اور جب ہم کسی آیت کو دوسری آیت کے بجائے بدلتے ہیں تو گو اللہ تعالیٰ جو حکم بھیجتا ہے اسے خوب جانتا ہے لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم جھوٹے اور جعلساز ہو ٭

ہم نے اس بحث کے نکتے کی تصریح کر دی ہے اب ہم اس موضوع کو یہیں چھوڑتے ہیں لیکن بعد میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ قرآن مجید کی سیدھی سادی آیات کو اکثر کس طرح غلط سمجھا گیا ہے اور ان کو بعض نہایت چونکا دینے والی عمومی تاویلات کا آلہ بنایا گیا ہے جو تفسیر یا تاویل کے کسی مُسلّمہ قاعدے کے رو سے حق بجانب نہ تھیں ٭

جس بحث کا سلسلہ اوپر بیان کیا گیا ہے، اس کے بیج پچاس سال سے زیادہ عرصے پر بکھرے ہوئے ہیں عقیدۂ ختم نبوت عیسیٰ بن مریم کا روزِ قیامت سے پہلے بجسدِ عنصری دوبارہ ظہور اور مسئلہ جہاد، ان تینوں مسائل کے متعلق اختلافات ایسے تھے کہ علما کی طرف سے احتجاج اور مرزا صاحب کے خلاف کفر کے فتووں کا اجرا بالکل طبعی تھا۔ لہٰذا ۱۸۹۲ء میں جونہی مرزا صاحب نے مامور من اللہ ہونے کا دعوےٰ کیا۔ ان کے خلاف کفر کے فتوے دیئے جانے لگے، اس تحریک میں جہاں بعض ذی علم اور ذی اثر حضرات مثلاً مولانا محمد علی۔ خواجہ کمال الدین۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اور ڈاکٹر محمد حسین کشاں کشاں شامل ہو گئے، وہاں دوسرے لوگ غضبناک بھی ہوئے جو اس تحریک کو اصلاً سیاسی تحریک اور مسلمان ممالک و اقوام کے لئے باعث خطرہ سمجھتے تھے ڈاکٹر محمد اقبال نے اس کی شدید مذمت کی اور پروفیسر الیاس برنی نے اس کو استہزا کا نشانہ بنایا۔ بے شمار دیگر حضرات نے اس کے خلاف لکھا اور اب تک مسلسل لکھ رہے ہیں۔ احمدی نشر و اشاعت کی وقعت کو خوب جانتے ہیں۔ چنانچہ ان کے پروپیگنڈا کی مشینری بھی آغاز سے اب تک برابر سرگرم کار رہی۔ اس طرح دونوں طرف سے بے اندازہ لٹریچر فراہم ہو گیا ٭

دیگر شکایات و الزامات

اسلام کے تمام مذہبی مباحثات میں مُلحد۔ مُرتد۔ کافر۔ زندیق۔ مشرک۔ منافق۔ فاسق۔ فاجر۔ مفتری۔ ملعون۔ کذّاب۔ شیطان۔ ابلیس۔ مردود۔ شقی کے الفاظ نہایت عام ہیں۔ چنانچہ اس مباحثے کے متعلقہ لٹریچر میں یہ تمام الفاظ استعمال کئے جانے لگے۔ اس کے بعد فریقین نے

ایسے الفاظ بھی استعمال کئے جو چنداں اصطلاحی نہ تھے مثلاً ولد الزنا۔ ولد الحرام، خنزیر۔ طوائفین رنڈیاں، کتیاں۔ شرابی۔ زانی۔ بدکار۔ فریبی، غنڈا، خونی۔ بے حیا اور بے شمار دیگر الفاظ جن کا ذکر بے حد شرمناک ہے تقسیم کے بعد سے اس نزاع نے محض دشنام طرازی کی ایک مسلسل قسم کی صورت اختیار کر لی ہے جس میں شخصی چال چلن پر نہایت فحش اور بازاری حملے کئے گئے ہیں اور احرار اس معاملے میں اپنے مخالفین سے ہمیشہ بازی لے گئے ہیں ؛

اس قسم کے اختلافات انگریزوں کے لئے نہایت مفید تھے کیونکہ ان کا منشا یہی تھا کہ اُن کے محکوم لوگ مذہبی اختلافات میں اُلجھے رہیں۔ اور جب تک اس قسم کے نزاعات سے قانون و انتظام میں خلل اندازی کا کوئی خطرہ پیدا نہ ہوتا وہ ان کو غنیمت سمجھتے اگر لوگ محض اس جھگڑے میں مصروف رہتے کہ دوسروں کو جنت میں جانے کا حق ہے یا وہ ابدی جہنم کی آگ میں جلنے کے مستحق ہیں۔ اور وہ نہ ایک دوسرے کا سر پھوڑتے نہ اپنے لئے دنیاوی فوائد کا مطالبہ کرتے تو انگریز ان نزاعات کو کامل بے پروائی بلکہ شاید اطمینان سے دیکھتا رہتا لیکن جونہی یہ نزاعات ایک دوسرے کا سر پھوڑنے میں منتج ہوتے وہ فسادیوں کی سرکوبی میں نہایت شدید اور بیدرد بن جاتا۔ مرزا صاحب انگریزی راج کی اس برکت کی بے حد قدر کرتے تھے جو نہ صرف ان نزاعات کی اجازت دیتا تھا بلکہ ان کی ہمت افزائی کرتا تھا اور غیر احمدیوں کو تحریک احمدیہ کے بانی اور اس کے لیڈروں کے خلاف جو بڑی بڑی شکایات تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ انگریزوں کے ذلیل خوشامدی ہیں "جہاد" کے متعلق مرزا صاحب کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب ان واقعات کے پیش نظر لکھی تھی جو سرحد پر رونما ہو رہے تھے اور جن میں متعدد انگریز افسر قتل کر دئیے گئے تھے ہر انگریز افسر کو جو ہندوستان میں آتا تھا ہدایت کی جاتی تھی کہ "غازی" کی طرف سے ہوشیار رہے یعنی اس مذہبی دیوانے افغان یا قبائلی سے جو کسی کافر کو قتل کرنا کار ثواب سمجھتا تھا یہ فعل اس کے لئے مالی نفع کا موجب بھی ہوتا تھا اور خدا کے ہاں بھی اس کا اجر مُسلّم تھا۔ اگر اس قسم کے حملے مذہبی تعصب کا نتیجہ تھے تو ان کا ارتکاب یقیناً اسلام کے عقیدہ جہاد کے منافی تھا۔ اور مرزا صاحب نے اس عقیدے کی جو تردید کی وہ مستحسن تھی لیکن جب انہوں نے عقیدۂ جہاد کی تاویل میں "مہربان انگریزی حکومت" اور اس کی مذہبی رواداری کی تعریف نہایت خوشامدانہ لہجے میں کرنی شروع کی تو اس تاویل پر چند در چند شبہات پیدا ہونے لگے، پھر جب مرزا صاحب نے ممالک اسلامی کی عدم رواداری اور انگریزوں کی فراخ دلانہ مذہبی پالیسی کا مقابلہ و موازنہ توہین آمیز انداز میں کیا تو مسلمانوں کا غیظ و غضب اور بھی زیادہ مشتعل ہو گیا۔ احمدی جانتے تھے کہ ان کے عقائد دوسرے مسلم ممالک میں اشاعت ارتداد پر محمول کئے جائیں گے۔ اور ان کا یہ خیال اُس وقت اور بھی پختہ ہو گیا ہو گا جب افغانستان میں عبداللطیف (احمدی) کو سنگسار کیا گیا۔ جب پہلی جنگ عظیم میں (جس میں ترکوں کو شکست

ہوگئی تھی) بغداد پر ۱۹۱۸ء میں انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور قادیان میں اس "فتح" پر جشنِ مسرت منایا گیا تو مسلمانوں میں شدید برہمی پیدا ہوئی۔ اور احمدی انگریزوں کے پٹھو سمجھے جانے لگے۔

جب تقسیمِ ملک سے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا دُھندلا سا امکان اُفق پر نظر آنے لگا تو احمدی آنے والے واقعات کے متعلق متفکر ہونے لگے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء کے آغاز تک ان کی بعض تحریروں سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ انہیں پہلے انگریزوں کا جانشین بننے کی توقع تھی۔ لیکن جب پاکستان کا دُھندلا سا خواب مستقبل کی ایک حقیقت کا روپ اختیار کرنے لگا تو ان کو یہ امر کسی قدر دشوار معلوم ہوا کہ ایک نئی مملکت کے تصور کو مستقل طور پر گوارا کرلیں۔ انہوں نے اس وقت اپنے آپ کو عجیب گومگو کی حالت میں پایا ہوگا کیونکہ نہ تو وہ بھارت کی غیر مذہبی ہندو مملکت کو اپنے لئے چن سکتے تھے نہ پاکستان کو پسند کرسکتے تھے جس میں فرقہ بازی کے روا رکھے جانے کی کوئی توقع نہ تھی۔ ان کی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تقسیم کے مخالف تھے اور کہتے تھے کہ اگر ملک تقسیم بھی ہوگیا تو وہ اسے دوبارہ متحد کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کی وجہ واضح طور پر یہ تھی کہ احمدیت کے مرکز قادیان کا مستقبل بالکل غیر یقینی نظر آرہا تھا جس کے متعلق مرزا صاحب بہت سی پیشگوئیاں کرچکے تھے۔

مشروط تقسیم کے ماتحت قادیان پاکستان میں شامل کیا گیا تھا لیکن ضلع گورداسپور میں (جہاں قادیان واقع ہے) مسلمان صرف ایک فیصدی کی اکثریت میں تھے اور اس ضلع کی مسلمان آبادی زیادہ تر تین شہروں میں جمع تھی۔ جن میں ایک قادیان تھا۔ لہٰذا قادیان کے آخری شمول کے متعلق اندیشے محسوس کئے جانے لگے۔ اور چونکہ احمدی اس کو ہندوستان میں شامل کرنے کا مطالبہ نہ کرسکتے تھے۔ لہٰذا ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا کہ اس کو پاکستان میں شامل کرانے کے لئے جدوجہد کریں۔ احمدیوں کے خلاف معاندانہ اور بے بنیاد الزامات لگائے گئے ہیں کہ باؤنڈری کمیشن کے فیصلے میں ضلع گورداسپور اسلئے ہندوستان میں شامل کردیا گیا کہ احمدیوں نے ایک خاص رویہ اختیار کیا۔ اور چودھری ظفر اللہ خان نے جنہیں قائدِ اعظم نے اس کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش کرنے پر مامور کیا تھا خاص قسم کے دلائل پیش کئے۔ لیکن عدالت ہذا کا صدر جو اس کمیشن کا ممبر تھا اس بہادرانہ جدوجہد پر تشکر و امتنان کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جو چودھری ظفر اللہ خان نے گورداسپور کے معاملے میں کی تھی۔ یہ حقیقت باؤنڈری کمیشن کے کاغذات میں ظاہر و باہر ہے اور جس شخص کو اس مسئلے سے دلچسپی ہو۔ وہ شوق سے اس ریکارڈ کا معائنہ کرسکتا ہے۔ چودھری ظفر اللہ خان نے مسلمانوں کی نہایت بے غرضانہ خدمات انجام دیں۔ ان کے باوجود بعض جماعتوں نے عدالت تحقیقات میں ان کا ذکر جس انداز میں کیا ہے وہ شرمناک ناشکرے پن کا ثبوت ہے۔

احمدیوں کے خلاف دوسری شکایت جو ہمارے سامنے تفصیل سے پیش کی گئی ہے یہ ہے کہ

مرزا غلام احمد نے دوسرے انبیا کے مقابلے میں جن میں ہمارے رسول پاک صلعم بھی شامل ہیں، اپنا ذکر مبالغہ آمیز انداز سے کیا ہے اور احمدی اپنے بعض اشخاص کے متعلق امیر المومنین۔ اُم المومنین سیدۃ النساء۔ رضی اللہ عنہ، صحابہ کرام جیسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جو نبی کریمؐ کے اہل بیت یا ان کے حلقہ احباب سے مخصوص طور پر منسوب ہونے کی وجہ سے خاص تقدس و احترام کی سرمایہ دار بن چکی ہیں۔ مسٹر عبدالرحمان خادم نے جنھوں نے کتب قدیمہ کی تلاش و تجسس میں بڑی محنت کی ہے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ان القاب میں سے اکثر بعض اولیا کے خاندانوں میں بھی استعمال کئے جا چکے ہیں جن میں احراری لیڈر صاحبزادہ فیض الحسن کا خاندان بھی شامل ہے اور دوسرے فرقوں کے لیڈروں اور پیروں کے لئے بھی یہ القاب استعمال کئے گئے ہیں۔ جن میں ایک اور احراری لیڈر چودھری افضل حق بھی ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں کہ آیا ان القاب کا استعمال جائز تھا یا ناجائز۔ لیکن اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے جذبات ان القاب کے استعمال سے ضرور متاثر ہوتے ہیں جو خاص اور محدود شخصیتوں کے لئے استعمال ہونے کی وجہ سے مقدس قرار پا چکے ہیں اور ان کے ساتھ تاریخ اسلام کی بعض بلند شخصیتوں کی یاد وابستہ ہے۔ احمدی لٹریچر میں رسول پاکؐ کے خاندان کی بعض خواتین کے متعلق جو حوالے پائے جاتے ہیں ان کے متعلق بھی ہمارا یہی خیال ہے گو اس شکایت کی ایک نظیر "قلائد الجواہر" میں بھی پائی جاتی ہے اور وہ شاید زیادہ مبتذل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رسول پاک صلعم اور کسی دوسرے زندہ یا مُردہ شخص کے درمیان مقابلہ و موازنہ ہر مومن کے لئے دل آزاری کا موجب ہے۔ احمدی افسروں اور عہدہ داروں کے متعلق صدر مقام کو اس اطلاع کا موصول ہونا بھی ثابت ہو چکا ہے کہ انہوں نے بعض لوگوں کو احمدی فرقے میں داخل کیا لیکن مرکزی حکومت کے سرکاری اعلان مورخہ ۱۴۔ اگست ۱۹۵۲ء کے بعد امام جماعت احمدیہ نے ایک ہدایت نامہ جاری کر کے ان تبلیغی سرگرمیوں کو روک دیا تھا۔

یہاں اس مضمون کا ذکر ضروری ہے جو "الفضل" مورخہ ۱۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں "خونی مُلّا کے آخری دن" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس کی طرف جماعت اسلامی۔ مجلس عمل اور مجلس احرار نے خاص طور پر توجہ دلائی ہے اور اس کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ احمدی لٹریچر اشتعال انگیز ہے۔ اس مضمون سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ پروردگار عالم پاکستان کی نئی مملکت کو اس غرض سے وجود میں لایا ہے کہ مُلّا کو ختم کر دے۔ اس تحریر میں مُلّا کو نہایت سخت الفاظ میں بُرا بھلا کہا گیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ زمانہ ماضی کی بہت سی مسلمان مملکتوں کے زوال کی ذمہ داری مُلّا پر عائد ہوتی ہے۔ اس مضمون میں تین احمدیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو افغانستان میں مار ڈالے گئے تھے۔ یعنی امیر عبدالرحمن خان کے زمانے میں ایک شخص عبدالرحمن خان، امیر حبیب اللہ خان کے عہد حکومت میں صاحبزادہ عبداللطیف (جو سنگسار کیا گیا تھا) اور امیر امان اللہ خان کے عہد میں نعمت اللہ اور

اس کے ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ ان تینوں امیروں کا کیا حشر ہوا۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ مُلّا زدہ افغانستان کے مقابلے میں مملکت پاکستان وجود میں آئی ہے جو زیادہ روادار ہے۔ قائداعظم کی اس پالیسی کا حوالہ دے کر کہ تمام مسلمانوں کو مل کر متحدہ محاذ پیش کرنا چاہیئے کہا گیا ہے کہ اس سے عطا اللہ شاہ بخاری۔ مُلّا بدایونی۔ مُلّا احتشام الحق۔ مُلّا مودودی اور مُلّا محمد شفیع جیسے مُلّاؤں کا انجام ظاہر ہے۔ یہ مضمون قطعی طور پر اشتعال انگیز ہے۔ اس میں مولانا احتشام الحق اور مولانا محمد شفیع جیسے عُلما کا ذکر تحقیر آمیز پیرائے میں کیا گیا ہے جو دستور ساز اسمبلی کے ملحقہ تعلیمات اسلامی بورڈ کے ممبر ہیں۔ اور اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تضحیک کی گئی ہے جن کا دینیات میں تبحر سب کے نزدیک مُسلّم ہے۔ اس مضمون سے نہ صرف اُن علما کی جو اس میں مذکور ہیں۔ بلکہ یقیناً علما کے پورے گروہ کی دل آزاری ہوئی ہوگی۔ لیکن اس مضمون کے متعلق ایک بات قابل ذکر ہے۔ کہ یہ اُس وقت لکھا گیا ہے۔ جب آل مسلم پارٹیز کنونشن (کراچی) اور آل مسلم پارٹیز کنونشن (لاہور) اپنی اپنی مجلس عمل مرتب کر چکی تھیں۔ ان میں پانچ مذکورہ بالا عُلما شامل تھے۔ اور احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دلانے کی مہم کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ لہذا یہ مضمون جذبۂ انتقام کے ماتحت لکھا گیا تھا۔ بہر کیف اس سے ظاہر ہے کہ کس طرح ایک جماعت کے حملے کا جواب دوسری جماعت کی طرف سے دیا جا رہا تھا اور صورت حالات بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

احمدی ایک متحد و منظم جماعت ہیں۔ ان کا صدر مقام ایک خالص احمدی قصبے میں واقع ہے۔ جہاں ایک مرکزی تنظیم قائم ہے جس کے مختلف شعبے ہیں۔ مثلاً شعبۂ امور خارجہ۔ شعبہ امور داخلہ۔ شعبہ امور عامہ اور شعبہ نشر و اشاعت یعنی وہ شعبے جو ایک باقاعدہ سیکرٹیریٹ کی تنظیم میں ہوتے ہیں وہ سب یہاں موجود ہیں۔ ان کے پاس رضاکاروں کا ایک جیش بھی ہے جس کو "خدامِ دین" کہتے ہیں۔ "فرقان بٹالین" اسی جیش سے مرکب ہے۔ اور یہ خالص احمدی بٹالین ہے جو کشمیر میں خدمت انجام دے چکی ہے۔ احمدی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ یا ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور اپنی لڑکیاں ان کو نکاح میں نہیں دیتے یہ تمام حقائق شہادت سے ثابت ہو چکے ہیں۔ اور انہی کی بنا پر غیر احمدی جماعتیں اپنے اس مطالبہ کو حق بجانب قرار دیتی ہیں کہ احمدیوں کو ایک علیحدہ قوم قرار دیا جائے۔ احمدی اس تنظیمی بندوبست کو اس بنا پر جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر جماعت کو جس کے سامنے ایک قطعی مقصد۔ حکمت عملی اور لائحہ عمل موجود ہو۔ اس کا حق حاصل ہے کہ اپنے معاملات کو اپنے طریقے پر منظم کرے تاکہ بہترین نتائج پیدا ہوں۔ اس الزام کے جواب میں کہ وہ اپنی لڑکیاں غیر احمدیوں کو نہیں دیتے۔ احمدیوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ غیر احمدی کے ساتھ احمدی لڑکی کا نکاح ہمارے نزدیک کالعدم یا ناجائز نہیں ہے۔

لیکن لڑکی کے مفاد کے پیش نظر اس کے والدین کو یہی مشورہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لئے اپنی جماعت ہی میں شوہر تلاش کریں اس سلسلے میں دوسرے فرقوں اور جماعتوں کی مثالیں دی گئی ہیں جو اسی طریق پر عمل کرتی ہیں۔ مسلمانوں کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کے الزام کا جواب بھی یہی دیا جاتا ہے۔ کہ دوسرے فرقے بھی اسی امتیاز پر عامل ہیں یہ مثال نمایاں طور سے پیش کی گئی ہے کہ چودھری ظفراللہ خان قائداعظم کی نماز جنازہ میں شامل نہیں ہوئے لیکن چودھری ظفراللہ خان کا جواب یہ ہے کہ نماز جنازہ کے امام مولانا شبیر احمد عثمانی احمدیوں کو کافر۔ مرتد اور واجب القتل قرار دے چکے تھے اس لئے میں اس نماز میں شریک ہونے کا فیصلہ نہ کر سکا جس کی امامت مولانا کر رہے تھے۔ نماز جنازہ کے متعلق احمدیوں نے ہمارے سامنے بالآخر یہ موقف اختیار کیا کہ مرزا غلام احمد کا ایک فتوےٰ حال ہی میں دستیاب ہوا ہے جس میں انہوں نے احمدیوں کو اجازت دی ہے کہ وہ ان مسلمانوں کی نماز جنازہ میں شریک ہو سکتے ہیں جو مرزا صاحب کے مکذب اور مکفر نہ ہوں۔ لیکن اس کے بعد بھی معاملہ وہیں کا وہیں رہتا ہے کیونکہ اس فتوےٰ کا ضروری مفہوم یہی ہے کہ اس مرحوم کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی جو مرزا صاحب کو نہ مانتا ہو لہٰذا اس اعتبار سے یہ فتوےٰ موجودہ طرز عمل ہی کی تائید و تصدیق کرتا ہے۔

اس مسئلے پر کہ آیا احمدی دوسرے مسلمانوں کو ایسا کافر سمجھتے ہیں جو دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ احمدیوں نے ہمارے سامنے یہ موقف ظاہر کیا ہے کہ ایسے لوگ کافر نہیں ہیں اور لفظ "کفر" جو احمدی لٹریچر میں ایسے اشخاص کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے کفر خفی یا انکار مقصود ہے یہ ہرگز کبھی مقصود نہیں ہوا کہ ایسے اشخاص دائرہ اسلام سے خارج ہیں لیکن ہم نے اس موضوع پر احمدیوں کے بے شمار سابقہ اعلانات دیکھے ہیں اور ہمارے نزدیک ان کی کوئی تعبیر اس کے سوا ممکن نہیں کہ مرزا غلام احمد کے نہ ماننے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ مسلمان جو رسول پاک صلعم کے بعد کسی مامور من اللہ کے دعوے کو قبول نہیں کرتے چونکہ وہ اللہ اور رسولؐ کے منکر نہیں ہیں لہٰذا "امت" میں شامل ہیں یہ قول کسی اعتبار سے بھی اس سابقہ اعلان سے غیر مطابق نہیں کہ دوسرے مسلمان کافر ہیں در اصل ان الفاظ سے اُس سابقہ عقیدے کی بالواسطہ تصدیق ہوتی ہے کہ ایسے اشخاص صرف ان معنوں میں مسلمان ہیں کہ وہ رسولؐ کی امت سے تعلق رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے مسلم معاشرے کے ممبر کہلانے کے حقدار ہیں۔ یہ موقف اس قول سے بالکل مختلف ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور کافر نہیں ہیں۔

آخری شکایت احمدیوں کے خلاف یہ ہے کہ وہ احمدیہ عقائد کی تبلیغ کے لئے جارحانہ پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ اس شکایت کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ چودھری ظفراللہ خان نے ۱۸۔ مئی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک کراچی میں تقریر کی۔ احمدی افسر عام جلسوں کی کھلم کھلا صدارت کرتے اور تحریک احمدیت کی حمایت میں تقریریں کرتے ہیں اور جن لوگوں کا ان سے سرکاری طور پر سابقہ پڑتا ہے ان کو

احمدی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس امر پر شدید اعتراض کیا گیا ہے کہ سرکاری افسر اور اہلکار مقامی انجمنوں کے عہدہ دار بن جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مرزا بشیر الدین محمود احمد کی کوئٹہ والی تقریر پیش کی گئی ہے جو "الفضل" مورخہ ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی تھی اور جس میں انہوں نے اپنی جماعت سے اپیل کی تھی کہ بلوچستان میں اپنے پروپیگنڈا کو تیز کر دیں تاکہ یہ صوبہ آئندہ سرگرمیوں کا مرکز بن جائے۔ اس کے علاوہ ان کا وہ خطبہ پیش کیا گیا۔ جو ۱۹۵۱ء کے کرسمس میں انہوں نے صدر انجمن احمدیہ ربوہ کے سالانہ اجلاس میں دیا تھا اور جو "الفضل" مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اس خطبہ میں انہوں نے اپنے پیروؤں سے پُر جوش اپیل کی تھی کہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیں تاکہ جو لوگ اب تک منکر رہے ہیں وہ ۱۹۵۲ء کے آخر تک احمدیت کے آغوش میں آجائیں ایک اور خطبے کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو "الفضل" مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا اور جس میں احمدیوں کو ترغیب دی گئی تھی کہ صرف ایک محکمے یعنی فوج ہی میں جمع نہ ہو جائیں بلکہ تمام دوسرے محکموں میں بھی پھیل جائیں۔ اس کے علاوہ بہت سی رپورٹوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جو احمدی سرکاری افسروں اور اہلکاروں نے اپنی تبلیغ کے نتائج کے متعلق صدر مقام کو بھیجیں +

احمدیوں کا پروپیگنڈا صرف پاکستان تک محدود نہیں۔ اور "الفضل" کی بعض شائع کردہ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے ملکوں میں جو احمدی مقرر ہیں۔ اُن کی تبلیغ پر بھی بعض اوقات مار پیٹ اور بدنظمی رونما ہو گئی۔ اسی قسم کا ایک واقعہ اوکاڑہ میں بھی پیش آیا تھا۔ وہاں ایک احمدی ڈپٹی کمشنر کے عہد میں بعض احمدی مُبلّغین غیر احمدیوں کے دیہات میں گئے اور وہاں اُن سے بدسلوکی کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ اس بدسلوکی کے سلسلے میں گرفتاریاں ہوئیں پھر ان گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں بعض مقررین نے تقریریں کیں اور ان تقریروں کو سن کر ایک نوجوان نے ایک احمدی مُدرّس کو قتل کر دیا +

بیان کیا جاتا ہے کہ اس شدید اور جارحانہ پروپیگنڈا سے مسلمانوں کے جذبات مذہبی کو صدمہ پہنچا اور اسی وجہ سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ بحث کے دوران میں احمدی لیڈروں کی بعض دوسری تحریرات کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن میں مسلمانوں کو لفظ "دشمن" سے موسوم کیا گیا تھا یا اُن کے لئے صرف "مسلمان" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا تاکہ احمدیوں سے ممیز کیا جا سکے +

مطالبات کی پُشت پر نظریّہ

مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائدی اختلافات اور احمدیوں کی سرگرمیوں کے متعلق اس بیان کی ترتیب کے بعد ہم اُن وجوہ کو سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں جن کی بنا پر تین مطالبات پیش کئے گئے

ہم اس سے پیشتر لکھ چکے ہیں کہ قریب قریب تمام علما اس امر پر متفق ہیں کہ تین مطالبات میں سے ہر مطالبہ اسلام کے اُس تصور پر مبنی ہے جو ان کے نزدیک صحیح ہے۔ مولانا داؤد غزنوی ماسٹر تاج الدین انصاری، سید مظفر علی شمسی اور بعض دوسرے اشخاص نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ یہ مطالبات اس قرار داد مقاصد کا قدرتی نتیجہ تھے جو ۱۲۔ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں طویل اور پُرجوش بحث کے بعد منظور ہوئی تھی۔ تحقیقات کے دوران میں شروع سے آخر تک ہر شخص کے نزدیک یہ بات مسلّم تھی کہ یہ مطالبات اُسی نظریئے کی پیداوار ہیں جس کے بل پر پاکستان میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کا دعویٰ، اور بعض حلقوں کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا۔ مطالبات کی معقولیت یا عدم معقولیت کا اندازہ کرنے کے لئے اس نکتے کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی مملکت میں (یا اسلام میں کیونکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں) مسلم رعایا اور غیر مسلم رعایا کے حقوق کے درمیان بنیادی فرق و امتیاز ہے اور ایک فرق کا ذکر تو ابھی کیا جاسکتا ہے کہ غیر مسلموں کو نظم و نسق حکومت کے اونچے دائروں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا اگر احمدی مسلمان نہیں بلکہ کافر ہیں تو وہ مملکت کے کسی بڑے عہدے پر فائز نہیں ہو سکتے۔ اسلئے یہ لازم آتا ہے کہ دو مطالبوں کے مطابق چودھری ظفراللہ خان اور دوسرے احمدیوں کو جو مملکت کے کلیدی عہدوں پر قابض ہیں موقوف کر دیا جائے۔ اور تیسرے مطالبہ میں احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آیندہ کسی احمدی کو مملکت میں کوئی ایسا مقام حاصل نہ ہو سکے۔ چونکہ یہ مسئلہ جس کو مطالبات نے بلا واسطہ پیدا کیا ہے۔ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور پاکستان کے مستقبل کے لئے انتہا درجے کا اہم ہے اسلئے ہم نے علما کی امداد سے "مملکت اسلامی" کے تصور اور اس کے متعلقات پر گہری نظر ڈالی ہے۔ اور اب ہم اسی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

مملکت اسلامی

ہمارے سامنے یہ بار بار کہا گیا ہے کہ پاکستان کے مطالبے میں "مملکت اسلامی" کا مطالبہ قطعاً شامل تھا۔ پاکستان کے لئے جدوجہد کرنے والے اہم لیڈروں کی بعض تقریروں سے بلاشبہ یہی مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ لیڈر جب مملکت اسلامی کا یا کسی ایسی مملکت کا نام لیتے تھے جس پر قوانین اسلامی کی حکومت ہوگی تو شاید ان کے ذہن میں کسی ایسے قانونی نظام کا تصور ہوگا جو اسلامی عقائد۔ اسلامی قانون شخصی۔ اسلامی اخلاقیات اور اسلامی ادارت پر مبنی ہو یا ان سے مخلوط ہو۔ جس شخص نے بھی پاکستان میں ایک مذہبی مملکت کے قیام پر سنجیدگی سے غور کیا ہے اُسے اُن عظیم مشکلات کا ضرور احساس ہوا ہے جو کسی ایسی سکیم میں لازماً پیش آئیں گی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کا تصور قائم کرنے والے اولین مفکر سمجھے جاتے ہیں۔ اپنے خطبۂ صدارت (مسلم لیگ ۱۹۳۰ء) میں فرمایا:۔

"ہندوؤں کو کسی قسم کا اندیشہ نہ ہونا چاہیئے کہ خود اختیار مُسلم مملکتوں کی تخلیق کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسی مملکتوں میں کوئی مذہبی قسم کی حکومت قائم ہوگی۔ یہ اصول کہ ہر گروہ کو اپنے خطوط پر آزادانہ ترقی کرنے کا حق ہونا چاہیئے ہرگز کسی تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کی پیداوار نہیں ہو سکتا۔"

جب ہم ذمہ داری کے مسئلے پر توجہ کریںگے تو ہم یہ ضرور بتائیں گے کہ جو جماعتیں آج تینوں مطالبات کو مذہبی وجوہ کی بنا پر نافذ کرانے کے لئے تقاضا کر رہی ہیں۔ ان میں سے اکثر خود اسلامی مملکت کے تصور کی مخالف ہیں۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا خیال بھی یہی ہے کہ اگر کبھی نئی "مسلم مملکت" وجود میں آگئی تو اس میں حکومت کی ہیئت صرف سیکولر (غیر مذہبی) ہی ہو سکتی ہے۔

تقسیم سے پہلے قائداعظم نے پاکستان کی جو پہلی تصویر دنیا کے سامنے پیش کی وہ اُس انٹرویو میں ظاہر ہوئی تھی جو انہوں نے رائٹر کے نامہ نگار مسٹر ڈون کیمبل کو دیا تھا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ نئی مملکت ایک عصری جمہوری مملکت (ماڈرن ڈیماکریٹک سٹیٹ) ہوگی جس میں حاکمیت کے حامل جمہور ہوں گے۔ اور اس نئی قوم کے تمام افراد کے حقوق شہریت بلا امتیاز مذہب ونسل وعقیدہ مُساوی ہوں گے۔ جب پاکستان رسمی طور سے نقشۂ عالم پر نمودار ہوگیا تو قائداعظم نے ۱۱۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں ایک یادگار تقریر کی جس میں نئی مملکت کے بنیادی اصولوں کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اس کے باوجود اس تقسیم میں اُن اقلیتوں کے مسئلے سے دامن بچانا ناممکن ہے جو ایک ڈومینین یا دوسری میں رہ جائیں گی۔ یہ بات بالکل ناگزیر تھی۔ اس کے سوا کوئی دوسرا حل نہیں۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ اگر ہم پاکستان کی اس عظیم مملکت کو خرّم وخوشحال بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم باشندوں کی خصوصاً عوام اور غربا کی فلاح وبہبود پر اپنی تمام کوششیں مرتکز کر دیں۔ اگر تم باہم تعاون سے کام کرو گے ماضی کو بھول جاؤ گے اور مخالفتوں کو ترک کر دو گے تو تم لازماً کامیاب ہو جاؤ گے۔ اگر تم اپنے ماضی کو بدل دو گے۔ اور اس سپرٹ میں متحد ہو کر کام کرو گے کہ تم میں سے ہر ایک خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ خواہ ماضی میں اس کے تعلقات تمہارے ساتھ کیسے ہی رہے ہوں۔ خواہ اس کا رنگ۔ اس کی ذات اور اس کا عقیدہ کچھ بھی ہو اول۔ دوم اور آخر اس مملکت کا شہری ہے۔ جس کے حقوق وفرائض بالکل مساوی ہیں تو تمہارے عروج و ترقی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔

مَیں اس معاملے پر انتہائی زور دینا چاہتا ہوں۔ ہمیں اس سپرٹ میں کام شروع کر دینا چاہیئے کچھ مدت میں اکثریت اور اقلیت اور ہندو قوم اور مسلم قوم کی یہ تمام بدنمائیاں غائب ہو جائیں گی کیونکہ آخر مسلمان ہونے کی حیثیت میں بھی تمہارے ہاں

پٹھان - پنجابی - شیعہ - سنی وغیرہ موجود ہیں اور ہندوؤں میں بھی برہمن - ویشنو - کھتری - اور پھر بنگالی - مدراسی وغیرہ ہیں - اگر مجھ سے پوچھو تو میں یہ کہوں گا کہ یہ چیز ہندوستان کی آزادی وخود مختاری کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم مدتوں پہلے آزاد ہو چکے ہوتے - دنیا کی کوئی طاقت کسی قوم کو خصوصاً چالیس کروڑ نفوس کی قوم کو اپنا محکوم نہیں رکھ سکتی - اگر یہ بات نہ ہوتی تو کوئی تم کو مفتوح نہ کر سکتا اور اگر کر بھی لیتا تو زیادہ مدت تک تم پر اپنا تسلط قائم نہ رکھ سکتا (چیرز) لہٰذا اس سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہئے - تم آزاد ہو اس مملکت پاکستان میں تم اپنے مندروں میں آزادانہ جا سکتے ہو - اور مساجد اور دوسری عبادت گاہوں میں بھی جانے میں آزاد ہو - تمہارا مذہب - تمہاری ذات تمہارا عقیدہ کچھ بھی ہو کاروبار مملکت کا اس سے کوئی تعلق نہیں (ہیئر ہیئر) تم جانتے ہو تاریخ شاہد ہے کہ کچھ مدت بیشتر انگلستان کے حالات آج کل کے ہندوستان کے حالات سے بدتر تھے - رومن کیتھلک اور پراسٹنٹ ایک دوسرے کو آزار پہنچانے میں مصروف تھے - آج بھی بعض ایسی مملکتیں موجود ہیں جن میں ایک خاص طبقے کے خلاف امتیازات اور قیود عائد کی جا رہی ہیں - خدا کا شکر ہے کہ ہم ایسے ایام میں اپنی مملکت کا آغاز نہیں کر رہے ہیں - ہمارا آغاز ایسے ایام میں ہو رہا ہے جب ایک قوم اور دوسری قوم - ایک ذات اور مسلک اور دوسری ذات اور مسلک کے درمیان کوئی تفریق و امتیاز نہیں رہا - ہم اس بنیادی اصول کی بنا پر آغاز کار کر رہے ہیں کہ ہم تمام شہری ہیں اور ایک مملکت کے مساوی شہری ہیں (پُر زور اظہار مسرت) انگلستان کے لوگوں کو بھی ایک زمانے میں صورت حالات کے حقائق کا سامنا کرنا پڑا تھا - اور ان ذمہ داریوں اور گرانباریوں سے بھگتنا پڑا تھا جو ان کی حکومت نے ان پر عائد کی تھیں اور وہ اس آگ میں سے قدم بقدم گزر چکے ہیں آج تم بجا طور سے کہہ سکتے ہو کہ رومن کیتھلک اور پراٹسٹنٹ کا کوئی وجود باقی نہیں - آج صرف یہ حقیقت موجود ہے کہ ہر شخص برطانیہ عظمیٰ کا شہری ہے ہر شہری کی حیثیت مساوی ہے اور تمام شہری ایک قوم کے افراد ہیں ؛

میرے نزدیک اب ہمیں اسی نصب العین کو پیش نظر رکھنا چاہئے پھر تم دیکھو گے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد نہ ہندو ہندو رہیں گے نہ مسلمان مسلمان رہیں گے - مذہبی معنوں میں نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی معنوں میں سب ایک مملکت کے شہری ہوں گے ؛

قائد اعظم پاکستان کے بانی تھے اور جس موقع پر انہوں نے یہ تقریر کی تھی وہ تاریخ پاکستان

کا پہلا سنگِ میل تھا۔ اس تقریر کے مخاطب اپنی مملکت کے مسلم و غیر مسلم باشندے بھی تھے اور اہلِ عالم بھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ جس نصب العین کے حصول کی خاطر نئی مملکت اپنی تمام طاقتوں کو وقف کرنے والی تھی اس کو حتی الامکان نہایت واضح طور پر متعین کر دیا جائے۔ اس تقریر میں بار بار ماضی کی تلخیوں کا ذکر کر کے یہ اپیل کی گئی ہے کہ ماضی کو بدل دو اور جنگ و پیکار کو دفن کر دو۔ قائدِ اعظم کے نزدیک اس مملکت کے آئندہ شہری کو بلا امتیاز رنگ و نسل اور بلا لحاظ مذہب و ملت برابر کے حقوق و رعایات حاصل ہوں گے اور اس پر برابر کے فرائض عائد ہوں گے۔ اس تقریر میں لفظ "قوم" کو بار بار دہرایا گیا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ مذہب کو کاروبارِ مملکت سے کوئی تعلق نہیں اور وہ صرف فرد کے ذاتی ایقان و ایمان کا معاملہ ہے۔

ہم نے علما سے سوال کیا کہ آیا مملکت کا یہ تصور ان کے نزدیک قابلِ قبول ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے بلا تامل اس کا جواب نفی میں دیا اور ان میں احراری اور وہ سابق کانگرسی بھی شامل تھے۔ جو تقسیم سے پہلے اس تصور کو قریب قریب جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔ اگر مولانا امین احسن اصلاحی کی شہادت جماعتِ اسلامی کے نقطۂ نگاہ کی صحیح مظہر ہے تو جو مملکت اس نصب العین پر مبنی ہو وہ "ابلیس کی مخلوق" ہے۔ ان کے اس خیال کی تصدیق جماعت کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بے شمار تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ علما میں سے کوئی بھی ایسی مملکت کو برداشت نہیں کر سکتا جس کی بنیاد قومیّت پرستی اور اس کے متعلقات پر ہو۔ ان کے نزدیک مملکت کی فعالیت کو متعین کرنے کی اہلیت صرف "ملّت" اور اس کے متعلقات میں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قائدِ اعظم نے ایک عصری قومی مملکت کا جو تصور پیش کیا تھا وہ ۱۲۔ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرار دادِ مقاصد منظور ہو جانے کے بعد متروک ہو گیا۔ لیکن یہ بھی کھلم کھلا تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ قرار داد اگرچہ الفاظ و فقرات کے اعتبار سے بہت بلند بانگ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں محض دھوکا ہے اور اس میں نہ صرف مملکتِ اسلامی کا ہیولیٰ تک شامل نہیں بلکہ اس کی دفعات خصوصاً جو بنیادی حقوق سے متعلق ہیں واضح طور پر مملکت اسلامی کے اصولوں کے منافی ہیں۔

مملکتِ اسلامی کی بنیادیں

اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ "مملکتِ اسلامی" کیا چیز ہے۔ جس کے متعلق باتیں تو سب کرتے ہیں اور سوچتا کوئی بھی نہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ ہمیں خود مملکت کے دائرہ و ظائف کا ایک واضح تصور قائم کرنا چاہیے۔

جب علما سے یہ کہا گیا کہ تاریخ اسلام میں سے کسی اسلامی مملکت کی نظیر پیش کریں تو ان کے خیالات و آرا میں باہم اختلاف تھا۔ مثلاً اگرچہ حافظ کفایت حسین (شیعہ عالم) نے صرف اس نظامِ حکومت کو اپنا نصب العین قرار دیا جو رسولِ پاک صلعم کے زمانے میں قائم تھا۔ لیکن مولانا داؤد غزنوی نے اپنے

پیش کردہ نظائر میں جمہوریہ اسلامی کا زمانہ عمر بن عبد العزیز کا عہد خلافت اور صلاح الدین ایوبی دمشقی۔ سلطان محمود غزنوی محمد تغلق۔ اورنگ زیب اور موجودہ حکومت عربیہ سعودیہ کی مثالیں بھی شامل کر دیں تاہم اکثر علما نے جمہوریہ اسلامی کے نظام حکومت کو پیش کیا جس کی مدت ۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک یعنی تیس سال سے بھی کم تھی اور بعض نے عمر بن عبد العزیز کے نہایت مختصر عہد کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ مولانا عبد الحامد بدایونی نے کہا کہ ایک مثالی مملکت کی تفصیلات علما خود تجویز کر دینگے۔ ماسٹر تاج الدین انصاری کے دماغ میں مملکت اسلامی کے متعلق جو ژولیدہ تصور تھا وہ ان کی شہادت کے مندرجہ ذیل حصے سے معلوم کیا جا سکتا ہے :۔

"سوال ۔ کیا آپ تحریک خلافت میں شامل تھے ؟

جواب ۔ جی ہاں ۔

سوال ۔ تحریک خلافت ہندوستان میں کب ختم ہوئی تھی ؟

جواب ۔ ۱۹۲۳ء میں جب ترکوں نے اپنے ملک کو سیکولر سٹیٹ (غیر مذہبی مملکت) قرار دیدیا

سوال ۔ اگر آپ سے یہ کہا جائے کہ جب ترکوں نے خلافت کو موقوف کر دیا۔ اس کے بعد بھی تحریک خلافت طویل مدت تک قائم رہی تو کیا یہ صحیح ہوگا ؟

جواب ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ترکوں کی طرف سے خلافت کے موقوف ہوتے ہی تحریک خلافت ختم ہو گئی تھی ۔

سوال ۔ آپ کے متعلق اطلاع یہ ہے کہ آپ ۱۹۲۸ء تک تحریک خلافت کے ممبر رہے اور تقریریں بھی کرتے رہے کیا یہ صحیح ہے ؟

جواب ۔ یہ صحیح نہیں ہو سکتا ۔

سوال ۔ کیا کانگرس کو خلافت سے دلچسپی تھی ؟

جواب ۔ جی ہاں ۔

سوال ۔ کیا خلافت آپ کے نزدیک دینی عقیدے پر مبنی تھی یا محض ایک سیاسی تحریک تھی ؟

جواب ۔ یہ ایک خالص دینی تحریک تھی ۔

سوال ۔ کیا مسٹر گاندھی تحریک خلافت کے حامی تھے ؟

جواب ۔ جی ہاں ۔

سوال ۔ تحریک خلافت کا مدعا کیا تھا ؟

جواب ۔ انگریز ترکی میں خلافت کے ادارے کو نقصان پہنچا رہا تھا اور مسلمان انگریز کے اس رویئے سے رنجیدہ تھے ۔

سوال ۔ کیا اس تحریک کا مدعا یہ نہ تھا کہ مسلمانوں میں خلافت کا احیا کیا جائے ؟

جواب ۔ جی نہیں ۔

سوال کیا خلافت آپ کے نزدیک مُسلم نظامِ حکومت کا ضروری جزو ہے ؟
جواب - جی ہاں -
سوال - لہٰذا کیا آپ پاکستان میں خلافت کے قیام کے حامی ہیں ؟
جواب - جی ہاں -
سوال - کیا مسلمانوں کے ایک سے زیادہ خلیفے بھی ہو سکتے ہیں ؟
جواب - جی نہیں -
سوال - کیا پاکستان کا خلیفہ تمام مسلمانانِ عالم کا خلیفہ ہو گا ؟
جواب - ہونا تو چاہیئے مگر ہو نہیں سکتا "

سیاسی فکر کا ارتقا گزشتہ تین ہزار سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے - اور اس فکر کو اس کے ابتدائی مرحلوں میں مذہب سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس دوران میں دو سوال ہمیشہ غور و فکر کا موضوع رہے ہیں :-

(۱) مملکت کے معینہ وظائف کیا ہیں ؟

(۲) مملکت کا حاکم کون ہو گا ؟

اگر مملکت کی سرگرمیوں کا دائرہ فرد کی مادّی یا روحانی یا دونوں قسم کی بہبود پر حاوی ہے تو پہلے سوال سے براہِ راست دوسرا بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیاتِ انسانی کا مقصد اور انسان کی انتہائی تقدیر کیا ہے - اس مسئلے پر مختلف اوقات میں نہیں بلکہ ایک ہی زمانے میں مختلف و متضاد خیالات مروّج رہے ہیں - استوائی جنوبی افریقہ کے باشندوں کا اب تک یہ عقیدہ ہے کہ ان کے دیوتا کو ماننے ان کو جنگل میں شکار کھیلنے اور ناچنے گانے کے لئے بھیجا ہے ایپیکورس کے پیرووں کا یہ قول بھی زیادہ تر یہی مفہوم رکھتا ہے کہ حیاتِ انسانی کا مقصد کھانا پینا اور خوش رہنا ہے - کیونکہ موت ان تمام خوشیوں سے محروم کر دیتی ہے - افادیت پرستوں نے اپنے ادارات کو اس مفروضے پر مبنی قرار دیا ہے کہ اس زندگی کے بعد جو کچھ بھی ہو اس کا خیال نہ کرو اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ ذہنی اور جسمانی لذتیں حاصل کی جائیں - رواقیین کا ایمان ہے کہ تمام جسمانی خواہشات کو روکنا اور کم کرنا چاہیئے اور دیو جانس کلبی نے زندگی بسر کرنے کے لئے ایک ٹب ہی کو کافی قرار دیا تھا - جرمن فلسفیوں کا خیال ہے کہ فرد محض مملکت کے لئے زندہ رہتا ہے لہٰذا مقصدِ حیات یہ ہے کہ مملکت جن مقاصد کے حصول کا فیصلہ کرے ان میں اس کی خدمت کی جائے - قدیم ہندو فلسفی گھونسے کی منطق اور اس کے طبعی نتائج یعنی قانون انتخابِ طبعی اور تنازع للبقا پر ایمان رکھتے تھے - مملکت کا سامی نظریہ خواہ وہ یہودی ہو - عیسائی ہو یا اسلامی - ہمیشہ اس امر کا مدعی رہا ہے کہ حیاتِ انسانی کا مقصد آیندہ زندگی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے - لہٰذا عبادتِ الٰہی اور اعمالِ حسنہ ہی زندگی کے

تنہا مقصد ہیں۔ فلاسفہ یونان جن کی ابتدا سقراط سے ہوتی ہے مقصد زندگی اس امر کو سمجھتے تھے کہ فلسفیانہ غور و فکر میں مصروف رہیں تاکہ ان عظیم صداقتوں کا انکشاف کر سکیں جو فطرت میں پوشیدہ ہیں اور دوسرے لوگوں کا کام یہ ہے کہ ان فلسفیوں کے خور و نوش کا انتظام کریں جو اس کام میں مصروف ہیں۔ اسلام اس عقیدے پر زور دیتا ہے کہ انسان کو جو زندگی بخشی گئی ہے وہ صرف اس دنیا کی زندگی نہیں بلکہ ابدی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب موجودہ زندگی ختم ہو جاتی ہے اور اگلے جہان میں انسان کا درجہ اور مرتبہ اس کے ان عقائد و اعمال پر منحصر ہے جن پر وہ اس دنیا میں عامل رہا ہے چونکہ موجودہ زندگی بجائے خود مقصود نہیں۔ بلکہ حصولِ مقصود کا محض ایک ذریعہ ہے۔ اسلئے نہ صرف فرد بلکہ مملکت کو بھی اُس سیکولر نظریے کے خلاف رہنا چاہیئے جو تمام سیاسی اور اقتصادی ادارات کو اس امر پر مبنی قرار دیتا ہے کہ آیندہ زندگی پر اس کے اثرات کی کچھ پروانہ کی جائے اور فرد اور مملکت کو ایسے انسانی کردار کے لئے کوشاں رہنا چاہئے جس سے آدمی کو آیندہ زندگی میں بہتر مقام حاصل ہو سکے۔ اس نظریے کے مطابق اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے لہٰذا یہ سوال فوراً پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ اور مومن یا مسلم کس کو کہتے ہیں ہم نے علما سے یہ سوال کیا اور انہوں نے اس کے جو جوابات دئے۔ ان کا ہم عنقریب تذکرہ کرینگے۔ لیکن ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ کہ ہمیں یہ دیکھ کر بے انتہا افسوس ہوا کہ علما جن کا پہلا فرض اس موضوع پر پختہ آرا کو قائم کرنا تھا مایوس کن حد تک باہم غیر متفق تھے۔ ان فاضل علما نے اپنے خیالات کس انداز سے ظاہر کئے۔ اس کو چھوڑ دیجئے اور ہماری بات سنیئے۔ ہمارے نزدیک اسلام ایک ایسا نظام ہے جو (ہر منظم مذہب کی مانند) مندرجہ ذیل پانچ موضوعات پر حاوی ہے :-

(۱) مسلّمات یعنی بنیادی عقائد

(۲) عبادات یعنی وہ مذہبی رسوم و عوائد جو انسان کو بجا لانے چاہئیں۔

(۳) اخلاقیات یعنی کردار اخلاقی کے ضوابط

(۴) ادارات۔ معاشرتی۔ اقتصادی اور سیاسی

(۵) خالص قانون یعنی شریعت

ان تمام موضوعات کے متعلق قواعد و ضوابط کی لازمی بنیاد الہام پر ہے نہ کہ عقل پر۔ گو یہ دونوں باہم مطابق بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ مطابقت اتفاقی ہوگی کیونکہ عقل انسانی ناقص ہو سکتی ہے۔ اور عقل کا حقیقی و قطعی تقاضا صرف اللہ کے علم میں ہے جو انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے اپنے برگزیدہ پیغمبروں کی وساطت سے عالم انسانی کو اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ اسلئے انسانوں کو چاہیئے کہ عقائد کو تسلیم کریں۔ عبادات کی پابندی اختیار کریں۔ تعلیمات اخلاقی پر عمل کریں۔ قانون کی اطاعت کریں اور اُن ادارات کو قائم کریں جو اللہ نے الہام فرمائے ہیں خواہ ان کی عقلی مصلحت ظاہر نہ ہو بلکہ خواہ وہ عقل انسانی کے خلاف ہی ہوں کیونکہ ذات باری تعالیٰ منزہ عن الخطا ہے۔ اسلئے الہام الٰہی

کے ذریعے سے جو کچھ بھی معلوم ہو۔ اس کو ایک قطعی صداقت کی حیثیت سے قبول کرتا ہوگا۔ خواہ اس کا موضوع روحانی اور ماورائے طبیعی ہو یا تاریخ۔ قانون اور عبادات سے تعلق رکھتا ہو یا کسی ایسے موضوع سے متعلق ہو جس کو فکرِ انسانی تحقیق علمی سے وابستہ سمجھتا ہو۔ مثلاً انسان کی پیدائش۔ ارتقاء علم کائنات یا علم ہیئت۔ عقل کا معیار قطعی معیار نہیں ہے اور اس حقیقت سے انکار گویا اللہ تعالیٰ کی عقلِ کُل اور اس کے عزائم کا انکار ہے اور یہ کفر ہے ÷

اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً اپنے برگزیدہ بندوں کی معرفت جن میں ہمارے رسول پاکؐ آخری تھے اپنا الہام بھیجا ہے یہ الہام قرآن مجید میں موجود ہے اور مندرجہ بالا پانچ موضوعات پر حاوی ہے۔ لہٰذا اسلام کو ماننے والے شخص کا صحیح کام یہ ہے کہ وہ اس الہام الٰہی کو سمجھے۔ اس پر ایمان لائے اور اس پر عمل کرے ÷

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے پیغامات بھیجنے کے لئے واسطہ بناتا ہے وہ رسول یا نبی کہلاتے ہیں۔ چونکہ نبی کا ہر قول و فعل اللہ کے اشارے کے ماتحت ہوتا ہے اور ہمارے رسول پاکؐ کا ہر قول و فعل یقیناً اللہ کی طرف سے تھا۔ لہٰذا وہ بھی رسمی الہام ہی کی مانند خطا سے پاک ہوتا ہے کیونکہ انبیا معصوم ہیں۔ اور ایسے قول یا فعل کی اہلیت ہی نہیں رکھتے جو منشائے الٰہی کے خلاف ہو یہ افعال و اقوال "سنت" کہلاتے ہیں اور سُنت قرآن ہی کی طرح غلطی اور خطا سے پاک ہے۔ اس سُنت کی تفصیل حدیث میں درج ہے۔ اور حدیث کی متعدد کتابیں ہیں جو مسلمان علماء نے کئی نسلوں تک طویل محنت شاقہ اور گہری تحقیق کے بعد مرتب کی ہیں۔

"حدیث" رسول پاک صلعم اور ان کے صحابہ کرام کے اقوال و افعال کے تذکرے سے مُراد ہے اولین دَور میں صحابہ یعنی وہ لوگ جنہوں نے رسول پاکؐ کی صحبت میں زندگی بسر کی علم سنّت کے بہترین اور مستند ماخذ تھے بعد کے لوگوں کو تابعین کے اقوال پر اکتفا کرنا پڑا۔ یہ لوگ رسول پاکؐ کے بعد پہلی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جنہوں نے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا۔ پھر اس کے بعد کی نسل کے بیانات پر حصر کرنا پڑا۔ جو "تبع تابعین" کہلاتے ہیں یہ لوگ رسول پاکؐ کے بعد دوسری نسل سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے تابعین سے کسب علم کیا تھا "مرفوع" وہ حدیث ہے جو رسول پاک کے متعلق کسی بیان پر مشتمل ہو "موقوف" اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں صرف صحابہ کے اقوال و افعال کا ذکر ہو۔ اور "مقطوع" وہ حدیث ہے جو رسول پاکؐ کے بعد کی پہلی نسل سے قبل پر حاوی نہ ہو۔ بلکہ صرف تابعین کے اقوال و افعال پر مشتمل ہو بعض احادیث میں خود اللہ تعالیٰ کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ ایسی حدیث کو حدیث قدسی یا حدیث الٰہی کہتے ہیں تاکہ عام "حدیث نبوی" سے ممیز ہو سکے ÷

جو احادیث رسول اللہ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان کا بہت بڑا حصہ "احکام" "فرائض دینی" "حلال و حرام" "پاکیزگی عبادات" "خوراک کے متعلق ضوابط اور دیوانی و فوجداری قوانین پر مشتمل ہے اس کے علاوہ ان میں عقائد۔ سزا و جزا۔ حشر و نشر۔ جہنم اور جنت۔ ملائکہ تخلیق عالم الہام اور

انبیائے سابق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بہت سی احادیث میں رسول پاک صلعم کے مفید و بابرکت اقوال اور اخلاقی تعلیمات مندرج ہیں۔

احادیث کی اہمیت آغاز ہی میں محسوس کر لی گئی تھی۔ اور نہ صرف ان کو ازبر یاد کیا جاتا تھا بلکہ وہ بعض حالات میں معرض تحریر میں بھی لائی گئی تھیں۔ تدوین حدیث کا کام تیسری صدی ہجری میں شروع ہوا۔ اور صحاح ستّہ اُسی صدی میں مرتب کی گئیں۔ جن کے مصنفین یہ حضرات تھے :-

(۱) البخاری (وفات سنہ ۲۵۶ ہجری مطابق سنہ ۸۷۰ء)
(۲) مُسلم (وفات سنہ ۲۶۱ ہجری مطابق سنہ ۸۷۵ء)
(۳) ابوداؤد (وفات سنہ ۲۷۵ ہجری مطابق سنہ ۸۸۸ء)
(۴) الترمذی (وفات سنہ ۲۷۹ ہجری مطابق سنہ ۸۹۲ء)
(۵) النسائی (وفات سنہ ۳۰۳ ہجری مطابق سنہ ۹۱۵ء)
(۶) ابن ماجہ (وفات سنہ ۲۷۳ ہجری مطابق سنہ ۸۸۶ء)

زمانۂ حاضر کے قوانین شہادت کے رو سے (جن میں ہمارا قانون شہادت بھی شامل ہے) احادیث سُنّت کی قابل قبول شہادت نہیں ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک متعدد راویوں کے سلسلے سے ہم تک پہنچی ہے۔ لیکن قانونی سند کے اعتبار سے قابل قبول ہیں۔ احادیث کے ان مجموعوں کی وقعت اس بات سے نہیں (جیسا کہ غلطی سے اکثر بیان کیا جاتا ہے) کہ ان کے مؤلفین نے سب سے پہلے رائج حدیثوں کے متعلق صحیح یا موضوع ہونے کا فیصلہ کیا بلکہ ان کی اصلی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ایسے تمام اقوال کو یکجا جمع کر دیا جو اُس زمانے کے سلفی حلقوں میں صحیح سمجھے جاتے تھے۔

شیعہ حدیث کو اپنے نقطۂ نگاہ سے پرکھتے ہیں اور صرف ایسی حدیثوں کو معتبر سمجھتے ہیں۔ جن کی روایت حضرت علی اور ان کے رفقا سے منسوب ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر ان کی اپنی کتابیں موجود ہیں۔ جن میں سے وہ مندرجہ ذیل پانچ کتابوں کو بالخصوص بہت معتبر خیال کرتے ہیں :-

(۱) الکافی از محمد بن یعقوب الکلینی (وفات سنہ ۳۲۸ ہجری مطابق سنہ ۹۳۹ء)
(۲) من لایستحضرہ الفقیہ از محمد بن علی بن بابویہ القمی (وفات سنہ ۳۸۱ ہجری مطابق سنہ ۹۹۱ء)
(۳) تہذیب الاحکام۔
(۴) الاستبصار فی مختلف فیہ الاخبار (کتاب سابق کا خلاصہ) از محمد الطوسی
(وفات سنہ ۴۵۹ ہجری مطابق سنہ ۱۰۶۷ء)
(۵) نہج البلاغہ (حضرت علی کے مبیّنہ اقوال) از علی بن طاہر الشریف المرتضیٰ
(وفات سنہ ۴۳۶ ہجری مطابق سنہ ۱۰۴۴ء) (یا از برادرش رضی الدین البغدادی)

جب دوسری اور تیسری صدیوں میں عبادات و رسوم۔ عقائد و مسلّمات اور اہم ترین سیاسی و اجتماعی ادارات نے قطعی شکل اختیار کر لی تو بہت سے راویان حدیث کے استناد اور ان

کی روایتوں کے اعتبار کے بارے میں ایک رائے عامہ پیدا ہوگئی۔ عقیدے کے اصول اساسی اس وقت تک مالک بن انس الشافعی اور دیگر علما کی تصانیف میں قائم ہو چکے تھے جو مختلف حلقوں میں مستند و معتبر سمجھے جاتے تھے بلکہ وہ زیادہ تر رسول پاک صلعم کی احادیث کی سند پر ہی مبنی تھے۔ جتنا وقت گزرتا گیا کسی نے ان احادیث کی صحت پر شبہ کرنے کی جرات نہ کی۔ اور آج تک صحاح ستہ کی احادیث کی صحت و صداقت کا تقریباً قطعی یقین برابر چلا آرہا ہے +

ہم اب تک اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی موضوع پر کوئی حکم بھی ہو اگر اس کا استخراج قرآن مجید اور سنّت رسول پاکؐ سے کیا گیا ہے تو وہ ہر مسلمان کے لئے واجب التعمیل ہے لیکن چونکہ سنّت کی شہادت صرف حدیث ہے۔ اسلئے سنت اور حدیث کے الفاظ ایک دوسرے سے اس قدر مخلوط ہو گئے ہیں کہ دونوں میں تمیز دشوار ہو گئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں مقصد "قرآن و سنت" ہو وہاں بھی عام طور پر "قرآن و حدیث" ہی کا جملہ استعمال کیا جاتا ہے +

اس مرحلے پر ایک اور اصول سامنے آجاتا ہے جو مساوی طور پر بنیادی ہے وہ اُصول یہ ہے کہ اسلام آخری الہامی مذہب ہے جو ہر اعتبار سے مکمل اور جامع ہے اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس دین کے کسی حصّے کی تنسیخ یا تخفیف یا اضافے کا امکان اتنا ہی بعید ہے۔ جتنا کسی نئے رسول کا مبعوث ہو جانا غیر ممکن ہے۔ دین مکمل کر دیا گیا ہے (اکملتُ لکم دینکم سورہ ۵ آیت ۳) اسلئے اب کسی ایسے نئے ضابطے کی ضرورت نہیں رہی جو اصلی ضابطے کی تنسیخ۔ ترمیم یا تردید کرے اور نہ کسی نئے پیغمبر یا پیغام کی حاجت باقی ہے۔ لہٰذا ان معنوں میں نبوت رسول پاک صلعم پر ختم ہو گئی اور الہام کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ یہ "ختم وحی نبوت" کا عقیدہ ہے +

اگر اس نظریے کو پوری طرح سمجھ لیا جائے کہ اسلام کے عقائد۔ اخلاق اور ادارات خطا سے پاک ہونے کے عقیدے پر مبنی ہیں خواہ وہ بے خطائی قرآن میں ہو سنت میں۔ اجماع میں یا اجتہاد مطلق میں مضمر ہو تو اس سے جو نتائج بھی مستنبط ہونگے وہ آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے چونکہ ہر معاملے میں خواہ وہ عبادات سے متعلق ہو یا اس کی نوعیت سیاسی یا اجتماعی یا اقتصادی ہو آخری معیارِ صداقت الہام الٰہی ہے۔ اور الہام قرآن مجید ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور سنت بھی الہام ہی کی مانند بے خطا ہے اور سنت کی صحت کی تنہا شہادت حدیث ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت قائم کرنے کے خواہشمندوں کا پہلا فرض یہ معلوم کرنا ہے کہ جس حکم کا حالات حاضرہ پر اطلاق ہوتا ہے وہ آیا قرآن یا حدیث میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے موزوں ترین اشخاص وہی ہیں جنھوں نے زندگی بھر قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہے۔ یعنی سُنیوں کے علما اور شیعوں کے مجتہد جو امام غائب (جو امر الٰہی کے ماتحت حاکم ہے) کے نائب ہیں۔ ان علمائے دین کا وظیفہ یہ ہوگا کہ ایسے احکام کا سراغ لگانے میں مصروف رہیں جن کا اطلاق مخصوص صورتوں پر ہو سکے۔ ان کی یہ مصروفیت اسی قسم کی ہوگی جس میں فلاسفہ یونان مشغول رہا کرتے تھے اور دونوں میں فرق صرف یہ ہوگا کہ

فلاسفہ یونان کے نزدیک تو تمام صداقتیں فطرت میں مضمر تھیں جو انفرادی کوشش سے بے نقاب کی جا سکتی تھیں۔ لیکن علما و مجتہدین اس حق کا سراغ لگائیں گے جو کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ میں موجود ہے۔ مجلس اصول اساسی میں علما کے بورڈ کی جو سفارش کی گئی تھی وہ گویا اس اصول کا منطقی اعتراف تھا اور اس بورڈ کے خلاف صحیح اعتراض حقیقت میں یہی ہونا چاہیئے تھا کہ جس اصول نے اس بورڈ کو جنم دیا تھا۔ اس کے عمل درآمد کے لئے وہ بورڈ نہایت ناکافی اور کمزور آلہ تھا +

اجماع کے معنی ہیں مجتہدین ملت کا اتفاق رائے۔ مجتہدین وہ لوگ ہیں جو رسول پاک صلعم کے وصال کے بعد اپنے علم کی بنا پر خود حکم لگانے اور فیصلے کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اجماع کے اختیار کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اللہ تعالےٰ امکانِ خطا سے حفاظت کرے گا کیونکہ ابن ماجہ میں رسول اللہ صلعم کی ایک حدیث درج ہے کہ "میری اُمت گمراہی پر کبھی متفق نہ ہوگی"۔ اجماع سے متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق احکام معیّن کر دیئے جاتے تھے اور جب وہ ایک دفعہ معین ہو جاتے تھے تو دین کا جزو لاینفک بن جاتے تھے اور ان سے انکار کرنا "کفر" قرار دیا جاتا تھا۔ اجماع کے متعلق یہ نکتہ یاد رکھنا لازمی ہے کہ اس سے مجتہدین کے اتفاق رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ عوام کے اتفاق کا معاملہ بالکل خارج از بحث ہے۔ اس طریق سے اجماع نے نہ صرف غیر منفصل معاملات کے متعلق احکام معین کر دیئے ہیں بلکہ بعض اہم ترین عقائد تک کو تبدیل کر دیا ہے +

اجماع اور اجتہاد میں یہ فرق ہے کہ اجماع اجتماعی اور اجتہاد انفرادی ہوتا ہے۔ اجتہاد کے معنی ہیں کسی مقدمے یا قانون کے کسی حکم کے متعلق رائے قائم کرنے میں انتہائی محنت کرنا۔ اجتہاد قرآن اور سنت پر قیاس کے اطلاق سے کیا جاتا ہے۔ اجتہاد پہلے پہل خطا سے پاک نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کے نتائج ہمیشہ ظنی خیال کئے جاتے تھے یہ صرف اُس حالت میں خطا سے پاک سمجھا جاتا تھا۔ جب مختلف افراد کا اجتہاد مل کر اجماع بن جاتا تھا۔ لیکن یہ وسیع اجتہاد بہت جلد ایسے لوگوں کے خاص اجتہاد کی شکل اختیار کر گیا جو رائے قائم کرنے کا خاص حق رکھتے تھے جب بعد کے علما نے چار شرعی مذاہب کی تاسیس کا مطالعہ کیا تو ان مذاہب کے بانیوں کو "اجتہاد مطلق" کا درجہ دے دیا۔ لیکن وقتاً فوقتاً ایسے افراد ظہور میں آتے رہے۔ جنہوں نے اجتہاد کے اولین مفہوم کو اختیار کیا اور دعویٰ کیا کہ وہ بھی اصولِ اوّلیہ کے ماتحت اپنی رائے قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک ابن تیمیہ حنبلی تھے (وفات ۷۲۸ھ) دوسرے سیوطی تھے (وفات ۹۱۱ھ) جنہوں نے اجتہاد کے دعوے کے علاوہ اپنی صدی کے مجدّد ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جس طرح ہر صدی میں ایک مجدد آنا چاہیئے اسی طرح ہر زمانے میں کم سے کم ایک مجتہد ضرور ہونا چاہیئے۔ شیعوں کے اسلام میں آج بھی مجتہدین مطلق موجود ہیں جو امام غائب کے نائب سمجھے جاتے ہیں۔ پس اجتماعی اجتہاد سے اجماع پیدا ہوتا ہے اور اجماع کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خطا سے محفوظ رکھتا ہے۔ یعنی اجماع کا فیصلہ خطا سے پاک ہوتا ہے +

مملکت اسلامی کے لوازم

چونکہ اسلامی شریعت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ الہام الٰہی اور رسول پاک کے اقوال وافعال خطا سے پاک ہیں۔ لہٰذا قرآن اور سنت کے احکام وقوانین انسان کے وضع کردہ قوانین سے بالاتر ہیں۔ اور ان دونوں کے تصادم کی صورت میں آخر الذکر کو (بلالحاظ اپنی نوعیت کے) اول الذکر کے آگے سر جھکا دینا چاہیئے۔ اس طرح اگر کسی مسئلے کے متعلق قرآن یا سنت میں کوئی ایسا حکم موجود ہو جو ہمارے تصور کے مطابق قانون دستوری یا قانون بین الاقوامی کے دائرے میں آتا ہو تو اس صورت میں اس حکم کو نافذ کرنا چاہیئے۔ سوائے اس حالت کے کہ خود وہ حکم انحراف کی اجازت دیتا ہو۔ یعنی شریعتِ اسلامی میں قانون دستوری اور دوسرے قانون کے درمیان کوئی فرق وامتیاز نہیں بلکہ جتنے قوانین قرآن اور سنت میں پائے جاتے ہیں۔ وہ مملکت کی مسلمان رعایا کے لئے قانون ملکی ہی کا ایک حصہ ہیں۔ اسی طرح اگر قرآن یا سنت میں کوئی ایسا حکم ہو۔ جو دوسری مملکتوں کے ساتھ مملکت کے تعلقات یا مملکت کی مسلمان رعایا اور دوسری مملکتوں یا ان مملکتوں کی رعایا کے درمیان روابط سے تعلق رکھتا ہو تو اس حکم کا نفاذ بھی اتنا ہی لازمی ہوگا۔ جتنا قرآن یا سنت کے دوسرے احکام کا نفاذ ضروری ہے۔ لہٰذا اگر پاکستان اسلامی مملکت ہے یا اس کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنانے کا ارادہ ہے تو اس کے دستور میں ذیل کی پانچ دفعات ضرور ہونی چاہئیں :۔

(۱) تمام قوانین جو قرآن وسنت میں موجود ہیں۔ مسلمانوں کے لئے قانون ملکی کا ایک حصہ متصور ہونگے اور اسی حیثیت سے نافذ کئے جائیں گے ؛

(۲) دستور کی کوئی دفعہ جو قرآن یا سنت کے منافی ہوگی وہ اپنے منافی ہونے کی حد تک کالعدم سمجھی جائے گی۔ سوائے اس حالت کے کہ دستور خود اجماع امت کے ماتحت وضع کیا گیا ہو یعنی مُسلّمہ مرتبے کے علما اور مجتہدین کے اتفاق رائے سے تیار ہوا ہو ؛

(۳) سوائے اس حالت کے کہ پاکستان کے موجودہ قوانین کو مذکورہ بالا قسم کے اجماع امت کی منظوری حاصل ہو جائے۔ موجودہ قانون کی کوئی دفعہ جو قرآن یا سنت کے منافی ہوگی وہ اپنے منافی ہونے کی حد تک کالعدم سمجھی جائے گی ؛

(۴) کسی آئندہ قانون کی کوئی دفعہ جو قرآن وسنت کے منافی ہوگی کالعدم سمجھی جائے گی ؛

(۵) بین الاقوامی قانون کا کوئی قاعدہ اور کسی ایسے میثاق یا معاہدے کی کوئی دفعہ (جس کے فریقوں میں پاکستان بھی شامل ہوگا) اگر قرآن یا سنت کے خلاف ہوگی تو پاکستان کے کسی مسلمان پر اس کی پابندی واجب نہ ہوگی :

مملکت اسلامی میں حاکمیت اور جمہوریت

علما نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ اگر پاکستان میں اصولِ اسلامی کے مطابق حکومت قائم کی گئی تو اس کی شکل جمہوری نہیں ہوگی ہم ابھی قرآن وسنت کی حاکمیت کے عقیدے کی وضاحت کر چکے ہیں قرارداد مقاصد میں جب یہ اظہار کر دیا گیا کہ تمام حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے تو گویا اس موقف کو صحیح طور سے تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن جب اس قرارداد کے واضعین نے یہ بیان کیا کہ ایک آزاد وخودمختار مملکت کے لئے دستور تیار کیا جائے گا جس میں اسلام کے سکھائے ہوئے اصولِ جمہوریت پوری طرح مدنظر رکھے جائیں گے تو انہوں نے خودمختار اور جمہوریت دونوں لفظوں کا غلط استعمال کیا۔ ہو سکتا ہے کہ جس سیاق وسباق میں انہوں نے یہ لفظ استعمال کئے۔ اس میں اُن لوگوں نے اس کا مطلب غلط نہ سمجھا ہو جو اسلامی اصولوں کے ماہر ہیں۔ لیکن یہ دونوں لفظ مغربی فلسفۂ سیاست سے مستعار لئے گئے تھے اور ان معنوں میں دونوں کا استعمال اس قرارداد میں غلط طور سے کیا گیا تھا جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں ملک آزاد وخودمختار ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے باشندے یا اس کا کوئی دوسرا گروہِ افراد حق رکھتا ہے کہ اپنے ملک کے نظم امور کو جس طریقے سے چاہے چلائے۔ اور اس میں ضرورت اور پالیسی کے سوا دوسرے مصالح بالکل حائل نہ ہوں لیکن ایک اسلامی مملکت اس مفہوم میں آزاد وخودمختار نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کو قرآن یا سنت کے کسی قانون کو منسوخ یا ترمیم یا ترک کرنے کا اختیار نہیں ہوگا کسی مملکت کے اختیار قانون سازی کو قطعاً محدود کر دینا اس مملکت کے لوگوں کی آزادی وخودمختاری کو محدود کرتا ہے۔ اور اگر اس تحدید کا ماخذ ارادۂ عوام کے سوا کوئی اور ہو تو جس حد تک یہ تحدید عائد کی جائے گی اسی حد تک اس مملکت اور اس کے باشندوں کی حاکمیت لازماً کم ہو جائے گی۔ اسلامی مملکت میں حاکمیت اپنے قانونی مفہوم کے اعتبار سے صرف اللہ ہی کی ذات کو حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح جمہوریت کا مطلب "جمہور کی حکومت" ہے خواہ یہ حکومت براہِ راست ان کے ہاتھ میں ہو جیسے یونان و روما میں تھی یا وہ اپنے منتخب نمائندوں کی وساطت سے حکومت کریں جیسے زمانۂ حاضر کی جمہوریتوں میں رواج ہے۔ اگر دستور کے وضع کرنے۔ قوانین کے بنانے اور انتظامی کارروائی کے دائرے میں جمہور کا اختیار بعض ناقابل تبدیل احکام وقواعد کے ماتحت ہو تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جو قانون چاہیں منظور کر سکتے ہیں یا انتظامی وظائف کی بجا آوری میں اپنے منشا کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی اسلامی مملکت میں متفقہ ایک قسم کا اجماع بھی ہو تو عوام اس میں حصہ لینے سے قطعی طور پر محروم ہونگے کیونکہ فقہ اسلامی میں اجماع اُمت صرف مسلّمہ حیثیت کے علما و مجتہدین تک محدود ہے اور جمہوریت کی طرح یہ حق عوام تک ہرگز نہیں پہنچتا ٭

علما کے نزدیک اسلامی مملکت کے دیگر خصائص

سابقہ صفحات میں ہم نے اپنی طاقت بھر ان اصولوں کی تصریح کی کوشش کی ہے جن پر ایک مذہبی مملکت تعمیر کی جاسکتی ہے اور اس کو اسلامی مملکت کہا جاسکتا ہے۔ اب ہم ایسی مملکت کے بعض خصائص بیان کریں گے اور اس کے متعلق علما کے تصور کا خاص طور پر تذکرہ کریں گے؛

مجلس قانون ساز اور قانون سازی

نظام اسلامی میں قانون سازی کا موجودہ مفہوم بالکل ناپید ہے۔ دین وسیاست کا وہ مجموعی نظام جو "دین اسلام" کہلاتا ہے۔ ایک مکمل نظام ہے اور اس میں ایسا انتظام موجود ہے کہ جو صورتِ حالات بھی پیدا ہو اس کے متعلق قانون کا انکشاف واطلاق کر دیا جائے۔ جمہوریہ اسلام کے دوران میں زمانہ حاضر کے انداز کی کوئی مقننہ موجود نہ تھی اور جو صورت حالات یا فوری ضرورت پیش آجاتی تھی۔ اس کے مطابق علما قانون کا انکشاف اور اطلاق کر سکتے تھے۔ قانون بن چکا تھا اور اس کے بنانے کی حاجت نہ تھی۔ اور قانون کا نفاذ جن لوگوں کے سپرد تھا ان کا کام صرف یہ تھا کہ کسی خاص مقدمے کی اغراض کے لئے قانون کا انکشاف کریں۔ البتہ جب ایک دفعہ اس قانون کا آغاز اور اطلاق ہو جاتا تو وہ دوسروں کے لئے پیروی کی ایک نظیر بن جاتا۔ بعض حلقوں کا یہ قول بالکل غلط ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں جو مختلف قوموں پر مشتمل ہے جس میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ اور جس میں غیر مسلموں کو نمائندگی بھی دی گئی ہے اور یہ حق بھی عطا کر دیا گیا ہے کہ جو مسئلہ پیش ہو اس پر ووٹ دے سکیں۔ مقننہ ہی اجماع یا اجتہاد کی ایک شکل ہے۔ حالانکہ اجتہاد اجتماعی نہیں بلکہ صرف انفرادی ہوتا ہے اور گو اجماع اجتماعی ہوتا ہے۔ لیکن اس میں ان لوگوں کا کوئی مقام نہیں جو علمِ قانون کے ماہر نہیں ہیں اس اصول کے ماتحت کفار خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے بالکل خارج از بحث ہو جاتے ہیں؛

چونکہ اسلام ایک مکمل مذہب ہے۔ اس میں واضح قوانین بھی ہیں۔ اور اجماع یا اجتہاد سے مستنبط بھی کئے جاسکتے ہیں۔ اور وہ انسانی فعالیت کے پورے دائرے پر حاوی ہیں۔ لہذا اس میں اس چیز کا کوئی جواز نہیں جس کو زمانہ حاضر کے مفہوم میں قانون سازی کہتے ہیں۔ اس نکتے پر جب مولانا ابوالحسنات صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے مندرجہ ذیل جوابات دیئے:—

سوال۔ کیا قانون کی تعبیر جن افراد یا جماعات کے سپرد کی جاتی ہے۔ ان سے علیحدہ وضع قوانین کا ادارہ بھی اسلامی مملکت کا ایک لازمی جزو ہے؟

جواب۔ جی نہیں۔ ہمارا قانون مکمل ہے۔ اور اس میں صرف ایسے اشخاص کی تعبیر اور توجیہ کی ضرورت ہے جو اس کے ماہر ہیں۔ میرے عقیدے کے مطابق کوئی ایسا مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کے متعلق قرآن یا حدیث سے قانون کا استنباط نہ ہو سکے۔

سوال ۔ صاحب الحل والعقد کن لوگوں کو کہتے ہیں؟

جواب ۔ وہ اپنے وقت کے ممتاز علما تھے۔ ان لوگوں کو اپنے علم شریعت کی وجہ سے یہ رتبہ حاصل ہوا تھا۔ یہ لوگ کسی اعتبار سے زمانہ حاضر کی جمہوریت کے مشابہ یا مترادف نہ تھے۔"

یہی خیال امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی ایک تقریر میں ظاہر کیا تھا جو "آزاد" مورخہ ۲۲۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں درج ہوئی تھی۔ اس تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا کہ ہمارا دین کامل و مکمل ہے اور مزید قوانین وضع کرنا کفر کے برابر ہے، لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی رائے یہ ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں اُن معاملات کے متعلق صحیح معنوں میں قانون سازی ممکن ہے جن کے متعلق قرآن، سنت اور سابقہ اجماع میں کوئی ہدایت نہ مل سکے۔ اور مولانا نے اپنے اس نکتے کی وضاحت کے لئے اُس مجلسِ افراد کا ذکر کیا ہے جس سے رسول پاکؐ اور ان کے بعد خلفا امورِ مملکت کے متعلق تمام معاملات پر مشورہ کیا کرتے تھے یہ مسئلہ کسی قدر مشکل ہے اور اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ قانون سازی کے ادارے کو اس دعوے کے مطابق بنانا ہوگا جو مولانا ابوالحسنات اور بعض دوسرے علمائے دین نے کیا ہے کہ اسلام ایک مکمل اور جامع ضابطہ ہے اور اس قدر وسیع ہے کہ ہر قسم کی انسانی فعالیت کے متعلق پیدا ہونے والے مسائل کا حل مہیا کر سکتا ہے۔ اور کسی ایسے خلا کا قائل نہیں جس کو تازہ قانون سازی سے پُر کرنے کی ضرورت ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام مشورے کا حکم دیتا ہے اور نہ صرف رسول پاک صلعم بلکہ پہلے خلفائے اربعہ اور ان کے جانشین بھی اپنے وقت کے ممتاز اشخاص سے مشورہ کیا کرتے تھے جن پر ان کے علم شریعت اور ان کے تقویٰ کی وجہ سے پورا اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ اس تحقیقات کے دوران میں مجلس شورے کے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہیں ہو سکا، سوائے اس کے جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اس تحریری بیان میں موجود ہے جو مولانا نے اس عدالت کی درخواست پر دیا گیا تھا یہ صحیح ہے کہ ایک مجلس افراد موجود تھی جس سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ امر کسی قدر مشتبہ ہے کہ آیا وہ ایک مستقل مجلس تھی۔ اور آیا ان لوگوں کا مشورہ کوئی قانونی حیثیت یا تنفیذی قوت رکھتا تھا۔ اگرچہ ان اشخاص کی نمایندہ نوعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان کا انتخاب یقیناً زمانہ حاضر کے طریقوں کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ ان سے عارضی طور پر مشورہ ضرور کیا جاتا تھا لیکن یہ قطعاً صحیح نہیں کہ وہ موجودہ مجالس قانون ساز کی طرح قوانین وضع کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ ان کے کئے ہوئے فیصلے یقیناً نظائر کا کام دیتے تھے، اور ان کی نوعیت اجماع کی تھی جو قانون سازی نہیں۔ بلکہ کسی خاص مقدمے پر کسی موجودہ قانون کے اطلاق کا نام ہے۔ جب امورِ مملکت میں ان سے مشورہ کیا جاتا تھا تو ان کے وظائف یقیناً اس صلاح کی نوعیت رکھتے تھے جو زمانہ حاضر کی کابینہ دیتی ہے لیکن اس قسم کی صلاح قانون نہیں ہوتی بلکہ اس کو صرف فیصلہ کہا جا سکتا ہے۔

زمانہ حاضر کی قانون سازی کو اجماع سے مشابہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ جیسا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، مجلس قانون ساز قانون وضع کرتی ہے، لیکن مجلس شوریٰ کے علما کا کام یہ تھا

کہ کسی خاص نکتے پر جس کا ذکر قرآن و سنت میں نہ پایا جاتا ہو، فیصلے کا تعین کریں۔ لہٰذا وہ صرف قانون کا انکشاف و اطلاق کرتے تھے۔ قانون کو وضع نہ کر سکتے تھے۔ البتہ جو فیصلہ وہ کر دیتے تھے نہ صرف اس خاص مقدمے پر بلکہ بعد کے موقعوں پر بھی واجب العمل نظیر بن جاتا تھا۔ اگر قانونِ دستور میں یہ دفعہ شامل ہو کہ اگر اس قانون کی کوئی دفعہ قرآن و سنت کے مخالف ہوگی تو کالعدم سمجھی جائے گی اور عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں مقننہ کے کسی بنائے ہوئے قانون کے خلاف اس بنا پر اعتراض اٹھایا جائے کہ خود مجلس قانون ساز ہی قرآن و سنت کے خلاف ہے تو تصور کیجئے کہ کس قدر عجیب اور پیچیدہ صورتِ حالات پیدا ہو جائے گی ۔

غیر مسلموں کا موقف

جس وجہ کی بنا پر چودھری ظفراللہ خان اور مملکت کی کلیدی اسامیوں کے احمدی عہدہ داروں کی برطرفی کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ احمدی غیر مسلم ہیں۔ اسلئے ایک اسلامی مملکت کے ذمیوں کی طرح وہ مملکت کے بڑے عہدوں پر تقرر کا حق نہیں رکھتے۔ مطالبات کے اس پہلو سے براہِ راست یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اسلامی دستور نافذ کرینگے تو پاکستان میں غیر مسلموں کا موقف کیا ہوگا۔ ممتاز علما کی رائے یہ ہے کہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت ذمیوں کی سی ہوگی۔ اور وہ پاکستان کے پورے شہری نہ ہوں گے۔ کیونکہ ان کو مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ وضع قوانین میں ان کی کوئی آواز نہ ہوگی قانون کے نفاذ میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا اور انہیں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اس موقف کا پورا اظہار مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری۔ مولانا احمد علی۔ میاں طفیل محمد اور مولانا عبدالحامد بدایونی کی شہادتوں میں کیا گیا ہے۔ جب اس موضوع پر مولانا ابوالحسنات سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا :۔

"سوال۔ اگر ہم پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کرینگے تو کفار (غیر مسلم) کا موقف کیا ہوگا۔ کیا انہیں وضع قوانین میں کوئی آواز حاصل ہوگی۔ انہیں قانون کی تنفیذ کا موقع دیا جائے گا۔ اور انہیں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کا حق ہوگا؟

جواب۔ ان کا موقف ذمیوں کا سا ہوگا۔ ان کی وضع قوانین میں کوئی آواز نہ ہوگی۔ قانون کی تنفیذ میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اور سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کا کوئی حق نہ ہوگا۔

سوال۔ کیا ایک اسلامی مملکت میں رئیس مملکت اپنے اختیارات کا کوئی جزو کفار کو تفویض کر سکتا ہے؟

جواب۔ جی نہیں"

مولانا احمد علی نے استفسار کا یہ جواب دیا :۔

"سوال۔ اگر ہم پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کرینگے تو کفار کا موقف کیا ہوگا۔ کیا انہیں وضع قوانین میں کوئی آواز حاصل ہوگی۔ انہیں قانون کی تنفیذ کا موقع دیا جائے گا۔ اور نہ انہیں سرکاری عہدوں

پر فائز ہوتے کا حق ہو گا؟

جواب۔ ان کا موقف ذمیوں کا سا ہو گا۔ وضع قوانین میں ان کی کوئی آواز نہ ہو گی۔ نہ تنفیذِ قانون کا حق ہو گا۔ البتہ حکومت ان کو کسی سرکاری عہدے پر فائز ہوتے کی اجازت دے سکتی ہے۔"

میاں طفیل احمد نے حسب ذیل بیان دیا :۔

"سوال۔ اقلیتوں کے حقوق کے متعلق جو مضمون 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' مورخہ ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کو پڑھ کر بتائیے کہ آیا اس میں اسلامی مملکت کے متعلق آپ کے خیالات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ (اس مضمون میں بیان کیا گیا تھا کہ اقلیتوں کے حقوق مسلمانوں کے برابر ہوں گے)۔

جواب۔ مَیں نے یہ مضمون پڑھ لیا ہے۔ اگر پاکستان میں جماعت کے نظریے پر مبنی مملکت قائم کی جائے تو مَیں پاکستان میں عیسائیوں یا دوسرے غیر مسلموں کے ان حقوق کو تسلیم نہیں کروں گا۔"

اس نکتے پر مولانا عبدالحامد بدایونی کی ذہنی ژولیدگی مندرجہ ذیل بیان سے ظاہر ہو گی :۔

"سوال۔ کیا آپ نے کبھی مذکورہ بالا تقریر کو پڑھا ہے؟ (قائد اعظم کی وہ تقریر جو انہوں نے ۱۱۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں کی تھی)۔

جواب۔ جی ہاں مَیں نے وہ تقریر پڑھی ہے۔

سوال۔ کیا آپ اب تک پاکستان کے اس تصور سے اتفاق کرتے ہیں جو قائد اعظم نے دستور ساز اسمبلی کی تقریر میں پیش کیا تھا اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آج کے بعد صرف ایک پاکستانی قوم ہو گی جس میں مسلم اور غیر مسلم شامل ہوں گے۔ اُن سب کو مساوی شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ نسل، مذہب اور مسلک کا کوئی امتیاز نہ ہو گا۔ اور مذہب محض فرد کا نجی معاملہ سمجھا جائے گا؟

جواب۔ مَیں اس اصول کو تسلیم کرتا ہوں کہ تمام قوموں کو خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، مملکت کے نظم ونسق اور قانون سازی میں ان کی آبادی کے مطابق نمائندگی حاصل ہونی چاہئیے۔ سوائے اس کے کہ غیر مسلم شعبہ فوج اور محکمہ عدالت میں نہ لئے جاسکیں گے۔ نہ وزیر مقرر کئے جاسکیں گے اور نہ کسی اعتماد کے عہدے پر فائز ہو سکیں گے۔

سوال۔ کیا آپ کا مقصد اس سے یہ ہے کہ غیر مسلموں کا موقف ذمیوں کا سا ہو گا یا اس سے بہتر ہو گا؟

جواب۔ جی نہیں۔ ذمیوں سے مراد ان ملکوں کی غیر مسلم آبادی سے ہے۔ جن کو کسی اسلامی مملکت نے فتح کیا ہو۔ اس لفظ کا اطلاق اُن غیر مسلم اقلیتوں پر نہیں ہو سکتا جو کسی اسلامی مملکت میں پہلے سے آباد ہوں ایسی اقلیتیں مُعاہد کہلاتی ہیں (یعنی وہ لوگ جن سے کوئی معاہدہ کیا گیا ہو)۔

سوال۔ اگر ان سے کوئی معاہدہ نہ ہو تو پھر ان کی حیثیت کیا ہو گی؟

جواب ایسی حالت میں ان قوموں کو شہریت کے کوئی حقوق حاصل نہ ہوں گے :

سوال ۔ کیا پاکستان میں رہنے والی غیر مسلم اقلیتیں آپ کے نزدیک مُعاہد کہلا سکتی ہیں ؟

جواب ۔ جی نہیں ۔ تاوقتیکہ ان سے کوئی معاہدہ نہ ہو ۔ میرے علم میں ایسی قوموں کے ساتھ پاکستان میں اب تک کوئی معاہدہ نہیں ہوا :

پس اس عالمِ دین کی شہادت کے رُو سے پاکستان کے غیر مُسلم نہ تو شہری ہوں گے نہ انہیں ذمیوں یا معاہدوں کی حیثیت حاصل ہوگی :

جمہوریہ اسلامی کے دوران میں رئیس مملکت یعنی خلیفہ ایک ایسے نظام انتخاب کے ماتحت منتخب کیا جاتا تھا جو زمانۂ حاضر کے انتخاب سے قطعاً مختلف تھا ۔ اور اس کی بنیاد نہ بالغوں کے حق رائے دہی پر اور نہ عمومی نمائندگی کی کسی اور ہیئت پر تھی ۔ اس کی جو بیعت کی جاتی تھی ۔ جسے حلفِ اطاعت کہنا چاہئے ۔ اسے ایک مقدس معاہدہ کی حیثیت حاصل تھی اور جب وہ اجماع الامت یعنی لوگوں کے اتفاق آرا سے منتخب ہو جاتا تھا تو جائز حکومت کے تمام شعبوں کا سرچشمہ بن جاتا تھا ۔ اس کے بعد اس کو اور صرف اس کو حکومت کرنے کا حق ہوتا تھا وہ اپنے بعض اختیارات اپنے نائبوں کو تفویض کر سکتا تھا ۔ اور اپنے گرد ایسے اشخاص کے ایک گروہ کو جمع کر لیتا تھا جو علم و تقویٰ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے ۔ اس گروہ کو مجلس شوریٰ یا اہل الحلّ والعقد کہتے تھے ۔ اس نظام کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ کُفّار اُن وجوہ کے ماتحت جو واضح تھے اور جن کے بیان کی حاجت نہیں ۔ اس مجلس میں دخل حاصل نہیں کر سکتے تھے ۔ اور خلیفہ اپنے اختیارات کفار کو بالکل تفویض نہ کر سکتا تھا ۔ خلیفہ حقیقی رئیس مملکت اور تمام اختیارات کا حامل ہوتا تھا ۔ اور زمانۂ حاضر کی کسی جمہوری مملکت کے صدر کی طرح ایک بے اختیار فرد نہ تھا ۔ جس کا فرض صرف اتنا ہوتا ہے کہ اپنے وزیر اعظم اور کابینہ کے فیصلوں پر دستخط کر دے وہ غیر مسلموں کو اہم عہدوں پر مقرر نہ کر سکتا تھا نہ قانون کی تعبیر یا تنفیذ میں ان کو کوئی جگہ دے سکتا تھا اور وضع قوانین کا کام ان کے سپرد کرنا تو قانونی اعتبار سے بالکل ہی ناممکن تھا :

جب صورت حال یہ ہے تو مملکت کو لازماً کوئی ایسا انتظام کرنا ہوگا کہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق متعیّن ہو سکے ۔ اور اس کے نتائج پر عمل درآمد کیا جا سکے ۔ لہٰذا یہ مسئلہ بنیادی طور پر اہم ہے کہ فلاں شخص مسلم ہے یا غیر مسلم اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اکثر ممتاز علما سے یہ سوال کیا ہے کہ وہ "مسلم" کی تعریف کریں ۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اگر مختلف فرقوں کے عُلما احمدیوں کو کافر سمجھتے ہیں تو ان کے ذہن میں نہ صرف اس فیصلے کی وجوہ بالکل روشن ہونگی بلکہ وہ "مسلم" کی تعریف بھی قطعی طور پر کر سکیں گے کیونکہ اگر کوئی شخص یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ فلاں شخص یا جماعت دائرہ اسلام سے خارج ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ دعوےٰ کرنے والے کے ذہن میں اس امر کا واضح تصور موجود ہو کہ "مسلم" کس کو کہتے ہیں ۔ تحقیقات کے اس حصّے کا نتیجہ بالکل اطمینان بخش نہیں نکلا ۔ اور اگر ایسے سادہ معاملے کے متعلق بھی ہمارے علماء کے دماغوں میں اس قدر ژولیدگی موجود ہے تو آسانی سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ زیادہ پیچیدہ معاملات

کے متعلق ان کے اختلافات کا کیا حال ہوگا۔ ذیل میں ہم "مسلم" کی تعریف ہر عالم کے اپنے الفاظ میں درج کرتے ہیں۔ اس تعریف کا مطالبہ کرنے سے پہلے ہر گواہ کو واضح طور پر سمجھا دیا گیا تھا۔ کہ آپ وہ قلیل سے قلیل شرائط بیان کیجئے۔ جن کی تکمیل سے کسی شخص کو مسلم کہلانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور یہ تعریف اس اصول پر مبنی ہونی چاہیئے جس کے مطابق گرییمر میں کسی اصطلاح کی تعریف کی جاتی ہے۔ نتیجہ ملاحظہ ہو۔

مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان

"سوال۔ مسلم کی تعریف کیا ہے؟

جواب۔ اوّل۔ وہ توحید الٰہی پر ایمان رکھتا ہو۔

دوئم۔ وہ پیغمبر اسلام کو اور تمام انبیائے سابقین کو خدا کا سچا نبی مانتا ہو۔

سوم اس کا ایمان ہو کہ پیغمبر اسلام صلعم انبیا میں آخری نبی ہیں۔ (خاتم النبیین)۔

چہارم۔ اس کا ایمان ہو کہ قرآن کو اللہ تعالےٰ نے بذریعہ الہام پیغمبر اسلام صلعم پر نازل کیا۔

پنجم۔ وہ پیغمبر اسلام صلعم کی ہدایات کے واجب الاطاعت ہونے پر ایمان رکھتا ہو۔

ششم۔ وہ قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔

سوال۔ کیا تارکِ صلوٰۃ مسلم ہوتا ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔ لیکن منکرِ صلوٰۃ مسلم نہیں ہو سکتا۔"

مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے اسلام مغربی پاکستان:۔

"سوال۔ ازراہ کرم مسلم کی تعریف کیجئے۔

جواب۔ وہ شخص مسلم ہے۔ جو (۱) قرآن پر ایمان رکھتا ہو اور (۲) رسول اللہ صلعم کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہو۔ ہر شخص جو ان دو شرطوں کو پورا کرتا ہے مسلم کہلانے کا حقدار ہے۔ اور اس کے لئے اس سے زیادہ عقیدے اور اس سے زیادہ عمل کی ضرورت نہیں۔"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی:۔

"سوال۔ ازراہ کرم مسلم کی تعریف کیجئے۔

جواب۔ وہ شخص مسلم ہے جو (۱) توحید پر (۲) تمام انبیاء پر (۳) تمام الہامی کتابوں پر (۴) ملائکہ پر (۵) یوم الآخرۃ پر ایمان رکھتا ہو۔

سوال۔ کیا ان باتوں کے محض زبانی اقرار سے کسی شخص کو مسلم کہلانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور آیا ایک مسلم مملکت میں اس سے وہ سلوک کیا جائے گا جو مسلمان سے کیا جاتا ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہوں تو کیا کسی شخص کو اس کے عقیدے کے وجود پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے؟

جواب۔ جو پانچ شرائط میں نے بیان کی ہیں وہ بنیادی ہیں جو شخص ان شرائط میں سے کسی

شرط میں کوئی تبدیلی کرے گا وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔"

غازی سراج الدین مُنیر:۔

سُوال۔ ازراہ کرم مُسلم کی تعریف کیجئے۔

جواب۔ میں ہر اس شخص کو مسلمان سمجھتا ہوں جو کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان کا اقرار کرتا ہے۔ اور رسول پاک صلعم کے نقش قدم پر چل کر زندگی بسر کرتا ہے۔"

مفتی محمد ادریس جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد۔ لاہور:۔

سُوال۔ ازراہ کرم مسلمان کی تعریف کیجئے۔

جواب۔ لفظ مُسلمان فارسی کا لفظ ہے 'مُسلم' کے لئے فارسی میں جو لفظِ مسلمان بولا جاتا ہے اس میں اور لفظ 'مومن' میں فرق ہے۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں لفظ مومن کی مکمل تعریف کروں کیونکہ اس امر کی وضاحت کے لئے بے شمار صفحات درکار ہیں کہ 'مومن' کیا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اقرار کرتا ہے وہ مُسلم ہے۔ اس کو توحید الٰہی۔ رسالتِ انبیا اور یوم قیامت پر ایمان رکھنا چاہیئے جو شخص اذان یا قربانی پر ایمان نہیں رکھتا وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بے شمار دیگر امور بھی ہیں جو ہمارے نبی کریم سے ہم کو تواتر کے ساتھ پہنچے ہیں مُسلم ہونے کے لئے ان سب امور پر ایمان لانا ضروری ہے۔ میرے لئے یہ قریب قریب ناممکن ہے کہ ان تمام امور کی مکمل فہرست پیش کروں۔"

حافظ کفایت حسین۔ ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ:۔

سُوال۔ مسلمان کون ہے؟

جواب۔ جو شخص (۱) توحید (۲) نبوت اور (۳) قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ مسلمان کہلانے کا حقدار ہے یہ تین بنیادی عقائد ہیں جن کا اقرار کرنے والا مسلمان کہلا سکتا ہے۔ ان تین بنیادی عقائد کے معاملے میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ان تین عقیدوں پر ایمان رکھنے کے علاوہ بعض اور امور ہیں جن کو 'ضروریات دین' کہتے ہیں۔ مسلمان کہلانے کا حقدار بننے کے لئے ان کی تکمیل ضروری ہے۔ ان ضروریات کے تعین اور شمار کے لئے مجھے دو دن چاہئیں لیکن مثال کے طور پر میں یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ احترام کلام اللہ۔ وجوب نماز۔ وجوب روزہ۔ وجوب حج مع الشرائط اور دوسرے بے شمار امور ضروریات دین میں شامل ہیں۔"

مولانا عبدالحامد بدایونی۔ صدر جمعیت العلمائے پاکستان:۔

سُوال۔ آپ کے نزدیک مسلمان کون ہے؟

جواب۔ جو شخص ضروریاتِ دین پر ایمان رکھتا ہے وہ 'مومن' ہے اور ہر مومن مسلمان کہلاتے

کا حق دار ہے +

سوال۔ ضروریات دین کون کون سی ہیں ؟

جواب۔ جو شخص پنج ارکان اسلام پر اور ہمارے رسول پاک صلعم پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ ضروریات دین کو پورا کرتا ہے +

سوال۔ آیا ان پنج ارکانِ اسلام کے علاوہ دوسرے اعمال کا بھی اس امر سے کوئی تعلق ہے کہ کوئی شخص مسلمان ہے یا دائرہ اسلام سے خارج ہے ؟

(نوٹ۔ گواہ کو سمجھا دیا گیا تھا کہ دوسرے اعمال سے وہ ضوابط اخلاقی مراد ہیں جو زمانۂ حاضر کے معاشرے میں صحیح سمجھے جاتے ہیں)

جواب۔ یقیناً تعلق ہے۔

سوال۔ پھر آپ ایسے شخص کو مسلمان نہیں کہیں گے جو ارکان خمسہ اور رسالت پیغمبر اسلام پر تو ایمان رکھتا ہے لیکن دوسرے لوگوں کی چیزیں چرا لیتا ہے جو مال اس کے سپرد کیا جائے اس کو غبن کر لیتا ہے۔ اپنے ہمسائے کی بیوی کے متعلق نیت بد رکھتا ہے اور اپنے محسن سے انتہائی ناشکری کا مرتکب ہوتا ہے ؟

جواب۔ ایسا شخص اگر ان عقیدوں پر ایمان رکھتا ہے جو ابھی بیان کئے گئے ہیں تو ان تمام اعمال کے باوجود وہ مسلمان ہوگا "

مولانا محمد علی کاندھلوی دار الشہابیہ۔ سیالکوٹ :۔

"سوال۔ از راہ کرم مسلمان کی تعریف کیجئے۔

جواب۔ جو شخص نبی کریم صلعم کے احکام کی تعمیل میں تمام ضروریات دین کو بجا لاتا ہے۔ وہ مسلمان ہے +

سوال۔ کیا آپ ضروریات دین کی تعریف کر سکتے ہیں ؟

جواب۔ ضروریاتِ دین ہر مسلمان کو معلوم ہیں خواہ وہ دینی علم نہ رکھتا ہو +

سوال۔ کیا آپ ضروریات دین کو شمار کر سکتے ہیں ؟

جواب۔ وہ اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا ذکر بے حد دشوار ہے۔ میں ان ضروریات کو شمار نہیں کر سکتا۔ بعض ضروریات دین کا ذکر کیا جا سکتا ہے مثلاً صلوٰۃ، صوم وغیرہ"

مولانا امین احسن اصلاحی :۔

"سوال۔ مسلمان کون ہے ؟

جواب۔ مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سیاسی مسلمان۔ دوسرے حقیقی مسلمان۔ سیاسی مسلمان کہلانے کی غرض سے ایک شخص کے لئے ضروری ہے کہ

(۱) توحید الٰہی پر ایمان رکھتا ہو +

(۲) ہمارے رسول پاکؐ کو خاتم النبیین مانتا ہو یعنی اپنی زندگی کے متعلق تمام معاملات میں ان کو آخری سند تسلیم کرتا ہو:
(۳) ایمان رکھتا ہو کہ ہر خیر و شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے:
(۴) روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو:
(۵) قرآن مجید کو آخری الہام الٰہی الیقین کرتا ہو:
(۶) مکہ معظمہ کا حج کرتا ہو:
(۷) زکوٰۃ ادا کرتا ہو:
(۸) مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتا ہو:
(۹) اسلامی معاشرے کے ظاہری قواعد کی تعمیل کرتا ہو:
(۱۰) روزہ رکھتا ہو:

جو شخص ان تمام شرائط کو پورا کرتا ہو وہ ایک اسلامی مملکت کے پورے شہری کے حقوق کا مستحق ہے اگر وہ ان میں سے کوئی ایک شرط پوری نہ کرے گا تو وہ سیاسی مسلمان نہ ہوگا (پھر کہا) اگر کوئی شخص ان دس امور پر ایمان کا محض اقرار ہی کرتا ہو، گو ان پر عمل کرتا ہو یا نہ کرتا ہو تو یہ اس کے مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے:

حقیقی مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کے تمام احکام پر عین اس طرح ایمان رکھتا ہو اور عمل کرتا ہو جس طرح وہ احکام و ہدایات اس پر عائد کئے گئے ہیں

سوال۔ کیا آپ یہ کہیں گے کہ صرف حقیقی مسلمان ہی "مردِ صالح" ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ اگر ہم آپ کے ارشاد سے یہ سمجھیں کہ آپ کے نزدیک سیاسی مسلمان کہلانے کے لئے صرف عقیدہ کافی ہے اور حقیقی مسلمان بننے کے لئے عقیدے کے علاوہ عمل بھی ضروری ہے تو کیا آپ کے نزدیک ہم نے آپ کا مفہوم صحیح طور سے سمجھا ہے؟

جواب۔ جی نہیں۔ آپ میرا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھے۔ سیاسی مسلمان کے معاملے میں بھی عمل ضروری ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان عقائد کے مطابق عمل نہیں کرتا جو ایک سیاسی مسلمان کے لئے ضروری ہیں تو وہ سیاسی مسلمانوں کے دائرے سے خارج ہو جائے گا:

سوال۔ اگر کوئی سیاسی مسلمان ان باتوں پر ایمان نہ رکھتا ہو جن کو آپ نے ضروری بتایا ہے تو کیا آپ اس شخص کو "بے دین" کہیں گے؟

جواب۔ جی نہیں میں اسے محض "بے عمل" کہوں گا:

صدر انجمن احمدیہ ربوہ کی طرف سے جو تحریری بیان پیش کیا گیا۔ اس میں مسلم کی تعریف یہ کی گئی کہ مسلم وہ شخص ہے جو رسول پاک صلعم کی اُمت سے تعلق رکھتا ہے اور کلمہ طیبہ پر ایمان کا اقرار کرتا ہے۔

ان متعدد تعریفوں کو جو علماء نے پیش کی ہیں پیش نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرے کی ضرورت ہے؟ بجز اس کے کہ دین کے کوئی دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنی طرف سے "مسلم" کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالمِ دین نے کی ہے اور وہ تعریف اُن تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائیگا اور اگر ہم علماء میں سے کسی ایک کی تعریف کو اختیار کر لیں تو ہم

اُس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے تمام علما کی تعریف کے رو سے کافر ہو جائیں گے۔

ارتداد

اسلامی مملکت میں ارتداد کی سزا موت ہے۔ اس پر علما عملاً متفق الرائے ہیں (ملاحظہ ہوں مولانا ابوالحسنات سید محمدؐ احمد قادری صدر جمعیت العلمائے پاکستان پنجاب۔ مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے اسلام مغربی پاکستان۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بانی و سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان۔ مفتی محمد ادریس جامع اشرفیہ لاہور و رکن جمعیتہ العلمائے پاکستان۔ مولانا داؤد غزنوی صدر جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان۔ مولانا عبدالحلیم قاسمی جمعیتہ العلمائے اسلام پنجاب۔ اور مسٹر ابراہیم علی چشتی کی شہادتیں) اس عقیدے کے مطابق چودھری ظفر اللہ خاں نے اگر اپنے موجودہ مذہبی عقائد ورثے میں حاصل نہیں کئے۔ بلکہ وہ خود اپنی رضامندی سے احمدی ہوئے تھے۔ تو ان کو ہلاک کر دینا چاہئے۔ اور اگر مولانا ابوالحسنات سید محمدؐ احمد قادری یا مرزا رضا احمد خان بریلوی یا اُن بے شمار علما میں سے کوئی صاحب [جو فتوے (EX.D.E 14) کے خوبصورت درخت کے ہر پتے پر مرقوم دکھائے گئے ہیں] ایسی اسلامی مملکت کے رئیس بن جائیں تو یہی انجام دیوبندیوں اور وہابیوں کا ہوگا جن میں مولانا محمد شفیع دیوبندی ممبر بورڈ تعلیمات اسلامی ملحقہ دستور ساز اسمبلی پاکستان اور مولانا داؤد غزنوی بھی شامل ہیں۔ اور اگر مولانا محمدؐ شفیع دیوبندی رئیس مملکت مقرر ہو جائیں تو وہ ان لوگوں کو جنہوں نے دیوبندیوں کو کافر قرار دیا ہے۔ دائرہ اسلام سے خارج قرار دینگے۔ اور اگر وہ لوگ مُرتد کی تعریف میں آئیں گے۔ یعنی انہوں نے اپنے مذہبی عقائد ورثے میں حاصل نہ کئے ہوں گے۔ بلکہ خود اپنا عقیدہ بدل لیا ہوگا۔ تو مفتی صاحب ان کو موت کی سزا دے دیں گے۔

جب دیوبندیوں کا ایک فتوےٰ (EX.D.E 13) جس میں اثنا عشری شیعوں کو کافر و مرتد قرار دیا گیا ہے۔ عدالت میں پیش ہوا تو کہا گیا کہ یہ اصلی نہیں۔ بلکہ مصنوعی ہے لیکن جب مفتی محمدؐ شفیع نے اس امر کے متعلق دیوبند سے استفسار کیا۔ تو اُس دارالعلوم کے دفتر سے اس فتوے کی ایک نقل موصول ہو گئی جس پر دارالعلوم کے تمام اساتذہ کے دستخط ثبت تھے۔ اور ان میں مفتی محمدؐ شفیع صاحب کے دستخط بھی شامل تھے۔ اس فتوے میں لکھا ہے کہ جو لوگ حضرت صدیق اکبرؓ کی صحابیت پر ایمان نہیں رکھتے۔ جو لوگ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے قاذف ہیں۔ اور جو لوگ قرآن میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔ وہ کافر ہیں۔ مسٹر ابراہیم علی چشتی نے بھی جنہوں نے مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے مضمون سے باخبر ہیں۔ اس رائے کی تائید کی ہے۔ ان کے نزدیک شیعہ اپنے اس عقیدے کی وجہ سے کافر ہیں کہ حضرت علیؓ نبوت میں ہمارے رسول پاکؐ کے شریک تھے۔ مسٹر چشتی نے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کیا ہے۔ کہ اگر کوئی سُنی اپنا عقیدہ بدل کر شیعوں کا ہم خیال ہو جائے۔ تو آیا وہ اس ارتداد کا مرتکب ہوگا جس کی سزا موت ہے۔ شیعوں کے نزدیک تمام سُنی کافر ہیں۔ اور اہل قرآن یعنی وہ لوگ جو حدیث کو غیر معتبر سمجھتے ہیں اور واجب التعمیل نہیں مانتے۔ متفقہ طور پر کافر ہیں۔ اور یہی حال آزاد مفکرین کا ہے۔ اس تمام بحث کا آخری نتیجہ یہ ہے۔ کہ شیعہ۔ سُنی۔ دیوبندی۔ اہل حدیث اور بریلوی لوگوں میں سے کوئی بھی مُسلم نہیں۔ اور اگر

مملکت کی حکومت ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو۔ جو دوسری جماعت کو کافر سمجھتی ہے تو جہاں کوئی شخص ایک عقیدے کو بدل کر دوسرا اختیار کرے گا۔ اس کو اسلامی مملکت میں لازماً موت کی سزا دی جائے گی۔ اور جب یہ حقیقت مدنظر رکھی جائے کہ ہمارے سامنے مُسلم کی تعریف کے معاملے میں کوئی دو عالم بھی متفق الرائے نہیں ہو سکے۔ تو اس عقیدے کے نتائج کا قیاس کرنے کے لئے کسی خاص قوت متخیلہ کی ضرورت نہیں۔ اگر علما کی پیش کی ہوئی تعریفوں میں سے ہر تعریف کو معتبر سمجھا جائے پھر انہیں تحلیل و تحویل کے قاعدے کے ماتحت لایا جائے اور نمونے کے طور پر الزام کی وہ شکل اختیار کی جائے جو گلیلیو کے خلاف انکویزیشن کے فیصلے میں اختیار کی گئی تھی تو اُن وجوہ کی تعداد بے شمار ہو جائے گی جن کی بنا پر کسی شخص کا ارتداد ثابت کیا جا سکے۔

اس رپورٹ کے کسی سابقہ حصے میں "الشہاب" کی ضبطی کا حوالہ دیا گیا تھا۔ یہ کتابچہ مولانا شبیر احمد عثمانی کا لکھا ہُوا تھا۔ جو بعد میں پاکستان کے شیخ الاسلام بن گئے تھے۔ اس کتابچے میں مولانا نے قرآن، سنت، اجماع اور قیاس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہ اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے۔ اس دینیاتی عقیدے کو پیش کرنے کے بعد مولانا نے اس کتابچے میں بطور بیان واقعہ یہ لکھا تھا۔ کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور بعد کے خلفا کے زمانوں میں عرب کے وسیع رقبے بارہا مرتدین کے خون سے رنگین ہوئے۔ یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم اس عقیدے کی صحت یا عدم صحت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ حکومت پنجاب کے پاس اس کتابچے کی ضبطی کی تجویز وزیر داخلہ نے بھیجی تھی۔ ہم اپنے آپ سے یہ سوال کرتے ہیں۔ کہ آخر حکومت نے ایسا قدم کیوں اُٹھایا جس سے ایک ایسے عقیدے کی مذمت لازم آئی جو مولانا کے دعوے کے مطابق قرآن اور سنت سے اخذ کیا گیا تھا۔ ارتداد کے لئے سزائے موت بہت دُور رس متعلقات کی حامل ہے۔ اور اس سے اسلام مذہبی جنونیوں کا دین ظاہر ہوتا ہے جس میں حُریت فکر مستوجب سزا ہے۔ قرآن تو بار بار عقل و فکر پر زور دیتا ہے۔ رواداری کی تلقین کرتا ہے اور مذہبی امور میں جبر و اکراہ کے خلاف تعلیم دیتا ہے۔ لیکن ارتداد کے متعلق جو عقیدہ اس کتابچے میں پیش کیا گیا ہے وہ آزادیٔ فکر کی جڑ پر ضرب لگا رہا ہے۔ کیونکہ اس میں یہ رائے قائم کی گئی ہے۔ کہ جو شخص پیدائشی مسلمان ہو۔ یا خود اسلام قبول کر چکا ہو۔ وہ اگر اس خیال سے مذہب کے موضوع پر فکر کرے۔ کہ جو مذہب اسے پسند آئے۔ اس کو اختیار کر لے۔ وہ سزائے موت کا مستوجب ہوگا۔ اس اعتبار سے اسلام کامل ذہنی فالج کا پیکر بن جاتا ہے۔ اور اگر اس کتابچہ کا یہ بیان صحیح ہے۔ کہ عرب کے وسیع رقبے بارہا انسانی خون سے رنگین ہوئے تھے۔ تو اس سے یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ عین اس زمانے میں بھی جب اسلام عظمت و شوکت کے نقطۂ عروج پر تھا۔ اور پورا عرب اس کے زیر نگیں تھا اس ملک میں بے شمار ایسے لوگ موجود تھے۔ جو اس مذہب سے منحرف ہو گئے تھے اور انہوں نے اس کے نظام کے ماتحت رہنے پر موت کو ترجیح دی تھی۔ غالباً اس کتابچے سے وزیر داخلہ کے ذہن پر کچھ اسی قسم کا اثر مترتب ہُوا ہوگا جس کے ماتحت انہوں نے حکومت پنجاب کو اس کتابچے کی ضبطی کا مشورہ دیا۔ مزید برآں وزیر موصوف نے جو خود دینی امور میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ ضرور یہ سوچا ہوگا۔ کہ اس کتابچے کے مصنف نے جو نتیجہ نکالا ہے۔ وہ اس نظیر پر مبنی ہے جو عہد نامہ عتیق کے فقرات ۲۶، ۲۷، ۲۸ میں مذکور ہے۔ اور جس کے متعلق قرآن کی دوسری سورت کی چوّنویں آیت میں جزوی سا اشارہ کیا گیا ہے۔

اس نتیجے کا اطلاق اسلام سے ارتداد پر نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ قرآن مجید میں ارتداد پر سزائے موت کی کوئی واضح آیت موجود نہیں۔ اس لئے کتابچے کے مصنف کی رائے بالکل غلط ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ایک تو سورۃ کافرون کی چھ مختصر آیات میں اور دوسری سورت کی آیہ "لا اکراہ" کی تہ میں جو مفہوم ہے۔ اس سے وہ نظریہ بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ جو "الشہاب" میں قائم کیا گیا ہے۔ سورہ کافرون صرف تیس الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کی کوئی آیت چھ الفاظ سے زیادہ کی نہیں۔ اس سورت میں وہ بنیادی خصوصیت واضح کی گئی ہے۔ جو کردار انسانی میں ابتدائے آفرینش سے موجود ہے۔ اور "لا اکراہ" والی آیت میں جس کا متعلقہ حصہ صرف نو الفاظ پر مشتمل ہے۔ ذہن انسانی کی ذمہ داری کا قاعدہ ایسی صحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کہ اس سے بہتر صحت ممکن نہیں۔ یہ دونوں متن جو الہام الٰہی کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اُس اصول کی بنیاد و اساس ہیں جس کو معاشرہ انسانی نے صدیوں کی جنگ و پیکار اور نفرت و خونریزی کے بعد اختیار کیا ہے۔ اور قرار دیا ہے کہ یہ انسان کے اہم ترین بنیادی حقوق میں سے ہے۔ لیکن ہمارے علماء و محققین اسلام کو جنگجوئی سے کبھی علیحدہ نہیں کرینگے۔

دوسرے مذاہب کی تبلیغ

ارتداد کی سزا کیا ہونی چاہئے۔ اور آیا غیر مسلموں کو علی الاعلان اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق ہے یا نہیں۔ یہ دونوں مسئلے باہم مربوط ہیں جس اصول کے ماتحت ایک مرتد کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ اسی کا اطلاق "کفر" کی علی الاعلان تبلیغ پر بھی ہونا چاہئے چنانچہ مولانا ابوالحسنات۔ غازی سراج الدین منیر۔ اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ صرف آخر الذکر نے اس معاملے میں اپنی رائے کو علما کی رائے کے ماتحت رکھا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں اسلام کے سوا کسی اور مذہب کو کھلم کھلا تبلیغ کی اجازت نہ ہوگی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے خیالات بھی اس موضوع پر اسی قسم کے ہیں جو انہوں نے اپنے کتابچے "اسلام میں مرتد کی سزا" میں ظاہر کئے ہیں۔ غازی سراج الدین منیر سے جب اس موضوع پر سوال کیا گیا۔ تو ان کا جواب یہ تھا:۔

"سوال۔ اگر آپ پاکستان کے رئیس مملکت ہو جائیں، تو احمدیوں سے کیا سلوک کریں گے؟

جواب۔ میں انہیں انسانوں کی حیثیت میں تو برداشت کر لونگا۔ لیکن انہیں اپنے مذہب کی تبلیغ و تلقین کی اجازت نہ دونگا۔"

اگر یہ نظریہ مُسلّم قرار دیا جائے۔ کہ ارتداد کی سزا موت ہوگی۔ اور اسلام کے خلاف کسی حملے یا خطرے کو بھی غداری قرار دیا جائے گا۔ اور اس کی سزا بھی وہی ہوگی جو ارتداد کی ہے۔ تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہر غیر مُسلم مذہب کی کھلم کھلا تبلیغ ممنوع قرار پائے گی۔

جہاد

اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ جن مسائل پر مسلمانوں اور احمدیوں کے درمیان اختلاف ہے۔ ان میں ایک جہاد بھی ہے۔ اس عقیدے سے بے شمار دوسرے متعلقہ امور سامنے آتے ہیں مثلاً غازی، شہید، جہاد بالسیف، جہاد فی سبیل اللہ، دارالاسلام، دارالحرب، ہجرت، غنیمت، خمس اور غلامی کے معنی کیا ہیں۔ اور یہ تصورات زمانۂ حاضر کے بین الاقوامی مسائل مثلاً جارحیت، قطع نسل، بین الاقوامی فوجداری کا دائرۂ اثر، بین الاقوامی معاہدے اور بین الاقوامی قانونِ عامہ کے قواعد سے کس حد تک متصادم ہوتے ہیں۔ اور کس حد تک ان میں تطابق ہو سکتا ہے۔

اسلامی مملکت دارالاسلام ہے یعنی وہ ملک جس میں اسلام کے احکام نافذ ہوں۔ اور جس کا حاکم مسلمان ہو۔ دارالاسلام کے باشندے مسلمان بھی ہوتے ہیں۔ اور وہ غیر مسلم بھی جنہوں نے مسلم اقتدار کے سامنے گردنِ اطاعت جھکا دی ہو۔ اور جن کو مملکت اسلامی نے بعض قیود کے ماتحت اور شہریت کا ملہ حاصل ہونے کے امکان کے بغیر اُن کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے دی ہو۔ لیکن ان کا اہل کتاب ہونا ضروری ہے۔ وہ بُت پرست ہرگز نہ ہوں۔ مملکت اسلامی نظریاتی اعتبار سے اپنے ہمسایہ غیر مسلم ملک سے دائماً برسرِ جنگ رہتی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے وہ کسی وقت دارالحرب بن جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ اسے چھوڑ کر اپنے برادرانِ دینی کے ملک میں چلے آئیں۔ ہم نے یہ پہلو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے سامنے پیش کیا۔ تو انہوں نے ذیل کے خیالات ظاہر کئے :۔

"سوال۔ جو ملک دارالاسلام کی سرحد پر واقع ہو۔ کیا وہ ایک اسلامی مملکت کے مقابلے میں ہمیشہ دارالحرب کی حیثیت رکھتا ہے؟

جواب۔ جی نہیں۔ اگر دونوں کے درمیان کوئی مصالحت کا معاہدہ موجود نہ ہو۔ تو اسلامی مملکت بالقوّۃ اپنے غیر مسلم ہمسایہ ملک سے برسرِ جنگ رہے گی۔ کوئی غیر مسلم ملک صرف اس صورت میں دارالحرب کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ جب اسلامی مملکت اس کے خلاف رسمی حیثیت سے اعلانِ جنگ کر دے۔"

غیاث اللُغات کے رُو سے دارالحرب کافروں کا وہ ملک ہے جس کو اسلام نے مطیع نہ کیا ہو کسی ملک کے دارالحرب بننے کے نتائج مختصر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں یوں بیان کئے گئے ہیں :۔

"جب کوئی ملک دارالحرب بن جائے۔ تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس میں سے نکل جائیں۔ اور جو بیوی اس وقت اپنے شوہر کا ساتھ دینے سے انکار کریگی۔ اس پر خود بخود طلاق واقع ہو جائے گی۔"

پس اگر ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ ہو جائے۔ اور پاکستان اس وقت اسلامی مملکت ہو۔ تو اسے سرحد پار سے چار کروڑ مسلمانوں کے استقبال کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحامد بدایونی کے نزدیک بحالت موجودہ بھی مسلمانانِ ہند ہجرت کر سکتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کی رائے یہ ہے :۔

"سوال:- کیا آپ پاکستان میں اپنے نقل مکانی کو مذہبی مفہوم کے اعتبار سے ہجرت کہیں گے؟
جواب:- جی ہاں"

اب ہم عنقریب یہ بتائیں گے۔ کہ مرزا غلام احمد نے عقیدۂ جہاد کی جو توجیہ کی ہے، وہ ان کے اور ان کی جماعت کے کفر کی وجہ کیوں بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس سے قبل ہم یہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ مسلمان اب تک جہاد کا کیا مطلب سمجھتے رہے ہیں۔ اور آج کیا سمجھتے ہیں۔ جہاد کے متعلق مختلف نظریئے رائج ہیں۔ مثلاً ایک تو کسی مذہبی جنونی کا خام تصور ہے۔ کہ وہ مذہبی جوش میں سرشار ہو کر تلوار ہاتھ میں لے، بلا امتیاز غیر مسلموں کا قتل عام کرتا پھرے۔ اور یقین رکھے کہ اگر وہ اس جنگ میں مارا گیا۔ تو شہید ہو گا۔ اور اگر اس قتل و خون میں کامیاب ہؤا۔ تو غازی کا رتبہ حاصل کرے گا۔ ایک انتہا تو یہ ہے۔ اور دوسری طرف یہ تصور بھی موجود ہے۔ کہ مسلمان کی پوری زندگی کفر کا مقابلہ کرنے کے لئے وقف ہے۔ (یہاں کُفر خطا و شر کے معنی میں استعمال ہؤا ہے) لہٰذا مسلمان کی زندگی میں سب سے بڑی سرگرمی یہ ہے کہ وہ دلیل و برہان کی مدد سے اور جہاں ضروری ہو۔ وہاں قوت سے کام لے کر اسلام کو پھیلائے۔ تا آنکہ وہ عالمگیر مذہب بن جائے۔ آخر الذکر دینی قوت کے استعمال میں اس حالت میں وہ کسی شخصی غرض سے جنگ نہیں کرتا۔ بلکہ اس جدوجہد کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ جو اللہ نے اس پر عاید کیا ہے اور جس کی بجا آوری کی واحد جزا ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ مختصر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں "جہاد" کے متعلق مندرجہ ذیل مختصر مقالہ درج ہے:-

"جہاد۔ (عربی) جنگ مقدس۔ اسلحہ کے زور سے اسلام کی اشاعت مسلمانوں کا علی العموم مذہبی فریضہ ہے۔ یہ اسلام کا چھٹا رکن بنتے بنتے رہ گیا۔ لیکن خارجیوں کے اولاد و احفاد اسے حقیقتہً چھٹا رکن تسلیم کرتے ہیں۔ مسلمان اس موقف پر تدریجی طور پر لیکن سرعت کے ساتھ پہنچ گئے۔ قرآن کی مکّی سورتوں میں حملے کے مقابلے میں صبر کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا رویّہ ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن مدینہ میں حملے کے دفاع کا حق قائم ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ اہل مکّہ کے خلاف لڑنا اور ان کو مطیع کرنا فرض عین قرار پا گیا۔ ممکن ہے اس میں کوئی شبہ کی گنجائش ہو۔ کہ آیا حضرت محمد (صلعم) خود اس امر کو تسلیم کرتے تھے۔ کہ انہیں اپنے منصب کے اعتبار سے کافروں کی دنیا کے خلاف مستقل طور پر اور بلا وجہ اشتعال جنگ جاری رکھنی چاہئے۔ تا آنکہ وہ اسلام کی مطیع و مغلوب ہو جائے۔ احادیث اس امر کے متعلق واضح ہیں۔ لیکن قرآن کی آیات میں ہمیشہ اُن کفار کا ذکر آتا ہے جن کو اس لئے مطیع کرنا ضروری ہے۔ کہ وہ خطرناک اور بے ایمان ہیں۔ لیکن حضرت نے آس پاس کی حکومتوں کو جو مکتوب لکھے۔ ان سے ظاہر ہے کہ آپ کے ذہن میں ایسے عالمگیر موقف کا تصور بالکل روشن تھا۔ اور آپ کے انتقال کے بعد یقیناً وہ تصور فی الفور عروج پا گیا۔ اور مسلمان فوجیں عرب کی حدود سے پار پیش قدمی کرنے لگیں۔ لیکن اب جہاد "فرض علے الکفایۂ" ہے۔ جو ان تمام مسلمانوں پر علے العموم عائد ہوتا ہے۔ جو مرد ہوں۔ آزاد ہوں۔ بالغ ہوں جسمانی اور ذہنی اعتبار سے صحیح العقل ہوں۔ اور مسلمان فوج تک پہنچنے کی ضروری استطاعت رکھتے ہوں۔ یہ فرض لازماً ہر فرد پر عائد نہیں ہوتا۔

لیکن جب ایک خاص تعداد اس فرض کو ادا کر دے۔ تو اس کی بجا آوری کافی سمجھی جاتی ہے پس جہاد اس وقت تک جاری رہنا چاہئے۔ جب تک پوری دنیا اسلام کے زیر نگیں نہ ہو جائے جہاد کی نگرانی اور قیادت کسی مسلمان حکمران یا امام کے ہاتھ میں ہونی ضروری ہے شیعوں کا امام چونکہ غائب ہے اس لئے وہ اس کے ظہور تک فریضۂ جہاد ادا نہیں کر سکتے۔ مزید برآں اگر ایسا حکمران سال بھر میں ایک دفعہ کوئی مہم لے کر روانہ ہو جائے۔ یا ہر سال ایک مہم کی تیاری ہی کرلے۔ جب بھی فریضہ کی ضروریات پوری ہو جائینگی جن لوگوں کے خلاف جہاد کرنا مقصود ہو۔ ان کو سب سے پہلے قبولِ اسلام کی دعوت دینی چاہئے۔ اگر وہ اس سے انکار کریں۔ تو پھر ان سے یہ کہنا چاہئے۔ کہ وہ مسلم حکومت کے آگے سر جھکا دیں۔ ذمّی بن جائیں جزیہ اور خراج دیں۔ اور اگر یہ بھی نہ مانیں۔ تو جنگ کرلیں۔ پہلی حالت میں ان کی جانیں ان کے خاندان اور ان کا مال بالکل محفوظ رہے گا۔ لیکن ان کی حیثیت ادنیٰ ہوگی انہیں شہریت کے اصطلاحی حقوق حاصل نہ ہوں گے۔ اور ان سے صرف حفاظت میں لئے ہوئے اشخاص کا سا سلوک کیا جائے گا۔ اگر وہ جنگ کرینگے۔ تو وہ اور ان کے افراد خاندان غلام بنا لئے جائیں گے۔ ان کے مال پر بطورِ غنیمت قبضہ کر لیا جائے گا جس کا ۴/۵ حصہ فاتحین کے لشکر کو دیا جائے گا۔ اگر وہ اسلام قبول کرلیں۔ اور اس کا موقع انہیں اس وقت بھی حاصل رہے گا۔ جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آکھڑی ہوں۔ تو وہ ملتِ مسلمہ میں شامل ہو جائیں گے۔ اور مساوی حقوق و فرائض کے حقدار ہوں گے۔ مرتدین کو قتل کر دینا ضروری ہے۔ اگر کسی مسلم ملک پر کفار کا حملہ ہو جائے۔ تو امام تمام مسلمانوں کے تمام اسلحہ بند ہونے کے لئے اعلانِ عام جاری کرے گا۔ اور خطرہ جتنا وسیع ہوتا چلا جائیگا اسی قدر اس اعلان کی وسعت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ پوری دُنیائے اسلام پر حادی ہو جائیگا۔ جو مسلمان اللہ کے راستے میں (فی سبیل اللہ) لڑتا ہوا مارا جائے۔ وہ شہید ہے۔ اور اس کا جنت میں جانا اور وہاں کی خاص برکات حاصل کرنا یقینی ہے۔ اوّلین نسلوں میں اس قسم کی موت ایک صالح زندگی کا تاج امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ اب بھی بعض موقعوں پر یہ چیز نہایت جوش انگیز ہوتی ہے۔ لیکن جب سے اسلام کا سلسلہ فتوحات ختم ہو گیا ہے شہادت کی عظمت و وقعت بھی نہیں رہی۔ تاہم اب بھی جب مسلموں اور غیر مسلموں کی جنگ ہو۔ تو وہ جہاد ہی کی ترغیبات و انعامات سے مالامال ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ ہندوستان میں نام نہاد معتزلی۔ اور ترکی میں نوجوان ترک اس کے منکر ہیں۔ اور اسا ہی جہاد کی توضیح کی کوشش کرتے ہیں لیکن مسلمان عوام اب تک ایمۂ شریعت کی متفقہ آواز کی پیروی کرتے ہیں۔ اگر عقیدہ جہاد کو خارج کر دیا جائے۔ تو اسلام میں کچھ باقی نہیں رہتا۔"

عام طور پر مُسلّمہ رائے یہ ہے کہ سُورہ توبہ (سُورہ ۹) کی پانچویں آیت نے ان مکّی آیات کو منسوخ کر دیا جن میں صرف دفاع کے لئے کفار کے خلاف قتال کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کے برعکس احمدیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت کسی دوسری آیت کو منسوخ نہیں کرتی۔ اور دونوں قسم کی آیات یعنی مکّی آیات اور سورہ توبہ کی متعلقہ آیات کے دائرے مختلف ہیں چنانچہ وہ پہلو بہ پہلو چل سکتی ہیں۔ اس سے ناسخ و منسوخ اور اس کے اثرات

نتائج کی مشکل بحث شروع ہو جاتی ہے۔ احمدیوں کی طرف سے یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ اس عقیدے کے منافی ہے۔ کہ قرآنِ مجید لوحِ محفوظ میں تمام وکمال موجود ہے۔ اس عقیدے (ناسخ ومنسوخ) سے اس امر کا اعتراف لازم آتا ہے۔ کہ منسوخ شدہ آیت کسی خاص موقع کے لئے اُتری تھی۔ اور اس موقع پر اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد بیکار ہو گئی۔ گویا اللہ تعالیٰ کو بعد میں پیش آنے والے واقعات کا علم نہیں تھا جن سے وہ آیت بیکار ہو جانے والی تھی۔ یا اس کا کوئی ناپسندیدہ نتیجہ نکلنے والا تھا۔ اس عقیدے کا تیسرا نتیجہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے اس دعوے کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ کہ اسلام کے قوانین ناقابلِ تغیّر اور بے لچک ہیں۔ کیونکہ اگر بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے ایک نیا الہام ضروری ہو جاتا ہے۔ تو الہام کی تکمیل کے بعد حالات میں جو تغیرات ہونگے۔ وہ زیادہ تر الہامات کو بیکار اور متروک بنا دینگے۔ ہم اس مباحثے کے مالۂ وماعلیہ پر اپنی رائے ظاہر نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مختصر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالے سے اور بعض دوسری پیش شدہ تحریرات سے جن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی کتابیں بھی شامل ہیں عقیدۂ جہاد کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا۔ اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ اسلام اسلحہ اور فتوحات کے زور سے پھیلا ہے۔ اب جارحیت اور نسل کُشی انسانیت کے خلاف جرائم قرار پا چکے ہیں۔ اور انہی جرائم کی بنا پر نیورمبرگ اور ٹوکیو کی مختلف بین الاقوامی عدالتوں نے جرمنی اور جاپان کے اربابِ جنگ کو موت کی سزائیں دی ہیں۔ ایک طرف جارحیت اور نسل کُشی کے جرائم ہیں۔ اور دوسری طرف یہ عقیدہ ہے۔ کہ اسلام بزورِ شمشیر اور بزورِ فتوحات پھیلا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ نسل کُشی کے متعلق عنقریب ایک بین الاقوامی میثاق مرتب ہونے والا ہے لیکن اگر جہاد کا وہ نظریّہ درست ہے۔ جو ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ تو پاکستان اس میثاق میں ہرگز حصہ نہیں لے سکتا۔ مکّی سورتوں کی مندرجہ ذیل آیات میں وہ بلند ترین اور پاکیزہ اصول پیش کیا گیا ہے جس کا دھندلا سا تصور اب کہیں جا کر بین الاقوامی قانون والوں کو نظر آنے لگا ہے۔ لیکن ہم برابر یہی تلقین کر رہے ہیں۔ کہ جارحیّت اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے!

سُورہ ۲ - آیات ۱۹۰ - و ۱۹۳

(۱۹۰) وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔

اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے نہ نکلو۔ واقعی اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا +

(۱۹۳) وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ۔ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ ط فَاِنِ انْتَھَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ۔

اور ان کے ساتھ اس حد تک لڑو۔ کہ فساد باقی نہ رہے۔ اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔ اور اگر وہ لوگ باز آجائیں۔ تو سختی کسی پر نہیں ہو سکتی۔ سوائے بے انصافی کرنے والوں کے۔

سورہ ۲۲ - آیات ۳۹ - ۴۰

(۳۹) اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ط وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ۔

ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے جن سے لڑائی کی گئی۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور

یقیناً اللہ ان کو غالب کر دینے کی پوری قدرت رکھتا ہے

(۴۰) الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ

جو اپنے گھروں سے بلاوجہ نکالے گئے۔ محض اتنی بات پر کہ وہ کہتے تھے۔ کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ تعالےٰ لوگوں کا ایک کا دوسرے سے زور نہ گھٹاتا رہتا۔ تو صومعے خلوت خانے عبادتخانے اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے۔ بیشک اللہ اس کی مدد کرے گا۔ جو اس کی مدد کرے گا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ قوت والا اور غلبے والا ہے۔

شریعت اسلامی کی ایک اور شاخ "قانون اسیران جنگ" ہے۔ اس کا بھی بین الاقوامی قانون سے تصادم یقینی ہے۔ مثلاً اسیران جنگ کے ساتھ سلوک کے بارے میں ہمیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اُن خیالات کی پابندی کرنی ہوگی۔ جو قرآن وسنت پر مبنی بتائے جاتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:۔

"سوال:۔ کیا اسلام میں کوئی قانونِ جنگ بھی موجود ہے؟

جواب:۔ جی ہاں۔

سوال: کیا وہ قانون زمانہ حاضر کے بین الاقوامی قانون جنگ سے بنیادی طور پر مختلف ہے؟

جواب: یہ دونوں نظام ایک بنیادی فرق پر مبنی ہیں۔

سوال: جو غیر مسلم کسی جہاد میں اسیران جنگ بن کر آئیں۔ ان کے حقوق کیا ہیں؟

جواب: اس مسئلے میں اسلامی قانون یہ ہے کہ اگر وہ ملک جس کے یہ قیدی باشندے ہوں۔ ان کا فدیہ (معاوضہ) ادا کر دے۔ تو وہ رہا کر دیئے جائیں۔ قیدیوں کے تبادلہ کی بھی اجازت ہے۔ اگر ان دونوں متبادل صورتوں میں سے کوئی بھی ممکن نہ ہو۔ تو قیدی ہمیشہ کے لئے غلام بنا لئے جائیں۔ اگر ایسا کوئی شخص اپنی کمائی میں سے اپنا فدیہ ادا کرنے کی پیشکش کرے تو اس کو فدیے کے لئے رقم فراہم کرنے کی اجازت دے دی جائے۔

سوال: آیا آپ کا خیال یہ ہے۔ کہ جب تک حکومت ایک اسلامی حکومت کی شکل اختیار نہ کرلے۔ اس وقت تک اس کی طرف سے اعلان کردہ جنگ "جہاد" نہ سمجھی جائے گی؟

جواب: جی نہیں۔ اگر مسلمانوں کی قومی حکومت مملکت کے جائز مفادات کے لئے جنگ کا اعلان کرے۔ تو اس کو جہاد کہا جا سکتا ہے۔ جو رائے (EX. D.E 12) میں مجھ سے منسوب کی گئی ہے۔ وہ میں نے کبھی ظاہر نہیں کی:۔

رہا یہ مسئلہ کہ اگر حکومت پاکستان اپنی موجودہ شکل وصورت کے ساتھ انڈین

یونین کے ساتھ اپنے معاہدات ختم کرکے اعلانِ جنگ کر بھی دے ۔ تو کیا اس کی یہ جنگ جہاد کے حکم میں آجائے گی ۔ آپ نے اس بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے ۔ وہ بالکل درست ہے ۔ جب تک حکومت اسلامی نظام کو اختیار کر کے اسلامی نہ ہو جائے ۔ اس وقت تک اس کی کسی جنگ کو جہاد کہنا ایسا ہی ہے جیسا کسی غیر مسلم کے آزاد کشمیر کی فوج میں بھرتی ہو کر لڑنے کو جہاد اور اس کی موت کو شہادت کا نام دیا جائے ۔ مولانا کا جو مُدّعا ہے ۔ وہ یہ ہے کہ معاہدات کی موجودگی میں تو حکومت یا اس کے شہریوں کا اس جنگ میں شریک ہونا شرعاً جائز ہی نہیں ۔ اگر حکومت معاہدات ختم کر کے جنگ کا اعلان کر دے ۔ تو حکومت کی جنگ تو جہاد پھر بھی نہیں ہوگی ۔ تا آنکہ حکومت اسلامی نہ ہو جائے ۔"

اس چٹھی میں جو خیال ظاہر کیا گیا ہے ۔ وہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا ہے ۔ اور اس کی شہادت میاں طفیل محمدؐ نے دی ہے جن کا بیان ہے ۔ کہ "EX. D.E.12 اس چٹھی کی عکسی نقل ہے جو میں نے کسی شخص کو لکھی تھی جس کا نام اب مجھے یاد نہیں"۔

اس معاملے کے متعلق مولانا ابو الحسنات محمد احمدؐ قادری کی رائے حسب ذیل ہے :۔

"سوال :۔ کیا اسلام میں کوئی قانونِ جنگ موجود ہے ؟

جواب :۔ جی ہاں ۔

سوال :۔ کیا وہ قانون بنیادی اصولوں کے اعتبار سے موجودہ بین الاقوامی قانون سے مختلف ہے ؟

جواب :۔ جی ہاں ۔

سوال :۔ اس شخص کے کیا حقوق ہیں جو جنگ میں قید کر لیا جائے ؟

جواب ۔ وہ اسلام قبول کر سکتا ہے ۔ یا 'امان' طلب کر سکتا ہے ۔ ایسی حالت میں اس سے 'مُستامن' کا سلوک کیا جائیگا ۔ اگر وہ امان طلب نہ کرے گا ۔ تو غلام بنا لیا جائے گا ۔"

اسی قسم کی رائے کا اظہار جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمدؐ نے کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو :۔

"سوال ۔ کیا اسلام میں جنگ کا کوئی قانون ہے ؟

جواب ۔ جی ہاں ۔

سوال ۔ اگر وہ قانون بین الاقوامی قانون سے متصادم ہو ۔ تو آپ کس قانون کی پیروی کریں گے ؟

جواب ۔ اسلامی قانون کی ۔

سوال ۔ پھر آپ ازراہ کرم یہ بیان کیجئے کہ آپ کا لشکر جن اشخاص کو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے گرفتار کرے گا ۔ ان کی حیثیت کیا ہوگی ؟

جواب ۔ میں اس کا فی البدیہہ جواب نہیں دے سکتا ۔ اس کے لئے مجھے مسئلے کا مطالعہ کرنا ہوگا ۔"

اس میں کوئی شک نہیں ۔ کہ اگر غنیمت اور خُمس کو جہاد کا لازمی جزو سمجھا جائے تو بین الاقوامی معاشرہ اس کو محض لوٹ اور

رہزنی قرار دیگا۔

غیر مسلم مملکتوں کے مسلمانوں کا ردِّ عمل

جس نظریہ کی بنا پر پاکستان میں اسلامی مملکت کی بنیاد رکھنے کی خواہش کی جاتی ہے۔اس کے بعض نتائج ان مسلمانوں پر ضرور اثر انداز ہوں گے جو غیر مسلم حکمرانوں کے ماتحت ممالک میں آباد ہیں۔ہم نے امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری سے سوال کیا کہ آیا ایک مسلمان ایک غیر مسلم مملکت کی وفادار رعایا ہو سکتا ہے ان کا جواب ذیل میں درج ہے:۔

"سوال۔ کیا آپ کی رائے میں ایک مسلمان ایک کافر حکومت کے احکام کی تعمیل کا پابند ہو سکتا ہے؟

جواب۔ یہ ممکن نہیں۔ کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کا وفادار ہو۔

سوال۔ کیا چار کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنی مملکت کے وفادار شہری ہوں؟

جواب۔ جی نہیں۔"

یہ جواب اُس نظریے کے بالکل مطابق ہے جو ہمارے سامنے پُر زور طریق پر پیش کیا گیا ہے لیکن اگر پاکستان کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ اپنے دستور کی بنیاد مذہب پر رکھے۔ تو یہی حق ان ملکوں کو بھی دینا ہو گا جن میں مسلمان کافی بڑی اقلیتوں پر مشتمل ہیں۔ یا جو کسی ایسے ملک میں غالب اکثریت رکھتے ہیں جن میں حاکمیت کسی غیر مسلم قوم کو حاصل ہے۔ لہٰذا ہم نے مختلف علما سے یہ سوال کیا۔ کہ اگر پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ شہریت کے معاملات میں مسلموں سے مختلف سلوک کیا جائے۔ تو کیا علما کو اس امر پر کوئی اعتراض ہو گا۔ کہ دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ روا رکھا جائے۔ اس سوال کے جوابات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت العلما پاکستان:۔

"سوال۔ کیا آپ ہندوؤں کا جو ہندوستان میں اکثریت رکھتے ہیں یہ حق تسلیم کریں گے۔ کہ وہ اپنے ہاں ہندو دھرم کے ماتحت مملکت قائم کر لیں؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ اگر اُس نظام حکومت میں منوشاستر کے ماتحت مسلمانوں سے ملیچھوں یا شودروں کا سا سلوک کیا جائے۔ تو کیا آپ کو کوئی اعتراض ہو گا؟

جواب۔ جی نہیں۔"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

"سوال۔ اگر ہم پاکستان میں اس شکل کی اسلامی حکومت قائم کر لیں۔ تو کیا آپ ہندوؤں کو اجازت دیں گے۔ کہ وہ اپنے دستور کی بنیاد اپنے مذہب پر رکھیں؟

جواب۔ یقیناً مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ کہ حکومت کے اس نظام میں مسلمانوں سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے۔ ان پر منو کے قوانین کا اطلاق کیا جائے۔ اور انہیں حکومت میں حصہ اور شہریت کے حقوق قطعاً نہ دیئے جائیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اس وقت بھی ہندوستان میں صورت حالات یہی ہے۔"

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری :-

"سوال - ہندوستان میں کتنے کروڑ مسلمان آباد ہیں ؟

جواب - چار کروڑ

سوال - کیا آپ کو اس امر پر اعتراض ہوگا کہ ان پر منُو کے قوانین عائد کئے جائیں جن کے ماتحت انہیں کوئی شہری حق حاصل نہ ہوگا۔ اور ان سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے گا ؟

جواب - میں پاکستان میں ہوں اور ان کو مشورہ نہیں دے سکتا۔"

میاں طفیل محمد (جماعت اسلامی)

"سوال - دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کس قدر ہے ؟

جواب - پچاس کروڑ۔

سوال - اگر آپ کے قول کے مطابق مسلمانانِ عالم کی کل آبادی پچاس کروڑ ہے۔ اور پاکستان سعودی عرب یمن انڈونیشیا۔ مصر۔ ایران۔ شام۔ لبنان۔ شرق اردن۔ ترکی اور عراق کے مسلمانوں کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ نہیں۔ تو کیا آپ کے نظریے کا یہ نتیجہ نہ ہوگا۔ کہ تیس کروڑ مسلمانانِ عالم محض لکڑی کاٹنے اور پانی بھرنے والے بن جائیں گے ؟

جواب - میرے نظریے کا اثر اُن کی حیثیت پر نہ ہونا چاہئے۔

سوال - کیا اُس حالت میں بھی کہ ان سے مذہبی بنا پر غیر مساوی سلوک کیا جائے۔ اور معمولی حقوق شہریت سے بھی محروم کر دیا جائے ؟

جواب - جی ہاں۔"

اس گواہ نے تو یہاں تک کہ دیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم حکومت اپنے ملک کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو اسامیاں پیش بھی کرے۔ تو ان کا فرض ہوگا۔ کہ ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔

غازی سراج الدین منیر :-

"سوال - کیا آپ پاکستان میں اسلامی مملکت کا قیام چاہتے ہیں ؟

جواب - یقیناً۔

سوال - اگر ہمسایہ ملک اپنے سیاسی نظام کو اپنے مذہب پر مبنی قرار دے۔ تو اس پر آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا ؟

جواب - اگر وہ چاہیں۔ تو ایسا کر سکتے ہیں۔

سوال - کیا آپ ان کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں۔ کہ وہ تمام مسلمانانِ ہند کو شودر اور ملیچھ قرار دے دیں۔ اور انہیں کسی قسم کا شہری حق نہ دیں ؟

جواب - ہم انتہائی کوشش کرینگے۔ کہ ایسی حرکت سے پہلے ہی ان کی سیاسی حاکمیت ختم کر دی جائے۔ ہم ہندوستان کے مقابلے میں بہت طاقتور ہیں۔ ہم ضرور اتنے مضبوط ہوں گے۔ کہ ہندوستان کو ایسا کرنے سے روک دیں۔

سوال - کیا تبلیغ اسلام مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں شامل ہے ؟

جواب - جی ہاں -

سوال - کیا مسلمانانِ ہند کا بھی یہ فرض ہے - کہ علی الاعلان اپنے مذہب کی تبلیغ کریں؟

جواب - ان کو اس کا حق حاصل ہونا چاہئے -

سوال - اگر ہندوستانی مملکت مذہبی بنیاد پر قائم کر دی جائے - اور وہ اپنے مسلم باشندوں کو تبلیغ مذہب کے حق سے محروم کر دے - تو کیا ہوگا؟

جواب - اگر ہندوستان کوئی ایسا قانون وضع کرے گا - تو چونکہ میں 'تحریک توسیع' پر ایمان رکھتا ہوں - اس لئے ہندوستان پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لونگا -"

گویا مذہبی وجوہ کی بنا پر امتیازی سلوک کی باہم مساوات کا یہ جواب ہے -

ماسٹر تاج الدین انصاری :-

"سوال - کیا آپ چار کروڑ مسلمانانِ ہند کے لئے بھی وہی نظریہ پسند کرینگے - جو آپ پاکستان کے مسلمانوں کے لئے پیش کر رہے ہیں؟

جواب - وہ نظریہ اختیار کرنے کے بعد تو وہ ایک منٹ کے لئے ہندوستان میں نہ رہ سکیں گے -

سوال - کیا مسلمان کا نظریہ ہر مقام پر اور ہر وقت میں بدلتا رہتا ہے؟

جواب - جی نہیں -

سوال - پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند بھی وہی نظریہ اختیار نہ کریں - جو آپ کا ہے؟

جواب - اس کا جواب اُنہی کو دینا چاہئے -"

ہمارے سامنے جس نظریے کی حمایت کی گئی ہے - اس کو اگر ہندوستان کے مسلمان اختیار کر لیں - تو وہ مملکت کے سرکاری عہدوں سے کاملاً محروم ہو جائیں گے - اور صرف ہندوستان ہی میں نہیں - بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی ان کا یہی حشر ہوگا - جہاں غیر مسلم حکومتیں قائم ہیں مسلمان ہر جگہ دائمی طور پر مشتبہ ہو جائیں گے - اور فوج میں بھرتی نہ کئے جائیں گے - کیونکہ اس نظریے کے مطابق کسی مسلم ملک اور کسی غیر مسلم ملک کے درمیان جنگ ہونے کی صورت میں غیر مسلم ملک کے مسلم سپاہیوں کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو مسلم ملک کا ساتھ دیں - یا اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں - ہم نے اس مسئلے پر دو عالموں سے سوالات کئے - جن کے جوابات درج ذیل ہیں :-

مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت العلمائے پاکستان :-

"سوال - ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی صورت میں مسلمانانِ ہند کا فرض کیا ہوگا؟

جواب - ان کا فرض ظاہر ہے کہ انہیں ہمارا ساتھ دینا چاہئے - اور ہندوستان کی جانب سے ہمارے خلاف نہ لڑنا چاہئے -"

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی :-

"سوال - ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی حالت میں مسلمانانِ ہند کا فرض کیا ہوگا؟

جواب - ان کا فرض ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف نہ لڑیں - اور نہ کوئی ایسا فعل کریں جو پاکستان

کی سلامتی کے لئے مُضر ہو۔"

دوسرے اثرات

اسلامی مملکت کے دوسرے اثرات ونتائج یہ ہوں گے۔ کہ ہر قسم کی سنگ تراشی۔ تاش بازی۔ تصویر کشی۔ انسانوں کی عکسی تصاویر۔ موسیقی۔ رقص۔ مخلوط اداکاری۔ سینما۔ تھیئٹر سب کچھ بند کر دینا ہوگا۔ مولانا عبد الحلیم قاسمی نمائندہ جمعیت العلمائے پاکستان کا قول ملاحظہ ہو:۔

"سوال۔ تشبیہ اور تمثیل کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ آپ مجھ سے کوئی معین سوال کیجئے۔

سوال۔ لہو و لعب کے متعلق آپ کا خیال کیا ہے؟

جواب۔ اس سوال کا جواب بھی وہی ہے۔ جو دے چکا ہوں۔

سوال۔ انسانوں کی تصویر کھینچنے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اگر اس قسم کی تصویر کشی ضروری ہو جائے۔ تو اس کے خلاف کچھ اعتراض نہیں۔

سوال۔ عکسی تصویر (فوٹو گرافی) کے متعلق آپ کا خیال کیا ہے؟

جواب۔ میرا جواب وہی ہے۔ جو تصویر کشی کے متعلق دے چکا ہوں۔

سوال۔ سنگتراشی بحیثیت فن کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب۔ یہ ہمارے مذہب میں ممنوع ہے۔

سوال۔ کیا آپ تاش بازی کو بھی لہو و لعب میں شمار کرتے ہیں؟

جواب۔ جی ہاں۔ یہ لہو و لعب میں شامل ہے۔

سوال۔ رقص و موسیقی کے متعلق کیا خیال ہے؟

جواب۔ یہ ہمارے دین میں ممنوع ہیں۔

سوال۔ ڈراما اور اداکاری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اس کا انحصار اس امر پر ہے۔ کہ آپ کا مطلب کس قسم کی اداکاری سے ہے۔ اگر اس میں بے حیائی اور مرد عورت کا اختلاط لازم ہو۔ تو شرع اسلامی اس کے خلاف ہے۔

سوال۔ اگر مملکت آپ کے نظریات پر مبنی ہو جائے۔ تو کیا آپ کوئی ایسا قانون وضع کریں گے۔ جس کے ماتحت تصویر کشی۔ انسانوں کی فوٹو گرافی۔ سنگتراشی۔ تاش بازی۔ موسیقی۔ رقص۔ اداکاری اور تمام سینما اور تھیئٹر ممنوع قرار پائیں؟

جواب۔ ان تمام مشاغل کی موجودہ صورت کو دیکھ کر تو میرا جواب اثبات میں ہے۔"

مولانا عبد الحامد بدایونی اس امر کو معصیت قرار دیتے ہیں۔ کہ اناٹمی کے پروفیسر طلبہ کو تشریح اعضا کی تعلیم دینے کے لئے مسلموں کی نعشوں پر عمل جراحی کریں۔

فوجی سپاہی اور پولیس کے سپاہی کو حق حاصل ہوگا کہ مذہبی وجوہ کی بنا پر اپنے حاکم اعلیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی کرے۔ اس پر مولانا ابو الحسنات کا خیال حسب ذیل ہے:۔

"میرا ایمان ہے کہ اگر کسی پولیس مین کو کسی ایسے فعل کا حکم دیا جائے جس کو ہم اپنے مذہب کے خلاف سمجھیں۔ تو پولیس مین کا فرض ہوگا کہ حاکم کے حکم کو نہ مانے۔ اگر 'پولیس' کی جگہ 'فوج' کا لفظ رکھ دیا جائے۔ جب بھی میرا جواب یہی ہوگا۔

سوال۔ کل آپ نے بیان کیا تھا کہ اگر کوئی حاکم اعلیٰ پولیس یا فوج کے کسی سپاہی کو ایسے فعل کا حکم دے جو آپ کے نزدیک مذہب کے خلاف ہو۔ تو پولیس یا فوج کے اس سپاہی کا فرض ہوگا کہ اس حاکم کا حکم ماننے سے انکار کردے۔ کیا آپ پولیس یا فوج کے سپاہی کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ خود ہی ایسے حکم کے متعلق فیصلہ کرلے۔ کہ وہ مذہب کے خلاف ہے؟

جواب۔ یقیناً اسے یہ حق ہے۔

سوال۔ فرض کیجئے پاکستان اور کسی دوسرے مسلم ملک کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ اور فوجی سپاہی یہ محسوس کرے کہ پاکستان غلطی پر ہے۔ اور دوسرے ملک کے کسی سپاہی پر گولی چلانا مذہب کے خلاف ہے۔ کیا آپ ایسے سپاہی کو اپنے کمانڈنگ افسر کی نافرمانی میں حق بجانب سمجھیں گے؟

جواب۔ ایسی حالت میں فوجی سپاہی کو چاہئے کہ علماء سے فتوےٰ حاصل کرے"۔

ہم نے اسلامی مملکت کے موضوع پر ذرا طویل بحث کی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم ایسی مملکت کی مخالفت یا حمایت میں کوئی مقالہ ضبط تحریر میں لانا چاہتے تھے۔ بلکہ ہمارا محض یہ مقصد تھا کہ اگر اس نظریاتی ابتری کے صحیح اسباب صریحاً معین نہ کئے گئے جس نے فسادات کی وسعت و شدت میں اضافہ کردیا تھا۔ تو ان بے شمار امکانات کی ایک واضح تصویر سامنے آجائے۔ جو آئندہ واقع ہوسکتے ہیں ظاہر ہے۔ کہ یہ ابتری اور ژولیدگی موجود تھی۔ ورنہ مسلم لیگی جن کی اپنی حکومت برسر اقتدار تھی۔ اس کے خلاف کھڑے نہ ہوجاتے۔ سرکاری ملازموں کے دلوں سے وفاداری اور فرض عامہ کی بجا آوری کی حس رخصت نہ ہوگئی ہوتی۔ اور وہ اپنی ہی حکومت اور اپنے ہی افسروں کے خلاف دیوانوں کی طرح ہاؤہو نہ کرتے پھرتے عام آدمیوں کے دل سے انسانی جان و مال کا احترام غائب نہ ہوگیا ہوتا۔ اور وہ ضمیر کی کسی ملامت یا تامل کے بغیر آزادانہ لوٹ مار میں مصروف نہ ہوجاتے۔ ارباب سیاست اُن لوگوں کا سامنا کرنے سے احتراز نہ کرتے جنہوں نے ان کو عہدوں پر فائز کیا تھا۔ اور نظم حکومت کے ذمہ دار اپنے واضح فرض کی بجا آوری میں تامل اور بے دلی محسوس نہ کرتے۔ ایک بات تو اس تحقیقات میں قطعی طور پر ثابت ہوچکی ہے کہ اگر ایک دفعہ عوام کو یہ یقین دلادیا جائے۔ کہ جو کچھ ان سے کہا جا رہا ہے وہ مذہبی اعتبار سے صحیح ہے یا مذہب نے اس کا حکم دیا ہے۔ تو ان کو ہر عمل پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ جس میں وہ ضبط و نظم۔ وفاداری۔ شائستگی۔ اخلاق اور حس شہریت کے تمام مصالح کو آگ لگا دیں گے۔

عام آدمی پاکستان کو ایک اسلامی مملکت سمجھتا ہے - حالانکہ ایسا نہیں ہے - اس عقیدے کو اس مسلسل چیخ پکار سے تقویت پہنچی ہے - جو اسلام اور اسلامی مملکت کے متعلق قیام پاکستان کے وقت سے اب تک مختلف حلقوں کی طرف سے مچائی جا رہی ہے - اسلامی مملکت کے خواب نے ہر زمانے میں مسلمانوں کو پریشان کیا ہے - اور یہ اس شاندار ماضی کی یاد کا نتیجہ ہے - جب اسلام دنیا کے ایک دور دست گوشے یعنی عرب کے بیابانوں سے طوفان کی طرح اٹھا اور چشم زدن میں دنیا پر چھا گیا - اس نے ان دیوتاؤں کو جو ابتدائے آفرینش سے انسان پر حکومت کر رہے تھے - ان کی مسندوں سے اتار پھینکا - صدیوں کے قدیم ادارات اور اوہام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ ڈالا - اور ان تمام تہذیبوں کا قلع قمع کر دیا - جن کی بنیادیں انسان کی غلامی پر اٹھائی گئی تھیں ایک سو پچیس سال کی مدت انسانی تاریخ میں بلکہ کسی قوم کی تاریخ میں بھی کیا حیثیت رکھتی ہے لیکن اسلام اتنی مدت کے اندر اٹک سے اطلانطک اور سپین تک اور چین کی سرحد سے مصر تک پھیل گیا - اور صحرا کے فرزندوں نے تہذیب و تمدن کے تمام پرانے مرکزوں پر قبضہ کر لیا - مثلاً طیسیفون - دمشق - اسکندریہ - ہندوستان اور ان تمام مقامات پر جو سمیری اور آشوری تہذیبوں سے منسوب و متعلق تھے - مورخین نے اکثر یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر معاویہ کا محاصرہ قسطنطنیہ کامیاب ہو گیا ہوتا - یا اگر جنوبی فرانس اور طورس کے میدانوں میں چارلس مارٹل کے خلاف جنگ کرتے ہوئے عبدالرحمٰن کے مجاہدین میں دفعتہً عربوں کی لوٹ مار کی پرانی جبلت بیدار نہ ہو گئی ہوتی - تو آج دنیا کی حالت کیا ہوتی - شاید مسلمان کولمبس سے بہت پہلے امریکہ کو دریافت کر چکے ہوتے - اور ساری دنیا مسلمان ہو گئی ہوتی - بلکہ شاید خود اسلام یورپ کے سانچے میں ڈھل گیا ہوتا - عرب کے خانہ بدوشوں کی اس شاندار کامیابی کی کوئی مثال اس سے پیشتر دنیا نے نہ دیکھی تھی - اور یہی وہ کامیابی ہے - جس کی یاد کے باعث مسلمان ماضی کے تصورات میں غرق رہتا ہے - اور اس عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کا خواہاں ہے - جو ایک زمانے میں اسلام سے وابستہ تھی - آج مسلمان یاد ماضی کا لبادہ اوڑھے - صدیوں کا بھاری بوجھ اپنی پشت پر لادے - مایوس و مبہوت ایک دوراہے پر کھڑا ہے - اور فیصلہ نہیں کر سکتا - کہ دونوں میں سے کس موڑ کا رُخ کرے - دین کی وہ تازگی اور سادگی جس نے ایک زمانے میں اس کے ذہن کو عزم مصمم اور اس کے عضلات کو لچک عطا کی تھی - آج اس کو حاصل نہیں ہے - اس کے پاس نہ فتوحات حاصل کرنے کے وسائل ہیں - نہ اہلیت ہے - اور نہ ایسے ممالک ہی موجود ہیں - جن کو فتح کیا جا سکے مسلمان بالکل نہیں سمجھتا - کہ جو قوتیں آج اس کے خلاف صف آرا ہیں - وہ ان قوتوں سے بالکل مختلف ہیں - جن سے اُس کو ابتدائے اسلام میں جنگ کرنی پڑی تھی - اور اس کے اپنے آباؤ اجداد ہی کی رہنمائی سے ذہنِ انسانی نے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں - جن کے سمجھنے سے وہ قاصر ہے - لہٰذا وہ اپنے آپ کو عجیب بے بسی کی حالت میں پاتا ہے - اور انتظار کر رہا ہے - کہ کوئی آئے - اور اسے اس بے یقینی اور ژولیدگی کی دلدل سے باہر نکلنے میں مدد دے - لیکن وہ برابر یونہی انتظار کرتا رہے گا - اور اس انتظار کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا - صرف ایک ہی چیز ہے - جو اسلام کو ایک عالمگیر تصور کی حیثیت سے محفوظ رکھ سکتی ہے اور مسلمان کو جو آج ضد و ندامت کا پیکر بنا ہوا ہے - دنیائے حال اور دنیائے مستقبل کا شہری بنا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی نئی تاویل و تشکیل دلیرانہ کی جائے جو زندہ حقائق کو مردہ تصورات سے الگ کر دے -

واضح اور دلیرانہ فکر کا یہی فقدان ہے اور فہم و فیصلہ کی یہی نا اہلیت ہے جس نے پاکستان میں یہ ابتری پھیلا رکھی ہے یہ ابتری برابر جاری رہے گی۔ اور اس قسم کی صورت حالات جس کے متعلق ہم تحقیقات کر رہے ہیں بار بار پیدا ہوتی رہے گی۔ تاوقتیکہ ہمارے لیڈر منزل مقصود کا اور اس تک پہنچنے کے ذرائع کا صاف اور واضح تصور قائم نہ کریں۔ یہ سمجھنے کے لئے کسی خاص تخیل کی ضرورت نہیں کہ نا قابل مصالحت عناصر نا قابل مصالحت ہی رہیں گے۔ خواہ آپ کا یقین یا مقصود اس کے خلاف ہو۔ جو اصول باہم متصادم ہوں۔ اُن کو ان کے حال پر چھوڑ دو گے۔ تو نتیجہ بدنظمی اور ابتری کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اور اگر ان کو بے اثر بنانے کا کوئی نسخہ استعمال کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ مُردہ و بے جان ہوگا۔ جب تک ہمارے لیڈروں میں اس امر کی خواہش اور قابلیت پیدا نہ ہوگی۔ کہ وہ دو نظریوں کے تصادم پر کسی ایک کو منتخب کریں۔ بے یقینی کی حالت برابر قائم رہے گی۔ اگر ہم جہاں ریتی کی ضرورت ہے۔ وہاں ہتھوڑا استعمال کرنا چاہیں گے۔ اور اسلام سے اُن عقدوں کے حل کرنے کی توقع رکھیں گے۔ جن کو حل کرنا اس کا کبھی مقصود نہ تھا۔ مایوسی۔ نامرادی اور دل شکستگی برابر ہمارے شامل حال رہے گی۔ وہ مقدس دین جس کا نام اسلام ہے۔ برابر زندہ رہے گا خواہ ہمارے لیڈر اس کو نافذ کرنے کے لئے موجود نہ بھی ہوں۔ دینِ اسلام فرد میں۔ اس کی روح اور اس کے نقطۂ نگاہ میں اور مہد سے لحد تک خدا اور بندوں کے ساتھ تعلقات میں زندہ ہے۔ اور زندہ رہے گا۔ اور ہمارے اربابِ سیاست کو خوب سمجھ لینا چاہئے۔ کہ اگر احکام الٰہی ایک انسان کو مسلمان نہیں رکھ سکتے۔ تو ان کے قوانین یہ کام انجام نہیں دے سکتے۔

مطالبات کے متعلق خواجہ ناظم الدین کا ردِ عمل

ہم اس رپورٹ کے سابقہ حصوں میں بیان کر چکے ہیں۔ کہ احمدیوں کے متعلق تین مطالبات کیونکر وضع کئے گئے۔ اور پھر "ڈائرکٹ ایکشن" کی دھمکی کے ساتھ خواجہ ناظم الدین کے سامنے کیونکر پیش کئے گئے۔ چونکہ خواجہ ناظم الدین نے علما کے ساتھ اکثر طویل گفتگوئیں کی ہیں۔ اس لئے سمجھ لینا چاہئے۔ کہ دینی نقطۂ نگاہ سے ان مطالبات کی صحت اور ان کے جواز کے مسئلے پر بھی ضرور بحث ہوئی ہوگی۔ خواجہ ناظم الدین ایک راسخ العقیدہ مذہبی آدمی ہیں۔ انہوں نے ان مطالبات کو بے تکلف مسترد نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ان کی معقولیت سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا ہوگا۔ کہ مطالبات تو محض "فانے کا پتلا سرا" ہیں۔ جو ٹھونکا جا رہا ہے۔ اور اگر یہ اصول تسلیم کر لیا گیا۔ کہ ایسے مذہبی مسائل کے متعلق بحث و فیصلہ مملکت کا کام ہے۔ تو شاید انہیں اور بھی زیادہ دشوار مطالبات کا سامنا کرنا پڑے۔ انہوں نے یہ بھی سوچا ہوگا۔ کہ ان مطالبات کے تسلیم کر لینے سے نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ بین الاقوامی دنیا پر کیا اثرات مترتب ہونگے۔ ان مطالبات کی تہ میں ایک لازمی مفروضہ یہ تھا کہ ایک اسلامی مملکت میں مسلموں اور غیر مسلموں کے حقوق کے درمیان بنیادی فرق ہوگا۔ اور اس قسم کی مملکت کے معمولی فرائض میں یہ فیصلہ کرنا بھی شامل ہوگا۔ کہ فلاں فرد یا فلاں جماعت مسلمان ہے یا نہیں۔ چودھری ظفر اللہ خان اور دوسرے احمدیوں کو جو مملکت کے اہم

سرکاری عہدوں پر فائز ہیں - برطرف کرنے کا مطالبہ ایک اور پیچیدہ مسئلہ پیش کرتا تھا - چودھری ظفراللہ خاں بین الاقوامی دنیا میں نہایت مشہور و محترم شخصیت تھے - ان کی برطرفی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کی وسیع اشاعت ہوتی اور اس پر بین الاقوامی تبصرے کئے جاتے - اور ایسی تصریح شائع کرنا بے انتہا مشکل ہو جاتا جس سے بین الاقوامی شعور مطمئن ہو سکتا - قانون دستور کے ماتحت چودھری ظفراللہ خاں اور دوسرے احمدی عہدہ دار محض مذہبی عقائد کی بنا پر ملازمت سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے تھے - کیونکہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی ۶ - اکتوبر ۱۹۵۰ء ہی میں پاکستان کے شہریوں کے بنیادی حقوق کے متعلق ایک عبوری رپورٹ منظور کر چکی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر مستند شہری مذہب نسل - ذات جنس اور مقام ولادت کے امتیاز کے بغیر مملکت کی ملازمت میں تقرر کا حقدار ہے اور اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ آزادی ضمیر اور اپنے مذہب کے تسلیم، تعمیل اور تبلیغ کا حق ہر شہری کے لئے محفوظ ہے - انجمن اقوام متحدہ (جس کا ممبر پاکستان بھی ہے) کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کے متعلق جو کمیشن مقرر کیا تھا. اس نے انسانی حقوق کے بارے میں بین الاقوامی میثاق کا ایک مسودہ تیار کیا تھا - اس میثاق کی دفعہ ۱۳ کا منشا یہ ہے کہ ہر شخص کو فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق ہوگا جس میں اپنے مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اس مذہب یا عقیدے کو تعلیم، عمل، عبادت اور ادائے رسوم میں ظاہر کرنے کی آزادی بھی شامل ہے - لہذا اگر یہ مطالبات منظور کر لئے جاتے ، تو بین الاقوامی حلقوں میں خاصا اضطراب پیدا ہو جاتا اور بین الاقوامی دنیا کی توجہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کے واقعات کی طرف مبذول کرا دی جاتی - اور مطالبات کی منظوری گویا اس امر کا اعلان عام سمجھی جاتی کہ پاکستان اپنی شہریت کو اُن وجوہ پر مبنی قرار دے رہا ہے جو دوسری قوموں کے مقابلے میں بنیادی طور پر مختلف ہیں - اور غیر مسلم محض اپنے عقائد مذہبی کی بنا پر پاکستان میں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے سے محروم کئے جا رہے ہیں - ہندوستان پاکستان کو رسوا اور بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا - لہذا وہ اس موقع سے بھی ضرور فائدہ اٹھاتا. ہندوستان میں بھی فرقہ وار مسئلہ موجود ہے - وہ یقیناً پاکستان پر اس معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام عائد کرتا جو ۸ - اپریل ۱۹۵۰ء کو حکومت ہند اور حکومت پاکستان کے درمیان قرار پایا تھا - اور جس کے ماتحت دونوں حکومتوں نے اقلیتوں کے افراد کو اس امر کی ضمانت دی تھی کہ ان کو اپنے اپنے ملک کی پبلک زندگی میں حصہ لینے سیاسی اور دوسرے عہدوں پر فائز ہونے اور سول محکموں اور مسلح فوجوں میں ملازمت کرنے کے حقوق اکثریتوں کے افراد کے بالکل مساوی حاصل ہونگے - اور یہ حقوق اس معاہدے میں بنیادی حقوق قرار دئے گئے تھے - اس معاہدے کی تکمیل کے وقت وزیر اعظم پاکستان نے اس قرارداد مقاصد کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی تھی اور کہا تھا کہ اس قرارداد کے رو سے اقلیتوں کو سول کے محکموں اور مسلح فوجوں میں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کی ضمانت حاصل ہے - لیکن اب اسی قرارداد مقاصد کو گویا بطور دلیل قاطع اپنے اس دعوے کی تائید میں

استعمال کر رہے تھے کہ ایک اسلامی مملکت میں مسلم اور غیر مسلم رعایا کے درمیان فرق و امتیاز قرآن و سنت کی ہدایات کے مطابق بنیادی ہے۔ اور قرآن اور سنت کے مطابق احمدیوں کو جو غیر مسلم ہیں کسی اہم عہدے پر فائز ہونے کا حق نہیں۔ ہندوستان کو احمدی مذہب یا احمدیوں سے کوئی غرض نہ تھی نہ ایسے مذہبی جھگڑوں سے کوئی سروکار تھا جن سے وہ بعافیت گزر چکا ہے۔ لیکن وہ مطالبات کی منظوری کے نتائج کو ضرور فوراً محسوس کرتا۔ اور صحیح طور پر یہ مقدمہ پیش کرتا کہ اگر احمدیوں کو مملکت میں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تو ہندوؤں کو (جن سے ہندوستان کو وابستگی ہے) کیونکر دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام متعلقات خواجہ ناظم الدین کے ذہن میں موجود ہوں گے اور انھوں نے اپنے مذہبی عقائد اور ان نتائج کے درمیان جو مطالبات کی منظوری سے رونما ہوتے۔ سخت تکلیف دِہ کشمکش محسوس کی ہوگی۔ لہٰذا انھوں نے علما کے ساتھ اپنے مذاکرات کو اس امید موہوم میں طول دیا کہ وہ لوگ اپنے مطالبات ترک کر دیں گے یا کوئی غیر متوقع واقعہ اس مسئلے کو حل کر دیگا۔ یا عقلِ انسانی اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کر لیگی۔ انہیں اس امر کی ہرگز توقع نہ تھی کہ وہ علما جو اُن کے ساتھ اور ان کے رفقا کے ساتھ اس شرعی مسئلے پر طویل مذاکرات کر چکے ہیں ان کی حکومت کے خلاف ہو جائیں گے اور ایسی حرکت شروع کر دینگے جس کو بغاوت سے کم نہیں سمجھا جا سکتا۔

آخر کار خواجہ ناظم الدین نے مطالبات کو رَد کر دیا۔ اور اس رَد کے وجوہ بھی بیان کئے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے علما کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ ان گرفتاریوں پر مظاہرے ہوئے جلوس نکلے جلسے منعقد کئے گئے اور بدنظمی کی وہ کیفیت پیدا ہوئی جو ہم رپورٹ کے حصہ سوم میں پوری طرح بیان کر چکے ہیں۔ سید فردوش شاہ ڈی ایس پی ۴۔ مارچ کی شام کو مسجد وزیر خاں کے اندر یا دروازے کے عین باہر قتل کر دیئے گئے۔ جہاں مولانا عبد الستار خاں نیازی نے اپنے آپ کو اس شورش کا واحد حاکم و آمر بنا رکھا تھا۔ ۵۔ مارچ کو قتل اور آتش زنی اور لوٹ مار کے واقعات کی اطلاعات آنے لگیں۔ اور پولیس کو اکثر جگہ گولی چلانی پڑی۔ فوج کچھ نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے ساتھ یہ مفاہمت کی گئی تھی کہ اس کا کام صرف سول کی قوت کو مدد دینا ہے۔ وہ صرف پولیس کی معیّت میں رہے گی۔ اور کوئی حرکت بجائے خود نہ کریگی۔ تا آنکہ کسی خاص صورت حالات کی اصلاح اس کے سپرد نہ کر دی جائے۔ بار بار گولی چلانے کے باوجود صورت حالات میں نہ صرف کوئی اصلاح نہ ہوئی بلکہ وہ بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ ۵۔ مارچ کی سہ پہر کو گورنمنٹ ہاؤس میں شہریوں کا جو اجلاس ہوا اس میں کوئی لیڈر۔ کوئی سیاسی آدمی اور کوئی شہری اس پر آمادہ نہ تھا کہ شہریوں سے عقل و ہوش اختیار کرنے کی اپیل پر دستخط کرے۔ سب خوف زدہ تھے کہ ایسا کرنے سے وہ عوام میں نامقبول ہو جائیں گے۔ بلوائی ہجوم نے کوتوالی کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اور ۵۔ مارچ کی شام کو وُزرا و حکام کے اجلاس میں جو فیصلے کئے گئے۔ ان کا مطلب پولیس نے یہ سمجھا کہ گولی چلانا بالکل بند کر دیا جائے۔ لہٰذا بلوائی ہجوم نے کوتوالی کا محاصرہ جاری رکھا۔ اور ۶۔ مارچ کی صبح کو حکومت کی مشینری میں پورے سقوط کے آثار نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ حکومت نے طوائف الملوکی کے آگے کھلم کھلا ہتیار ڈال دینے کا اعلان کر دیا۔ اس دن

صبح کو چیف منسٹر کا بیان محض "میکیا ولیت" کا ایک نمونہ تھا۔ لیکن یہ چال کامیاب نہ ہو سکی۔ صورت حالات بالکل قابو سے باہر ہو گئی۔ اور شہریوں نے محسوس کیا کہ ان کے جان و مال کو سخت خطرہ درپیش ہے۔ اب فوج زیادہ دیر تک انتظار نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے شہر کا چارج لے لیا۔

خلاصہ یہ ہے۔ وہ کوائف جو مارشل لا کے اعلان کا باعث ہوئے حسب ذیل تھے:۔

(۱) نظمِ حکومت کی مشینری کامل طور پر بے اثر ہو گئی۔ سول کی قوت بالکل ناکام ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت پنجاب نے ۶۔ مارچ کو مطالبات کی منظوری کا اعلان کر دیا۔

(۲) فساد و بدنظمی کی وسعت و شدت جس کی وجہ سے قوائے حکومت شل ہو گئے۔

(۳) بدنظمی کی وسعت و شدت براہ راست اس کیفیت کا نتیجہ تھی کہ حکومت کا احترام بالکل غائب ہو گیا تھا۔ مطالبات کو مذہبی شکل دے دی گئی تھی اور عوام میں یہ خیال وسیع پیمانے پر پھیلا دیا گیا تھا کہ احمدی رسول پاک صلعم کے مرتبہ عالی کو کم کر رہے ہیں اور اسلام کے ایک بنیادی عقیدے کو مضرت پہنچا رہے ہیں۔

(۴) کوئی شخص ان مطالبات کے نتائج و عواقب کا اندازہ نہ کرتا تھا اور اگر کسی کو ان کا اندازہ بھی تھا تو وہ ان کا اظہار عوام کے سامنے کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا کہ مبادا غیر ہردلعزیز ہو جائے یا سیاسی حمایت کھو بیٹھے۔

(۵) یہ مطالبات بظاہر بہت معقول صورت میں پیش کئے گئے اور چونکہ ہر ایسی بات پر شدید زور دیا جاتا تھا جو کسی اعتبار سے اسلام یا اسلامی مملکت کے ساتھ بعید سے بعید تعلق بھی رکھتی ہو۔ لہٰذا کوئی شخص ان مطالبات کی مخالفت کا حوصلہ نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ خود مرکزی حکومت نے بھی جس کے سامنے یہ تحریک کئی مہینے سے مع اپنے متعلقات و نتائج کے ظاہر تھی۔ اس موضوع پر ایک اعلانِ عام بھی جاری نہ کیا +

حصّہ پنجم

فسادات کی ذمہ داری

ذمہ داری

جو کوائف فسادات کا موجب ہوئے ان کو معلوم کرنے کے بعد اب ہم اُن کی ذمہ داری عائد کرنے کے مسئلے پر گفتگو کریں گے۔ اس سلسلے میں پہلے ان جماعتوں کے خیالات و آرا کو بیان کرنا ضروری ہے جنہوں نے ہماری تحقیقاتی کارروائی میں حصہ لیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پنجاب اور مسلم لیگ نے اس موضوع پر اپنے کوئی خیالات قائم ہی نہیں کئے۔ اول الذکر نے صرف چند سطروں کا ایک تحریری بیان دینے پر اکتفا کیا جس کا منشا یہ تھا کہ اس معاملے کے متعلق چونکہ حکومت پنجاب نے کوئی تحقیقات نہیں کی اور اب اس پورے معاملے کی تفتیش کی غرض سے ایک تحقیقاتی عدالت مقرر ہو گئی ہے۔ اس لئے حکومت اس تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنے کوئی خیالات پیش نہیں کرے گی۔ لیکن ہر قسم کا ضروری مواد عدالت کو مہیا کر کے اس کی امداد کرے گی۔ مسٹر فضل الٰہی نے بحیثیت مُشیر عدالت ہمارے سامنے بحث کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ پیش کردہ شہادت کی بنا پر یہ امر ثابت شدہ قرار دینا چاہیئے کہ فسادات کی ذمہ داری حکومت پنجاب اور مسلم لیگ پر عاید ہوتی ہے۔ مسلم لیگ نے یہی کافی سمجھا کہ اپنی بعض منظور کردہ قراردادوں کی نقول عدالت کی معلومات کے لئے بھیج دے اور اس امر کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہ کی کہ وہ کوائف کیا تھے جو فسادات کا موجب ہوئے اور کون کون سے افراد و گروہ ان فسادات کے ذمہ دار ہیں۔

صدر انجمن احمدیہ ربوہ نے اپنے تحریری بیان میں فسادات کی ذمہ داری احرار۔ جماعت اسلامی۔ عُلما اور صوبائی و مرکزی حکومتوں پر عاید کی ہے۔ انجمن نے احرار کے خلاف یہ الزام عائد کیا ہے کہ انہوں نے اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو عوام میں بحال کرنے کی غرض سے ایک مذہبی مسئلے کو استعمال کیا۔ اسی قسم کے مقاصد جماعت اسلامی سے وابستہ کئے گئے ہیں اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اسلامی مملکت پر جو اصرار کیا۔ اس سے ان کا مدعا یہ تھا کہ مملکت میں سب سے اونچا مقام حاصل کریں اور اسی غرض سے جماعت اسلامی نے احرار اور دوسرے علماء کے ساتھ اشتراک عمل کیا تھا۔ اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آئندہ دستور پاکستان کے متعلق جماعت اسلامی کے آٹھ مطالبات میں اس نویں مطالبے کا اضافہ کہ احمدیوں کو دستور ہی میں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ کسی مذہبی ضرورت سے نہیں بلکہ محض سیاسی غرض سے کیا گیا تھا۔ یہی نیت علماء کی بتائی گئی ہے جنہوں نے احمدیوں کے خلاف

مہم میں احراریوں کی ہم آہنگی اختیار کی۔ بیان کیا گیا ہے کہ علماء کا مقصد بھی جماعت اسلامی کی طرح بالکل یہی تھا کہ آیندہ دستور کے مذہبی پہلو پر اصرار کر کے سیاسی قوت واقتدار حاصل کریں۔ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے خلاف بھی یہی الزام عاید کیا گیا ہے کہ شدید پروپیگنڈا کی وجہ سے جو طوفان عرصۂ دراز سے پرورش پا رہا تھا اس کی طرف سے ان حکومتوں نے بے پروائی اختیار کئے رکھی اور اس کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو چیف منسٹر نے یہ اعلان کیا کہ حکومت پنجاب مطالبات کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور ایک صوبائی وزیر کو مرکزی حکومت کے سامنے پنجاب کا نقطۂ نگاہ پیش کرنے کے لئے کراچی روانہ کر رہی ہے۔ تو اس اعلان کی وجہ سے قانون و انتظام بالکل ختم ہو گئے اور احمدیوں کے خلاف انتہائی دہشت کا دور شروع ہو گیا۔ اس بیان کے ثبوت میں قتل۔ لوٹ مار اور آتش زنی کے متعدد واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو لاہور میں اس اعلان کے بعد پیش آئے احراریوں کی رائے میں فسادات کی ذمہ داری اولاً تو بعض غیر ملکی طاقتوں پر عاید ہوتی ہے جو پاکستان کی حکمت عملی کو اپنے مفادات کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہیں۔ اس سلسلے میں برطانیہ عظمیٰ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ زمانہ ماضی میں ان کی پالیسی مسلمانوں کے متعلق مخالفانہ رہی ہے۔ اور انہوں نے چودھری ظفر اللہ خان کو اس مقصد کے لئے اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ دوسرا فریق جس کو احرار نے فسادات کا ذمہ دار قرار دیا ہے وہ قادیانی ہیں خصوصاً مرزا بشیرالدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ اور چودھری ظفر اللہ خاں۔ تیسرا فریق جو موردِ الزام ہے وہ خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان اور ان کے رفقا ہیں۔ جن کی کمزوری اور قوتِ فیصلہ کے فقدان نے ایسی فضا پیدا کر دی جو فسادات کے لئے بہت موافق تھی۔ اس الزام کا چوتھا نشانہ صوبائی حکومت اور اس کے حکام ہیں جنہوں نے قوت کے بیش از بیش استعمال سے عوام کو مشتعل کر دیا۔

مجلس عمل پنجاب کے تحریری بیانات کے مطابق فسادات کا تعلق ذیل کے وجوہ سے ہے۔ اوّل۔ احمدی تحریک اور احمدیوں کا اشتعال انگیز رویہ۔ دوم۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے احمدیوں کے ساتھ ترجیحی سلوک سوم۔ احمدی مسئلے کا بروقت حل تلاش کرنے میں ان دونوں حکومتوں کی ناکامی۔ چہارم عوام کے پُرامن اور آئینی مظاہروں کو فرو کرنے کے لئے بہت زیادہ قوت کا استعمال اور افسروں کا اشتعال انگیز رویہ۔ پنجم۔ بعض احمدی افراد اور احمدیوں کی منظم ٹولیاں جو جان بوجھ کر تشدد میں مصروف ہو گئیں۔ تاکہ حکومت کو تحریک تحفظ ختم نبوت کے کچلنے کا بہانہ مل جائے۔ ششم۔ معاشرے کے وہ بدمعاش عناصر جنہوں نے اپنے مکروہ اغراض کی وجہ سے لاقانونی کی فضا پیدا کر دی۔

جماعت اسلامی نے اپنے تحریری بیان میں فسادات کی ذمہ داری اولاً خود احمدیوں پر اور ثانیاً مرکزی اور صوبائی دونوں حکومتوں پر عاید کی ہے۔ احمدیوں کے خلاف الزام ثابت کرنے کی کوشش میں جماعت نے مختصر لیکن مکمل طور پر ذیل کے امور کا حوالہ دیا ہے: احمدیوں کے مخصوص عقاید۔ جماعت احمدیہ کے بانی اور ان کے پیرووں کی تحریریں اور تقریریں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ بے حد اشتعال انگیز اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والی ہیں احمدیوں کی انقطاع پسندانہ اور غیر وفادارانہ سرگرمیاں اور اس امر کی مسلسل کوشش کہ عام ملتِ مسلمہ میں سے ایک علیحدہ اور منظم جماعت کو الگ کر لیا جائے۔ جو ملت سے کوئی وجہ اشتراک نہ رکھتی ہو اور فی الحقیقت ملت کے اتحاد کے لئے

خطرہ بن جائے ۔ حکومت کے خلاف یہ الزام ہے کہ اس نے اس معاملے میں کمزور ۔ غیر دانشمندانہ اور متزلزل سی پالیسی اختیار کئے رکھی جس سے نہ صرف عوام بلکہ حکام میں سخت پریشانی اور ابتری پیدا ہوئی ۔ حکومت پر یہ الزام بھی عاید کیا گیا ہے کہ اس نے کئی مہینے تک پریس اور پلیٹ فارم پر مطالبات کی حمایت میں ایک تیز و تند شورش کو روا رکھا ۔ حالانکہ وہ مطالبات ایک طرف تمام مسلمانوں اور دوسری طرف احمدیوں کے درمیان ایک صاف اور واضح مناقشے کی صورت اختیار کر چکے تھے ۔ اگرچہ علماء نے جن میں امیر جماعت اسلامی بھی شامل تھے ۔ حکومت کو اس نازک صورتِ حالات کا احساس دلانے کی انتہائی کوشش کی ۔ جس کا لاوا بالکل پھٹنے کے قریب پہنچ چکا تھا ۔ لیکن حکومت برابر تغافل اور عدمِ فیصلہ کی پالیسی پر قائم رہی ۔ اور یہ نہ محسوس کیا کہ یہ مطالبات تمام مسلمانوں کے متفقہ مطالبات ہیں اور جب حکومت نے دفعتہً قلابازی لگائی اور ۲۷ فروری کو کراچی میں علماء کی گرفتاری کا حکم دے دیا ۔ پھر وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کی پالیسی اختیار کی ۔ اور دفعہ ۱۴۴ اور بیش از بیش قوت کا استعمال کیا ۔ تو یہ امور فسادات میں "قطعاً" اضافے کا باعث ہوئے ۔ جماعت اپنے آپ کو "ڈائرکٹ ایکشن" سے بالکل بری اور بے تعلق ظاہر کرتی ہے ۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے کبھی اس طرزِ عمل کی تائید نہیں کی ۔ اور اس اصول پر مُصر ہے کہ ایک جمہوری ملک میں جب کوئی عمومی مطالبہ اتنی اہمیت اختیار کر جائے جتنی موجودہ حالت میں احمدیوں کے خلاف تحریک نے اختیار کر لی تھی تو اس کے ما لہٗ و ما علیہ پر غور کر کے اس کا سامنا کرنا اور کسی فیصلے پر پہنچنا اشد ضروری ہے ۔

مسٹر دولتانہ نے مرکزی وزارت کی جانب سے مندرجہ ذیل وجوہ کو اس صورت حالات کا ذمہ دار قرار دیا ۔

(۱) مسلمانوں میں احمدیوں کی مخالفت کا قدیم جذبہ ۔

(۲) خود احمدیوں کا کوتاہ نظرانہ رویّہ ۔ جنہوں نے دوسرے مسلمانوں سے اپنے اختلافات کو کم کرنے کے بجائے اُن کا اعلان عام کیا اور اُن پر مُصر رہے ؛

(۳) پاکستان کے قومی نظریے کی مبہم مذہبی اساس جس پر موقع بے موقع زور دینے کی وجہ سے مُلّائیت کو تقویت پہنچی اور سیاسی اصولوں کے متعلق مُلّا کے طرزِ عمل کو مقبولیت حاصل ہوئی ۔

(۴) ۔ احراریوں کی طرف سے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے ایک خطرناک صورت حالات کا استعمال ۔

(۵) ۔ شورش میں علماء کے عام گروہ کی شرکت ؛

(۶) فسادات کے پھوٹ پڑنے کے بعد شوریدہ سروں ۔ پیشہ ور بدمعاشوں اور اسی قسم کے دوسرے عناصر کی سرگرمیاں ؛

(۷) مرکزی حکومت کی قیادت جو لوگوں کی رہنمائی کرنے میں ناکام رہی ۔

مسٹر دولتانہ نے فسادات کے ضمنی وجوہ میں ان چیزوں کو بھی بیان کیا ہے معاشرے کے تمام حصوں میں گہری بے اطمینانی ۔ معاشی حالات کی روز افزوں اور سریع خرابی ۔۔ خوراک کی بہم رسانی میں خلل ۔ قومی مسائل مثلاً "کشمیر جوناگڑھ اور ہندوستان سے تعلقات کا شاخسانہ ۔ دستوری مسائل کے متعلق رویّہ حکومت کی آئندہ شکل کے معین کرنے میں تاخیر ۔ حکومت کے نظم و نسق کے خلاف شکایات ۔ لیڈروں پر اعتماد کا فقدان اور ہر حلقے میں عام دل شکستگی اور بے حوصلگی ۔ لاہور اور بیرونجات کے جن افسروں نے تحریری بیانات داخل کئے ہیں ان میں سے اکثر نے احرار کو اور

ان مُلاؤں کو مورِدِ الزام قرار دیا ہے جو شورش کی آگ کو ہوا دینے کے لئے احراریوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ بعض حکام نے مرکزی حکومت کے تغافل پر بھی تبصرہ کیا ہے جس نے عوام کی بروقت اور صحیح رہنمائی نہ کی۔ چند افسروں نے احمدیوں کو بھی واقعات کے لئے ذمہ دار قرار دیا ہے۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور

فسادات کی ذمہ داری ابتدأً آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور کے ممبروں پر اور ان بے شمار مذہبی انجمنوں پر عاید ہوتی ہے۔ جن کے ممبر اپنی انجمنوں کے نمائندوں کی حیثیت سے ان کنونشنوں میں شامل ہوئے۔ "ڈائریکٹ ایکشن" اختیار کرنے کی قرارداد آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کے اجلاس منعقدہ ۱۸ ؍ جنوری ۱۹۵۳ء (بمقام کراچی) میں منظور کی گئی اور اس قرارداد پر عمل درآمد کرنے کے لئے ایک مرکزی مجلس عمل مرتب کرنے کا فیصلہ بھی اسی کنونشن میں کیا گیا۔ مجلس عمل کا آئین اسی دن شام کو مکمل کر لیا گیا اور مجلس عمل کے مقرر کئے ہوئے ایک وفد کی وساطت سے ۲۲ ؍ جنوری کو خواجہ ناظم الدین کو یہ الٹی میٹم دے دیا گیا۔ کہ مطالبات کو تسلیم کریں یا اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں۔ اُس وقت تک اس بات کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ مطالبات منظور نہ ہونے کی صورت میں "ایکشن" کی نوعیت کیا ہو گی اور نہ خواجہ ناظم الدین نے الٹی میٹم دینے والے ارکان وفد سے انٹرویو کے دوران میں اس کے متعلق کوئی سوال کیا۔

یہ الٹی میٹم ایک غیر فوجی بغاوت کے نوٹس سے کم نہ تھا اور فیصلہ یہ تھا کہ اگر اس الٹی میٹم کا جواب مجلس عمل کے نزدیک قابل اطمینان نہ ہو تو مجلس اس بغاوت کے آغاز۔ اس کی تنظیم اور اس کی ہدایت کاری کی ذمہ دار ہو گی۔ مجلس کا بیان یہ ہے کہ مطالبات کے مسترد ہونے کی صورت میں جس عمل کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ وہ نہ "ڈائرکٹ ایکشن" تھا۔ نہ "براہِ راست اقدام"۔ بلکہ صرف "راست اقدام" تھا۔ جس سے صرف یہ مقصود تھا کہ مطالبات رد ہونے پر عوامی بے اطمینانی کا کاملاً بے ضرر۔ پُرامن اور آئینی مظاہرہ کیا جائے۔ اس بات کا قصد کبھی نہ تھا کہ یہ مظاہرہ سول بغاوت یا سول نافرمانی کی نوعیت اختیار کرے۔ اور اگر تحریک کے لیڈر جو اقدام کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے تھے گرفتار نہ کر لئے جاتے تو "ڈائریکٹ ایکشن" کا قدرتی نتیجہ فسادات کی صورت میں رونما نہ ہوتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ لیڈروں کی گرفتاری ایک نامناسب اقدام تھا۔ اور اس کے بعد جو احتجاج اور مظاہرے ہوئے وہ براہ راست انہی گرفتاریوں کا نتیجہ تھے۔ اس لئے جو فسادات ان مظاہروں کے بعد ہوئے وہ انہی گرفتاریوں کی وجہ سے ہوئے اور ان کے لئے صوبائی حکومت اور مرکزی حکومت ذمہ وار ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ بالکل ناقابل قبول ہے اگر کسی حکومت کو یہ دھمکی دی جائے کہ اگر اس نے فلاں فلاں مطالبات فلاں تاریخ تک تسلیم نہ کر لئے تو مطالبات کرنے والی جماعت حکومت کے خلاف "ڈائرکٹ ایکشن" کرے گی۔ اور حکومت ان مطالبات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اس قسم کی دھمکی دینے والی جماعت کو گرفتار کر لے اور ان گرفتاریوں کی وجہ سے فسادات برپا ہو جائیں تو اس جماعت کو نہ یہ کہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے اور نہ اس کے لئے یہ کہنا زیبا ہے کہ اگر گرفتاریاں نہ ہوتیں تو فسادات نہ ہوتے۔ "ڈائرکٹ ایکشن" کی دھمکی ایک قائم شدہ حکومت کو دھمکی دینا ہے اور کوئی حکومت جو صحیح معنوں میں حکومت ہو۔ اس قسم کی دھمکی کی طرف سے بے پروا نہیں ہو سکتی۔ سوائے اس حالت کے کہ وہ اس

دھمکی کا سامنا کرنے کی جرأت نہ رکھتی ہو اور ہتھیار ڈال دینے اور اقتدار سے دست بردار ہو جانے پر آمادہ ہو جائے تاہم موجودہ معاملے میں خواجہ ناظم الدین نے جو احمدیوں کے خلاف جذبے کی قوت سے پوری طرح باخبر تھے اور اُن وجوہ کی ظاہری معقولیت سے بھی واقف تھے جن کی بنا پر یہ مطالبات پیش کئے گئے تھے۔ علما سے بحث کرنے اور انہیں وہ مشکلات سمجھانے کی ہر امکانی کوشش کی جو مطالبات کی منظوری میں حائل تھے اور وہ نتائج بھی بتائے جو اس منظوری سے رونما ہونے والے تھے۔ اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین اور بعض علماء کے درمیان بڑی حد تک باہمی مفاہمت اور شاید اشتراک جذبات بھی موجود تھا۔ لیکن نہ خواجہ ناظم الدین اور نہ علما کی مہارت اس عقدے کا کوئی حل تلاش کر سکی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ فروری کو مجلس عمل نے گورنر جنرل اور وزیراعظم کی کوٹھیوں پر رضاکاروں کے دستے بھیجنے کا فیصلہ کر دیا۔ اگرچہ ایک مضبوط اور صاحب عزم حکومت علما کے منصوبہ کردہ طرز عمل کی حماقت و شرارت کو محسوس کرنے کے بعد اس سے پہلے بھی گرفتاریاں کرنے میں حق بجانب ہوتی لیکن اب تو علما کو گرفتار کرنا بالکل ہی ناگزیر ہو گیا۔ اور ان گرفتاریوں کے ساتھ ہی احتجاج۔ مظاہرے اور فسادات شروع ہو گئے۔

اگر گرفتاریاں نہ کی جاتیں جب بھی بدنظمی اور لاقانونی ضرور برپا ہوتی۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے صرف اس تحریک کے علمبردار ہی انکار کر سکتے ہیں۔ وہ تمام لوگ جو اس تحریک سے متعلق یا اس کے ذمہ دار تھے خوب جانتے تھے کہ ایسے نتائج ضرور رونما ہوں گے۔ پنجاب میں جو اس تحریک کا مرکز تھا ہزارہا رضاکار بھرتی ہو چکے تھے اور ان کی تعداد پچاس ہزار کی اُس مقررہ تعداد سے بڑھ چکی تھی جس کے بھرتی کرنے کا ذمہ صاحبزادہ فیض الحسن نے لے رکھا تھا۔ ان رضاکاروں سے حلف ناموں پر دستخط کرائے جا چکے تھے۔ بے اندازہ سرمایہ فراہم کیا جا چکا تھا۔ اور اضلاع کی مجالس عمل اور ان کے ڈکٹیٹروں کی فہرستیں تیار ہو چکی تھیں۔ تاکہ یکے بعد دیگرے گرفتار ہوتے چلے جائیں۔ تحریک کو منظم کرنے والوں کے سامنے ملتان اور کراچی کی نظیریں موجود تھیں۔ اور ان میں سے اکثر خود اس کا تجربہ رکھتے تھے۔ کہ ایسے موقعوں پر کیا ہوا کرتا ہے لیڈروں کی عام تقریروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ اگر حکومت ڈائرکٹ ایکشن کی دھمکی کے آگے سر نہ جھکائے گی تو اس سے کس قدرتی نتیجے کی توقع ہے اور الٹی میٹم دینے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی عوام سے جو اپیلیں کی جاتی تھیں ان میں گولیوں کا اور خون کا۔ رسول پاکؐ کی ناموس پر جانیں قربان کرنے کا۔ کفن کا۔ آگ کا۔ شعلہ ریزی کا اور تقسیم سے پیشتر ہندو مسلم فسادات کے ایام کا نہایت پُر معنی ذکر موجود تھا۔ جن لوگوں نے ان جذبات و حسیات کا اظہار کیا تھا وہ ہم سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ ہم ان کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیں گے کہ انہیں ان واقعات کی توقع نہ تھی جو بعد میں پیش آئے۔ نہ انہیں کبھی ایسے نتائج کا اندیشہ ہوا تھا حالانکہ یہ نتائج اُن کے اپنے افعال سے پیدا ہوئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ رضاکاروں کے دستے چوری چھپے جانے والے تھے تاکہ کوئی ہجوم ان کے ساتھ نہ ہو جائے یہ ایک ایسی صورت ہے جو وہ لوگ ہرگز پیش نہیں کر سکتے جن کی سرگرمیوں کی بنیاد ہی عوامی شورش اور پروپیگنڈا پر تھی۔ اس کی شہادت اس امر سے ملتی ہے کہ نہ صرف ۱۶ سے ۱۸ جنوری تک کراچی میں کنونشن کے جلسے کے وقت بلکہ ڈائرکٹ ایکشن سے پہلے دن کی شام کو بھی لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ اسی شام کو یہ اعلان کیا گیا کہ اگلے دن صبح کو ایک جلسۂ عام ہو گا جس میں حکومت کے ساتھ ہونے والے مذاکرات کا نتیجہ سنایا جائے گا اور اگر وہ مذاکرات ناکام ہوئے تو آئندہ کے لئے اصلی پروگرام کا اعلان کیا جائے گا۔

ہمارے سامنے جو شہادت پیش ہوئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ جب مجلس عمل کے ممبروں نے خواجہ ناظم الدین کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ان کو خوب معلوم تھا کہ اگر مطالبات رد کر دیئے گئے "اور ڈائرکٹ ایکشن" پر عمل درآمد شروع ہو گیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ بڑے پیمانے پر فسادات برپا ہو جائیں گے۔ جن میں آتش زنی۔ خونریزی اور شدید قسم کی عام بدنظمی شامل ہو گی۔ چونکہ واقعات نے بالکل وہی صورت اختیار کی جو متوقع تھی۔ لہذا ان فسادات کی ذمہ داری براہ راست اس مجلس کے ممبروں پر عاید ہوتی ہے اور چونکہ مجلس عمل بہت سی مذہبی انجمنوں اور مذہبی رہناؤں کے کارندے کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ اس لئے جو اشخاص یا گروہ اس کراچی کنونشن کے ممبر تھے۔ جس نے "ڈائرکٹ ایکشن" کی قرارداد منظور کی تھی وہ سب کے سب فسادات اور اس کے نتائج کے ذمہ دار ہیں۔ آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور کے ممبر اس لئے ذمہ دار ہیں کہ انہوں نے "ڈائرکٹ ایکشن" کی قرارداد منظور کی۔ وزیراعظم کو الٹی میٹم دینے کی تائید کی اور ڈائرکٹ ایکشن کے پروگرام کا سارا ساز و سامان فراہم کیا۔ بے شمار مذہبی انجمنوں اور واعظوں کی ذمہ داری کا تعین کرنے میں ہم نے نیابتی مسئولیت کے مسلمہ اصول اور کار فرما اور کارندے کے تعلقات سے متعلقہ قانون پر عمل کیا ہے۔ جو مجالس عمل آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور نے مقرر کی تھیں۔ وہ اپنی اپنی کنونشن کی نمایندہ اور کارندہ تھیں اور جو فعل کسی مجلس نے کیا بشرطیکہ وہ فعل مجلس کے دائرہ اختیار میں تھا اس کی ذمہ داری اس کے کار فرما پر عاید ہوتی ہے۔ کنونشن کے ممبروں نے "ڈائرکٹ ایکشن" کی قرارداد کی منظوری اور اس قرارداد پر عمل درآمد کے لئے مجلس عمل کا تقرر کر کے مجلس کو پورا اختیار دے دیا کہ وہ اس قرارداد کو عمل میں لانے کے ذرائع طے کرے۔ اس اعتبار سے مجلس کے تمام اعمال اس کنونشن کے اعمال تھے۔ جس نے اس کو مقرر کیا تھا۔ لہذا جب تک کنونشن کا کوئی ممبر ڈائرکٹ ایکشن سے اپنی بے تعلقی کا علے الاعلان اظہار نہ کرے وہ "ڈائرکٹ ایکشن" کے طبعی نتائج کا بالکل مجلس ہی کی طرح ذمہ دار ہے :

پارلیمنٹ میں بجٹ پر عام مباحثے کے دوران میں خواجہ ناظم الدین نے بظاہر امر واقعہ کی حیثیت سے یہ بیان کیا کہ مختلف مذہبی انجمنوں کے بعض ممتاز علما نے باوجود اس کے کہ وہ مجالس عمل کے ممبر تھے۔ اور انہوں نے احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مطالبے کی تائید کی تھی۔ "ڈائرکٹ ایکشن" کے پروگرام سے بے تعلقی اختیار کر لی ہے۔ اور اگر اس حقیقت کی کافی وسیع اشاعت کی جاتی تو بعض علما اور مساجد کے بعض امام ہرگز تحریک میں حصہ نہ لیتے۔ لیکن ہمارے روبرو اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ کسی انجمن یا کسی شخص نے جو کراچی یا لاہور کی کنونشن کا ممبر تھا ڈائرکٹ ایکشن کی تحریک سے علے الاعلان بے تعلقی کا اظہار کیا ہو۔ اور اس قسم کے اظہار بے تعلقی کی عدم موجودگی میں یہ سمجھنا ہرگز موزوں نہیں کہ دونوں کنونشنوں میں سے کسی کے ممبر علماء میں سے کسی نے (اور کس نے) اس لائحہ عمل سے اختلاف کیا تھا جس کا فیصلہ مجلس عمل نے کیا تھا۔ اس مجلس عمل نے جو خود انہوں نے اس مقصد سے مقرر کی تھی۔ اور جس کے افعال کی ذمہ داری نہ صرف قانون کے رو سے بلکہ کردار انسانی کے عام اصولوں کے رو سے بھی انہی پر عائد ہوتی ہے :

تعلیمات اسلامی بورڈ کے ممبر

یہ امر بے حد تعجب انگیز ہے کہ تعلیمات اسلامی کا بورڈ بھی جو ایک حکومتی ادارہ ہے۔ اس ڈائرکٹ ایکشن کے کاروبار میں از سر تا پا کود پڑا۔ مولانا سلیمان ندوی (صدر) مولانا ظفر احمد انصاری (سیکرٹری) اور مولانا محمد شفیع ممبر بورڈ ان قراردادوں میں شامل تھے

جو ڈائرکٹ ایکشن اور مجلس عمل کے قیام کے متعلق منظور کی گئی تھیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ تمام حضرات حکومت کے ملازم ہیں اور معقول مشاہرے وصول کر رہے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ علما اپنی ہی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوں اور سب امور کو اپنے ہی معیاروں پر جانچتے ہوں لیکن کوئی ایسا اصول ہم کو کسی نے اب تک نہیں سمجھایا جس کے ماتحت کوئی شخص دیانت داری سے حکومت کا ملازم بھی رہے۔ سرکاری خزانے سے معقول تنخواہ بھی وصول کرے اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسی تحریک میں بھی شامل ہو جو اسی حکومت کے خلاف بغاوت سے کم نہ ہو۔ اگر یہ حضرات قادیانی مسئلے پر اتنے ہی مضطرب تھے تو انہیں اپنی ہی حکومت کے خلاف ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد میں شریک ہونے سے پہلے دیانت دار آدمیوں کی طرح اس حکومت سے تعلق منقطع کر لینا چاہیئے تھا۔ ان میں سے کسی نے علے الاعلان یہ کہنے کی جرات نہ کی کہ وہ ڈائرکٹ ایکشن کے خلاف ہے نہ اس ہنگامے کی مذمت کی جو اس اقدام کے نام پر برپا کیا جا رہا تھا۔ جس حالت میں ایسا کوئی اعلان موجود نہیں وہ بھی کونشن کے دوسرے ممبروں ہی کی طرح فسادات کے ذمہ دار ہیں۔

جماعتِ اسلامی

جماعت اسلامی کی ذمہ داری کے مسئلے پر بحث کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے اغراض و مقاصد اور اس کی سرگرمیوں کے دائرے کا مختصر حال بیان کر دیا جائے۔ جماعت اسلامی تقسیم سے پہلے موجود تھی۔ اس کا صدر مقام پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور میں تھا اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اس کے بانی تھے تقسیم کے بعد مولانا پاکستان چلے آئے اور انہوں نے ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی پاکستان کے لئے ایک نیا آئین وضع کیا۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی اب تک کام کر رہی ہے۔ اور اس کا اپنا علیحدہ آئین ہے۔

جماعت اسلامی کا نظریہ نہایت سادہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کی جائے جس کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ ایک "دینی سیاسی" نظام قائم کیا جائے۔ جس کو جماعت "اسلام" کہتی ہے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے وہ نہ صرف پروپیگنڈا کو ضروری سمجھتی ہے۔ بلکہ آئینی ذرائع سے اور جہاں ممکن ہو۔ وہاں قوت سے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہاں ہے۔ جو حکومت جماعت کے تصور پر مبنی نہ ہو۔ مثلاً جہاں اس کی بنیاد قومیت پر ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک "شیطانی حکومت" اور خود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک "کفر" ہے۔ اور تمام لوگ جو ایسی حکومت میں ملازمت یا کسی دوسری حیثیت سے حصہ لے رہے ہیں یا رضامندی سے اس نظام کی اطاعت کرتے ہیں وہ گنہگار ہیں۔ ہٰذا جماعت مسلم لیگ کے تصور پاکستان کی علی الاعلان مخالف تھی۔ اور جب سے پاکستان قائم ہوا ہے۔ جس کو "ناپاکستان" کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جماعت موجودہ نظام حکومت اور اس کے چلانے والوں کی مخالفت کر رہی ہے۔ ہمارے سامنے جماعت کی جو تحریریں پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک بھی نہیں۔ جس میں مطالبہ پاکستان کی حمایت کا بعید سا اشارہ بھی موجود ہو۔ اس کے برعکس یہ تحریریں جن میں کئی ممکن مفروضے بھی شامل ہیں۔ تمام کی تمام اس شکل کی مخالف ہیں جس میں پاکستان وجود میں آیا اور جس میں اب تک موجود ہے۔ ایک فوجی عدالت میں اس جماعت کے بانی نے یہ بیان کیا کہ مسلح بغاوت کے سوا جماعت کا عقیدہ اور مقصد یہ ہے کہ موجودہ نظام حکومت کو توڑ کر جماعت اسلامی کے تصور

کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔ جماعت کے رئیس کو امیر کہتے ہیں۔ اور اگرچہ اس کی رکنیت محدود ہے۔ جس میں آج کل صرف ۹۹۹ ممبر شامل ہیں۔ لیکن جماعت کی نشرواشاعت کی مشینری خاصی وسیع ہے ٭

ہم کسی موقع پر یہ بیان کر چکے ہیں کہ تین مطالبات مذہب پر مبنی بنائے جاتے ہیں۔ جماعت نے اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس سے انکار نہیں کیا۔ لیکن دونوں نے احمدیوں کو اقلیت قرار دینے اور ان کو کلیدی اسامیوں سے برطرف کرنے کے بہت سے دوسرے وجوہ پر بھی زور دیا ہے۔ ان وجوہ کے اظہار میں گویا یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان مطالبات کا ایک سیاسی و مجلسی پہلو بھی ہے۔ اب اگر یہ خیال درست ہو اور مطالبات کے مذہبی پہلو کو فی الحال نظر انداز کر دیا جائے اور یہ معلوم ہو کہ جماعت ڈائرکٹ ایکشن کے فیصلے میں شریک تھی تو جماعت کا موقف یہ سمجھنا چاہیئے کہ اگر حکومت کسی عوامی مطالبہ کو منظور نہ کرے یا اس پر غور کرنے کو تیار نہ ہو تو تمام آئینی ذرائع کو بالائے طاق رکھ کر حکومت کو سول بغاوت کا الٹی میٹم دے دینا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک اس موقف کو کوئی شائستہ حکومت برداشت نہیں کر سکتی جس کو یقین ہو کہ وہ محض قوت کے بل پر نہیں بلکہ جمہور کی مرضی سے برسر اقتدار ہے۔ اور جب کبھی ایسی حکومت کو ایسی صورت کا سامنا ہو اس کا یہ واضح فرض ہے کہ الٹی میٹم کو رد کر دے اور اس کی دھمکی کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے تمام امکانی وسائل کام میں لائے۔ اگر جماعت اسلامی کے نزدیک ان مطالبات کے وجوہ مجلسی اور سیاسی نوعیت رکھتے تھے۔ تو اس کے لئے واضح راہ عمل یہی تھی کہ وہ آئینی تحریک شروع کرتی۔ دستور ساز اسمبلی کے خیالات تبدیل کرنے کی کوشش کرتی یا آئندہ انتخابات تک انتظار کرتی اور اسی مسئلے پر الیکشن کی جنگ لڑتی۔ موجودہ حالت میں ہمارے تمام معاملات غیر حل شدہ حالت میں ہیں۔ اس حالت میں حکومت کے سینے پر پستول رکھ کر اسے کسی مطالبے کو پورا کرنے یا کوئی خاص طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کرنا نہ صرف غیر آئینی بلکہ صاف طور پر وطن دشمنی کا فعل ہے۔ اور یہ طریقہ صرف وہی جماعت اختیار کر سکتی ہے جو حکومت کی مشکلات میں اضافہ کرنے کی خواہاں ہو۔ اگر یہ مطالبات مذہبی وجوہ پر مبنی قرار دے کر پیش نہ کئے جاتے تو ظاہر ہے کہ کوئی بحران پیدا نہ ہوتا۔ کیونکہ اس حالت میں حکومت ان مطالبات کو پیش کرنے والے فریق سے یہ خواہش ظاہر کرتی کہ وہ اپنے دعوے کو دلائل سے ثابت کرے تاکہ ان لوگوں کے خلاف مناسب اقدام کیا جا سکے جو مملکت کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک مطالبہ یہ تھا کہ احمدیوں کو کلیدی عہدوں سے برطرف کیا جائے۔ اور اس کی بنیاد صرف مذہب پر تھی۔ کیونکہ چوہدری ظفراللہ خاں کے سوا کوئی احمدی کسی کلیدی عہدے پر فائز نہیں ہے اور خود جماعت اسلامی کلیدی عہدے کی یہ تعریف کر چکی ہے۔ کہ وہ عہدہ جس کا کام پالیسی وضع کرنا ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی سے سوال کیا گیا کہ جب احمدیوں کو کلیدی عہدوں سے برطرف کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ان سے کون سے دوسرے عہدے مراد ہیں۔ تو وہ کسی ایسے عہدے کا نام نہ لے سکے جس پر کوئی احمدی فائز ہو۔ اسی طرح اگر چوہدری ظفراللہ خان کی موقوفی کا مطالبہ اس بنا پر کیا جاتا کہ ان کی سرگرمیاں مملکت کے مفاد کے لئے مضر ہیں۔ تو حکومت (ان کے احمدی ہونے کے علاوہ) اس امر کا قطعی ثبوت طلب کرتی کہ وہ بعض ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جن کا علم وزیراعظم کو نہیں ہے۔ اور جن سے مملکت کو ایسا نقصان پہنچ رہا ہے کہ ان کی برطرفی ضروری ہو گئی ہے لہٰذا فسادات کے لئے جماعت کی ذمہ داری کے متعلق واحد سوال یہ ہے کہ آیا دوسری جماعتوں کی طرح جماعت اسلامی بھی اس فیصلے کی حامی تھی۔ کہ اگر حکومت نے ان مطالبات کو جو بعض مذہبی عقائد پر مبنی بتائے جاتے تھے۔ تسلیم نہ کیا تو اس کے خلاف ڈائرکٹ ایکشن

شروع کر دیا جائے گا؟

جماعت اسلامی فسادات کی ذمہ داری قبول کرنے سے اس بنا پر انکار کرتی ہے کہ اس نے ڈائرکٹ ایکشن کی یا ایسے اقدام کے فیصلے کی تعمیل کے لئے کسی پروگرام کی کبھی حمایت نہیں کی۔ مجلس عمل۔ احرار اور احمدی جماعت اسلامی کے اس بیان کی تردید کرتے ہیں۔ لہذا یہ معین کرنا ضروری ہے کہ آیا فسادات کی کوئی ذمہ داری جماعت پر بھی عاید کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ ایک طرف جماعت اسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بیان اور دوسری طرف مجلس احرار اور مجلس عمل کے اظہار کے درمیان جو فرق ہے۔ وہ اس رپورٹ کے ایک سابقہ حصے میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس امر سے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی نے انکار نہیں کیا کہ ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد کراچی میں ۱۸ جنوری کو کنونشن کے ایک جلسے میں منظور کی گئی تھی جس میں مولانا خود موجود تھے۔ اس مجلس میں ایک اور قرارداد بھی منظور کی گئی۔ جس کے ماتحت پندرہ ممبروں کی ایک مجلس عمل مرتب کی گئی جن میں سے آٹھ اسی وقت اتفاق رائے سے نامزد کر دیئے گئے۔ اس مرحلے تک تو جماعت اسلامی اور مجلس عمل اور احرار کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف اس مرحلے سے شروع ہوتا ہے جب اسی دن شام کو مجلس عمل کے ان آٹھ ممبروں کا اجلاس ہوا جو کنونشن میں چنے گئے تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی جماعت کا بیان ہے کہ اس اجلاس کی کوئی اطلاع مولانا مودودی کو نہیں دی گئی۔ حالانکہ وہ کراچی میں موجود تھے۔ اس اجلاس میں نہ مولانا نے اور نہ جماعت اسلامی کے کسی نمائندے نے شرکت کی۔ بلکہ وہ آٹھ ممبر بھی جو صبح منتخب ہوئے تھے سارے کے سارے حاضر نہ ہو سکے۔ سات مزید ممبروں کے شمول کی بھی کوئی اطلاع ہم کو نہیں دی گئی۔ اور یہ سات ممبر شام کے اس اجلاس میں حاضر نہ تھے۔ جس میں خواجہ ناظم الدین کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ لہذا مجلس عمل خواجہ ناظم الدین کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ کرنے کی مجاز نہ تھی۔ اس لئے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی اُن واقعات کے ذمہ دار نہیں ہیں جو الٹی میٹم پیش کرنے کے بعد رونما ہوئے۔ اگرچہ شہادت سے ثابت ہے اور مجلس عمل اور احرار نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ۱۸ جنوری کو کنونشن کے اجلاس میں جو لوگ مجلس عمل کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب مجلس عمل کے اس اجلاس میں شریک نہ تھے جو شام کو منعقد ہوا تھا۔ اور خواجہ ناظم الدین کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ شامل کردہ سات ممبروں کی غیر حاضری میں اور ان کی اطلاع کے بغیر کیا گیا تھا۔ احرار اور نمائندگان مجلس عمل کا یہ دعویٰ ہے کہ مجلس عمل کے اس اجلاس میں جماعت اسلامی کا ایک نمائندہ شامل ہوا تھا۔ اور چونکہ اس نے الٹی میٹم کے فیصلے کو منظور کیا تھا۔ لہذا وہ منظوری جماعت اسلامی کی سمجھنی چاہیئے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ان آٹھ ممبروں میں شامل تھے جو کنونشن میں منتخب کئے گئے تھے اور احرار کے ایک طلب کردہ گواہ سید مظفر علی شمسی کا بیان ہے کہ ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد مجھے حافظ کفایت حسین۔ ماسٹر تاج الدین انصاری مولانا عبدالحامد بدایونی اور خود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھوائی تھی شمسی کا یہ بھی بیان ہے۔ کہ کنونشن میں اس امر کا اعلان کیا گیا تھا۔ کہ مجلس عمل کے آٹھ نامزد ممبروں کا ایک اجلاس شام کے آٹھ بجے دفتر تحریک ختم نبوت میں منعقد ہوگا۔ گواہ نے یہ بھی کہا کہ اسی دن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک دعوت طعام کے موقع پر کہا۔ کہ وہ مجلس عمل کے اجلاس شام میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ کیونکہ انہیں ایک ضروری کام ہے اور یہ بھی بتایا کہ جماعت کی جانب سے مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی و سندھ اس مجلس کے اجلاس میں شریک ہوں گے۔ جب اسی دن شام کے آٹھ بجے دفتر تحریک ختم نبوت میں یہ اجلاس ہوا۔ تو مولانا سلطان احمد اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی جانب سے شریک ہوئے اور انہوں نے کارروائی میں حصہ لیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک الٹی میٹم تیار کرنے اور اسے

خواجہ ناظم الدین کو بھیج دینے کا فیصلہ ہوگیا۔ مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد کا بیان ہے کہ جب شام کے وقت مجلس عمل کے ممبروں کا اجلاس ہوا تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ پیغام بھیجا کہ وہ چونکہ ایک اور کام کی وجہ سے معروف ہیں اس لئے انہوں نے مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی کو ہدایت کی ہے کہ اجلاس میں شریک ہوں۔ چنانچہ جس وقت سات مزید ممبر شامل کئے گئے اور وہ اشخاص بھی منتخب کئے گئے جو خواجہ صاحب کو الٹی میٹم دینے والے تھے۔ اس وقت امیر موصوف اجلاس میں موجود تھے۔ مولانا کا یہ بھی بیان ہے کہ جماعت اسلامی کے اس نمائندے نے نہ تو مجلس عمل کے اجلاس پر آئین کے خلاف ہونے کا کوئی اعتراض کیا نہ اس کے فیصلے کے خلاف کوئی آواز اُٹھائی۔ مولانا سلطان احمد طلب نہیں کئے گئے۔ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مولانا سلطان احمد کو مجلس عمل کے اجلاس میں بھیجا تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس بیان کی بھی تردید کی ہے کہ کسی دعوت طعام کے موقع پر انہوں نے آٹھ ممبروں کے اجلاس میں شامل ہونے سے معذوری ظاہر کی تھی اور اپنی جگہ مولانا سلطان احمد کو اس اجلاس میں شریک ہونے کی ہدایت کی تھی۔ اب ایک طرف مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بیان ہے اور دوسری طرف مولانا ابوالحسنات محمد احمد اور سید مظفر علی شمسی کی شہادت ہے۔ ان دونوں میں جو اختلاف ہے اس کے پیش نظر یہ فیصلہ کرنا قطعی طور پر ناگوار اور کسی قدر مشکل ہے کہ کس بیان کو سچ سمجھا جائے لیکن چونکہ جماعت اسلامی کی ذمہ داری صرف اسی واقعہ پر منحصر نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس پر اپنی کوئی رائے دینے سے احتراز کرتے ہیں

ایک طرف جماعت اسلامی اور دوسری طرف احرار اور مجلس عمل کے درمیان دوسرا اختلاف مولانا سلطان احمد کے اس رویّے سے متعلق ہے جو انہوں نے دفتر تحریک ختم نبوت کراچی میں ۲۶، فروری کو مجلس عمل کے ایک اجلاس میں اختیار کیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بیان ہے کہ اگرچہ انہیں اس اجلاس کی اطلاع موصول ہوگئی تھی لیکن چونکہ وہ بیمار تھے۔ اس لئے انہوں نے ٹیلیفون پر مولانا سلطان احمد کو بعض ہدایات دے دیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء کو ایک مفصل خط بھی لکھ دیا۔ اس ٹیلیفونی پیغام اور خط کا خلاصہ یہ تھا کہ اس اجلاس میں جماعت اسلامی کی طرف سے اس رائے پر زور دیا جائے۔ کہ ڈائریکٹ ایکشن نہ کیا جائے نہ کوئی غیر آئینی قدم اُٹھایا جائے اور اگر یہ تجویز قبول نہ کی جائے تو مولانا سلطان احمد اعلان کر دیں کہ جماعت اسلامی مجلس عمل کی ممبری سے مستعفی ہوتی ہے۔ چونکہ مولانا سلطان احمد طلب نہیں کئے گئے اس لئے ہم نہیں جانتے۔ کہ ان کو یہ خط کب ملا اور انہوں نے مجلس عمل میں کیا خیالات ظاہر کئے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مولانا سلطان احمد کے نام اپنے خط میں یہ لکھا تھا کہ مجھے ۱۸، جنوری کے اجلاس کنونشن کے بعد مجلس عمل کے کسی اجلاس کا علم نہیں۔ مجھے ان عام مظاہروں سے اختلاف ہے جو لاہور میں کئے جا رہے ہیں اور جن سے لوگوں کے دلوں میں یہ توقع پیدا کرنا مقصود ہے کہ ۲۲، فروری کو ایک جنگ عظیم شروع ہونے والی ہے۔ اگر اس توقع کے پیدا ہونے کے بعد کسی جنگ کا اعلان نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تحریک کا مقصد ناکام ہو جائے گا۔ جماعت اسلامی اس مفاہمت کی بنا پر مجلس عمل میں شامل ہوئی تھی کہ ہر جماعت حصول مقصد کے لئے اپنا لائحہ عمل الگ تیار کرے گی اور مجلس عمل کے حکم کے ماتحت یا اس کے بنائے ہوئے کسی پروگرام کی تعمیل میں کام نہ کرے گی جس سے اس کی اپنی حیثیت مدغم ہو جائے۔ مجلس عمل کا یہ رویہ غلط ہے کہ اس نے بطور خاص خواجہ ناظم الدین کے خلاف مظاہروں کا انتظام کیا ہے۔ کیونکہ ایسے طرز عمل سے تحریک کے ساتھ بنگالیوں کی ہمدردی ختم ہو جائے گی۔ اور چوہدری ظفراللہ خاں کی برطرفی کے مطالبے پر اصرار کرنا بھی غلط ہے۔ بڑے پیمانے پر کسی شورش کے برپا کرنے کے لئے فضا سازگار

نہیں ہے۔ کیونکہ اوّل۔ ابھی تعلیم یافتہ طبقے مطالبات کے جواز کے قائل نہیں کئے جا سکے۔ دوم۔ پنجاب اور بہاولپور کے سوا دوسرے صوبوں کو ابھی تک تحریک سے دلچسپی پیدا نہیں ہوئی مجلس عمل نے اپنے لئے جو راہِ عمل تجویز کی ہے اگر اس پر اصرار کیا گیا تو نتیجہ ناکامی ہوگا۔ مولانا سلطان احمد کو چاہیئے کہ مجلس عمل کے ممبروں کے سامنے ان نکات پر زور دیں۔ اور اگر مجلس ان کے خیالات سے متفق نہ ہو۔ تو وہ جماعت کو مجلس عمل سے منقطع کر لیں۔ اگرچہ اس خط میں مولانا سلطان احمد کو جو ہدایات دی گئی تھیں وہ واضح اور قطعی تھیں۔ لیکن ہمارے سامنے اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا نقطہ نگاہ مجلس عمل کے سامنے بیان کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس ہمارے سامنے مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد اور سید مظفر علی شمسی کی یہ شہادت موجود ہے کہ مولانا سلطان احمد نے مجلس کے فیصلے کے خلاف کوئی اختلاف یا نامنظوری کا اظہار نہیں کیا۔ مقدمے کے اس حصے پر مولانا ابوالحسنات کی شہادت درج ذیل ہے:۔

"سوال:۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ مولانا سلطان احمد نے مجلس عمل کی کارروائی میں کیا حصہ لیا تھا؟

جواب:۔ جی ہاں۔

سوال:۔ کیا انہوں نے اس قرارداد سے جو کارروائی میں مندرج ہے کسی اختلاف کا اظہار کیا تھا؟

جواب۔ جی نہیں۔ ہاں ہر شخص متفق تھا:۔

(عدالت سے) مجھے قطعی یقین ہے کہ مولانا سلطان احمد نے مجلس کے فیصلے کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کیا تھا:۔

سوال:۔ کیا مولانا سلطان احمد نے یہ کہا تھا کہ وہ مولانا مودودی کی ٹیلیفونی ہدایات کے ماتحت اجلاس میں حاضر ہوئے ہیں۔ اور جس خط کا مولانا مودودی نے ذکر کیا ہے وہ انہیں اب تک نہیں ملا؟

جواب:۔ جی ہاں۔ یہ صحیح ہے۔

سوال:۔ کیا اس کے بعد مولانا سلطان احمد نے یہ کہا تھا کہ مولانا مودودی کی طرف سے کوئی ہدایات نہ ملنے کی صورت میں وہ مجلس کے فیصلوں کے متعلق کوئی قطعی رویّہ اختیار نہیں کر سکتے؟:۔

جواب:۔ جی نہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا۔

اس سے قبل مولانا مودودی نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے لئے ذاتی طور پر مجلس عمل میں شریک ہونا ضروری نہیں اور وہ کسی دوسرے شخص کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج سکتے ہیں مولانا سلطان احمد نے یہ نہیں کہا کہ جب تک انہیں مولانا مودودی کا وہ خط نہ مل جائے جو آنے والا ہے۔ وہ قرارداد پر کسی قسم کی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ مجھے قطعی طور پر یاد ہے کہ جب میں نے مولانا سلطان احمد سے پوچھا کہ آیا انہیں مجلس کے اجلاس مورخہ ۲۶ میں جماعت اسلامی کی نمائندگی کا پورا اختیار حاصل ہے تو انہوں نے صاف صاف اثبات میں جواب دیا تھا۔

سوال:۔ آپ سے مولانا مودودی نے کب کہا تھا کہ وہ جماعت کی جانب سے اپنا ایک نمائندہ پورے اختیار کے ساتھ بھیجیں گے؟

جواب:۔ میں اس واقعہ کی تاریخ یا مہینا نہیں بتا سکتا:۔"

اس شہادت کی تصدیق سید مظفر علی شمسی کے بیان سے اور (EX.D.E 336) یعنی مجلس عمل کی کارروائی کے ریکارڈ سے ہوتی ہے جس پر خود مولانا سلطان احمد کے دستخط ثبت ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس تحریر میں ممبروں کے دستخط کارروائی کے ریکارڈ کے اُوپر ثبت ہیں۔ لیکن مولانا ابوالحسنات کی شہادت اس نکتہ پر بالکل واضح اور قطعی ہے کہ اس تحریر میں اجلاس کی کارروائی اور اس کے فیصلوں کا اندراج بالکل صحیح ہے۔ اور ان سے مولانا سلطان احمد بالکل متفق تھے۔ لہٰذا ہمیں اس رائے کے قائم کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ کہ ۲۷ ر فروری کی صبح سے گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کی کوٹھیوں پر پکٹنگ کرنے کا فیصلہ مولانا سلطان احمد کو قبول تھا۔ تاہم اس رائے سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اس بیان کی تردید مقصود نہیں۔ کہ مولانا سلطان احمد کو اس قسم کے اقدام میں شریک نہ ہونے کی ہدایات دی گئی تھیں اور مولانا سلطان احمد کی رہنمائی کے لئے تفصیلی ہدایات اس خط میں مرقوم تھیں جو (EX D.E 66) کے طور پر شامل مسل ہے۔ اس مرحلے پر ہم جماعت اسلامی کے ایک بیان کا ذکر کریں گے جس میں اِن کوائف کا اظہار کیا گیا ہے جن میں ۱۶ر جنوری سے ۱۸ر جنوری تک اور ۲۶ر فروری کو کراچی میں کنونشن کے اجلاس ہوئے تھے جماعت اسلامی اس مجلس عمل کی ممبر تھی جس کو آل مسلم پارٹیز کنونشن کے اجلاس لاہور مورخہ ۱۳ر جولائی میں قائم کیا گیا تھا۔ مجلس عمل میں جماعت اسلامی کے دو نمایندے مولانا امین احسن اصلاحی اور ملک نصراللہ خان عزیز تھے۔ بعد میں اصلاحی کی جگہ میاں طفیل محمد مقرر کر دیئے گئے تھے۔ نومبر کے اواخر میں مجلس عمل کا ایک اجلاس ہوا۔ جس میں ملک نصراللہ خان عزیز اور میاں طفیل محمد شریک ہوئے۔ اس میں صاحبزادہ فیض الحسن نے سول نافرمانی کی ایک قرارداد پیش کی جو بعد میں واپس لے لی گئی اور شیخ حسام الدین کی قرارداد منظور کر لی گئی جس کا منشا یہ تھا کہ کراچی میں کنونشن کا اجلاس طلب کیا جائے۔ چنانچہ یہ کنونشن ۱۶ سے ۱۸ر جنوری تک کراچی میں منعقد ہوئی۔ جس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی شریک ہوئے۔ اس کے بعد پنجاب کی مجلس عمل کے اس اجلاس میں جو وسط فروری میں بمقام لاہور منعقد ہوا تھا ملک نصراللہ خان عزیز نے مولانا مودودی کا ایک مکتوب پڑھ کر سنایا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ پنجاب میں مجلس عمل جو کچھ کر رہی ہے وہ اس کی قانوناً مجاز نہیں ہے۔ کیونکہ کراچی کی کنونشن منعقدہ ۱۸ر جنوری میں "راست اقدام" کی کسی شکل کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا مرکزی مجلس عمل کا ایک اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور اسی مطالبہ کی تعمیل میں ۲۶ر فروری کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مولانا سلطان احمد شریک ہوئے۔ اسی اجلاس کے لئے مولانا مودودی نے مولانا سلطان احمد کو ہدایت کی تھی۔ کہ اگر مجلس عمل کوئی غیر دانشمندانہ اور عاجلانہ قدم اُٹھانے پر اصرار کرے تو اپنے آپ کو اور جماعت کو مجلس عمل سے علیحدہ کرلیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ۲۴ر جنوری کو کراچی سے واپس لاہور آئے۔ اور آپ نے موچی دروازے کے باہر ایک جلسۂ عام میں تقریر کی۔ اس تقریر کا مفاد اس رپورٹ کے کسی سابقہ حصے میں بیان کیا جا چکا ہے۔

۱۸ر فروری ۱۹۵۳ء کو میاں طفیل محمد قیم جماعت اسلامی پاکستان نے جماعت کے ارکان اور متفقین کے نام اس مطلب کی ہدایات جاری کیں کہ مجلس عمل ایک ایسی جماعت ہے جس کو آل مسلم پارٹیز کنونشن نے مرتب کیا ہے اور جو انجمنیں مجلس میں شامل ہونے پر رضامند ہوئی ہیں انہوں نے اپنی انفرادیت کو مجلس میں مدغم نہیں کیا۔ لہٰذا جماعت اسلامی کے کسی رکن یا متفق کو مجلس عمل کے حکم سے کسی حلف نامے یا اعلان پر دستخط نہ کرنے چاہئیں۔ یہ امر جماعت کے

ضبط و نظم کے خلاف ہے کہ اس کا کوئی ممبر کسی اور جماعت کے جاری کئے ہوئے حکم کی اطاعت کرے اور اقدام کے کسی پروگرام پر عمل نہ کیا جائے جب تک اس کا فیصلہ مرکزی مجلس عمل میں نہ ہو جائے جو عنقریب منعقد ہونے والی ہے۔ اور احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلانے کی جدوجہد میں کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جو غیر آئینی یا نامناسب ہو اور جس سے بدنظمی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔

جب ۲۷ فروری کو کراچی میں گرفتاریاں کی گئیں تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو ایک بیان جاری کیا جس میں گرفتاریوں کی اور اس پریس نوٹ کی مذمت کی۔ جو حکومت نے گرفتاریوں کو حق بجانب ظاہر کرنے کے لئے جاری کیا تھا مولانا نے اس بیان میں یہ کہا کہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن میں سے کسی کی ذہنیت بھی ایک تھانیدار سے بہتر نہیں۔ یہ گرفتاریاں ایسے اشخاص کا فعل ہیں جو عقل و خرد سے بالکل عاری ہیں۔ اور حکومت کے لئے سیدھا راستہ یہی تھا کہ یا تو مطالبات کو منظور کر لیتی یا عوام کو اس بات کا قائل کرتی کہ ان کے مطالبات حق بجانب نہیں ہیں یا مستعفی ہو جاتی اور حکومت نے جو وسائل اختیار کئے ہیں ان سے مطالبات کو دبایا نہیں جا سکتا۔ اور حکومت نے پریس نوٹ میں یہ بالکل جھوٹ لکھا ہے کہ یہ مطالبات احرار کے وضع کردہ ہیں جو پاکستان کے دشمن ہیں۔ یہ مطالبات مسلمانوں کے متفقہ مطالبات ہیں۔ گو ان مطالبات کو تسلیم کرانے کے ذرائع کے متعلق جماعت اسلامی اور دوسروں کے درمیان اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔

"تسنیم" مورخہ ۲ مارچ ۱۹۵۳ء میں ایک افتتاحیہ لکھا گیا جس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اس بیان کا ایک حصہ دہرایا گیا جو مولانا نے ۲۷ فروری کو حکومت کے پریس نوٹ کے متعلق جاری کیا تھا۔ اور انہی تین متبادل راستوں کا اعادہ کیا گیا جو مولانا نے اس بیان میں حکومت کے لئے تجویز کئے تھے۔ اسی اخبار نے اپنی اشاعت مورخہ ۳ مارچ میں اسی موضوع پر ایک اور مقالہ شائع کیا جس میں ان باتوں کی مذمت کی کہ عام جلسوں میں تقریروں کے دوران میں نامناسب نعرے لگائے جائیں اور جلوسوں میں غنڈا پن ظاہر کیا جائے اور حکومت کے اکابر کے جنازے نکالے جائیں۔ اگرچہ اس مقالے میں ایسی تمام حرکات کی مذمت کی گئی۔ لیکن یہ بھی کہا گیا کہ لوگوں نے یہ طرز عمل خود مسلم لیگ سے سیکھا ہے جس نے ملک خضر حیات خان ٹوانہ کے خلاف اسی قسم کی شورش منظم کی تھی۔ اخبار نے یہ بھی بتایا کہ ایسی حرکات اس مقدس مقصد کے لئے مضرت رساں ہوں گی جس کے لئے عوام جدوجہد کر رہے ہیں۔

پھر ۴ مارچ ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں اس اخبار نے میاں طفیل محمد قیم جماعت کا ایک بیان شائع کیا جس میں لکھا تھا۔ کہ مجھے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مکان اور "تسنیم" کے دفتر پر پکٹنگ ہونے والی ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ تحریک غیر ذمہ دار ہاتھوں میں پڑ چکی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس پکٹنگ کی تجویز کی ہے وہ نہیں جانتے کہ مجلس عمل کے خاتمے سے قبل جماعت اسلامی نے تحریک کے ذمہ دار لیڈروں سے مشورہ کر کے ایک فرض کی بجا آوری اپنے ذمہ لی تھی جس کو وہ برابر ادا کرتی رہے گی۔ اور مولانا اختر علی خاں نے اپنی تقریر میں جماعت اسلامی پر حملہ کیا تھا۔ جس کا جواب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے پاس موجود ہے۔ ان لوگوں پر الزامات عائد کرنا عقل کی بات نہیں جو ایک مشترک مقصد کے حصول کے لئے کام کر رہے ہیں۔ جمہور عوام کو چاہئے کہ افواہوں سے متاثر نہ ہوں اور نادان دوستوں کے اکسانے پر ان لوگوں کو پریشان نہ کریں جو مشترک مقصد کے حصول کے لئے مصروف کار ہیں۔

۵ مارچ کی اشاعت میں "تسنیم" نے اپنے سٹاف رپورٹر کی ایک رپورٹ شائع کی۔ کہ میں نے جماعت کے موقف کی وضاحت کے لئے جماعت اسلامی کے ذمہ دار اشخاص سے ملاقات کی ہے اور ایک شخصیت نے جو جماعت کی جانب سے ترجمانی کا حق رکھتی ہے۔ یہ بیان کیا ہے کہ جماعت کا موقف ۴۔ مارچ کے "تسنیم" میں واضح کر دیا گیا ہے اور ایک شخص مولانا محمد یوسف جو گزشتہ روز مولانا اختر علی خان کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا اور بعد میں رہا کر دیا گیا۔ ایسی حرکات کر رہا ہے جو مشترک مقصد کے لئے نقصان رساں ہیں۔ عوام کو غیر ذمہ دار اشخاص کی پھیلائی ہوئی افواہوں پر یقین نہ کرنا چاہیئے۔ اور جماعت کو وہ کام کرنے کا موقع دینا چاہیئے جو اس نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

چالیس صفحوں کا ایک کتابچہ "قادیانی مسئلہ" ۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو شائع کیا گیا۔ جس میں مولانا مودودی کی اس رائے کی تائید میں کہ احمدی دائرہ اسلام سے خارج ہیں تفصیلی دلائل پیش کئے گئے تھے۔ اس کتابچے میں احمدی لٹریچر سے بے شمار اقتباسات نقل کئے گئے تھے اور کہا گیا تھا کہ پاکستان کی تمام مذہبی انجمنوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ مسلم معاشرے سے اس سرطان (احمدیت) کو کاٹ کر پھینک دیا جائے اور ظفر اللہ خان کو اس کے عہدے سے موقوف کرایا جائے۔ کیونکہ اس کی سرگرمیاں، اس سرطان کی جڑوں کو بیرونی دنیا اور مسلمان ملکوں میں پھیلا رہی ہے۔ کتابچے کے آخر میں محض برسبیل تذکرہ یہ اشارہ بھی کیا گیا تھا کہ مطالبات کو تسلیم کرانے کے لئے عام لوگ جس قسم کے مظاہرے تجویز کر رہے ہیں۔ وہ مناسب نہیں ہیں اور سنجیدہ اور تعلیم یافتہ لوگ ان کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس اشارے کے ساتھ ہی یہ بھی بیان کر دیا تھا کہ لوگوں نے یہ مظاہرے مسلم لیگ کی شورش سے سیکھے ہیں۔ جو اس نے ملک خضر حیات خان ٹوانہ کی وزارت کو توڑنے کے لئے برپا کی تھی اور یہ مظاہرے "مُلّا" نے ایجاد نہیں کئے۔

اسی دن جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے ایک قرارداد منظور کی۔ جس میں یہ اعلان کیا کہ مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کو منوانے کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ اور تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اس کو صحیح خطوط پر چلانا چاہیئے۔ اس قرارداد میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ جمہور کے مطالبات حق بجانب ہیں۔ اگر ان مطالبات کے تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا تو عوام میں لازماً بے اطمینانی اور غیظ و غضب پیدا ہوگا۔ اور ایسے معاملات میں تغافل کی پالیسی سے عوام غیر آئینی ذرائع کو کام میں لانے پر آمادہ ہو جایا کرتے ہیں۔ حکومت کا یہ رویہ غلط ہوگا۔ کہ وہ مطالبات کو قوت سے دبائے۔ اور جب قوت کے استعمال کی وجہ سے لوگ مشتعل ہو جائیں تو ان کے خلاف پولیس اور فوج استعمال کی جائے۔ یہ طرز عمل ملک کو لازماً "خانہ جنگی کی طرف لے جائے گا۔ اس قرارداد میں مولانا مودودی کی اس تقریر کا مقاد بھی درج کیا گیا تھا جو انہوں نے اس دن گورنمنٹ ہاؤس میں کی تھی۔ اس قرارداد میں مولانا کی تقریر کا حوالہ دے کر یہ کہا گیا تھا کہ مولانا نے اس تقریر میں جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ عوامی مطالبات کو رد کر دینے کے بعد حکومت کی طرف سے امن و امان کی اپیل بالکل بے کار ہے۔ اور اگر حکومت عوام کے مطالبات کو قوت کی مدد سے دبانے پر تلی ہوئی ہے تو اس اپیل سے کوئی مفید مقصد حاصل نہ ہوگا۔ اور اگر حکومت چاہتی ہے کہ صورت حالات میں مزید خرابی پیدا نہ ہو تو اس کو چاہیئے کہ مطالبات کو قوت سے دبانے کی کوشش کو ترک کر کے عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرے اور عوام کے نمایندوں سے گفت و شنید شروع کر دے۔ جب تک دلیل کا مقابلہ دلیل سے کرنے کا اصول اختیار نہ کیا جائے گا بدنظمی اور خونریزی کے واقعات برابر جاری رہیں گے۔ اور اگر حکومت کو اس امر میں کوئی شبہ ہو کہ یہ مطالبات عوام کے متفقہ مطالبات ہیں

تو یہ حکومت کا کام ہے کہ اس حقیقت کو معلوم کرنے کا کوئی اور طریقہ تجویز کرے اور اگر تمام معیاروں پر جانچنے کے بعد یہ مطالبات متفقہ ثابت ہوں اور حکومت پھر بھی انہیں تسلیم نہ کرے۔ تو لوگوں کے لئے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ اس قرارداد میں واقعات و حوادث کے متعلق جماعت اسلامی کی رائے بھی ظاہر کی گئی تھی۔ اور کہا گیا تھا کہ امیر جماعت اسلامی نے ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کے بعد سے بار بار تحریک کے علم برداروں کی توجہ ان دو پہلوؤں کی طرف مبذول کرائی ہے۔ کہ (۱) یہ مناقشہ صرف پنجاب تک محدود ہے۔ اور (۲) پنجاب میں بھی تعلیم یافتہ طبقے اس مسئلے کے مذہبی۔ مجلسی اور سیاسی متعلقات و نتائج کا احساس نہیں رکھتے۔ لیکن مجلس عمل کے ممبروں نے ان دو پہلوؤں کا مناسب لحاظ رکھے بغیر ڈائرکٹ ایکشن شروع کر دیا اور جب ڈائرکٹ ایکشن کا آغاز ہوا تو وہ ایسے واقعات فسادات سے داغدار ہو گیا جو اسلامی اخلاق کیلئے باعث توہین تھے اور جن سے ایک مقدس مقصد کی تذلیل ہوئی۔ قرارداد میں تحریک کے مقصد کے ساتھ جماعت اسلامی کی تائید و حمایت کا اعادہ کیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ مقصدِ تحریک کے حصول کے لئے جو طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں ان کی حمایت کرکے جماعت اپنے تمام اصولوں کو قربان نہیں کر سکتی۔ قرارداد میں بیان کیا گیا کہ اس سلسلے میں جماعت کی تین ذمہ داریاں ہیں اوّل۔ مطالبات کو تسلیم کرانے کے لئے موثر طریقے اختیار کرنا دوم۔ تحریک کو حتی الامکان پُرامن راستے پر چلانا۔ اور اس کو شائستگی کی حدود کے اندر رکھنا اور سوم تمام منصف مزاج لوگوں کو ترغیب دینا۔ کہ وہ اس تشدد کو روکنے کی تدابیر معلوم کریں۔ جو ملک کے امن اور اس کی سالمیت کے لئے ایک خطرہ بن رہا ہے۔ اسی پرچے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک اور بیان شائع کیا گیا جس میں انہوں نے دو برقی پیغامات کا ذکر کیا جو انہوں نے وزیراعظم پاکستان کو بھیجے تھے۔ اور اپنی گورنمنٹ ہاؤس والی تقریر کا حوالہ دیا جس کے دوران میں انہوں نے پوری صورت حالات واضح کرنے کے بعد حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ وہ عوام کے خلاف فوج اور پولیس کے استعمال کو روک دے۔ اور مطالبات کی معقولیت کا اندازہ کرنے کی غرض سے مذاکرات شروع کر دئے۔ انہوں نے ریڈیو پر حکومت کی اپیل کے متعلق تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ حکومت نے قانون و انتظام کی بحالی کے لئے صرف اپیل پر اکتفا کیا۔ مطالبات پر غور کرنے کے متعلق ایک لفظ نہ کہا۔ سارا الزام عوام پر عائد کیا اور اپنے آپ کو بالکل بری رکھا:

اب جماعت اسلامی اور اس کے بانی کی سرگرمیوں کے تفصیلی بیان کے بعد جو حقائق جماعت اسلامی نے تسلیم کئے ہیں یا اس کے خلاف ثابت ہو چکے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) جماعت اسلامی پنجاب کی مجلس عمل کی ایک فریق تھی۔

(۲) جماعت اسلامی اس مجلس عمل کی بھی ایک فریق تھی۔ جو آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن نے قائم کی تھی اور جس نے ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد منظور کی تھی۔

(۳) مولانا سلطان احمد نے جو کراچی میں ۲۶ فروری کو مجلس عمل کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔ اپنے آپ کو مجلس عمل کی سرگرمیوں سے منقطع نہیں کیا۔ گورنر جنرل اور وزیراعظم پاکستان کی کوٹھیوں پر رضاکاروں کو بھیجنے کا پروگرام ان کی موجودگی میں طے کیا گیا لیکن انہوں نے اس کے خلاف کوئی احتجاج نہ کیا۔

(۴) شروع سے آخر تک جماعت اسلامی کا ایک نہ ایک نمائندہ کراچی اور لاہور کی مجالس عمل کے

اجلاسوں میں برابر شریک ہوتا رہا۔

(۵)۔ ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد منظور ہونے کی تاریخ سے لے کر فسادات کی پوری شدت تک جماعت اسلامی نے کوئی ایسا اعلانِ عام نہ کیا کہ وہ ڈائرکٹ ایکشن میں شامل نہیں ہے اور ان سرگرمیوں سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتی ہے۔ جو مجلس عمل کے طے کردہ پروگرام کی تعمیل میں جاری تھیں۔

(۶)۔ اس شہادت کے مطابق جس پر شبہ کرنے یا جس کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ۵۔ مارچ کو مولانا مودودی نے گورنمنٹ ہاؤس میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ حکومت اور عوام کے درمیان خانہ جنگی جاری ہے۔ اور جب تک حکومت قوت کے استعمال کو روک کر عوام کے نمائندوں سے مذاکرات شروع نہ کرے۔ امن وامان کی اپیل جاری کرنے کا کوئی موقع نہیں۔ اور

(۷)۔ جماعت اسلامی نے اپنی قرارداد مورخہ ۵۔ مارچ میں اُسی رائے کو دُہرایا جو اُس دن مولانا مودودی نے گورنمنٹ ہاؤس میں ظاہر کی تھی۔

جماعت کو خوب معلوم تھا کہ "ڈائرکٹ ایکشن" کے پروگرام سے نہایت خوفناک قسم کے فسادات رونما ہوں گے کیونکہ مولانا مودودی نے اپنی بعض تقریروں میں جو "تسنیم" میں شائع ہوئیں۔ لفظ "جنگ" استعمال کیا۔ اور ۳۰۔ جنوری کو لاہور میں موچی دروازے کے باہر تقریر کرتے ہوئے ہندو مسلم فسادات کا حوالہ بھی دیا۔

۵۔ مارچ سے پہلے "تسنیم" کی مختلف تحریرات اور جماعت اسلامی کی جاری کردہ ہدایات میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ جماعت "ڈائرکٹ ایکشن" کے پروگرام کی حامی یا مؤید نہیں ہے۔ اس کے برعکس ان تحریروں میں اس حقیقت کا چھپا ہوا اعتراف کیا گیا ہے۔ کہ جماعت اسلامی نے اس معاملے میں ایک خاص ذمہ داری لے لی ہے جس کو پورا کرنے میں وہ اپنی بہترین قابلیت صرف کر دے گی۔ اس سے حافظ خادم حسین کی اس شہادت کی تائید ہوتی ہے کہ جماعت اسلامی اور دوسرے فریقوں کے درمیان تقسیم کار کی کوئی سکیم موجود تھی۔ جس کے قرائن مولانا امین احسن اصلاحی کے اس بیان میں پائے جاتے ہیں کہ جماعت کا پروگرام تقریریں کرنا اور لٹریچر شائع کرنا ہے۔ لہٰذا پھر بھی اگر یہ مان لیا جائے اور ہم یقین کرلیں کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بیان کا یہ حصہ صحیح ہے۔ اور جماعت اسلامی اور دوسرے فریقوں کے درمیان ڈائرکٹ ایکشن کے پروگرام کی تفصیلات کے متعلق اختلافات تھے۔ اور جماعت آئینی ذرائع اختیار کرنے پر مُصر تھی۔ پھر بھی اس امر کی حیثیت مجلس عمل کے ممبروں کے درمیان ایک گھریلو اور داخلی معاملے کی تھی۔ اور اس سے "اُس ڈائرکٹ ایکشن" کے قدرتی نتائج کے متعلق جماعت کی ذمہ داری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جماعت اسلامی ڈائرکٹ ایکشن کے فیصلے میں سنجیدگی سے شامل تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر جماعت نے علی الاعلان اور وضاحت کے ساتھ اپنے آپ کو ڈائرکٹ ایکشن کے پروگرام سے بے تعلق کر لیا ہوتا تو وہ ان واقعات کی ذمہ دار نہ ہوتی جو بعد میں رونما ہوئے۔ لیکن اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ جماعت نے ڈائرکٹ ایکشن سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کیا ہو۔ اس کی نامنظوری ظاہر کی ہو یا اس کی مذمت کی ہو۔ محض جلوسوں کی ترتیب کے انداز کو یا بناوٹی جنازے نکالنے کو یا جلسوں میں تقریروں پر نعرے لگانے کو ناپسند کرنے کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ ڈائرکٹ ایکشن کی مذمت کی گئی تھی یا

ان تدابیر کو نا واجب قرار دیا گیا تھا جو ۲۶ فروری کے اجلاس میں اس اقدام کی تعمیل کے لئے طے ہوئی تھیں۔ اور جب جماعت اسلامی کے لیڈر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے حکومت کی ان سر توڑ کوششوں میں جو وہ ۵ مارچ کو فسادات کے روکنے کے لئے کر رہی تھی کسی قسم کا تعاون پیش نہ کیا تو ہمارے نزدیک جماعت کی ذمہ داری میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا۔ بلکہ اس کے برعکس مولانا نے سرکشانہ رویہ اختیار کیا۔ تمام واقعات کا الزام حکومت پر عائد کیا اور فسادی عناصر کو "تشدد کا شکار" کہہ کر اُن سے عام ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ گورنمنٹ ہاؤس میں انہوں نے جو رویہ اختیار کیا۔ اس کے متعلق جو شہادت پیش ہوئی ہے۔ اس سے ہم یہی اثر قبول کر سکتے ہیں کہ وہ پورے نظام حکومت کے انہدام کی توقع کر رہے تھے۔ اور حکومت کی متوقع پریشانی اور حواس باختگی پر بغلیں بجا رہے تھے۔ اور اگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھ لی جائے کہ جماعتِ اسلامی کا مقصد اقتدار حاصل کرنا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال کے مطابق اللہ کی حاکمیت کے ماتحت مذہبی ادارات کے قیام کا مقصد حاصل کرنے کا موثر ترین ذریعہ یہی ہے تو اس امر میں ذرا بھی شبہ باقی نہیں رہتا۔ کہ جو کچھ ہو رہا تھا اسے جماعت اسلامی کی پوری تائید و حمایت حاصل تھی۔ لہذا ڈائرکٹ ایکشن کی منظوری سے اور اُس پروگرام سے جو مجلس عمل نے کراچی میں ۲۶ فروری کو طے کیا تھا کہ گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کی کوٹھیوں پر رضا کاروں کے دستے بھیجے جائیں۔ اور مولانا ابو الحسنات کو تحریک کا پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا جائے۔ جو طبعی نتائج پیدا ہوئے ان کی ذمہ داری جماعت پر بھی عاید ہوتی ہے۔ تحریک کے لیڈروں کی گرفتاریاں ناگزیر ہو چکی تھیں۔ اور مجلس عمل مورخہ ۲۶ فروری کی کارروائی میں پہلے ڈکٹیٹر کی امکانی گرفتاری کا جو ذکر موجود ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ لیڈروں کو بھی اس معاملے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا۔ جو واقعات گرفتاریوں کے بعد رونما ہوئے وہ چونکہ متوقع تھے۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ عام احتجاجوں اور مظاہروں سے جو صورت حالات پیدا ہوگی اس کی درستی کے لئے حکام کیا تدابیر اختیار کریں گے۔ اس لئے جماعت کی طرف سے یہ دعویٰ بالکل نازیبا ہے کہ سارا الزام حکومت پر عاید ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے ان فسادات کو فرو کرنے کے لئے جو نہایت سرعت سے نہایت تشویش انگیز صورت اختیار کر رہے تھے۔ قوت کا استعمال کیا۔ سید فردوس شاہ کو ۴ مارچ کی شام کو ایک غضبناک ہجوم نے مسجد وزیر خاں کے اندر یا باہر قتل کر دیا۔ یہ بعد میں ہونے والے واقعات کا محض ایک پیش خیمہ تھا۔ لیکن اس حادثے کے بعد بھی جماعت اسلامی نے نہ اظہار تاسف کیا۔ نہ اس وحشیانہ قتل کی مذمت میں ایک لفظ کہا۔ بلکہ اس کے برعکس اس جماعت کے بانی نے آگ اور خون کے اس ہولناک ہنگامے کے درمیان "قادیانی مسئلہ" کا بم پھینک دیا۔ ہمارے نزدیک جماعت کے ذہن کی کیفیت صحیح صحیح یہ تھی کہ اگرچہ وہ اس پروگرام کو جائز نہ سمجھتی تھی جو ڈائرکٹ ایکشن کی قرار داد کی تعمیل کے لئے طے ہوا تھا۔ لیکن وہ شروع سے آخر تک لوگوں کے سامنے اپنے حقیقی خیالات کا دلیرانہ اور دیانتدارانہ اعلان اس خوف کی وجہ سے نہ کر سکی کہ مبادا وہ عوام میں غیر ہر دلعزیز ہو جائے۔ لہذا وہ اپنی ذہنیت اور اپنے رویے کے اعتبار سے کسی دوسری سیاسی شخصیت یا انجمن سے مختلف نہ تھی اور دوسروں ہی کی مانند ہر ایسے اقدام سے خائف تھی۔ جو اسے عوامی تنقید کا نشانہ بنا دے۔

ہمیں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی اس حجت میں کوئی زور نہیں معلوم ہوتا کہ کراچی میں مجلس عمل کا جو اجلاس ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کی شام کو منعقد ہوا تھا وہ بے قاعدہ اور غیر آئینی تھا لہذا اس کے بعد مجلس عمل نے جو کچھ بھی کیا

وہ آئینی اعتبار سے ناجائز تھا۔ اگر یہ معاملہ صرف جماعت اسلامی اور مجلس عمل کے دوسرے فریقوں ہی کے درمیان ہوتا اور عدالت سے یہ مطالبہ کیا جاتا کہ وہ ایسی کارروائی میں جس میں پارٹیوں کے درمیان کسی حق یا کسی ذمہ داری کا تعین ضروری ہو آئین کے اس مسئلے کا فیصلہ کر دے۔ تو ہم غالباً جماعت کی رائے سے اتفاق کرتے۔ لیکن ہمارے سامنے آئینی جواز یا عدم جواز کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جماعت اسلامی اپنا نام مجلس عمل پنجاب اور مرکزی مجلس عمل دونوں میں شامل کرا چکی تھی۔ وہ ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد میں ایک فریق کی حیثیت رکھتی تھی اور مجلس عمل کے اجلاس مورخہ ۲۷ فروری میں جماعت کا نمائندہ اس قرارداد میں شریک تھا کہ رضا کاروں کے دستے بھیجے جائیں۔ اور اقدامات کے اجرا کے لئے ایک ڈکٹیٹر مقرر کیا جائے۔ لہذا موجودہ تحقیقات میں اس نکتے کو کوئی حیثیت حاصل نہیں +

میانوالی کے غلام صدیق۔ اور سرگودہا کے سید احمد شاہ جماعت سے اس وقت خارج کئے گئے جب مارشل لار کے نفاذ پر خاصی مدت گزر چکی تھی۔ لہٰذا اس اخراج سے جماعت کے موقف کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ بہت سے اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں نے جو اطلاعات بصیغہ راز بھیجیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کے ممبروں نے فسادات میں حصہ لیا۔ ڈپٹی کمشنر منٹگمری نے اپنی ڈائری مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء میں ایک شخص سلطان احمد کا ذکر کیا ہے اور اسی ضلع میں جماعت کا ایک اور ممبر محمد حسین تو گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ گوجرانوالہ اور راولپنڈی کے پولیس سپرنٹنڈنٹوں نے بھی اپنی رپورٹوں میں ارکانِ جماعت اسلامی کی ان سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے دورانِ فسادات میں اختیار کی تھیں +

احرار

احراریوں کی ابتدا اور ان کی سرگرمیوں کی پوری کیفیت اس رپورٹ کے کسی سابقہ حصے میں دی جا چکی ہے احراریوں کی پالیسی کا غالب اور بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ کسی کے ماتحت ہو کر کام نہیں کریں گے۔ اسی اصول کے مطابق وہ کانگرس سے علیحدہ ہوئے۔ گو اس کے بعد بھی انہوں نے کانگرس سے ملنے جلنے اور اس کے آگے دُم ہلانے کا رویہ جاری رکھا۔ ان کے اور مسلم لیگ کے درمیان کامل مغایرت تھی اور مسلم لیگ کے پاکستان کو انہوں نے کبھی قبول نہ کیا تھا۔ جس زمانے میں مسلم لیگ قائد اعظم کے زیر قیادت پاکستان کے لئے جدوجہد کر رہی تھی احرار بار بار مسلم لیگ کی ممتاز شخصیتوں کو مغلظات سُنا رہے تھے۔ اور ان پر غیر اسلامی زندگی بسر کرنے کے الزام عاید کر رہے تھے۔ اسلام ان کے لئے ایک حربے کی حیثیت رکھتا تھا۔ جسے وہ کسی سیاسی مخالف کو پریشان کرنے کے لئے جب چاہتے۔ بالائے طاق رکھ دیتے۔ اور جب چاہتے اُٹھا لیتے۔ کانگرس کے ساتھ سابقہ پڑنے کی صورت میں ان کے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا۔ اور وہ نظریۂ قومیت کے پابند تھے۔ لیکن جب وہ لیگ کے خلاف صف آرا ہوئے تو ان کی واحد مصلحت اسلام تھی۔ جس کا اجارہ انہیں خدا کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ ان کے نزدیک لیگ اسلام کی طرف سے محض بے پرواہی نہ تھی بلکہ دشمنِ اسلام تھی۔ ان کے نزدیک

قائداعظم" کافراعظم" تھے۔ اسلامی طرزِ زندگی صرف انہی کو معلوم تھا اور مسلم لیگ کا ہر شخص مذہب سے سخت بیگانہ ہو کر زندگی بسر کر رہا تھا۔ انہوں نے اسلام کو حربہ بنا کر مسلم لیگ کو شکست دینے کی جو کوشش کی۔ وہ احراری لیڈر مولانا مظہر علی اظہر کے بعض اقوال سے واضح ہوتی ہے۔ انہی مولانا سے وہ شعر منسوب کیا جاتا ہے جس میں قائداعظم کو کافراعظم کہا گیا تھا۔ یہ صاحب شیعہ ہیں۔ لیکن انہیں "مدح صحابہ" جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اور لکھنؤ کے شیعہ سنی فسادات کے ایام میں انہوں نے اور ان کے بیٹے نے یہی نعرہ اختیار کیا تھا جس سے ہر شیعہ غضبناک ہو جاتا تھا۔ اور یہ دونوں شیعہ سنی فسادات کی آگ کو بھڑکانے کے لئے لاہور سے لکھنؤ گئے تھے۔ بھاٹی دروازے کے باہر احراریوں کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مظہر علی اظہر نے کہا کہ میں گزشتہ دو تین مہینوں سے مسلم لیگ سے سوال کر رہا ہوں کہ آیا پاکستان میں صحابہ کرام کے ناموں کی عزت کی جائے گی۔ لیکن مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کانگرسی وزارتوں کے صوبوں میں جہاں اب تک انگریز کا راج ہے۔ اور مسلم لیگ کو اقتدار حاصل نہیں۔ لیگ والے صحابہ کا نام احترام کے ساتھ لینے کی اجازت نہیں دیتے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر لیگ برسرِ اقتدار آ گئی تو کیا پھر بھی صورت حالات یہی رہے گی۔ جو آج لکھنؤ میں اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں رونما ہے اور آیا "مدح صحابہ" جرم قرار پائے گی؟ آگے چل کر انہوں نے پوچھا کہ اگر لکھنؤ اور محمود آباد میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے لئے مدحیہ الفاظ زبان پر نہیں لائے جا سکتے تو لیگ کے پاکستان میں کیا حالت ہوگی اور مسلمانوں کو ایسے پاکستان سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے (حوالہ شہباز مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء) نوائے وقت نے اپنی اشاعت مورخہ ۲ نومبر ۱۹۴۵ء میں ایک مکتوب شائع کیا جو انہی صاحب نے ایک اور احراری لیڈر کو لکھا تھا۔ چونکہ اس مکتوب کے اصلی ہونے پر سوال اٹھایا گیا تھا اس لئے ہم نے اس کے متعلق مولانا مظہر علی اظہر کا بیان لیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے قطعی طور پر یاد نہیں ہے کہ میں نے یہ مکتوب لکھا ہو لیکن چونکہ یہ مکتوب لاہور کے ایک ممتاز اخبار میں شائع ہوا اور مولانا نے اس کی کوئی تردید نہیں کی۔ لہٰذا ہمیں یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ خط مولانا ہی کا لکھا ہوا ہے یہ ناممکن ہے کہ مولانا کو جو اس زمانے میں بڑے نامور لیڈر تھے اس مکتوب کے شائع ہونے کی خبر بھی نہ ہوتی۔ چونکہ مولانا نے اس کی تردید نہیں کی اس لئے اس کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے۔ کہ اصل مکتوب نوائے وقت کے قبضے میں موجود تھا۔ اور اگر ضرورت پیش آتی تو اس مکتوب کے لکھنے والے کی شخصیت قطعی طور پر ثابت کر دی جاتی۔ اس مکتوب کا موضوع بھی "مدح صحابہ" ہی ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ مولانا خود شیعہ ہیں۔ اس چٹھی میں مولانا نے لکھا کہ مدح صحابہ کا حربہ مسلم لیگ کے خلاف موثر طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور الیکشنوں کے نتائج خواہ کچھ بھی ہوں اس مسئلے پر مسلم لیگ اور حکومت دونوں کو ہتھیار ڈال دینے پڑیں گے۔ مولانا کے اس طرزِ عمل سے بالکل واضح ہے کہ احرار اور دوسری جماعتیں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے کس قدر آسانی سے مذہب کو استعمال کر لیتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم اسی قسم کی ایک اور کوشش کا ذکر بھی کریں گے جو خود مسلم لیگ نے ۱۹۴۶ء میں قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں بڑے بڑے پیروں اور مشایخوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے کی تھی۔ مسلم لیگ نے عوام کی

حمایت حاصل کرنے کی غرض سے بارہ ممبروں کی ایک مشایخ کمیٹی مقرر کی جن میں سے بعض نہایت عالی مرتبت مذہبی پیشوا تھے۔ مثلاً پیر صاحب مانکی شریف۔ پیر جماعت علی شاہ۔ خواجہ نظام الدین (تونسہ شریف) مخدوم رضا شاہ ملتانی وغیرہم۔ لیکن اس معاملے کا ایک نہایت دلچسپ پہلو یہ ہے کہ خان افتخار حسین خان ممدوٹ۔ سردار شوکت حیات خان۔ ملک فیروز خان نون اور نواب محمد حیات قریشی بھی جو اپنی مذہبیت کے اعتبار سے چنداں مشہور نہ تھے اس کمیٹی میں شامل کر لئے گئے تھے۔ اور انہیں بھی مذہبی القاب دے دیئے گئے تھے:۔ یعنی خان افتخار حسین خان ممدوٹ کو "پیر ممدوٹ شریف" سردار شوکت حیات خان کو "سجادہ نشین واہ شریف" ملک فیروز خان نون کو "دربار سرگودھا شریف" اور نواب محمد حیات قریشی کو "سجادہ نشین سرگودھا شریف" ظاہر کیا گیا۔ اور سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کمیٹی کے سیکرٹری مسٹر ابراہیم علی چشتی کو "فاضل ہند سجادہ نشین پیسہ اخبار شریف" کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اس مشایخ کمیٹی کے تقرر کا واحد مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ صوبے کے اہم سیاسی لیڈروں کو مسلّمہ حیثیت کے مذہبی پیشواؤں میں خلط ملط کر دیا جائے اور انہیں مذہب کے نمائندوں کی حیثیت دے دی جائے: تاکہ موقع آنے پر وہ عوام کو آسانی سے متاثر کر سکیں۔ اور موجودہ شورش ہی کے دوران میں احراری اخبار "آزاد" کے دو پرچوں میں (۷، دسمبر اور ۱۶، دسمبر ۱۹۵۲ء) دو تقریریں درج ہوئی ہیں۔ ایک حافظ قمر الدین سجادہ نشین سیال شریف کی۔ اور دوسری قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی۔ جن میں نہ صرف مذہبی بغاوت کو جائز بلکہ کار ثواب قرار دیا گیا:۔

جہاں تک احراریوں کا تعلق ہے انہوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کا مسلسل استعمال کیا ہے۔ انہوں نے کانگرس کو ترک کیا تو مذہبی وجوہ کی بنا پر کیا۔ اور مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت کی تو وہ بھی مذہبی بنا پر کی۔ مولانا مظہر علی اظہر نے ۱۹، ستمبر ۱۹۴۵ء کو امرتسر میں ایک بیان دیا کہ مسلم لیگ کا نعرۂ پاکستان محض ایک سٹنٹ ہے۔ اور میں نہ مسٹر جناح کو قائد اعظم مانتا ہوں نہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ تسلیم کرتا ہوں۔ کیونکہ مسٹر جناح کی زندگی غیر اسلامی ہے۔ انہوں نے لوگوں سے اپیل کی۔ کہ پاکستان کے نعروں سے گمراہ نہ ہوں۔ اور آئندہ الیکشن میں ان لوگوں کو ووٹ دیں جو جمہور کی خدمت کر رہے ہیں۔ "ملاپ" (لاہور) نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۷، دسمبر ۱۹۴۵ء میں احراری لیڈر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایک تقریر شایع کی جو انہوں نے علی پور کی احرار کانفرنس میں کی تھی۔ اس تقریر میں امیر شریعت نے ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کہ مسلم لیگ کے لیڈر "بے عملوں کی ٹولی" ہیں۔ جنہیں اپنی عاقبت بھی یاد نہیں اور جو دوسروں کی عاقبت بھی خراب کر رہے ہیں۔ اور وہ جس مملکت کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پاکستان نہیں۔ بلکہ خاکستان ہے۔ اسی رہبر محترم نے پسرور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اب تک کسی ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا جو پاکستان کی "پ" بھی بنا سکے (حوالہ استقلال نمبر روزنامہ جدید نظام ۱۹۵۱ء) چودھری افضل حق احراری لیڈر نے مسلم لیگ کے تصور پاکستان کے خلاف بہت سی طنزیہ اور توہین آمیز باتیں کہیں جو خطبات احرار کے صفحات ۸۱-۸۲، ۸۳ اور ۹۹ پر درج ہیں۔ مولوی محمد علی جالندھری نے ۱۵، فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور میں تقریر کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ احرار پاکستان کے مخالف تھے۔ اور ان کے اس عقیدے کی وجہ عنقریب

لوگوں پر ظاہر ہو جائیں گی۔ اس مقرر نے تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد بھی پاکستان کے لئے "پلیدستان" کا لفظ استعمال کیا اور ہمارے سامنے کیپٹن عبدالحیٌ کی جو شہادت پیش ہوئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فسادات کے دوران میں احراری لیڈر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں جو تقریریں کیں ان میں سے ایک تقریر میں انہوں نے کہا۔ کہ پاکستان ایک بازاری عورت ہے جس کو احرار نے مجبوراً قبول کیا ہے ۔

تقسیم کے موقع پر احراری ایک دل شکستہ اور مایوس جماعت کی حیثیت میں پاکستان آئے بعض احراری لیڈر وہیں رہ گئے ۔ اور "زمیندار" مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کی شایع کردہ ایک رپورٹ کے رُو سے آل انڈیا مجلس احرار نے ایک قرارداد منظور کی جس میں قرار دیا گیا کہ آج احراری تنظیم ختم کی جاتی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں کانگرس کے سوا کسی دوسری سیاسی تنظیم کا وجود مناسب نہیں۔ اس قرارداد میں مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ کانگرس میں شامل ہو جائیں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت کو تسلیم کرلیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی آیندہ سرگرمیاں خدمت خلق تک محدود رہیں گی۔ اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنے مذہبی حقوق کی حفاظت کے لئے جمعیتہ العلماء کی تنظیم میں شامل ہو جائیں ۔ پاکستان میں وہ کچھ مدت تک خاموش رہے اور اپنے لئے کوئی نیا نظریہ سوچنے کی کوشش کرتے رہے ۔ انہوں نے بار بار کہا کہ وہ سیاسیات سے دست بردار نہیں ہوئے اور ان کا ارادہ ہے کہ پاکستان میں حزب الاختلاف کی شکل اختیار کریں (حوالہ "آزاد" ۲۶ دسمبر ۱۹۵۰ء و ۲۷ مئی ۱۹۵۲ء اور "تعمیر نو" ۵ دسمبر ۱۹۴۹ء) ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ احراری ایک مدت تک بے حرکت رہنے کے بعد ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے بیدار ہونے لگے تھے ۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ پاکستان میں ان کے پرانے نظریات کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور مسلم لیگ انہیں اُبھرنے کا موقع نہ دے گی۔ تو انہوں نے سیاسی میدان میں مسلم لیگ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ۔ اور اعلان کیا کہ آیندہ وہ تبلیغ میں معروف رہیں گے انہوں نے اس امر کا کوئی اعلان نہ کیا کہ تبلیغ کے میدان میں ان کی سرگرمیوں کا ٹھیک ٹھیک دائرہ کیا ہوگا ۔ لیکن ہمارے سامنے تسلیم کیا گیا ہے کہ احمدیوں کے سوا دوسرے غیر مسلموں کو مسلمان بنانا اُن کے لائحہ عمل میں شامل نہ تھا ۔ اور تبلیغی سرگرمی کو صرف احمدیوں کے خلاف جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا ۔ احمدیوں کے ساتھ احرار کی دشمنی ایک چوتھائی صدی سے چلی آرہی ہے ۔ اور اگرچہ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ تقسیم سے پہلے انہیں احمدیوں سے اور انکے عقیدوں اور ان کی سرگرمیوں سے بہت زیادہ سروکار نہ تھا ۔ لیکن یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اب احراریوں نے احمدیوں کے خلاف نزاع کو اپنے اسلحہ خانے سے ایک سیاسی حربے کے طور پر باہر نکالا اور جو واقعات اس کے بعد پیش آئے وہ اس امر کی بیّن شہادت ہیں کہ وہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے انتہائی فہیم اور چالاک ہیں ۔ انہوں نے سوچا کہ اگر وہ عوام کے جذبات کو احمدیوں کے خلاف برانگیختہ کردیں گے ۔ تو کوئی اُن کی مخالفت کی جرأت نہ کرے گا ۔ اور ان کی اس سرگرمی کی جتنی بھی مخالفت کی جائے گی اسی قدر وہ ہر دلعزیز اور مقبول عام ہو جائیں گے ۔ اور بعد کے واقعات سے ظاہر ہوگیا کہ ان کا یہ مفروضہ بالکل صحیح تھا ۔ لہٰذا انہوں نے اپنی پوری توجہ احمدیوں پر مرتکز کردی اس کے بعد خواہ تبلیغ کانفرنس یا دفاع کانفرنس یا استحکام کانفرنس یا یوم تشکر یا یوم مطالبات کی تقریبات ہوں

یا محض مولشیوں کا میلہ ہو۔ ان کانفرنسوں اور یوموں وغیرہ کے نام محض دھوکا تھے اور ان کا سب سے بڑا موضوع احمدی اور احمدیت ہوتا تھا۔ اگر وہ اس مذہبی نزاع کو دوسرے مذہبی نزاعات کی طرح جاری رکھتے تو غالباً ان کو بہت زیادہ تائید و حمایت حاصل نہ ہوتی۔ لیکن وہ اپنی عیاری کی وجہ سے خوب جانتے تھے کہ مسلمانوں کے جذبات کسی موضوع پر اس قدر آسانی سے اور تیزی و تندی سے برانگیختہ نہیں کئے جا سکتے اور ان کے غیظ و غضب کو بیدار نہیں کیا جا سکتا۔ جس قدر رسول پاک صلعم کی حقیقی یا خیالی توہین پر کئے جا سکتے ہیں۔ لہذا انہوں نے یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ ان کی سرگرمیوں کا مقصد یہ ہے کہ رسول پاک کی نبوت کی حفاظت کی جائے۔ اور آپ کی ناموس پر احمدیوں کے حملوں کا مقابلہ کیا جائے۔ جو اس عقیدے کی اشاعت کرتے ہیں کہ رسول پاک آخری نبی نہیں تھے۔ اور ایک اور نبی پیدا ہو گیا ہے جو رسول پاک کے برابر بلکہ اُن سے بہتر ہونے کا دعویدار ہے۔ یہ چال کامیاب ہو گئی۔ اور حاضرین کی کثیر تعداد ان کے جلسوں میں شریک ہونے لگی۔ اور چونکہ بعض احراری مقرر الفاظ و فقرات کے انتخاب اور تشبیہ و استعارہ کے استعمال میں بڑے ماہر واقع ہوئے ہیں اور اپنی تقریروں میں طنز و ظرافت کے چھینٹے بھی خوب دیتے ہیں۔ (خواہ وہ ظرافت کتنی ہی مبتذل کیوں نہ ہو) لہذا وہ روز بروز مقبول عام ہونے لگے۔ حکومت اس پر بہت پریشان ہوئی۔ اور مسٹر دولتانہ چیف منسٹر نے ان کی سرگرمیوں کے متعلق جو پہلی یادداشت قلمبند کی اس میں یہ بالکل صحیح لکھا کہ احراری اپنے لئے سیاسی مقام حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ یہی رائے مولانا ابوالحسنات کی تھی جو آخر میں "ڈائرکٹ ایکشن" کے پہلے ڈکٹیٹر بن گئے۔ چنانچہ مولانا نے اپنے ایک بیان میں جو "مغربی پاکستان" مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ کہا کہ احرار نے ختم نبوت کی تحریک سیاسی مقصد سے شروع کی ہے۔ اور ہمارا عزم مصمم ہے کہ ہم کسی سیاسی جماعت کو مذہب سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ دیں گے "مغربی پاکستان" نے اپنے ۲ جولائی اور ۴ جولائی ۱۹۵۲ء کے پرچوں میں احرار کی سرگرمیوں پر جو تبصرہ کیا۔ اس کا منشا بھی یہی تھا۔ اور احراریوں کی نیتوں کو مسٹر قربان علی خان انسپکٹر جنرل پولیس سے بہتر کوئی نہ جانتا تھا۔ انہوں نے شروع سے آخر تک بار بار اس نکتے پر زور دیا کہ احراریوں نے جان بوجھ کر ایک ایسا مسئلہ منتخب کیا ہے جس میں کوئی ان کی مخالفت کی جرات نہ کر سکے گا۔ اور وہ اسی مسئلے پر نہایت آسانی سے مسلم لیگ کو بھی شکست دے سکیں گے۔ اس مسئلے کے نتائج و عواقب ملک کے مستقبل اور اس کے استحکام کے متعلق نہایت دور رس اہمیت رکھتے ہیں۔ اور اگرچہ حکومت اس وقت ایک مشکل مسئلے سے دوچار ہے۔ لیکن بہرکیف کسی نہ کسی کو کہیں نہ کہیں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اور ایسے ہی مواقع ہوتے ہیں۔ جن پر کسی ملک کی قیادت کا امتحان ہوتا ہے۔

ہم اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ احراریوں نے اپنی سیاسیات سے دست برداری کا اعلان کر کے مسلم لیگ کی طرف سے مخالفت کے امکان کا سدِّباب کر دیا تھا۔ اس کے بعد مسلم لیگ اور احراریوں کے اتحاد کی وجہ سے مسلم لیگ احراریوں کی سرگرمیوں کی طرف سے بے پروا رہی۔ بلکہ ان کو نظر انداز بھی کرتی رہی۔ لیکن جب انہوں نے ختم نبوت کے مسئلے پر قریب قریب تمام مذہبی انجمنوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تو وہ باہر نکل آئے۔ اور انہوں نے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے احکام کی خلاف ورزی شروع کر دی جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں

نے حکومت کی اعلان کردہ پالیسی کے ماتحت صادر کئے تھے پہلے پہلے تو یہ احکام اُن عام جلسوں پر عاید کئے گئے جن کے انعقاد یا انتظام کی ذمہ داری احرار پر ہوتی تھی۔ لیکن جب احراریوں نے مسجدوں میں جلسے کرنے شروع کر دیئے تو اُن احکام کا اطلاق اُن جلسوں پر بھی کر دیا گیا۔ اس سے غیظ و غضب کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ کیونکہ احراریوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ حکومت نے مسجدوں کے اندر جلسوں میں دخل دینا شروع کر دیا ہے۔ جو مداخلت فی الدین ہے یہ دلیل بہت آسانی سے کامیاب ہو گئی۔ اور اس سابقہ دلیل ہی کی طرح موثر ثابت ہوئی کہ احرار نبوت کے دفاع اور رسولِ پاک صلعم کی حرمت کے لئے لڑ رہے ہیں۔ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی خلاف ورزی زیادہ کی جانے لگی۔ اور خاصی مقبولِ عام ہو گئی۔ اور جب بعض احراری مجرموں کے خلاف اس نافرمانی کی بنا پر مقدمے چلائے گئے۔ تو وہ دفعتہً "شہدا" کا مرتبہ حاصل کر گئے۔ عوام میں بڑے زور شور سے پروپیگنڈا کیا گیا کہ حکومت نہ صرف مسجدوں کو عبادت گاہ کی حیثیت سے اور فرائض مذہبی کی بجا آوری کے لئے استعمال کرنے پر قیود عاید کر رہی ہے بلکہ ان لوگوں پر بیدردانہ مقدمے چلا رہی ہے جن کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ مساجد میں نماز پڑھتے ہیں اور مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان دلائل کا کوئی جواب نہ تھا۔ اور حکومت نے اس مکروہ پراپیگنڈا کو رد کرنے کے لئے کچھ نہ کیا بلکہ صرف ایک مبہم اور مختصر بیان شائع کر دیا کہ حکومت کو کسی کے مذہب میں مداخلت کرنا مقصود نہیں ہے۔ جب احرار نے حکومت کے ساتھ مفاہمت کا ڈھونگ رچایا۔ اور ایک پیمان کر لیا (جس کی اطلاع احرار میں سے صرف انہی کو تھی جنہوں نے وہ پیمان کیا تھا) کہ وہ احمدیوں کو نہ قتل کریں گے نہ لوٹیں گے۔ نہ بے آبرو کریں گے۔ تو حکومت نے جھٹ اس یقین دہانی کو تسلیم کر لیا۔ لہٰذا جن احرار مجرموں کو سزائیں ہو چکی تھیں وہ رہا کر دیئے گئے اور زیر سماعت مقدمے اور دفعہ ۱۴۴ کے احکام واپس لے لئے گئے۔ اس کے بعد احرار نے اپنی روایات کے مطابق اپنی سرگرمیاں زیادہ زور شور سے شروع کر دیں اور چونکہ دفعہ ۱۴۴ کے احکام نافذ ہی نہ تھے جن کی خلاف ورزی کا سوال پیدا ہوتا۔ اس لئے ان کے خلاف کوئی مقدمات دائر نہ ہوئے اور حکام اضلاع نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔

خواجہ ناظم الدین سے گفت و شنید شروع ہوئی۔ اور جنوری کی کراچی کنونشن اور اس کی قائم کردہ مجلس عمل کی طرح یہاں بھی احرار ہی کا غلبہ و تسلط رہا۔ رضاکاروں کی بھرتی اور سرمایے کی فراہمی کا کام تمام تر احرار ہی کر رہے تھے۔ اور جب مولانا اختر علی خاں نے تحفظ ختم نبوت کے نام پر خود روپیہ جمع کرنے کی کوشش کی تو اس پر بہت کم لوگوں نے لبیک کہی۔ لہٰذا سول بغاوت کا سارا سر و سامان احرار ہی کا کیا دھرا تھا۔

آل مسلم پارٹیز کانفرنس بھی احرار ہی کی ساختہ پرداختہ تھی اور اس کی کارروائیوں پر بھی انہی کا غلبہ رہتا تھا۔ مجلس عمل میں ان کو ان کے حصے سے زیادہ نمائندگی حاصل تھی۔ اور مجلس کے بعض ممبر جو دوسری جماعتوں کے نامزد کئے ہوئے تھے وہ بھی اصل میں احراری ہی تھے۔ بالآخر گرفتاری اور قید میں بھی احراریوں کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ پس وہ فسادات کے لئے براہِ راست ذمہ دار تھے۔

احرار کے رویئے کے متعلق ہم نرم الفاظ استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کا طرز عمل بطور خاص مکروہ اور قابلِ نفرین تھا۔ اس لئے کہ انہوں نے ایک دنیاوی مقصد کے لئے ایک مذہبی مسئلے کو استعمال کر کے

اس مسئلے کی توہین کی اور اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کے لئے عوام کے مذہبی جذبات و حسیات سے فائدہ اٹھایا۔ اس بات پر صرف احرار ہی یقین رکھ سکتے ہیں۔ کہ وہ اپنے اعمال میں مخلص تھے۔ کیونکہ ان کی گزشتہ تاریخ اس قدر واضح طور پر غیر مستقل رہی ہے کہ کوئی احمق ہی ان کے دعوائے مذہبیت سے دھوکا کھا سکتا ہے۔ خواجہ ناظم الدین نے ان کو دشمنانِ پاکستان قرار دیا اور وہ اپنی گزشتہ سرگرمیوں کی وجہ سے اسی لقب کے مستحق تھے۔ ان کے بعد کے رویے سے یہ واضح ہو گیا کہ نئی مملکت کے وجود میں آنے کے بعد وہ اس کے مخالف ثابت ہوئے جو پارٹی پاکستان اور مسلم لیگ اور اس کے تمام لیڈروں کی مخالف اور کانگرس کی محض ایک کنیز تھی اس کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنے گزشتہ نظریات کو ترک کر دیتی۔ اور قیام پاکستان پر جو اس کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود وجود میں آگیا تھا۔ راتوں رات اپنے عقائد کو بدل کر اس مملکت میں اسلام کی واحد اجارہ دار بن بیٹھتی، جس کے قیام کے خلاف اس نے ایڑی چوٹی تک کا زور لگا دیا تھا۔ کیا احرار پر اپنے نصب العین کا انکشاف تقسیم کے بعد ہی ہوا تھا؟ پاکستان کے لئے اسلامی مملکت کا جو نعرہ وہ لگا رہے تھے۔ وہ اس وقت کہاں تھا۔ جب وہ ان جماعتوں اور ان لوگوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ جو مسلمانوں کے لئے صرف ایک وطن کا مطالبہ کر رہے تھے کیا ان کے ہندوستانی ساتھیوں کو جواب تک احرار ہی کہلاتے ہیں۔ کانگرس نے یہ کام سپرد نہیں کیا کہ وہ کشمیریوں کو بخشی کی حکومت گوارا کرنے پر آمادہ کریں؟

اگر یہ سب کچھ سچ ہے۔ تو صرف پاکستان کے سادہ لوح لوگ ہی احراریوں کے مذہبی جوش کے اظہار سے دھوکا کھا کر بے وقوف بن سکتے ہیں۔ وہ جن نظریات کو پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہیں ان کو اختیار کرنے کے متعلق ذرا اُن کے صدر کے خیالات سُنیئے:۔

سوال:۔ کیا آپ کو اقبال اور نہرو کے اختلاف کا کچھ علم ہے؟

جواب:۔ جی ہاں۔

سوال:۔ ازراہ کرم بیان فرمایئے کہ ان دونوں کے درمیان کس موضوع پر اختلاف تھا؟

جواب:۔ نہرو 'وطن' پر زور دیتے تھے لیکن علامہ اقبال مذہب پر اصرار کرتے تھے۔

سوال:۔ تو گویا احرار کے اور علامہ اقبال کے نظریوں کے درمیان کھلا ہوا تصادم موجود تھا۔

جواب:۔ جی ہاں۔

سوال:۔ پھر احرار نے اپنا نظریہ تبدیل کیوں کر لیا؟

جواب:۔ جب تک ہم کانگرس کے ساتھ تھے ہم سیاسی پارٹی تھے لیکن جب پاکستان وجود میں آگیا تو ہم نے اپنے آپ کو ایک مذہبی پارٹی میں تبدیل کر لیا۔

سوال:۔ جب احراری کانگرس کا ساتھ دے رہے تھے تو کیا وہ اس امر کو جزو مذہب سمجھتے تھے کہ وہ ایک غیر منقسم ملک میں اچھے شہری بن کر رہ سکتے ہیں؟

جواب:۔ جی ہاں۔

سوال:۔ کیا آپ اب تک اس مذہبی عقیدے پر قائم ہیں ؟

جواب:۔ جی نہیں۔

سوال:۔ کیا احرار قومیت پرست مسلمانوں کی ایک جماعت تھی ؟

جواب:۔ جی ہاں ۔

سوال:۔ کیا ان کا نظریہ وہی تھا جو کانگرس کا تھا ؟

جواب:۔ جی ہاں ۔

سوال:۔ کیا جمعیت العلمائے ہند بھی قومیت پرست مسلمانوں کی ایک جماعت تھی ؟

جواب:۔ جی ہاں ۔

سوال ۔ کیا آپ کی رائے میں مسلمان مستقبل کے اس دستور کے ماتحت جو احرار اور کانگرس کے تصور میں موجود تھا۔ ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کر سکتا تھا ؟

جواب:۔ جی ہاں ۔

سوال ۔ کیا آپ اب تک اس رائے پر قائم ہیں ؟

جواب ۔ جی نہیں ۔

سوال ۔ کیا کانگرس اور احرار کے نظریہ میں وطن غالب حیثیت رکھتا تھا ؟

جواب:۔ جی ہاں ۔

سوال:۔ کیا آپ کانگرس کے اس خیال سے متفق تھے ؟

جواب:۔ جی ہاں ۔

سوال:۔ کیا آپ اسی نظریئے کو پاکستان کے شہریوں کے لئے بھی موزوں سمجھ سکتے ہیں جو کانگرس کے ساتھ تعلق کے زمانے میں آپ کا نظریہ تھا ؟

جواب ۔ جی نہیں ؟

اس پر تبصرے کی کوئی ضرورت نہیں کہ پاکستان میں احرار کا سا ماضی رکھنے والی جماعت بھی اگر ایک بظاہر معقول مذہبی شاخسانہ کھڑا کر دے تو وہ حکومت کا تختہ اُلٹ سکتی ہے !

احمدی

احمدی براہ راست فسادات کے لئے ذمہ دار نہ تھے ۔ کیونکہ فسادات حکومت کے اس اقدام کا نتیجہ تھے جو حکومت نے اس پروگرام کے خلاف کیا تھا جو ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد کے ماتحت آل مسلم پارٹیز کنونشن نے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن مطالبات کا تعلق احمدیوں سے تھا۔ اور وہ مطالبات اس لئے وجود میں آئے تھے کہ احمدیوں کے بعض عقاید اور ان کی سرگرمیاں مخصوص انداز کی تھیں اور وہ دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ اور ممتیز ہونے پر زور دے رہے تھے ۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ یہ مطالبات احمدیوں کے عقاید اور ان کی سرگرمیوں ہی کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ لہٰذا یہ معیّن کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ آیا فسادات کے اشتعال میں احمدیوں کا بھی کوئی حصہ تھا۔ عامۃ المسلمین کے ساتھ ان کے اختلافات نصف صدی سے زیادہ مدت سے چلے آ رہے تھے۔ اور تقسیم سے پیشتر وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے پروپیگنڈے اور اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف تھے تاہم قیام پاکستان سے صورت حالات بالکل بدل گئی۔ اس کے بعد اگر احمدی یہ سمجھتے تھے کہ اب اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کی تلقین یا اسلام کے اندر فرقہ دار عقاید کی تبلیغ کی اجازت جن حدود کے اندر دی جائے گی ان کے متعلق اگر وہ کوئی پالیسی وضع نہ کریں گے جب بھی ان کی سرگرمیوں کے خلاف کوئی برہمی پیدا نہ ہو گی۔ اور نئی مملکت میں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ تو وہ گویا اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے۔ تاہم بدلے ہوئے حالات کے مطابق ان کی سرگرمیوں اور ان کی جارحانہ نشر و اشاعت میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا اور غیر احمدی مسلمانوں کے خلاف دل آزار باتیں برابر کہی جاتی رہیں۔ کوئٹہ میں مرزا بشیر الدین محمود احمد نے جو تقریر کی وہ نہ صرف نامناسب بلکہ غیر مآل اندیشانہ اور اشتعال انگیز تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے بلوچستان کے صوبے کی پوری آبادی کو احمدی بنا لینے اور اس صوبے کو مزید جد و جہد کے مرکز کی حیثیت سے استعمال کرنے کی علی الاعلان حمایت کی۔ اسی طرح جب انہوں نے اپنے پیرووں کو یہ ہدایت کی کہ تبلیغ احمدیت کے پروپیگنڈا کو تیز کر دیں تاکہ ۱۹۵۲ء کے آخر تک پوری مسلم آبادی احمدیت کی آغوش میں آ جائے تو گویا مسلمانوں کو تبدیل مذہب کے متعلق سرگرمیوں کا کھلا نوٹس دے دیا اور جب مرزا غلام احمد کو نہ ماننے والوں کے متعلق "دشمن" یا "مجرم" یا "محض مسلمان" کے الفاظ استعمال کئے گئے تو جن لوگوں کی توجہ ان اشارات کی طرف مبذول کرائی گئی ان کا مشتعل ہونا لازمی تھا۔ احمدی افسروں نے لوگوں کو احمدی بنانے کی مہم میں از سرتاپا مصروف ہو جانا اپنا مذہبی فریضہ خیال کیا۔ ان کے اس رویّے کی وجہ سے احمدیوں کو اس امر کا حوصلہ ہوا کہ جہاں کہیں انہیں افسروں کی حمایت حاصل تھی یا حاصل ہونے کی توقع تھی وہاں اپنے مقصد کے حصول میں زور شور سے مصروف ہو جائیں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ اگر ضلع منٹگمری کا حاکم اعلیٰ احمدی نہ ہوتا تو احمدیوں کو ہرگز جرأت نہ ہوتی۔ کہ غیر احمدی دیہات کے علاقے میں کھلم کھلا اپنے تبلیغی مشن پر روانہ ہو جاتے۔ جب کوئی سرکاری افسر اپنے فرقہ وارانہ عقاید کا علے الاعلان اظہار کرتا ہے۔ جیسے کہ بعض احمدی افسروں نے کیا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ جن تنازعات میں اس کی جماعت کا کوئی فرد ایک فریق ہو ان میں اس کی غیر جانب داری پر کسی کو اعتماد نہیں رہتا۔ اس کا فیصلہ کتنا ہی صحیح اور دیانت دارانہ ہو لیکن اگر وہ فیصلہ اس فریق کے خلاف ہو جو اس افسر کی جماعت سے تعلق نہ رکھتا ہو تو اس فریق کو یہ یقین دلانا غیر ممکن ہے کہ اس کو فرقہ دار وجوہ کی بنا پر ناانصافی کا شکار نہیں بنایا گیا۔ لہٰذا ان افسروں کا طرز عمل نہایت افسوسناک تھا اور اس امر کا مظہر تھا کہ وہ اس اصول کے فہم سے بالکل قاصر ہیں۔ جس کے ماتحت کسی سرکاری افسر کو اپنا ظاہری رویّہ

معین کرنا چاہیئے۔ لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ اگرچہ احمدی براہِ راست فسادات کے ذمے دار نہیں ہیں لیکن ان کے خلاف عام شورش کا موقع خود انہی کے طرزِ عمل نے بہم پہنچایا۔ اگر ان کے خلاف احساسات اتنے شدید نہ ہوتے تو ہم نہیں سمجھتے کہ احراری اُس حالت میں بھی ہر قسم کی مختلف مذہبی جماعتوں کو اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے ؛

مسلم لیگ

تحریک تحفظ ختم نبوت اور بعد کے فسادات کے متعلق مسلم لیگ کے بہت سے ممتاز ممبروں کی سرگرمیوں کا ذکر اس رپورٹ کے کسی سابقہ حصے میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف یہ ضروری ہے کہ اُن بڑے واقعات کا اعادہ کر دیا جائے جو مسلم لیگ۔ بعض مسلم لیگی افراد اور بعض مسلم لیگی عہدہ داروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو پارٹی کے ضبط کے ماتحت تھے۔ یاد ہوگا کہ زمانہ زیر تبصرہ کے دوران میں ۱۶ اپریل ۱۹۴۹ء سے ۲۰ اگست ۱۹۵۰ء تک میاں عبدالباری۔ ۲۰ اگست ۱۹۵۰ء سے ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء تک صوفی عبدالحمید اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۱ء کے بعد مسٹر دولتانہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر رہے۔ ممدوٹ وزارت کی موقوفی کے بعد میاں عبدالباری نے دفعہ ۹۲ الف کے نفاذ کے دوران میں مسلم لیگ کے بعض لیڈروں کو گورنر کے مشیروں کی حیثیت سے نامزد کر دیا تھا۔ اگرچہ صوبائی نظم و نسق کی ذمہ داری گورنر ہی پر عاید تھی۔ جو گورنر جنرل کی جانب سے کارفرما تھا۔ لیکن گورنر نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو منتخب عوامی وزارت کے برسرِ اقتدار ہونے کی حالت میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا مشیروں کی حیثیت وزیروں کی مانند تھی۔ ۴ نومبر ۱۹۴۹ء سے ۲۴ جولائی ۱۹۵۰ء تک شعبہ قانون و انتظام کے مشیر ملک محمد انور تھے ؛

اگرچہ مسٹر دولتانہ کے اخباری بیان مورخہ یکم اپریل ۱۹۵۲ء میں اور اس بیان کے ماتحت ۳ اپریل ۱۹۵۲ء کو جو ہدایات لیگوں کے نام جاری کی گئیں ان میں مسلم لیگ کے ممبروں کو غیر لیگی جلسوں کی صدارت سے منع کر دیا گیا تھا۔ اور ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ ایسی سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہ لیں جن سے پاکستان کے شہریوں کے مختلف طبقوں کے درمیان بیگانگی یا دشمنی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ لیکن لیگ کی کسی تنظیم نے ان ہدایات سے یہ مطلب اخذ نہ کیا کہ ان کے ممبروں کو تحریک تحفظ ختم نبوت کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے منع کیا گیا ہے۔ ان ہدایات میں خالص مجلسی اور غیر سیاسی نوعیت کی تقریبوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اور اگرچہ یہ بتا دیا گیا تھا کہ لفظ "سیاسی" کو اس کے ڈھیلے ڈھالے مفہوم میں نہ لیا جائے۔ بلکہ اس کا شدید اور معین مطلب سمجھا جائے۔ لیکن متعدد اضلاع میں مسلم لیگ کے ممبروں نے دل و جان سے تحفظ ختم نبوت کی تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس ہدایت کی طرف بھی کوئی توجہ نہ کی گئی کہ مسلم لیگ کو ایسی سرگرمیوں میں حصہ نہ لینا چاہیئے جن سے پاکستانی شہریوں کے مختلف طبقوں کے

درمیان بیگانگی یا دشمنی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ اور لیگ کے عہدہ دار اور ممبر بلکہ مجلس قانون ساز کے وہ ممبر جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے بے تکلف اس تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اگر کبھی ان سرگرمیوں کی اطلاع صوبائی مسلم لیگ کو موصول بھی ہوئی تو اس نے اس کی پروا نہ کی۔ اور بعض ممبروں نے جو استفسارات اس سلسلے میں کئے ان کا بھی کوئی قطعی جواب نہ دیا گیا۔ سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ نے اپنے ایک اجلاس منعقدہ ۲۷ جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک قرارداد منظور کی۔ جس میں اعلان کیا کہ ختم نبوت اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ مساجد پر دفعہ ۱۴۴ کے احکام کے اطلاق کی مخالفت کی۔ ان احکام کو مداخلت فی الدین قرار دیا۔ اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ نہ صرف ان احکام کو واپس لے بلکہ ان کی خلاف ورزی کی وجہ سے جو مقدمات دائر کئے گئے ہیں۔ ان کو بھی واپس لے لے۔ سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ کی قرارداد کے بعد ۲۰ جولائی کو سٹی مسلم لیگ سرگودھا نے بھی ایک قرارداد منظور کی۔ جس میں مطالبہ کیا کہ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اور صوبائی مسلم لیگ اور آل پاکستان مسلم لیگ سے استدعا کی کہ وہ اس قسم کا اعلان کرانے کی غرض سے عملی تدابیر اختیار کریں اسی قسم کی ایک قرارداد میں سٹی مسلم لیگ کاموکے نے قادیانیوں کو مسلم لیگ کی ممبری کے حق سے محروم قرار دیا۔ اور لیگ سے ان کے اخراج کا مطالبہ کیا۔ جن اہم لیگی اشخاص نے احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے متعلق قراردادوں کی حمایت کی (اور وہ قراردادیں صوبائی مسلم لیگ کے اس سالانہ اجلاس میں جو ۲۶ - ۲۷ جولائی ۱۹۵۲ء میں منعقد ہونے والا تھا۔ پیش کرنے کے لئے بھیج دی گئیں) ان اشخاص کے نام درج ذیل ہیں:-

قاضی مرید احمد ایم ایل اے کونسلر پنجاب مسلم لیگ

صاحبزادہ محمود شاہ (گجرات) کونسلر پنجاب مسلم لیگ

محمد اسلام الدین ایم ایل اے

مولانا سید احمد سعید کاظمی ممبر صوبائی مسلم لیگ کونسل

خواجہ عبدالحکیم صدیقی صدر سٹی مسلم لیگ ملتان

صوفی محمد عبدالغفور لدھیانوی آفس سیکرٹری ڈسٹرکٹ مسلم لیگ، کونسلر پنجاب مسلم لیگ۔

محمد ابراہیم قریشی جنرل سیکرٹری سٹی مسلم لیگ جھنگ و کونسلر پنجاب مسلم لیگ۔

مسٹر دولتانہ (صدر) اور دوسرے عہدہ داروں نے ان قراردادوں کا جائزہ لیا اور اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ جس قرارداد کو ۲۷ جولائی کے دن کونسل کے دوسرے اجلاس میں پیش ہونا تھا اس کا مسودہ کس نے تیار کیا تھا۔ لیکن مسٹر دولتانہ نے اس قرارداد کی پوری ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ یہ قرارداد آٹھ کے مقابلے میں ۲۸۴ کی عظیم اکثریت سے منظور ہوئی۔ جس میں کہا گیا کہ عقیدہ ختم نبوت کے متعلق مسلمانوں اور قادیانیوں کے اختلافات بنیادی ہیں۔ اور انہی اختلافات کی وجہ سے یہ تجویز

پیش کی گئی ہے کہ دستور پاکستان میں احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اور یہ تجویز کسی حد تک مسلمانوں کے اس ردعمل کی مظہر ہے جو مذہبی امور اور شہری و مجلسی زندگی کے دوسرے دوائر میں قادیانیوں کے قومی انقطاعی رجحانات سے پیدا ہوا ہے۔ اس تجویز میں آئینی اور قانونی نوعیت کے بعض سنگین اور اہم مسائل شامل ہیں۔ جن پر نہایت گہرے غور و خوض کی ضرورت ہے اور یہ کام پورے اعتماد کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان دستور ساز اسمبلی کے لیڈروں کی پختہ کارانہ دانشمندی پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ اور اس اثنا میں مسلم لیگ کے ہر ممبر کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ سکون و متانت کی فضا پیدا ہو جائے۔ کیونکہ صرف ایسی ہی فضا میں بنیادی دستوری پالیسی پر اثر ڈالنے والے معقول فیصلے کئے جا سکتے ہیں۔ اور کونسل اس اصول سے اپنی غیر متزلزل وابستگی کا اظہار کرتی ہے کہ مسلمانان پاکستان کا صرف جمہوری ہی نہیں بلکہ مذہبی فرض بھی ہے کہ بلا امتیاز مذہب و ملت مملکت کے ہر شہری کے جان و مال۔ آبرو۔ اور تمام شہری حقوق کی حفاظت کریں۔ اس قرارداد کی تہ میں جو خیال مضمر ہے اس کی تشریح اس سے قبل مسٹر دولتانہ بمقام پسرور ضلع سیالکوٹ کی مسلم لیگ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بھی کر چکے تھے۔ اور قرارداد منظور ہو جانے کے بعد بھی ۳۰ راگست کو حضوری باغ لاہور میں اور ۱۳ ستمبر کو راولپنڈی میں مسٹر دولتانہ نے اس کی مزید وضاحت کی۔ ان سب تقریروں میں مسٹر دولتانہ نے ختم نبوت کے متعلق اپنے اور تمام مسلمانوں کے ایمان پر زور دیا۔ اس عقیدے کو نہ ماننے کے نتائج واضح کئے۔ ان مطالبات کی نوعیت واضح کی جو اس عقیدے کا نتیجہ یا اس عقیدے پر مبنی تھے۔ اور اس موقف کا اعلان کیا کہ مطالبات کی نوعیت دستوری ہے۔ لہٰذا ان پر غور و فیصلہ کا حق صرف مرکز کو حاصل ہے ان تقریروں میں انہوں نے یقیناً اس حقیقت پر بھی زور دیا کہ پاکستان کی مذہبی اقلیتیں اپنے جان و مال و آبرو کے تحفظ کی حقدار ہیں۔ اس قرارداد سے اور ان تقریروں سے نہایت واضح اور قطعی طور پر یہ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ اور ذاتی طور پر مسٹر دولتانہ خود بھی قادیانیوں کو غیر مسلم سمجھتے تھے۔ کیونکہ حضوری باغ میں انہوں نے جو تقریر کی۔ اس سے صرف یہی نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہے۔ کہ عقیدہ ختم نبوت کو معرض بحث میں لانا ہی "کفر" ہے۔ اور ختم نبوت ہمارے ایمان کا ایک حصہ ہے۔ جو ہر قسم کی دلیل اور منطق سے بالاتر ہے۔ اور قادیانی اپنے علیحدگی پسند رجحانات کی وجہ سے خود ہی اس شدید جذبے کے ذمہ دار ہیں جو ان کے خلاف لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہے۔ ان کی تقریر راولپنڈی سے بھی بالکل یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ ۲۵ اکتوبر کو نظام آباد کے مقام پر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ گوجرانوالہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے مسٹر دولتانہ نے ایک مبہم سا اشارہ کیا کہ بعض لوگ مسلمانوں میں تفرقہ ڈال رہے ہیں۔ اور یہ لوگ نہ صرف اتحاد اسلامی بلکہ پاکستان کی سالمیت کو تباہ کر رہے ہیں۔ لیکن اگر ان کے سابقہ اعلانات کو پیش نظر رکھا جائے تو اس اشارے کا تعلق مسلمانوں اور احمدیوں کے اختلافات سے نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ مسٹر دولتانہ اپنی سابقہ تقریروں میں احمدیوں کو تو واضح طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دے چکے تھے۔

دوسرا نکتہ جو اس قرارداد اور ان تقریروں سے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ احمدیوں کے متعلق مطالبات اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً دستوری حیثیت رکھتے ہیں ۔ لہذا ان میں مداخلت کا حق صرف مرکزی ارباب اختیار کو ہے ۔ جن سے آل پاکستان مسلم لیگ مرکزی حکومت اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی مراد ہیں ۔ مسٹر دولتانہ اس موقف کے اظہار کے نتائج و عواقب سے یقیناً پوری طرح باخبر ہوں گے ۔ قرارداد کی زبان سے اور اس موضوع پر مسٹر دولتانہ کی تقریروں کے الفاظ و فقرات سے ایک بات نہایت صفائی سے واضح ہو گئی ہے ۔ کہ صوبے کو قانون و انتظام کے پہلو کے سوا ان مطالبات سے کوئی سروکار نہیں ۔ اور صرف مرکز ہی ہے جو ان مطالبات کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے اور ان کو تسلیم کرانے کے لئے ضروری تدابیر اختیار کر سکتا ہے ۔ اس کے بعد کسی شخص کو یہ کہنے کی جرات نہ ہو سکتی تھی کہ احمدی ایک الگ قوم نہیں ہیں ۔ بلکہ دائرہ اسلام کے اندر ہیں ۔ اور ان کے خلاف جو مطالبات کئے جا رہے ہیں وہ بے بنیاد اور غیر حق بجانب ہیں ۔ اور مسترد کر دینے چاہئیں ۔ جب مطالبات کو جائز و حق بجانب قرار دیا جا چکا تو اس کے بعد یہ لازم ہو گیا کہ ان کے متعلق ہر قسم کے معروضات اور دعوے مرکز میں پیش ہونے چاہئیں۔ اور ان مطالبات کو تسلیم کرانے کے لئے ہر قسم کی سرگرمیوں کا رُخ مرکزی ارباب اختیار کی طرف ہونا چاہئے۔ یعنی خواجہ ناظم الدین کی طرف جو آل پاکستان مسلم لیگ کے لیڈر اور پاکستان کے وزیراعظم ہیں ۔ کیونکہ اگر وہ چاہیں تو پارٹی کے اجلاس میں ان مطالبات کو تسلیم کرا کر دستور ساز اسمبلی سے بھی منظور کرا سکتے ہیں ۔ لہذا حالات نے یہی صورت اختیار کر لی اور خواجہ ناظم الدین اپنے آپ کو ایک دشوار حالت میں پا کر بے حد مضطرب ہوئے بالکل اسی طرح جیسے دولتانہ صاحب اس صورت میں مضطرب ہوتے اگر مطالبات کا تعلق صوبائی حکومت سے ہوتا ۔ اب سرگرمیوں کا مرکز کراچی میں منتقل ہو گیا ۔ اور علما کے وفد پر وفد خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کر کے مطالبات پر گفتگو کرنے لگے ۔ علما کے ساتھ ان ملاقاتوں اور ان کی سرگزشتوں کے تفصیلی حالات اس سے قبل بیان کئے جا چکے ہیں ۔ چونکہ خواجہ صاحب نہایت مذہبی آدمی اور مخلص و راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اس لئے انہوں نے اس موقع پر اپنے آپ کو عجیب گومگو کی حالت میں پایا ۔ وہ جلیل القدر علما کے دلائل کو رد نہ کر سکتے تھے ۔ کیونکہ وہ دلائل خود ان کے عقاید کے مطابق تھے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ قائداعظم کے انتقال ۔ قرارداد مقاصد کی منظوری اور مجلس اصول اساسی کی سفارشات کے وقت سے علما کو مملکت میں بڑا اقتدار حاصل ہو چکا ہے ۔ اگر وہ مطالبات کو رد کر دیتے تو (خود ان کے بیان کے مطابق) علما سے ان کا کھلم کھلا تصادم ہو جاتا ۔ اور وہ اس صورت سے ہر حال میں بچنا چاہتے تھے وہ ان مطالبات کو تسلیم بھی نہیں کر سکتے تھے ۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پاکستان ضحکۂ روزگار بن جاتا ۔ اور بین الاقوامی دنیا پر اس دعوے کی حقیقت کھل جاتی کہ پاکستان ایک ترقی پذیر ۔ روشن خیال اور جمہوریت پسند مملکت ہے ۔ تسہیل اور مفاہمت کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں ۔ اگرچہ مسئلہ بالکل صاف اور واضح تھا لیکن اس میں ایسے خطرناک اثرات و عواقب شامل تھے ، کہ ایک طرف یا دوسری طرف کوئی بھی قطعی فیصلہ کیا جاتا خواجہ صاحب کے لئے ضرور مصیبت کا باعث ہوتا ۔

خواجہ ناظم الدین کو اس اندوہ ناک صورت میں کس نے مبتلا کیا ۔ اس کا جواب یقیناً یہی ہے کہ مسلم لیگ

کی قرارداد اور اس کی تفریح و توضیح نے۔ جب لیگ نے مطالبات کے وجود اور ان کے جواز کو رسمی طور پر تسلیم کر لیا۔ اور ان کی دستوری نوعیت کو قائم اور واضح کر دیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ شورش کا رُخ کراچی کی طرف پھر جاتا۔ اسکے بعد صوبائی مسلم لیگ کے ممبر بے نیاز و بے پروا بھی رہ سکتے تھے اور اگر چاہتے تو مطالبات کی کھلم کھلا حمایت بھی کر سکتے تھے۔ لیکن خود لیگ کی قرارداد میں ان کی واضح تائید کی جا چکی تھی۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مسلم لیگ کے ممبر کسی تامل و تکلف کے بغیر مطالبات کی حمایت کا اعلان کرنے لگے جو بے شمار پوسٹر اور اشتہارات مطالبات کی تائید میں شائع ہو رہے تھے ان میں لیگ کے اہم عہدے داروں اور صوبائی اسمبلی کے مسلم لیگی ممبروں کے نام نہایت نمایاں حیثیت سے درج کئے جاتے تھے۔ صرف جولائی کے مہینے میں اس قسم کے پانچ پوسٹر شائع ہوئے۔ ان میں سے ایک پوسٹر کا عنوان تھا "ختم نبوت کے مسئلے پر ہر مسلمان اپنا آخری قطرۂ خون بہا دے گا" یہ پوسٹر مجلس احرار اسلام لائل پور کے شعبہ نشر و اشاعت نے شائع کیا تھا اور اس پر چودھری عزیز الدین ایم ایل اے صدر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ لائل پور اور ممبر مجلس عاملہ پنجاب صوبہ مسلم لیگ شیخ بشیر احمد صدر سٹی مسلم لیگ لائل پور اور چار دوسرے مسلم لیگی ایم ایل اے کے دستخط ثبت تھے۔ ایک اور پوسٹر ادارہ تحفظ ختم نبوت نے شائع کیا۔ جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ تحریک میں گرفتار ہونے والے اشخاص کو رہا کر دیا جائے۔ اور اُن کوائف کی تحقیقات کرائی جائے جو "شہدائے ملتان" کی موت پر منتج ہوئے۔ اس پوسٹر پر یہ نام درج تھے: ڈاکٹر علی محمد صدر مسلم لیگ سمندری۔ چودھری علی شیر جنرل سیکرٹری مسلم لیگ سمندری۔ شیخ محمد عالم کونسلر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ لائل پور۔ حکیم منصف علی ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ لائل پور۔ چودھری خدا بخش ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ سمندری۔ چودھری محمد علی مجاہد سمندری۔ چودھری محمد یعقوب سمندری اور چودھری عنایت اللہ سمندری۔ تیسرے پوسٹر پر محمد عاشق خان جنرل سیکرٹری سٹی مسلم لیگ قصور۔ سید حسن علی شاہ ہمدانی کونسلر سٹی مسلم لیگ قصور اور میاں خادم حسین ممبر مسلم لیگ قصور کے دستخط تھے۔ اسی طرح جھنگ میں ایک پوسٹر شائع کیا گیا جس پر حسب ذیل اشخاص کے دستخط ثبت تھے: حکیم محمد معین الحق سیکرٹری پرائمری مسلم لیگ مگھیانہ۔ میاں گل محمد ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ مگھیانہ۔ حافظ ظفر احمد ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ مگھیانہ۔ حکیم عباس علی خان ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ مگھیانہ۔ سید محمد سبطین ممبر مجلس عاملہ مسلم لیگ مگھیانہ۔ سید غلام عباس علی شاہ صدر پرائمری مسلم لیگ موضع جھر کی۔ حاجی اللہ جوایا کونسلر سٹی مسلم لیگ مگھیانہ۔ ماسٹر اللہ دتا کونسلر مسلم لیگ مگھیانہ۔ میاں غلام قادر ممبر مسلم لیگ مگھیانہ۔ ماسٹر غلام نبی سینئر نائب صدر مسلم لیگ مگھیانہ۔ میاں نذیر حسین کونسلر سٹی مسلم لیگ مگھیانہ۔ میاں احمد دین خزانچی مسلم لیگ مگھیانہ چودھری دوست محمد ممبر مسلم لیگ مگھیانہ۔ میاں امیر بخش جائنٹ سیکرٹری مسلم لیگ مگھیانہ۔ میاں خادم حسین سالار ڈسٹرکٹ مسلم لیگ جھنگ اور میاں رحمت اللہ کنوینر پرائمری مسلم لیگ مگھیانہ۔ مجلس تحفظ ختم نبوت شیخوپورہ نے "متفقہ مطالبات" کے عنوان سے ایک پوسٹر شائع کیا۔ جس پر عطا محمد۔ خیر دین چشتی۔ محبوب الٰہی۔ محمد شریف۔ محمد اسلم۔ عبدالرحیم امین گیلانی۔ ناصر قریشی اور چودھری مشتاق احمد ارکان مجلس عاملہ و کونسلر سٹی مسلم لیگ شیخوپورہ کے دستخط تھے۔ اس پوسٹر میں مطالبات کی حمایت کی گئی تھی۔ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کو مداخلت فی الدین قرار دیا گیا تھا اور ان کو واپس لینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی مجلس نے اسی مضمون کے متعلق ایک اور پوسٹر شائع کیا جس پر چودھری عبدالغنی ایم ایل اے کونسلر پاکستان مسلم لیگ۔ حاجی محمد علی ایم ایل اے چودھری لال خان صدر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ

شیخوپورہ اور چودھری محمد ابراہیم صدر سٹی مسلم لیگ شیخوپورہ کے دستخط ثبت تھے۔

مسلم لیگ کے ممبروں نے سرمائے کی فراہمی اور رضاکاروں کی بھرتی میں سرگرم حصہ لیا۔ ان میں سے بعض افراد اضلاع میں ڈکٹیٹر یا ڈائرکٹ ایکشن کمیٹیوں کے ممبر بن گئے۔ اور جب فسادات شروع ہوئے تو یہ لوگ دل و جان سے تحریک میں کود پڑے مسلم لیگ کے ۳۷۷ ممبر اس شورش میں شامل ہوئے مسٹر محمد حسین سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اضلاع سے موصول شدہ سرکاری اطلاعات کی مدد سے ایک فہرست تیار کی ہے جس میں ان مسلم لیگیوں کے کوائف درج ہیں معلوم ہوتا ہے کہ میانوالی کے سوا باقی تمام اضلاع کے مسلم لیگی اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ مندرجہ ذیل فہرست سے معلوم ہوگا کہ ہر ضلع میں مسلم لیگ کے کتنے ممبر اس شورش میں شامل ہوئے۔

لاہور	۲۶
سیالکوٹ	۲۸
شیخوپورہ	۲۱
گجرات	۳۷
سرگودھا	۵۸
جہلم	۹
راولپنڈی	۲۱
کیمبل پور	۵
منٹگمری	۱۸
جھنگ	۱۰
ڈیرہ غازی خاں	۳
مظفر گڑھ	۱۶
ملتان	۲۱
گوجرانوالہ	۴۳
لائل پور	۶۱
	۳۷۷

ان حضرات نے جلوسوں میں حصہ لیا۔ پر تشدد ہجوموں کی قیادت کی۔ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی خلاف ورزی کی۔ اور تحریک کی مالی امداد کے لئے سرمایہ فراہم کیا۔ اس فہرست میں جن اشخاص کے نام درج ہیں ان میں صوبے کی مختلف مسلم لیگوں کے صدر، سینئر نائب صدر، نائب صدر، سیکرٹری، خزانچی اور دوسرے عہدہ دار شامل ہیں۔ ان میں سے چار صوبائی مسلم لیگ کے کونسلر ہیں۔ پانچ مسلم نیشنل گارڈ کے ممبر ہیں۔ دو ایڈووکیٹ ہیں۔ اور ایک روزنامہ اخبار کا ایڈیٹر ہے۔ ان میں سے چوالیس زیر دفعہ ۳ (۳) اور چھ زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ۔ گیارہ زیر دفعہ ۱۸۸ تعزیرات پاکستان۔ چھ زیر ضوابط مارشل لا۔ دو۔ لوٹ مار آتش زنی اور قتل کے لئے اور ایک صاحب زیر دفعہ ۱۲۴۔الف و ۱۵۳ الف تعزیرات پاکستان گرفتار کئے گئے۔ ان میں سے دو مفرور ہو گئے اور ایک کو تنبیہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔ ایک نمبردار تھا جو اس عہدے سے برخاست کر دیا گیا اور ایک کے ریوالور کا لائسنس معطل کر دیا گیا۔

صوبائی مسلم لیگ ان تمام سرگرمیوں کو بالکل اطمینان سے دیکھتی رہی اور ہمارے سامنے کاغذات کا جو بھاری ریکارڈ موجود ہے اس میں کہیں بھی اس امر کی شہادت موجود نہیں کہ صوبائی مسلم لیگ نے ایسی سرگرمیوں کو ناپسند کیا ہو۔ بلکہ متعدد حلقوں کی طرف سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس تحریک کو صوبائی مسلم لیگ کی تائید و حمایت حاصل تھی۔

مطالبات اگرچہ احمدیوں کے متعلق تھے لیکن حکومت کے خلاف تھے! ان ایام میں آج کل کی مانند برسر اقتدار حکومت مسلم لیگ کی حکومت تھی یہ امر ہماری حس جواز و شائستگی کے اعتبار سے بالکل ناقابل فہم ہے کہ وہ لوگ جو مسلم لیگ کے ضبط و نظم کے ماتحت تھے کس طرح ایک ایسی تحریک میں

یا اس کے بعد ڈاڑکٹ الیکشن کی مہم میں حصہ لے سکتے تھے۔ اور اس فعل کو جو مسلم لیگ کے انضباط اور اس کے ساتھ وفاداری کے قطعاً منافی تھا۔ واضح کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ گوجرانوالہ اور سرگودھا کے واقعات اس پہلو سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ہم نے ان مقامات کے مسلم لیگیوں کے طرز عمل کی وضاحت طلب کی۔ ہماری کوشش کا نتیجہ درج ذیل ہے:

ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ نے اپنے تحریری بیان میں لکھا:-

"سٹی مسلم لیگ میں جو گروہ برسر اقتدار ہے۔ اس نے قانون شکنی کی تائید کی۔ حکومت کے اقدام کی مذمت کی۔ جن شورش پسندوں کو عام جلسوں پر عائد شدہ پابندی توڑنے پر گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس سلسلے میں ایک قرارداد بھی منظور کی گئی اور ایک پوسٹر بھی شائع کیا گیا۔ ....

مقامی مسلم لیگ کے عہدہ دار حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے میں ناکام رہے اور لیگ میں اپنے مخالف گروہ مثلاً شیخ برکت علی۔ شیخ محمد عاشق وغیرہ سے لیڈری چھین لینے کی امید میں شورش پسندوں سے جا ملے"

مسٹر منظور حسن پنجاب اسمبلی کے ممبر ہیں جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے اس کے علاوہ گوجرانوالہ سٹی مسلم لیگ کے سیکرٹری بھی ہیں۔ یہ ایڈووکیٹ ہیں۔ اور اس حیثیت میں انہوں نے ان ملزموں کی وکالت کی جن کے خلاف دفعہ ۱۴۴ کے احکام کو توڑنے کی بنا پر مقدمات دائر کئے گئے تھے۔ ان احکام کا مقصد یہ تھا کہ مسجدوں میں ایسے عام اجتماعات منعقد نہ کئے جائیں۔ جن کی نوعیت مذہبی نہ ہو۔ جیسا کہ سابق میں بتایا جا چکا ہے۔ ۲۰ جون ۱۹۵۲ء کو شیرانوالہ باغ مسجد کے ایک جلسۂ عام میں بعد نماز جمعہ بعض ممتاز احراری لیڈروں نے تقریریں کیں ایک دن پہلے اس جلسے کا اعلان بالکل عام جلسوں کی طرح کیا گیا۔ اور یہ جلسہ اُس وقت منعقد کیا گیا۔ جب نماز جمعہ ہو چکی مسٹر منظور حسن نے سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ کے ایک اجلاس میں ایک قرارداد پیش کی جس میں ان اشخاص کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا جو ۲۰۔ جون کو بعد نماز جمعہ ایک جلسۂ عام منعقد کرتے اور اس میں تقریر کرنے کی وجہ سے گرفتار کئے گئے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی احکام زیر دفعہ ۱۴۴۔ کو واپس لینے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ یہ صاحب اس تحقیقات کے ۷۹ ویں گواہ کی حیثیت سے طلب کئے گئے۔ ان کے بیان کا متعلقہ حصہ درج ذیل کیا جاتا ہے:-

سوال۔ آپ نے اپنے تحریری بیان میں لکھا ہے کہ ایک گروہ آپ کا مخالف تھا جو ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کا منظور نظر تھا۔ ازراہ کرم اس گروہ کے ممبروں کے نام بتائیے۔

جواب۔ (گواہ نے چند اشخاص کے نام لئے اور پھر کہا) ان میں سے سیٹھ غلام قادر سیٹھ محمد عبداللہ شیخ برکت علی اور شیخ عاشق حسین مسلم لیگ کے ممبر ہیں۔

سوال۔ کیا آپ کو علم تھا کہ اس قرارداد کو منظور کر کے آپ حکومت کی مذمت کر رہے ہیں؟

جواب۔ اُس وقت مجھے اس بات کا احساس نہ ہوا تھا کہ حکومت نے دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کی جو گرفتاریاں کی ہیں۔ ان کی مخالفت کر کے میں حکومت کی مذمت کر رہا ہوں۔

سوال۔ وہ کون لوگ تھے جو دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری کے احکام کی خلاف ورزی کے لئے گرفتار کئے گئے تھے؟

جواب۔ صاحبزادہ فیض الحسن۔ ان کا بیٹا جس کا نام میں نہیں جانتا۔ مولوی عبدالواحد اور دیگر اشخاص۔ گرفتار شدگان میں زیادہ تر احراری تھے۔

سوال۔ جب یہ مقدمہ عدالت میں آیا تو کیا آپ ان لوگوں کے وکیل تھے؟

جواب۔ میں وکیل ہوں اور جب صاحبزادہ فیض الحسن کے لڑکے اور مولوی عبدالواحد کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ تو میں نے ان کی وکالت کی۔

سوال۔ کیا ان میں سے کسی کے خلاف یہ الزام عاید کیا گیا تھا کہ اس نے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تقریر کی تھی؟

جواب۔ عدالت میں کوئی ابتدائی اطلاع کی رپورٹ پیش نہیں کی گئی تھی اس لئے میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ ان لوگوں کے خلاف ایسا الزام لگایا گیا تھا۔

. . . .

میں نے سُنا تھا کہ صاحبزادہ فیض الحسن نے دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک تقریر کی تھی۔

میں اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتا۔ کہ مسجد میں کوئی شخص جیسی تقریر چاہے کر سکتا ہے۔ صاحبزادہ فیض الحسن نے یہ تقریر مسجد میں کی تھی۔

سوال۔ اگر آپ اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے کہ کوئی شخص اس امر کا مقتدر ہے کہ مسجد میں جس قسم کی تقریر چاہے کرے اور اگر آپ کو معلوم نہ تھا کہ صاحبزادہ فیض الحسن نے مسجد میں کس قسم کی تقریر کی تھی تو پھر آپ ایسی قرارداد کے منظور کرنے میں کیوں شامل ہوئے جس میں ایسی تقریر کے لئے صاحبزادہ فیض الحسن کی گرفتاری کی مذمت کی گئی تھی؟

جواب۔ ہم اس امر کے مخالف تھے کہ مسجد میں کسی فعل کے خلاف دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری کا اطلاق کیا جائے۔

سوال۔ آپ نے اس قرارداد کی تجویز سے پہلے صدر پنجاب صوبہ مسلم لیگ سے مشورہ کر لیا تھا؟

جواب۔ جی نہیں۔

. . . .

دوسرے دن صبح کو مجھے میری مرضی کے خلاف گوجرانوالہ سے باہر لے جا کر پنڈی بھٹیاں میں پہنچا دیا گیا۔

سوال۔ آپ گوجرانوالہ میں واپس کب آئے؟

جواب۔ اس سے دوسرے دن۔

سوال۔ کیا واپسی پر آپ نے ایک جلوس کی قیادت کی؟

جواب۔ میں نے رضامندی کے ساتھ کسی جلوس کی قیادت نہیں کی۔ ۷ مارچ کو جب میں پنڈی بھٹیاں سے واپس آیا اور گھنٹہ گھر کے پاس پہنچا تو میں نے ایک بہت بڑا جلوس دیکھا جو تیس یا چالیس ٹرکوں پر مشتمل تھا شورش پسندوں

نے مجھے ایک ٹرک میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا ۔ یہ جلوس سٹی تھانے ۔ کے نزدیک مسجد کے باہر پہنچ کر ٹھہر گیا ۔

سوال ۔ کیا اس کے بعد آپ مسجد کے اندر گئے ؟

جواب ۔ مجھے جبراً مسجد کے اندر لے گئے اور مجھے دھمکی دے کر ایک تحریر پر میرے دستخط کرائے گئے جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں ۔

سوال ۔ جس تحریر پر آپ نے دستخط کئے کیا وہ مجلس عمل کا حلف نامہ تھا ؟

جواب ۔ اس تحریر کا فارم مجلسِ عمل نے تیار کیا تھا ۔

سوال ۔ کیا فسادات کے آغاز سے پہلے مسلم لیگ نے کبھی کوئی ایسا جلسہ عام مرتب کیا تھا جس میں احراریوں کی تقریریں ہوئی ہوں ؟

جواب ۔ ایک دفعہ ۱۹۵۱ء کے اوائل میں ایک دفاع کانفرنس گوجرانوالہ میں منعقد کی گئی تھی ۔ یہ کانفرنس چھ مختلف جماعتوں نے طلب کی تھی ۔ جس میں احرار، اسلام لیگ ۔ جناح عوامی لیگ اور جماعت اسلامی شامل تھیں ۔

سوال ۔ کیا ۲۰ ، جون ۱۹۵۲ء کو 'یوم مطالبات' کے موقع پر کوئی جلسہ عام منعقد کیا گیا تھا ؟

جواب ۔ اس تاریخ پر ایک جلسے کا اعلان کیا گیا تھا ۔ لیکن دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت حکم صادر ہونے پر یہ جلسہ منسوخ کر دیا گیا تھا

سوال ۔ اطلاع یہ ہے کہ یہ جلسہ مسجد شیرانوالہ باغ کے اندر منعقد کیا گیا اور اس میں صاحبزادہ فیض الحسن ۔ شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے تقریریں کیں ۔ اور یہ سب گرفتار کر لئے گئے ۔

جواب ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے چونکہ دفعہ ۱۴۴ ۔ ضابطہ فوجداری کے ماتحت ایک حکم کے رو سے عام جلسے ممنوع قرار دئے گئے تھے اس لئے مسجد شیرانوالہ باغ کے اندر جمعۃ الوداع کے موقع پر ایک جلسہ منعقد کیا گیا تھا ۔ اس جلسے کے مقررین میں صاحبزادہ فیض الحسن ۔ شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری شامل تھے ۔

سوال ۔ کیا آپ کو بالکل یقین ہے کہ جس مقدمے میں آپ وکیل بنائے گئے تھے وہ اسی موقع کی تقریروں کی بناء پر گرفتاریوں کی وجہ سے دائر کیا گیا تھا ؟

جواب ۔ یہ مقدمہ اسی موقع کی تقریروں کی بنا پر دائر کیا گیا تھا ۔

سوال ۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ مولانا اختر علی خاں نے اس تحریک کے سلسلے میں گوجرانوالہ ۔ کے کسی جلسہ عام میں تقریر کی تھی ؟

جواب ۔ جی ہاں ۔

سوال ۔ چائے کی پارٹی کس نے دی تھی ؟

جواب ۔ یہ پارٹی میں نے سیکرٹری سٹی مسلم لیگ ۔ کی حیثیت میں نہیں بلکہ مولانا کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات کی وجہ سے دی تھی ۔ اس پارٹی میں شہر کے تقریباً تمام مسلم لیگی شامل ہوئے تھے ۔

سوال ۔ کیا کسی مسلم لیگی نے پبلک پلیٹ فارم پر اس شورش کی مذمت کی تھی ؟

جواب : یہ ممکن نہ تھا کیونکہ تحریک کی حمایت میں عوامی جذبات بہت برانگیختہ تھے ۔

سوال : ۔ کیا مسلم لیگ کے کسی عہدے دار یا مقتدر ممبر نے اس شورش میں رضامندی سے حصہ لیا ؟

جواب : جی نہیں ۔ ان میں سے بعض کو حصہ لینے پر یقیناً مجبور کر دیا گیا تھا ۔"

مسٹر آفتاب احمد صدر سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ کا بیان حسب ذیل ہے :۔

"سوال ۔ کیا مسلم لیگ نے من حیث الجماعت یا مسلم لیگ کے کسی لیڈر نے علی الاعلان اس شورش کی مذمت کی؟

جواب ۔ ہمیں صوبہ مسلم لیگ کی طرف سے کوئی ہدایات موصول نہ ہوئی تھیں۔ جب چیف منسٹر ۱۷۔ فروری کو گوجرانوالہ آئے اور ہم نے ان سے ہدایات طلب کیں۔ تو انہوں نے کہا کہ ان کو مرکز سے کوئی ہدایات نہیں پہنچیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر مرکز سے اس شورش کو کچل دینے کی ہدایات موصول ہوں گی تو حکومت پنجاب ان کی تعمیل کرے گی۔

. . . .

چیف منسٹر کے اصلی الفاظ یہ تھے "صاحب ۔ میں تو اس شورش کو دو منٹ کے اندر ختم کر سکتا ہوں۔ لیکن خواجہ صاحب مجھے کچھ نہیں کرنے دیتے"۔ چونکہ ہمیں نہ صوبے کی طرف سے نہ مرکز کی طرف سے کوئی ہدایات موصول ہوئی تھیں ۔ اس لئے ہم علی الاعلان اس تحریک کی مذمت کرنے سے قاصر تھے۔

سوال ۔ ان لوگوں کی ہمت افزائی کرنے سے حکام ضلع کا مقصد کیا تھا؟ (ان لوگوں سے مراد سٹی مسلم لیگ کے وہ اشخاص تھے جو مسٹر آفتاب احمد اور مسٹر منظور حسن کے گروہ کے مخالف تھے)

جواب ۔ اس ٹولی کا ہمیشہ سے یہی شیوہ رہا ہے کہ حکام کی خوشامد درآمد کی جائے۔ حکام ضلع بھی چاہتے تھے کہ اس گروہ کی حمایت کرکے ہر دلعزیز ہو جائیں۔ جن کے متعلق خیال یہ تھا کہ وہی تحریک کو چلا رہے ہیں۔ حکام ضلع مقامی مسلم لیگ کو پسند نہیں کرتے تھے اس لئے ان کی پالیسی یہی تھی کہ ایک حریف گروہ کو قائم رکھیں۔

سوال ۔ حکام ضلع مقامی مسلم لیگ کے خلاف کیوں تھے؟

جواب : کیونکہ مسلم لیگ مقامی حکام کے نظم و نسق پر تنقید کیا کرتی تھی"۔

قاضی مرید احمد مجلس قانون ساز کے ایک ممبر ہیں ۔ جو مسلم لیگ ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے ۔ آپ آل پاکستان مسلم لیگ کونسل کے بھی ممبر ہیں ۔ ہمارے سوالات کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا ۔ اس سے ان کی حیثیت واضح ہو جائے گی:۔

"سوال ۔ آپ کس ٹکٹ پر انتخابات کے لئے کھڑے ہوئے تھے؟

جواب : مسلم لیگ کے ٹکٹ پر۔

سوال ۔ کیا آپ اس سے پہلے بھی کبھی صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں امیدوار ہوئے تھے؟

جواب :۔ جی نہیں ۔

سوال ۔ اگر آپ مسلم لیگ کا ٹکٹ حاصل نہ کرتے تو کیا آپ کے لئے اسمبلی کے الیکشن میں کامیاب ہونے کی کوئی گنجائش تھی؟

جواب : اگر مجھے لیگ ٹکٹ نہ دیتی اور مجھے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہونا پڑتا جب بھی میں سمجھتا ہوں کہ میں کامیاب ہو جاتا ۔

سوال : آپ کتنی اراضی کے مالک ہیں؟

جواب : بیس کنال ۔

سوال : آپ حصول معاش کے لئے کیا کام کرتے ہیں ؟
جواب : گرفتاری کے دن تک میں اناج کے کاروبار میں دلالی کا کام کرتا تھا ۔
سوال : آپ کو اس کام کا لائسنس کس نے دیا تھا ؟
جواب : حکام ضلع نے ۔
سوال : آپ کتنا انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں ؟
جواب ۔ بالکل نہیں "

یہ گواہ مجلس عمل سرگودھا کا صدر تھا ۔ اس نے شورش میں سرگرم حصہ لیا ۔ یہاں تک کہ ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد کے ماتحت پروگرام کے آغاز میں بھی شامل تھا ۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس کی گرفتاری عمل میں آئی ۔ اس گواہ نے مجلس عمل کے لئے سرمایہ فراہم کیا ۔ اور مطالبات کی حمایت اور حکومت کی مخالفت میں بعض نہایت زوردار تقریریں کیں ۔ ان جلسوں میں جس قسم کی باتیں یہ شخص کہتا تھا ۔ وہ ذیل میں درج ہیں :-

"پولیس مین ۔ تھانیدار اور ڈپٹی کمشنر کو اپنا حکمران نہ سمجھو ۔ اُن سے نہ ڈرو ۔ اور ان کی کچھ پرواہ نہ کرو "۔

" محمد علی (موجودہ وزیر اعظم پاکستان) مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرنے کے لئے دہلی گیا ۔ خیر ۔ اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا ۔ لیکن وہ اپنی بیوی 'ام المومنین' کو ساتھ کیوں لے گیا ۔ بھائیو ! اس کی بیوی ضرور 'ام المومنین' ہوگی کیونکہ وہ خود 'امیر المومنین' ہے ۔ خیر ۔ 'اُم المومنین' دہلی چلی گئی ۔ وہاں پینتیس لاکھ مسلمانوں کی موت وحیات کا مسئلہ پیش تھا ۔ لیکن جونہی اس کے ننھے بچّے کے انگوٹھے پر ایک خراش آئی وہ بھاگی ہوئی کراچی پہنچ گئی "۔

"پینتیس لاکھ مسلمان کشمیر میں موت کا سامنا کر رہے ہیں ۔ اور یہ شخص (یعنی وزیر اعظم پاکستان) اپنے آپ کو نہرو کا چھوٹا بھائی کہتا ہے ۔ میں کہوں گا ' سگ باش برادر خورد مباش ' "

اس تقریر میں اس نے حکام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب انگریزوں کے چیلے اور بداخلاق لوگ ہیں ۔ قمار بازی کرتے ہیں اور شراب پیتے ہیں " میں نے ایک دفعہ مسٹر نون چیف منسٹر سے ذکر کیا کہ ایک ضلع کا ڈپٹی کمشنر ساری رات جُوا کھیلتا ہے ۔ اور دن بھر عدالت میں اونگھتا رہتا ہے ۔ یہ بارہ لاکھ انسانوں کا نمائندہ قمار باز اور زناکار ہے ۔ اس کا چال چلن نہایت مکروہ ہے ۔ لیکن وہ صاحب بہادر ہے اس شکایت پر کوئی کارروائی نہ کی گئی "۔

عدالت میں اس گواہ کی شہادت اس طرح جاری رہی :-

"سوال ۔ آپ نے اس قرارداد کا مسودہ کب تیار کیا تھا ۔ جو صوبہ مسلم لیگ کی کونسل کو بھیجی گئی تھی ؟
جواب ۔ قرارداد کا مسودہ کونسل کے اجلاس سے دس پندرہ دن پہلے تیار کیا گیا ہوگا ۔
سوال ۔ آپ نے اس قرارداد کا مسودہ تیار کرتے وقت کسی سے مشورہ کیا تھا ؟
جواب ۔ یہ میرا انفرادی فعل تھا ۔
سوال ۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس قرارداد میں خطرناک امکانات مضمر تھے ؟
جواب ۔ جی نہیں ۔ میں جو قرارداد پیش کرنا چاہتا تھا اس میں مجھے کوئی خطرہ نظر نہ آتا تھا ۔
سوال ۔ کیا آپ نے قرارداد بھیجنے سے پہلے مسلم لیگ کے کسی اعلیٰ صاحب اختیار سے مشورہ کیا تھا ؟

جواب ۔ جی نہیں

سوال ۔ کیا آپ ڈائرکٹ ایکشن کے حامی تھے ؟

جواب ۔ میں نہیں جانتا ڈائرکٹ ایکشن کیا چیز ہے ۔ جس عمل کا فیصلہ ہوا تھا وہ 'راست اقدام' تھا ۔

سوال ۔ آپ نے 'راست اقدام' کا لفظ پہلے پہل کب سنا ؟

جواب ۔ مجھے یاد نہیں ۔

سوال ۔ 'راست اقدام' کی اصطلاح کس سلسلے میں آپ کے سامنے آئی ؟

جواب ۔ میں نے اخباروں میں پڑھا تھا کہ مرکزی مجلس عمل نے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں یہ دھمکی دی ہے کہ اگر مطالبات پورے کئے گئے تو 'راست اقدام' کیا جائے گا ۔

سوال ۔ آپ نے اس 'راست اقدام' سے کیا مطلب سمجھا ؟

جواب ۔ میں اس اصطلاح سے یہ سمجھا کہ مسلمان اپنے مطالبات کو حکومت تک پہنچانے کے لئے عام جلسے کریں گے اور قرار دادیں منظور کریں گے اس کے علاوہ اس سلسلے میں حکام اضلاع کے پاس وفد بھیجیں گے لیکن کوئی غیر آئینی طریقے اختیار نہ کریں گے ۔

سوال ۔ کیا راست اقدام کی قرارداد سے پہلے حکومت اور اس کے افسروں کے پاس وفد نہیں گئے تھے اور صوبے کے قریب قریب ہر مقام پر مطالبات کی حمایت میں عام تقریریں نہیں کی گئی تھیں ؟

جواب ۔ جی ہاں ۔ یہ تمام باتیں پہلے کی جا چکی تھیں لیکن راست اقدام کی قرارداد کے بعد ان کو زیادہ زور شور سے کرنا مقصود تھا ۔

سوال ۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کی ایم ۔ ایل ۔ اے کی حیثیت مسلم لیگ کی طفیل سے ہے ؟

جواب ۔ جی ہاں ۔ میں خوب جانتا ہوں ۔

سوال ۔ کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ برسر اقتدار حکومت مسلم لیگی حکومت ہے ؟

جواب ۔ جی ہاں ۔ میں یہ بھی خوب جانتا ہوں ۔

سوال ۔ اگر 'راست اقدام' سے سول نافرمانی یا قوانین ملکی کی خلاف ورزی مراد ہوتی تو آپ یقیناً اس تحریک میں شامل نہ ہوئے ہوتے ؟

جواب ۔ جی نہیں ۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ 'راست اقدام' سے مراد وہی ہے جو عدالت نے بیان کیا ہے تو میں اس تحریک میں شامل ہونے سے احتراز کرتا ۔

سوال ۔ کیا آپ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ کسی مسلم لیگی کا کوئی فعل جس سے حکومت کو پریشان کرنا یا اس کو اقتدار سے محروم کرنا مقصود ہو ۔ لیگ کے ساتھ وفاداری کے منافی ہے ؟

جواب ۔ اگر کوئی مذہبی معاملہ پیش آ جائے تو میں مسلم لیگ یا مسلم لیگی حکومت کی کوئی پروا نہ کروں گا ۔"

اب ان اشخاص کی شہادتوں سے جو نتائج مترتب ہوتے ہیں ۔ وہ یہ ہیں : سنی مسلم لیگ گو جرانوالہ میں دو حریف گروہ ہیں ۔ یعنی مسٹر آفتاب احمد اور مسٹر منظور حسن کا گروہ ۔ اور شیخ برکت علی اور شیخ محمد عاشق کا گروہ ۔ پہلا گروہ برسر اقتدار ہے ۔

اور بین السطور سے ظاہر ہے کہ ضلع کے انتظام حکومت پر اپنا قابو رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرا گروہ جو لیگ میں برسر اقتدار نہیں لیکن حکام ضلع کا پسندیدہ ہے پہلے گروہ کو بے دخل کرنے کا خواہش مند ہے۔ لہذا پہلا گروہ اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کی غرض سے کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہے جس سے اس کو مقبولیت عامہ حاصل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس گروہ کو ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے ختم نبوت کی تحریک اور احمدیوں کے خلاف شورش سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا۔ لہذا اس گروہ کے نزدیک یہ بالکل جائز تھا کہ مساجد کے جلسوں پر دفعہ ۱۴۴ کے احکام کے اطلاق پر حکومت کی مذمت کرے۔ اس کے نزدیک وہ لوگ ہیرو تھے جن پر ان احکام کی خلاف ورزی کا الزام عائد ہوا۔ لہذا اس نے ان کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس نے حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ان احکام کو واپس لے لے کیونکہ ان سے مداخلت فی الدین لازم آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں سٹی مسلم لیگ نے مسلم لیگی حکومت کی تائید کرنے اور لوگوں کو یہ سمجھانے کے بجائے کہ مساجد کو ایک ایسی سیاسی پارٹی کی جلسہ گاہ بنا دینا جو مسلم لیگ کی مخالف ہے مساجد کی توہین ہے۔ حکومت کی مذمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اس مذمت سے برسر اقتدار گروہ زیادہ ہر دلعزیز ہوتا تھا۔ اور اس کے مخالف گروہ کی چالیں ناکام ہوتی تھیں۔ اسی مقصد سے مسٹر منظور حسن سکرٹری سٹی مسلم لیگ نے احراریوں کے حلف نامے پر دستخط کئے۔ سرمایہ فراہم کیا۔ جلوسوں کی قیادت کی۔ اور ڈائرکٹ ایکشن کے پروگرام کے ماتحت ہر دوسری سرگرمی میں حصہ لیا۔ جب یہ گواہ کہتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ جبر کے ماتحت کیا تو ہمیں اس کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں آتا۔

قاضی مرید احمد سرگودھا میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ کوئی انکم ٹیکس ادا نہیں کرتا۔ اور صرف بیس کنال زمین کا مالک ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح مسلم لیگ نے اس کو قانون ساز اسمبلی میں منتخب کرا دیا۔ وہ مسلم لیگ کا مخلوق ہونے کے باوجود اس امر کو بالکل جائز اور مناسب سمجھتا ہے۔ کہ ضلع کی مجلس عمل کا ڈکٹیٹر بن جائے اور اپنے ضلع میں مسلم لیگی حکومت کے خلاف بغاوت کی رہنمائی کرے۔ نہ وہ اس امر کو نازیبا محسوس کرتا ہے کہ اپنے گرد ایک اجتماع کو جمع کر کے وزیر اعظم پاکستان اور ان کی بیگم کے خلاف استہزا کرے اور ہر برسر حکومت شخص کو گالیاں دے۔ اور ان تمام حرکات کو ختم نبوت کے نام پر جائز سمجھے۔

مسلم لیگیوں نے فسادات کے آغاز سے پہلے اور بعد میں جو حصہ لیا۔ وہ ہمارے لئے ہرگز مقام تعجب نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کے ممبروں کی یہ سرگرمیاں مسلم لیگی قرارداد اور صدر صوبہ مسلم لیگ کی تقریروں کا قدرتی نتیجہ تھیں۔ میر نور احمد ڈائرکٹر تعلقات عامہ کی سرگرمیوں کے متعلق شہادت میں تحریک کو خاص "راستے پر لگانے" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ لیکن اس لفظ کو صوبہ مسلم لیگ کی قرارداد اور اخباروں اور تقریروں میں اس کی پے در پے توضیح و تصریح کے اثرات واضح کرنے کے لئے بالکل موزوں طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب مطالبات کی حمایت میں اخباروں کے مسلسل پروپیگنڈا اور ان کی آئینی نوعیت پر اصرار کا حال ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے علم میں آیا۔ جو ماہ جولائی ۱۹۵۲ء میں لاہور آئے ہوئے تھے اور ان سے یہ شکایت کی گئی۔ کہ یہ پروپیگنڈا ان اخباروں میں کیا جا رہا ہے جن کو بڑی بڑی رقوم حکومت سے ملی تھیں۔ اور اس پروپیگنڈا کو میر نور احمد چلا رہے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے افسر مذکور کو طلب کیا۔ اس افسر نے وزیر موصوف کے سامنے اعتراف کیا کہ جو کچھ وہ کر رہا تھا اس کا مقصد

یہ تھا۔ کہ تحریک کو ایک "خاص" راستے پر لگا دیا جائے۔ اگرچہ میر نور احمد نے اس اعتراف سے انکار کیا ہے لیکن یہ اعتراف پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ اور اس عجیب و غریب استعارے کا صرف یہی مطلب سمجھا جا سکتا ہے کہ میر نور احمد نے اس تحریک کے لیے ایک راستہ پیدا کر لیا تھا۔ اور اس راستے کا رُخ قدرتی طور پر کراچی کی طرف ہی ہو سکتا تھا کیونکہ آل پاکستان مسلم لیگ اور مرکزی حکومت دونوں کا مرکز کراچی تھا۔ تمام شہادت تقریری بھی اور تحریری بھی جس کی مقدار بہت زیادہ ہے اور جس میں اخباروں کے بے شمار مضامین اور تقریریں شامل ہیں۔ اس امر کی مظہر ہے کہ مسلم لیگ کی قرارداد مورخہ ۱۷ جولائی کے بعد ہر شخص جو اس تحریک سے وابستہ تھا۔ اس آئینی موقف کو خوب سمجھنے لگا تھا کہ صوبجات میں پروپیگنڈا کرنا بے سود ہے۔ اور جب تک یہ مطالبات باقاعدہ طور پر دستور ساز اسمبلی میں پیش نہ کئے جائیں گے۔ اس شورش کا کوئی محسوس نتیجہ نہ نکلے گا۔ لہذا تمام جماعتوں نے جو مطالبات کی منظوری کے لئے چیخ پکار کر رہی تھیں۔ اپنی تمام سرگرمیوں کا رخ مرکزی حکومت کی طرف کر دیا۔ جس کے رئیس خواجہ ناظم الدین تھے۔ اس لئے اگر خواجہ ناظم الدین ان مطالبات کو تسلیم نہ کر سکے۔ اور نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ڈائرکٹ ایکشن شروع ہو گیا۔ اور فسادات پھوٹ پڑے تو واقعات کی ذمہ داری واضح طور پر مسلم لیگ پر بھی اسی طرح عاید ہوتی ہے جس طرح آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس پر جس نے مطالبات وضع کئے تھے۔ اور خواجہ ناظم الدین کے سینے پر پستول رکھ کر ان کے سامنے وہ مطالبات پیش کئے تھے۔ اس تمام دوران میں مسلم لیگ یا اس کے کسی لیڈر نے نہ تحریک کی مزاحمت کے لئے کچھ کیا اور نہ عوام کے سامنے کوئی مقابلے کا نظریہ پیش کیا۔ بلکہ اس کے برعکس مسلم لیگ نے اپنی قرارداد کے ذریعے سے اپنے آپ کو اس قدر ناقابل انکار طور پر پابند کر لیا تھا کہ وہ بعد میں اس رائے سے روگرداں نہ ہو سکتی تھی۔ جو اس نے رسمی حیثیت سے اپنی قرارداد میں ظاہر کر دی تھی۔ اور جس کے بہترین مفسر خود لیگ کے صدر صاحب تھے۔ اگر وہ ایسا کرتی تو انتہائی تحقیر اور غیر ہردلعزیزی کا شکار ہو جاتی۔ ہمیں اس امر میں ذرا سا شبہ بھی نہیں ہے کہ اس تمام جھگڑے کے ایک سے زیادہ معقول جواب دیئے جا سکتے تھے۔ اگر مسلم لیگ کے لیڈروں کو ان مطالبات کے نتائج کو پوری طرح سمجھنے کی توفیق ہوتی اور وہ صوبے کو ذلت اور تباہی سے بچانے کے قابل اور اس کے خواہشمند ہوتے تو وہ ضرور اس میں کامیاب ہو جاتے۔ گوجرانوالہ اور سرگودھا کے مقدمات اور کیمپ کے واقعہ میں بہت بڑے سبق پوشیدہ تھے۔ اگر وہ سبق صحیح طور پر پڑھائے جاتے تو عوام کی آنکھیں کھل جاتیں۔ اور ان کو اس شورش سے باز رکھا جا سکتا تھا جو چند سیاسی طالع آزماؤں نے ان کی حکومت کو شکست دینے کے لئے برپا کر رکھی تھی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارا عام آدمی لازمی طور پر صحیح الدماغ ہے۔ اور اگرچہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح بلکہ شاید ان سے زیادہ مذہبی واقع ہوا ہے۔ لیکن اگر معاملات کو موزوں طریق پر اس کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ ان کی حقیقی صورت کو سمجھنے کی بھی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ وہ ایک نئی مملکت کا دیانتدار اور محب وطن شہری ہے۔ اور اگر اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی۔ کہ چند سیاسی مایوسین نے اپنے پرانے گناہوں کو دھونے کی غرض سے جس عمومی جذبے کو برانگیختہ کیا ہے۔ اس کے امکانات نہایت خطرناک ہیں تو وہ اپنے لیڈروں کی بات ضرور سنتا۔ اگر بازار کے عام آدمی کو موزوں طریق پر بتایا جاتا کہ ایک سیاسی جماعت جو مسلم لیگ کے حریف کی حیثیت سے میدان میں آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مذہب کو محض ایک آلۂ کار کے طور پر

استعمال کر کے عوام میں مقبول ہونا چاہتی ہے اور عام آدمی کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ تو وہ آدمی یقیناً اس بات کو سمجھ جاتا۔ گوجرانوالہ اور سرگودھا میں دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی جو خلاف ورزیاں کی گئیں وہ اس امر کا واضح نمونہ تھیں کہ مذہب کو کس طرح سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ سرگودھا میں ایک باقاعدہ جلسہ عام جمعہ کے دن ایک مسجد میں دس بجے قبل دوپہر منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر ضرورت صرف اس کی تھی کہ اس جلسے کے منتظمین کو چیلنج دیا جاتا۔ کہ آیا جمعہ کی نماز دس بجے ہوا کرتی ہے؟ اور پھر لطف یہ ہے کہ اس جلسے کے صدر اور اس کے مقررین کے ناموں کا اعلان اس سے پیشتر رسمی طور پر کیا جا چکا تھا۔ یہی کیفیت گوجرانوالہ میں ہوئی۔ احرار نے جلسے سے ایک دن پیشتر پوسٹروں اور لاؤڈ سپیکروں سے اس جلسے کا اعلان کیا۔ اور ان اعلانات میں بیان کیا گیا کہ فلاں فلاں احراری لیڈر مختلف مقامات سے جلسے میں تقریریں کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ جب خطیب خطبہ پڑھ رہا تھا اس وقت پھر ایک شخص نے جلسے کا اعلان کیا اور یہ جلسہ اصل میں اس وقت منعقد ہوا جب نماز جمعہ ہو چکی۔ اگر مسلم لیگ کے لیڈر احراریوں کی ان چالوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے تو ہمیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ لوگ اپنے رویے میں ترمیم کر لیتے.. اور حکومت کے نقطۂ نگاہ کو سمجھ کر اس کی قدر کرتے۔

ہمارے سامنے جماعتوں کے فاضل وکیل نے بار بار جمہوریت کے اصولوں کا اعادہ کیا ہے۔ اور اس پر بہت زور دیا ہے کہ مطالبات متفقہ ہیں۔ اور کسی جمہوری ملک میں جب کسی مطالبے کی حمایت و تائید قوی اور عالمگیر ہو جائے تو حکومت اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی۔ خواہ اس تسلیم کے نتائج کچھ بھی ہوں۔ یہ بھی کہا گیا کہ ہمارے سیاسی لیڈر چونکہ عوام کے ووٹ سے منتخب ہوئے ہیں۔ اور اپنی موجودہ کرسیوں پر محض اس لئے متمکن ہیں کہ عوام نے ان کو وہاں بٹھایا ہے۔ اس لئے ان کا فرض ہے کہ ان کے ووٹر جو کچھ کہیں وہ اس کی تعمیل کریں یہی اصول ہمارے سامنے وزارت اور مسلم لیگ کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ ایک نمایندہ حکومت میں کوئی سیاسی لیڈر صرف اسی صورت میں نمایندہ جمہور کہلا سکتا ہے۔ کہ وہ جمہور کے احساسات۔ تعصبات اور خواہشات کا احترام کرے اور ان کو عمل میں لائے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ نہایت ادنیٰ نصب العین ہے جسے ہمارے لیڈر اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جس کے اکثر لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ اور صرف قلیل سا تناسب خواندہ ہے۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا پریشان کن نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے لیڈر ہمیشہ عوامی جہالت و تعصب کے پیکر اور بلند نصب العینوں سے بالکل خالی اور محروم رہیں گے۔ جہاں ووٹر اپنے ووٹ کی قدر و قیمت کو جانتا ہو۔ اپنے ملک کے مخصوص مسائل کو اور دنیا کے واقعات کی رفتار کو سمجھنے کے لئے ضروری عقل و فراست سے بہرہ ور ہو اور تمام قومی معاملات پر صحیح رائے قائم کرنے والا اتنا ترقی یافتہ ذہن رکھتا ہو۔ وہاں لیڈر یقیناً اس امر کا پابند ہوتا ہے کہ رائے عامہ کی پیروی کرے یا اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جیسا ہمارا ملک ہے۔ بلاشک و شبہ لیڈروں کا حقیقی وظیفہ یہ ہے کہ عوام کی رہنمائی کریں۔ نہ کہ شروع سے آخر تک ان کی مرضی پر اور بقول مسٹر قربان علی خاں کے "ہر وقت ریوڑ کے آگے آگے" چلیں۔ خوف یہ تھا کہ اگر

ہم نے جرأت و ہمت کا کوئی اقدام کیا تو عوام میں نامقبول ہو جائیں گے۔ زیادہ تر اسی خوف کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک ایسی تحریک کا مقابلہ کرنے یا اس کو روکنے کے لئے جس نے اپنی بظاہر مذہبی اپیل کی وجہ سے جمہور پر نہایت سرعت سے قابو پا لیا تھا۔ جس نظریے کی ضرورت تھی وہ بالکل ناپید رہا۔ لہذا ہماری رائے یہ ہے کہ ہمارے لیڈر اپنے فرض کی بجا آوری میں قاصر رہے ہے۔ اور ایک ایسی صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے قطعاً ناقابل ثابت ہوئے جو دوراندیشی دانشمندی اور حسن تدبیر کے تمام اوصاف کی متقاضی تھی۔ اس تمام دوران میں ایک بھی عوامی لیڈر نے شہریوں کی عام عقل و فہم کو اپیل کرنے کی جرأت نہ کی۔ یہاں تک کہ جب فسادات کی آگ پوری شدّت سے بھڑک رہی تھی۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی عوام کو یہ سمجھانے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ ان کو گمراہ کر کے ایک ایسے راستے پر ڈالا جا رہا ہے۔ جس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے ٹکڑے اڑ جائیں گے۔ صدر صوبہ مسلم لیگ کہتے ہیں۔ کہ اگر وہ اپنے ارادے پر انحصار رکھتے تو انتہائی کوشش کرتے کہ یہ مطالبات وجود میں نہ آتے۔ کیونکہ یہ مطالبات بجائے خود نہ بنیادی تھے نہ فوری طور پر ضروری تھے۔ اور ایسے گھریلو تنازعات کو چھیڑنا اس وقت تک بالکل بے موقع ہے۔ جب تک پاکستان محفوظ نہ ہو جائے۔ لیکن ہمارے سامنے کوئی ایسی شہادت موجود نہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہو۔ کہ ۲۷۔ جولائی کی قرارداد سے بیشتر اس خیال کو عوام کے سامنے پیش کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی۔ نہ اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ اس مسئلے کو اہمیت دینے سے مسلم لیگ کی شاخوں کو باز رکھنے کی کوئی سعی عمل میں لائی گئی۔ بلکہ اس کے برعکس صوبہ مسلم لیگ نے ایک نامزدوں وقت پر اپنا سالانہ اجلاس منعقد کیا اور کونسلروں نے جو قرارداد منظور کی اس کا مسودہ خود جناب صدر نے مرتب کیا۔

اس مرحلے پر ہم ایک اور بات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو بے حد اہم ہے۔ کسی خاص انتظام کے ماتحت جس کا اصول ہماری سمجھ میں نہیں آیا صوبہ مسلم لیگ کا لیڈر صوبے کا چیف منسٹر بھی ہوتا ہے۔ لہذا ایسا ہو سکتا ہے اور اس قصے میں ایسا ہوا کہ مسلم لیگ کا لیڈر قانون و انتظام کے محکمے کا انچارج بھی تھا۔ اگر ایک ہی آدمی دو مختلف عہدوں پر قابض ہو تو یہ امر ناگزیر ہے کہ جو فیصلے وہ یا اس کی پارٹی سیاسی دائرے میں کرے وہ اگر قانون و انتظام کے دائرے سے متعلقہ معاملات کے ساتھ دور یا نزدیک کا واسطہ رکھیں تو ان فیصلوں کا اثر آخر الذکر دائرے پر پڑے۔ لیکن اربابِ ریاست کے وظائف ایک حاکم کے وظائف سے لازماً مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شخص سیاسی آدمی ہونے کی حیثیت سے محض پالیسی وضع کرتا ہے۔ لیکن ایک حاکم کا کام یہ ہے کہ قانون کی موجودہ مشین کو بلالحاظ کسی سیاسی مصلحت کے اس مقصد سے استعمال کرے کہ امن و انتظام قائم رہیں۔ اور معاشرے کی سلامتی پر جو حملے ہوں ان کو دفع کیا جا سکے۔ اس تحقیقات کے دوران میں یہ نکتہ اس حد تک ثابت و واضح ہو گیا ہے کہ اس قسم کے انتظامات کے سنگین نتائج کے متعلق شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی مسلم لیگ کے انتخابی اعلان میں اس نکتے کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ مسلم لیگ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اور ذمہ لیتی ہے کہ یہ قانون جو عام طور پر تشدد آمیز سمجھا جاتا ہے منسوخ کر دیا جائے گا۔ لیکن پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کو قانون کی

تشکیل دی گئی کیونکہ موجودہ حالات میں اس قسم کے غیر معمولی قانون کا نفاذ ضروری سمجھا گیا۔ تاکہ اگر کسی خاص صورت حالات میں سلامتی عامہ اور قیام انتظام کو شدید خطرہ پیش آنے کا احتمال ہو تو ہیئت منتظمہ کے پاس کافی اختیارات محفوظ ہوں۔ اس ایکٹ کی دفعہ ۳ کے ماتحت حکومت کو اختیار ہے کہ اگر اس کے نزدیک کسی شخص کو سلامتی عامہ یا نظم عمومی کے منافی عمل سے روکنا ضروری ہو تو اسکو نظر بند کر دے۔ اس ایکٹ کی دفعہ ۵ میں اسی مقصد سے حکومت کو اختیار دیا گیا ہے کہ کسی شخص کی حرکات و سکنات پر حکماً پابندی لگا دے یا اسکو عام تقریریں کرنے سے روک دے۔ ایکٹ کی دفعہ ۶ میں حکومت کو پریس اور اخبارات پر وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں۔ لیکن ان اختیارات کا استعمال صرف اس حالت میں ہو سکے گا۔ جب کسی اخبار کے طابع۔ ناشر یا ایڈیٹر کو کسی ایسی سرگرمی سے روکنا مقصود ہو جو سلامتی عامہ یا نظم عمومی کے قیام کے منافی ہو۔ دفعہ ۱۲ کے ماتحت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اختیار دیا گیا ہے کہ کسی پبلک مقام پر کسی جلوس یا مظاہرے یا عام جلسے کو ممنوع قرار دے دے۔ دفعہ ۲۱ کے ماتحت یہ امر جرم قابل سزا قرار دیا گیا ہے۔ کہ کوئی شخص ایسی تقریر کرے۔ یا کوئی ایسا بیان یا افواہ یا اطلاع شائع کرے جس سے عوام میں خوف یا دہشت پیدا ہو۔ یا پیدا ہونے کا احتمال ہو یا اس سے پاکستان کی کسی حکومت یا حکومت کے کسی ملازم کی بدنامی ہو۔ یا ہونے کا احتمال ہو۔ یا اس سے کسی ایسی سرگرمی کو تقویت ملے یا تقویت ملنے کا احتمال ہو جو سلامتی عامہ یا نظم عمومی کے قیام کے منافی ہو۔ دفعہ ۲۳ کے ماتحت یہ امر قابل سزا ہے کہ کوئی بناوٹی رسم ادا کی جائے جو موت سے متعلق یا اس کے نتیجے سے منسوب ہو (مثلاً جنازے وغیرہ نکالنا) آخر میں دفعہ ۲۵ ایسے شخص کو قابل سزا قرار دیتی ہے جو کسی سرکاری ملازم یا مقامی ہیئت مختارہ کے کسی ملازم کو یہ ترغیب دے یا ترغیب دینے کی کوشش کرے کہ وہ ایسے ملازم کی حیثیت میں اپنے فرائض کی بجا آوری کی پروا نہ کرے یا بجا آوری سے قاصر رہے۔ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی یہ دفعات فوری ضرورت کے قانون کی نوعیت رکھتی ہیں۔ ان معنوں میں کہ یہ اُس وقت استعمال کی جائیں گی جب معمولی قانون کام نہ دے اور عوام کے امن اور ان کی سلامتی کو شدید خطرہ در پیش ہو۔ اس ایکٹ کا استعمال اُسی صورت میں مقصود ہے جب ان فوق العادۃ اختیارات کے استعمال کا جواز موجود ہو۔ اور ملک کا معمولی قانون صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہو۔ اس لئے گو مسلم لیگ اس قانون کی مخالف تھی لیکن پھر بھی لیگ کے لیڈر کا جو قانون و انتظام کا انچارج بھی تھا یہ فرض تھا کہ اگر اس کے نزدیک امن عامہ اور نظم عمومی کو ایسا خطرہ لاحق تھا جس کے مقابلے کے لئے ایسے قانون کی ضرورت تھی تو وہ ان فوق العادۃ اختیارات کو استعمال کرتا۔ جس وقت سے احمدی غیر احمدی نزاع نے امن و امان اور سلامتی عامہ کے لئے خطرے کی صورت اختیار کی بعض افسروں نے جن کے نزدیک ان دفعات کا استعمال ضروری تھا۔ وزارت سے پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی کسی نہ کسی دفعہ کے ماتحت کارروائی کی سفارش کی۔ لیکن جس وقت یہ معاملہ مسلم لیگ کے لیڈر کے سامنے صوبے کے چیف منسٹر کی حیثیت میں پیش ہوا اس نے ایسے فیصلے کئے جن کا محرک مسلم لیگ کا نظریہ تھا۔ حالانکہ نظم و نسق حکومت کے نقطۂ نگاہ سے وہ فیصلے غلط تھے۔

جن مقدمات کے متعلق انتظامی افسروں کو کارروائی کرنی پڑی۔ ان کے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسی سفارشات کی گئیں کہ فلاں شخص کو زیر دفعہ ۳ گرفتار کیا جائے۔ یا زیر دفعہ ۵۔ اسے تقریریں

کرنے سے روک دیا جائے۔ یا اس کی حرکات و سکنات کو کسی مقام میں پابند کر دیا جائے۔ یا زیر دفعہ ۲۱ - حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو گالیاں دینے یا ان کے جنازے نکالنے کی وجہ سے مقدمہ چلایا جائے۔ لیکن ارباب سیاست کو پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ سے نفرت تھی۔ اور جب کبھی اس ایکٹ کے ماتحت کسی کارروائی کی سفارش کی گئی۔ اس کو ہمیشہ سیاسی عینک سے دیکھا گیا اور جو فیصلے کئے گئے ان میں ہمیشہ ارباب سیاست نے حکام پر غلبہ حاصل کیا۔ قانون و انتظام کا انچارج حاکم جو اقدام بھی کرنا چاہتا ہے یا اسے کرنا پڑتا ہے اس میں وہ صرف قانون و انتظام کے پہلو کو دیکھتا ہے۔ لیکن سیاسی آدمی کی سب سے پہلی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ مجوزہ کارروائی سے اس کی اور اس کی جماعت کی ہر دلعزیزی پر کیا اثر پڑے گا۔ اس ذہنیت کی ایک دلچسپ مثال اُس خیال میں ملے گی۔ جو مشیر شعبۂ قانون و انتظام نے اس وقت ظاہر کیا تھا جب میاں انور علی نے ۳۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کو یہ سفارش کی کہ بعض احراری لیڈروں کے خلاف زیر دفعہ ۱۵۳ - الف اور زیر دفعہ ۲۱ - پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ مقدمات چلائے جائیں۔ ملک محمد انور نے جو سیاسی آدمی تھے۔ اس مجوزہ کارروائی کے خلاف فیصلہ کیا۔ اور لکھا کہ "مسلمان چونکہ احمدیت کے معاملے میں بہت حساس ہو رہے ہیں لہذا اگر احراریوں کے خلاف احمدیوں کو برا بھلا کہنے کی وجہ سے مقدمات چلائے گئے، تو انہیں عوام کی نگاہوں میں وہ درجۂ شہادت حاصل ہو جائے گا۔ جس کے وہ مستحق نہیں ہیں"۔ یہی خیال انہوں نے بعد میں بھی دہرایا۔ اور مسٹر دولتانہ کا رویہ بھی شروع سے آخر تک یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب کبھی انہوں نے سمجھا کہ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت کوئی کارروائی عوام میں غیر مقبول ہوگی وہ ہمیشہ اس ایکٹ کے استعمال سے متنفر رہے۔ ایک مقدمے میں تو انہوں نے صاف صاف فتوےٰ دیدیا کہ وہ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت کوئی کارروائی کرنے کے حامی نہیں ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ افسر جن کے نزدیک سلامتی عامہ کی حفاظت اور نظم عمومی کے قیام کے لئے یہ ایکٹ بے حد کارآمد تھا۔ اس کی طرف سے بالکل ہی برگشتہ و بے نیاز ہو گئے۔ اب گویا صورت یہ ہوئی کہ جب کوئی سیاسی آدمی بحیثیت حکمران بھی کام کر رہا ہو اس کا اصول یہ ہوگا کہ اگر کوئی اقدام قانون کے ماتحت جائز بھی ہو اور کسی واقعہ کی نوعیت اس کی متقاضی بھی ہو کہ ایسا اقدام کیا جائے تو وہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے عام بے اطمینانی پیدا ہوگی۔ یہ اصول قریب قریب ایسا ہی ہے جیسے مثلاً عوام کسی قتل پر تحسین و آفرین کر رہے ہوں اور قاتل کے خلاف قانونی چارہ جوئی سے عوام کے برہم ہو جانے یا ملزم کے ساتھ عوام کی ہمدردی میں اضافہ ہونے کی توقع ہو تو قاتل کو سزا دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس شورش کے دوران میں قانونی کارروائی کی جتنی تجاویز حکومت کے سامنے پیش ہوئیں۔ ان سب کا فیصلہ بظاہر اسی اصول کے ماتحت کیا گیا۔ ایک اور مثال یہ ہے۔ کہ جب زیر دفعہ ۱۴۴ مسجدوں کے اندر عام جلسے منعقد کرنے کے خلاف احکام دئے گئے اور ان کی خلاف ورزی کی گئی تو احرار اور علماء نے عوام کے سامنے یہ بظاہر معقول دعویٰ پیش کیا۔ کہ حکومت مسجدوں کے اندر ان اشغال و اعمال کی ممانعت کر رہی ہے۔ جو ہمارے مذہب کے نزدیک جائز یا واجب ہیں۔ اور حکومت کے احکام جمہور کے مذہبی حقوق میں مداخلت کا حکم رکھتے ہیں۔ ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ

مداخلت فی الدین کا الزام غلط اور حکومت کے خلاف ایک بے بنیاد اتہام تھا۔ لیکن حکومت کے کارندوں نے ان الزامات کی تردید کے لئے کوئی جوابی پراپیگنڈا نہ کیا۔ مجرمین عوام کے محبوب و ممدوح اور ہیرو سمجھے جانے لگے۔ اور چیف منسٹر صرف اسی فکر میں رہے۔ کہ جس سیاسی جماعت سے ان کا تعلق ہے۔ اس کی حیثیت پر اس جذبے کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اب کیمپ کے واقعہ کو لیجئے۔ اس میں پولیس نے قوت کا استعمال کیا جس سے کچھ جانی نقصانات بھی ہوئے۔ بعد میں قوت کے اس استعمال کو ہائیکورٹ کے ایک جج نے جو اس واقعہ کی تحقیقات پر مامور ہوا تھا حق بجانب قرار دیا۔ لیکن جب اس واقعہ کی اطلاع موصول ہوئی اور اس پر عوام کے غیظ و غضب کا اندازہ کیا گیا تو حاکم نے سیاسی آدمی کے سامنے بالکل ہتھیار ڈال دیئے۔ اور صرف سزا یافتہ مجرمین ہی رہا نہ کر دیئے گئے۔ بلکہ زیر سماعت مقدمات اور دفعہ ۱۴۴۔ کے احکام بھی واپس لے لئے گئے۔ اس کے بعد احراریوں یا دوسرے شورش پسندوں کے خلاف کسی قسم کی موثر کارروائی نہ کی گئی۔ اور انہیں حسب منشا ہر شکل اور ہر وسعت کا پروپیگنڈا کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ تنبیہہ سے زیادہ کسی قسم کی موثر کارروائی نہ کی گئی۔ اور تنبیہوں کا قصہ یہ ہے۔ کہ وہ احراریوں کو بے شمار دفعہ کی گئیں۔ یہاں تک کہ ان کا اعادہ مذاق معلوم ہونے لگا۔ اور ان کے علاوہ بھی مختلف افسروں نے مختلف موقعوں پر انہی لوگوں کو بار ہا تنبیہہ کی۔ اور اسی پر اکتفا کیا۔

بہت سے افسروں نے زیر دفعہ ۱۵۳۔ الف اور زیر دفعہ ۲۹۵۔ الف تعزیرات پاکستان بہت سے مقدمات چلانے کی سفارش کی۔ اور اس باب میں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ کہ جن لوگوں کے خلاف یہ قانونی کارروائی تجویز کی گئی تھی وہ ان دونوں دفعات کے ماتحت جرائم کے مرتکب ہوئے تھے۔ لیکن نہ کسی مقدمے کے دائر کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور نہ کوئی مقدمہ دائر کیا گیا۔ گو بہت ہی آخری مرحلے پر ایک پُر اسرار سا حکم دیا گیا تھا کہ جہاں معمولی قانون کے خلاف کسی جرم کا ارتکاب کیا جائے۔ وہاں ملزموں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ جو لوگ احمدیوں اور ان کے لیڈروں کے خلاف انتہائی نفرت پھیلا رہے تھے ان کے خلاف مضبوط اور موثر کارروائی نہ ہونے کا نتیجہ ظاہر ہے۔ عقیدہ فرد کا ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اور خواہ وہ دوسروں کو کتنا ہی بھونڈا۔ غیر دیانتدارانہ اور مضحکہ خیز معلوم ہو۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس عقیدے کے لوگ نہایت خلوص و دیانت سے اس پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ اور ہمیں اس حقیقت میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ احمدی اپنی جماعت کے بانی کا اور بعد کے لیڈروں کا جن میں موجودہ امام جماعت بھی شامل ہے انتہائی احترام کرتے ہیں لہٰذا ان شخصیتوں پر حملہ ہونے سے احمدیوں کے مذہبی جذبات یقیناً مجروح ہوئے ہوں گے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ احمدیوں کے خلاف چونکہ تضحیک و دشنام طرازی کا پروپیگنڈا صوبے بھر میں نہایت بڑے پیمانے پر جاری کیا گیا تھا۔ اس لئے احمدی نفرت و حقارت سے دیکھے جاتے ہوں گے۔ لہٰذا جو لوگ ایک چھوٹی سی جماعت کے خلاف عوامی جذبات کو مسموم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ ان کے خلاف کسی کارروائی کے فقدان کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ایسی تدبیر اختیار نہ کرنی پڑے جس سے عوام کی بے اطمینانی میں اضافہ ہو جائے۔ خواہ اس چھوٹی جماعت کو کتنا ہی گہرا اور شدید صدمہ پہنچا ہو۔ اس تمام صورت حالات کی وجہ صرف یہ تھی کہ مسلم لیگ اور اس کے لیڈر عوام کے نزدیک ہر دلعزیز رہنا چاہتے تھے۔ اور کوئی ایسی

حرکت نہ کرنا چاہتے تھے جس کی وجہ سے ووٹر ناراض ہو جائیں اور لیگ کو اقتدارِ حکومت سے محروم کر دیں۔

اسی خواہش نے مسٹر دولتانہ کو ۶۔ مارچ ۱۹۵۳ء والا بیان شائع کرنے کی ترغیب دی۔ ہمارے سامنے یہ تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ یہ بیان ان معنوں میں غیر دیانت دارانہ تھا۔ کہ اس کی حیثیت ایک سیاسی چال سے زیادہ نہ تھی۔ اور یہ چال اس لئے چلی گئی تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے مارشل لا نافذ نہ ہونے پائے۔ یہی نتیجہ اس واقعہ سے بھی نکلتا ہے کہ بعد میں مسٹر دولتانہ نے ۱۰ مارچ کو یہ بیان خود ہی واپس لے لیا۔ سوال یہ ہے کہ پھر یہ بیان جاری ہی کیوں کیا گیا۔ خصوصاً ایسے وقت جب مسٹر دولتانہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ مارشل لا نافذ کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے یا عنقریب ہونے والا ہے؟ اس کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے کہ عوام میں ہر دلعزیز رہنے کی خواہش نے مسٹر دولتانہ سے یہ بیان جاری کرایا۔ مسٹر دولتانہ نے اس بیان کے اثرات و نتائج پر ایک لمحے کے لئے بھی غور نہ کیا۔ اور اس انتہائی پریشانی کا اندازہ بھی نہ لگایا جو اس سے مرکزی حکومت کو لاحق ہونی ضروری تھی۔ اور لاحق ہوئی۔ مسٹر دولتانہ نے سوچا کہ مرکزی حکومت خواہ کتنی ہی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جائے مجھے ضرور کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہیئے جس سے میں ہر دلعزیز ہو جاؤں۔

اخبارات

ہم زمانہ زیرِ بحث کے دوران میں اخباروں کی سرگرمیوں کا ذکر اور ان پر تبصرہ تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے بدترین مجرم "آزاد"۔ "زمیندار"۔ "احسان"۔ "آفاق" اور "مغربی پاکستان" تھے۔ ان میں سے پہلا تو خالص احراری اخبار تھا۔ لیکن باقی چار یقیناً حکومت کے اثر کو قبول کر سکتے تھے کیونکہ وہ حکومت سے بڑی بڑی رقمیں وصول کر چکے تھے۔ "آفاق" عملاً مسٹر دولتانہ کا اپنا اخبار تھا۔ بہرکیف وہ براہِ راست میر نور احمد کے اختیار اور نگرانی کے ماتحت تھا۔ جو ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ کی حیثیت سے پالیسی کے معاملات میں مسٹر دولتانہ کے زیرِ اثر تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی طرح ہم بھی اس امر کا تصور نہیں کر سکتے۔ کہ مسٹر دولتانہ اس مواد کی نوعیت اور مقدار سے بے خبر تھے۔ جس کو اس طویل مدت کے دوران میں یہ اخبارات شائع کرتے رہے۔ اگر آفاق مورخہ یکم جون کا مقالہ تحریک کے متعلق اس کے گزشتہ رویئے کا مظہر تھا تو اس وقت تک یہ اخبار اس نزاع کے متعلق معقول رائے ظاہر کر رہا تھا۔ لیکن جولائی کے اوائل میں اس کی پالیسی میں دفعتہً ایک انقلاب آیا۔ اور اس نے نہ صرف اس شورش کی طرف غیر معمولی توجہ شروع کر دی بلکہ اس موضوع پر اپنے خیالات بالکل تبدیل کر لئے۔ اور اس کے مضامین اپنی پالیسی اور دلائل کے اعتبار سے کاملاً مسلم لیگ کی قرار داد اور مسٹر دولتانہ کی تقریروں سے ہم آہنگ ہو گئے۔

غالباً اس نے اپنے خیالات قرارداد اور تقریروں سے مستعار لئے - لیکن یہ بھی ممکن ہے - گو اس کی براہ راست کوئی شہادت نہیں - کہ مسٹر دولتانہ اور میر نور احمد کے درمیان جو اس اخبار کی پالیسی کے نگراں تھے - کچھ اشتراک عمل موجود ہو تاکہ اس طوفان کا رُخ کراچی کی طرف پھیر دیا جائے - بہرحال اس اخبار نے صوبہ مسلم لیگ کی قرارداد مورخہ ۲۷ - جولائی کے بعد جو مضامین لکھے ان کا قدرتی اثر یہی تھا -

بیان کیا جاتا ہے کہ "زمیندار" کی مقبولیت اور اشاعت کی وجہ یہ تھی کہ وہ احمدیوں کو متواتر دشنام و استہزا کا نشانہ بناتا رہا - تاہم ہمیں یقین نہیں ہے کہ اگر ڈائرکٹر تعلقات عامہ اس معقول مالی امداد کے پیش نظر جو حکومت نے اس اخبار کو دی تھی اس کی سرگرمیوں پر قابو رکھنے کی خواہش کرتے تو جب بھی یہ اخبار اپنے رویے پر مُصر رہتا - خصوصاً ان تعلقات کے پیش نظر جو مولانا اختر علی خاں اور خود مسٹر دولتانہ کے درمیان قائم تھے - "احسان" اور "مغربی پاکستان" بھی ڈائرکٹر تعلقات عامہ کو ناراض کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے - اوّل الذکر کو سرکاری امداد ایک غیبی عطیہ تھا اور آخر الذکر کو جو امداد دی گئی - وہ اس کی قلیل اشاعت کے مقابلے میں بہت معقول تھی - ان اخباروں نے مطالبات کی حمایت میں بھی پُرزور پراپیگنڈا جاری رکھا - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امر روز بروز زیادہ واضح ہوتا چلا گیا - کہ مطالبات کو تسلیم کرانے کے لئے یا تو خواجہ ناظم الدین کے خیالات بدلنا ضروری ہے یا ان کو دھمکی دے کر مغلوب کرنا ہوگا -

اس رپورٹ کے ایک سابقہ حصے میں ہم نے اُن مضامین کا مفاد نقل کیا تھا جو ان اخباروں نے موجودہ نزاع پر قلمبند کئے تھے - انہوں نے اس موضوع پر بار بار مضامین لکھ کر اس سے جس غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا - اور جس طریقے سے مطالبات کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی - اس سے ان کا یہ مقصد صاف طور پر واضح ہوتا تھا کہ شورش کی آگ کو ہوا دی جائے اور حتی الامکان اس کو وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے - ان اخباروں کے کالموں میں کہیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جس میں ان واقعات کو ناپسندیدہ اور قابل نفریں قرار دیا گیا ہو جو اس سلسلے میں صوبے بھر کے اندر رونما ہو رہے تھے - یہ ثابت کرنے کے لئے کہ احمدی ایک الگ قوم ہیں - طویل اور مدلل مضامین شائع کئے گئے - شورش کے سلسلے میں رونما ہونے والے واقعات کی ہیجان خیز خبریں درج کی گئیں - ملاقاتوں کے نتائج مساجد میں اور دوسرے مقامات پر ہونے والے جلسوں، اور منظور شدہ قراردادوں کا اندراج کیا گیا - ان سب افعال کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ شورش کی وسعت و شدت میں اضافہ ہو - اور اس نتیجے سے یہ اخبارات صرف باخبر ہی نہ تھے بلکہ ان کا مقصد بھی یقیناً یہی ہوگا - مزید برآں ان اخباروں نے اس نکتے پر جو زور دیا کہ یہ مطالبات مرکز کے دائرہ اختیار میں ہیں اس کا اثر بھی صرف یہی ہو سکتا تھا کہ شورش کی رفتار کا رُخ کراچی کی طرف پھر جائے - اس سے قبل ہم اس بیان کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ڈائرکٹر تعلقات عامہ تحریک کو کراچی کے "راستے پر لگانے" کی پالیسی میں شریک تھے اور "آزاد" کے سوا باقی سب مذکورہ اخبارات ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ کے ممنون اور ان سے متاثر

پذیر تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پالیسی میں بھی وہ ڈائرکٹ ایکشن کے پیرو تھے۔ لہٰذا مطالبات کے رد ہونے سے جو صورت حالات پیدا ہوئی اس کے لئے یہ سب ذمہ دار ہیں۔ اس لئے بعد میں رونما ہونے والے فسادات کی ذمہ داری انہی پر ہے۔

مرکزی اور صوبائی حکومتیں

خواجہ ناظم الدین بنام مسٹر دولتانہ

مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت دونوں کے رئیس علی الترتیب خواجہ ناظم الدین اور مسٹر دولتانہ تھے۔ فریقوں نے ان دونوں کو بھی ذمے داری میں شریک بتایا ہے۔ خواجہ ناظم الدین کے خلاف یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگرچہ جماعتوں نے یہ مطالبات اگست ۱۹۵۲ء ہی میں رسمی طور پر ان کی خدمت میں پیش کر دیے تھے۔ لیکن انہوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ بلکہ جب ۲۲ جولائی کو انہیں الٹی میٹم دے دیا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئے یہاں تک کہ انہیں ۲۶ فروری کو اس فیصلے کا علم ہوا کہ اگلی صبح کو ان کی کوٹھی پر پکٹنگ کیا جائے گا۔ درحقیقت مسٹر دولتانہ کے دعوے کے مطابق فساد کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ خواجہ ناظم الدین خاموش رہے۔ ان کا رویہ مذبذب رہا اور وہ علماء سے اکثر طویل مذاکرات کرتے رہے تاہم جماعتیں اس امر پر متفق نہیں ہیں کہ خواجہ ناظم الدین کا رویہ کیا ہونا چاہئے تھا۔ احمدیوں کا قول ہے کہ اگر مرکزی حکومت مطالبات کو فی الفور اور علی الاعلان رد کر دیتی اور صوبے کو ایک واضح اور ذمہ دارانہ ہدایت دے دیتی کہ جو لوگ مطالبات کے لئے شورش برپا کر رہے ہیں ان کے متعلق مضبوط کارروائی کی جائے۔ اور ان کے خلاف قانون کی پوری مشینری کو استعمال کیا جائے تو فسادات بالکل واقع نہ ہوتے لیکن غیر احمدی جماعتیں متفقہ طور پر یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ اگر مطالبات کے ساتھ اتفاق کا اعلان شروع ہی میں کر دیا جاتا اور ان کو تسلیم کرانے کے لئے ضروری تدابیر اختیار کی جاتیں یا اختیار کرنے کا وعدہ کر لیا جاتا تو کسی قسم کی بے چینی یا بدنظمی ظہور میں نہ آتی۔ مسٹر دولتانہ نے کچھ نہیں بتایا کہ خواجہ ناظم الدین کو مطالبات کے متعلق کیا اقدام کرنا چاہیے تھا۔ ان کو صرف یہ شکایت ہے کہ خواجہ ناظم الدین کو کسی پالیسی کا فیصلہ کر کے اس کا اعلان کر دینا چاہیے تھا خواہ وہ پالیسی کچھ بھی ہوتی۔

خواجہ ناظم الدین ایک خاص طور پر دشوار و فی الحقیقت مسئلے سے دوچار ہو رہے تھے ہر قرینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے مطالبے کا مذہبی پہلو خواجہ صاحب کو متاثر کر چکا تھا اور یہ بالکل واضح ہے کہ وہ مطالبات کے قطعی انسداد سے علما کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے وہ اپنے عقائد مذہبی میں صادق اور مخلص تھے اور علما کا بے حد احترام کرتے تھے وہ اس امر سے بھی باخبر تھے کہ علما اب امور ملکی پر بہت بڑا اثر و نفوذ رکھتے ہیں ان کا بلند موقف قرارداد مقاصد میں واضح تھا۔ اور تحریک سے وابستہ ہونے والے بعض علما دستور ساز اسمبلی کے ملحقہ تعلیمات اسلامی بورڈ کے ممبر تھے لہٰذا ان کے ساتھ براہ

راست متصادم ہونا بالکل خارج از بحث تھا بلاشبہ خواجہ صاحب ان مطالبات کو تسلیم کر سکتے تھے یا شخصی طور پر ان کی حمایت کا وعدہ کر سکتے تھے۔ اس حالت میں کوئی گڑبڑ پیش نہ آتی تاآنکہ معاملہ دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوتا فسادات بالکل رونما نہ ہوئے ہوتے۔ اور خواجہ ناظم الدین پاکستان میں ہردلعزیز ہیرو بن چکے ہوتے۔ احمدی ایک چھوٹی سی جماعت تھے اور ان کی طرف سے کسی مزاحمت یا فساد و بدنظمی کا امکان نہ تھا۔ بلاشبہ چودھری ظفر اللہ خان کی برطرفی پر بین الاقوامی حلقوں میں کسی قدر حرکت پیدا ہوتی لیکن پاکستان کی آبادی اس برطرفی پر تحسین و آفرین کے نعرے لگاتی۔

پھر خواجہ ناظم الدین نے یہ راستہ کیوں اختیار نہ کیا؟ ان کا قول یہ ہے کہ یہ راستہ نہ محض اس لئے اختیار نہ کیا گیا کہ ایسا اعلان دوسرے مسلم ممالک میں موثر نہ ہوتا۔ بلکہ اس اقدام کے دوررس نتائج کا خیال حائل ہوگیا۔ جو اس رپورٹ میں کسی دوسرے مقام پر بیان کئے جا چکے ہیں۔ اگر یہ مطالبات تسلیم کر لئے جاتے تو پاکستان بین الاقوامی برادری سے خارج ہوگیا ہوتا۔

اب دو متبادل سامنے تھے۔ علما سے براہ راست تصادم اور پاکستان کا عالمی برادری سے اخراج۔ خواجہ ناظم الدین کے لئے صرف یہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ ملک کا واسطہ دے کر اور ان عوام کا نام لے کر جو عنقریب فاقہ کشی کا شکار ہونے والے تھے۔ علما سے رحم کی درخواست کریں لیکن اللہ کے منشا اور حکم کے سامنے وطن قوم اور بھوک جیسی پست مصلحتیں کیا حقیقت رکھتی تھیں اور اللہ ہی کے منشا اور حکم کے ماتحت علما خواجہ ناظم الدین کے پاس آئے تھے۔ لہٰذا وہ اپنی ضد اور ہٹ پر پختگی سے قائم رہے۔ خواجہ ناظم الدین نے ان کو یاد دلایا کہ چودھری ظفر اللہ خان کو خود قائداعظم نے اس عہدے پر مقرر کیا تھا۔ کیا علما اس مملکت کے مرحوم بانی کے فیصلے کا احترام نہ کریں گے؟ لیکن دنیا کی ہر چیز بدل سکتی ہے مگر علما کی رائے جب ایک دفعہ قائم ہو جائے تو اس میں کوئی تغیر نہیں آ سکتا۔ چنانچہ وہ اس دلیل سے بھی قائل نہ ہوئے۔ شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین نے ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش بھی کی اور ایک فریق کو وزارت میں ایک عہدہ بھی پیش کیا۔ خواجہ ناظم الدین اس قدر بلند اخلاق اور عزت دار آدمی ہیں کہ ان سے ایسی چالوں کی توقع نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ سیاسی آدمی بھی ہیں اور سیاسیات میں آدمی اکثر سیاسی آدمی ہی ہو کر رہ جاتا ہے اور علما میں بھی ایسے آبرومند لوگ موجود ہیں جو عقائد کی پختگی اور جرأت کے سرمایہ دار ہیں اور کسی دنیاوی کشش سے مسحور نہیں کئے جا سکتے لہٰذا پھوٹ ڈالنے اور رشوت دینے کی کوشش ناکام ہوگئی اس کے بعد خواجہ صاحب نے ٹال مٹول کا طرز عمل اختیار کیا۔ بلکہ ایک دفعہ یہ ارادہ بھی کر لیا کہ پوری دنیائے اسلام کے علما کو جمع کر کے ان سے اس مشکل سے نجات دلانے کی استدعا کریں۔ لیکن علما اب تک کافی انتظار کر چکے تھے اور مزید انتظار پر آمادہ نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ڈائرکٹ ایکشن کے پروگرام کا فیصلہ کر لیا۔

اب خواجہ ناظم الدین کے لئے اس کے سوا کوئی راہ عمل باقی نہ رہی کہ اس چیلنج کو قبول کر لیں یا وزارت سے دست بردار ہو جائیں انہوں نے پہلی راہ اختیار کی اور علما کو گرفتار کر لیا۔ اس واقعہ کے کئی ہفتے بعد جب پارلیمنٹ میں بجٹ پر عام مباحثہ ہو رہا تھا۔ خواجہ ناظم الدین نے ایک تقریر کی جس میں لاہور کے اندر مارشل لا کے اعلان کی وجوہ بیان کرتے ہوئے علما کے اس فعل کو غیر جمہوری اور خلاف اسلام بتایا۔ آپ نے یہ ثابت کرنے

کی کوشش کی کہ اکثر علماء ڈائرکٹ ایکشن کے خلاف ہیں۔ اور صرف علماء کے احراری گروہ نے یہ اقدام شروع کیا ہے۔ لیکن ان کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد ۱۸ جنوری ہی کی آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن میں اتفاق آراء سے منظور ہو چکی تھی۔ جس میں تمام مذاہب و مسالک کے علماء موجود تھے۔ البتہ ڈائرکٹ ایکشن کی صورت کا فیصلہ بعد میں کیا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر خواجہ ناظم الدین کے ذہن پر یہ حقیقت روشن تھی کہ ڈائرکٹ ایکشن غیر جمہوری اور خلاف اسلام ہے اور ملک کے بہترین مفادات کے منافی ہے تو انہوں نے اس سے قبل یہی بات علی الاعلان کیوں نہ کہی۔ جب ۲۲ جنوری کو علما کے ایک وفد نے ان کو اس اقدام کا الٹی میٹم دے دیا تھا۔ علما کے ساتھ ان کے طویل اور مسلسل مذاکرات کی خبریں تقریباً تمام اخباروں میں شائع ہو رہی تھیں۔ اور لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جاگزین ہو گیا تھا کہ وہ علما کے نقطۂ نگاہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اور جب ۲۷ فروری کو انہوں نے مطالبات کو مسترد اور علما کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب بھی اس کارروائی کے جو وجوہ بیان کئے وہ اطلاع عام کے لئے شائع نہ کئے گئے۔ بلکہ فی الحقیقت حکومت پنجاب کو واضح طور پر ہدایت کی گئی کہ جن خیالات کی اشاعت کا اسے حکم دیا گیا ہے وہ مرکزی حکومت سے منسوب نہ کئے جائیں۔ اب مرکزی حکومت کے خیالات کو خفیہ رکھنے کی ہدایات سے کیا نتیجہ مترتب ہوتا ہے؟ نتیجہ صرف ایک ہی ہے کہ مرکزی حکومت کو اپنے موقف و مقام کے متعلق پورا یقین نہ تھا اور وہ ایسے اقدام کا اپنے آپ سے منسوب ہونا پسند نہ کرتی تھی جو بعد میں غیر مقبول اور ناپسندیدہ قرار پائے۔

مرکزی حکومت کئی مہینوں تک عدم فیصلہ۔ تامل اور تذبذب کی جس پالیسی پر کاربند رہی اس کا اثر صوبے کی صورت حالات پر پڑا۔ بلاشبہ قانون و انتظام ایک صوبائی مضمون تھا لیکن ایسی صورتوں میں جب پوری آبادی کسی مذہبی جوش میں مبتلا ہو رہی ہو۔ محض قانونی و انتظامی آلات کو حرکت دینے سے زیادہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ "چیز" پنجاب میں موجود نہ تھی۔ اور مرکز نے اس پر غور ہی نہ کیا تھا۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ فساد برابر پرورش پاتا رہا۔ اور جب پھوٹا۔ تو نہایت شدت سے پھوٹا۔ اس کو روکنے یا اس سے دست و گریباں ہونے کا موزوں ترین موقع وہ تھا جب خواجہ ناظم الدین کو ڈائرکٹ ایکشن کی دھمکی دی گئی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یا تو خواجہ صاحب نے اس کو محض ایک خالی خولی دھمکی خیال کیا۔ یا انہوں نے علماء کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات پر بھروسا کیا۔

ہمارے سامنے جو تحریری بیانات پیش ہوئے۔ جو زبانی شہادتیں دی گئیں اور جو بحث کی گئی۔ ان میں مسٹر دولتانہ کے خلاف یہ بیان کیا گیا کہ انہوں نے اعلیٰ سیاسیات کا کھیل کھیلنے کے لئے اس شورش کو خود جاری کیا اور چلایا۔ اور مسٹر فضل الٰہی نے تو ایک وقت پر یہ اشارہ بھی کیا تھا کہ مسٹر دولتانہ کی اس سیاست بازی کا مقصد صرف داخلی نہ تھا بلکہ بین الاقوامی سیاسیات سے بھی متعلق تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ خواجہ ناظم الدین کو اقتدار کی کرسی سے اتار پھینکیں خود اپنی قیادت میں ایک مرکزی حکومت قائم کریں اور پاکستان کو ایک کمیونسٹ مملکت بنا دیں۔ ہم نے معاملے کے اس حصے کے متعلق شہادت کا نہایت احتیاط سے جائزہ لیا ہے لیکن ہمارا یہ خیال نہیں کہ مسٹر دولتانہ اس شورش کے ابتدائی مرحلوں میں اس کے آغاز اور اس کی ہمت افزائی سے کوئی خاص مقصد پورا کرنا چاہتے تھے۔ پنجاب میں ان کو سہولت اور آرام کی پوزیشن حاصل تھی۔ اور ہم نہیں سمجھتے۔ کہ پاکستان کی وزارت عظمٰے جو کانٹوں کی سیج

ہے۔ ان کے لئے کوئی دلکشی رکھتی تھی۔ ہمارے نزدیک وہ اتنے حریص جاہ بھی نہ تھے کہ بین الاقوامی سیاسیات کا کھیل ختم نبوت کے مسئلے پر کھیل سکتے۔ یہ امکانات ہمیں کچھ بعید سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان امور سے تعلق رکھتے ہیں جن کا ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر دولتانہ نے آغاز کار ہی میں یہ سمجھ لیا تھا کہ طوفان پرورش پا رہا ہے۔ اور اس کی شدت و وسعت روز بروز لا محالہ بڑھتی چلی جائے گی۔ وہ بھی خواجہ ناظم الدین ہی کی طرح علما سے براہ راست تصادم سے بچنے کے خواہاں تھے۔ لیکن خواجہ صاحب تو انسانی دانش و عیاری پر بھروسا کرتے رہے کہ وہ آنے والے طوفان کو نابود کرنے کا کوئی نہ کوئی وسیلہ دریافت کرے گی۔ اور مسٹر دولتانہ کی معقولیت نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ انسانی دانش ایسے معاملات میں کوئی بھروسے کی چیز نہیں۔ اور ایسے مسائل حالات و کوائف کے ناگہانی اور اتفاقی اختلاط سے حل نہیں ہوا کرتے۔ انہیں معلوم تھا کہ طوفان آنے والا ہے لیکن وہ خواجہ ناظم الدین کی طرح یہ محسوس نہ کر سکتے تھے۔ کہ اگر وہ اپنا سر ریت میں چھپا لیں گے تو وہ طوفان خود بخود گزر جائے گا۔ جب انہیں اس پُر شور آندھی کے آثار صاف صاف نظر آ گئے تو ان کے لئے یہی چارہ باقی رہ گیا کہ یا تو اس سے باہر رہیں۔ یا اگر ممکن ہو تو اس کے رُخ کو موڑنے کی کوشش کریں۔

ہمارے سامنے اس امر کی بھی کافی شہادت موجود نہیں کہ مسٹر دولتانہ نے دانستہ اس تحریک کو شروع کیا یا لاہور میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس (مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء) کے اجلاس سے پہلے اس کو تقویت پہنچانے کی کوئی کوشش کی۔ مولانا اختر علی خاں نے اس عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے دو بیانات دیئے تھے۔ ایک اس وقت جب ان کا مقدمہ ایک خاص فوجی عدالت میں پیش تھا۔ اور ایک درخواست کی شکل میں جو انہوں نے ۱۲۔ اپریل ۱۹۵۳ء کو موجودہ چیف منسٹر کو ارسال کی۔ ان دونوں میں مولانا نے بیان کیا کہ مسٹر دولتانہ نے جن کے ساتھ ان کے خاصے گہرے تعلقات تھے ایک سے زیادہ دفعہ ان کو ہدایت کی کہ مرکزی حکومت کے خلاف تحریک کو چلائیں اور حکومت پنجاب کو اس سے باہر رکھیں۔ فوجی عدالت والے بیان میں انہوں نے ماسٹر تاج الدین انصاری سے اپنی ایک گفتگو کا ذکر بھی کیا۔ جس کے دوران میں انصاری نے بتایا تھا کہ مسٹر دولتانہ نے احمدیوں کے خلاف پراپیگنڈا سے اتفاق ظاہر کیا ہے اسی بیان میں آگے چل کر مولانا اختر علی خاں نے یہ بھی بتایا کہ ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا ابو الحسنات دونوں نے انہیں اطلاع دی تھی۔ کہ ۱۶ فروری کو لاہور میں جو ہڑتال کی جا رہی ہے اس کو "برسراقتدار لوگوں" کے زیر ہدایت منظم کر کے کامیاب بنایا جائے گا۔

مولانا داؤد غزنوی نے بھی ایک فوجی افسر کے سامنے بیان دیتے ہوئے مسٹر دولتانہ کے خلاف اسی قسم کی باتیں کہیں۔ مثلاً کہا کہ ایک دفعہ مولانا اختر علی خاں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ مسٹر دولتانہ نے تحریک کے لئے سرمایہ مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور ایک اور موقع پر بعض لیڈروں نے جن میں ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا ابو الحسنات شامل تھے مجھے یہ بتایا تھا کہ اب وہ کراچی میں تحریک شروع کرنا چاہتے ہیں جب میں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ تو انہوں نے بتایا کہ جب تک ہم چیف منسٹر سے مشورہ نہ کر لیں۔ لاہور میں ڈائرکٹ ایکشن کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا داؤد غزنوی نے اس بیان میں یہ بھی ذکر کیا۔ کہ جو خیال ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا ابو الحسنات نے ظاہر کیا تھا۔ اس کی تصدیق مولانا اختر علی خاں نے مجلس عمل کے اجلاسوں کے دوران میں کی۔ اور

مولانا اختر علی خاں نے مجلس عمل کے ایک بعد کے اجلاس میں اس امر کو تسلیم کیا تھا کہ مسٹر دولتانہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ پنجاب میں کوئی شخص احمدیوں کے خلاف تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

اس تحقیقات میں جب ہم نے مولانا اختر علی خاں سے مسٹر دولتانہ کے ساتھ ان کی گفتگو کے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے اس سے انکار کیا۔ لہٰذا فوجی عدالت میں ان کا سابقہ بیان کوئی قطعی شہادت نہیں۔ مولانا اختر علی خاں اور مولانا داؤد غزنوی کے بیانات کے باقی حصے چونکہ محض سُنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں۔ اس لئے قطعاً ناقابل قبول ہیں مسٹر دولتانہ کے خلاف دوسری شہادت مولانا امین احسن اصلاحی کے بیان میں اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی لکھی ہوئی ایک چٹھی میں شامل ہے۔ لیکن یہ بیان اور یہ چٹھی ایک "رائے" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لئے ان کے متعلق بھی ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ یہ غیر متعلقہ ہیں۔ لہٰذا ہم شہادت کے ان ٹکڑوں میں سے کسی پر بھی حصر نہیں کر سکتے اسی طرح ڈاکٹر عنایت اللہ سلیمی نے شہادت دی ہے کہ ایک دفعہ ان سے مولانا غلام غوث سرحدی نے کہا تھا کہ مسٹر دولتانہ اس تحریک کے حامی ہیں۔ لیکن یہ شہادت بھی سُنی سنائی ہونے کی وجہ سے ناقابلِ قبول ہے۔ انہوں نے مزید یہ بیان کیا۔ کہ شیخوپورہ کے مسلم لیگیوں کی سرگرمیوں سے عوام نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ تحریک کو حکومت کی حمایت حاصل ہے۔ لیکن یہ بھی محض ایک غیر متعلقہ رائے ہے۔

خواجہ ناظم الدین نے بیان کیا ہے کہ مسٹر دولتانہ مرکزی حکومت میں پنجاب کے نمایندے کے تقرر پر اپنا اقتدار چاہتے تھے۔ خواجہ ناظم الدین کو یہ احساس صرف اس وقت ہوا جب مجلس اصول اساسی کی سفارش دربارۂ تجویز مساوات کے متعلق ان کے اور مسٹر دولتانہ کے درمیان اختلافات رونما ہوئے مجلس اصول اساسی کی رپورٹ دسمبر میں کسی وقت شائع ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ رپورٹ کی اشاعت سے پہلے مسٹر دولتانہ کے پیشِ نظر اس مقصد کا ہونا ممکن نہیں۔ رپورٹ کی اشاعت کے بعد مساوات نمایندگی کے مسئلے پر بنگال اور پنجاب کا جھگڑا شدید صورت اختیار کر گیا۔ پنجاب کے نقطۂ نگاہ کی نمایندگی مسٹر دولتانہ کر رہے تھے۔ اور بنگال کی رائے کا اظہار خواجہ ناظم الدین فرما رہے تھے۔ یہ قضیہ ان دونوں حضرات کے درمیان قریب قریب ذاتی مناقشے کی صورت اختیار کر گیا۔ خواجہ ناظم الدین کا بیان ہے کہ مسٹر دولتانہ نے مجلس اصولِ اساسی کی رپورٹ پر دستخط کئے تھے جس میں مساوات نمایندگی تجویز کی گئی تھی۔ اور مسٹر دولتانہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس تجویز کی قطعی اور غیر مشروط حمایت کبھی نہیں کی اور انہوں نے ایک اختلافی نوٹ لکھنے کے بعد مجلس اصول اساسی کی رپورٹ پر مشروط دستخط کئے تھے حقیقی صورت کچھ بھی ہو یہ دستاویز ہمارے سامنے نہیں۔ جس سے ہم معلوم کر سکیں کہ کونسا بیان صحیح ہے۔ لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ رپورٹ کی اشاعت کے بعد مسٹر دولتانہ نے پنجاب کے نقطۂ نگاہ کی حمایت ڈٹ کر کی۔ اور اس کی تائید میں رائے عامہ کو متحد اور منظم کر لیا۔ خواجہ ناظم الدین کا اپنا بیان یہ ہے کہ جب میں اس جھگڑے کے متعلق رائے عامہ کا اندازہ کرنے کیلئے پنجاب آیا تو میرے سامنے بہت سے وفد پیش ہوئے جن کو مسٹر دولتانہ نے خود وکالت کے لئے ہدایات دے کر بھیجا تھا چنانچہ ہر وفد نے ایک ہی قسم کے دلائل پیش کئے۔ جو بالکل یکساں الفاظ میں لکھے ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ یہ تمام تحریری وکالت نامے تمام وفدوں کو خود مسٹر دولتانہ نے مہیا کئے تھے۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ اس قضیہ پر خواجہ ناظم الدین و مسٹر دولتانہ کے درمیان کشمکش تھی اور یہ بالکل ممکن ہے کہ مسٹر دولتانہ نے یہ سوچا ہو کہ اگر وہ خواجہ ناظم الدین کو اکھیڑ دینے میں کامیاب ہو گئے

تو مساوات نمائندگی کی تجویز سے پنجاب کی نجات کے مواقع بہتر ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے اس مقصد کو سامنے رکھ کر زیادہ اطمینان قلب کے ساتھ انہوں نے یہ کوشش کی ہو۔ کہ خواجہ ناظم الدین کی مخالفت کو ختم کرنے کے لئے ان کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا جائے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ مسٹر دولتانہ تحریک کا رخ کراچی کی طرف پھیرنے کی پالیسی مجلس اصول اساسی کی رپورٹ شائع ہونے سے بہت پہلے اختیار کر چکے تھے۔ اور ہمارے سامنے اس امر کی کوئی شہادت نہیں۔ کہ اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد انہوں نے علما یا دوسرے علمبرداران تحریک کو اپنی سرگرمیاں تیز کر دینے کی کوئی ہدایت کی ہو۔ علما رپورٹ کی اشاعت سے پہلے خواجہ ناظم الدین سے کئی ملاقاتیں کر چکے تھے۔ اور بعد میں انہوں نے کراچی میں جو سرگرمیاں اختیار کیں۔ جن میں ڈائرکٹ ایکشن کی قرارداد کی منظوری اور الٹی میٹم کا ارسال بھی شامل تھا۔ وہ محض اسی لائحہ عمل کا نتیجہ تھا جس کا فیصلہ وہ پہلے سے کر چکے تھے۔

مندرجہ بالا نتائج سے ہماری اس رائے کی تردید نہیں ہوتی۔ جو ہم نے مسلم لیگ کے خلاف بحث کرتے ہوئے قائم کی تھی کہ لاہور میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کے بعد اور خصوصاً مسلم لیگ کی قرارداد مورخہ ۲۷۔ جولائی کے بعد مسٹر دولتانہ کی مستقل پالیسی یہ تھی کہ تحریک کا رخ کراچی کی طرف موڑ دیا جائے۔ تاکہ پنجاب اس شورش کی تباہ کاری سے بچ جائے یہ رائے ان چیزوں پر مبنی ہے:۔

خود لیگ کی قرارداد کے الفاظ۔ مسٹر دولتانہ کی اپنی تقریریں جن میں ان کا بیان مورخہ ۶۔ مارچ ۱۹۵۳ء بھی شامل ہے اور جس کے اثرات کے متعلق ہم "مسلم لیگ" کے عنوان کے ماتحت اوپر پوری طرح بحث کر چکے ہیں۔ اخبارات کے بے شمار مضامین میر نور احمد ڈائرکٹر تعلقات عامہ کی سرگرمیاں اور دوسری کیفیاتی شہادت۔ خواجہ ناظم الدین نے اپنی شہادت میں ایک نہایت موزوں تشبیہ استعمال کی ہے۔ اور شکایت کی ہے کہ مسٹر دولتانہ چاہتے تھے۔ کہ میں "ننھے کو لئے رہوں"۔ اگر مطالبات کو ایک ننھے بچے سے تشبیہ دی جائے۔ تو ذمہ واری کے پورے موضوع کو ایک فقرے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً احرار نے ایک بچہ جنا۔ جسے انہوں نے متبنّیٰ بنانے کے لئے علما کی خدمت میں پیش کیا۔ علما نے اس کا باپ بننا منظور کر لیا۔ لیکن مسٹر دولتانہ نے سمجھ لیا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر پنجاب میں شرارت کرے گا۔ لہٰذا انہوں نے اس کو ایک نہر میں بہا دیا جو میر نور احمد کی مدد سے کھودی گئی تھی اور جس کو پانی اخباروں نے اور خود مسٹر دولتانہ نے مہیا کیا تھا۔ جب یہ بچہ حضرت موسیٰ کی طرح بہتا ہوا خواجہ ناظم الدین تک پہنچا تو انہوں نے دیکھا کہ بچہ خوبصورت تو ہے لیکن اس کے چہرے پر ایک چینِ جبین اور ایک غیر معلوم سی ناگواری نظر آتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو گود میں لینے سے انکار کیا اور پرے پھینک دیا۔ اس پر بچے نے ایڑیاں رگڑنا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ اس شور نے اس کی پیدائش کے صوبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور خواجہ ناظم الدین اور مسٹر دولتانہ دونوں کو موقوف کرا دیا۔ یہ بچہ ابھی زندہ ہے۔ اور راہ دیکھ رہا ہے کہ کوئی آئے اور اسے اٹھا کر گود میں لے لے۔ اس مملکت خداداد پاکستان میں سیاسی ڈاکوؤں۔ طالع آزماؤں اور گمنام و بے حیثیت آدمیوں۔ غرض سب کے لئے کوئی نہ کوئی روزگار موجود ہے۔ ہمارے سامنے صرف دو ایسے آدمی ہیں۔ جنہوں نے اس قسم کا روزگار قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ یعنی سردار بہادر خاں وزیر مواصلات اور مسٹر حمید نظامی ایڈیٹر "نوائے وقت"۔ انہوں نے اس بچے کو اور اس کے تمام نتائج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

حصّہ ششم

صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے سِول حکام نے جو تدابیر اختیار کیں آیا وہ کافی تھیں یا نہیں

اس حصّے میں بطور خاص اُن تدابیر کے کافی یا ناکافی ہونے پر بحث کی گئی ہے جو سِول حکام نے شورش کا مقابلہ کرنے کے لئے اختیار کیں۔ لیکن یہ حصّہ اپنی نوعیت کی وجہ سے اُن کوائف سے تعلق رکھتا ہے۔ جو ۶۔ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لا نافذ ہونے پر منتج ہوئے کسی کسی مقام پر لامحالہ "ذمہ داری" کے حصّے کا ذکر بھی آجائے گا۔ کیونکہ سارا معاملہ ایک ہی ہے اور ہر چیز کو سختی سے الگ الگ رکھنا ممکن بھی نہیں اور مناسب بھی نہیں۔

گواہ

ہم اُن اشخاص کی شہادت اور طرزِ عمل پر بحث کر رہے ہیں جو آج بھی ملک کی سیاسی یا سرکاری زندگی میں ممتاز درجوں پر فائز ہیں۔ بعض کے ساتھ ہمارے دوستانہ تعلقات ہوں گے دوسروں کے ہم مدّاح ہیں۔ اور یہ مدّاحی اُن کی دانشمندی۔ ذہانت یا نیک نیتی کی وجہ سے ہے لہٰذا ان لوگوں کے متعلق کسی "لیڈر" کے سے بے لحاظ اعتماد کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہمارے لئے خاصی پریشانی کا موجب ہوگا۔ جہاں کہیں شہادت متضاد ہے اور معاملہ اہم نہیں وہاں ہم یہی کہنا بہتر سمجھتے ہیں کہ فیصلہ سنانا غیر ضروری ہے اور جہاں معاملہ اہم ہے وہاں ہم صرف یہی کہیں گے کہ فلاں امر ثابت ہوگیا ہے یا ثابت نہیں ہوا اسکے ساتھ ہی یہ واضح رہنا چاہیئے کہ ہم نظم حکومت کی مشینری کا بحیثیت مجموعی جائزہ لے رہے ہیں کسی خاص افسر کے طرز عمل سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ طرز عمل صرف اسی حد تک متعلقہ سمجھا جائے گا جس حد تک اس کا تعلق اس مشینری کے چلنے سے ہے جب کوئی خاص افسر صورت حالات کی ضرورت سے زیادہ بوجھ دانستہ خود اپنے ذمے لے لے۔ مثلاً ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور۔ صرف اسی صورت میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ آیا وہ بوجھ پوری طرح اٹھایا گیا تھا۔ اور جب کسی افسر نے اپنی پالیسی پر خارجی مصالح کے اثر کو گوارا کر لیا ہو جیسے ڈائرکٹر تعلقات عامہ نے غالباً کیا۔ صرف اسی صورت میں انفرادی حیثیت سے اس کی تنقیح کی جائے گی۔

گواہوں کی اکثریت نے یہ سمجھ کر شہادت دی ہے کہ ان کی شہادت ذہین اشخاص لے رہے ہیں اور

ذہانت کی توہین کرنا ایک اخلاقی جرم ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں ہم اس نیک نیتی سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں جو خواجہ ناظم الدین کی خصوصیت بھی ہوسکتا ہے کہ سب لوگوں کو ان کے خیالات سے اتفاق نہ ہو لیکن جب وہ بول رہے تھے تو بعض اوقات اُن سے ایک ایسی روشنی کے شرارے" ظاہر ہوتے تھے جو "یہ وہ گوہر ہیں نایاب" تھی بعض گواہوں میں ایسی صاف بیانی نظر نہیں آئی ہم ان کے شکر گزار نہیں ہیں لیکن چونکہ ہمیں معلوم ہے کہ عادت فطرت ثانیہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہم اس امر کو نظر انداز کرسکتے ہیں۔ ٹال مٹول اور ٹیڑھی ترچھی باتیں کرنا ایسے عیب ہیں جو کسی قانونی عدالت میں ایسے ہی مکروہ ہیں۔ جیسے کسی بلوے کی صورت حالات میں فیصلے کی غلطی ناگوار ہوسکتی ہے ایسے حضرات کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اپنے ذہنی سروسامان کو نئے سرے سے درست کریں۔

دراصل ہماری محنتوں کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے اس تحقیقات کا حکم دینے سے حکومت کا کچھ بھی مقصد ہو بہرحال اس نے ہمیں اس امر کا موقع دیا ہے کہ ہم اپنے افسروں سے جن پر نظم حکومت کا بوجھ ہے یہ گزارش کریں کہ اس بوجھ کو "فولادی چوکھٹے" کی روایات کے مطابق اٹھائیں جب ہم یہ نظارہ دیکھا کرتے تھے کہ ایک حاکم ضلع جوش میں بھرے ہوئے ایک جلوس کے درمیان تیر کی طرح سیدھا کھڑا ہے۔ اس کے مضبوط دہانے پر ایک ہلکا سا تبسم ہے اور عزم مصمم اس کے چہرے پر لکھا ہوا ہے ہم خاص طور پر انہی حضرات کو اپنا مخاطب بنانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ارباب سیاست ایک جج کے لئے ہمیشہ مایوسی کا باعث ہوتے ہیں اور انہیں ہونا بھی چاہئے اور جو چیز ایک شخص کیلئے گوشت ہے وہ دوسرے کے لئے زہر ہوسکتی ہے۔ حکومت کے قوی ملازم لوگوں کے لئے خدا کی نعمت ہیں۔ اور اگر حکومت لوگوں کی ہے تو وہ حکومت کیلئے بھی نعمت ہیں آپ کو یاد ہوگا کہ کراچی میں تین چار مضبوط اور قوی سرکاری ملازم ہی تھے جنھوں نے کشتی کو غرقاب ہونے سے بچا لیا تھا۔

"قانون" اور "انتظام" میں فرق

ہم ان حقایق سے آغاز کرینگے جو بالکل واضح ہیں۔ قانون و انتظام کا قیام صوبائی حکومت کا فرض اور ہر مہذب حکومت کا ابتدائی وظیفہ ہے اور اس میں دوسرے مصالح کا کوئی لحاظ نہیں ہونا چاہئے لیکن قانون اور انتظام دو مختلف اصطلاحات ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کوئی تقریر کرے یا کوئی کتابچہ لکھے جو قانون کے تو خلاف ہو۔ لیکن اس سے کسی قسم کی بدنظمی پیدا نہ ہوسکے لہٰذا جو حکومت ایسی تقریر کو محض اس بنا پر نظر انداز کردے کہ اگرچہ اس تقریر کو کئے ہوئے اور اس کتابچے کو لکھے ہوئے ایک مہینا گزر چکا ہے اور کوئی ناگوار واقعہ رونما نہیں ہوا تو وہ حکومت اپنے آدھے فرض سے کوتاہی کی مرتکب ہوگی۔ اس امر کو فراموش کردیا جاتا ہے کہ اس رویے سے قانون کے جلال کی توہین ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ مقرروں مصنفوں اور بے شمار پڑھنے والوں کے دلوں میں حقارت نشوونما پاجاتی ہے جزوی طور پر اسی قسم کی ذہنی کیفیت کے باعث حکام کو ذلیل کن چیلنج دیئے جاتے ہیں چونکہ یہ چیز بالآخر انتظامی صورت حالات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لئے حاکم کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عوام کو قانونی حدود کے اندر رہنے کی تربیت دینا اشد ضروری ہے۔

قانون وانتظام کے حکام

صوبائی دائرے میں چیف منسٹر میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ قانون و انتظام کے انچارج وزیر تھے جن کے مددگار چیف سیکرٹری۔ ہوم سیکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی تھے کاروبار حکومت کے قواعد کے رو سے چیف سیکرٹری "امن و سکون عامہ" کا انچارج ہوتا ہے اور پولیس کے دوسرے معاملات کے متعلق جن میں پبلک سیفٹی ایکٹ کا استعمال بھی شامل ہے سیکرٹیریٹ کا کام ہوم سیکرٹری انجام دیتا ہے اور قانون وانتظام کے دائرے میں چیف سیکرٹری کا مددگار ہوتا ہے قانون وانتظام کے متعلق تمام امور چیف سیکرٹری کی وساطت سے گزرتے ہیں جو سی آئی ڈی کی سیاسی برانچ کا اعلیٰ افسر بھی ہوتا ہے۔ انسپکٹر جنرل ہوم ڈیپارٹمنٹ میں جائنٹ سیکرٹری ہوتا ہے اور اندرونی دفاع کا کام اس کے سپرد ہے ڈی آئی جی سی آئی ڈی صوبے کی انٹیلی جنس آرگنائزیشن (تنظیم استخبارات) کے لئے ذمہ دار ہوتا ہے اور حکومت اور حکام اضلاع کو مدد دیتا ہے وہ سیاسی معاملات کے متعلق تمام کاغذات بلحاظ نوعیت مضمون براہِ راست چیف سیکرٹری یا ہوم سیکرٹری کو بھیجتا ہے۔ لیکن جرائم کے متعلقہ کاغذات انسپکٹر جنرل کی وساطت سے ارسال کرتا ہے اخبار و اطلاعات کی فراہمی سی آئی ڈی اور ضلع کے سیکیورٹی سٹاف کی ذمہ داری ہے آخرالذکر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ماتحت ہوتا ہے اور دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ لاہور میں خاص کر اطلاعات زیادہ تر صوبے کی سی آئی ڈی فراہم کرتی ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ضلع کے انتظام فوجداری کا حاکم اعلیٰ ہے اور قانون وانتظام کے قیام کا ذمہ دار ہے ضلع میں پولیس فورس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عمومی نگرانی اور ہدایت کے ماتحت کام کرتا ہے۔

ہوم سیکرٹری اور ڈی آئی جی (سی آئی ڈی) ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتے ہیں

حکومت کی نوازش سے ہمیں مجلس احرار اور متعلقہ امور کے متعلق سی آئی ڈی کی ایک سو سے زیادہ مسلیں دستیاب ہوئیں جن میں سے بہت سی مسلوں کو ہم نے اول سے آخر تک پڑھا ہے ہم نے یہ دیکھا کہ جب کوئی معاملہ ڈی آئی جی (سی آئی ڈی) کے سامنے آتا ہے وہ اسے ہوم سیکرٹری کے پاس بھیج دیتا ہے لیکن چند موقعوں پر انسپکٹر جنرل نے اور ان سے بھی کم موقعوں پر چیف سیکرٹری نے بھی کچھ لکھا. یہ بات ہم پر واضح نہیں ہوئی کہ عملاً چیف سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل کس حد تک اس قصے میں شامل ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ بوجھ ہوم سیکرٹری اور ڈی آئی جی ہی اٹھاتے ہیں۔

چیف منسٹر صرف پالیسی وضع کرتا ہے

جہاں تک ہم سمجھتے ہیں چیف منسٹر پالیسی وضع کرتا ہے اور سیکرٹری اسکی تفصیلات طے کرتے ہیں لیکن مسٹر دولتانہ نے خود اعتراف کیا ہے (اور پالیسی کے عمل درآمد کا جائزہ لیتے وقت اس امر کو ذہن میں رکھنا چاہئے) کہ اگر یہ عملی کا کوئی واضح کیس ان کے علم میں آئے گا تو ان کا فرض ہوگا کہ مداخلت کریں۔

مسٹر دولتانہ کا دعویٰ مضبوطی کی پالیسی تفصیلات کے ذمہ دار افسر

مسٹر دولتانہ کا دعویٰ یہ ہے کہ جہاں تک قانون وانتظام کا

تعلق ہے ان کی پالیسی مضبوطی کی ہے اور انہوں نے اپنے افسروں کے مشورے کے خلاف کبھی کچھ نہیں کیا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تفصیلات طے کرنے میں کسی کمزوری کا سراغ ملے تو اسکی ذمہ داری افسروں پر عائد ہوگی انہوں نے مزید یہ کہا کہ قانون و انتظام کی صورت حالات اس لئے دشوار ہوگئی کہ سیاسی افق پر ایک نیا منظر نمودار ہوگیا جس نے پورے ملک پر اپنا اثر ڈالا اور جس کے متعلق آخری فیصلہ صرف مرکز ہی کرسکتا تھا برطانوی راج کے ماتحت جب مسلمان کئی محاذوں پر ایک سیاسی جنگ لڑ رہے تھے تمام لوگوں کا جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے نام نہاد سا اتحاد ضروری تھا جب پاکستان مسلمانوں کی ایک قومی مملکت کی حیثیت سے وجود میں آگیا تو وطن اور ملک کے مقابلے میں مسلمان "ملت" کے تصور سے سرشار ہوگئے۔ قرارداد دستور کے منظور ہونے کے بعد کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہ رہا کہ ملک کے مستقبل کے متعلق سیاسی بحث کرتے ہوئے مذہبی مسائل

پاکستان میں "ملت" کے تصور نے چیزوں کی صورت مختلف کردی

غیر متعلق ہیں احرار کا ماضی بلاشبہ نہایت مکروہ تھا لیکن انہوں نے نہایت عیاری سے کام لے کر اپنے پرانے اسلحہ خانے سے ایک مذہبی فضیہ منتخب کیا اور علما کی بڑی جماعت نے ان کے ساتھ اتفاق کرلیا جسکی جزوی وجہ جہانگیر پارک کراچی میں احمدیوں کا وہ جلسہ تھا جو ۱۷ - ۱۸ مئی ۱۹۵۲ء کو زیر صدارت چودھری ظفراللہ خاں منعقد ہوا تھا (انہوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ احرار تھے جنہوں نے علما سے اتحاد کرلیا تھا) تین مطالبات کے متعلق مرکز سے ایک مضبوط پالیسی کا اعلان کرانے کی بارہا کوشش کی گئی لیکن خواجہ ناظم الدین علما کے ساتھ "انسداد تصادم" سے بچنے کے لئے ہمیشہ مذبذب رہے آخر تک علما کے ساتھ مذاکرات کرتے رہے۔ اور بالآخر پوری دنیائے اسلام کے علما کی ایک کانفرنس پر بھروسہ کرتے رہے۔

خواجہ ناظم الدین مطالبات کے حامی تھے

اس امر کے قرائن موجود تھے کہ خواجہ ناظم الدین مطالبات کے حامی ہیں: مجلس اصول اساسی نے ان کی منظوری سے یہ سفارش کی کہ علما کی ایک کمیٹی مجلس وضع قوانین کی کارروائی پر ویٹو کا اختیار استعمال کرے: انہوں نے مجلس عمل کے ساتھ مساوی حیثیت سے براہ راست مذاکرات جاری رکھے: ۱۶ - اگست ۱۹۵۲ء کو ایک کتابچہ شائع کیا گیا جس میں وزرا و حکام کو اس امر پر ملامت کی گئی کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کے پروپیگنڈے کے لئے اپنی سرکاری حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ کیونکہ براہ راست احمدیوں کے خلاف تھا، مرکزی حکومت کے ایک وزیر چودھری ظفراللہ خاں کو پریس اور پلیٹ فارم سے نہایت بدتمیزی سے گالیاں دی جاتی رہیں لیکن کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

مسلم لیگ کونسل ۲۶-جولائی ۱۹۵۲ء مسٹر دولتانہ کا رویہ

اگرچہ مسلم لیگی عموماً اس مسئلے کو مذہبی مسئلہ سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو اسکی جذباتی اپیل سے الگ نہ رکھ سکتے تھے لیکن مسٹر دولتانہ نے کونسل کے اجلاس مورخہ ۲۶-۲۷- جولائی ۱۹۵۲ء میں ان کو اس منشا کی قرارداد منظور کرنے سے محترز رہنے پر آمادہ کرلیا۔ کہ

احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے اور کونسل کو سمجھا دیا کہ صوبائی تنظیم ایسے مسائل کا فیصلہ کرنے کی اہل نہیں جو مرکزی کونسل اور اسمبلی کے دائرۂ عمل میں آتے ہیں۔ انہوں نے کونسل کے ممبروں پر یہ واضح کر دیا کہ مرکز کچھ بھی فیصلہ کرے صوبے کا فرض یہ ہے کہ قانون و انتظام کو بحال رکھے اور جان و مال کی حفاظت کرے (سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۵۲ء)

لیگ کے حامی اخباروں کا رویّہ

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے جولائی ۱۹۵۲ء میں لیگ کے حامی اخباروں پر بھی اپنے خیالات واضح کر دیئے چنانچہ اس کے بعد "احسان"۔ "آفاق" اور "مغربی پاکستان" نے فرقہ وار پروپیگنڈا بند کر دیا۔ لیگ کا چوتھا حامی اخبار "زمیندار" مرکز کا منظور نظر تھا اور اس سے بے شمار فوائد حاصل کر رہا تھا۔

فرقہ وار جلسوں کے خلاف کارروائی

مسٹر دولتانہ نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ آخری اور اہم بات یہ ہے کہ فرقہ وار جلسوں کے خلاف کافی انتظامی کارروائی کی گئی احمدیوں اور احراریوں دونوں کے جلسے جون ۱۹۵۲ء میں ممنوع قرار دیئے گئے جس پر یہ مکروہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ حکومت مسجدوں میں مداخلت کر رہی ہے کیونکہ جب حکم امتناعی دیا گیا تو احراریوں نے مسجدوں میں جلسے منعقد کئے پھر بھی بعض مقدمات دائر کئے گئے اور بعض اشخاص سزایاب بھی ہوئے اور اس کا نتیجہ مفید ہوا۔ احراری ۱۹۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک وفد لے کر آئے اور اس کے بعد ایک بیان شائع کیا کہ ان کا ارادہ ہرگز تشدد اختیار کرنے کا نہیں اور وہ حکومت کو قانون و انتظام کے قیام میں مدد دیں گے۔ اس یقین دہانی پر مسٹر دولتانہ نے حکم امتناعی واپس لے لیا مقدمے بھی واپس لے لئے اور سزا یافتوں کو رہا کر دیا۔

یکطرفہ کارروائی ممکن نہ تھی

مسٹر دولتانہ کا دعویٰ ہے کہ ان کے لئے قانون و انتظام کی حفاظت کی غرض سے احرار کے خلاف یکطرفہ کارروائی کرنا ممکن نہ تھا۔

اوّل اس لئے کہ ممکن ہے اس سے مرکز یا صوبوں کے ساتھ پالیسی کا تصادم ہو جاتا دوم۔ اسلئے کہ جب ۸۔ اگست ۱۹۵۲ء کو وزرائے کابینہ۔ چیف منسٹروں اور گورنروں کے اجلاس کراچی میں یہ فیصلہ ہو گیا کہ علما سے براہِ راست تصادم سے پرہیز کیا جائے اور ذاتی اثر کا دباؤ ڈالا جائے تو اقدامات کا راستہ کھلا نہ رہا۔ آخری بات یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں صورت حالات خاص طور پر بڑی نہ تھی جون اور جولائی ۱۹۵۲ء کی شورشوں پر قابو پا لیا گیا تھا۔ احرار نے عہد و پیمان کر دیا تھا اور مرکز علما سے مذاکرات کر رہا تھا۔

ختم نبوت۔ احمدیوں کے جنونی رجحانات

خود شورش کے متعلق مسٹر دولتانہ کا خیال یہ تھا کہ ختم نبوت کا عقیدہ اسلام کا ایک مقدس اصول ہے اور احمدی غیر مسلم ہیں۔ اس شورش کو خود احمدیوں کے "مخصوص علیحدگی پسندانہ۔ ناقابل مفاہمت اور جنونی رجحانات" سے تقویت پہنچی احرار نے اپنے کھوئے ہوئے اعتماد و اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے احمدیوں کے اس رویّے سے فائدہ اٹھایا بہرحال یہ تحریک ایک ایسے وقت پر بالکل بے موقع تھی جب ملک اندرونی اور بیرونی خطرات سے دوچار تھا بین الاقوامی حالات کے اعتبار سے دیکھا جائے۔ تو یہ

نہایت قابل بحث قضیہ تھا اور اس کے خلاف نہایت وقیع سیاسی اور عملی دلائل دیئے جا سکتے تھے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر تحریک جو فرقہ وارانہ تلخی کو اُکسانے والی ہو سنگین نتائج کی حامل ہُوا کرتی ہے۔

لیکن مختصراً "ہم سبب کو روکے بغیر اس کے اثر پہ قابو نہ پا سکتے تھے"

خواجہ ناظم الدین کا دفاعی جواب: صوبے نے شورش کا رُخ مرکز کی طرف پھیر دیا

خواجہ ناظم الدین نے یہ تسلیم کیا کہ مسٹر دولتانہ نے مرکز سے کوئی فیصلہ کرنے کے لیئے اصرار کیا تھا لیکن اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ ذمہ داری مرکز کی طرف منتقل ہو جائے۔ خواجہ صاحب نے مارچ ۱۹۵۳ء میں دستور ساز اسمبلی کو بھی یہ بتا دیا تھا کہ یہ شورش "سیاسیات اقتدار" کی بھڑکائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے اس امر سے انکار کیا کہ کراچی کی اگست کانفرنس میں کوئی ایسا فیصلہ ہُوا تھا کہ علما سے براہِ راست تصادم پیدا کرنے سے گریز کیا جائے: اس گفتگو کا عام رُجحان یہ تھا کہ صورت حالات کا مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان اصولوں کو اختیار کیا جائے جو ۱۴ اگست کے کمیونکے میں قائم کیئے گئے تھے اگر ان اصولوں پر مناسب طریق سے عمل درآمد کیا جائے تو اس سے اصل شورش کی بنیاد ختم ہو جائے گی۔ اور وہ بنیاد اس شکایت پہ ہے کہ مذہبی پراپیگنڈا سرکاری سرپرستی میں کیا جا رہا ہے خواجہ صاحب اس خیال پر قائم تھے کہ اس کمیونکے میں مطالبات کے متعلق مرکز کے رویّے کی وضاحت ہو گئی تھی۔ باقی رہا عُلما کا معاملہ تو چونکہ خواجہ صاحب نے ہمیشہ ان مطالبات کو ناقابل عمل قرار دیا تھا اس لیئے علما نے یہی اثر قبول کیا ہو گا کہ وہ ناقابل تسلیم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے قطعی اور آخری طور پر انہیں مسترد نہیں کیا لیکن علما کو یہ مشورہ دیا کہ ان پر زور نہ دیں اور ان کو یہ بھی بتایا کہ انسانی دانشمندی ضرور کوئی ایسا حل تلاش کر سکتی ہے جس میں مطالبات کے منظور یا مسترد کرنے کی ضرورت نہ پڑے انہوں نے علما سے یہ بھی کہہ دیا کہ آبادی کے کسی حصّے کو اقلیت قرار دینا حکومت کے فرائض میں داخل نہیں ہے اور یہ وظیفہ دستور ساز اسمبلی کا ہے خواجہ صاحب نے بیان کیا کہ وہ خود بھی احمدیوں کو اقلیت قرار دلانے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن وہ یہ بات علما سے کہنے پر آمادہ نہ تھے کیونکہ اس سے علما کے ساتھ براہِ راست تصادم لازم آتا جس سے وہ احتراز کرنا چاہتے تھے تاہم انہوں نے علما کو بتا دیا کہ ان مطالبات پر زور دینا مفادِ ملکی کے منافی ہے اور ان کو تسلیم کرنا بے حد مشکل ہے بلکہ دستوری دستاویز میں بھی لفظاً "مسلم" کی ایسی تعریف کرنا آسان نہ ہو گا جو احمدیوں کو تو اس تعریف سے خارج کر دے اور کسی دوسرے طبقے کو خارج نہ کرے۔

فتوائے کفر اور اس کا اثر

خواجہ صاحب کا اپنا عقیدہ یہ تھا کہ اگر نوے فیصدی علما اس پر اتفاق کر لیں کہ مرزا غلام احمد کو ماننے والا کافر ہے اور اس کو سنگسار کر کے ہلاک کر دینا چاہیئے تو وہ اس فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیں گے۔ لیکن کفر کا فتوےٰ کسی جماعت کو لازماً ایک غیر مسلم اقلیت نہیں بنا دیتا لہٰذا مطالبات کی بنیاد ایک اسلامی مملکت کے مطالبہ سے کوئی تعلق نہیں

رکھتی۔ خلفائے اربعہ کے بعد سے تاریخ اسلام میں کفر کے فتووں کا رواج عام رہا ہے لیکن ان کا یہ نتیجہ کبھی نہیں ہوا کہ ان افراد یا جماعات کو جن کے خلاف فتوے دیا گیا ہو شہری حقوق سے محروم کر دیا جائے۔ یہ بیان ایک ایسی مملکت میں واقعی بے حد غنیمت اور تسلی بخش ہے جس میں فتوے غالباً توپ اور مکھن کی مانند ضروری بننے والے ہیں۔ یہ آخری فقرہ ہمارا ہے۔

وہ علما کو آزادی اظہار کا حق دینا چاہتے تھے

خواجہ ناظم الدین نے اقرار کیا کہ انہوں نے مسٹر دولتانہ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ وہ علما کو علی الاعلان اپنے عقائد مذہبی کے اظہار سے منع کریں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اظہار خیالات کی آزادی میں مداخلت کی جا رہی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اظہار خیالات کی آزادی کا مطلب "مادر پدر آزادی" نہیں۔ اور جب مقررین حد سے تجاوز کرنے لگے اگر اس حالت میں حکومت پنجاب تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۵۳۔الف اور دفعہ ۲۹۵۔الف کا ہوشمندانہ استعمال کرتی تو صورت حالات اس حد تک نہ بگڑنے پاتی۔ پھر تو کیفیت یہ ہو گئی کہ اگر علما بھی ڈائرکٹ ایکشن کے فیصلے سے منحرف ہونا چاہتے تو رائے عامہ کے خوف سے ایسی جرات نہ کر سکتے۔

اگست ۱۹۵۲ء کی کانفرنس

چونکہ خواجہ ناظم الدین تسلیم کرتے ہیں کہ وہ علما کے ساتھ تصادم سے احتراز کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اس سوال کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی کہ آیا اگست ۱۹۵۲ء کی کانفرنس میں تصادم سے بچنے کا کوئی فیصلہ کیا گیا تھا یا نہیں تاہم مسٹر دولتانہ کے اپنے دو گواہوں یعنی سردار عبدالرب نشتر اور خان سردار بہادر خاں نے بھی مسٹر دولتانہ کی تائید میں کچھ نہیں کہا (یہی دو گواہ تھے جو اگست کی کانفرنس کے متعلق استفسارات کے لئے طلب کئے گئے تھے)، اول الذکر نے کہا کہ جب صوبجاتی نمائندوں سے ان کے خیالات دریافت کئے گئے تو خان عبدالقیوم خاں نے قوت کے استعمال کے متعلق تامل کا اظہار کیا کیونکہ اس کا اثر ان کے صوبے پر پڑنے کا اندیشہ تھا لیکن مسٹر دولتانہ کی رائے یہ تھی کہ اگر مرکز قطعی فیصلہ کر دے کہ اس تحریک کو ختم کر دیا جائے تو ایسی حالت میں حکومت پنجاب کسی قدر کوشش کے بعد صورت حالات کا مقابلہ کامیابی سے کر سکے گی۔ سردار عبدالرب نشتر یہ نہیں بتا سکے کہ آیا وزیر اعظم نے کسی خیال کا اظہار کیا تھا یا کوئی رسمی فیصلہ کیا گیا تھا لیکن ان کے قول کے مطابق اتفاق آرا اسی پر تھا کہ تحریک کو بزور دبا دیا جائے۔ خواجہ ناظم الدین کا عام رویہ بھی یہی تھا وہ مطالبات کے حامی معلوم نہ ہوتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ رائے عامہ کو دبانے کے لئے قوت بھی استعمال نہ کرنا چاہتے تھے۔

خان سردار بہادر خاں

خان سردار بہادر خاں نے کہا کہ مسٹر دولتانہ نے مرکزی حکومت سے کسی صاف اور واضح فیصلے کے لئے اصرار کیا تاکہ پنجاب میں نظم حکومت کی مشینری تیز تر ہو جائے اگر ایسا فیصلہ صادر ہو گیا تو حکومت اپنی سیاسی مشینری (یعنی مسلم لیگ اور اخبارات) کو عوام کی صحیح تعلیم کے لئے آمادہ کر لے گی۔

مسٹر دولتانہ کے ایک اور گواہ مسٹر چندریگر تھے لیکن ان سے اس کانفرنس کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا گیا۔

خواجہ ناظم الدین کے بیان کی نفی نہیں ہوتی

اس شہادت سے خواجہ ناظم الدین کے اس دعوے کی نفی نہیں ہوتی کہ کانفرنس کے نزدیک ۱۴۔ اگست کا کمیونکے اس مسئلے کا بہترین حل تھا۔ سردار عبدالرب نشتر نے وزیراعظم کے زیر ہدایت اس کمیونکے کا مسودہ تیار کیا تھا بیان کرتے ہیں کہ گو یہ مسودہ اس کانفرنس میں تیار نہیں ہوا۔ لیکن ممکن ہے یہ اس کانفرنس کی گفت و شنید ہی کا نتیجہ ہو۔ خواجہ ناظم الدین نے اس امر سے بلا تامل انکار کیا ہے کہ اس کانفرنس میں علما کے ساتھ تصادم سے احتراز کا فیصلہ کیا گیا تھا خواجہ صاحب کے اس انکار کے کچھ معنی ضرور ہوں گے۔ اگر کانفرنس نے اس قسم کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا تو پھر مسٹر دولتانہ کے اس قول میں کوئی جان نہیں رہتی کہ ۰۔ اگست ۱۹۵۲ء کے بعد اُن کے لئے کسی کارروائی کا دروازہ کھلا نہ رہا تھا اور اگر ۱۴۔ اگست کا کمیونکے اس کانفرنس کی گفت و شنید کا نتیجہ تھا تو اس کمیونکے کو نئی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے

۱۴۔ اگست کے کمیونکے سے خواجہ ناظم الدین کا رویہ واضح ہو جانا چاہیئے تھا

یہ تحریک کو "راستے پر لگانے" کی ایک کوشش تھی (یہ محاورہ آگے چل کر عام فہم ہو جائے گا) اور اس سے خواجہ ناظم الدین کے ذہن میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ مولانا اختر علی خاں ایڈیٹر "زمیندار" نے جن کی سرکردگی میں ایک وفد کراچی گیا تھا۔ ۲۔ اگست کو یا اس کے قریب ایک فتحمندانہ اعلان کیا کہ مرکزی حکومت ۱۴۔ اگست کو بعض مطالبات تسلیم کرلے گی لیکن انکو اس کمیونکے میں پریشان کن جواب ملا۔ خواجہ ناظم الدین کا بیان ہے کہ انہوں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا اور صرف یہی کہا تھا کہ وہ یوم پاکستان کی تقریر میں اس موضوع کے متعلق کچھ کہیں گے یہاں پھر مسٹر دولتانہ نے ایک بیان دیا ہے جو ان کے وکیل نے دوسرے گواہوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی: مرکزی وزرا نے خواجہ ناظم الدین سے کہا کہ انہیں مولانا اختر علی خاں سے کوئی وعدہ نہ کرنا چاہیئے تھا اور اگر وہ کر چکے ہیں تو اس کو پورا کرنے کا عزم کر لیں" اس پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ پالیسی کا کوئی واضح اعلان نہ ممکن ہے نہ قرین مصلحت ہے اور اس قضیئے سے دامن چھڑانے کے لئے عوام کو کسی قسم کا دلاسا دے دیا جائے چنانچہ اسکے بعد یہ کمیونکے جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا"۔ مسٹر دولتانہ نے اس امر کی صراحت نہیں کی کہ وزرا کیونکر اپنے اس بلند بانگ اصرار سے کہ خواجہ ناظم الدین اپنا وعدہ پورا کریں نیچے اُتر کر اس پر رضامند ہو گئے کہ محض ٹالنے کی خاطر ایک کمیونکے شائع کر دیا جائے جس میں مطالبات کا کوئی ذکر تک نہ ہو لہٰذا ہم اس کمیونکے کو اسکی ظاہری حیثیت میں قبول کر کے یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ اگر "زمیندار" کی پیدا کی ہوئی توقعات کے باوجود خواجہ ناظم الدین نے مطالبات پر نہیں بلکہ اس چیز پر اپنی توجہ مبذول کی جسکو وہ بنیادی سبب سمجھتے تھے تو ظاہر ہے کہ ان کے دل میں مطالبات کے متعلق کوئی لمبا چوڑا جذبہ نہ تھا اور اگر علما کو اُن سے کوئی امیدیں تھیں تو وہ امیدیں خدا ہی سے ہونی چاہیئے تھیں۔

کمیونکے کا اثر بے حیثیت رہا

ہم کو معلوم نہیں کہ مسٹر دولتانہ کے وکیل نے مسٹر انور علی کے اس بیان سے کیا فائدہ حاصل کیا ہے کہ جب "زمیندار" کے اعلان کی کوئی تردید نہ کی گئی تو عوام کے دلوں میں امیدیں پیدا ہو گئیں۔ اگر کمیونکے سے کوئی وسیع بلوہ رونما ہو گیا ہوتا تو بارہ دن کی مختصر مدت کے لئے امیدیں پیدا ہو جانا بطور دلیل قابل توجہ ہو سکتا تھا مسٹر انور علی کا دوسرا بیان بھی جو کم و بیش متضاد سا ہے ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ کمیونکے ہی سے احرار اور ان کے دوستوں نے یہ اثر قبول کیا کہ ان کا نقطہ نگاہ جزوی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور مزید منظوری کا اعلان عنقریب کیا جائے گا اگر اس کمیونکے سے احرار خوش ہوئے تو ایک طرف خواجہ ناظم الدین نے تحریک کو "راستے پر لگانے" کی جو کوشش کی تھی وہ کامیاب ہو گئی اور دوسری طرف "زمیندار" نے جن امیدوں کو بیدار کیا تھا وہ بھی خاک میں ملنے سے بچ گئیں۔ بہر حال خواجہ ناظم الدین کا یہ مقصد تو نہ تھا کہ احراریوں کو کسی حالت میں بھی حکومت کے کسی فعل پر زیادہ سے زیادہ مسرت نہ ہو جس حد تک احراریوں کی شکایات صحیح معلوم ہوتی تھیں خواجہ ناظم الدین کے لئے راستہ کھلا ہوا تھا بلکہ درحقیقت یہ ضروری بھی تھا کہ وہ انسدادی تدابیر اختیار کریں۔

مسٹر دولتانہ نے فیصلے پر اصرار کیا

خواجہ ناظم الدین اس سے انکار نہیں کرتے کہ مسٹر دولتانہ وقتاً فوقتاً کسی فیصلے کے صدور پر اصرار کرتے رہے دوسرا موقع ۲۶-اگست ۱۹۵۲ء کو مری میں پیدا ہوا اور ان کے بیان کے مطابق تیسرا موقع وہ تھا جب اکتوبر میں مسلم لیگ کا اجلاس ڈھاکہ میں ہو چکا تھا اور آخر ۱۶-۱۷ فروری ۱۹۵۳ء کو اس معاملے کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ جب خواجہ ناظم الدین لاہور گئے تھے یہی موقع تھا جس پر خواجہ ناظم الدین نے انکو بتایا کہ وہ علما کے ساتھ براہِ راست تصادم کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔

مسٹر چندریگر کی شہادت

مسٹر چندریگر جو مری اور لاہور کے مذاکرات کے شاہد ہیں مری کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اور مسٹر دولتانہ نے وزیر اعظم سے اصرار کیا کہ مرکز کے رویّے کا تعین اور اعلان ضروری ہے کیونکہ مسلم لیگ اور دوسرے سنجیدہ طبقے اس وقت تک جوابی پروپیگنڈا جاری نہیں کر سکتے جب تک انہیں مرکزی حکومت کے رویّے کا علم نہ ہو جائے اور صورت حالات کے زیادہ بگڑ جانے کا احتمال ہے خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ وہ سردار عبدالرب نشتر کی حج سے واپسی پر اس معاملے کے متعلق علما سے گفتگو کریں گے اور پھر کوئی پالیسی وضع کی جائے گی وہ ایک ایسا فارمولا تیار کرنے کی فکر میں تھے جو سب کے لئے قابل قبول ہو۔ اور پھر اس فارمولا کی تائید پاکستان مسلم لیگ کونسل سے کرانا چاہتے تھے ہمارے ایک سوال کے جواب میں مسٹر چندریگر نے تسلیم کیا کہ وزیر اعظم نے کہا تھا" ان مطالبات کا ذکر کئے بغیر" اور اگر قانون و انتظام کا سوال پیدا ہوا تو اس کا تدارک صوبائی حکومت کا کام ہوگا"۔ لیکن انہوں نے یہ تسلیم نہ کیا کہ مرکزی حکومت کی پالیسی اموافق ہو یا مخالف۔ یا مرکزی حکومت کے تذبذب کا کوئی اثر قانون و انتظام پر بھی پڑے گا"

مسٹر چندریگر کا بیان ہے کہ اسکے بعد ۱۶- فروری کو مزید بات چیت ہوئی اور وزیر اعظم نے بتایا کہ وہ مختلف مسالک کے علما سے گفتگو کرنے کے بعد پُرامید ہیں اور وہ ان کے اختلاف رائے پر بھروسا کرکے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض ڈائرکٹ ایکشن کی حمایت سے باز رہیں گے اور ممکن ہے کہ ڈائرکٹ ایکشن ہو ہی نہ سکے اگر اس امر میں ناکامی ہوئی تو وہ ساری دنیائے اسلام کے علما کی ایک کانفرنس طلب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

حکومت پنجاب کے وکیل مسٹر فضل الٰہی نے گواہ کو یاد دلایا کہ ۲۶- اگست کو مری میں وزیر اعظم کی رائے یہ تھی کہ اگرچہ مطالبات قابل تسلیم نہیں ہیں۔ لیکن اگر ایسا اعلان کر دیا گیا تو شورش پسندوں کو موقع ملے گا کہ عوام کو مشتعل کریں گواہ نے جواب دیا کہ "۲۶- اگست کو وزیر اعظم نے ایسی کوئی رائے ظاہر نہیں کی تھی میری موجودگی میں انہوں نے یہ خیال پہلی دفعہ ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور میں ظاہر کیا تھا۔"

مسٹر چندریگر کی شہادت میں دو اہم نکتے

جو سوال ہم نے قانون و انتظام کی نسبت خواجہ ناظم الدین کے رویّے کے متعلق کیا اور جو سوال مسٹر فضل الٰہی نے مطالبات کے متعلق ان کے رویے کی نسبت کیا ان سوالوں سے خواجہ ناظم الدین کے جواب کے دو نہایت اہم پہلو واضح ہوئے لیکن اگر ان کو مسٹر چندریگر کے اس بیان کے ضمیمے کے طور پر نہ پڑھا جائے جو انہوں نے مسٹر دولتانہ کے وکیل کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے ۲۶- اگست اور ۱۶- فروری کے اجلاسوں کے متعلق دیا تھا تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین علما کے سوا اور کسی چیز پر غور کر ہی نہیں رہے تھے اگر یہ سوال نہ کئے جاتے تو اس امر کا احتمال تھا کہ ہم ان کے طرز عمل کے متعلق نامکمل سی رائے قائم کرتے اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب کے ذہن پر بڑی حد تک علما ہی چھائے ہوئے تھے لیکن ان جوابات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں قانون و انتظام کی صورت حالات کا بھی احساس تھا اور انہوں نے مطالبات کے متعلق اپنی رائے کم از کم ۱۶- فروری کو صوبائی حکومت تک پہنچا دی تھی۔ اگر یہ درست ہے تو صوبائی حکومت کیا جاننا چاہتی تھی اور ۲۱- فروری ۱۹۵۳ء کو چیف سیکرٹری کے دستخطوں سے جو چٹھی وزارت داخلہ کو لکھی گئی تھی اور درخواست کی گئی تھی کہ "ان مطالبات کے متعلق مضبوط پالیسی کا اعلان کرے تاکہ اس اعلان سے ہمارے ہاتھ مضبوط ہو جائیں" اس کا کیا مطلب تھا۔

علما سے رعایات دوسرے مقاصد کے لئے

مسٹر دولتانہ نے اپنے بیان کے ایک مرحلے پر یہ شکایت کی تھی کہ خواجہ ناظم الدین علما کو رعایات دینے کی پالیسی پر اسلئے کاربند ہو رہے تھے کہ انہیں دوسرے محاذوں پر استعمال کر سکیں۔ "میرے نزدیک ان کی پالیسی یہ تھی کہ اپنی پوری توجہ مذہبی قضیوں پر مرتکز کر دیں اور اسطرح ہر دلعزیزی حاصل کر کے مساوات نمائندگی اور زبان جیسے مسائل دستوری میں کامیاب ہو جائیں"۔ عدالت کے ایک سوال پر بطور تصریح انہوں نے یہ کہا کہ .... "میرے پاس ان کے مذہبی خلوص پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہیں"۔ "میرا خیال ہے کہ وہ مذہبی احساسات کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر رہے تھے اور خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ ان

کے مذہبی عقائد اور ان کی سیاسیات دونوں کا رُخ ایک ہی طرف تھا" اگر حقیقت یہی ہے تو یہ کہنا قرینِ انصاف نہ ہوگا کہ وہ بعض دوسرے مقاصد کی خاطر عُلما کے آگے جھک رہے تھے لیکن مسٹر دولتانہ کے وکیل کا موقف اس وقت زیادہ استوار تھا جب اس نے خواجہ ناظم الدین سے یہ سوال کیا کہ ایک اسلامی مملکت کے تصور کے متعلق ان کے مذہبی عقائد کیا ہیں بظاہر اس سوال کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ان کی سیاسیات پر ان

اسلامی مملکت کے متعلق خواجہ صاحب کا تصوّر

عقائد کا کسقدر گہرا اثر ہے خواجہ ناظم الدین کا قول یہ تھا کہ خود قائدِ اعظم کا نصب العین بھی اسلامی دستور تھا اور حقیقت میں پاکستان اسی یقین کی بنا پر حاصل کیا گیا تھا خواجہ صاحب نے اس خیال کو تسلیم نہیں کیا کہ قائدِ اعظم پاکستان میں مسلموں اور غیر مسلموں کی واحد قوم بنانا چاہتے تھے جس میں سب کے شہری حقوق مساوی ہوں کیونکہ اگر ان کا نقطۂ نگاہ یہی ہوتا تو وہ مسلم لیگ کی از سرِ نو تنظیم کا مشورہ نہ دیتے جب خواجہ صاحب کو یاد دلایا گیا کہ قائدِ اعظم نے ۱۱۔ اگست ۱۹۴۷ء کو دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی تھی کہ "کچھ وقت گزر جانے پر ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے مذہبی مفہوم کے اعتبار سے نہیں کیونکہ یہ ہر فرد کے ذاتی یقین و ایمان کا معاملہ ہے بلکہ وہ سب سیاسی مفہوم میں مملکت کے شہری ہوں گے"۔ تو خواجہ صاحب نے صاف کہا کہ مذہب یا اسلامی مملکت کے متعلق اُن کا یہ نقطۂ نگاہ نہیں ہے انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ خان لیاقت علی خاں کی زندگی میں آئندہ دستور کے متعلق مجلس اصولِ اساسی کی جو عبوری رپورٹ پیش کی گئی تھی اس میں جو نظام مدنظر تھا وہ مذہبی مملکت کا نہ تھا آپ نے مزید یہ بیان کیا کہ موجودہ رپورٹ علما کے ساتھ طویل مذاکرات کے بعد تیار کی گئی تھی جن میں تین دوسرے وزرا بھی شامل تھے اور ان میں سے ایک سردار عبدالرب نشتر تھے مختصر یہ کہ جس فضا میں موجودہ رپورٹ نے جنم لیا وہ خشک مذہبیت کی فضا تھی بھلا جو حکومت مذہب میں از سرتا پا مستغرق ہو اس کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ مطالبات کو رد کر دیتی)۔

علما پر خواجہ صاحب کے رویّے کا کیا اثر مترتب ہُوا

اس دلیل میں یقیناً قوت ہے اور دوسرے کوائف کی عدم موجودگی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین کے رویّے سے علما پر یہ اثر پڑا کہ شاید وہ کچھ مدت کے بعد ان مطالبات کو منظور کر لیں گے لیکن بعض علما نے جو بحیثیت وفد خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ہمارے سامنے ایسے بیانات دیئے ہیں جن سے ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ خواجہ صاحب کا رویہ ہر ذہین آدمی پر روشن ہو جانا چاہئے تھا مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے ۱۳۔ اور ۱۶۔ اگست ۱۹۵۲ء کو دو دفعہ تین چار دوسرے اشخاص کی معیت میں خواجہ صاحب سے ملاقات کی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگوں کا یہ مطالبہ کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے دستور ساز اسمبلی کے دائرۂ اختیار میں ہے ہم نے ان سے سوال کیا کہ آیا وہ اسمبلی کے لیڈر کی حیثیت سے اسمبلی میں یہ سوال اٹھائیں گے یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں اس معاملے پر غور کروں گا"۔ چودھری محمد ظفر اللہ خاں

کے متعلق" انہوں نے قطعی طور پر یہ رائے ظاہر کر دی کہ وہ اس معاملے میں کوئی کارروائی نہیں کرینگے"۔ احمدیوں کو کلیدی اسامیوں سے برطرف کرنے کے متعلق انہوں نے کہا کہ وفد کو یہ کیس ہمارے سامنے پیش کرنا پڑے گا (اسکا مطلب کچھ بھی ہو) پھر ہم اس پر ہمدردانہ غور کرینگے اس کے ساتھ ہی انہوں نے ارکانِ وفد سے پوچھا کہ کیا آپ لوگوں نے ۱۴ اگست کا پریس کمیونکے دیکھا ہے؟ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ وہی کافی ہے۔

مولانا ابوالحسنات

اگر مولانا ابوالحسنات کے بیان پر اعتبار کیا جائے تو حقیقت میں خواجہ صاحب نے بالکل یہی کہا تھا" ہم نے پھر ان سے سوال کیا کہ آیا حکومت نے مطالبات ثلاثہ کے متعلق کوئی فیصلہ کیا ہے انہوں نے ہم سے دریافت کیا کہ کیا آپ لوگوں نے مرکزی حکومت کا وہ کمیونکے پڑھا ہے کہ حکومت کے وزرا اور سرکاری افسروں کو فرقہ دارا اور مذہبی تبلیغ سے باز رہنا چاہیئے؟ ہم نے کہا کہ ہم وہ کمیونکے اور اسکے متعلق چودھری ظفر اللہ خاں کے خیالات بھی پڑھ چکے ہیں اس کے بعد خواجہ ناظم الدین نے کہا کہ حکومت کے اس اقدام سے (یعنی کمیونکے کی اشاعت سے) آپ لوگوں کو مطمئن ہو جانا چاہیئے ہم نے کہا کہ کمیونکے کا ان مطالبات سے کوئی تعلق نہیں جو ہم نے آپکی خدمت میں پیش کیئے ہیں"

پھر مولانا ابوالحسنات

چار یا پانچ ماہ بعد مولانا ابوالحسنات نے پھر خواجہ صاحب سے ملاقات کی اس دفعہ مولانا اختر علی خاں اور بعض دوسرے اشخاص ان کے ساتھ تھے یہ واقعہ غالباً دسمبر ۱۹۵۲ء کا ہے کیونکہ اس کے بعد جنوری میں پھر ملاقات ہوئی تھی۔ خواجہ ناظم الدین نے وفد کو بتایا کہ "میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے لئے ان مطالبات کو تسلیم کرنا مشکل ہے"۔ جنوری میں انہوں نے ارکان وفد سے کہا کہ "اگر میں نے چودھری محمد ظفر اللہ خاں کو کابینہ سے برطرف کر دیا تو پاکستان کو امریکہ سے گندم کا ایک دانہ بھی نہ ملے گا"۔ جب ارکانِ وفد نے یہ سنا تو دوسرے دو مطالبات کے متعلق کوئی ذکر نہ کیا۔

مولانا بدایونی

مولانا عبدالحامد بدایونی مرکزی مجلس عمل کے پانچ دوسرے ممبروں کی معیت میں ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو یا اس کے بعد خواجہ صاحب سے ملے۔ ان کی شہادت اتنی واضح تو ہے کہ اس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکے لیکن کچھ زیادہ یقین انگیز نہیں مولانا کا بیان یہ ہے وزیر اعظم نے کہا کہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کو چونکہ ہندوستان و پاکستان کے تنازع انہار اور غذا کی صورت حالات میں بڑی اہمیت حاصل ہے اسلئے میں انہیں برطرف کرنے سے قاصر ہوں لیکن جہاں تک اصل مسئلے کا تعلق ہے میں اس پر غور کرنے کے لیئے تیار ہوں جب مولانا سے یہ سوال کیا گیا کہ جس حالت میں اصل مسئلے کے متعلق وزیر اعظم مائل بہ کرم تھے تو پھر مجلس عمل نے ڈائرکٹ ایکشن کیوں شروع کر دیا۔ تو مولانا نے جواب دیا کہ باقی دو مطالبات کے متعلق" خواجہ صاحب کا جواب تسلی بخش نہ تھا اس سے پہلے کوئی چھ سات موقعوں پر وزیر اعظم مطالبات کو منظور کرنے کا وعدہ کر چکے تھے اور کہ رہے تھے کہ ذرا انتظار

کیجئے۔ لیکن مولانا کے خیال میں کسی دوسری دشواری یا ذمہ داری سے الگ ہو کر وہ ان مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

واضح طور پر نہیں کہا خود خواجہ ناظم الدین بھی یہ نہیں کہتے کہ انہوں نے کسی موقع پر بالوضاحت علما سے کہہ دیا تھا کہ وہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔

اسکی وجہ یہ بھی کہ وہ علما کے ساتھ تصادم سے بچنا چاہتے تھے ان سے کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ "براہِ راست تصادم" کے معنی کیا ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اسکا مفہوم یہ تھا:۔ اگر آپ کسی شخص سے یہ کہہ دیں کہ میں تمہارا مطالبہ منظور نہیں کروں گا تم جہنم میں جاؤ تو وہ اپنے مقصد کے لیئے بے انتہا جوش و خروش کا نتیجہ بن جائے گا لیکن اگر آپ اس کے نقطۂ نگاہ سے ہمدردی کا اظہار کریں لیکن اسکے ساتھ ہی تاسف کے ساتھ یہ کہہ دیں کہ میں نہایت شدید مشکلات کی وجہ سے آپ کا مطالبہ منظور کرنے سے قاصر ہوں تو اس سے اتنا جوش پیدا نہیں ہوگا ایسے حالات میں آپ ہر وقت معاملے پر مزید غور و فکر کے لئے آمادہ رہتے ہیں لیکن اگر کسی سیچے پبلک آدمی کی اس قسم کی باتوں اور اسکے حُسنِ نیت اور خیرسگالی کے جذبے سے کوئی شخص بہشت کا تصور باندھنے لگے تو وہ بہشت کسی عقل مند کا بہشت نہ ہوگا (یعنی جنت الحمقا ہوگا)

اپنے آپ کو حالات کی لہر پر چھوڑ دینے کی پالیسی مسٹر دولتانہ نے اپنے بیان کے ایک اور مرحلے پر یہ بھی کہا کہ مرکز کی پالیسی اپنے آپ کو حالات کی لہر پر چھوڑ دینے کی پالیسی تھی اس سے کسی منشا یا ارادے کا اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ قوت فیصلہ کے فقدان ہی کا پتہ چلتا ہے لیکن اگر مرکز اپنے دائرے میں بے بسی سے بہا جا رہا تھا تو کیا صوبائی قیادت کو اس سے یہ تحریک نہ ہوئی تھی کہ وہ اپنے آپکو اس بہاؤ سے بچانے کے لئے اپنے فرض کو بہتر طریق پر محسوس کرتی؟ ہم مستثنےٰ قسم کی اس قیادت کا تصور نہیں کر رہے ہیں جو کسی ضرورت کے وقت سطح پر اُبھر آیا کرتی ہے بلکہ ہم اس عام قسم کے آدمی کا تصور کر رہے ہیں جو اوسط سے کسی قدر بلند ہوتا ہے اور عام دانشمندی اور محنت سے کام لے کر کسی خرلنگ کو بھی منزل مقصود پر پہنچا سکتا ہے مسٹر دولتانہ نے جواب دیا کہ وہ اپنی حکومت کو اس بہاؤ سے بچانے کا کوئی بہتر طریقہ دریافت نہ کر سکتے تھے کیونکہ اگست ۱۹۵۲ء کی کراچی کانفرنس میں اور اس کے بعد بھی اس امر کا واضح اشارہ کر دیا گیا تھا کہ مطالبات اور تقریریں اس وقت تک ممنوع نہیں قرار دی جا سکتیں جب تک وہ حدودِ قانون کے اندر رہیں انہیں آخری لمحے تک یقین نہیں آیا کہ وزیر اعظم مطالبات کو تسلیم نہ کرینگے علما کے ساتھ مذاکرات کا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ لیڈروں کو کسی نہ کسی طرح اس امر پہ آمادہ کر لیا جائے کہ وہ مطالبات پر فوری مقصد کی حیثیت سے اصرار نہ کریں اگر مسٹر دولتانہ نے وزیر اعظم کے طرزِ عمل سے یہ اثر قبول کیا تو افسوسناک ہے لیکن متعلقہ فریق یعنی علما کا تاثر بالکل ہی مختلف تھا اور ان کا محض تاثر ہی نہ تھا بلکہ انہوں

نے سب باتیں خود شخص متعلق کے منہ سے سُنی تھیں لہٰذا علما کے ساتھ مذاکرات کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ انکو جھکنے کی ترغیب دی جائے اور انہیں دو ٹوک جواب دے کر ناراض نہ کیا جائے۔ مزید براں اگرچہ یہ صحیح ہے کہ وزیر اعظم نے آزادیٔ اظہار (خصوصاً مذہبی فکر کے معاملے میں) کی حمایت کی لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ تقریریں حدودِ قانون کے اندر نہ رہیں اور اس کے باوجود انہیں ممنوع قرار نہ دیا گیا۔ عنقریب یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ دعویٰ بلا وجہ نہ تھا۔

مقصد بظاہر تشدّد کے حق میں نہ تھا

یہ دلیل دی گئی ہے کہ وزیر اعظم نے علما کے ساتھ تصادم سے بچنے کی جو ہدایات دی تھیں ان کی وجہ سے صوبائی دائرے میں کوئی اقدام نہ کیا جا سکا اس دلیل میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ عُلما گویا شوریدہ سر اور دشنام باز دیوانوں کا ایک گروہ تھے جو تشدد کی تلقین کرتے تھے اور خون کے نظارے دیکھنا چاہتے تھے شاید وہ "مذہبی دیوانہ" کہلانے سے تو انکار نہ کریں لیکن ان میں سے ایک بھی ہمارے سامنے یہ اعتراف کرنے پر تیار نہ ہوا کہ اس نے تشدد کی مذمت نہیں کی۔ مولانا میکش نے علما کے کیس پر نمایاں زورِ بیان سے بحث کی لیکن احمدیوں کے خلاف خود اپنے مجنونانہ جوش کے باوجود انہوں نے ان تمام دشنام آمیز تقریروں کی مذمت کی جو ادنیٰ درجے کے لیڈروں نے کی تھیں۔ بیان واقعات سے معلوم ہوگا کہ ایسی تقریریں سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ مولوی محمد علی جالندھری۔ سید مظفر علی شاہ شمسی ماسٹر تاج الدین اور چند دیگر اشخاص نے کی تھیں (اور ہمیں مولانا اختر علی خاں کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے) لیکن اِن حضرات کو یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ انہیں مذہب کے متعلق کوئی گہرا علم حاصل ہے یا وہ علما کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے جب یہ سوال کیا گیا کہ آپ کے نقطۂ نظر میں آیندہ حکومت کی کیا شکل ہونی چاہیئے تو آپ نے جواب دیا کہ اس سوال کا جواب علما ہی دے سکتے ہیں اسلیئے وہ تنہا "امیر شریعت" ہیں جو مذہب کے قلمدان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

عُلما سے تصادم کے متعلق خواجہ ناظم الدین کے اندیشے غیر حقیقی تھے

لیکن مسٹر دولتانہ کو مرکز کے خلاف جو شکایات تھیں ان کے جواب میں سب کچھ کہنے کے بعد اُس شدتِ خوف کو سمجھنا مشکل ہے جو خواجہ ناظم الدین کو علما کے ساتھ تصادم کے متعلق لاحق تھا۔ اگر مطالبات کو رد کرنے کا فیصلہ کر دیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ بے شمار مسلمان ذبح ہو جاتے جو نیک نیتی سے اپنی جانیں دے دیتے اور سمجھتے کہ وہ درجۂ شہادت پہ فائز ہو رہے ہیں اگر اب تک کوئی خونریزی ہوئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں اللہ کی حضور میں اسکا جواب دِہ قرار نہ دیا جاؤنگا لیکن اگر میں نے جارحانہ رویہ اختیار کیا ہوتا اور ملک کو ایک مذہبی جنگ کے حوالے کر دیا ہوتا تو یقین ہے کہ میں دنیا و عقبیٰ دونوں میں روسیاہ ہو جاتا اگر یہ جنگ قانون و انتظام کے سوال پر نہیں بلکہ صرف اپنے مالہٗ و ماعلیہ کی بنا پر لڑی جاتی تو صورت حالات دس گنا زیادہ بدتر

ہوگئی ہوتی اور یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ آخر میں ہم کامیاب ہو جاتے" ہم بڑے احترام کے ساتھ یہ کہیں گے کہ ہمیں خواجہ صاحب کا یہ ارشاد اپنے روشن خلوص کے باوجود جذبات سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ احمدیوں اور سرکاری افسروں کے سوا جو دوسرے لوگ فسادات کا شکار ہوئے وہ دو طبقوں سے تعلق رکھتے تھے ایک وہ لوگ جنہوں نے درجۂ شہادت حاصل کرنے کی کوشش کی اور دوسرے وہ جو اپنے مجرمانہ منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے ایسے موقعوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو قانون و انتظام کی صورت حالات اور مقاصد کی جنگ میں کوئی امتیاز کر سکتا۔ مذہبی دیوانہ تمام حالات میں یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک بلند مقصد کے لئے لڑ رہا ہے ضرورت صرف اسکی ہے کہ کوئی بخاری اسے اسکا یقین دلا دے چور اور بدمعاش کو اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ جس چیز کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہا ہے وہ ناموس رسُول ہے۔ یا بائیسکل کی درجن بھر ٹیوبیں ہیں یہاں بھی صرف کسی بخاری کا یہ اعلان چاہیئے کہ ناموس رسُول خطرے میں ہے۔ ۲۷۔ فروری کی صبح کو لاہور کے بہت ہی کم لوگوں کو اسکی خبر تھی کہ علما اسلیئے گرفتار کیئے گئے ہیں کہ انہوں نے وزیر اعظم کی کوٹھی پر رضا کاروں کے دستے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا ان کا خیال یہ تھا کہ یہ گرفتاریاں اسلیئے ہوئی ہیں کہ مطالبات منظور نہیں کیئے گئے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خان عبد القیوم خاں نے خواجہ ناظم الدین کو سرحد اور قبائل کے متعلق کچھ بتایا تھا اور خواجہ ناظم الدین سمجھتے تھے کہ اگر مطالبات رُد کر دیئے گئے تو جہاد کا اعلان ہو جائے گا ہر حال اب مطالبات رُد کیئے جا چکے ہیں بلکہ وہ سال گزشتہ فروری کی ۲۷۔ تاریخ کو رُد کیئے گئے تھے لیکن قبائل کو کچھ معلوم نہیں کہ لاہور میں جو ایک مدکا سا جھونکا چلا تھا وہ مطالبات کے رُد ہونے کا نتیجہ تھا یا جرائم پیشہ لوگوں کے شور و شغب سے واقع ہوا تھا جو بڑے شہروں میں عموماً ہوا ہی کرتا ہے ہر بات اس پر منحصر ہے۔ کہ آپ لوگوں کو کیا بتاتے ہیں اسلیئے واقعات کا انحصار اس شخص پر ہے جو لوگوں کو زبان سے بتاتا ہے یا اس اخبار پر ہے جو انہیں قلم سے بتاتا ہے یعنی یا تو وہ شخص ہے جو زبان کو دشنام طرازی اور عناد کا آلہ سمجھتا ہے یا وہ شخص جو یہ خیال کرتا ہے کہ وہ اپنے طاقتور قلم سے ہر غلیظ جوہڑ کے پانی کو حرکت دے سکتا ہے مختصر یہ کہ یہ جمہور کی "تعلیم" کا مسئلہ ہے جیسے مولانا مودودی پر اواخر فروری ۱۹۵۳ء میں منکشف ہُوا۔ یا کسی مذہبی یا سیاسی رُجحان کو مدراستے پر لگانے" کا معاملہ ہے جیسے میر نور احمد کو مدت دراز سے علم تھا۔

علما دوسرے ماہرین کی طرح یک گیر ذہن رکھتے ہیں

عُلما کا طبقہ فاضل اشخاص کا طبقہ ہے اور تمام دوسرے خُدّام علم کی طرح بے حد احترام کا مستحق ہے لیکن تمام فاضل اشخاص کی طرح جن کی دماغی قوتیں کسی فن میں تخصص حاصل کرنے کے درپے رہتی ہیں ہمارے عُلما کا ذہن بھی "یک گیر" ہو گیا ہے اور "یک گیر" ذہن میں خطرناک امکانات مُضمر ہوتے ہیں آپ کا گزارا مختصین (یعنی سپیشلسٹوں) کے بغیر نہیں ہوتا لیکن آپ کو "جنرل پریکٹیشنر"

(معالج عمومی) کی ضرورت ہوتی ہے جو اُن تمام مضامین سے شناسائی رکھتا ہو (جن میں سپیشلسٹ بطور خاص مہارت پیدا کرتے ہیں) تاکہ ان کی سرگرمیوں کو جمع کر کے ان سے کام لے سکے۔ سپیشلسٹ کا دائرہ نگاہ اپنے خاص مضمون کے سوا دوسرے مضامین کے متعلق لازماً تنگ ہوتا ہے۔ ہم "ملائیت" یا "مذہبی دیوانگی" جیسی پست اصطلاحات کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ ایک عام گریجوئیٹ جو اپنے مضامین میں سے کسی ایک کے متعلق نہایت سطحی علم رکھتا ہے اس قسم کی اصطلاحات کو نہایت نخوت سے استعمال کرتا ہے گویا وہ کوئی بڑی اعلیٰ ہستی ہے کیا آپ کسی ماہر حیوانیات پر ماہر حیوانیات ہونے یا کسی ماہر امراض یا پر ماہر امراض یا ہونے کا **الزام** عائد کر سکتے ہیں؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ علما کا دائرہ نگاہ اس لئے تنگ ہے کہ وہ علما ہیں بلکہ اس دائرے کی تنگی کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی صرف ایک شاخ کے ماہرین خصوصی ہیں وہ بارش کے خواہاں صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ انکی چھوٹی سی کھیتی ہری بھری

دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے بے پروائی

ہو جائے نہ وہ جانتے ہیں نہ اس امر کی پروا کرتے ہیں کہ اس بارش سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک اور چھوٹی سی کھیتی کو کیا نقصان پہنچ جائے گا علما نے ہم سے صاف صاف کہ دیا ہے (اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے آنسو بہانا تو ایک طرف رہا آنکھ تک نہیں جھپکی) کہ جب تک ہمارے خاص نمونے کا اسلام یہاں رائج ہے ہم کو اس بات کی کچھ پروا نہیں کہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کا کیا حشر ہو گا۔ صرف ایک مثال سن لیجئے امیر شریعت نے کہا کہ "باقی ۶۲ کروڑ (یہ عدد اُن کا اپنا ہے) کو اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کرنا چاہئے"۔ ان کروڑوں مسلمانوں کے لئے جو حل مولانا محمد علی کاندھلوی (سیالکوٹ) نے تجویز کیا ہے وہ شاید سب سے زیادہ قابل عمل ہے کہ ان مسلمانوں کو اپنے عقائد اور مذہبی نظریات بدل کر ویسے ہی بنا لینے چاہئیں۔ جیسے لاہور۔ دہلی یا ٹمبکٹو میں رائج ہیں۔

لہٰذا جن لوگوں کو صرف یہیں کی کھیتیوں کی نہیں بلکہ چین اور پیرو کی فصلوں کی دیکھ بھال بھی کرنی ہے ان کے لئے اشد ضروری ہے کہ تمام اطراف کے مفادات کا خیال رکھیں اور جہاں مناسب سمجھیں آب پاشی کو روک دیں اگر خواجہ ناظم الدین کو یقین تھا کہ مطالبات منظور نہیں کئے جا سکتے تو انہیں ان کے رد کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے تھا وہ علما کو "کچلنے" کے کام سے گھبراتے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ مطالبات کے رد کرنے کا (استعارے کے مفہوم کے سوا) یہ نتیجہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ علما "کچلے" جاتے بہر حال انکے دل میں علما کی اس قدر عزت تھی کہ ۲۷۔ فروری ۱۹۵۳ء کو جب ڈائرکٹ ایکشن انکے گھر کے دروازے پر پہنچنے ہی والا تھا انہوں نے

خواجہ ناظم الدین کے نزدیک علما کی عزت

استعفے کی دھمکی دی۔ اس اُمید میں کہ "اگر علما عقل کی بات نہیں سنتے اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ وہ پاکستان کی سلامتی کو خطرے میں ڈال رہے ہیں تو غالباً میرے استعفے کی پیشکش سے انہیں صدمہ ہو گا اور وہ اس حقیقت کو محسوس کر لیں گے" اس ارشاد میں خوش عقیدگی جس افراط سے موجود تھی اس پر ہم چونک اٹھے اور ہم نے کہا کہ علما تو شاید خواجہ صاحب کے **استعفے** کا خیر مقدم

کرتے بلکہ اسے اپنی ٹوپیوں کے لئے (ان میں سے بعض اب ٹوپیاں پہنتے ہیں) طرۂ افتخار سمجھتے اور اسے اسی قسم کے حالات میں آیندہ حکومتوں کے خلاف بھی استعمال کرتے۔ ان کا یہ خیال بھی معلوم ہوتا ہے کہ علما جمہور کے نمایندے ہیں۔ اس سے پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ کوئی مطالبہ عوامی مطالبے کی حیثیت کیونکر حاصل کر لیتا ہے۔ اور خود خواجہ ناظم الدین یہ بیان کر چکے ہیں کہ مولانا مودودی نے اس وجہ کی بنا پر "ڈائرکٹ ایکشن" سے بے تعلقی اختیار کی تھی کہ ان کے نزدیک ابھی اسکے لئے وقت موزوں نہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں ابھی مطالبات کی کافی اشاعت نہ ہوئی تھی۔ ایک مقام پر (اس عدالت کے سامنے نہیں) مولانا مودودی نے یہ بیان کیا تھا کہ اس تحریک کا چرچا ابھی صرف پنجاب اور بہاول پور ہی میں ہے۔ اور ان علاقوں میں بھی اسے تعلیم یافتہ طبقے کی حمایت حاصل نہیں۔ اور جمہور کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ابھی بہت پروپیگنڈے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا مطالبات کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اولاً احرار کے اور بعد میں علما کے مطالبات ہیں۔ اگر یہ مطالبات آغاز ہی میں رد کر دیئے جاتے تو حکومت کو کافر حکومت کہا جاتا۔ لیکن اب حکومت اور خواجہ ناظم الدین کے خلاف اس سے بدتر باتیں کہی گئی ہیں اور ان کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ شاید خان سردار بہادر خاں کا یہ خیال درست ہے کہ عوام کی تین قسمیں ہیں۔ اول وہ جو مطالبات پر مخلصانہ یقین رکھتے ہیں۔ دوم وہ جو ان سے سیاسی فوائد حاصل کرنیکے خواہاں ہیں۔ اور سوم وہ جنھیں یہ سمجھایا گیا تھا کہ اگر پورے اصرار اور دباؤ سے کام لیا جائے تو مرکزی حکومت ان مطالبات کو قبول کر لے گی۔ خاں صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ عوام کی اکثریت چونکہ تیسرے گروہ سے تعلق رکھتی تھی اس لئے اگر مرکز ایک واضح رویّہ اختیار کر لیتا تو یہ لوگ تحریک سے دست بردار ہو جاتے۔ آراء ہمیشہ مختلف ہوتی ہیں اور قطعی بھی ہو سکتی

"عوامی" مطالبہ کس کو کہتے ہیں

ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک لوگ جس چیز کو عوامی مطالبہ کہتے ہیں وہ کوئی ایسی مقدس چیز نہیں ہوتی اگرچہ وہ مطالبہ کسی حقیقی بات پر مبنی نہ ہو لیکن اگر اسکو ایک مقبول عام اخبار اور ایک فصیح البیان مقرر کی تائید حاصل ہو جائے تو اسکو خاصی تقویت پہنچ جاتی ہے اور اگر یہ مطالبہ حکومت کے خلاف ہو۔ خواہ وہ کوئی حکومت ہو تو اس کو سامعین زیادہ سرگرمی سے سنیں گے اس امر کے باوجود کہ بعض لوگ اب حکومت کو اپنی حکومت کہتے ہیں اسکے متعلق ان کا تصور اب تک ایک اجنبی راج ہی کی مانند ہے وہ اس کو اپنی حکومت اسلئے سمجھتے ہیں کہ اس کو انتہائی طفلانہ شوخی سے غلیظ گالیاں دے سکتے ہیں۔ وہ اس لئے اسکو اپنی حکومت خیال کرتے ہیں کہ وہ دفتر کے اوقات کو تمباکو نوشی میں گزار دیتے ہیں اور انہیں موقوفی کا خوف نہیں ہوتا غرض اسی قسم کے "اچھے اوصاف" جو بے شمار ہیں ہم نے "مقبول عام اخبار" کا ذکر کیا تھا "مقبول عام اخبار" کی ایک مثال "زمیندار" ہے اور آپکو عنقریب معلوم ہو جائیگا کہ وہ کیوں مقبول عام ہے۔

خواجہ ناظم الدین کا طریق فکر مذہبی تھا

لہٰذا اس موضوع کے متعلق خالص مذہبی طریق فکر ہی تھا جسکی وجہ سے خواجہ ناظم الدین یہ سمجھتے تھے کہ اگر علما کے ساتھ صاف گوئی سے کام لیا گیا تو کوئی قومی مصیبت نازل ہو جائے گی وہ اس اعتقاد پر مخلصانہ قائم تھے لیکن اسکے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی باخبر تھے "کہ "جو شخص مرکز سے کسی فیصلے کے لئے اصرار کرتا ہے۔ اسکی نیت یہ ہے کہ ذمہ داری مرکز کی طرف منتقل ہو جائے"۔ .... ایسی حالت میں اگر

فوج یا پولیس کسی پر گولی چلائے گی تو صوبائی لیڈر یہ کہیں گے کہ یہ سب کچھ مرکز کے حکم سے ہو رہا ہے اگر اس کشمکش میں مرکزی حکومت ٹوٹ گئی تو صوبائی حکومت لوگوں سے یہ کہیگی کہ "ہم تو شروع سے آخر تک تمہاری تائید کرتے رہے ہیں"۔ کسی ناگوار اقدام کی ذمہ داری اٹھانے کا یہی طبعی لیکن افسوسناک خوف ہے جس سے یہ تلخ نتائج رونما ہوئے ہیں۔ خواجہ ناظم الدین کا کیس یہ ہے کہ اگر صورت حالات کا تدارک قانون و انتظام کے پہلو سے بوجہ احسن کیا جا سکتا تھا تو اس امر پر اصرار کیوں ضروری سمجھا گیا کہ مطالبات کے متعلق کوئی فیصلہ ضرور کرنا چاہیئے۔ اگر اسطرح صورت حالات کا تدارک ہو سکتا تھا اور اگر وقتاً فوقتاً یہ امر واضح کیا جا چکا تھا

مقصد مرکز کو پریشان کرنا تھا

کہ مرکز مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو "مضبوط" فیصلے پر اصرار کرنے اور لوگوں کو بار بار یہ بتانے سے کہ صرف مرکز ہی کوئی فیصلہ دے سکتا ہے صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا کہ مرکز کو پریشان کیا جائے۔ ہمارے نزدیک اس دلیل کی وقعت اُسی صورت میں واضح ہو سکتی ہے کہ ہم دونوں حکومتوں کو ایک "عضوی کُل" سمجھیں۔ جس کے ایک حصے کو صدمہ پہنچے تو پورے جسم کو تکلیف ہو گی اگر شدید صدمے اور خفیف صدمے میں سے انتخاب کرنا ہو تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ شدید صدمے سے بچنا چاہیئے۔ یہ رائے اس مفروضے پر مبنی ہے کہ انتخاب ایک ہی شخص کو کرنا ہوگا

دو خرابیوں میں سے ایک کا انتخاب

اگر مطالبات رُد کر دیئے جاتے تو مرکز نامقبول ہو جاتا اور اگر قانون و انتظام کے پہلو سے کوئی اقدام کیا جاتا تو اس سے صوبہ غیر ہر دلعزیز ہو جاتا۔ لیکن دونوں صورتوں میں نامقبولیت کی نوعیت مختلف ہوتی۔ اوّل الذکر صورت میں چونکہ ایک مذہبی مطالبے کا استرداد لازم آتا اس لیئے مذہبی جنون کو مشتعل کرنیکی بہت بڑی گنجائش ہوتی۔ اور آخر الذکر صورت میں موجودہ قانون کے ماتحت اقدامات کئے جاتے اور الزامات یہ ہوتے کہ ملک کی رعایا کے کسی طبقے کی شدید توہین کی گئی یا حکومت کے کسی وزیر کو برُا بھلا کہا گیا یا لوگوں کو خونریزی پر اُکسایا گیا۔ آخر الذکر اقدام کی بنیاد قانونی اور اخلاقی ہوتی اور اگرچہ اس سے کسی قدر اشتعال پیدا ہوتا لیکن اس اقدام کو کسی دلیل و برہان کے بغیر حق بجانب قرار دیا جا سکتا تھا۔ اگر ایک تنہا نقطۂ نگاہ سے دیکھا جاتا تو صوبائی دائرے میں کارروائی یقیناً دو خرابیوں میں سے کم درجے کی خرابی ہوتی اور اگر دو مختلف زاویوں سے دیکھا جاتا تو دونوں فریقوں کے پیش نظر اپنا اپنا مفاد رہتا اور حقیقت یہی ہے کیونکہ لوگ لازماً عام آدمی کی بہبود پر نظر نہیں رکھتے بلکہ اپنے سیاسی مستقبل کا خیال رکھتے ہیں۔ مسٹر انور علی کا بیان ہے"۔ ایک دفعہ چیف منسٹر نے مجھ سے کہا کہ اگر ہم نے کوئی اقدام کر دیا اور مرکز نے مطالبات منظور کر لیئے تو مجھے اندیشہ ہے کہ میری پوزیشن نازک ہو جائے گی"۔

قانون و انتظام کے متعلق مرکزی حکومت کی تشویش

اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم قانون و انتظام کے پہلو اور اس میں مرکز کے حصے کا جائزہ لیں۔ آج سے بہت پہلے یعنی ۲ ستمبر ۱۹۵۱ء کو وزارت داخلہ نے نہایت واضح الفاظ میں احمدیوں اور احراریوں کے نزاع کے متعلق تمام صوبائی حکومتوں پر اپنے خیالات ظاہر کر دیئے تھے "مرکزی حکومت کا خیال یہ ہے

کہ مذہبی عقاید کی اشاعت کے متعلق کسی فرقے یا جماعت کے جائز حقوق پر نامناسب پابندی عائد نہ کرنی چاہیئے اور مختلف عقائد رکھنے والوں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز ملحوظ نہ رکھنا چاہیئے۔ لیکن مذہبی نزاعات کو معقول حدود تک مقید رکھنا چاہیئے اور انہیں ایسے نقطے تک پہنچ جانے کا موقع نہ دینا چاہیئے کہ امن و سکون عامہ خطرے میں پڑ جائے۔ مرکزی حکومت کی رائے میں جنگجویانہ اور جارحانہ فرقہ آرائی کو سختی سے دبا دینا چاہیئے"۔

چونکہ اس کے بعد مذہبی اور فرقہ وار نزاعات میں نمایاں اضافہ ہو گیا۔ جس سے بعض مقامات پر نقض امن واقع ہوا۔ اس لئے یہی خیالات ۲- جولائی ۱۹۵۲ء کو دہرائے گئے۔

مرکزی حکومت نے حکومت پنجاب کی کارروائی کو پسند کیا

مکتوب ذیل کے الفاظ پر ختم ہوا: "حکومت پاکستان نے اس اقدام کو بنظر اطمینان دیکھا ہے۔ جو پچھلے دنوں حکومت پنجاب نے فرقہ وار شورش کے تدارک کے لئے اختیار کیا"۔ یہ اشارہ اس اقدام کی طرف ہے کہ جون ۱۹۵۲ء میں احمدیوں اور احراریوں کے جلسوں پر پابندی عاید کی گئی اور بعض اشخاص کے خلاف اشتعال انگیز تقریروں کی بنا پر مقدمات دائر کئے گئے۔

حکومت پنجاب اپنے افسروں کی رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً جو پالیسی تجویز کرتی رہی وہ ان گشتی مراسلوں سے ظاہر ہے جو رپورٹ کے سابقہ حصوں میں تفصیل سے نقل کی گئی ہیں۔ اب اس بیان واقعات میں ان کا ذکر ان کے مناسب مقام پر کیا جائے گا۔ ہم اپنے موجودہ مقصد کے لئے زیر جائزہ مدت کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

اوّل - سردار عبدالرب نشتر کی حکومت زیر دفعہ ۹۲ - الف تا اپریل ۱۹۵۱ء۔ دوم - مسٹر دولتانہ کی حکومت تا ۱۹- جولائی ۱۹۵۲ء جب احرار کی اس یقین دہانی پر کہ وہ قانون و انتظام کی حالت کو مناسب طور پر بحال رکھیں گے ان کے جلسوں پر سے پابندی اٹھالی گئی۔ اور ان کے خلاف دائر مقدمات واپس لے لئے گئے۔ سوم ڈائرکٹ ایکشن کے چیلنج تک کی مدت جس میں ڈائرکٹ ایکشن کا چیلنج بھی شامل ہے۔ چہارم - ۲۶- فروری ۱۹۵۳ء سے ۶- مارچ ۱۹۵۳ء تک۔

اوّل: دفعہ ۹۲ - الف کی حکومت

مسٹر دولتانہ نے اس زمانے کو اپنے لئے قابل تقلید نمونہ قرار دیا ہے۔ یہ زمانہ احراریوں کی سرگرمیوں کے اندر جھانکنے کے اعتبار سے بھی مفید ہے اس لئے اس زمانے کے چند متعلقہ واقعات کا ذکر کر دینا چاہیئے۔ ۲۹- دسمبر ۱۹۴۹ء کو مسٹر انور علی ڈی آئی جی نے سیالکوٹ میں مولوی غلام اللہ کی تقریر پر کارروائی کی تجویز پیش کی۔ اور پھر جنوری ۱۹۵۰ء میں ملتان کی ان تقریروں کو قابل اقدام قرار دیا۔ جن میں جنرل نذیر احمد اور چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے خلاف احمدی ہونے کی وجہ سے نکتہ چینی کی گئی تھی۔ چیف ایڈوائیزر شیخ محمد انور کسی کارروائی کے خلاف تھے اس بنا پر کہ اس سے مقررین کو "سستی شہادت" مل جائے گی۔ سردار

مشیروں کی حکومت کے دوران میں احرار کو تنبیہ

عبدالرب نشتر نے کہا کہ "حکام اعلیٰ کو گالیاں دینا مذہبی عقاید کی تبلیغ واشاعت سے مختلف شے ہے"۔ اور انہوں نے قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولوی غلام غوث سرحدی سے جو گفتگو کی تھی اس سے ان لوگوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ آپ نے مشیر سے کہا کہ صدرِ احرار ماسٹر تاج الدین سے بات چیت کریں۔ مشیر نے اس ہدایت کی تعمیل کی اور واضح طور پر کہہ دیا کہ اگر اس تنبیہ پر توجہ نہ کی گئی تو حکومت مجبوراً شدید اقدام کرے گی۔ یہ دوسری تنبیہ تھی۔

احرار نے "الشہاب" کو دوبارہ چھاپا

اس اثنا میں احراریوں نے ایک گمنام کتابچہ جو اصلاً پاکستان کے "لاٹ پادری" مولانا شبیر احمد عثمانی کا لکھا ہوا تھا۔ بظاہر مصنف کی اجازت سے دوبارہ چھاپ لیا۔ اس کتابچے میں حکومت افغانستان کے اس فعل کو حق بجانب قرار دیا گیا تھا کہ اس نے کئی سال پیشتر دو احمدیوں کو سنگسار کر دیا تھا۔ جون ۱۹۵۰ء میں مسٹر انور علی نے لکھا کہ "بعض بیّن وجوہ کی بنا پر" اس پمفلٹ کو ممنوع قرار دینا تو مناسب نہ ہوگا لیکن ماسٹر تاج الدین اور دوسرے لیڈروں کو تنبیہ کرنی چاہیئے۔ چیف سیکرٹری (حافظ عبدالمجید) چیف ایڈوائیزر اور گورنر نے اس سے اتفاق کیا اور گورنر نے یہ بھی کہا کہ سابقہ تنبیہات چونکہ موثر ثابت نہیں ہوئیں۔ اس لئے ان لوگوں کو بتا دینا چاہیئے کہ اگر وہ اپنی سرگرمیوں سے باز نہ آئے تو حکومت کارروائی کرنے پر مجبور ہوگی۔

مسٹر انور علی نے ۲۸۔ مئی ۱۹۵۰ء کو ایک اور سلسلے میں ایک مزید یادداشت لکھی جس میں تقسیم کے بعد احراریوں کی سرگرمیوں کی تفصیل بیان کرکے موثر اقدام کی تجویز پیش کی۔ اس یادداشت میں لکھا تھا کہ ایک احمدی فوجی افسر کوئٹہ میں ہلاک کیا جا چکا ہے۔ امام جماعت احمدیہ اور ان کے والد کو زناکار کہا گیا ہے چودھری محمد ظفراللہ خاں کو گدھا۔ مکّار اور غدّار کی سی گالیاں دی گئی ہیں اور کہا گیا ہے کہ انہوں نے قادیان کی خاطر کشمیر کو بیچ دیا۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے اپنی ایک تقریر میں یہ اعلان کیا ہے کہ اگر مرزا غلام احمد نے آجکل کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دیتے۔ اس جلسے کے حاضرین میں سے ایک آدمی بیچ بیچ اٹھکر کہنے لگا کہ میں چودھری ظفراللہ خاں کو ہلاک کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ایک اور موقع پر مرزا بشیرالدین محمود احمد کو ہلاک کر دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی گئی۔ مسٹر انور علی نے تجویز کی کہ (۱) جہاں عملی تشدد کی تلقین کی جائے۔ وہاں سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳۔ استعمال کی جائے (۲) جہاں وزیر خارجہ کو گالیاں دی جائیں وہاں دفعہ ۲۱۔ کا اطلاق کیا جائے (۳) مخش تقریریں مثلاً وہ تقریر جس میں مہاتما گاندھی اور خلیفہ قادیان کی ہم بستری کا ذکر کیا گیا ہے برداشت نہ کی جائیں۔ اور (۴) احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دینے کے متعلق سنجیدگی سے غور کیا جائے

مسٹر انور علی کی تجویز کہ احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دیا جائے

"الشہاب": خواجہ شہاب الدین کی رائے

اس یادداشت میں مسٹر انور علی نے پھر "الشہاب" کا ذکر کیا۔ اور بتایا کہ وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین

ایک دفعہ آئے تھے تو انہوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ کتابچہ فی الفور ضبط ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں تشدد کی تلقین کی گئی ہے وزیر موصوف نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر احرار کے خلاف اب کوئی اقدام نہ کیا گیا تو ان کی مقبولیت کئی گنا بڑھ جائے گی اور تاخیر سے جو کارروائی کی جائے گی وہ سیاسی مشکلات پیدا کرنے کے علاوہ ان لوگوں کو "شہید" کی حیثیت دے دے گی۔

ہمیں اس موقع پر یہ دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ چیف سیکرٹری اور مشیر نے کیا کہا۔ البتہ مسٹر انور علی کی یادداشت ہمارے نزدیک صورت حالات کا بہترین نقشہ پیش کرتی ہے۔ چیف سیکرٹری نے صرف زیر دفعہ ۳۔ اقدام کرنے سے اتفاق کیا۔ مشیر نے پھر "سستی شہادت" کا عذر پیش کیا گورنر نے ایڈوائزر کی یادداشت کی تائید کی اور ۱۶۔ جولائی ۱۹۵۱ء کو ماسٹر تاج الدین کو تیسری دفعہ تنبیہ کی گورنر کی یادداشت کا یہ فقرہ خاص طور پر اہم ہے۔ انہوں نے ماسٹر تاج الدین سے کہا کہ یہ یقین کیا جاتا ہے اور غالباً صحیح بھی ہے کہ احرار ہر دلعزیزی حاصل کر کے اپنے سیاسی مقاصد کی پیش برد کے لئے ختم نبوّت کی تحریک سے کام لینا چاہتے ہیں۔

ہم یقینی طور پر نہیں کہ سکتے کہ آیا مسٹر دولتانہ اپنے تجویز کردہ نمونے کے مطابق کارروائی کا بخوبی آغاز کر سکتے لیکن یہ امر ہمارے دائرہ تحقیقات سے باہر ہے۔ شاید سابقہ حکومت نے اپنے لئے یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ کسی اقدام سے پہلے تین دفعہ رسمی تنبیہ کرنا ضروری ہے پہلی محض تنبیہ ہوگی۔ دوسری کڑی تنبیہ اور تیسری شدید تنبیہ۔ حتیٰ کہ "الشہاب" بھی ضبط نہ کیا گیا تا آنکہ خواجہ شہاب الدین نے اسکے متعلق سختی سے اظہار خیال نہیں کیا۔

احرار نے سوچا کہ اب نئی حکومت ہے اس لئے تنبیہات کی تختی صاف سمجھنی چاہیئے اور نئے سرے سے آغاز کار کرنا چاہیئے۔ مطلب یہ کہ پہلی تنبیہیں بالکل محو ہو چکی ہیں۔

دوم مسٹر دولتانہ کی حکومت تا ۱۹۔ جولائی ۱۹۵۲ء

مال روڈ پر جلوس ایک تجویز

مسٹر دولتانہ کے زمانے سے متعلق پہلی فائل وہ تھی جس کا عنوان "یوم تشکر" تھا۔ اس پر مسٹر انور علی کی یہ یادداشت موجود ہے:۔

"قبل تقسیم کے ایام میں مال روڈ پر جلوسوں کو گزرنے کی اجازت نہ دی جاتی تھی" اگر وہ پرانی کتاب سے ایک ورق نکال کر اس پر عمل شروع کر دیں تو یہ کتنی بڑی نعمت ہو اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ جلوس کو دونوں مال روڈوں پر جانے کی اجازت نہیں تو ان کے لئے جلوس کی آدھی دلکشی غائب ہو جائے گی اور شاید وہ موجب سمجھ کر جلوس نکالنے کا خیال ہی ترک کر دیں اس جلوس میں کوئی لطف نہیں جو ہائیکورٹ اور ڈین بار بر کی دکان کے آگے سے نہ گزرے یہ ایسا معاملہ ہے جس پر حکومت کو ضرور غور کرنا چاہیئے۔ البتہ پیرونگ کراس کی جائے ملاقات کو جہاں حکام عام طور پر جلوسوں کا استقبال کیا کرتے ہیں بہت سے افسر حسرت سے یاد کیا کرینگے۔

اب ہم چند مخصوص نوعیت کے واقعات کا ذکر کرتے ہیں:۔

محمد علی جالندھری منٹگمری میں
۱۵-اپریل ۱۹۵۱ء

(۱) اس عہدِ حکومت کی پہلی تقریر شاید وہ تھی جو مولوی محمد علی جالندھری نے ۱۵-اپریل ۱۹۵۱ء کو منٹگمری کانفرنس میں کی۔ اس تقریر میں انہوں نے کہا کہ ان کے پاس اس امر کی تحریری شہادت موجود ہے کہ سازش راولپنڈی سے احمدیوں کا تعلق ہے۔ یہ بلاشبہ مہمل بات تھی اور مسٹر انور علی نے بالکل صحیح کہا کہ اس سے غیظ وغضب پیدا ہوگا۔ لہذا تنبیہ ہونی چاہیئے انہوں نے تین سابقہ تنبیہات کا ذکر بھی کیا۔

جھوٹا پروپیگنڈا

یہ واضح طور پر نفرت کی تلقین تھی اور نفرت بھی نہایت مکروہ قسم کی کیونکہ نہ تو مولوی محمد علی ایسے اہم تھے کہ ایسی شہادت ان کے قبضے میں ہوتی اور نہ کوئی ایسی تحریر اس کے بعد مقدمہ سازش کے ٹریبونل کے سامنے پیش کی گئی۔ لیکن اس قسم کی شبہ انگیز خبر نہایت آسانی سے لوگوں کے دماغوں میں گھر کر لیتی ہے اور اس کا کوئی ثبوت پیش کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ سامعین اسکو بالکل صحیح اور شک وشبہ سے بالا سمجھ لیتے ہیں۔ ڈی آئی جی نے حسب سابق تنبیہ کرنے کی تجویز کی لیکن حسب سابق کوئی تنبیہ نہ کی گئی۔ مسٹر دولتانہ نے انکی یادداشت پر محض اپنے مختصر دستخط ثبت کر دیئے انہوں نے اپنی شہادت میں (موجودہ یادداشت کی نسبت نہیں) بصراحت کہی ہے کہ جو فائلیں ان کے پاس بغرض اطلاع بھیجی جاتی تھیں۔ ان پر وہ صرف اپنے مختصر دستخط کر دیا کرتے تھے، لیکن یہ فائل تو کسی قطعی اقدام کی متقاضی تھی۔

(۲) ۱۹-اگست ۱۹۵۱ء کو سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے موچی دروازے کے باہر ایک تقریر کی جس میں سے بعض مخصوص فقروں کا مفہوم ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

عطاء اللہ شاہ بخاری لاہور میں
۱۹-اگست ۱۹۵۱ء

"ہمارا ایک دشمن تو سرحد پر ہمارے سامنے ہے اور دوسرا دشمن ہمارے درمیان موجود ہے تم اس سانپ سے بالکل بے خبر ہو جو تمہاری آستین میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے بارہا بتایا ہے کہ احمدی پاکستان کے وفادار نہیں ہیں ڈسکہ میں چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے بھتیجے کی شادی کے موقع پر مرزا صاحب کہہ چکے ہیں کہ احمدیوں کا بھلا اکھنڈ ہندوستان ہی میں ہے اور اگر تقسیم ہو بھی جائے تو دونوں حصے کسی نہ کسی طرح پھر مل جائیں گے۔ کیا تم اس سے زیادہ غداری کا تصور کر سکتے ہو؟ مجھے اور مرزا صاحب دونوں کو ہتھکڑیاں لگا دو اور ایک کمرے میں بند کر دو۔ صبح سے پہلے پہلے جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے گا اگر وہ صبح تک زندہ رہیں اور مجرم ثابت ہو جائیں تو تم کو چاہیئے کہ قادیان اور ربوہ کے درمیان ہر درخت پر ایک ایک احمدی کو پھانسی دے دو۔ ساغر نے کہا ہے کہ مرزا صاحب اور چودھری محمد ظفر اللہ خاں نے کشمیر کا بیڑا غرق کر دیا اگر یہ جھوٹ ہے تو

اسکو جیل میں بھیجو اور اگر یہ سچ ہے تو ظفراللہ خاں کو جیل میں بھیجو۔"

شیخ بشیر احمد کا احتجاج

اس پر شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ امیر جماعت احمدیہ لاہور نے ایک شکایت ڈپٹی کمشنر کو بھیجی جس نے وہ کمشنر کے پاس بھیج دی اور کمشنر نے ہوم سیکرٹری (سید احمد علی) کے پاس ارسال کی اور ہوم سیکرٹری نے اس پر لکھا کہ میں نے اس معاملے کے متعلق چیف منسٹر سے گفتگو کی ہے جنھوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں انسپکٹر جنرل کی وساطت سے احراری لیڈروں کو یہ تنبیہ

ایک اور تنبیہ

کردوں کہ وہ حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ انکو یہ بھی بتا دیا جائے کہ اگر انہوں نے اس تنبیہ کو قبول نہ کیا تو حکومت کو ان کے خلاف کارروائی کرنی پڑے گی۔ چنانچہ انسپکٹر جنرل نے شیخ حسام الدین سیکرٹری مجلس احرار کو تنبیہ کر دی جنھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس تنبیہ کو مناسب حلقوں تک پہنچا دیں گے۔

مرکزی حکومت کی تشویش

مسٹر جی۔ احمد سیکرٹری وزارت داخلہ نے بھی ۴ ستمبر ۱۹۵۱ء کو چیف سیکرٹری سے پوچھا کہ آیا تقریر کی یہ رپورٹ صحیح ہے کہ وزیر خارجہ قادیان کے لئے کشمیر کو فروخت کر رہے ہیں۔ چیف منسٹر نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے اور مقرر کو تنبیہ کی جا چکی ہے

بخاری مظفر گڑھ میں اکتوبر ۱۹۵۱ء

(۳) لیکن اس تنبیہ کا نتیجہ ملاحظہ ہو۔ دو مہینے بعد اکتوبر ۱۹۵۱ء میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے مظفر گڑھ میں تقریر کی۔ جس میں تقسیم کے متعلق احمدیوں کے رویّے کی نسبت اپنے اکثر خیالات کا اعادہ کیا اور ایک نیا راگ اس میں شامل کر دیا "ایک احمدی جاسوس ایک شخص گوپال داس کی معیّت میں گرفتار کیا گیا ہے اور میں نے حکومت کو اس سلسلے میں عمدہ معلومات مہیا کی ہیں"۔ کیا عام سیدھے سادے لوگ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ بزرگ جو اپنی کہن سالی کے بوجھ سے زیر بار ہونے کے باوجود شمشیر کی طرح تیز ہے گوپال داس کے ساتھی کے متعلق ایسی کہانی تصنیف کرے گا جس کو سچائی سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں؟ اگر یہ سچ ہو تو کیا اس سے "غدّاروں" کے خلاف شدید جذبات مشتعل نہ ہو جائینگے؟ اگر آپ یہ جانتے ہوئے کہ اس تقریر کی بنا جھوٹ پر ہے۔ اس کو نظرانداز کر رہے ہیں تو یہ مقرّر کے سفید بالوں کا احترام تو شاید ہو لیکن آپ اس مرض سے تغافل کر رہے ہیں جو اس نے آپ کی قوم میں پھیلا دیا ہے۔

ڈی آئی جی نے کارروائی کی سفارش کی

اس پر مسٹر انور علی نے تجویز کی کہ (۱) ایک دو احراریوں کی زبان بندی کی جائے (۲) سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی نقل و حرکت اسکے گاؤں کے اندر محدود کر دی جائے اور (۳) مجرمانہ تقریروں کے لئے قانون کے ماتحت مقدمات چلائے جائیں۔ خان قربان علی خاں نے بھی ایسا ہی زوردار نوٹ لکھا۔ انہوں نے کہا کہ احرار نے اتنا کچھ کیا ہے

انسپکٹر جنرل نے مضبوط اقدام کی تجویز کی

کہ ان کے خلاف مضبوط اقدام بالکل حق بجانب ہے۔ آخری تنبیہ وہ تھی جو انہوں نے خود شیخ

حسام الدین کو کی۔ لیکن یہ واضح تھا کہ تنبیہات بالکل بے کار ہیں اور اگر احراری من حیث الجماعت باز بھی آجائیں تو سید عطاءاللہ شاہ بخاری کبھی باز نہیں رہ سکتے ان کے ذہن میں تو گالی کے سوا اور کچھ نہیں۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ان کی زبان بندی کے باعث ایک مرتی ہوئی پارٹی میں نئی جان پڑ جائے لیکن اس کا فیصلہ ارباب سیاست کا کام ہے خاں صاحب نے لکھا کہ ذاتی طور پر وہ مضبوط اقدام کے حامی ہیں تاکہ رواداری کی فضا پیدا ہو سکے چیف سیکرٹری نے اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے یہ تجویز کی کہ چیف منسٹر ان سب افسروں کی معروضات سن لیں اور پھر کسی فیصلے پر پہنچیں۔

۲۱۔ نومبر ۱۹۵۱ء کو چیف منسٹر کے سیکرٹری نے ظاہراً چیف منسٹر کی ہدایت کے ماتحت یہ یادداشت لکھی کہ "جب تک چیف منسٹر فلاں جگہ سے واپس نہ آجائیں کوئی کارروائی نہ کی جائے" اسکے بعد ۶۔ دسمبر کو چیف منسٹر اور

افسروں کی کانفرنس

نتیجہ: پالیسی کی چٹھی مورخہ ۲۴ دسمبر ۵۱ء

ان کے افسروں کی کانفرنس ہوئی اور پھر ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کو پالیسی کی چٹھی جاری کی گئی۔ یہ پالیسی کی چٹھی قریب قریب مرکزی حکومت کی چٹھی مورخہ ۷۔ ستمبر ۱۹۵۱ء کے خطوط ہی پر مرتب کی گئی تھی اور اس میں ڈپٹی کمشنروں کو بتایا گیا تھا کہ کسی قوم یا کسی فرقے کو اپنے مذہبی عقائد کی تعمیل کے جو جائز حقوق حاصل ہیں ان پر کسی قسم کی ناواجب پابندی عائد نہیں کی جاسکتی لیکن یہ امر اہم ہے کہ مذہبی نزاعات کو بڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔ خصوصاً اس حد تک کہ امن و سکون عامہ خطرے میں پڑ جائے بد نظمی کے واقعات وہیں رونما ہوئے ہیں جہاں ڈپٹی کمشنر چوکنے نہ رہے اور انہوں نے بروقت انسدادی تدابیر اختیار نہ کیں یا جہاں انہوں نے فرق و امتیاز سے کام لیا۔ لہٰذا جذبات سے الگ ہو کر اقدام نہ کر سکے حکومت کو معلوم تھا کہ بعض حکام ضلع اپنے مذہبی عقائد کی وجہ سے غیر احمدی مفزرین کی طرفداری کرتے رہے ہیں۔

اس کا مطالعہ خوشگوار ہے

اب کاغذ پر اور حالات و کوائف سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو اس چٹھی کا مطالعہ بہت ہی خوشگوار ہے اور یہ چٹھی سول سروس کی بہترین روایات کے مطابق ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کو فرقہ وار سرگرمیوں کے اثرات کا پورا اندازہ ہے اس خطرے کا بھی احساس ہے۔ جو حکام ضلع کے عقائد مذہبی سے خود اُن حکام کو اور نظم حکومت کو لاحق ہوتا ہے اور مذہبی عقائد کی تعمیل کے ان جائز حقوق کی حفاظت بھی منظور ہے جو ہر شخص کو حاصل ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس نے "امیر شریعت" کے متعلق کیا کیا؟ کیا حکومت نے لوگوں کو اس امر کا موقع نہیں دیا

لیکن اصل معاملے کو نظر انداز کر دیا

کہ جو زہر ان کو دیا جا رہا ہے اس کو بے تکلف پیتے چلے جائیں؟

ڈی آئی۔ جی مسٹر انور علی نے بعض نہایت موثر تجاویز پیش کی ہیں انسپکٹر جنرل نے یہ بتایا ہے کہ تین دفعہ سابقہ حکومت کے عہد میں اور دو دفعہ نئی حکومت کے زمانے میں تنبیہ کی جاچکی ہے لیکن ان تنبیہات کا کوئی

اثر نہیں ہوا۔ اور رواداری کی فضا پیدا کرنا ضروری ہے اس کے بعد ان پانچ حضرات کی ایک کانفرنس ہوتی ہے جن پر حکومت کے نظم ونسق کا بار ہے۔ ان حضرات نے کوئی دو گھنٹے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زبان بندی کے امکانی اثرات پر بحث کرنے میں صرف کئے یعنی اگر اس کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی تو آیا احرار سے گندم ملے گی۔ یا کسی مہربان آسمان سے بارش حاصل ہو سکے گی؟ اور آیا ایک قریب مرگ پارٹی میں از سر نو جان پڑ جائے گی کسی مرتے ہوئے انسان میں از سر نو جان پڑ جانا کسی معجزے ہی سے ممکن ہے اور امیر شریعت کے خلاف اقدام کرنا کوئی معجزہ نہیں۔ لیکن اگر آج سے دس سال پہلے اسکے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جاتا تو یہ یقیناً ایک معجزہ ہوتا۔

ایک لفظ کی اکثر توہین کی جاتی ہے "مضبوط اقدام"

آئی جی اور ڈی آئی جی نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ "مضبوط اقدام" کیا جائے اس لفظ کی اتنی دفعہ بے حرمتی کی گئی ہے کہ اب اس کو دہراتے ہوئے سننے سے ہمیں متلی کا احساس ہوتا ہے یہ لفظ ۲۱۔ جنوری ۱۹۵۳ء کو بھی استعمال کیا گیا تھا جب چیف سیکرٹری نے وزارت داخلہ سے کہا تھا کہ مطالبات کے متعلق "مضبوط پالیسی" کا تعین کرے۔ تاہم کم از کم یہ دونوں پولیس افسر جانتے تھے کہ اس لفظ سے کیا مراد ہے۔ چنانچہ ان کی یادداشتوں میں اسکا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں میں سے ایک دو کو جیل خانے میں بھیجدیا جائے اور تیسرے کو نظر بند کر دیا جائے۔ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان افسروں نے کانفرنس میں اپنا ارادہ بدل لیا ہو؟ اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ دوسرے تین افسروں کا خیال "مضبوط اقدام" کے متعلق اُن سے مختلف تھا۔

پالیسی کی چٹھی مورخہ ۳۔ نومبر ۱۹۵۱ء پہلے ہی موجود تھی

جو گشتی چٹھی ۲۸۔ دسمبر ۱۹۵۱ء کو جاری کی گئی قطعی طور پر بیکار تھی اور یہ امر اور بھی واضح ہو جاتا ہے جب یہ حقیقت سامنے رکھی جائے کہ کم وبیش اسی قسم کی چٹھی ۳۔ نومبر ۱۹۵۱ء کو بھی جاری کی جا چکی تھی چٹھی میں یہ کہا گیا تھا کہ ایسی مثالیں حکومت کے علم میں آئی ہیں کہ مختلف فرقوں کے افراد نے ایک دوسرے کے خلاف قابل اعتراض پروپیگنڈا کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں کے جذبات کو صدمہ پہنچا ہے اور اکثر شخصی تشدد بھی کیا گیا ہے اور بعض اوقات مقامی افسر نے بھی ان مقاصد سے اپنی وابستگی ظاہر کی ہے اور یہ امر صوبے میں سخت اضطراب اور حکومت کے لئے سخت تشویش کا باعث ہو رہا ہے"۔ حکومت کا یہ خیال ہے کہ کسی قوم یا فرقے کے اُن جائز حقوق پر کوئی نامناسب پابندی عاید نہ کی جائے جو اسے اپنے عقاید مذہبی پر عمل درآمد کے متعلق حاصل ہیں"۔ .... اس کے بعد مرکزی حکومت کی چٹھی مورخہ ، ستمبر ۱۹۵۱ء کے ترشئے ترشائے الفاظ دُہرا دیئے گئے ہیں۔ آخر میں ڈپٹی کمشنروں کو ہدایت دی گئی کہ جنگجو یانہ اور جارحانہ فرقہ پرستی کو "مضبوطی" سے دبایا جائے مقامی افسروں کو چاہیئے کہ جب

کبھی فرقہ وار اشتعال انگیز تقریروں اور کشیدگی پیدا کرنے والی سرگرمیوں کی وجہ سے گڑبڑ کا احتمال ہو تو مضبوط اقدام کریں اور اس مقصد کے لئے احکام امتناعی کی اُن دفعات کو کام میں لائیں جو قانون فوجداری میں درج ہیں۔"

پالیسی کی چھٹیوں میں یہ فرض کر لیا گیا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ قانون کے ماتحت عمل نہیں کرتے جب تک انہیں واضح طور پر بتایا نہ جائے

یعنی حکام اضلاع کی رہنمائی کے لئے یہ امر واضح طور پر بتانا پڑا کہ ملک کے قانون فوجداری میں ایسی دفعات موجود ہیں جن کا اطلاق ایسی تقریروں پر ہو سکتا ہے لیکن جب شیخ بشیر احمد نے اگست ۱۹۵۱ء کی موچی دروازے والی تقریر کے خلاف ڈپٹی کمشنر سے شکایت کی۔ تو شیخ صاحب قانون سے واقف تھے اور ڈپٹی کمشنر سے شکایت کرنے کا واضح مقصد یہی تھا کہ افسر مذکور قانون کو استعمال کرے کیا حکومت نے کوئی گشتی چھٹی بھیجکر حکام اضلاع کو حکم دے رکھا تھا کہ حکومت سے پوچھے بغیر قانون کے ماتحت کوئی کارروائی نہ کریں یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈپٹی کمشنر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خلاف مقدمہ چلانے پر آمادہ نہ تھا کیونکہ (۱) وہ کہن سال بزرگ تھے۔ یا (۲) وہ ایک عوغائی پارٹی یعنی احرار میں سے تھے یا (۳) وہ تقریریں صرف چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے خلاف کی گئی تھیں جو صرف ایک احمدی تھے یا (۴) اس لئے کہ ڈپٹی کمشنر یہ بوجھ کمشنر کے کندھوں پر ڈال دینا چاہتا تھا یا (۵) اسکی رائے میں تقریر کارروائی کے قابل ہی نہ تھی؟ آپ ان وجوہ میں کسی کو بھی منتخب کر لیجئے۔ اس سے یہی ظاہر ہو گا کہ نظم حکومت کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی تھیں اپنے حکام اضلاع کو خود اعتمادی سکھائیے۔ اگر یہ چیز ان کے کردار میں موجود نہیں ہے تو ان کو دوسری اسامیوں پر مقرر کیجئے اور ان کی جگہ ایسے آدمی مہیا کیجئے جن کے کندھے ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لئے کافی فراخ ہوں۔ ۶- دسمبر ۱۹۵۱ء

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں

کی کانفرنس میں اس سوال پر بھی غور ہونا چاہئے تھا کہ لاہور اور مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنروں سے کیوں جواب طلب نہ کیا جائے کہ جس حالت میں انہیں ۳- نومبر کی گشتی چھٹی پہنچ چکی تھی انہوں نے قانون کے ماتحت کوئی اقدام کیوں نہ کیا- یہی ایک طریقہ ہے جس سے خوابیدہ افسروں کو بیدار کر کے انہیں ذمہ داری کا احساس دلایا جا سکتا ہے یہ زیادہ تر چیف سیکرٹری کا کام ہے لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جب ایک کانفرنس ایک یا دو تقریروں پر غور کرنے کے لئے منعقد کی جائے تو چیف منسٹر کو یہ خیال ہی نہ آئے کہ مقامی افسر نے کچھ بھی نہیں کیا۔

بھلوال میں احمدی کانفرنس ۲۲- ستمبر ۱۹۵۱ء

(۴) ۲۲ اور ۲۳- ستمبر ۱۹۵۱ء کو بھلوال میں ایک احمدی تبلیغ کانفرنس منعقد ہوئی اُس کے مقابلے پر محض چڑانے کے لئے سامنے کی مسجد میں ایک سُنی کانفرنس فی البدیہہ کر لی گئی۔ پولیس

کی رپورٹ مظہر ہے کہ احمدیوں نے کوئی ناگوار بات نہیں کی لیکن احراریوں نے ایسی باتیں کیں۔ مسٹر انور علی نے تجویز کی کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس مقامی لیڈروں کو تنبیہ کرے۔ خان قربان علی خاں نے ۴۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو یہ بھی کہا کہ ”اگر وہ فرقہ وارانہ شرارت کریں تو قانونی کارروائی کی جائے“ یہ واقعہ محض احراریوں کے طرزِ عمل کی مثال پیش کرنے کے لئے بیان کیا گیا ہے۔

ملتان میں احمدی کانفرنس
۱۸۔ نومبر ۱۹۵۱ء

(۵) ۱۸۔ نومبر ۱۹۵۱ء کو احرار نے ملتان میں احمدیوں کے ایک جلسے کو درہم برہم کر دیا۔ شیخ بشیر احمد نے پھر شکایت کی اور اس دفعہ حکومت کو بھیجی کہ لائلپور میں ایک اور جلسہ بھی اسی طرح درہم برہم کیا گیا ہے انہوں نے لکھا کہ حکومت کی پالیسی واضح ہونی چاہئے اور اس کا ظہور عمل میں ہونا چاہئے۔ انہوں نے حکومت کو یاد دلایا کہ ہفتے کے آخر میں احمدیوں کا ایک اور سالانہ جلسہ سیالکوٹ میں ہونے والا ہے اور حفاظت کا مطالبہ کیا۔ مسٹر قربان علی نے کہا کہ میں اس چٹھی کے ایک ایک لفظ سے اتفاق کرتا ہوں اور اسکے ساتھ ہی ”مضبوط پالیسی“ کی استدعا کی۔

ملتان کے جلسے کو درہم برہم کرنے کا واقعہ خاص طور پر مسٹر دولتانہ کے علم میں لایا گیا۔ چنانچہ انہوں نے اس معاملے کے متعلق اپنے افسروں سے بات چیت کی اور معاملہ ڈپٹی ہوم سیکرٹری کی ایک یادداشت پر ختم ہو گیا۔ جو چیف منسٹر کی جانب سے لکھی گئی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ ”اس اطلاع پر کوئی علیحدہ کارروائی ضروری نہیں ہے۔“

سیالکوٹ میں ۱۶۔ فروری ۱۹۵۲ء

سیالکوٹ کا جلسہ خود احمدیوں کی رضامندی سے ملتوی کرنا پڑا۔ کیونکہ فضا میں بہت تناؤ تھا آخر یہ جلسہ ۱۶۔۱۷۔ فروری ۱۹۵۲ء کو منعقد ہوا لیکن اس وقت بھی پولیس کو اس جلسے کے گرد خاردار تار کا جنگلہ لگانا پڑا احراری کچھ دور کھڑے رہے اور انہوں نے جلسے کے بعد احمدیوں پر پتھر پھینکے۔ ڈپٹی کمشنر نے قوت کی نمائش کر کے صورت حالات کو بد سے بدتر نہ ہونے دیا اور احمدیوں کو پولیس کے پہرے کے ساتھ ٹرکوں میں بٹھا کر گھروں کو روانہ کر دیا۔ ۱۷۔ فروری کو جو جلسہ ہونے والا تھا اس کے متعلق خود احمدیوں ہی نے سوچا کہ اس کا انعقاد خطرے سے خالی نہیں چنانچہ انہوں نے اس دن جلسہ نہ کیا۔

احرار کانفرنس اوکاڑہ میں
۲۴۔ نومبر ۱۹۵۱ء

(۶) ۲۴۔۲۵۔ نومبر ۱۹۵۱ء کو اوکاڑہ میں ایک احرار کانفرنس منعقد ہونے والی تھی اور چونکہ اوکاڑہ احمدیوں اور احراریوں کے نزاع کا ایک اڈا تھا۔ (۱۹۵۰ء میں یہاں ایک احمدی مارا گیا تھا) اس لئے چیف منسٹر نے ڈی آئی جی کا یہ مشورہ قبول کر لیا کہ یہ جلسہ ممنوع قرار دیا جائے اس کے بعد معلوم ہوا کہ منٹگمری کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مشتاق احمد چیمہ اس شرط پر اس جلسے کے انعقاد کی اجازت دے چکے ہیں کہ اس میں کوئی

قابل اعتراض تقریر نہیں کی جائے گی۔ مسٹر دولتانہ اس وقت کراچی میں تھے اور چونکہ مسٹر قربان علی کے نزدیک بہترین رویہ یہی تھا کہ وعدے کا ایفا کیا جائے لہذا انہوں نے ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی کہ اگر آپ

منٹگمری کا ڈپٹی کمشنر

کو اعتماد ہو کہ کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آئے گا تو آپ جلسے کی اجازت دے سکتے ہیں اس جلسے کا افتتاح خود مسٹر چیمہ نے کیا اور دوسرے دن اختتامی تقریر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کی جس میں انہوں نے احرار کا شکریہ ادا کیا کیونکہ اس جلسے کا نام "دفاع کانفرنس" رکھا گیا تھا۔ مندرجہ ذیل دو تقریروں کے اقتباسات قابل ملاحظہ ہیں:۔

۱ قاضی احسان احمد شجاع آبادی: "مرزائیوں سے خبردار رہو یہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور حکومت پاکستان کو چاہیئے کہ خان لیاقت علی خان کے قتل کی تحقیقات کرتے وقت انکو ذہن میں رکھے انکو پاکستان میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا کوئی حق نہیں ہے۔"

(ان لوگوں کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ یہ تمام قومی مصائب کی تحقیقات کے گم شدہ سلسلے دریافت کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں)

۲ سید عطاءاللہ شاہ بخاری: ملک کے دفاع کو مضبوط کرنے کی ضرورت پر زور دینے کے بعد آپ نے کہا "ایک غدار ایک کروڑ سؤروں سے بدتر ہے اگر حکومت مجھے غدار سمجھے تو اسے چاہیئے کہ مجھے گولی مار دے۔ نہایت افسوس ہے کہ مرزا بشیرالدین نے ایک دفعہ پاکستان کو ہندوستان سے متحد کرنے کی کوششوں کی کھلم کھلا حمایت کی تھی یہ پاکستان سے غداری تھی۔"

ڈپٹی کمشنر اور چیف سیکرٹری کے درمیان اس مسئلے پر کچھ خط و کتابت بھی ہوئی کہ ایسی کانفرنس کی صدارت کرنا کس حد تک جائز تھا۔ ہمیں بحیثیت مجموعی اتفاق ہے کہ مسٹر چیمہ کے طرز عمل کے خلاف ایک سے زیادہ وجوہ کی بنا پر اعتراض ہونا چاہیئے تھا لیکن تاہم یہ امر موجب اطمینان ہے کہ حکومت سے استصواب کئے بغیر ڈپٹی کمشنر نے بعض شرائط کے ماتحت ایک جلسے کے انعقاد کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ ان کو فیصلے کی غلطیاں کرنے دو وہ کچھ تو کریں جس سے یہی ظاہر ہو سکے کہ وہ فیصلے کی غلطیاں کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

رگڑا امست قلندر دا
مارچ ۱۹۵۲ء محض ایک تنبیہ

(۷) مارچ ۱۹۵۲ء میں ایک کتابچہ مسٹر انور علی کے علم میں آیا جس کا نام تھا "رگڑا امست قلندر دا" اور جو سائیں آزاد قلندر بھیروی نے لکھا تھا جس میں سی آئی ڈی کے بیان کے مطابق بانی احمدیت پر "دشنام آمیز اور توہین انگیز" نکتہ چینی کی گئی تھی جس کے خلاف زیر دفعہ ۲۹۵-الف تعزیرات پاکستان اور زیر دفعہ ۹۹-الف ضابطہ فوجداری کارروائی ہو سکتی تھی مسٹر انور علی نے ایک یادداشت میں لکھا کہ اگرچہ تازہ ہدایات کے مطابق ایسے اشخاص کے خلاف "مضبوط" کارروائی ہونی چاہیئے لیکن اس کتابچے کا مصنف کوئی خاص ممتاز حیثیت نہیں رکھتا اور اگر اس کے خلاف قانونی کارروائی کی گئی تو رسوائے عالم ہو جائے گا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجرموں کو رسوائی عام سے کیوں محروم کیا جائے۔ لیکن ہمیں تو اس مشورے کی پشت پر وہی خیال کارفرما نظر آتا ہے جس کے ماتحت ۱۹۵۱ء میں چیف ایڈوائزر

مجرموں کو "رسوائی عام" اور "سستی شہادت" کا حق دینے سے انکار

نے احرار کو بہ حیثیت مجموعی "سستی شہادت" کا مرتبہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یعنی اندیشہ یہ تھا کہ پیمانۂ اقدار میں ان کا رتبہ بلند ہو جائیگا اور وہ قید ہونے کے بعد اہم اشخاص بن جائیں گے لیکن لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اقدام نہ ہونے کی صورت میں لوگ بدگوئی اور گالی گلوچ کو زندگی کا عام منظر سمجھ لیتے ہیں اور بالآخر جب یہ دشنام طرازی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور اس کو روکنے کے لئے کوئی کوشش کی جاتی ہے تو لوگ اس کو "آزادی تقریر میں ناواجب مداخلت" قرار دینے لگتے ہیں یہی جولائی ۱۹۵۲ء میں ملتان میں ہوا۔ مہینا بھر قانون کی خلاف ورزی میں جلوس نکلتے رہے اور جب آخر ان پر پابندی عائد کی

جولائی ۱۹۵۲ء کو ملتان میں جو گولی چلی وہ احکام کے عدم نفاذ کا نتیجہ تھی

گئی اور فرض شناس پولیس افسر نے اس پابندی کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔ تو انسانی بھیڑوں کا ایک چھتا اس کے تھانے کے گرد جمع ہو گیا جس نے آہنی کٹہرا توڑ ڈالا۔ انسانوں اور سامانوں پر اینٹیں پھینکیں آگ لگانے کی کوشش کی چند سرکاری افسروں کو زخمی کر دیا اور اس وقت تک ٹھنڈے نہ ہوئے جب تک چھ گولیاں چھ سینوں میں ٹھنڈی نہیں ہو گئیں۔

اس پر "تسنیم" مورخہ ۲- جولائی ۱۹۵۲ء نے لکھا "ہم اس پولیس افسر کی غیر ذمہ داری کی مذمت کئے بغیر نہیں رہ سکتے جس نے ایک اجتماع پر محض اسلئے لاٹھی چارج کیا کہ وہ نعرے لگا رہے تھے اور دفعہ ۱۴۴ کے ایک حکم کی خلاف ورزی کر رہے تھے .... سرگودھا اور دوسرے مقامات پر بھی ایسے احکام توڑے گئے ہیں"۔

تاہم ہوم سیکرٹری نے ڈی آئی جی سے اتفاق کیا اور کتابچے کے مصنف کو صرف تنبیہ کر دی گئی چیف منسٹر نے دورے سے واپس آنے پر اس کارروائی کو پسند کیا۔ شاید یہ نظم ہی بہت اچھی تھی!

دو مہینے بعد مئی ۱۹۵۲ء میں احراریوں نے ایک پوسٹر شائع کیا جس کا عنوان یہ تھا:-

"خلیفہ قادیان مرزا بشیر الدین کی گاندھی جی سے ہم بستری اور اکھنڈ ہندوستان"

ہم اس عنوان کا انگریزی میں ترجمہ نہیں کر سکتے اس لئے کہ لفظ "ہم بستری" کے دو معنی ہیں اس لفظ کو مرزا بشیر الدین نے ایک معنی میں استعمال کیا ہے اور احرار نے اس کا دوسرا مفہوم لیا ہے جو فحش ہے۔ یہ پوسٹر

ہم بستری والا پوسٹر: تنبیہ بھی نہ کی گئی

بھی فحش و ناشائستہ مواد سے لبریز ہے اس میں جسٹس سکیمپ کے ایک فیصلے کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس میں جسٹس موصوف نے مرزا صاحب سے خرابی اخلاق منسوب کی ہے حالانکہ دراصل جسٹس سکیمپ نے ایک ایسی تحریر کا اقتباس نقل کیا ہے جس کے خلاف احمدیوں نے اعتراض کیا تھا۔ یہی تحریر اسی طریقے سے ایک اور قابل اعتراض کتاب "جانباز پاکٹ بک" میں نقل کی گئی تھی اور ہم

ہیں سے ایک نے اسی بنا پر کتاب کے مصنف کو توہین عدالت کی پاداش میں ایک ماہ قید کی سزا دی تھی۔ ڈی آئی جی نے اس کیس میں کوئی خاص سفارش نہ کی۔ اور چیف منسٹر نے اس یادداشت پر محض مختصر دستخط کر دینے پر اکتفا کیا۔

سرگودھا کانفرنس ۲۴۔ مارچ ۱۹۵۲ء

(۸) اس کے بعد ایک اہم واقعہ "استحکام پاکستان احرار کانفرنس" ہے۔ جو ۲۴-۲۵ مارچ ۱۹۵۲ء کو سرگودھا میں منعقد ہوئی۔ سیکرٹری انجمن احمدیہ سرگودھا نے مرکزی حکومت کو ایک احتجاجی تار بھیجا جس میں تشدد کی اس کھلی تلقین اور لاقانونی کی شکایت کی جس نے احمدی جماعت کو شدید خطرے میں مبتلا کر رکھا تھا مرکزی حکومت نے چیف سیکرٹری سے رپورٹ طلب کی چنانچہ مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ کی ایک نقل بھیج دی گئی لیکن اس پر مسٹر انور علی نے اپنی حکومت سے پُرزور احتجاج کیا۔ اور کہا کہ

مرکزی حکومت نے رپورٹ طلب کی ڈی آئی جی نے احتجاج کیا

مرکزی حکومت کو تمام مختلف معاملات کے متعلق رپورٹیں طلب کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اس سے کام میں خواہ مخواہ اضافہ ہوتا ہے حالانکہ مرکزی حکومت ان معاملات میں احکام صادر کرنے کی آئینی اہلیت نہیں رکھتی بہتر یہ ہوتا کہ مرکزی حکومت اس تار کو ضروری کارروائی کی غرض سے صوبائی حکومت کے پاس بھیج دیتی۔ قانون و انتظام کے معاملے میں صوبائی حکومت "مختار کل" ہے اور جب اس سے رپورٹیں طلب کی جائیں تو لوگوں کو جرأت ہو جاتی ہے کہ اس حکومت کو نظر انداز کر کے مرکز کو مداخلت کی دعوت دیں۔

یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اس امر کے باوجود کہ مسٹر انور علی کے نزدیک قانون و انتظام کے معاملے میں صوبائی حکومت مختار کل تھی۔ ۲۱۔ فروری ۱۹۵۳ء کو "مضبوط پالیسی" والی چٹھی مرکزی حکومت کو مسٹر انور علی ہی کے ایما پر بھیجی گئی تھی۔

تقریریں: جالندھری نے کہا زندیق واجب القتل ہیں بخاری

سی۔ آئی۔ ڈی نے جن تقریروں کو قلمبند کیا ان میں مولوی محمد علی جالندھری کا یہ فقرہ بھی تھا کہ "مرزائی" زندیق ہیں اور زندیق شریعت اسلامی کے رو سے واجب القتل ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کہا کہ چودھری ظفر اللہ خان جان بوجھ کر کشمیر کی گتھی کو الجھا رہے ہیں اور افغانستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کی تلخی کو قائم رکھے ہوئے ہیں اس مقرر نے اپنے سامعین کو حکم دیا۔ کہ ایک جلوس نکالیں اور وزیر خارجہ کی برطرفی کا مطالبہ کریں۔ اور نعرہ لگائیں "مرزائیت مردہ باد۔ ظفر اللہ مردہ باد۔ مرزا بشیر احمد مردہ باد" اس جلوس کے متعلق اس رپورٹ کا مفاد نقل کرنا مفید ہوگا جو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حکومت کو ارسال کی:۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ جلوس کے متعلّق

"۲۸- مارچ کو عطاء اللہ شاہ بخاری کی ہدایت کے مطابق کوئی دو سو آدمیوں کا جلوس نکالا گیا۔ میں نے مولوی عبداللہ احراری (تاجر کتب) عبدالرشید اشک اور دوسرے لوگوں سے کہا کہ وہ جلوس کی قیادت نہ کریں۔ کیونکہ اس سے نفرت و حقارت پیدا ہونے اور فساد کے پھوٹ پڑنے کا احتمال ہے۔ لیکن انہوں نے میرے مشورے پر کان نہ دھرا اور کہا کہ احتجاج کا صرف یہی طریقہ ہے انہوں نے اپنے پیروؤں سے مُردہ باد کے نعرے لگوائے جلوس جلتا آگے بڑھتا گیا اسمیں اضافہ ہوتا گیا کچہری بازار میں ایک اور بڑا جلوس آن ملا۔ اور پھر یہ دونوں جلوس مل کر میونسپل باغ کی طرف چلے۔

قانون و انتظام بالکل اُٹھ چکا ہے

عبدالرشید اشک ان کو حوصلہ دلا رہا تھا کہ بے خوف آگے بڑھے چلو۔ ایک وقت یہ تو معلوم ہوتا تھا کہ قانون و انتظام بالکل ہی اُٹھ چکا ہے ڈپٹی کمشنر نے بھی اس جلوس کو دیکھا .... احراری کارکن امن اور سلامتی کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کا ظاہری مقصد تو احمدیوں کی مذمّت کرنا ہے لیکن اندرونی مقصد یہ ہے کہ بدنظمی اور لاقانونی پیدا کی جائے۔ میں مندرجہ ذیل کارروائی کرنا چاہتا ہوں جس کیلئے حکومت کی اجازت کا طالب ہوں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مجھ سے متفق ہیں کہ مضبوط اقدام کرنا چاہیئے

ایس پی نے اقدام کی تجویز کی

میری تجویز یہ ہے کہ مولوی عبداللہ احراری۔ مولوی صالح محمد اور عبدالرشید اشک کو زیر دفعہ ۳۔ سیفٹی ایکٹ پندرہ دن کے لئے گرفتار کر لیا جائے۔ مندرجہ ذیل سات آدمیوں نے (یہاں ان کے نام نقل کئے گئے ہیں) چونکہ جلوس میں سرگرم اور نمایاں حصّہ لیا تھا اس لئے میری یہ تجویز ہے کہ ان کے خلاف دفعہ ۱۰۷/۱۵۱ ضابطہ فوجداری استعمال کی جائے۔ یہ مذکورہ بالا تین اشخاص کے نہایت پُرجوش پیرو ہیں۔ اور اس امر کا احتمال ہے کہ وہ احمدیوں کو زدو کوب یا ان کی توہین کر کے امن و امان میں خلل انداز ہونگے"۔

پھر ارادہ بدل لیا

یہ تحریر ۲۸- مارچ کو لکھی گئی تھی۔ ۴- اپریل کو انہوں نے ایک اور چھٹی لکھی۔ "میں نے ۲- اپریل کو ان تین مولویوں کو طلب کر کے انہیں مشورہ دیا کہ جلوس نہ نکالیں اگر احراری کارکن اور ان کے حامی تمیز سے کام لیں گے اور مزید جلوس نہ نکالیں گے تو میں ان کے خلاف کارروائی ملتوی کر دونگا"۔

یہ رویہ اس پالیسی کے مطابق نہ تھا جو ۲- دسمبر ۱۹۵۱ء کی چھٹی میں معیّن کی گئی تھی۔ اور اگر معاملہ

یہیں رہ جاتا تو محض یہ کہہ دیا جاتا کہ مقامی افسروں کا کام تسلی بخش نہیں ہے۔ گویا ایک تاجر کتب سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کہتا ہے کہ تم دخل در معقولات نہ دو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اس کا کوئی خیال نہیں کرتا حالانکہ اس کا "اپنا کام" یہ تھا کہ نقضِ امن کو روکے اور فوری گرفتاریاں کرے۔

اسے کیا کرنا چاہیئے تھا

ایک موقع پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ قانون و انتظام بالکل اُٹھ چکا ہے اور صرف سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہی اسکے حامل باقی رہ گئے ہیں اور ان کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ دونوں یتیموں کی طرح اِدھر اُدھر دھکے کھا رہے ہیں۔ ہمیں ان پر رحم آتا ہے اُس نظام حکومت پر رحم آتا ہے جس نے انکو پیدا کیا ہے لیکن معاملہ یہیں تک نہیں رہا۔ ڈی آئی جی نے ایک پُر زور یادداشت لکھکر سپرنٹنڈنٹ پولیس

ڈی آئی جی نے اقدام کی تجویز کی

کی رائے کی تائید کی اور یہ یادداشت انسپکٹر جنرل کو بھیجدی۔ اس کے بعد ڈی آئی جی کے اسسٹنٹ نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ٹیلیفون پر بتایا کہ ڈی آئی جی نے پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نہیں بلکہ زیر دفعہ ۱۰۷/۱۵۱ ضابطہ فوجداری کارروائی کرنے کا مشورہ دیا ہے اس سے پہلے یا شاید بعد میں ڈی آئی جی نے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کی رائے طلب کی۔ اور ۲۔ اپریل ۱۹۵۲ء کو انہیں بتایا گیا کہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۵۳۔ الف اور ۲۹۵۔ الف اور ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۰۸ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ ۳۔ اپریل کو ڈی آئی جی نے ایک یادداشت لکھی کہ چیف منسٹر نے رپورٹ ملاحظہ کر لی ہے

لیکن چیف منسٹر سے ملاقات کے بعد ارادہ بدل لیا

اور پراسیکیوٹنگ ایجنسی نے یہ مشورہ دیا ہے کہ تقریروں کے خلاف مقدمات نہیں چلائے جاسکتے۔ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مشورے کی یہ تعبیر نہایت عجیب ہے لیکن اگر ڈی آئی جی نے چیف منسٹر کے ساتھ ملاقات کے بعد اپنی رائے ہی بدل لی تھی تو انہوں نے الزام پراسیکیوٹنگ ایجنسی پر کیوں رکھا؟

مولوی محمد شفیع سرگودھا ۲۴۔ جون ۱۹۵۲ء

تین ماہ بعد مولوی محمد شفیع خطیب جامع مسجد سرگودھا نے ۲۴۔ جون ۱۹۵۲ء کو جمعۃ الوداع کے موقع پر ایک تقریر کی اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اس کی رپورٹ تیار کی جو کم و بیش ان الفاظ میں تھی:-

اسکے متعلق ایس پی کی رپورٹ

"۲۴۔ جون ۱۹۵۲ء کو عیدگاہ میں مولوی محمد شفیع نے حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم جاری رکھی۔ یہ شخص واضح طور پر اور شدت کے ساتھ حکومت کا مخالف ہے۔ یہ مجلس احرار سے تعلق رکھتا تھا اور یونینسٹوں کی حمایت کیا کرتا تھا اس نے ایک بہت بڑا اشتہاری تختہ مسجد کے اندر لگا رکھا ہے جس پر ہر روز حکومت کے خلاف مولانا مودودی کے خیالات

چاک سے لکھ دیتا ہے سرگودھا کے ایک شخص صابر علی نے جو زیر دفعہ ۳۔ پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کیا گیا تھا بیان کیا کہ ایک دفعہ مولوی محمد شفیع نے اس اشتہاری تختے پر لکھا کہ سابق وزیر اعظم نے امریکہ کے دورے پر سرکاری روپے کا غلط استعمال کیا۔ اس شخص سے کوئی توقع نہیں کہ اپنی اصلاح کرے گا یہ شخص بلاشبہ تفرقہ انگیز ہے"۔

ایس۔ پی نے کوئی کارروائی نہ کی

تاہم ۲۶۔ جون کو ایس پی نے لکھا کہ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پراسیکیوٹنگ ڈی ایس پی سے اس مسئلے پر گفت و شنید کی ہے کہ مولوی محمد شفیع وغیرہ کے خلاف ایک حکم امتناعی کی خلاف ورزی کے لئے زیر دفعہ ۱۸۸۔ تعزیرات پاکستان مقدمہ چلایا جائے لیکن ان سب نے یہ فیصلہ کیا کہ ان تقریروں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے جو جمعۃ الوداع کے موقع پر کی گئی تھیں۔ ڈی آئی جی نے اس رپورٹ کی اطلاع انسپکٹر جنرل اور حکومت کو دی۔ انسپکٹر جنرل نے کہا اس میں شک نہیں کہ وہ مسجد کے نام سے ناجائز فائدہ

آئی۔ جی نے سنجیدگی سے اسکا نوٹس لیا لیکن چیف منسٹر نے کوئی توجہ نہ کی

اٹھائیں گے۔ لیکن جب تک ہم یہ تسلیم نہ کر لیں کہ مسجد قانون شکنوں کیلئے مامن ہے ہم اس ذمہ داری سے آزاد نہیں ہو سکتے کہ قانون ملکی کا احترام ہر حال میں قائم رکھا جائے گا۔ چیف منسٹر نے ۴۔ جولائی کو اس یادداشت کو ملاحظہ کیا۔

کارروائی ہونی چاہیئے تھی

مسٹر دولتانہ نے ہمیں عدالت میں بتایا کہ جب کبھی کوئی فائل ان کے پاس صرف بغرض اطلاع بھیجی جاتی تھی وہ اس پر صرف مختصر دستخط کر دیا کرتے تھے ایک اور مقام پر انہوں نے کہا کہ وہ عام طور پر اپنے افسروں کی سفارشات سے اتفاق کر لیا کرتے تھے۔ ایک اور موقع پر انہوں نے تسلیم کیا کہ اگر کسی شدید بے عملی کی اطلاع ان کو ملتی تھی تو وہ اس کے متعلق اقدام کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے یہ صورت کم از کم بے عملی کا کیس تو ضرور تھی اور اس مضبوط اقدام کے قطعاً خلاف تھی جس کا تصور ۳۔ نومبر اور ۲۲۔ دسمبر ۱۹۵۱ء میں کیا گیا تھا۔ ایک شخص نے جسکو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے افتراق انگیز دیوانہ بتایا ہے امتناع جلسہ کے احکام کو توڑ کر ایک جلسہ منعقد کر لیا اسکی کوئی وجہ بھی نہ بتائی گئی حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کہا گیا کہ یہ جمعۃ الوداع کا موقع تھا اور جمعۃ الوداع ہزار مہینوں سے بہتر ہے اس کے علاوہ یہ ایک ایسا کیس تھا جس کے متعلق انسپکٹر جنرل نے کارروائی کی سفارش کی تھی اور کہا تھا کہ اگر کوئی کارروائی نہ کی گئی تو حکومت قانون ملکی کو نافرمانی سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری سے آزاد نہ ہو سکے گی۔

مئی میں ڈی آئی جی سی آئی ڈی کی طرف سے صورت حالات کا عمومی جائزہ اور پالیسی کی نئی چٹھیوں کا اجرا

۲۰۔ مئی ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی نے ایک جامع یادداشت لکھی جس میں ۱۹۵۰ سے لیکر احرار کے افعال اور ان

کے اثرات کا خلاصہ درج کیا جس کا اختصار درج ذیل ہے:۔

(۱) اکتوبر ۵۰ء میں اوکاڑہ کے مقام پر احمدی مبلغین کو راستے میں روک کر ان کے منہ کالے کئے گئے (ظاہر ہے کہ یہ "جارحانہ فرقہ پرستی" کا نتیجہ تھا) ایک سکول کا مدرس ہلاک کر دیا گیا (۲) قریب قریب اسی زمانے میں ایک احمدی پنڈی میں مارا گیا۔ گو اسکی ہلاکت کا فوری سبب مذہبی اختلافات سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ (۳) جنوری ۱۹۵۱ء میں احراریوں نے سیالکوٹ میں احمدیوں کا ایک جلسہ درہم برہم کر دیا (۴) فروری میں چک جھمرا کے مقام پر مولوی عصمت اللہ احمدی کے بیٹے کو ریلوے سٹیشن پر احرار نے چھرا مار دیا (۵) مارچ میں گوجرانوالہ کے مقام پر ایک احمدی دکاندار پر حملہ کیا گیا لیکن پولیس نے اسکی جان بچا لی (۶) اپریل میں لائل پور کے مقام پر غلام نبی جانباز کی دھمکی کے بعد ایک احمدی دکاندار پر حملہ کیا گیا (۷) مئی میں سمندری کے مقام پر احمدیوں کی ایک مسجد جلا دی گئی۔ (۸) نومبر میں پھر لائل پور میں احمدیوں کا ایک جلسہ درہم برہم کیا گیا جس کے باعث طرفین کو جانی نقصان اٹھانا پڑا (۹) اسی مہینے میں احرار نے ملتان میں احمدیوں کے ایک جلسے کو منتشر کرنے کی کوشش کی (۱۰) مارچ ۱۹۵۲ء میں سرگودھا کے مقام پر حکم امتناعی کے باوجود احراریوں کا ایک جلوس نکالا گیا۔ ہم ابھی اس کا ذکر کر چکے ہیں (۱۱) اپریل ۱۹۵۲ء میں راولپنڈی کے ایک جلسے میں ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر لوگوں کو چودھری ظفر اللہ خاں کے قتل کی ترغیب دی (۱۲) اسی مہینے گوجرانوالہ میں چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے دو جنازے نکالے گئے جن کے ساتھ یہ توہین آمیز نعرے لگائے گئے "ظفر اللہ ٹیٹر چور دا۔ نعرہ مارو زور دا"۔ (۱۳) مئی ۱۹۵۱ء میں لائل پور کے مقام پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بڑے پیمانے پر مظاہروں کا اعلان کیا۔ (۱۴) سی آئی ڈی نے دوران مراسلت میں ایک چھٹی پکڑی جس میں لکھا تھا کہ جو شخص وزیر خارجہ کو قتل کرے گا اسکو جنت الفردوس میں جگہ ملے گی۔

مسٹر انور علی نے کہا کہ احراری جو تقسیم کے بعد مسلمانوں کو اپنا منہ نہ دکھا سکتے تھے۔ اب جارحانہ رویّہ اختیار کئے ہوئے ہیں وہ لوگوں کو بتا رہے ہیں کہ انہوں نے مسلم لیگ کے اعلیٰ لیڈروں سے صلح کر لی ہے۔ گورنر چیف سیکرٹری۔ اور انسپکٹر جنرل نے ان کو وقتاً فوقتاً تنبیہ کی۔ لیکن ان تنبیہات کا کوئی اثر نہ ہوا اب انہوں نے متعدد مقامات پر اپنی شاخیں کھول دی ہیں اور ان کے ممبروں کی کل تعداد ۱۰۴۶ ہے۔ اگر انہیں قوت اور ہردلعزیزی حاصل کرنے کا موقع دے دیا گیا تو ان کا تدارک روز بروز دشوار ہوتا چلا جائے گا آخر میں انہوں نے لکھا کہ "ہوم سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل سے بات چیت کرنیکے بعد" ان کی سفارشات حسب ذیل ہیں:۔

ڈی آئی جی نے دوبارہ سفارش کی کہ احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دیا جائے۔ ۲۰۔ مئی ۱۹۵۲ء

(۱) جیسا کہ انہوں نے ۱۹۵۰ء میں تجویز کی تھی احراریوں کو خلاف قانون جماعت قرار دے دینا چاہیئے۔

(۲) سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولوی محمد علی جالندھری نظر بند یا محبوس کر لئے جائیں۔

(۳) احراریوں کے جلسے ہر حال میں ایک یا دو سال کے لئے ممنوع قرار دے دئے جائیں۔

مسٹر قربان علی خاں کی پیشگوئی اور تنبیہ

اسکے بعد مسٹر قربان علی خاں نے ایک پیشگویانہ اور عمیق یاد داشت لکھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صورت حالات کا کتنا صحیح اندازہ کر رہے تھے اور حکومت کا کوئی فیصلہ کن قدم نہ اٹھانا ان کے نزدیک "سیاسی تاتل" کا نتیجہ تھا ہم اس کا صرف مفاد ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

"آخر ہم کب تک یاد داشتیں لکھنے ہی کے مرحلے پر مقیم رہیں گے؟ مجھے کامل یقین ہے کہ اگر حکومت نے احرار کو ہاتھ نہ لگانے کی موجودہ پالیسی جاری رکھی تو یہ لوگ جلد یا بدیر کسی ایسے ہولناک جرم کا ارتکاب کرینگے کہ حکومت کو اس امر کی جواب دہی سخت مشکل ہو جائے گی کہ سی آئی ڈی کی مسلسل اور پرزور رپورٹوں کے باوجود اس نے کوئی بروقت اقدام کیوں نہ کیا۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کا فیصلہ کرنا مشکل ہے لیکن کسی نہ کسی کو یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا۔ مرکز غالباً ایک ایسے معاملے میں الجھنے کی ذمہ داری میں شریک نہیں بنے گا جس میں ایک نئے حزب اختلاف کے پیدا ہو جانے کا بعید نہیں امکان ہے خصوصاً ایک ایسے قضیئے پر جسکو مذہبی حیثیت سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی نہ کسی حکومت کو خواہ وہ کہیں بھی ہو عوام کی صحیح رہنمائی لازماً کرنی ہو گی۔ اگر ہر پارٹی کو یہ خوف ہے کہ احراری اپوزیشن میں جا بیٹھیں گے تو قانون و انتظام کو بحال رکھنا بے حد مشکل ہو جائے گا۔ آج احرار کوئی قوت نہیں رکھتے لیکن کل وہ نہایت قوی ہو سکتے ہیں اگر حکومت کو یقین ہے کہ ان کا طرز عمل کسی نہ کسی کارروائی کا متقاضی ہے تو اس کارروائی کا بہترین موقع آج ہی ہے"۔

مسٹر قربان علی خاں نے عدالت میں اپنے بیان کی تصریح کی

سوالات کرنے والوں نے مسٹر قربان علی خاں سے سوال کیا تھا کہ دونوں حکومتوں کی اضافی ذمہ داری کے متعلق اس یاد داشت کا مفہوم کیا ہے؟ خاں صاحب کے تحریری بیان سے ذیل کے فقرات نقل کئے جاتے ہیں: (۱) "صاف اور دو ٹوک جواب یقیناً مرکزی حکومت کی پریشانی کا موجب ہوتا اور صوبائی حکومت کو اس سے اور بھی زیادہ گھبراہٹ ہوتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مسئلے کا تعلق صرف پنجاب سے نہ تھا" (۲) "میں نے اس بات پر زور نہیں دیا کہ مطالبات کا جواب کیونکر دیا جائے بلکہ میں نے مقامی حکومت سے یہ کہا تھا کہ عوام کی صحیح رہنمائی کر کے انہیں بتائے کہ ایک باقاعدہ منظم حکومت میں عوامی مطالبات کس طریقے سے پیش کرنے چاہئیں میں نے حکومت پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ جو لوگ حکومت کو ایک خاص فیصلے پر مجبور کرنے کی غرض سے تشدد کا وعظ اور تشدد ہی کا استعمال کر رہے ہیں ان کے خلاف شدید تعزیری اور موثر انسدادی کارروائی کرنی چاہئے۔ یہ سوال میرے ذہن میں کبھی نہ تھا کہ صوبائی حکومت مرکزی حکومت کی منظوری کے بغیر کوئی دوٹوک جواب دینے کی ذمہ داری لے لے"!

(۳) تمیرے لیئے یہ محسوس کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ صوبائی حکومت مرکزی حکومت سے یہ چاہتی ہے کہ وہ صورت حالات کی ناگوار ذمہ داری کا سامنا خود کرے میرے خیال میں یہ دونوں ہی اس ناگوار ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کر رہی تھیں .... میں اپنی یادداشتوں میں جو گزارش کر رہا تھا وہ یہ تھی کہ حکومت پنجاب اس خیال سے بالکل خالی الذہن رہے کہ مرکزی حکومت مطالبات کے متعلق کیا کرتی ہے اور خود لاقانونی کے ظہور پر مستعدی اور مضبوطی سے تدارک کی تدبیریں اختیار کرے اگر مرکزی حکومت کوئی مضبوط فیصلہ کر دیتی تو بہت بڑی مدد کا باعث ہوتی لیکن اگر اس نے کوئی مضبوط فیصلہ نہیں کیا تو اس سے صوبائی حکومت قانون و انتظام کے قیام کی ذمہ داری سے سبکدوش تو نہ ہو گئی تھی"

اس طریق سے مسٹر قربان علی خاں نے ذیل کے معاملات کی طرف حکومت کی توجہ بطور خاص مبذول کرادی (۱) آپ لوگ سی آئی ڈی کے مشورے کو مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں اور اگر کوئی واقعہ ہو گیا تو آپکے لیئے اپنی ناکامی کی توجیہہ کرنا مشکل ہو جائے گا (۲) اگر آپ اس لیئے کوئی کارروائی نہیں کرتے کہ اس سے آپ کو پریشانی ہوتی ہے تو مرکزی حکومت کا یہ اندیشہ بھی بالکل صحیح ہے (۳) لیکن چونکہ آپ لوگ قانون انتظام کے ذمے دار ہیں اسلیئے آپ کو مرکز سے استصواب کیئے بغیر صورت حالات کا تدارک کرنا چاہیئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۵۔مئی کو چیف منسٹر اور دوسرے افسروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جنکے فیصلے پالیسی کی اس تیسری چٹھی میں ظاہر کیئے گئے۔جو ۵۔جون ۱۹۵۲ء کو جاری کی گئی اس میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ہدایت دی گئی تھی کہ بلا استثنا احمدیوں اور احراریوں کے تمام جلسوں کو ممنوع قرار دے دیں

چیف منسٹر اور افسروں کی کانفرنس۔ پالیسی کی چٹھی مورخہ ۵۔جون

اور جہاں کہیں کوئی جلسہ ہونے والا ہو وہاں دفعہ ۱۴۴ عائد کر دیں اس چٹھی نے ۲۴۔دسمبر ۱۹۵۱ء والی چٹھی کو منسوخ کر دیا۔جس میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو اختیار تمیزی کے استعمال کا موقع دیا گیا تھا ایک اعتبار سے یہ گویا اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تمام معاملات میں اختیار تمیزی کے استعمال کی اہلیت نہیں رکھتے تاہم ۳۱۳۔۱۰۔آدمیوں کی ممبری خلاف قانون قرار نہ دی گئی۔نہ کسی شخص کی زبان بندی یا نظر بندی کی گئی یہ معقول سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ جس حالت میں حکومت کے کم سے کم ناگوار اقدام سے مطلوبہ نتیجہ مترتب ہو سکتا تھا تو کسی شدید تدبیر کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن عنقریب واضح ہو جائے گا کہ مطلوبہ مقصد حاصل نہیں ہوا تھا۔احرار مساجد میں منتقل ہو گئے اور چونکہ جمعتہ الوداع سر پر آ رہا تھا لہذا حکومت نے ۱۹ جون کو ایک لاسلکی ہدایت صادر کی کہ اگر احراری جمعتہ الوداع کی نماز سے قبل یا بعد جلسے منعقد کرنے کا ارادہ کریں تو مقام جلسہ کا ذکر کیئے بغیر امتناعی احکام صادر کر دیئے جائیں۔اور مقامی اماموں کو تنبیہ کر دی جائے

۱۹۔جون کی چٹھی

تاہم اگر امتناع کے باوجود جلسہ منعقد ہو جائے تو اس میں کوئی مداخلت نہ کی جائے اور خلاف ورزی احکام کے لیئے گرفتاریاں کچھ دیر توقف کے بعد کی جائیں۔

۲۸ - جون کی چٹھی

۲۸ - جون کو ایک اور چٹھی جاری کی گئی جس کا منشا یہ تھا کہ اگر حکم امتناعی کی خلاف ورزی کی جائے تو قانونی کارروائی صرف احرار کے اور ان میں بھی ممتاز اشخاص کے خلاف کی جائے۔ مقصد یہ تھا کہ انہیں عوام سے منقطع کر دیا جائے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ مئی اور جون ۱۹۵۲ء میں جو کارروائی کی گئی وہ بالکل ہی ناکافی تھی۔ لیکن چونکہ مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ صرف یہی کارروائی ممکن تھی اس لئے اس موقف کا مزید جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کے قول کے مطابق اس اجلاس میں جو سب سے پہلا معاملہ زیر غور آیا وہ یہ تھا کہ آیا مطالبات پیش کرنا بھی ممنوع قرار دیا جائے۔ دوسرا معاملہ یہ تھا کہ ان مطالبات کی حمایت میں پروپیگنڈا روک دیا جائے۔ اور تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ آیا احرار کے خلاف یکطرفہ اقدام کیا جائے۔ پہلے تین معاملات

کانفرنس کے متعلق مسٹر دولتانہ کا بیان: احراریوں کو خلاف قانون جماعت کیوں قرار دیا جا سکا

کا انحصار اس امر پر تھا کہ آیا مطالبات حق بجانب ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ان کے مالۂ و ماعلیہ کے متعلق فیصلہ صوبائی حکومت کے اختیار سے باہر تھا۔ باقی رہا تیسرا معاملہ۔ تو اس امر کے متعلق نہ کوئی قطعی معلومات اور نہ کوئی گہرا شبہ موجود تھا کہ احراری مملکت کے خلاف سازش کر رہے ہیں یا کسی دشمن طاقت کے کارندے ہیں یا کھلم کھلا تشدد کی حمایت کر رہے ہیں لہٰذا ہم ان کے خلاف تعزیری یا انسدادی کارروائی مرکز کے مشورے کے بغیر نہ کر سکتے تھے لیکن قانون و انتظام کے پہلو سے ہم نے سخت کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا"۔ اس کانفرنس کی عام رائے بھی تھی کہ جب تک مرکز کوئی پالیسی وضع نہ کرے کوئی اقدام نہیں کیا جا سکتا۔

مسٹر دولتانہ کے مفروضات غلط ہیں

مسٹر انور علی یا مسٹر قربان علی نے اپنی یادداشتوں میں یہ نہیں لکھا تھا کہ احراریوں کو اس بنا پر خلاف قانون جماعت قرار دیا جائے کہ وہ مملکت کے خلاف سازش کر رہے ہیں یا کسی دشمن طاقت کے کارندے ہیں بلکہ اس کارروائی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے تشدد اور لاقانونی کے متعدد واقعات چیف منسٹر کے علم میں لائے گئے تھے۔ دلیل دی گئی ہے کہ انسدادی یا تعزیری کارروائی مرکز کے مشورے کے بغیر نہیں کی جا سکتی لیکن قانون و انتظام کے پہلو سے سخت کارروائی کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اس دلیل کی بنا دو مفروضات پر ہے۔ اول۔ کہ انسدادی یا تعزیری کارروائی قانون و انتظام کے پہلو سے نہیں کی جاتی اور دوم کہ کسی انجمن کو خلاف قانون قرار دینے سے پہلے مرکز سے مشورہ کرنا ضروری ہے یہ دونوں مفروضات غلط ہیں

مرکز کے فیصلے کا تصور ۷ - جولائی تک نہ تھا

اس کے علاوہ جب ۲۴ - مئی ۱۹۵۲ء کی کانفرنس منعقد ہوئی اس وقت مرکز سے مشورہ کرنے کا خیال کسی کے ذہن میں نہ آیا تھا یہ بات مسٹر دولتانہ کو پہلے پہل ۷ - جولائی ۱۹۵۲ء کو سوجھی تھی۔ جب وہ نتھیا گلی میں مقیم تھے۔ اور ایک فائل ان کے پاس بھیجی گئی تھی یہ فائل ہوم سیکرٹری مسٹر غیاث الدین احمد کی بعض تجاویز سے متعلق تھی جو انہوں نے وزارت داخلہ کی چٹھی مورخہ ۲ - جولائی ۱۹۵۲ء سے برانگیختہ ہو کر پیش

کی تھیں۔ ہم اس سے قبل اس چٹھی کا ذکر کر چکے ہیں۔ مرکزی حکومت نے صوبجات کی رہنمائی کے لئے جو دو گشتی چٹھیاں جاری کی تھیں ان میں یہ چٹھی دوسری تھی اس میں سابقہ ہدایات کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ خلجویانہ اور جارحانہ فرقہ پرستی کو سختی سے دبایا جائے اور آخر میں حکومت پنجاب کے "تازہ" اقدامات پر اظہار اطمینان کیا گیا تھا۔ یہ وہی اقدامات تھے جن کا ہم اب جائزہ لے رہے ہیں اس پر مسٹر غیاث الدین احمد نے یہ رائے ظاہر کی کہ اب وقت آ گیا ہے جب مرکز سے اونچی سطح پر ایک پالیسی وضع کرنے کی استدعا کی جائے "جس میں مذہبی جنون اور فلسفہ نفرت کی تلقین احرار نے کی ہے اسکو اگر نابود نہ کیا گیا تو یہ فتنہ صرف صوبے تک محدود نہ رہے گا۔ تحریک ختم نبوت کے متعلق مرکز ہمیں بتائے کہ ہم کس طریق پر عمل کریں کیا ہم ان سرگرمیوں سے اغماض کریں جن کا مقصد یہ ہے کہ ایک چھوٹے طبقے کو جسمانی یا مذہبی اعتبار سے کاملاً مغلوب کر دیا جائے۔ .... مرکز کو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ آیا قانون و انتظام کی مصلحتوں کو عقائد مذہبی پر ترجیح دینی چاہیئے۔ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے متعلق عام آدمیوں میں روز بروز یہ خیال پھیل رہا ہے کہ خود ان کے بعض رفقا اس تحریک کے پیچھے ہیں"۔

ہوم سیکرٹری نے مرکز کی چٹھی مورخہ ۲- جولائی پر تبصرہ کیا

ہوم سیکرٹری نے تجویز کی کہ چیف منسٹر وزیر اعظم پاکستان کو ایک ذاتی چٹھی لکھیں۔

چیف سیکرٹری کا جائزہ

چیف سیکرٹری حافظ عبد المجید نے اس فائل کو اوپر بھیجتے ہوئے ایک یادداشت لکھی جس میں صورت حالات کا اندازہ اور جائزہ ہماری رائے میں بے نظیر تھا۔ ان کی تحریر کا مفاد یہ ہے: "ہمیں قانون و انتظام کے قیام کے لئے کارروائی کرنے میں مرکز کی تائید و حمایت کی ضرورت نہیں لیکن احرار نے جو یہ اثر پیدا کیا ہے کہ مرکز یا بعض وزرا یا حکام ان کی شورش کے حامی ہیں تو اس اثر کو دور کرنے کے لئے ایک بیان کی اشاعت ہمارے نزدیک ضروری ہے [ہوم سیکرٹری نے اس ذکر کو حذف کر دیا ہے کہ مرکز کی پالیسی وزارت داخلہ کی چٹھی مورخہ ستمبر ۱۹۵۰ء میں واضح کی جا چکی ہے اور پی یو سی (چٹھی مورخہ ۲- جولائی ۱۹۵۲ء) میں اس کا اعادہ بھی کیا جا چکا ہے] پالیسی یہ ہے کہ اس قسم کے نزاعات کو مناسب حدود سے تجاوز کی اجازت نہ دینی چاہیئے وغیرہ۔ مرکز نے حکومت پنجاب کے "تازہ اقدام" پر اظہار اطمینان بھی کیا تھا۔ رہے دوسرے مسائل یعنی احمدیوں کو اقلیت قرار دینا اور وزیر خارجہ کو برطرف کرنا تو ان سے ہمارا کوئی سروکار نہیں ہم پہلے مطالبہ کے متعلق مرکز کے فیصلے کی امکانی توقع نہیں رکھتے۔ اسلئے کہ اس کا فیصلہ کرنا دستور ساز اسمبلی کا کام ہے اور ہم وزیر اعظم کو یہ مشورہ دینے کے اہل نہیں ہیں کہ وہ وزیر خارجہ پر اپنے اعتماد کا اظہار کریں"۔

مرکز اپنا مافی الضمیر ظاہر کر چکا ہے

اس تحقیقات کے دوران میں شروع سے آخر تک جب کبھی کوئی ایسی یادداشت یا کوئی ایسا بیان ہمارے سامنے آیا ہے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ مرکز کو اپنا خیال ظاہر کرنا چاہیئے تو ہمارا بھی احساس کچھ اسی قسم کا رہا ہے کہ مرکز کو معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور اس نے کہہ دیا تھا کہ ان لوگوں کو جائز حدود تک

مذہبی پروپیگنڈا کرنے دو لیکن اگر ان کا رویہ جارحانہ ہو جائے تو انکی سرکوبی کر دو تم نے مئی اور جون ۱۹۵۲ء میں جلسوں کا امتناع اور مقدمات کی تیاری کر کے جو قدم اٹھایا ہے وہ ہمارے نزدیک بالکل درست ہے۔

بہر حال جب یہ فائل نتھیا گلی میں مسٹر دولتانہ کے پاس پہنچی تو انہوں نے ۷۔ جولائی کو اس پر ایک لمبا نوٹ لکھا جس کا اختصار یہ ہے:-

مسٹر دولتانہ کو تسلیم ہے کہ مرکز نے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہے اور قانون وانتظام کے معاملے کا تعلق مجھ سے ہے

"میں اس امر کی تدبیر کر رہا ہوں کہ مرکز سے ایک مستقل اور قطعی پالیسی وضع کراؤں۔ چنانچہ غالباً اس مہینے کے آخر میں ایک کانفرنس کراچی میں منعقد ہوگی اب وزارت خارجہ کی چھٹی مورخہ ۲۔ جولائی ۱۹۵۲ء (پی یو سی) کے پیش نظر مرکز کو کوئی رسمی مراسلہ بھیجنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ حقیقت ظاہر و باہر ہے کہ ہمیں قانون و انتظام کے قیام کے فرض کا احساس دلانے کے لئے کسی رہنمائی کی حاجت نہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ لوگوں کو تشدد پر اکسانے والوں کا سختی سے تعاقب کریں اور اپنی غیر جانب داری کو نشر و اشاعت کے ذریعے سے بالکل واضح کر دیں۔ ہمیں جلسوں کے موجودہ امتناع کو قائم رکھنا چاہیئے لیکن عوام کی "ذکاوت حس" کے پیش نظر مسجدوں میں مداخلت نہ کرنی چاہیئے۔ مسجدوں کے متعلق یہ پالیسی بلا شبہ منطق کے رو سے غلط ہے۔ لیکن "انتہائی اصطلاحی قانونی رویہ" اختیار کرنے سے لوگ مشتعل ہوں گے علاوہ بریں مساجد کے اندر ہونے والے جلسوں میں شورش انگیزی کی اہمیت نہیں ہوتی۔"

کوئی شہادت نہیں کہ ۲۴۔ مئی کی کانفرنس میں مرکز سے استصواب کا کوئی ذکر کیا گیا تھا

مسٹر دولتانہ نے اپنے تحریری بیان میں ایک علیحدہ عنوان "کوششیں" کے ماتحت اپنی ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو ان کی حکومت نے مرکز سے فیصلہ حاصل کرنے کے لئے کیں۔ ان کے قول کے مطابق پہلی کوشش نتھیا گلی میں کی گئی جہاں انہوں نے خواجہ شہاب الدین۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سردار عبد الرب نشتر اور دوسرے حضرات سے ملاقات کی اور ان میں سے پہلے دو حضرات نے انہیں یقین دلایا کہ وہ مسٹر دولتانہ کا نقطۂ نگاہ وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کر دینگے جن کیمیں کا نتیجہ ۲۴۔ مئی ۱۹۵۲ء کے فیصلے کی شکل میں نکلا نہ اسکی فائل میں اور نہ کسی دوسری فائل میں اس امر کے آثار نظر آتے ہیں کہ اس ملاقات میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس معاملے پر غور کرنا مرکز کا کام ہے۔ مسٹر غیاث الدین اور مسٹر انور علی نے جو طویل بیانات دئے ان کے دوران میں ان میں سے کسی سے بھی یہ سوال نہیں کیا گیا کہ آیا ایسا کوئی موضوع زیر بحث آیا تھا لہٰذا احرار کو خلاف قانون جماعت قرار نہ دینے کی جو دلیل پیش کی گئی ہے اس میں کوئی جان نہیں۔

اس کے بعد مسٹر دولتانہ نے یہ ظاہر کرنیکی کوشش کی کہ ان دونوں پولیس افسروں نے بھی اپنی یادداشتوں

کے باوجود اور کانفرنس کے دوسرے حاضرین نے بھی میرے ساتھ ایک فیصلے پر اتفاق کر لیا پوری صورت حال پر بحث کی گئی اور آخر میں ہر شخص کی رائے یہی تھی کہ کسی سیاسی پارٹی کو خلاف قانون قرار دینا بے حد شدید اقدام ہے اور مجلس احرار چونکہ ایک آل پاکستان انجمن ہے۔ اس لئے ایسا اقدام آل پاکستان سطح ہی پر کیا جا سکتا ہے اور پھر اسکو اُن لوگوں کے سامنے حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرنی ہوگی جو حکومت کے نظام جمہوریت کو قبول کر چکے ہیں۔

اوّل۔ چونکہ حکومت پنجاب کے وکیل نے یہ دعویٰ پیش کیا تھا کہ مسٹر دولتانہ عام طور پر اپنے افسروں کے مشورے پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا کرتے ہیں اسلئے مسٹر دولتانہ کے وکیل کا یہ کام تھا کہ جس جس بڑے موقع پر پالیسی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی ان کے متعلق افسروں سے بطور خاص سوال کر لیتے۔ آخر مسٹر انور علی سے یہ کیوں نہ پوچھا گیا کہ جس تجویز نے ان کو ۱۹۵۱ء سے مبتلائے پریشانی کر رکھا تھا اس کی قطع و برید پر وہ کیونکر متفق ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بیان کیا کہ "میری یادداشت مورخہ ۲۰۔ مئی ۱۹۵۲ء کی بنیاد پر حکومت نے شدید اقدام کیا اور جلسوں کا امتناع کر دیا"۔ لیکن ایک اور

ڈی آئی جی کا خیال ہے کہ پرانی حکومت میں زیادہ مضبوط اقدام کیا گیا ہوتا

مقام پر انہوں نے یہ بھی کہا کہ "اگر احرار میری تجویز (۱۹۵۱ء) کے مطابق خلاف قانون جماعت قرار دے دیئے گئے ہوتے تو ۱۹۵۲ء میں کچھ بھی نہ ہوا ہوتا"۔ پھر کہا کہ "۱۹۵۲ء میں میں نے پھر یہی تجویز کی اور اس وقت بھی اس کے اختیار کرنے کی گنجائش ابھی موجود تھی"۔ آگے چل کر کہا کہ "جو کارروائی میری تجویز پر وقتاً فوقتاً کی جاتی تھی اس سے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ پرانی حکومت میں یہی اقدام زیادہ سریع اور موثر ہوتا"۔ جب تک یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ میاں انور علی نے دو متضاد پوزیشنوں کو (یعنی ۱۹۵۱ء کی اپنی پوزیشن اور مسٹر دولتانہ کی بالکل مختلف پوزیشن) تطابق دینے کی کوشش کی ہے معمولی تعبیر کے رو سے تو ہم شدید اقدام کو محض تقابلی مفہوم ہی دے سکتے ہیں۔ یعنی اقدام ان واقعات کے مقابلے میں شدید تھا جو اس وقت تک رونما ہو رہے تھے یہ بھی ممکن ہے کہ مسٹر انور علی اپنے ذہن میں فقرے کے پہلے حصّے پر زور دیتے ہوں (یعنی: "میری یادداشت کی بنیاد پر") کیونکہ ابتداً انہیں صرف یہی فکر ہونی چاہیئے تھی کہ اپنی پوزیشن کو صاف کریں اور بتائیں کہ انہوں نے صورت حالات کی سنگینی سے حکومت کو مطلع کرنے میں کس حد تک کوشش کی تھی۔

کسی انجمن کو خلاف قانون جماعت قرار دینا ہرگز جمہوریت کے منافی نہیں

دوم۔ ہمیں ان دو باتوں کے درمیان کوئی منطقی یا سببی تعلق نہیں معلوم ہوتا کہ (۱) احرار ایک آل پاکستان انجمن تھی۔ اور (۲) ان کے خلاف من حیث الجماعت جو اقدام کیا جائے گا اس کو "ان لوگوں کے سامنے حق بجانب ثابت کرنا پڑے گا۔ جو جمہوری نظام حکومت کو قبول کر چکے ہیں"۔ اگر احرار صرف صوبائی انجمن ہوتے تو کیا انہیں

خلاف قانون جماعت قرار دینا جمہوریت کے خلاف نہ ہوتا ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انکے جلسے ممنوع قرار دئے گئے جو چیز اس اقدام کی وجہ جواز تھی وہ زیادہ شدید کارروائی کے لئے بھی وجہ جواز ہو سکتی تھی اس سلسلے میں ایک ہی دلیل موزوں تھی کہ احرار نے کوئی ایسی سنگین حرکت نہ کی تھی کہ ان کو خلاف قانون جماعت قرار دینا حق بجانب ہوجاتا لیکن اس حالت میں مسٹر دولتانہ کو یہ کہنا پڑتا کہ ڈی آئی جی اور انسپکٹر جنرل "پیشنگویانہ یاسیّت" یا "یاس آمیز پیشنگوئی" کے عادی ہو چکے تھے ۔

احرار کے متعلق مسٹر انور علی کا اندازہ صحیح تھا

ہمارا نیک نیتی سے یقین ہے کہ مسٹر انور علی نے احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دینے کے اثر کے متعلق جو کچھ کہا اس سے ظاہر ہے کہ صورت حالات کے متعلق ان کا اندازہ بالکل صحیح تھا اگر یہ تدبیر مئی ۱۹۵۲ء میں اختیار کر لی جاتی" تو احرار علما سے مذہبی اپیل کرنے کے قابل نہ ہوتے اور جولائی ۱۹۵۲ء میں آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقد نہ ہوتی اور اگر علما بیچ میں نہ کود پڑے ہوتے تو احمدی نزاع کو دوسرے فرقہ دارانہ نزاعات سے (جن سے ہم واقف ہیں) مختلف حیثیت دینے کی نوبت نہ آتی ۔

۵ - جولائی ۱۹۵۲ء کے فیصلے

۲۸ - جون ۱۹۵۲ء کو یا اس کے لگ بھگ مسٹر دولتانہ مجلس اصول اساسی کے ایک اجلاس میں شریک ہونے کے لئے نتھیا گلی گئے ۔ "زمیندار" نے اپنی اشاعت مورخہ یکم جولائی میں یہ اطلاع شائع کی کہ مسٹر دولتانہ نے روانگی سے پہلے دو گھنٹے تک اپنے افسروں سے بات چیت کی ۔ حکومت پنجاب کے وکیل چودھری فضل الٰہی نے کہا کہ اس بات چیت کے دوران میں مسٹر دولتانہ نے اُن فیصلوں کے متعلق اپنے افسروں کو ہدایت دی تھی جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے اجلاس مجوزہ ۵ - جولائی میں ہونے والے تھے ۔ مسٹر دولتانہ کو یاد نہیں کہ آیا انہوں نے دو گھنٹے کی کوئی خاص گفتگو کی تھی لیکن تسلیم کیا کہ وہ یقیناً اپنے افسروں سے قریب باقاعدہ ملاقات کرتے رہتے تھے وہ یہ کہنے سے بھی قاصر ہیں کہ انہوں نے افسروں سے مجوزہ کانفرنس کے موضوع پر کوئی بات چیت کی تھی ۔

اس کانفرنس کی صدارت چیف سیکرٹری نے کی اور اس میں اضلاع کے مندوبین کے علاوہ انسپکٹر جنرل ڈی آئی جی سی آئی ڈی ہوم سیکرٹری اور ڈائرکٹر تعلقات عامہ بھی شریک ہوئے اس کانفرنس میں یہ فیصلے کئے گئے : (۱) احکام زیر دفعہ ۱۴۴ میں مقام جلسہ کا ذکر نہ کیا جائے (۲) اگر کوئی احراری یا کوئی احمدی کسی ایسے جلسے میں تقریر کرے جو اسکی جماعت نے منعقد نہ کیا ہو اور وہ تقریر قابل اقدام ہو ۔ تو اسکی رپورٹ حکومت کو بھیجی جائے لیکن اس اثنا میں اسکو گرفتار نہ کیا جائے (۳) جو جلسے مسجدوں کے باہر منعقد ہوں ان کو بھی منتشر نہ کیا جائے لیکن بعد میں احمدیوں اور احراریوں کے ممتاز لیڈروں کے خلاف (جیسی صورت ہو) مقدمات رجسٹر کر لئے جائیں ۔ . . . . . . (۵) آل مسلم پارٹیز کنونشن میں جو ۱۳ - جولائی ۱۹۵۲ء کو ہونے والی ہے کوئی مداخلت نہ کی جائے اگر وہ جلسہ جلسوں کے امتناع کی

خلاف ورزی ہی میں ہو رہا ہو) اگر اس کنونشن میں شریک ہونے والے علماء سے رابطہ پیدا کر کے انہیں تشدد کی مذمت کرنے پر آمادہ کر لیا جائے تو غالباً یہ امر مفید ثابت ہوگا۔

ہم نے دیکھا ہے کہ ۵۔جون کی ہدایات کو ۲۸۔جون کی چھٹی سے کس طرح نرم کر دیا گیا کہ اگر کبھی امتناعی حکم کی خلاف ورزی کی جائے تو صرف احراریوں اور ان میں سے بھی صرف ممتاز احراریوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ مقصد یہ تھا کہ احراریوں کو عوام سے الگ تھلگ کر دیا جائے یہ واضح تھا کہ اس سے ممتاز احراری عام احراریوں سے بھی الگ تھلگ ہو جائیں گے اس سے ممتاز لیڈر یہ محسوس کریں گے کہ شہادت کا تاج صرف انہی کے لئے مخصوص ہے اس سے قبل ۱۹۔جون کو مسجدوں کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا وہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا یہ درست ہے کہ مسجد کے اندر کسی جلسے کو منتشر کرنا اور وہیں لوگوں کو گرفتار کرنا حماقت ہوتا لیکن یہ کہنا کہ مسجدوں کے باہر منعقد ہونے والے جلسوں میں بھی

۵۔جولائی کے فیصلوں سے نظم حکومت کے ذمہ داروں کا موقف کمزور ہو گیا

خلل اندازی نہ کی جائے تا آنکہ ان کا زہر پھیل جائے امتناعی احکام کو تماشا بنا دینا ہے۔ امتناعی حکم کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز منع کی گئی ہے وہ واقع نہ ہو اگر یہ اعلان ہو کہ فلاں وقت اور فلاں مقام پر ایک جلسہ ہوگا۔ اور وہ ممنوع کیا جا چکا ہو تو سیدھا سادہ کام یہ ہے کہ انعقاد جلسہ سے دو گھنٹے پہلے اس مقام پر نصف درجن پولیس کے آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دی جائے۔ تاکہ لوگ جمع نہ ہو سکیں اور یہ ایسی بات نہیں جو ہم پہلے پہل تجویز کر رہے ہوں لیکن حکومت کا قول یہ ہے کہ ان لوگوں کو موج اڑانے دو۔ اور اگر جلسے میں پانچ آدمی تقریریں کریں اور ان میں صرف ایک احراری ہو اور وہ کوئی ممتاز لیڈر نہ ہو۔ تو کسی کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہ کرو چنانچہ اب تک اس حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔

۵۔جولائی کے فیصلوں کا اثر

مرکزی حکومت کو اطلاع دی گئی کہ تمام احمدیوں اور احراریوں کے جلسے ممنوع قرار دے دئے گئے ہیں۔ کراچی میں اس کو ایک بہت بڑا فیصلہ سمجھا جاتا ہے چنانچہ حکومت اس پر اطمینان کا اظہار کرتی ہے لیکن اس کے اثر پر غور کیجئے۔ جلسوں کو انعقاد کی اجازت دی جاتی ہے غیر احراریوں اور غیر احمدیوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ جیسی مکروہ و ناپاک باتیں چاہیں کریں۔ یہاں تک کہ معمولی قانون بھی ان کے خلاف معطل کر دیا جاتا ہے کیونکہ اگر معمولی قانون سے کام لیا جائے تو الگ تھلگ کرنے کی پالیسی کو نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا مولوی محمد علی خطیب جامع مسجد سرگودھا اور ان کا اشتہاری تختہ بدستور آزاد رہیگا (”لیاقت علیخاں نے سفر امریکہ کے دوران میں روپے کا ناجائز استعمال کیا“) کیونکہ مولوی صاحب اب احراری نہیں رہے اور آخر ممتاز احراریوں میں سے کتنے آدمیوں کا آپ پتہ دے سکتے ہیں۔ ان میں سے چھ تو گوجرانوالہ میں ہیں۔ دو سرگودھا میں اور ان میں آپ دو اور فالتو آدمیوں کا بھی اضافہ کر لیجئے۔ آگے چل کر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سیالکوٹ کے منظور احمد جنجنبی ”احمدیوں کے خلاف راسخ العقیدہ کارکن“ کہا جاتا تھا اور بشیر احمد خطیب جامع مسجد پسرور جو نہایت

متعصب احراری اور مقامی مجلس احرار کا صدر تھا اور جس کو ۱۹۳۲ء کی تحریک میں ایک ماہ قید کی سزا ملی تھی۔ ان دونوں کے خلاف نومبر ۱۹۵۲ء میں گگو شاہ کے میلے پر خطرناک تقریریں کرنے کی پاداش میں کوئی مقدمہ نہ چلایا گیا۔ اس لئے کہ یہ "چھوٹے لوگ" تھے۔

مزید تنقید

پھر اگر کوئی بدقسمت النسان احراری بھی ہے اور ممتاز احراری بھی لہٰذا قانونی کارروائی سے بچ نہیں سکتا تو اس کو بچانے کے لئے دوسرا فیصلہ موجود ہے جس کا منشا یہ ہے کہ اگر کوئی احراری یا احمدی کسی ایسے جلسے میں تقریر کرے جو اسکی جماعت نے منعقد نہ کیا ہو تو اسکے خلاف حکومت کی منظوری حاصل کئے بغیر کوئی کارروائی نہ کرنی چاہئے۔ یہ معلوم ہے کہ جب احراریوں کے جلسے ممنوع قرار دئے گئے اور انہوں نے مسجدوں میں جلسے کرنے کی چال اختیار کر لی تو کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ کانفرنس کے حاضرین میں سے کسی افسر کو یہ خیال نہیں آیا کہ احراری اپنے جلسوں کا انتظام کسی دوسرے کے سپرد کر دینگے۔ اور ان کو "دفاع کانفرنس" یا کسی اور نام سے موسوم کر دینگے نہیں اسکا تصور نہیں کیا جاسکتا لہٰذا جس دنیا میں زیادہ تر باتوں کا انحصار دلیل اور استنباط پر ہوتا ہے وہ ضرور یہی نتیجہ نکالے گی کہ حکم امتناعی کے پردے میں اصل مقصد یہ تھا کہ جلسے منعقد کرنے اور ان میں تقریر کرنے کی زیادہ سے زیادہ امکانی گنجائش مہیا کر دی جائے۔ اگر اس فیصلے کا یہ مقصد نہ بھی تھا تو اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے اثر اسی قسم کا پیدا کیا۔ ہوم سیکرٹری اپنی یادداشت مورخہ ۷۔ جولائی کے ذریعے سے ان فیصلوں کو مسٹر دولتانہ کے علم میں لائے وہ یادداشت درج ذیل ہے:۔

کیا افسروں نے پیشتر مسٹر دولتانہ سے مشورہ کیا تھا

"آنریبل چیف منسٹر بغرض اطلاع ملاحظہ فرمائیں: کانفرنس میں جو فیصلے ہوئے وہ اس عام پالیسی کے مطابق تھے جسکی منظوری کا فیصلہ چیف منسٹر صاحب فرما چکے ہیں لہٰذا یہ فیصلے بامید منظوری عزت مآب چیف منسٹر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو بھیج دئے گئے ہیں تاکہ وقت کا حرج نہ ہو۔"

"وہ کیا پالیسی تھی جسکی منظوری کا فیصلہ عزت مآب وزیر اعلیٰ کر چکے تھے"؟ مسٹر دولتانہ کا بیان ہے کہ یہ پالیسی ۲۵۔ مئی کی کانفرنس میں وضع کی گئی تھی اور "اس پالیسی کے متعلق عام دفتری معمول کے مطابق میں نے ضرور افسران متعلقہ سے بات چیت کی ہوگی" چودھری فضل الٰہی نے کہا ہے کہ اس پالیسی پر مسٹر دولتانہ کے نتھیا گلی روانہ ہونے سے قبل "دو گھنٹے کی ملاقات میں" گفتگو ہوئی تھی مسٹر دولتانہ کے بیان میں چودھری صاحب کے اس بیان کی کوئی خاص تردید نہیں کی گئی لیکن اگر اشارہ ۲۵۔ مئی کی پالیسی کی چٹھی کی طرف ہے تو ایسے دو زائد فیصلے کیوں کئے گئے۔ جنھوں نے اصلاً سابقہ فیصلے کے اثر کو معدوم کر دیا؟ مسٹر دولتانہ ان دونوں چٹھیوں کو متضاد نہیں سمجھتے"۔ ۵۔ جون کی چٹھی میں صرف جلسوں کے امتناع کا حکم دیا گیا ہے لیکن اُن کو جبراً منتشر کر دینے کی ہدایت نہیں دی گئی" لیکن ۵۔ جون کی چٹھی کے الفاظ ملاحظہ ہوں: "احتیاط سے غور و خوض کرنے کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ امن و سکون عامہ کے عمومی مفاد کے پیش نظر نہ احراریوں اور نہ احمدیوں کو یہ اجازت ہوگی کہ کسی نام اور کسی پردے میں بھی عام جلسے منعقد کریں۔ لہٰذا جہاں کوئی جماعت کسی جلسۂ عام کے

انعقاد کا ارادہ کرے آپ زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری انسدادی کارروائی کریں"؟ ہمارے نزدیک یہ کہنا بالکل غیر منطقیانہ ہے کہ اگرچہ مقصد یہی تھا کہ جلسہ کسی طرح بھی کوئی صورت اختیار نہ کر سکے لیکن اگر پولیس پانچ یا دس منٹ دیر سے پہنچی ہو اور اس دوران میں پانچ یا دس آدمی جمع ہو چکے ہوں تو ان کو منتشر نہ کیا جائے گا۔ اگر اس منطق کو اس مرحلے سے ذرا آگے لے جائیں تو پولیس لوگوں کو جمع ہونے سے روک سکتی ہے اگر اجلاس کے منتظمین پانچ یا دس افراد یا ان اشخاص کے ساتھ جو پولیس کے پہنچنے سے پہلے جمع ہو گئے تھے۔ جلسہ جاری رکھنے پر مطمئن ہوں تو انکو اسکی اجازت دے دی جائے۔

لیکن پھر ۵۔ جولائی کی کانفرنس کا انعقاد کیوں ضروری محسوس ہوا؟ ۱۹۔ جون کے پیغام اور ۲۸۔ جون کی چھٹی میں مساجد کا معاملہ بھی شامل تھا۔ اور اصولاً پالیسی کی چھٹی مورخہ ۵۔ جون اب تک برقرار تھی۔ یہیں "چیف منسٹر کی منظوری کا فیصلہ" کے الفاظ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا اشارہ بطور خاص چیف منسٹر کی طرف ہے کسی سابقہ پالیسی کی چھٹی کی طرف نہیں۔

یہ بات بھی افسوسناک ہے۔ کہ "دو گھنٹے کی بات چیت" کے متعلق مسٹر غیاث الدین احمد اور مسٹر انور علی میں سے کسی سے بھی استفسار نہ کیا جا سکا۔ یہاں قصور صرف مسٹر یعقوب علی کا نہیں۔ جنھیں ہوم سیکرٹری کی یادداشت کے واضح معانی کی تاویل کرنی تھی۔ بلکہ چودھری فضل الٰہی کا بھی ہے جو اس ملاقات کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ معانی بالکل صاف ہیں۔ اور حالات و کوائف (جیسا ہم نے بتایا ہے) بالکل ان کے حق میں ہیں۔

۱۹۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو احرار کی یقین دہانی

یہ زمانہ احرار کی اس مشہور "یقین دہانی" پر ختم ہوا جس میں امن قائم رکھنے کا وعدہ تو کیا لیکن اچھے برتاؤ کا عہد نہ کیا۔ اس یقین دہانی پر بحث کرنے سے پہلے ہم ڈی آئی جی کی اس یادداشت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یقین دہانی سے ذرا پہلے احراریوں کے ذہن کی کیا کیفیت تھی۔ اس وقت تک ماسٹر تاج الدین اور بعض دیگر اشخاص احکام امتناعی کی خلاف ورزی کے لئے گرفتار کئے جا چکے تھے۔ مسٹر انور علی نے ۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو ایک یادداشت لکھی جس کا مفاد یہ ہے:۔

۵۔ جولائی۔ ڈی آئی جی سے دو احراری لیڈروں کی ملاقات وہ انکی معافی کی تجویز کو تسلیم نہیں کرتے

"مولانا اختر علی خاں آج مولوی غلام غوث کی معیت میں جو نئے صدر احرار ہیں۔ مجھ سے ملنے آئے ان کا مقصد یہ یقین دلانا تھا کہ ایسی تقریریں نہیں کی جائیں گی جن سے نقض امن کا احتمال ہو بشرطیکہ گرفتار شدہ لوگ رہا کر دئے جائیں اور دفعہ ۱۴۴ واپس لے لی جائے۔ میں نے انکو وہ فیصلے سمجھائے جو آج افسروں کی گفت و شنید کے بعد ہوئے تھے اور ان کو بتایا کہ اگر وہ دونوں لیڈر معافی مانگ لیں تو حکومت رہائی وغیرہ کے مطالبات پر غور کر سکے گی مولوی غلام غوث

مسٹر انور علی کے اندیشے

سرحدی نے کہا کہ ان کے اور انکی جماعت کے خیال میں ماسٹر تاج الدین نے کوئی قصور نہیں کیا اگر ایک دفعہ احرار پر ثابت ہو جائے کہ حکومت اپنے فیصلوں کو نہیں بدلے گی تو وہ تصفیہ پر زیادہ مائل ہو جائیں گے۔

۷۔ جولائی ۱۹۵۲ء: مسٹر قربان علی خاں ــــ "میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں کہ حکومت قانون و انتظام کو بحال رکھنے کے متعلق اپنے فیصلوں کو بدلے۔ جو چیز بھی بدنظمی پیدا کرنے والی ہو اسکی سرکوبی پوری سختی سے ہونی چاہیئے۔"

ہوم سیکرٹری نے اس یادداشت کو اپنی یہ رائے لکھکر اوپر بھیجدیا کہ احراریوں کو احساس ہو گیا ہے کہ وہ جمہور عوام سے الگ تھلگ کئے جا رہے ہیں۔ مسٹر دولتانہ نے ۸ جولائی کو اس یادداشت پر مختصر دستخط ثبت کر دیئے

احرار نے حکومت کی اس کوشش کو شکست دے دی کہ احرار عوام سے منقطع ہو جائیں

ہوم سیکرٹری کے اس فقرے کو پڑھکر کہ اب احراری انقطاع کی حکمت عملی کے اثر کو محسوس کر رہے ہیں ہم کو یاد آ گیا کہ حکومت نے بھی ان کی حالت انقطاع سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور اس علیحدگی اور انقطاع کی مصیبت سے نجات دلانے کے لئے انہیں موقع دے دیا کہ وہ تمام جماعتوں کے علما کو گفتگو کی دعوت دے دیں۔ اس امر کا پہلے سے اندازہ کر لینا چاہیئے تھا کہ احرار اس حلقے کو توڑنے کی کھلی کوشش کر رہے ہیں جو حکومت نے اپنے خیال میں ان کے گرد کھینچا ہے ایسی حالت میں انہیں یہ اجازت دے دینا کہ قانون کی خلاف ورزی کر کے کنونشن منعقد کر لیں۔ کوئی عقل کی بات نہ تھی۔ قانون تو گدھا ہوتا ہی ہے لیکن انہوں نے اسکو مذاق بھی بنا دیا۔ اس کنونشن کو انعقاد کا موقع دینے سے بظاہر یہ مقصود تھا کہ اس کے اجلاس سے پہلے علما سے مل کر انہیں تشدد کے خلاف تلقین کرنے پر آمادہ کر لیا جائے میر نور احمد ڈائرکٹر تعلقات عامہ کا بیان ہے کہ چیف منسٹر نے انہیں مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری۔ مولانا

علما سے ملاقات کی پالیسی ناکام ہوئی مگر اسکی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی

محمد بخش مسلم اور مولانا غلام مرشد سے ملنے کی بطور خاص ہدایت کی ان کو سمجھایا گیا کہ "کنونشن کی فضا میں" یہ علما "مطلوبہ خطوط پر" فیصلہ حاصل نہ کر سکینگے لیکن اگر چیف منسٹر کو فیصلے سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی ہونی چاہیئے تھی تو یہ نہایت عجیب بات ہے کہ اسکے بعد نہ تو میر نور احمد نے انکو یہ اطلاع دی کہ علما سے ملاقات ناکام رہی ہے اور نہ چیف منسٹر ہی نے میر نور احمد سے پوچھا کہ علما سے بات چیت کا کیا نتیجہ نکلا آخر ان مولویوں نے شورش میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اور اکتوبر ۱۹۵۲ء میں محکمہ اسلامیات نے ان سرگرمیوں کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کر کے انہیں اُجرت پر لکچر دینے کے لئے منتخب کر لیا۔

مسٹر دولتانہ کا بیان ہے کہ انکی یہ پالیسی نہ تھی کہ علما کو اس کنونشن میں شریک ہونے کا موقع دیا جائے (یہ فیصلہ ۵۔ جولائی کو افسروں کی کانفرنس میں کیا گیا تھا) لیکن جب مسٹر دولتانہ نے فائل نمبر

۹۴(۲) ۱۶ ملاحظہ کیا تو مان گئے کہ انہوں نے ۵۔جولائی کو ذیل کی یادداشت لکھی تھی: "اگر ڈی پی آر۔ یا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس کنونشن میں شرکت کا ارادہ کرنے والوں سے ملاقات کریں اور انہیں تشدد اور خلاف ورزی قانون کی مذمت پر آمادہ کر لیں تو یہ کنونشن حکومت کے نقطۂ نگاہ سے حقیقتہً مفید ثابت ہو سکتی ہے۔"

لیکن کنونشن کی بابت یہ ریمارک اس لئے کئے گئے کہ ہوم سیکرٹری کی یادداشت میں "منقطع کرنے" کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے ہمیں یہ احساس ہوا کہ یہ دونوں موقف متضاد ہیں۔ بہر حال جو امید باندھی گئی تھی اگر وہ نیک نیتی پر مبنی تھی تو ہمیں اسکے خلاف کوئی خاص اعتراض نہیں اس معاملے میں دیانت داری کے ساتھ دو رائیں بھی ممکن ہیں۔

اب پھر اس ملاقات کی طرف آئیے۔ جو مولانا اختر علیخاں اور مولوی غلام غوث سرحدی نے ڈی آئی جی سے کی اس سے ظاہر ہے کہ احراری معافی مانگنے پر آمادہ نہ تھے اور خود اپنی شرائط پر حکومت سے احکام امتناعی اور مقدمات کی واپسی کے خواہاں تھے وہ تقریریں تو کرتے رہیں گے لیکن وہ ایسی نہ ہونگی جن سے نقص امن کا احتمال ہو گویا یہ اعتراف کر لیا گیا کہ اب تک جو تقریریں ہوتی رہی ہیں وہ ایسی ہی تھیں علاوہ بریں ڈی آئی جی کی یادداشت میں ایک اندیشے کا سراغ ملتا ہے کہ مبادا حکومت اپنے فیصلوں کو تبدیل کر دے اور مسٹر قربان علی خاں انکو یقین دلاتے ہیں کہ حکومت قانون و انتظام کے قیام کے فیصلوں کو تبدیل نہیں کریگی لیکن مسٹر انور علی کا اندیشہ جلد ہی صحیح ثابت ہو گیا ہم فی الحال احرار کے ساتھ سمجھوتے کا ذکر نہیں کر رہے ہیں۔ ہم ۱۴۔ اور ۱۵ جولائی کو گوجرانوالہ میں مقدمات کی واپسی کے متعلق سوچ رہے ہیں جب مسٹر دولتانہ سے ان کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو محض ایک اصطلاحی فیصلہ تھا جو افسروں نے ان دو احراری لیڈروں کے متعلق کیا تھا جو اسی قسم کے الزامات کی بنا پر سرگودھا میں سزایاب ہو چکے تھے۔ اوّل اگر کوئی شخص دغا بازی کی ایک واردات سرگودھا میں اور دوسری گوجرانوالہ میں کرے تو گوجرانوالہ کے مقدمے کو واپس لینا کوئی اصطلاحی فیصلہ نہ ہوگا اور اس کے لئے کوئی جواز بھی نہیں۔ اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایسی احمقانہ تجویز پیش کرے تو اس پر واضح کر دینا چاہئیے کہ یہ احمقانہ تجویز ہے۔ دوم۔ یہ فیصلہ چھ اشخاص کے متعلق تھا جن میں سے صرف دو سرگودھا میں سزایاب ہوئے تھے جب یہ امر مسٹر دولتانہ کے علم میں لایا گیا تو انہوں نے کہا مجھے یاد نہیں کہ میں افسروں کی کانفرنس مورخہ ۱۵۔جولائی میں جہاں یہ فیصلہ کیا گیا شریک ہوا تھا کیونکہ اس میں پالیسی کا کوئی سوال نہ تھا پھر ان کی توجہ ہوم سیکرٹری کی مندرجہ ذیل یادداشت مورخہ ۱۸۔جولائی کی طرف مبذول کرائی گئی:۔

گوجرانوالہ کے مقدمات واپس لے لئے گئے ۱۵۔جولائی ۱۹۵۲ء میاں انور علی کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے

واپسی حق بجانب نہیں تھی

"گوجرانوالہ کا مقدمہ کل واپس لے لیا گیا۔ میں نے ۱۵۔ کو عزت مآب چیف منسٹر سے ملاقات کے فوراً بعد ڈپٹی کمشنر کو طلب کیا۔ جب وہ ۱۶۔ کو مجھ سے ملنے آئے تو میں نے انکو حکومت کا فیصلہ بتا دیا"

یہ دیکھکر مسٹر دولتانہ نے کہا کہ میں نے ضرور واپسی مقدمہ سے اتفاق کیا ہوگا "میرا خیال یہ ہے کہ یہ اشخاص دفعہ ۱۴۴ کے خلاف محض ایک جلسے میں شریک ہونے کی وجہ سے گرفتار کئے گئے تھے اور چونکہ شہر میں بہت زیادہ شورش تھی اسلئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گوجرانوالہ نے ہوم سیکرٹری سے بات چیت کی ہوگی"

اگر یہ جواب صحیح ہو جب بھی مسٹر انور علی کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہو گیا کہ مبادا حکومت اپنے فیصلوں کو بدل دے لیکن یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ ہم نے اس رُوداد کے حصہ دوم میں دیکھا ہے کہ گوجرانوالہ سے کوئی تجویز موصول نہیں ہوئی تھی۔

عُلما کی کنونشن منعقدہ ۱۳۔ جولائی کا اثر مضر ہوا (بقول انسپکٹر جنرل)

عین اسی دن جب مقدمے کو واپس لینے کا فیصلہ ہوا مسٹر قربان علی خاں نے یادداشت لکھی کہ علما کے کنونشن کا اثر عوام پر نہایت مُضر ہوا ہے احراریوں نے مذہبی قضیوں پر ان کے جذبات کو بھڑکا کر اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے اب حکومت اور احرار کے درمیان دَوڑ ہو رہی ہے حکومت کو چاہیئے کہ مستعد رہے اور کسی قسم کی سُستی و غفلت کو روا نہ رکھے ہوم سیکرٹری نے بھی اسی قسم کی تحریر لکھی اور مسٹر دولتانہ نے یہ فائل ۱۶۔ جولائی کو دیکھی۔ حکومت کے وکیل نے ان سے سوال کیا کہ ان یادداشتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسروں کے خیالات صورت حالات کے متعلق نہایت زوردار تھے کیا ان سے آگاہ ہونے کے بعد بھی مسٹر دولتانہ اسی پر اصرار کریں گے کہ مقدمہ واپس لینے کا فیصلہ افسروں کا تھا اور اُن کا نہ تھا؟ اس سوال کا جواب حسب ذیل تھا:۔ "یہ فائل میرے پاس محض اطلاع کے لئے بھیجی گئی تھی۔ واپسی کے سوال کا اس سے کچھ واسطہ نہ تھا" اس کے بعد ان کو بتایا گیا کہ اسی فائل میں انسپکٹر جنرل کی ایک یادداشت مورخہ ۱۶۔ جولائی موجود ہے کہ اس موضوع پر ایک دن قبل کے اجلاس میں گفتگو ہوئی تھی دوسرے الفاظ میں مسٹر قربان علی خاں کی یادداشت مورخہ ۱۴۔ جولائی کے موضوع پر چیف منسٹر سے ۱۸۔ جولائی کے اجلاس میں بات چیت ہوئی تھی اس پر مسٹر دولتانہ نے مان لیا کہ وہ ضرور اس اجلاس میں موجود ہوں گے تاہم پہلے سوال کا جواب نہیں ملا جس کا منشا یہ تھا کہ ایسے پُرزور خیالات رکھنے والے افسر مقدمے کی واپسی سے اتفاق نہ کر سکتے تھے اس بات پر یقین کرنا غیر ممکن ہے کہ مسٹر قربان علی خاں کاغذ پر تو اپنی بے چینی کا اظہار کریں کہ احراریوں نے کنونشن منعقد کر کے اپنی چال میں فتح پائی ہے اور حکومت کو تنبیہ کریں کہ وہ مستعد رہے اور کسی قسم کی سُستی و غفلت کو روا نہ رکھے لیکن جب کانفرنس میں بیٹھیں تو مسٹر دولتانہ کو مقدمات واپس لینے کا مشورہ دیں کیونکہ ایک تو لوگ بہت مضطرب ہو رہے ہیں دوسرے ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ

انہوں نے ایک حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔ آخر جمہوری نظام حکومت میں حکومت کا حکم اس ناگفتہ شرط کے ماتحت ہونا چاہئے کہ اسکی تعمیل سے عوام کے قلوب میں اضطراب پیدا نہ ہو ہمارا مطلب یہ ہے کہ مسٹر قربان علی خاں کو ایک پولیس افسر کی حیثیت میں یہ تشویش نہ ہو سکتی تھی کہ "ان لوگوں کے سامنے جنھوں نے ایک نظام جمہوری قبول کیا ہے"۔ مقدمے کو حق بجانب ثابت کریں۔ لہٰذا افسروں کی کانفرنس میں یہ کارنامہ ضرور مسٹر دولتانہ ہی نے انجام دیا ہوگا۔

احراریوں کی یقین دہانی ۱۹ جولائی ۱۹۵۲ء

اب ہم حقیقی "یقین دہانی" کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یہ یقین دہانی سب کو معلوم ہے۔ بعض احراری لیڈروں نے ایک بیان میں تشدد کی مذمت کرنے کا وعدہ کیا اور مسٹر دولتانہ نے اس کے بدلے میں حکم امتناعی اور مقدمات دونوں کو واپس لینے کا ذمہ لے لیا مسٹر دولتانہ کے بیان کے مطابق احراریوں نے ان سے کہا تھا کہ ان کا مقصد قانون شکنی نہیں ہے لیکن تحریک ان کا جزو ایمان ہے اور ان کا حق ہے کہ اس مسئلے کو آئینی طریقے سے جمہور کے سامنے پیش کریں اسکے ساتھ ہی انہوں نے اس ایقان کا اظہار بھی کیا کہ احمدیوں کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرنا ان کا سیاسی اور مذہبی فریضہ ہے یہ معلوم تھا کہ جلسوں کی پابندی اُٹھ جانے کے بعد وہ اپنی معمولی سرگرمیاں جاری رکھیں گے۔ لیکن قانون و انتظام کو نقصان پہنچانے والا کوئی فعل نہ کرینگے ہمارے ایک سوال کے جواب میں مسٹر دولتانہ نے بتایا کہ میرے نزدیک تو اس مفاہمت میں یہ چیز مضمر تھی کہ ماضی میں احراریوں کی عام سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ متشددانہ افعال بھی شامل تھے لیکن مجھے اسکا یقین نہیں کہ احراری بھی اس موقف کا اعتراف کرتے تھے۔ یہ مطلب ہے ہماری اس رائے کا جو ہم اوپر ظاہر کر چکے ہیں کہ احراریوں نے امن قائم رکھنے کا وعدہ تو کیا لیکن اپنے برتاؤ کو ٹھیک رکھنے کا وعدہ نہیں کیا۔

یقین دہانی کو قبول کر لینا قابل اعتراض نہیں

احراریوں نے اپنے بیان میں کہا کہ نہ انہوں نے ماضی میں قانون و انتظام کے خلاف کسی فعل کا ارتکاب کیا ہے اور نہ آئندہ کسی ایسے فعل کا ارادہ رکھتے ہیں اس سے ہمیں وہ واقعہ یاد آجاتا ہے کہ مسٹر انور علی نے معافی پر اصرار کیا اور مولوی غلام غوث سرحدی نے کہا کہ معافی مانگنے کی کوئی وجہ ہی موجود نہیں۔ لیکن ہمارا یہ ارادہ نہیں کہ اس مفاہمت کے مالہٗ و ما علیہ پر کچھ وقت صرف کریں مسٹر انور علی کے سوا باقی تمام افسر مختلف وجوہ سے اس امر پر متفق ہیں کہ ایسے حالات میں یہی راہِ عمل بہترین تھی مسٹر قربان علی خاں نے کہا کہ اس مفاہمت سے احرار کے خلاف اس نکتہ چینی کا دروازہ کھل گیا کہ وہ جیل کو پسند نہیں کرتے حافظ عبدالمجید نے کہا کہ حکومت کے ایک افسر کی حیثیت سے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ انہیں ایک اور موقع دیا جائے۔ مسٹر غیاث الدین احمد نے لکھا کہ ایک مذہبی مسئلے پر امتناعی حکم زیادہ مدت تک موثر نہیں رہ سکتا انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ مسٹر دولتانہ پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر چکے تھے لیکن جب یہ فیصلہ افسروں کے اجلاس میں پیش کیا گیا تو ہر شخص نے اس سے اتفاق کیا۔

مسٹر انور علی نے کہا کہ یہ مقدمات ہی کے دباؤ کا اثر ہے کہ احرار ایک وفد کی صورت میں چیف منسٹر کے

پاس پہنچے اور ایک تحریری اقرار نامہ لکھ دیا کہ آیندہ شورش کو قانونی حدود کے اندر رکھیں گے یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے وعدے کے پابند نہ رہے اگر مجھ سے مشورہ کیا جاتا تو میں یہ کہتا کہ ان مقدمات کو واپس لینا اور ان اشخاص کو رہا کرنا مضرت رساں ہوگا کیونکہ میں احراریوں کو جانتا ہوں وہ ہرگز قابل اعتبار نہیں ہیں۔"

۳۔ یقین دہانی کے بعد

"احراریوں کے اقرار نامے کے بعد کچھ مدت خاموشی رہی اور اسکے بعد پھر قابل اعتراض تقریروں کا سیلاب پھوٹ پڑا اس اقدام کو ختم کرنے کے بعد اگر ان تمام لوگوں کے خلاف جو قابل اعتراض تقریریں کر رہے تھے مقدمے دائر کر دئے جاتے یا ان میں سے بعض کے خلاف انسدادی کارروائی کی جاتی" تو اس شورش میں مزید تخفیف ہو سکتی تھی"۔ مسٹر غیاث الدین احمد

ہوم سیکرٹری کے یہ ریمارک ذہن میں رکھکر اب ہم ان واقعات کا جائزہ لیں گے جو ۱۹۔جولائی کے بعد پیش آئے اور اس فیصلے کی نیک نیتی کا امتحان کرینگے جس کے ماتحت احراریوں کو "آئینی طریق پر" شورش کے جاری رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

قصور میں ۲۵۔جولائی ۱۹۵۲ء

(۱) ۲۵۔جولائی ۱۹۵۲ء کو قصور میں نماز جمعہ کے بعد ایک جلسہ ہوا جس کے مقررین میں ایک عالم شاہ بدمعاش بھی تھا۔ اس کے بعد چھاتی پیٹتا ہوا ایک جلوس نکالا گیا ایک آدمی نعرہ لگاتا تھا "ظفر اللہ کنجر" اور دوسرے آواز ملا کر چلاتے تھے "ہائے ہائے" اس کے بعد عالم شاہ اور ایک اور آدمی کہیں سے ایک گدھی لے آئے۔ جس پر "بیگم ظفر اللہ" کے الفاظ لکھدیئے پھر اس پر ایک آدمی کو سوار کرایا اور اس آدمی کو جوتوں کا ہار پہنا دیا یہ شخص "ٹاپ ہیٹ" سر پر رکھے ہوئے تھا جس پر "غلام احمد مرزا" لکھا تھا یہ جلوس احمدیوں کے ایک کارخانے کے سامنے رکا اور پندرہ منٹ تک یہ نعرے لگاتا رہا "مرزائیت کو تباہ کر دو" "ظفر اللہ کنجر" "ظفر اللہ کتا" "ظفر اللہ سوئر"۔

ڈی آئی جی اور آئی جی کے ریمارک

مسٹر انور علی نے قصور کے متعلق روزنامچے پر لکھا کہ مذہبی جنونیوں اور مولویوں نے طاقت پکڑ لی ہے اور غنڈے بھی میدان میں کود پڑے ہیں مسٹر قربان علی خاں نے کہا "قانون کی خلاف ورزی کی شورشوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے ایک لاقانونی سے دوسری لاقانونی پیدا ہوتی ہے اور اگر کوئی انسدادی طریقہ ممکن نہ ہو تو اس کا انجام انقلاب ہے یہ تاریخ کا سبق ہے جس میں تاخیر ہو سکتی ہے لیکن اسکو جھٹلایا نہیں جا سکتا"۔

چیف منسٹر نے اس یادداشت پر حسب معمول ۱۲۔اگست ۱۹۵۲ء کو اپنے مختصر دستخط کر دیئے۔

لیکن کارروائی کچھ نہیں

لیکن اب ہم ان یادداشتوں پر زیادہ اعتبار نہیں کرینگے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر سے محض خوش بیانی منظور تھی ان میں یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ احراریوں

کے وعدے کا کیا ہوا؟" ان بیانات میں کسی اقدام کی تجویز نہیں کی جاتی اور مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ جہاں کسی اقدام کی تجویز نہ کی گئی ہو وہاں میں کوئی اقدام نہیں کرتا البتہ کوئی صریح بے عملی نظر آ جائے تو وہ اور بات ہے اور موجودہ معاملہ یقیناً" صریح نہ تھا۔ علاوہ بریں ہمیں ان یادداشتوں پر اس لئے اعتبار نہیں رہا کہ اگر مسٹر دولتانہ ایک کانفرنس منعقد کر لیں گے تو یہ تمام حضرات اُن کے اس خیال سے متفق ہو جائیں گے کہ یہ مسئلے کا کوئی جمہوری حل نہیں ہے یہ صحیح ہے کہ وزیر خارجہ کی سخت توہین کی گئی ہے لیکن جب تک مرکزی حکومت یہ فیصلہ نہ کرے کہ مطالبات قبول کئے جائیں گے یا رد کر دئے جائیں گے۔ کوئی کیونکر کہہ سکتا ہے کہ گالی دینا جائز تھا یا ناجائز!

ڈی آئی جی کہتے ہیں کہ تحریک بازاری آدمیوں کے ہاتھ میں ہے

۳۱- جولائی کو ڈی آئی جی نے اپنے ذرائع سے حاصل شدہ ایک رپورٹ پر یہ یادداشت قلمبند کی: "اب یہ تحریک ایک راستے پر قائم نہیں بلکہ بازاری آدمیوں کے ہاتھوں میں پڑ چکی ہے .... میں احراریوں کی نیک نیتی پر یقین نہیں کرتا۔" اب تک ہم نے یہ نہ سنا تھا کہ حکومت تحریک کو "راستے پر لگانے" کی خواہاں ہے لہٰذا ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کس راستے پر لگانا مقصود تھا لیکن اس لفظ کو ذہن میں رکھئے گا۔

وزیر خارجہ کے جنازے

(۲) ۲۴- جولائی ۱۹۵۲ء کو ڈی آئی جی نے حکومت کو اطلاع دی کہ صوبے کے کئی مقامات پر وزیر خارجہ کے جنازے نکالے گئے ہیں اور یہ حرکت زیر دفعہ ۲۳- پبلک سیفٹی ایکٹ جرم ہے۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ سیفٹی ایکٹ استعمال نہ کیا جائے بلکہ اب چیف منسٹر خود احراری لیڈروں سے بات چیت کر کے انہیں عہد و پیمان کی پابندی کی طرف متوجہ کریں کیونکہ نچلی سطح پر اُن سے مذاکرات ناکام رہ چکے ہیں چیف منسٹر نے اس یادداشت پر ۳۰- جولائی کو دستخط کر دئے اس عدالت میں بیان دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں نے کوئی کارروائی نہیں کی کیونکہ مجھے ہوم سیکرٹری سے اتفاق تھا لیکن ہوم سیکرٹری نے جب

سیفٹی ایکٹ کے ماتحت کارروائی منظور نہ کی گئی

سیفٹی ایکٹ کے استعمال کو رد کیا تو بظاہر ان کے ذہن میں دفعہ ۳ کا تصور تھا جس میں آدمی کو سماعت مقدمہ کے بغیر ہی نظر بند کر دیا جاتا ہے لیکن دفعہ ۲۳- کی حیثیت بالکل تعزیرات پاکستان کی دفعات کے برابر ہے اور اگر مسٹر دولتانہ ہوم سیکرٹری سے متفق تھے (کیونکہ ان کے تصور میں بھی دفعہ ۳ ہی تھی) تو حقیقت میں یہ قانون شکنوں کی خوش قسمتی تھی کہ چیف سیکرٹری اور ہوم سیکرٹری دونوں کا تصور دفعہ ۲۳ کے متعلق وہ تھا جو دفعہ ۳ کا تھا لیکن خود مسٹر دولتانہ نے بھی تسلیم کیا کہ ۱۹۵۲ء میں ۹۹- اشخاص سیفٹی ایکٹ کے ماتحت پابند کئے گئے تھے اور ان میں سے ایک بھی سیاسی نظر بند نہ تھا۔

کیونکہ سیفٹی ایکٹ ایک ہوّا ہے

انہوں نے یہ بھی کہا کہ باقی رہی ہوم سیکرٹری کی یہ سفارش کہ احرار کو وعدہ یاد دلایا جائے تو میرے نزدیک ان سے کوئی مزید ملاقات ضروری نہ تھی کیونکہ میں نے ۲۷-۲۸- جولائی کو مسلم لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے احراری لیڈروں سے واضح طور

لیکن کوئی تنبیہ بھی نہ کی گئی

پر کہہ دیا تھا کہ انہیں اپنے قول و قرار پر قائم رہنا چاہیئے۔ اسکو کہتے ہیں صفائی کا جواب پیش کرنا! لیکن ایسے جواب پریس کانفرنسوں میں دیئے جاتے ہیں قانونی عدالتوں میں نہیں۔

(۳) ۲۶-۲۷ جولائی کو مسلم لیگ کے دفتر کے باہر بڑے پیمانے پر مظاہرے کیئے گئے۔ ایک جلسہ منعقد کیا گیا موٹر کاروں پر پتھر پھینکے گئے۔ پولیس کے بہت سے ملازم اور بعض ممبر بھی زخمی ہوئے بیگم جی اے خاں بھی مجروح ہوئیں اور وہاں سے اسی حالت میں لے جائی گئیں۔ پولیس کو اشک آور گیس اور لاٹھیوں کا استعمال کرنا پڑا۔

ایک قابل اعتراض کتابچہ ۴-اگست ۱۹۵۲ء

(۴) ۴-اگست ۱۹۵۲ء کو ایک کتابچہ سی آئی ڈی کے علم میں آیا جس کا نام تھا "مرزائیوں کے ناپاک عزائم" اسکے پہلے باب میں جو بنیادی عقائد سے متعلق ہے مرزا غلام احمد کی تحریروں کے اقتباسات پیش کیئے گئے ہیں اقتباسات کا نمونہ یہ ہے: "جو لوگ مجھے نہیں مانتے ان میں مرد سُور اور عورتیں کُتیاں ہیں۔" دوسرے باب میں بیان کیا گیا ہے کہ احمدیوں کو اب تک یقین ہے کہ پاکستان پھر ہندوستان سے متحد ہو جائے گا۔ تیسرے باب میں یہ لکھا ہے کہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں قیام پاکستان کے مخالف ہیں۔

کوئی کارروائی نہیں

اس کتابچے کا مقصد یا کم از کم اثر صاف طور پر یہی تھا کہ لوگوں کے دو طبقوں کے درمیان تلخی اور منافرت کے جذبات کو اُکسایا اور قائم رکھا جائے ڈی آئی جی کے اسسٹنٹ نے اس کتابچے کی ضبطی کی سفارش کی۔ ڈی آئی جی نے ۳ ستمبر ۱۹۵۲ء کو کہا کہ پہلے پہل جب یہ کتابچہ ہمارے علم میں آیا ہے اس پر ایک مہینا گزر چکا ہے اس لیئے اس مرحلے پر اسکو ضبط کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہ ہوگا ہوم سیکرٹری نے اتفاق کیا اور چیف منسٹر نے دستخط کر دیئے۔

ملتان: ۲۱-اگست ۵۲ء ڈی آئی جی نے تنبیہ کی تجویز پیش کی

(۵) ۲۱-اگست ۱۹۵۲ء کو ملتان میں ایک جلسہ ہوا جس میں سرکاری ملازموں کو خاص طور پر سخت سُست کہا گیا ڈی آئی جی نے صورت حالات کی روزانہ رپورٹ پر لکھا کہ سرکاری افسروں کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں ہوں تو ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں لیڈروں کو اسلیئے رہا کیا گیا تھا کہ وہ اپنے رفقا کو حدود قانون کے اندر رہنے کی تلقین کریں اب ان کو طلب کر کے تنبیہ کرنی چاہیئے۔ یہ لوگ اگرچہ سخت ناقابل اعتبار ہیں لیکن پھر بھی یہی مناسب ہے کہ انکو دوبارہ تنبیہ کی جائے ان لوگوں نے ۲۹-اگست کو ملتان میں "یوم شہدا" منانے کے لیئے جس جلسے کا ارادہ کر رکھا ہے وہ ممنوع قرار دیا جانا چاہیئے اور چونکہ ملتان فائرنگ کے متعلق جسٹس کیانی کی رپورٹ کے مطابق سرکاری ملازم بے قصور ثابت ہو چکے ہیں۔ اسلیئے اگر اب بھی احراری انکو نکتہ چینی کا نشانہ بنا رہے ہیں تو ان کا یہ عمل شائستگی کے تمام اصولوں کے خلاف ہے۔

صرف مقامی لیڈروں کو تنبیہ

چیف منسٹر نے جلسے کو ممنوع قرار دینے کی تجویز کو منظور نہ کیا لیکن اس تنبیہ کے اجرا سے اتفاق کیا کہ احراریوں کو اس جلسے میں صحیح برتاؤ کا

ثبوت دینا چاہئے ڈپٹی سیکرٹری ہوم نے تجویز کی تھی کہ اس تنبیہ کے اجرا کے متعلق پریس نوٹ جاری کئے جائیں۔ یہ تجویز بھی منظور نہ کی گئی صرف مقامی لیڈروں کو کمشنر کی وساطت سے تنبیہ کی گئی ہوم سیکرٹری نے دریافت کیا کہ آیا احراری لیڈروں کو ایک عام تنبیہ بھی کر دی جائے (یہاں تک تو ہوم سیکرٹری کی تحریر ٹائپ میں تھی) اسکے بعد انہوں نے اپنے قلم سے یہ سطر بھی لکھ دی کہ "میرے نزدیک ہمیں کچھ مدت اور انتظار کرنا چاہئے"

عام تنبیہ غیر ضروری ہے

چیف منسٹر نے ۳۱۔ اگست کو کہا کہ "میرے نزدیک اس مرحلے پر ہمیں عام تنبیہ کی فکر نہ کرنی چاہئے"۔

کسی دوسری جگہ ہم نے ملتان فائرنگ کا ذکر کیا ہے یہ واقعہ ۱۹۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو پیش آیا جب تھانہ کٹ کو ایک خطرناک ہجوم نے گھیر لیا تھا۔ گولی چلنے کے واقعہ کے بعد حکومت نے عوام کے احساسات کی رعایت کرکے ایک عدالتی تحقیقات کا حکم دیا جس کو ہم میں سے ایک نے انجام دیا اس تحقیقات میں قرار دیا گیا۔ کہ

یوم شہدا کا جلسہ گویا عدالتی فیصلے کے خلاف احتجاج تھا

پولیس نے اپنی حفاظت میں گولی چلائی لہذا یہ جائز تھی جن صحیح الخیال لوگوں کے نزدیک عدالتی غیر جانب داری اور عدالتی فیصلے کا وقار واجب الاحترام ہے ان کو اس فیصلے سے مطمئن ہو جانا چاہئے تھا۔ اس کے بعد "یوم شہدا" منانے کا مطلب یہ تھا کہ عدالت کے فیصلے کو ناپسند کیا گیا ہے اور مسٹر انور علی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ یہ امر شائستگی کے خلاف تھا لیکن حکومت پر اس نکتے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ توہین عدالت کا قانون شائستگی کا قانون ہے۔

پاکستانی فوج پر نکتہ چینی اگست ۱۹۵۲ء

(۶) صوبائی حکومت نے اگست ۱۹۵۲ء کے نصف اول کے متعلق مرکزی حکومت کو پانزدہ روزہ رپورٹ بھیجی جس میں یہ بیان کیا کہ سرگودھا کے ایک شخص مولوی احمد خان نے سمندری میں تقریر کرتے ہوئے پاکستانی فوج پر نکتہ چینی کی کیونکہ اس کے افسر رقص اور شراب کے عادی ہیں اور حکومت کے بڑے افسروں پر رشوت ستانی اور خویش پروری کا الزام لگایا۔ مرکزی حکومت قدرتی طور پر مضطرب ہوئی اس نے رپورٹ طلب کی اور سوال کیا کہ صوبائی حکومت نے اس تقریر کے متعلق کیا کارروائی کی ہے اس کا جواب ملا کہ اگرچہ مولوی نے فوج کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعمال کئے ہیں اور اسکے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ وہ بالکل گمنام آدمی ہے اسلئے اسکو نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔

مقرر گمنام آدمی ہے

(۷) ۲۵۔ اگست ۱۹۵۲ء کو منٹگمری میں احراریوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں مولوی محمد علی جالندھری نے سامعین کو بتایا کہ حکومت نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے۔ اور دفعہ ۱۴۴ واپس لے لی "مرزائیت کوئی مذہب نہیں بلکہ تماشا ہے اور مرزائی چوہڑوں چماروں سے بدتر ہیں اس میں شک نہیں کہ احرار قیام پاکستان کے سخت مخالف تھے لیکن اب وہ وفادار ہیں۔ مگر احمدی اب بھی ہندوستان سے دوبارہ مل جانے کی کوشش کر رہے ہیں مرزا قادیان بدچلن آدمی تھا اسکی خوشامد کے معاملات کے سلسلے میں کئی آدمی قتل کر دیئے گئے۔ مرزائیوں کو اپنے پانی کے نلوں سے پانی بھرنے کی اجازت نہ دینی چاہئے اور ان کے ساتھ ایک تانگے میں بھی نہیں بیٹھنا چاہئے۔ ان کو

مجبور کرنا چاہیئے کہ دوبارہ اسلام قبول کرلیں یہ صحیح ہے کہ وزیراعظم کے اعلان مورخہ ۱۴۔اگست کے جواب میں چودھری محمد ظفراللہ خاں کا جواب قابل اعتراض تھا لیکن چونکہ اسکے چوتڑوں پہ بڑے زور کی لات پڑی تھی اسلئے اس کا چیخنا قدرتی تھا"

چیف منسٹر نے یہ رپورٹ ۱۸ستمبر ۱۹۵۲ء کو ملاحظہ فرمائی۔

کوئی تجویز نہیں۔کوئی کارروائی نہیں

شاید اس مرحلے پر بھی کسی عام تنبیہہ کی فکر کرنا "غیرضروری تھا لیکن قانون ملکی کہاں تھا؟ کیا اس تقریر پر کسی شخص کو شرم نہ آئی؟!

لیکن ہم بھول رہے ہیں حکومت کوئی کارروائی کر ہی نہ سکتی تھی کیونکہ سی آئی ڈی یا ہوم سیکرٹری نے کسی کارروائی کی تجویز نہ کی تھی۔ باقی رہا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کا معاملہ تو غالباً یہ لوگ اپنے دوسرے فرائض میں مصروف ہوں گے۔جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کے قول کے مطابق تقسیم کے بعد ان کے سپرد ہوئے ہیں۔ یعنی "بڑے آدمیوں کے استقبال کے انتظامات"!

احرار کا خیال "یقین دہانی" کے متعلق کیا تھا

اب ہمیں کم از کم یہ تو معلوم ہوگیا ہے کہ "یقین دہانی" کے متعلق خود احرار کا خیال کیا تھا مولوی محمد علی کے قول کے مطابق حکومت مجبور ہو کر مغلوب ہوگئی تھی۔مولانا داؤد غزنوی نے اسی خیال کو دوسری شکل میں پیش کیا اور لائل پور کنونشن مورخہ ۲٦-۲۸ ستمبر میں یہ کہا کہ حکم امتناعی کی منسوخی اس امر کی شہادت ہے کہ حکومت جھک گئی ہے۔

(۸) ۲۹۔اگست ۱۹۵۲ء کو مسٹر نذیر احمد ایس پی (B) نے اس اطلاع پر کہ ماسٹر تاج الدین اور شیخ حسام الدین کے گروہوں میں پھوٹ پڑ گئی ہے یہ رائے قلمبند کی کہ مجلس عمل میں انحطاط اور افتراق کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں مسٹر دولتانہ نے اس اطلاع کو "دلچسپ" قرار دیا اور سی آئی ڈی کو حکم دیا۔کہ "ان تازہ حالات اور ان کے امکانی نتائج" سے مرکزی حکومت کو مطلع کردے اس رپورٹ میں ایس پی (B) نے ایک فتوے کا بھی ذکر کیا۔ جو ۱۴۔اکتوبر ۱۹۵۲ء کو مولانا داؤد غزنوی اور تین دیگر علما نے دیا تھا کہ جو لوگ مرزا غلام احمد کو نبی یا مجدد یا امام مانتے ہیں وہ مرتد اور بروئے اسلام واجب القتل ہیں اور جو حکومت اس حکم شرعی پر عمل نہیں کرتی اس سے مقاطعہ کرنا چاہیئے تجویز یہ تھی کہ اس فتوے کی تصدیق اُن علما سے کرائی جائے جو کراچی سے آنیوالے تھے لیکن نہ آسکے۔مسٹر نذیر احمد نے جھنگ۔ لائل پور، ٹلمبہ، منٹگمری۔ برانہ اور رنگو (کیمبل پور) کی قابل اعتراض تقریروں کا بھی ذکر کیا۔

کیا شورش مر رہی تھی؟

اور آخر میں یہ رائے ظاہر کی کہ تحریک تو عملاً مر رہی ہے لیکن لیڈر اپنی اہمیت کو قائم رکھنے اور روپیہ جمع کرنے کی غرض سے اسکو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

حالانکہ رپورٹ کے مندرجات میں اس خوش فکری کی کوئی گنجایش نہ تھی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر نذیر احمد احراریوں کے دو گروہوں میں پھوٹ پڑنے کی اطلاع سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔لیکن دوسرے پولیس افسر ایسے بے فکر نہ تھے۔مسٹر انور علی نے اس یادداشت پر لکھا کہ گو احراری لیڈر کسی قدر تھکے ہوئے ہیں لیکن جلسوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آئی اور ابھی شورش میں خطرناک امکانات پوشیدہ ہیں انسپکٹر جنرل نے ۲۳۔اکتوبر ۱۹۵۲ء کو کہا: "اگر اس شورش

کو اسی طرح جاری رہنے دیا گیا۔ تو ایک دن ہمیں نہایت شدید و سنگین گڑبڑ سے دو چار ہونا پڑے گا اور ممکن ہے اس پر

انسپکٹر جنرل نے گورنر کو ایک یادداشت بھیجی ۔ چیف منسٹر کو نہیں

قابو پانا دشوار ہو جائے"۔ آپ نے یہ یادداشت ہوم سیکرٹری یا چیف منسٹر کو نہیں بلکہ گورنر کو ارسال کی۔ مسٹر انور علی کا بیان ہے کہ یہ طریقہ غالباً اس یقین کی بنا پر اختیار کیا گیا کہ شاید گورنر اس معاملے سے مرکزی حکومت کو مطلع کر دے چونکہ ہمارا احساس بھی یہی تھا اسی لیے ہم نے مسٹر انور علی سے یہ سوال کیا تھا مسٹر قربان علی خان کے نزدیک صورت حالات کے تدارک کے لیے صوبائی حکومت کا رویہ اطمینان بخش نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہ غیر معمولی طریقہ اختیار کر کے گورنر کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ گو وزارتی نقطہ نگاہ سے خاں صاحب کا یہ رویہ قابل اعتراض تھا۔

لیکن گورنر صاحب نے اس یادداشت پر محض اپنے مختصر دستخط ثبت کر دئے۔

صورت حالات کا جائزہ اگست ستمبر ۱۹۵۲ء

(۹) ۱۹۔ اگست اور ۹ ستمبر ۱۹۵۲ء کے درمیان ایس پی (B) نے صورت حالات اور احمدیوں پر اس کے اثر کا جائزہ ان الفاظ میں لیا:۔

جولائی ۱۹۵۲ء کے بعد سے زیادہ تر ملتان۔ لائل پور اور منٹگمری اور جھنگ میں ایک سو چودہ احمدی احمدیت سے تائب ہو چکے ہیں۔

گیارہ احمدیوں نے بظاہر مع اہل و عیال اپنے مسکن ترک کر دئے ہیں۔

۲۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو وزیر آباد میونسپلٹی نے دو احمدی مدرسوں اور چار احمدی استانیوں کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس حکم کو معطل کر دیا ہے۔

مسٹر انور علی نے رائے دی کہ "پاکستان ازمنہ وسطیٰ کی طرف واپس چلا گیا ہے" مسٹر دولتانہ نے اس یادداشت پر ۱۷ ستمبر ۱۹۵۲ء کو دستخط کر دئے احمدیوں کے اس تبدیل مذہب سے ہمیں یاد آیا کہ جب سردار عبد الرب نشتر اس صوبے کے گورنر تھے تو ان کا خیال تھا کہ احمدی جماعت کی طرف سے نقض امن کا کوئی خطرہ نہیں کیونکہ یہ جماعت بہت قلیل التعداد ہے۔ اس لئے اگر احمدیوں کے خلاف تہدید آمیز تقریریں کی جائیں تو نقض امن کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ ہر وقت اپنے عقیدے سے دست بردار ہو سکتے ہیں۔

ڈسکہ کی تقریریں ۲۱ ستمبر ۱۹۵۲ء

(۱۰) ۲۱-۲۲ ستمبر کو ڈسکہ میں آل مسلم پارٹیز کنونشن ہوئی۔ اس میں جو تقریریں کی گئیں ان کے قابل اعتراض حصوں کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

مرزا غلام نبی جانباز: مرزا غلام احمد ایک مداری تھا۔ بدبخت انسان۔ عورت باز۔

مولوی محمد علی جالندھری: کشمیر کی لاینحل صورت کا ذمہ دار چودھری محمد ظفر اللہ خاں ہے۔

صاحبزادہ فیض الحسن: جس طرح گیدڑ کو خربوزوں کی اور بلی کو گوشت کی رکھوالی سپرد نہیں کی جا سکتی اسی طرح ظفر اللہ اور دوسرے مرزائیوں پر پاکستان کے متعلق اعتبار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ غدار ہیں۔ مرزا غلام احمد "واہیات" تھا۔ اس نے گرگٹ کو

مٹی سمجھ کر اس سے استنجا کر لیا تھا۔ اگر مرزائی اسلام قبول نہیں کرینگے تو ہم اس مقصد کے حصول کے لئے انتہائی کوشش کرینگے اور ایسی صورت میں یہ لوگ زمینوں، کارخانوں اور بنگلوں کی الاٹمنٹیں کھو بیٹھیں گے۔ بلکہ ربوہ بھی انکے قبضے سے نکل جائیگا۔

سید مظفر علی شاہ شمسی: مرزائی ذلیل اور کمینے ہیں انکو عزت آبرو کا کوئی احساس نہیں۔

شیخ حسام الدین: ظفر اللہ ہندوستان سے خفیہ تعلقات رکھتا ہے اس نے فلسطین کو اس لئے تقسیم کرایا ہے کہ یہودیوں کو ایک گڑھ مل جائے اور اینگلو امریکن بلاک کے مقاصد پورے ہوں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری: احمدی جاسوسوں کی ٹولی ہیں (اسکے علاوہ ملکہ وکٹوریا اور موجودہ ملکہ کے متعلق بھی کچھ کہا گیا۔ جس کو نقل نہ کرنا بہتر ہے)

(۱۱) "احسان" مورخہ ۲۵۔ اگست ۱۹۵۲ء نے مرزا غلام احمد کو "بناسپتی نبی" بتایا۔ اور جانباز پاکٹ بک کا اشتہار دیا جس میں مذہبی نزاع کے متعلق ناشائستہ باتیں درج ہیں۔ یہ پاکٹ بک پہلے پہل فروری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی۔

شیخوپورہ کی تقریریں ۹۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء

(۱۲) ۹۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو شیخوپورہ میں اور ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو چوہڑ کانا میں کنونشن کے اجلاس ہوئے۔

صاحبزادہ فیض الحسن: جو شخص نبوت کی عزت اور دختر رسولؐ کی ناموس کو نہیں بچا سکتا وہ پاکستان کو بھی نہیں بچا سکتا۔ مرزا غلام احمد نے کہا ہے کہ جو لوگ اسکو نہیں مانتے وہ بازاری عورتوں کی اولاد ہیں۔ پنجاب کے وزیروں نے اور خواجہ ناظم الدین نے بھی اسکو نہیں مانا انہیں چاہئے کہ اگر وہ ناموس رسولؐ کی حفاظت نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی ماؤں کی ناموس کی حفاظت تو کریں۔

مرزا غلام نبی جانباز: یہ تنکوں کا سانپ۔ ظفر اللہ بیرونی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ "ہم آئینی طریق پر لڑ رہے ہیں۔ میری کتابیں خریدو"

سید مظفر علی شاہ شمسی: خواجہ ناظم الدین اور دولتانہ کو چاہئے کہ لوگوں کے جذبات کا احترام کریں عوام ہی نے انکو کرسیاں دی ہیں اور وہی ان کرسیوں کو ان سے چھین سکتے ہیں۔ گورداسپور ظفر اللہ کی وجہ سے جاتا رہا مرزائی اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے اپنی لڑکیاں تک پیش کرنے میں تامل نہیں کرتے۔

شیخ حسام الدین: ظفر اللہ جاسوس اور غدار ہے۔

چیف منسٹر نے دستخط کر دئے

ڈی۔ آئی۔ جی نے اس یادداشت پر لکھا کہ احرار برابر نفرت و حقارت پھیلانے میں مصروف ہیں۔ چیف منسٹر نے اس پر دستخط کر دئے!

۲۴- دسمبر ۱۹۵۲ء کا فیصلہ

اس عنوان کے ماتحت ہم متعدد ایسی فائیلوں پر متوجہ ہوں گے جو چیف منسٹر کے ساتھ گفتگو کی خاطر معرض التوا میں پڑی تھیں اور جن کے متعلق آخر ۲۴- دسمبر کو ایک فیصلہ کیا گیا :-

راولپنڈی کی تقریریں ۱۵- نومبر ۱۹۵۲ء

(الف) ۱۵-۱۶-۱۵- نومبر ۱۹۵۲ء کو راولپنڈی میں کنونشن ہوئی تقریروں کے مندرجہ ذیل اقتباسات توجہ کے قابل ہیں :-

(۱) ماسٹر تاج الدین: ظفر اللہ کے برطرف ہونے کے بعد اس پر ایک مقدمہ دائر کیا جائے گا جس میں اسے مملکت اور اسلام کے خلاف سرگرمیوں کی جوابدہی کرنی ہو گی۔

(۲) قاضی احسان احمد: یہ کشمکش غدار اور وفادار یا سچ اور جھوٹ کے درمیان ہے .... آجکل کے دنوں میں سود اور نفع- رشوت اور فیس- جاسوس اور نبی مترادف الفاظ ہیں- اسلام کی حفاظت کے لئے تشدد جائز ہے اسلام کی تبلیغ کے لئے نہیں- مرزائی پھر ہندوستان میں شامل ہونے کے خواہاں ہیں۔

تشدد جائز ہے

محمد مسکین: مرزائیوں کو اپنے قبرستانوں میں دفن نہ ہونے دو۔

عبد اللہ شاہ: مرزائی ہتھیاروں کی ناجائز درآمد برآمد کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ مرزا غلام احمد دجال تھا جھوٹا نبی تھا۔

ماسٹر تاج الدین: (دوسرے دن) (کشمیر میں) متارکہ جنگ مرزائیوں کی چالوں سے ہوا تھا- دفعہ ۱۴۴ کا اطلاق مسجدوں پر انگریزی راج میں بھی نہ ہوا تھا اگر حکومت احمدیوں کو اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں ہوتی- تو ان سے مجلسی اور اقتصادی مقاطعہ کردو- ایک من- دس سیر چار چھٹانک گولی بارود ربوہ میں درآمد کی جا چکی ہے (کس قدر ٹھیک ٹھیک معلومات ہیں)

حافظ محمد سعید: گوجرانوالہ میں دکاندار مرزائیوں کے لئے الگ برتن رکھتے ہیں (مطلب یہ کہ تم بھی یہی کرو)

مولوی محمد علی جالندھری: مرزائی زندیق ہیں اور واجب القتل ہیں ہر مسلمان کو چاہیئے کہ مرزا غلام کے نام کے ساتھ لفظ "کذاب" شامل کر دیا کرے جو شخص کسی جھوٹے نبی کو قتل کر دے اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے

حکیم فضل کریم: مرزا شریف انسان نہ تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری: مرزا صاحب نے کہا ہے کہ ان کو خدا سے حمل ہو گیا گویا اس کے خدا نے زیر دفعہ ۳۷۷- تعزیرات پاکستان جرم کا ارتکاب کیا۔

جالندھری کے خلاف اقدام کی سفارش

۲۱- نومبر ۱۹۵۲ء کو ایس پی (سی آئی ڈی) نے رپورٹ کی کہ اب مولوی محمد علی جالندھری کے خلاف یا مقدمہ چلانا چاہئے یا اسے

نظر بند کر دینا چاہیئے۔ یہ امر جالندھری کے لئے باعث عزت تھا کیونکہ اسکی تقریریں خاص طور پر اچھی تھیں اور ان میں سے انتخاب کرنا بے حد مشکل تھا لیکن آخر "انتظام" کا پہلو منتخب کر لیا گیا اور "قانون" کا پہلو نظرانداز کر دیا گیا۔ بہرحال ڈی آئی جی نے ۲۵۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو لکھا کہ چیف منسٹر صاحب نے ہدایت کی ہے کہ وہ کراچی سے واپس آ کر ایک مجلس مذاکرہ میں بات چیت کر کے فیصلہ کرینگے کہ جنگجویانہ اور فرقہ پرستانہ تقریروں کا تدارک کیونکر کیا جائے۔

لائل پور کی تقریریں ۲۶ ستمبر ۵۲ء

(ب) ۲۶-۲۷ ستمبر کو لائل پور میں اور ۲۸ ستمبر کو سمندری میں کنونشن ہوئی :-

صاحبزادہ فیض الحسن : مرزا صاحب بیت چال چلن کے آدمی تھے اور اس قابل تھے کہ ان کے خلاف غنڈا ایکٹ کے ماتحت مقدمہ چلایا جاتا کیونکہ اس نے دختر رسول کی عصمت کی توہین کی تھی۔ اور ظفر اللہ دونوں غنڈے ہیں۔

شیخ حسام الدین : ظفر اللہ خبیث ہے اس پر مقدمہ چلانا چاہیئے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی وہی پرانی کہانی ملکہ وکٹوریا کے متعلق دہرائی اور ساتھ ہی یہ کہا کہ جنگ شاہی اور کہوٹہ کے ہوائی حادثوں کے ذمہ دار مرزائی ہیں۔

عطاء اللہ شاہ بخاری پر پابندی عاید کرنیکی سفارش

ان تقریروں پر ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ڈی آئی جی نے تجویز کی کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر کسی نہ کسی قسم کی پابندی عائد کرنا ضروری ہے۔ مثلاً اسکی نقل و حرکت کو ایک ضلع تک محدود کر دیا جائے یہ تقریریں قوم کو خراب کر رہی ہیں ہوم سیکرٹری نے کہا۔ وقت آ گیا ہے کہ حکومت پوری پوزیشن کا از سر نو جائزہ لے۔ تقریروں کا موضوع اور لہجہ نہایت شرانگیز ہے تجویز کی گئی کہ گفتگو کے لئے ایک اجلاس منعقد کیا جائے۔

(ج) ۳۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو مسجد گگو شاہ (سیالکوٹ) پر تقریریں : مولوی بشیر احمد اور قاضی منظور احمد نے کہا کہ مرزا غلام احمد کذاب اور دجال تھا اور احمدیوں سے مقاطعہ کرنا چاہیئے آخرالذکر نے یہ بھی کہا کہ اگر مسٹر دولتانہ مرزا صاحب کی مدد کو آئے گا تو اس کا استقبال بھی جوتوں سے کیا جائے گا۔ "اگر مرزا غلام احمد یہ کہہ دیتا کہ اس نے اپنا سر خواجہ ناظم الدین کی بیٹی کی گود میں رکھدیا تھا تو آپ اس کا نتیجہ دیکھ لیتے"۔ (اس میں مرزا غلام احمد کے اس رؤیا کی طرف اشارہ ہے جس میں مرزا صاحب نے دیکھا کہ ان کا سر دختر رسول کی گود میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس میں مرزا صاحب نے دختر رسول کا ذکر بالکل اسطرح کیا تھا جیسے کوئی اپنی ماں کا ذکر کرے)

۷۔ اکتوبر کی تقریریں : مولوی بشیر احمد نے ۱۹۳۵ء کی ایک کہانی سنائی کہ ایک شخص ڈاکٹر احسان علی نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی ایک سالی سے زنا بالجبر کیا۔ اس پر مرزا صاحب نے یہ سزا دی کہ سالی کے ہاتھ سے ڈاکٹر کو دس جوتے لگوائے۔ محبوب کے ہاتھوں کی ضربیں تو پھولوں کی طرح پڑتی ہیں اسلام میں زنا کی سزا

سنگساری ہے اگر ...... کے خاندان کی کسی عورت سے زنا بالجبر کیا جائے ....

مولوی کرامت علی نے کہا: مرزا غلام احمد کہتا ہے "اٹھو شتور و نماز پڑھو" یہ اس شخص کے اخلاق ہیں اگر خواجہ ناظم الدین سُنّی ہے تو مرزا غلام احمد کے قول کے مطابق وہ بھی بازاری عورتوں کی اولاد ہے اور اس کے گھر کی عورتیں کُتّیاں ہیں۔

اس جلسے میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس کا منشا یہ تھا: یہ جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ مرزائیوں کو ایک اقلیت قرار دے کیونکہ احمدی مرتد ہیں اور اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اسلام میں ان کو قتل کرنا جرم نہیں۔ اور ان کے جان و مال کی حفاظت مسلمانوں کا فریضہ نہیں۔ مرتد کی جان کی کوئی قیمت نہیں لیکن اسی حالت میں کہ مملکت اسلامی ہو۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مقدمہ چلانے کی سفارش کی

۱۸۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سیالکوٹ نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ایما پر اور ۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء کی پالیسی کی چھٹی کی تعمیل میں حکومت سے مذکورہ بالا تین مقررین کے خلاف مقدمات چلانے کی اجازت طلب کی۔ ایس پی (B) مسٹر نذیر احمد نے لکھا کہ منظور احمد احمدیوں کا کٹر مخالف ہے اور بشیر احمد ایک متعصب احراری جامع مسجد پسرور کا خطیب اور مقامی مجلس احرار کا صدر ہے تین دن بعد۔ ۲۱۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو مسٹر نذیر احمد نے لکھا کہ ان اشخاص کے خلاف مقدمہ چلانے سے سیالکوٹ میں "گڑبڑ" ہو گی جس پر مسٹر انور علی نے کہا کہ "ہم ان پھوٹ ڈالنے والوں کے خلاف مقدمات دائر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں گے جو اس موقع پر مملکت کے استحکام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

یہ کیس ۲۴۔ دسمبر ۱۹۵۲ء تک زیر تجویز رکھا گیا۔ اس دن چیف منسٹر اور ان کے افسروں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ "جہاں کوئی تقریر عام قانون کے خلاف ہو اس کے متعلق قانونی کارروائی کرنی چاہیئے"۔ ۳۔ جنوری ۱۹۵۳ء کو مسٹر

لیکن سفارش قبول نہ کی گئی کیونکہ وہ "چھوٹے آدمی" تھے

نذیر احمد نے یہ فیصلہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سیالکوٹ کو پہنچا دیا اور قطعاً اپنی ذمہ داری پر اس رائے کا اضافہ بھی کر دیا کہ میرے نزدیک یہ تینوں مولوی "چھوٹے آدمی" ہیں اور ان کے خلاف مقدمات چلانے سے کوئی مفید مقصد پورا نہ ہوگا۔ ہمارے نزدیک یہ طرز عمل بے مثال اور سخت قابل اعتراض تھا ممکن ہے سی آئی ڈی کے اس افسر نے یہ محسوس کیا ہو کہ جب اسکی حکومت نے بہت سے قانون شکنوں سے خدائی رواداری کا سلوک کیا ہے تو وہ خود بھی بعض سے اسی قسم کا سلوک کر سکتا ہے۔

(د) ۹ اور ۱۰ نومبر کی سیالکوٹ کنونشن: مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری: خواجہ ناظم الدین "اللہ لوک" ہے کھانے کا معاملہ علیحدہ ہے۔ بعض پہلوان صرف کھانے کے لئے ہوتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خواجہ صاحب ایک مرغی کھاتے ہیں۔ دو کھاتے ہیں۔ یا بیس کھاتے ہیں۔

صاحبزادہ فیض الحسن: میں مرزا صاحب کو دجّال اور کذاب کہوں گا۔ انہوں نے اُن لوگوں کو

سُور کی اولاد کہاہے جو انہیں نہیں مانتے۔ خواجہ ناظم الدین اور مسٹر دولتانہ بھی اس قبیل میں آتے ہیں۔
مولانا داؤد غزنوی: قادیان اور ننکانہ عنقریب کھلے شہر قرار پائیں گے ایک احدیوں کے حوالے کیا جائے گا اور دوسرا سکھوں کو دیا جائے گا یہ سب کچھ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کی کوششوں ہوگا اور ہمارے بے وقوف وزراء صرف دستخط کردینگے۔
ماسٹر تاج الدین: یہ چھ فٹ دو انچ لمبا مرتد۔ وزیر خارجہ پاکستان۔ منڈل اور ظفر اللہ خاں دونوں غیر مسلم ہیں دونوں کو قائد اعظم نے منتخب کیا تھا۔ منڈل تو بھاگ گیا اب معلوم نہیں ظفر اللہ کب بھاگے گا ظفر اللہ نے خود ہی اعلان کر دیا ہے کہ اگر اس نے استعفاء دے دیا تو وہ پاکستان کو چھوڑ کر باہر چلا جائے گا اسکو باہر جانے کی اجازت نہ دینی چاہیئے بلکہ اس پر مقدمہ چلانا چاہیئے۔
شیخ حسام الدین: انگریزوں نے جہاد کو ممنوع قرار دلوانے کے لئے مرزائیوں کو قائم کردیا یہ لوگ انگریزوں کے جاسوس ہیں دو احمدی افسر جن میں ایک میجر تھا اور دوسرا لفٹننٹ کرنل اٹک کے قریب اسلحہ کی ناجائز درآمد کرتے ہوئے پکڑے گئے لیکن پھر بھی گورمانی اور دولتانہ کو مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد کی اس بات پر یقین نہیں آتا کہ مرزائی ربوہ میں اسلحہ جمع کر رہے ہیں۔
(۷) ۱۹-۲۰- نومبر ۱۹۵۲ء کو شجاع آباد میں کانفرنس۔
مولوی غلام غوث ہزاروی: مرزا غلام احمد اپنی ٹانگیں اور رانیں عورتوں سے دبوایا کرتے تھے اور ان میں سے ایک عورت بھانو تھی وہ برہنہ عورتوں کو دیکھا کرتے تھے۔ اور ان کے بیٹے نے تسلیم کیا ہے کہ وہ شراب پیتے تھے (خدا جانے مولوی صاحب کو خاص طور پر بھانو کی فکر کیوں ہے)
مولوی محمد علی جالندھری: مرزا غلام احمد اپنی ماں کا لاڈلا تھا لیکن ساتھ ہی اُلّو کا پٹھا بھی تھا۔ ملک بدقسمت ہے جسکو خواجہ ناظم الدین جیسا وزیر اعظم ملا لیکن اس کی ماں خوش قسمت ہے جس کا بیٹا وزیر اعظم بن گیا۔
سید عطاء اللہ شاہ بخاری: مرزا محمود احمد کا باپ پاخانے میں مرا۔ اور میرا باپ اپنے گھر میں فوت ہوا۔ جب وہ پاخانے میں مرا تو اس نے دوسرے راستے سے قے کی۔ ملکہ وکٹوریا . . . . (وہی پرانی کہانی) مرزا صاحب نے کہا ہے کہ انہیں احساس ہوا کہ وہ عورت ہیں اور اللہ نے ان کے ساتھ جماع کیا ان کو دس مہینے حمل رہا۔ پھر درد ہوا۔ انہوں نے ایک درخت کو پکڑ لیا اور پھر وہ پیدا ہوگئے . . . .
وہ دن میں کئی کئی دفعہ پیشاب کرتے تھے۔

ڈی۔ آئی جی کا مشورہ ہے کہ قانون و انتظام کے دائرے میں یکطرفہ کارروائی نہ کرنی چاہیئے

ڈی آئی جی نے ۸۔ دسمبر ۱۹۵۲ء کو ان تقریروں کی ایک رپورٹ پر لکھا کہ مناسب تو یہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں پر مقدمات چلائے جائیں (احمدیوں پر بھی ؟) لیکن چونکہ مرکزی حکومت احرار کے متعلق اپنا رویہ واضح نہیں کرتی اور حکومت پنجاب یک طرفہ کارروائی نہیں کر سکتی اسلئے محض تنبیہ کافی ہے۔

ہمیں یہ پڑھکر بے حد تعجب ہوا۔ آخر قانون و انتظام کے معاملے میں "دوطرفہ کارروائی" کیونکر ہو سکتی ہے؟ ان مقدمات کے علاوہ جن کا ذکر (ا۔ب۔ج۔د اور ہ) میں آیا ہے۔ مندرجہ ذیل فائلیں بھی ۲۴ دسمبر کی کانفرنس میں پیش کی گئیں۔

احمدی واجب القتل ہیں

ا۔ کیمبلپور کے مولوی عبدالحنان کی تقریر کی فائل جس میں اس نے کہا کہ مرزائی واجب القتل ہیں۔ اور خواجہ ناظم الدین کافر۔ مرتد۔ احمق اور جاہل آدمی ہے۔

۲۔ اس پوسٹر کے متعلق فائل جس کا عنوان تھا "ذرا سوچیں تو ختم نبوت کا منکر کون ہے"۔ یہ پوسٹر احمدیوں نے اکتوبر ۱۹۵۲ء کے اوائل میں شائع کیا تھا اس کا مفاد یہ تھا کہ "اگر تمھارا ایمان ہے کہ یسوع مسیح ایک دن ظاہر ہو جائے گا تو پھر تمھارا ختم نبوت کے عقیدے سے کیا مطلب ہے ؟" ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ منٹگمری نے مقدمہ چلانے کی سفارش کی۔ لیکن ایس پی (B) اور ڈی آئی جی نے منظور نہ کیا۔ انسپکٹر جنرل نے بھی یہی خیال ظاہر کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ احمدیوں کو سمجھا دیا جائے کہ اپنے مفاد کی خاطر ہی بحث و نزاع کو دعوت نہ دیں۔

۲۴۔ دسمبر ۱۹۵۲ء کا فیصلہ

ہمیں معلوم نہیں کہ ان مقدمات پر کیا گفتگو ہوئی ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ ایک ایسی کانفرنس میں جس کے صدر وزیر شعبہ قانون و انتظام ہوں اور جس میں حکومت کے نہایت ذمہ دار افسر بھی شریک ہوں۔ سب سے پہلے یہ مسئلہ زیر بحث آنا چاہیئے تھا کہ احرار نے اپنی "یقین دہانی" کا ایفا نہیں کیا۔ بلاشبہ یہ سب افسر بھی ہماری ہی طرح اس بات کے قائل تھے کہ محولہ بالا تقریروں میں سے ہر ایک تقریر عام قانون کے خلاف تھی۔ جس میں ہم پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۳ کو بھی شامل سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں بھی عام عدالتی معمول کے مطابق سماعت مقدمہ کا حکم دیا گیا ہے۔

معمولی قانون کے استعمال کے متعلق کسی فیصلے کی ضرورت نہ تھی

جب فیصلہ صرف یہی ہونا تھا کہ جب کوئی تقریر عام قانون کے خلاف ہو تو مقرر کے خلاف مقدمہ دائر کیا جائے تو پھر وہ کیا چیز تھی جس پر خاص گفتگو کی ضرورت پیش آئی۔ سوائے اس کے کہ کوئی مزید کارروائی ضروری نہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ۲۴۔ دسمبر ۱۹۵۲ء تک عام اور معمولی قانون بھی معطل ہو رہا تھا؟ یا تو اسکا

مطلب یہی ہے یا یہ سمجھنا چاہئے کہ حقیقت میں کوئی فیصلہ ہی نہیں کیا گیا۔

لیکن اس تاریخ کے بعد بھی عام قانون بدستور معطل رہا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسٹر نذیر احمد ایس پی (B) نے خود اپنی مرضی سے گگو شاہ کے مقدمے میں قانون کو معطل کر دیا تھا انہوں نے آغاز اس عذر سے کیا کہ مقدمہ چلانے سے غیر ضروری گڑبڑ ہو گی اور ختم اس قول پر کیا کہ مقررین اسقدر چھوٹے آدمی ہیں کہ ان کے خلاف مقدمہ چلانا ہی فضول ہے تمام مقدمات میں ان دونوں میں سے ایک حالت ضرور پیدا ہو گی۔ یا تو مجرم ایک اہم آدمی ہوگا جس پر مقدمہ چلانے سے شورش میں اضافے کا خطرہ ہوگا اور یا وہ اتنا چھوٹا آدمی ہوگا کہ اسکے خلاف مقدمے کی ضرورت نہ ہو گی اور مسٹر نذیر احمد کی رائے دونوں صورتوں پر حاوی ہے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ جولائی میں گوجرانوالہ کے مقدمات اس لئے واپس لے لئے گئے کہ لوگ بہت پریشان و مضطرب ہو گئے تھے لیکن بصیرہ کے مست قلندر کا "رگڑا" (بانی احمدیت کے خلاف نہایت توہین انگیز اور دشنام آمیز کتابچہ) نظر انداز کر دیا گیا کیونکہ اگر اس پر مقدمہ دائر کیا جاتا تو مصنف کی شہرت ہو جاتی۔

مذہبی اور ذاتی عزت کی طرف سے بے پروائی

حکومت نے احراریوں سے یہ اقرار حاصل کیا کہ وہ احمدیوں کے جان مال اور آبرو کی حفاظت کریں گے حکومت نے خود احمدیوں کی جماعتی حیثیت سے مذہبی عزت اور اس جماعت کے بعض اہم افراد کی ذاتی عزت کی کوئی پروا نہ کی یہاں تک کہ اس نے وزیر اعظم کے سرکاری وقار کی بھی کوئی پروا نہ کی۔

"آزاد" مورخہ ۱۲۔ نومبر ۱۹۵۲ء

ہم کہہ چکے ہیں کہ ۲۴۔ دسمبر ۱۹۵۲ء کے بعد بھی عام قانون معطل رہا۔ مثال کے طور پر "آزاد" مورخہ ۱۲۔ نومبر ۱۹۵۲ء ملاحظہ ہو (احرار کا روزنامہ جسکے ایڈیٹر ماسٹر تاج الدین تھے)

ایک نہایت مکروہ افتتاحیہ

"آخر کب تک اس ملک میں ایک زانی۔ شرابی۔ غنڈے۔ بدمعاش۔ جعلساز۔ جھوٹے اور دجال کے متعلق نبی۔ مسیح موعود۔ احمد اور محمد کے نام ہمارے کانوں میں ڈالے جائیں گے اور کب تک ایک ایسی عورت کے لئے جو ننگ انسانیت ہے امت کی پاک اور باعصمت ماؤں کو انکی قبروں میں بے چین اور مضطرب کیا جائے گا؟" (یہ حوالہ مرزا غلام احمد اور ان کی اہلیہ کے متعلق ہے)

مرکزی حکومت سے احمدیوں کا احتجاج

منٹگمری کے احمدیوں کی ایک احتجاجی قرارداد پر حکومت پاکستان نے ۲۱۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو حکومت پنجاب کو توجہ دلائی پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے تحریر زیر بحث کا جائزہ لیا اور رپورٹ کی کہ وہ زیر دفعہ ۱۵۳۔ الف و ۲۹۵۔ الف تعزیرات پاکستان اور زیر دفعہ ۲۱۔ پبلک سیفٹی ایکٹ قابل اقدام ہے۔ ایس پی (B) نے ۲۲۔ دسمبر کو یہ رپورٹ کی کہ احمدیوں کے خلاف توہین آمیز مضامین لکھنا ایڈیٹر "آزاد" کا روزانہ معمول ہے۔ ۲۴۔ دسمبر کے فیصلے سے دو دن بعد ۲۸۔ دسمبر کو ڈی آئی جی نے یادداشت لکھی کہ یہ مضمون زیر دفعہ ۱۵۳۔ الف و زیر دفعہ ۲۱۔ واضح طور پر قابل سزا ہے لیکن مرکزی حکومت نے اب تک ہماری کوئی

ڈی آئی جی نے کہا کہ مرکز چونکہ بے توجہی کر رہا ہے اس لئے کوئی کارروائی نہ کی جائے

رہنمائی نہیں کی۔ اور اس بات پر ہم اب تک اظہار افسوس کرتے رہے ہیں اور مرکز کی 'بے التفاتی' کے پیش نظر صوبائی حکومت کو کوئی کارروائی نہ کرنی چاہئے"۔ کسی قسم کی کارروائی نہ کرنیکی سفارش کے بعد ڈی آئی جی نے اس شدید دشنام و توہین کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا جس کا نشانہ جماعت احمدیہ کے بانی اور اس کے افراد کو مسلسل بنایا جا رہا ہے۔ "یہ مضمون بھی اسی مہم کا ایک ٹکڑا ہے جو احرار لیڈروں اور ملاؤں نے روزانہ جاری کر رکھی ہے۔ میں ماسٹر تاج الدین سے بات کروں گا۔"

ہوم سیکرٹری اور چیف منسٹر نے اتفاق کیا

ہوم سیکرٹری نے ۲۹۔ دسمبر کو اس رائے سے اتفاق کیا اور چیف منسٹر نے ۵۔ جنوری ۱۹۵۲ء کو اس یادداشت پر دستخط کر دئے۔

منہ کا مزا کڑوا ہو گیا

شرافت و شائستگی اس فیصلے سے بغاوت کرتی ہیں۔ ہم "آزاد" کی یہ تحریر تو اس سے قبل پڑھ چکے تھے لیکن اس پر ڈی آئی جی کی یادداشت ہمارے سامنے اس وقت پڑھی گئی جب مسٹر دولتانہ ہمارے سامنے بطور گواہ پیش تھے۔ جب ہم نے اس یادداشت کو پڑھا تو ہمیں ایسا احساس ہوا جس کا ظاہر نہ کرنا ہی بہتر ہے ہمیں اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہ آیا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ان مکروہ صورتوں میں کم سے کم معمولی قانونی چارہ جوئی ضرور کر لینی چاہئے۔ لیکن دو ہی دن کی مدت کے اندر کیا واقعہ پیش آیا جسکی وجہ سے یہ فیصلہ بدل دیا گیا۔ کیا مرکزی حکومت نے ۲۴ اور ۲۶ دسمبر کے درمیان ہی بے التفاتی اختیار کر لی تھی؟ اگر ماسٹر تاج الدین کوئی خاص طور پر شائستہ آدمی تھے۔ اور ان کو بری الذمہ قرار دینے کے لئے کوئی وجہ پیدا کرنا ضروری تھا تو اس کے لئے مرکز کی بے التفاتی کا بہانہ ڈھونڈنا نہایت نازیبا بات تھی اس صورت حالات کی مضحکہ خیزی اس واقعہ میں ہے کہ ان مضامین کی طرف صوبائی حکومت کو توجہ دلانے والا خود مرکز ہی تھا۔

مسٹر دولتانہ کی تصریح

مسٹر دولتانہ نے عدالت میں کہا: "ہوم سیکرٹری نے بھی اتفاق کیا اور میں نے بھی اگر افسر کوئی مزید اقدام مناسب سمجھتے تو میں بلاشبہ ان سے متفق ہو جاتا۔ یہ یادداشتیں حکومت پاکستان کی اس چٹھی پر مبنی تھیں جس میں ان مضامین کی طرف توجہ دلائی گئی تھی مجھے یاد نہیں کہ میں نے یہ مضمون یا یہ یادداشت پڑھی تھی یا نہیں میری توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی گئی کہ ڈی آئی جی ماسٹر تاج الدین سے ملاقات کرنے کے بعد کوئی کارروائی کرنا چاہتے ہیں مجھ سے کوئی خاص فیصلہ طلب نہیں کیا گیا تھا۔ قابل اعتراض تحریروں کے خلاف کارروائی

پالیسی بالکل واضح تھی اور افسر اقدام کر سکتے تھے

کرنے کے مسئلہ کا اس سے قبل فیصلہ کیا جا چکا تھا اور پالیسی بالکل واضح تھی مجھ سے حکم کے کسی

ابہام کی تصریح کرانے یا کسی خاص کیس کے متعلق مخصوص ہدایات حاصل کرنے کے لئے کوئی استصواب نہیں کیا گیا۔

لیکن اگر بے عملی کا کوئی صریح کیس ہو

لیکن ہمارے ایک سوال پر مسٹر دولتانہ نے یہ بھی کہا کہ "اگر ڈی آئی جی یا ہوم سیکرٹری کی بے عملی کا کوئی واضح کیس کسی یادداشت کی شکل میں میرے پاس آتا جو محض اطلاع کی غرض سے بھیجا جاتا تو میرے لئے کارروائی کرنا بالکل بجا ہوتا"۔ نہ صرف بجا ہوتا بلکہ ان کا فرض تھا کہ وہ کوئی اقدام کرتے۔ کیونکہ ایسی حالت میں ان کی وضع کی ہوئی پالیسی کی تعمیل بالکل نہ ہوئی ہوتی۔ پالیسی یہ تھی کہ عام قانون کے ماتحت کارروائی کی جائے لیکن ڈی۔ آئی جی نے محض اسلئے کارروائی کرنے سے انکار کیا کہ الزام مرکزی حکومت پر عاید ہو۔

مسٹر دولتانہ کا موقف صحیح نہیں ہے

مزید براں ہمارا خیال یہ ہے کہ مسٹر دولتانہ نے ان فائلوں کے متعلق جو ان کی خدمت میں بغرض اطلاع پیش ہوتی تھیں جو موقف ظاہر کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے یہ فائلیں محض بغرض احترام ان کی خدمت میں پیش نہ کی جاتی تھیں کہ وہ وزیر انچارج تھے ان کے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ صورت حالات سے مطلع رہیں اور انہیں اس کارروائی کا بھی علم رہے جو کی جا رہی تھی تاکہ اگر وہ اس کارروائی کو ناکافی یا ضرورت سے زیادہ سمجھیں تو اسکی ترمیم یا تنسیخ کر دیں۔

بے عملی کی دوسری مثالیں

اسی قسم کی بے عملی اُن تقریروں کے متعلق بھی نظر آتی ہے جو چنیوٹ کی ختم نبوت کانفرنس میں ۲۶ دسمبر ۱۹۵۲ء کو اور بعد کے دو دنوں میں کی گئیں جن کے مندرجہ ذیل اقتباسات کا نقل کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا:۔

ماسٹر تاج الدین: ظفر اللہ پاکستان کا نہیں بلکہ اپنے خلیفہ کا وفادار ہے۔ اس کی سرگرمیوں پہ نگاہ رکھو اور اسکو برخاست کر دو۔ چونکہ علما نے احراری لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے اس لئے سرکاری دفتروں میں مذہبی بحث ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔

مولوی محمد علی جالندھری: ایک احمدی افسر نے گولی بارود کا بھرا ہوا ایک ٹرک اٹک کی آرڈیننس فیکٹری سے ربوہ بھیجدیا۔ ظفر اللہ کشمیر میں ہندوستانی افسروں کو بحال رکھنے پر رضامند ہو گیا تھا وہ غدار ہے اس نے گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کرا دیا۔ احرار اور مرزائی دونوں ہی پاکستان قائم کرنے کے مخالف تھے لیکن دونوں کی وجوہ مختلف تھیں۔ اول الذکر تو اسکی مخالفت سیاسی وجوہ سے کرتے تھے۔ لیکن آخر الذکر کی مخالفت مرزا غلام احمد کے الہامات پر مبنی تھی۔

سید مظفر علی شمسی: مرزا غلام احمد فاسق و فاجر تھا۔ غفار خاں تو غدار پاکستان

ہونے کی بنا پر قید کر دیا گیا لیکن ظفراللہ جو رسولِ پاکؐ کا غدار ہے۔ وزیر خارجہ بنا بیٹھا ہے۔

سید عطاء اللہ بخاری: اگر حکومت ظفراللہ خاں کو برطرف نہ کرے تو جس طرح مسلمانوں نے خضر وزارت کو توڑ دیا تھا اسی طرح وہ مرکزی حکومت کو بھی اقتدار سے محروم کر سکتے ہیں۔ اگر عوام نے اور حکومت نے موثر تدابیر اختیار نہ کیں۔ تو انگریز ربوہ میں ایک مرزائی حکومت قائم کر دیں گے۔

ان تقریروں کی رپورٹ چیف منسٹر کو بھیجی گئی انہوں نے ۷۔ جنوری ۱۹۵۳ء کو یہ رپورٹ ملاحظہ فرمائی لیکن اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا گیا نہ کوئی کارروائی تجویز کی گئی۔

اخبارات

اب تک ہم نے رپورٹ کے اس حصے کو صرف کانفرنسوں اور تقریروں تک محدود رکھا ہے۔ اور کہیں کہیں حسب ضرورت کسی اخباری مضمون یا کتابچے کا ذکر بھی کر دیا ہے یہ قطعی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مسٹر دولتانہ نے ایک طرف تو جولائی ۱۹۵۲ء میں احرار کے ساتھ سمجھوتا ہونے کے بعد کوئی کارروائی نہیں کی اور دوسری طرف بعض اخباروں کو جو حکومت کے زیر اثر تھے اکسایا گیا کہ وہ اس شورش کی آگ کو ہوا دیں اور اس کو کراچی کی سمت "راستے پر لگائیں"۔

راستے پر لگانا صوبہ لیگ کونسل نے اپنے اجلاس لاہور منعقدہ ۲۶-۲۷۔ جولائی میں فیصلہ کیا کہ مطالبات مرکز کے پاس بھیجے جائیں یہ گویا اس امر کا روشن ثبوت ہے کہ یہ تحریک کو "راستے پر لگانے" کی کوشش تھی اسکے ساتھ ہی مسٹر دولتانہ نے سخت مخالفت کا سامنا کر کے مندوبین کو اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کی قرارداد منظور کرنے پر اصرار نہ کریں۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ حرکت بدگمانی کو دور کرنے کے لئے تحریک کا رخ مرکز کی طرف موڑنے کے لئے اور مرکزی حکومت کو پریشان کرنے کے لئے کی تھی اسی وجہ سے انہوں نے احرار کے ساتھ مصالحت کر کے زبان بندی کی تمام پابندیاں غیر مشروط طور پر ہٹا لیں اور اگر کوئی شرط تھی تو یہ تھی کہ اگر ختم نبوت کی تحریک کی شدت کے باعث نئے انتخابات کی نوبت آگئی تو مسٹر دولتانہ ختم نبوت کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے اور احرار انکی حمایت کرینگے۔ اس معاملے پر اتفاق ہوا یا نہ ہوا یہ معاملہ آئندہ انتخابات سے تعلق رکھتا ہے ہمارا موجودہ مقصد صرف یہ ہے کہ تحریک کو "راستے پر لگانے" کے رجحانات کا جائزہ لیں۔ یہاں ہم یہ بھی بتا دیں کہ خواجہ ناظم الدین بھی اس امر سے آزردہ ہوئے چنانچہ انہوں نے بیان کیا۔ کہ "جس شخص نے بھی مرکز پر کسی فیصلے کے صدور کے لئے دباؤ ڈالا اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ذمہ داری مرکز کی طرف منتقل ہو جائے .... ایسی حالت میں اگر فوج اور پولیس کسی پر گولی چلاتی۔ تو صوبائی لیڈر کہہ دیتے کہ یہ سب کچھ مرکز کے حکم سے ہو رہا ہے اگر اس ہنگامے میں مرکزی حکومت ختم ہو جاتی تو صوبائی حکومت لوگوں سے کہتی۔ کہ "ہم تو شروع سے آخر تک تمہاری تائید کرتے رہے ہیں"

چار اخبار حکومت کے تنخواہ دار

اخبارات کو تعلقات عامہ کی ڈایرکٹریٹ سے اشتہارات کی صورت میں وسیع امداد ملتی ہے لیکن اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ اردو کے چار اخبارات کم و بیش حکومت کے تنخواہ دار تھے کیونکہ انہیں ناخواندگی کے خلاف مہم کی تکمیل کے لئے سکولوں ہسپتالوں اور جیلوں کو اخباروں کے پرچے مہیا کرنے کے عوض میں بڑی بڑی رقمیں پیشگی مل رہی تھیں۔ لاہور کے بڑے بڑے اخباروں کی نسبت پوزیشن حسب ذیل تھی: "پاکستان ٹائمز" "امروز" اور "نوائے وقت" نے تحریک سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" احمدیوں کے حامیوں کی ملکیت تھا۔ "آزاد" احراریوں کا اخبار تھا۔ "الفضل" احمدیوں کا اخبار (اسکی اشاعت محدود تھی) اور "زمیندار" احراریوں کا مشہور حامی تھا۔ "زمیندار" اور تین دوسرے اخباروں نے حکومت کی اس مد سے جسکا ذکر ہم کر چکے ہیں مندرجہ ذیل رقوم وصول کیں :۔

آفاق	ایک لاکھ روپے (۲۶۲۵۰ روپے کی اس رقم کے علاوہ جو اشتہارات کے حساب میں وصول ہوئی)
احسان	تہتر ہزار روپے
زمیندار	تئیس ہزار روپے
مغربی پاکستان	بائیس ہزار روپے

ان رقوم کی قسطیں جولائی ۱۹۵۲ء میں مندرجہ ذیل تاریخوں پر ادا کی گئیں :۔

زمیندار کو	دس ہزار۔ تین جولائی کو
آفاق کو	چالیس ہزار۔ چار جولائی کو
احسان کو	چالیس ہزار۔ پانچ جولائی کو

میر نور احمد جو مسٹر دولتانہ کی حکومت کے دوران میں ڈائرکٹر اطلاعات عامہ رہے بیان کرتے ہیں کہ اخبارات کو مالی امداد دینے کی سکیم سب سے پہلے دسمبر ۱۹۵۰ء یا جنوری ۱۹۵۱ء کی اس کانفرنس میں منظور کی گئی تھی۔ جو خواجہ شہاب الدین وزیر اطلاعات نے منعقد کی تھی تاکہ "جن اخباروں کی اشاعت حکومت کے متعلق سنجیدہ وہمدردانہ رویے کی وجہ سے کم ہو گئی ہو ان کے نقصان کی تلافی ہو سکے"۔ موجودہ حکومت کے وکیل چودھری فضل الٰہی کا دعویٰ یہ تھا کہ میر نور احمد مسٹر دولتانہ کی حکومت کے کارندے کی حیثیت سے ان چار اخباروں کو اس مقصد سے استعمال کر رہے تھے کہ شورش کو زندہ رکھیں اور اس کا رُخ کراچی کی طرف پھیر دیں لیکن میر نور احمد کا بیان ہے کہ جولائی

ڈی پی آر کا جواب

۱۹۵۲ء تک تو حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ کسی خاص معاملے کی تائید یا مخالفت کا جو حق اخباروں کو حاصل ہے اس میں مداخلت نہ کی جائے۔ لیکن جولائی کے تیسرے یا چوتھے ہفتے میں چیف منسٹر نے مجھے ہدایت کی کہ میں اپنے اثر کو استعمال کر کے اخباروں کو یہ مشورہ دوں کہ وہ اس موضوع پر لکھنا ترک کر دیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ حکومت کو بحیثیت مجموعی (جس میں سیکرٹریٹ بھی شامل ہے)

اخبارات کے خلاف ہوم سیکرٹری کی شکایت ۱۴ جولائی ۵۳ء

جولائی کے دوسرے یا تیسرے ہفتے ہی میں اخبارات سے

تعلقِ خاطر پیدا ہوا۔ کیونکہ ۴۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوم سیکرٹری نے بعض ایڈیٹروں کی ناشائستگی کے متعلق ایک نہایت فکرمندانہ یادداشت چیف منسٹر کو نتھیا گلی بھیجی تھی (ہوم سیکرٹری کے تحریری بیان کا ضمیمہ ۱-۲) "میں نے صبح ڈی۔ پی آر کو طلب کرکے یہ ہدایت کی کہ وہ اپنی مشینری کی رفتار کو تیز کر دیں اور پروپیگنڈا کا مواد پورے صوبے میں پھیلا دیں۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ دو تین پریس نوٹ صورت حالات کے مقابلے کے لئے بالکل ناکافی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عزت مآب چیف منسٹر کی خواہش کے مطابق یکم جولائی کو میں نے مولانا اختر علی خاں اور ان کے گروہ کے ایڈیٹروں سے بات چیت کی۔ ساری صورت حالات انکو سمجھائی اور ان کے تمام سوالات کے جواب دیئے تاکہ انکے خطروں اور اندیشوں کا ازالہ ہو جائے۔ وہ پوری طرح مطمئن ہو کر واپس گئے لیکن مجھے بے حد افسوس ہے کہ ایک اخبار کے سوا باقی کسی نے نرم الفاظ میں بھی حکومت کے اقدام کی پسندیدگی کا اظہار نہ کیا۔ میں نے عزت مآب چیف منسٹر کی خواہش کے مطابق کل پھر ٹیلیفون پر مولانا اختر علی خاں سے بات کی۔ انہوں نے پھر حکومت کے تمام اقدامات کے خلوص پر یقین کا اظہار کیا۔ لیکن آج کے پرچے میں حسب معمول احراریوں کے تمام اقوال کی حمایت کی۔ اس گروہ کے دوسرے اخباروں نے بھی یہی کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے کل مسٹر حمید نظامی (ایڈیٹر نوائے وقت) اور مسٹر مظہر علی خاں (ایڈیٹر پاکستان ٹائمز) کو بھی طلب کیا تھا۔ ان دونوں نے کہا کہ حکومت نے جو کچھ کیا ہے اسکی عام تائید ہونی چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ البتہ مسٹر نظامی نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر وہ اپنے اخبار میں اس خیال کا اظہار کریں گے تو حکومت اور مسلم لیگ کے منظور نظر اخبارات اپنی اشاعت بڑھانے کے لئے سب سے پہلے انہیں احمدی قرار دے کر نشانہ ملامت بنائیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسٹر مظہر علی خاں

حکومت نے خود مذہب کو استعمال کیا۔ مظہر علیخاں ایڈیٹر پاکستان ٹائمز

نے کہا کہ اس گڑبڑ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حکومت نے خود مذہب کو اپنا نعرہ اور اپنی قوت کا وسیلہ بنایا ہے اس لئے اگر ایک گروہ مذہب سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے تو دوسروں کو اپنے مقاصد کے لئے مذہب کو استعمال کرنے سے کیونکر منع کیا جا سکتا ہے۔"

اگر ہم ہوم سیکرٹری کی جگہ ہوتے تو ان حقائق ثابتہ کے بیان پر ان دونوں حضرات کا دلی شکریہ ادا کرتے۔

انسپکٹر جنرل نے نشر و اشاعت کی کمی پر ڈی پی آر کو ڈانٹ ڈپٹ کی

مسٹر غیاث الدین احمد نے اپنی شہادت میں بیان کیا کہ چیف منسٹر نے اس یادداشت پر دستخط کرکے اسے واپس کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ایک اور موقع پر وہ اور مسٹر انور علی اور مسٹر قربان علی خاں تینوں چیف منسٹر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اس موضوع پر بات چیت کی اسکے بعد مسٹر قربان علی نے میر نور احمد کو طلب کرکے زوردار الفاظ میں ہدایت کی کہ نشر و اشاعت کا کام زیادہ موثر طریقے سے منظم کیا جائے۔ اس اصرار کے بعد ڈی پی آر نے "ایک یا دو پوسٹر" شائع کئے۔

ممکن ہے اسی وجہ سے مسٹر غیاث الدین احمد نے اپنی یادداشت مورخہ ۴۔ جولائی میں یہ لکھا ہو۔ کہ "ایک یا دو پوسٹر" کافی نہیں ہوں گے۔

۵- جولائی کے فیصلوں میں بھی پروپیگنڈا پر زور دیا گیا

۵- جولائی کو جو فیصلے کئے گئے ان میں واضح طور پر کہا گیا کہ "اخباروں میں پروپیگنڈا تیز تر کر دینا چاہئے اور جو اخبارات عام طور پر حکومت کے حامی ہیں ان سے کہا جائے کہ اس معاملے میں بھی تعاون کریں کیونکہ ان کا رویہ اس مسئلے میں حکومت کے حق میں نہیں ہے"۔

ڈی پی آر کا جھوٹا جواب

لیکن میر نور احمد نے کہا ہے کہ "۵- جولائی کی کانفرنس میں افسروں نے مجھ سے کوئی خاص بات نہیں کی"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے میر صاحب سے کوئی ایسی بات نہیں کی جو قابل ذکر ہو لیکن اسکے بعد وہ نہایت سادگی سے یہ کہتے ہیں "سوائے اس کے کہ حکومت کے حامی اخبارات اعانت نہیں کر رہے ہیں اور مجھے ان سے مزید امداد حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے"۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ "فلاں شخص نے کوئی خاص ضرب شدید نہیں لگائی سوائے اس کے کہ زخم چھ انچ گہرا تھا"۔ اسکے بعد کہا "ان کا رویہ یہ تھا کہ حکام کو کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہئے جس پر مطالبات کی حمایت یا مخالفت کا گمان کیا جاسکے اسکا مطلب یہ تھا کہ مجھے مداخلت نہیں کرنی چاہئے"۔ اس موقع پر ان کے سامنے ۵- جولائی کے متعلقہ فیصلے پیش کئے گئے۔ اگر حکومت کے حامی اخباروں سے یہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا کہ "اس معاملے میں" تعاون کریں۔ اور اگر ہوم سیکرٹری نے یہ شکایت کی تھی کہ ان کا رویہ حکومت کے حق میں نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب کیونکر نکل سکتا ہے کہ میر نور احمد مداخلت نہ کریں اور کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے حکومت کا مافی الضمیر ظاہر ہو جائے؟ لیکن جب میر صاحب کو یہ فیصلے دکھائے گئے تو انہوں نے کہا کہ "اس کا تعلق اُن غلط فہمیوں سے تھا جو مساجد پر پابندیوں کے متعلق پھیل رہی تھیں"۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر اطلاعات کے بیان سے واضح ہے کہ حکومت کے حامی اخباروں اور محکمہ اسلامیات کے خلاف عام شکایت تھی جب ڈاکٹر صاحب جولائی کے نصف دوم میں لاہور آئے تو کسی شخص نے جس کا نام انہیں یاد نہیں رہا۔ انہیں یہ بتایا کہ تعلقات عامہ کی ڈائرکٹریٹ اخباروں کو ایسے مضامین مہیا کرتی رہی ہے جن سے شورش کو تیز کرنا مقصود تھا انہیں اخلاقی اعتبار سے یقین تھا کہ یہ اطلاع درست ہے۔ چنانچہ

میر نور احمد نے ٹالنے کی کوشش کی

انہوں نے نہایت صفائی کے ساتھ میر نور احمد سے سوال کیا کہ آیا یہ صحیح ہے کہ محکمہ اسلامیات اخباروں کو مضامین بھیجتا رہا ہے؟ میر نور احمد نے اس سوال کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب میں نے اصرار کیا تو انہوں نے کہا کہ شورش کو بعض اطراف میں "راستے پر لگانے" کی کوشش کی گئی تھی میں نے خاص طور پر یہ حقیقت ان کے سامنے پیش کی کہ آفاق جو ہر اعتبار سے تعلقات عامہ کی ڈائرکٹریٹ کے ماتحت ہے اسی بات پر اصرار کر رہا ہے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ اسلئے کیا گیا تاکہ تحریک بعض اطراف میں "راستے پر لگائی" جاسکے میں نے کہا کہ "راستے پر لگانا" نہیں بھڑکانا ہے"۔ اس کے بعد ڈاکٹر قریشی نے مسٹر دولتانہ سے ربط پیدا کیا اور مسٹر دولتانہ نے ان کو ۱۹- جولائی کے دن چائے پر مدعو کیا۔ انہوں نے مسٹر دولتانہ سے کہا کہ اگر صوبائی حکومت نے نشر و اشاعت کے سلسلے میں کوئی ایسی راہ عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو سابقہ راہ عمل سے الگ تھی تو مناسب

یہ تھا کہ آپ نخفیا گلی میں (جولائی میں مجلس اصول اساسی کے اجلاس کے موقع پر) مجھ سے گفتگو کر لیتے۔

مسٹر حمید نظامی نے ڈی پی آر کو ملزم ٹھیرایا

ڈاکٹر قریشی نے غیر رسمی طور پر مقامی ایڈیٹروں کو چائے پر بلایا اس موقع پر مسٹر حمید نظامی نے کہا کہ اخباروں میں اس مہم کو جاری رکھنے کے ذمہ دار خود میر نور احمد ہیں۔ ڈاکٹر قریشی کا بیان ہے کہ میر نور احمد نے اس الزام دہی کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ مسٹر حمید نظامی جب بطور گواہ پیش ہوئے تو انہوں نے بیان کیا کہ انہوں نے انگلی سے میر نور احمد کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ "یہ سب سے بڑے مجرم" ہیں ڈاکٹر قریشی کو اصل الفاظ تو یاد نہیں لیکن وہ اس بیان کے ساتھ عمومی حیثیت میں متفق ہیں۔

جب وہ کراچی واپس گئے تو انہوں نے وزیر اعظم کو بتایا کہ ان کی رائے میں تعلقات عامہ کی ڈائرکٹریٹ شورش کی آگ کو ہوا دے رہی ہے۔ اور "یہ نہایت عجیب بات ہے کہ صوبائی حکومت کا ایک محکمہ ایک ایسے اہم معاملے میں مرکزی حکومت کی واضح اجازت یا احکام کے بغیر ایک خاص پالیسی اختیار کرے میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مسٹر دولتانہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ تعلقات عامہ کی ڈائرکٹریٹ شورش کو بھڑکا رہی ہے تو یہ بھی نہایت عجیب معاملہ ہے اس لئے کہ اس اہم مسئلہ کے متعلق اخباروں کے تراشے ان کو ضرور مہیا کئے جاتے ہوں گے اور انہیں ضرور معلوم ہوگا کہ وہ اخبارات بھی جو براہ راست حکومت کے زیر نگرانی ہیں (مثلاً آفاق) اسی راہ عمل پر چل رہے ہیں لہٰذا جب مجھے مسٹر دولتانہ نے بتایا کہ یہ راہ عمل ان کے علم کے بغیر اختیار کی گئی تھی تو مجھے حقیقت میں بے حد تعجب ہوا" مسٹر دولتانہ نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ وہ اس معاملہ کی مزید تحقیق کریں گے لیکن اسکے بعد ڈاکٹر قریشی کو کوئی مزید اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

ڈی پی آر کی طرف سے ڈاکٹر قریشی کی تردید

میر نور احمد اس سے انکار کرتے ہیں کہ مسٹر حمید نظامی نے انہیں ڈاکٹر قریشی کے سامنے زبیری سماعت کے اندر "سب سے بڑا مجرم" قرار دیا تھا میر نور احمد الفاظ کے استعمال میں بہت محتاط ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے انکار کو اپنی قوت سامعہ کے ذکر سے محدود کر دیا ہے اس سے ہمیں یہ موقع مل گیا کہ ہم ڈاکٹر قریشی کے بیان کو بھی قبول کر لیں اور ساتھ ہی میر نور احمد پر بھی یقین کر لیں میر صاحب کے قول کے مطابق ڈاکٹر قریشی سے ان کی گفتگو دو شکایتوں کے متعلق ہوئی تھی جو اُن کے علم میں آئی تھیں: (۱) کہ اگرچہ حکومت کے حامی اخبارات شورش کی حمایت میں مضامین شائع کر رہے تھے لیکن میر نور احمد نے انکو بند کرانے کی کوئی کوشش نہ کی (۲) کہ مولوی ابراہیم علی چشتی ڈپٹی سیکرٹری محکمہ اسلامیات اس موضوع پر مضمون نگاری کا انتظام کر رہے تھے۔ پہلے موضوع کے متعلق ان کا جواب یہ تھا کہ اخبارات کی تحریریں "عموماً ان حدود کے اندر" ہوتی تھیں۔ جو گزشتہ زمانے میں جائز سمجھے جاتے تھے اور مجھے ان کو روکنے کی کوئی ہدایت موصول نہ ہوئی تھی (انہوں نے ڈاکٹر قریشی سے ۱۹۔ جولائی کو بالکے لگ بھگ بات چیت کی تھی اور ہوم سیکرٹری نے ۵۔ جولائی کو ان سے شکایت کی تھی کہ اخبارات تعاون نہیں کر رہے ہیں) دوسری شکایت کے متعلق انہوں نے بے خبری اور تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ میں نے ڈاکٹر قریشی سے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں تحریک کو "راستے پر" لگا رہا ہوں۔ بلکہ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے ایسا عجیب و غریب محاورہ

استعمال کیا ہو۔

مسٹر دولتانہ کا بیان

اس معاملے کے متعلق مسٹر دولتانہ کا بیان بالکل مختلف ہے: ڈاکٹر قریشی کی تجویز یہ تھی کہ ذاتی اثر سے کام لینا چاہئے انہوں نے ضمناً یہ ذکر بھی کیا کہ انہیں شکایات موصول ہوئی ہیں کہ میر نور احمد نے یا تو بعض مضامین کہکر لکھوائے ہیں یا بعض کسی دوسرے نام سے خود لکھکر دئے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کو یہ اطلاع مسٹر حمید نظامی نے دی تھی اسلئے مسٹر دولتانہ نے انہیں بتایا کہ مسٹر نظامی اور میر نور احمد ایک دوسرے کے مخالف ہیں لیکن میں اس معاملے کی تحقیق کرونگا۔ چند روز بعد انہوں نے "میر نور احمد کو طلب کیا" جنھوں نے اس الزام کی صحت سے انکار کیا۔ لہٰذا مزید کسی کارروائی کی ضرورت نہ ہوئی۔

میر نور احمد کا بیان ہے کہ چیف منسٹر کو خود میں نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر قریشی نے مجھ سے شکایت کی ہے لیکن چیف منسٹر نے مجھ سے ذکر نہیں کیا کہ ڈاکٹر قریشی نے ان سے کبھی شکایت کی ہے۔

ڈاکٹر قریشی اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ ہمیں اطمینان ہے کہ ان کا بیان غلط ثابت نہیں ہوا اور مخالف شہادت میں باہمی تضاد ہے ڈاکٹر قریشی کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے ایک ہی شکایت کے متعلق مسٹر دولتانہ سے ایک بات اور میر نور احمد سے دوسری بات کہی ہوگی۔

مسٹر گورمانی نے ڈاکٹر قریشی کی تائید کی

مسٹر مشتاق احمد گورمانی کا بیان ہے کہ ۱۹۵۲ء کے موسم گرما میں کسی وقت ڈاکٹر قریشی نے ارکان کابینہ کو بتایا تھا کہ "انہیں اس مطلب کی شکایات موصول ہوئی ہیں کہ پنجاب کے اخباروں میں جو فرقہ دارانہ مضامین شائع ہو رہے ہیں وہ ایسے ذرائع کی طرف سے مہیا کئے جاتے ہیں جو یا تو سرکاری ذرائع ہیں یا حکومت ان کی سرپرستی کر رہی ہے انہوں نے یہ بھی کہا کہ چیف منسٹر نے اس سے لاعلمی ظاہر کی ہے اور تحقیق حال کا وعدہ کیا ہے ڈاکٹر قریشی میر نور احمد کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔"

خواجہ ناظم الدین نے مسٹر دولتانہ سے بات کی

خواجہ ناظم الدین نے ۴۔ اگست کو یا اس کے لگ بھگ اس موضوع پر مسٹر دولتانہ سے گفتگو کی۔

خواجہ ناظم الدین کہتے ہیں "میں نے انکو بتایا کہ ڈاکٹر قریشی کے نزدیک میر نور احمد اس تحریک کی حمایت میں مختلف اخباروں کو مواد مہیا کرتے رہے ہیں میں نے یہ بھی کہا کہ 'پاکستان ٹائمز'، 'امروز'، 'نوائے وقت' اور 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' تو خاموش ہیں اور جن اخبارات پر حکومت کا اقتدار ہے خصوصاً 'زمیندار'، وہ شورش کی آگ کو ہوا دے رہے ہیں انہوں نے جواب دیا کہ اردو اخبارات کی اشاعت کا انحصار مقبول عام موضوع پر ہوتا ہے اس لئے ان کو روکنا بے حد مشکل ہے لیکن میرا مقصد یہ ہے کہ اخباروں میں زہر چکانی کی جو مہم جاری ہے اسکو تلقین و نصیحت سے قابو میں لایا جائے میں نے کہا کہ صورت حالات کے تدارک کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اخباروں کو شورش کے بھڑکانے سے روکا جائے۔ اور صرف آپ ہی ایسے شخص ہیں جو انہیں روک سکتے ہیں کیونکہ ان اخباروں کا دارومدار آپ ہی اعانت اور سرپرستی پر ہے"۔

مسٹر دولتانہ خواجہ ناظم الدین کے بیان کی تردید کرتے ہیں

اس کے متعلق مسٹر دولتانہ کا قول ہے کہ خواجہ ناظم الدین کا بیان " نادرست اور بالکل غیر منطقی ہے کیونکہ ڈاکٹر قریشی کی اس تجویز پر عمل کرنے کے بعد کہ میں اس موضوع کے متعلق اخباروں کو خاموش کرانے کے لئے اپنا ذاتی اثر استعمال کروں میں یہ نہیں کر سکتا تھا کہ وزیر اعظم کے پاس جا کر یہ کہوں کہ حکومت پنجاب کے لئے شورش کی حمایت میں اخبارات کو مضامین بھیجنا بہت اچھی بات تھی درآنحالیکہ ہم ان کو اس موضوع پر بالکل کچھ نہ لکھنے کی ترغیب دے رہے تھے "۔ اس دلیل میں مفروضہ یہ ہے کہ مسٹر دولتانہ نے ڈاکٹر قریشی کی تجویز پر عمل کیا لیکن مسٹر دولتانہ کی حمایت میں بہتر دلیل یہ دی جا سکتی تھی کہ ڈاکٹر قریشی کو یہ اطلاع دینے کے بعد کہ مجھے میر نور احمد کی سرگرمیوں کا کوئی علم نہیں۔ میں خواجہ ناظم الدین سے یہ نہ کہتا کہ " راستے پر لگانے " میں بھی بعض خوبیاں ہیں بہرحال مسٹر دولتانہ نے ہمیں کچھ نہیں بتایا کہ انہوں نے خواجہ ناظم الدین سے ٹھیک ٹھیک کیا کہا تھا یا اُن سے اس موضوع کا ذکر بھی آیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ذکر ضرور آیا تھا کیونکہ ڈاکٹر قریشی جب لاہور سے روانہ ہوئے تھے تو انہیں میر نور احمد کے معاملے کے متعلق اتنا ہی پختہ یقین تھا جتنا کیفیاتی شہادت سے پیدا ہو سکتا ہے (مسٹر حمید نظامی کی براہِ راست الزام دہی کے ذکر کو چھوڑ دیجئے) اور چونکہ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف خواجہ ناظم الدین سے بلکہ پوری کابینہ سے اس موضوع کا ذکر بطور شکایت کیا تھا لہٰذا خواجہ ناظم الدین کے لئے یہ بالکل قدرتی تھا کہ وہ تحریک کی صورت حالات پر گفتگو کرنے کے ساتھ اس موضوع کا ذکر بھی کرتے۔

اخباروں کے رویّے کے باوجود اُن کے معاہدوں کی تجدید کی گئی

اس سے قبل یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اخباروں کو بعض رقوم ۲-۴- اور ۵- جولائی کو ادا کی گئیں جب تحریک پورے شباب پر تھی کوئی حکومت جو کسی شورش کے متعلق فکر مند ہو ایسے اخباروں کی سرپرستی کو جاری نہیں رکھ سکتی جو تعاون کے بجائے مخالفانہ نقطۂ نگاہ کی اشاعت کر رہے ہوں لیکن میر نور احمد نے ایسا کیا اور مسٹر دولتانہ کو اس کا علم تھا ہمیں معلوم ہے کہ ہوم سیکرٹری نے ۴- جولائی کو حکومت کے حامی اخباروں کے خلاف کس قدر تلخی سے شکایت کی اور ۵- جولائی کے فیصلوں میں اُنکے رویّے کو کیونکر مخالفانہ ظاہر کیا گیا۔ جب میر نور احمد سے پوچھا گیا کہ جس حالت میں آپکے علم میں تھا کہ یہ اخبارات " قابل اعتراض سرگرمیوں " میں مصروف ہیں آپ نے انکو تازہ ادائیگیاں کیوں کیں تو میر نور احمد نے جواب دیا کہ " میرے خیال میں وہ قابل اعتراض سرگرمیوں میں مصروف نہ تھے "۔ اگر یہ سرگرمیاں حکومت کے نزدیک یا کم از کم میر نور احمد کے نزدیک پسندیدہ تھیں تو میر صاحب کا یہ جواب بالکل صحیح ہے میر صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ رقوم انہوں نے اپنی مرضی سے تقسیم کی تھیں۔

چیف منسٹر نے اس فعل کو منظور کیا

اور اسکی اطلاع چیف منسٹر کو دے دی تھی جنہوں نے اس تقسیم کو منظور کر لیا تھا وہ ظاہراً اپنی یادداشت مورخہ ۳۰ جولائی ۱۹۵۲ء کا ذکر کر رہے ہیں جس میں لکھا ہے کہ یہ رقوم ادا کر دی گئی ہیں "۔ جیسا کہ عزت مآب چیف منسٹر کی خدمت میں

زبانی عرض کیا جا چکا ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ زبانی گزارش ادائیگی سے پہلے کی گئی تھی جب یہ یادداشت مسٹر دولتانہ کو دکھائی گئی تو انہوں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ روپیہ صرف کرنیکے بعد مجھ سے اسکا ذکر کیا گیا۔ میر صاحب نے اس خرچ کے متعلق مجھ سے گفتگو نہیں کی"۔ مسٹر دولتانہ کا زور ان لفظوں پر ہے: "روپیہ صرف کرنے کے بعد"۔ لیکن چونکہ نوٹ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ادائیگیاں ۳-۴-۵- جولائی کو کی گئی تھیں اسلئے مسٹر دولتانہ سے یہ سوال کیا گیا: "لہذا معلوم ہؤا کہ ڈی پی آر نے آپکے نتھیا گلی روانہ ہونے سے قبل آپ سے ضرور اس خرچ کا ذکر کیا ہوگا"۔ اس کا جواب یہ تھا کہ "یہ اخراجات ۱۹۵۰ء کی ایک پرانی پالیسی کے سلسلے میں کئے گئے تھے"۔ لیکن یہ جواب تو قطعاً مفید نہیں کیونکہ ۱۹۵۰ء کی پالیسی یہ تھی کہ حکومت کے جن حامی اخباروں کو اپنی اعتدال پسندی کے باعث اشاعت کی کمی سے نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ ان کی مالی امداد کی جائے۔ مسٹر دولتانہ جواب دیتے ہیں کہ حکومت نے سب سے پہلے یہ فیصلہ جولائی کے تیسرے ہفتے میں کیا تھا کہ ان اخباروں کو اس نزاع کی اشاعت سے باز رکھنے کے لئے اپنے اثر و نفوذ کو استعمال کرے۔ اس جواب سے موجودہ صورت حالات کا مقابلہ مقصود تھا لیکن ایک اور مقام پر مسٹر دولتانہ نے عدم مداخلت کی پالیسی میں ماہ اگست کو بھی شامل کر لیا تھا۔ "زمیندار کے معاملے میں ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔......" زمیندار کے ساتھ جو معاہدہ تھا (پرچے

دولتانہ کا قول ہے کہ اس وقت تک کوئی پالیسی ہی نہ تھی: جولائی اگست ۱۹۵۲ء

مہیا کرنیکے متعلق) وہ ختم نہ کیا گیا کیونکہ اخبار کی پوری پالیسی پر اپنا اقتدار قائم کر لینا مقصود نہ تھا جولائی اور اگست میں مطالبات کے متعلق نہ ہماری اور نہ مرکز کی کوئی پالیسی تھی"۔ لیکن یہ جواب دینے والا اس بات کو بھول گیا کہ جولائی کے تیسرے ہفتے ہی میں ڈاکٹر قریشی نے مسٹر دولتانہ سے کہا تھا کہ وہ اخباروں کو اس شورش کی اشاعت ترک کر دینے کی ترغیب دیں اور سابقہ جواب میں کم از کم یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ حکومت نے کسی مرحلے پر اس نزاع کو "بلیک آؤٹ" کرنے کا فیصلہ ضرور کیا تھا لہذا حکومت کے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہ ہونا چاہئے تھا کہ جولائی کے بعد اس شورش کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔

لیکن پالیسی تو موجود تھی

یہ تو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ (کم از کم سی آئی ڈی کی فائلوں کے مطابق) جولائی میں اخبارات کو کنٹرول کرنیکی کوئی پالیسی موجود نہ تھی۔ ۴۔ جولائی کی یادداشت میں مسٹر غیاث الدین احمد نے مسٹر دولتانہ کو نتھیا گلی میں یہ اطلاع دی کہ "آپ کی ٹیلیفونی ہدایات کی تعمیل میں میں نے مولانا اختر علی خاں کو طلب کر کے ان سے بات چیت کی ہے"۔ یا تو مسٹر دولتانہ ہوم سیکرٹری سے کچھ اور کہتے تھے اور ڈی پی آر سے دوسرے انداز میں بات کرتے تھے یا وہ بھول رہے ہیں کہ وہ جولائی کے آغاز میں بھی ہوم سیکرٹری کو اخباروں کی نگرانی کے طریقے سمجھا رہے تھے۔

مسٹر دولتانہ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ جولائی اگست میں کوئی پالیسی ہی نہ تھی اس سے بالواسطہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخباروں کی ادائیگیوں کے مسئلے پر ان کے نتھیا گلی جانے سے پہلے ان کے ساتھ گفتگو ضرور ہوئی ہوگی لیکن اگر "روپیہ صرف کرنے کے بعد" کے الفاظ میں کچھ معنی ہیں تو کم از کم اس مرحلے پر مسٹر دولتانہ کو یہ

واضح کر دینا چاہیئے تھا کہ ان ادائیگیوں سے ۱۹۵۱ء کی پالیسی کا مقصد فوت ہو گیا اور انہیں چاہیئے تھا کہ ان ادائیگیوں سے پہلے مشورہ کر لیتے۔

زمیندار نے پروپیگنڈا جاری رکھا

اس سلسلے میں جتنے جوابات دیئے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس پر تنقید نہ ہو سکتی ہو۔ "زمیندار" کے ساتھ جو کارروائی معاہدہ تھا وہ شورش کی دیوانہ وار حمایت کے باوجود کالعدم نہ کیا گیا "کیونکہ کسی اخبار کی پوری پالیسی پر اقتدار قائم کرنا مقصود نہ تھا" سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا اخبار کی پالیسی کے اس حصے پر اقتدار قائم کرنا مقصود تھا جس کا حکومت پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا؟ کیا یہ بات ۱۹۵۱ء کی پالیسی کے مطابق تھی کہ ایک ایسے اخبار کی سرپرستی کی جائے جو شورش کو بھڑکا رہا تھا؟ یہ بات اسی صورت میں پالیسی کے مطابق ہو سکتی ہے کہ خود حکومت کی پالیسی بھی یہی ہو کہ شورش کو بھڑکایا جائے۔

اسکی وجہ

مسٹر دولتانہ اور میر نور احمد دونوں یہ کہتے ہیں کہ "زمیندار" کے سوا باقی تین اخباروں نے "بلیک آؤٹ" کے مشورے کے بعد اس نزاع کے متعلق شاذ ہی کوئی مضمون شائع کیا ہوگا۔ ہم حصہ دوم میں بتا چکے ہیں کہ یہ بلیک آؤٹ "کسقدر موہوم تھا۔ میر نور احمد نے کہا ہے کہ "زمیندار" نے کیوں اجتناب نہ کیا "اسکی وجہ میرے قیاس کے مطابق یہ ہے کہ مولانا اختر علی خاں کے نزدیک اس تحریک کی حمایت انکے لئے بے حد ہر دلعزیزی کا باعث ہو رہی تھی" شاید

اکتوبر میں ادررقم ملی

یہی وجہ تھی کہ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں "زمیندار" کو سات ہزار روپے کی ایک رقم عطا کر دی گئی چیف منسٹر کے ساتھ "زمیندار" کے معاملے پر بارہا گفتگو کی گئی (اور ایک دفعہ جائنٹ سیکرٹری وزارت اطلاعات ونشریات سے بھی بات چیت ہوئی) اور ہر دفعہ یہی فیصلہ کیا گیا کہ وہ عام امانت جو دوست اخبارات سے روا رکھی جاتی ہیں وہ "زمیندار" سے واپس نہ لینی چاہئیں۔ کیوں واپس نہ لینی چاہئیں ہمیں اسی کے جواب کی ضرورت ہے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۵۳ء کو اس اخبار کی اشاعت مرکزی حکومت کے احکام سے ممنوع قرار دی گئی لیکن وہ ایک اور نام "آثار" سے جاری ہو گیا اور اس کے عقبی صفحے پر لفظ "زمیندار" جلی قلم سے لکھا تھا۔ "آثار" "زمیندار" ہی کے مالک کا ایک پرانا اخبار تھا لیکن ایک خاص مدت تک شائع نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس کا ڈیکلریشن زائد المیعاد ہو گیا تھا لہٰذا وہ اس قانونی وجہ سے بند کر دیا گیا اس بنا پر نہیں کہ وہ اصل میں "زمیندار" ہی کا تسلسل تھا اس کے ساتھ ہی میر نور احمد نے سفارش کی کہ "مغربی پاکستان" کو مولانا اختر علی خاں نے خرید لیا ہے اس لئے اسی مہینے میں اسکو جاری ہونے کی اجازت دے دی جائے یہ سفارش اس لئے کی گئی کہ مولانا اختر علیخاں کے بیٹے منصور علی خاں نے ایک اقرار نامہ لکھ دیا تھا کہ وہ قطعی طور پر مختلف پالیسی پر کاربند ہوں گے ایسے وقت میں جب مارشل لا لاہور کو اس خانماں جنگجوئی سے نجات دلانے کی کوشش کر رہا تھا جس کا حامی "زمیندار" تھا۔ میر نور احمد نہایت معصومانہ انداز سے اسکو بے اثر کر دینگی دوا بلا رہے تھے اور اگر مرکزی حکومت بروقت احتجاج نہ کرتی تو شاید وہ کامیاب ہی ہو جاتے۔ میر نور احمد انکار کر رہے تھے کہ مرکز سے کوئی احتجاج ہوا تھا۔ لیکن اسوقت خاموش ہوئے جب انہیں ایک یادداشت دکھائی گئی جس میں کراچی سے ایک ٹیلیفونی پیغام کے ارسال کا اندراج موجود تھا۔

مختلف اخباروں خصوصاً "آزاد" اور "زمیندار" میں (صفحات ۸۰۹-۸۰۸، ۵ا، پیپر بک) بعض قابل اعتراض مضامین شائع ہوئے تھے وہ میر نور احمد کو دکھائے گئے اور پوچھا گیا کہ آیا انہوں نے ان کے خلاف کوئی کارروائی تجویز کی تھی انہوں نے جواب دیا کہ ان کے متعلق وقتاً فوقتاً چیف منسٹر سے گفتگو ہوتی تھی اور ہر دفعہ وہ یہی کہتے تھے کہ کارروائی ملتوی کر دی جائے تاآنکہ بعض فیصلے ہو جائیں کہ مجموعی حیثیت سے تحریک کا تدارک کیونکر کیا جائے گا۔ "زمیندار" کے خلاف کارروائی ملتوی کرنے کی سب سے بڑی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ ایسی کارروائی سے اتنے عقدے حل نہیں ہوں گے جتنے اور پیدا ہو جائیں گے۔

ڈی پی آر "زمیندار" کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں

۱۸- فروری ۱۹۵۳ء کو مرکز سے ایک تار آیا جس میں "زمیندار" کے ۲ اور "آزاد" کے تین مضامین کی طرف (جو سب کے سب فروری میں شائع ہوئے تھے) توجہ دلائی گئی اور امید ظاہر کی گئی کہ اخبارات کو شورش کے بھڑکانے سے باز رکھنے کے لئے ضروری تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ "زمیندار" کے تعلق میں میر نور احمد نے یہ یادداشت لکھی: "زمیندار کا رویہ احمدی مسئلے پر خاصا ناگوار ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں انتظار کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ شورش کیا صورت اختیار کرتی ہے"۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک مناسب یہ تھا کہ جب حکومت مجموعی حیثیت سے تحریک کے خلاف اقدام کرے تو "زمیندار" کا تدارک بھی اسی اقدام میں شامل ہو۔ اس امتیاز کی وجہ یہ تھی کہ "زمیندار" کا مسئلہ بالکل خاص تھا: اختر علی خاں پاکستان کے مدیرانِ جرائد کی کانفرنس (پی این ای سی) کے صدر تھے اور مرکز ان کو اچھا سمجھتا تھا"۔ جب یہ بتایا گیا کہ اس موقع پر تو خود مرکز ہی کارروائی پر اصرار کر رہا ہے تو انہوں نے جواب دیا (ہم صرف شہادت کا مفاد نقل کر رہے ہیں) "مرکز کی دو زبانیں ہیں۔ وزارتِ اطلاعات نے "زمیندار" کو حکومت کی حمایت پر قائم رکھنے کے لئے اس کے متعلق صرف ترغیبی طریقوں کے استعمال کا مشورہ دیا۔ وزارت داخلہ نے قابل اعتراض فقروں کی طرف توجہ دلائی اور کارروائی تجویز کی جو وزارت داخلہ خود بھی کر سکتی تھی اس مسئلے پر چیف منسٹر کے ساتھ ایک ایک ماہ کے وقفے سے گفتگو ہوتی رہی۔ لیکن اس دفعہ نہیں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ وزارتِ داخلہ نے ایک "انتہائی مخفیہ نہایت فوری مرموز" تار میں کارروائی کی سفارش کی لیکن مجھے اپنے خیالات حکومت پر واضح کرنے پڑے میں نے اپنی یادداشت میں مرکز کی دوسری زبان یعنی وزارت اطلاعات کا ذکر نہیں کیا۔"

ہم میر نور احمد کے جوابات و تشریحات کا جتنا زیادہ مطالعہ کرتے جاتے ہیں اُتنا ہی ہمارا تشتّت کا احساس بڑھتا جاتا ہے لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ اگر وہ مرکز کی ضروری ہدایات کو اس خیرہ چشمی سے رد کر رہے تھے تو انہیں ضرور کسی طرف سے مضبوط پشت پناہی حاصل تھی لیکن وزارت اطلاعات کے کسی قول کا (بشرطیکہ وہ سچ مچ کہا گیا ہو) کوئی بعید سے بعید تعلق بھی اس فقرے سے کیونکر ہو سکتا ہے جو میر صاحب کی یادداشت میں موجود ہے: "اگر یہ شورش قانون شکنی کی شکل اختیار کرے تو حکومت اس کے تدارک کے لئے ایک جامع پالیسی وضع کرے تو اخبارات کے خلاف کارروائی بھی اسی پالیسی کا ایک حصہ ہو گی"۔ میر صاحب کے کئی جملے اور محاورے ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں لہٰذا ہم نے ان سے پوچھا کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ کارروائی اُس وقت تک

ملتوی رکھی جائے جب تک قانون شکنی شروع نہ ہو جائے"؟ انہوں نے کہا میرا مطلب محض یہ تھا کہ اگر لاقانونی پھوٹ پڑی تو غالباً کارروائی زیادہ شدید کرنی ہوگی" کارروائی سے میری مُراد مناسب کارروائی تھی۔

لغو یعنی ایسی کارروائی جو صورت حالات کے مناسب ہو" ہمارے نزدیک اس قسم کی تصریحات کے جواب میں کم سے کم جو لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے وہ "لغو" ہے۔

زمیندار منظور نظر اخبار تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ زمیندار بہت لاڈلا اخبار تھا میر نور احمد نے "زمیندار" کے تعلق میں ہر قسم کی واضح اور ضمنی مہربانیوں کو تسلیم کرنے کے بعد مسٹر دولتانہ کے وکیل کے جواب میں یہ بتایا کہ مولانا اختر علی خان کے تعلقات خواجہ ناظم الدین کے ساتھ بہت گہرے تھے لیکن کیا کوئی اور مولانا بھی ہیں جو اس عزت کے دعویدار نہ تھے؟ ہمارے نزدیک تو قاضی احسان احمد شجاع آبادی تک بھی جو احمدی لٹریچر کا ایک چوبی صندوق لئے پھرتے تھے اس اعزاز کے حامل تھے خواجہ ناظم الدین اپنے مذاکرات کو کامیاب بنانے کی امید میں ان تمام حضرات سے بخوشی ملاقات کر لیتے تھے اور اگر مولانا اختر علیخاں نے اس صورت حالات سے فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ بہاول پور سے کراچی جانیکے لئے گورنر جنرل کا وائیکنگ طیارہ تک طلب کر لیا تو اس سے محض اُن کے اپنے اوصاف عالیہ کا پتہ چلتا ہے اگرچہ اختر علیخاں نے حکومت اور عوام دونوں کو ممنون کرنیکی کوششیں کیں لیکن آخر خواجہ ناظم الدین نے ان کے متعلق یہی رائے دی کہ وہ ایک ڈھل مل یقین سے آدمی ہیں جو کراچی میں مجھ سے ایک بات کہتے ہیں اور لاہور میں پہنچکر کرتے کچھ اور ہیں۔

خواندگی بالغاں کا فنڈ

ابھی تعجب انگیز باتیں ختم نہیں ہوئیں جو روپیہ اخباروں پر صرف کیا گیا اس میں سے دو لاکھ تین ہزار کی رقم خواندگی بالغاں کے فنڈ سے اِدھر منتقل کی گئی تھی۔ اس فنڈ کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ قانون ساز اسمبلی نے یہ رقم ناخواندہ بالغوں کی تعلیم کے لئے منظور کی تھی غالباً میر نور احمد کو لفظ "خواندگی" سے کچھ غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے اس رقم کو "خواندہ" بالغوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا۔ کیونکہ کسی

ڈی پی آر نے اسے "خواندہ" بالغوں کے فنڈ کے طور پر استعمال کیا

ناخواندہ آدمی کو تعلیم دینے کا تو یہ طریقہ نہیں کہ اسکے ہاتھوں میں "زمیندار" یا "آفاق" کا پرچہ دے دیا جائے۔ کیونکہ کافی پڑھا لکھا آدمی ہی کسی اخبار سے استفادہ کر سکتا ہے جب میر نور احمد نے یہ تجویز پیش کی تو انہوں نے حکومت سے کہا کہ اس امر کو "صیغہ راز" میں رکھا جائے کیونکہ ان کے قول کے مطابق یہ "سیاسی خرچ" تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک بہتر دلیل یہ ہوتی کہ اگر یہ معاملہ ظاہر ہو گیا تو اسکے خلاف نکتہ چینی ہوگی وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں کسی قدر نکتہ چینی کی توقع ضرور تھی اور واقعہ یہ ہے کہ سررشتہ تعلیم نے اس فیصلے کے خلاف اعتراض کیا تھا

ناخواندوں کو تعلیم دینا مقصود نہ تھا لیکن میر صاحب کا بیان ہے کہ انہیں حکومت کی منظور کی ہوئی ایک سکیم پر عمل درآمد کرنا تھا اور حکومت ہی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دوسرے فنڈ سے روپیہ منتقل کر لیا جائے اس کے بعد ایک واضح اعتراف بھی ہے: "ہماری سکیم کا مقصد ناخواندہ لوگوں کو

پڑھانا نہیں تھا بلکہ بعض خاص قسم کے اخباروں کو مالی امداد دینا تھا۔"

انہوں نے فائل (EX.D.E.250) میں ۳۰۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو ایک یادداشت لکھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے قبل چیف منسٹر سے گفتگو ہو چکی تھی یہ یادداشت چیف سیکرٹری اور چیف منسٹر کے پاس بھیجی گئی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ میر نور احمد صرف "اپنے طور پر" یہ کام نہ کر رہے تھے مسٹر دولتانہ نے تسلیم کیا کہ وزیر تعلیم چیف منسٹر کی اطلاع کے بغیر فنڈ کو دوسری جگہ صرف کر سکتے تھے اس کے بعد ان کو فائل دکھائی گئی جس پر انہوں نے کہا کہ "اگر فائل میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس کیس کے متعلق مجھ سے بات چیت کی تھی تو ضرور کی ہوگی کیونکہ یہ پالیسی کا معاملہ تھا۔"

ممکن ہے اخبارات کسی کو بھی نہ بھیجے گئے ہوں

یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا خواندہ لوگ واقعی مزید خواندہ بنائے گئے تھے۔ ڈائرکٹر نے تسلیم کیا ہے کہ ڈائرکٹوریٹ اخبارات کے جتنے پرچے خریدتی تھی ان کی کل تعداد اُن اداروں کی کل تعداد کے مقابلے میں جن کے لئے وہ خریدے جاتے تھے "بہت ہی زیادہ" تھی۔ ایک فہرست سے یہ ظاہر ہوا کہ فرمائش تو ساڑھے تین سو پرچوں کی دی گئی لیکن جن اداروں کے لئے ان کی ضرورت تھی وہ ۲۳۰ تھے لیکن بعض وقت مختلف اخباروں کے پرچے (یعنی ایک سے زیادہ پرچے) ایک ہی ادارے کو مہیا کر دیئے جاتے تھے فائل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان اداروں کو یہ اطلاع بھی دی جاتی تھی کہ فلاں پرچہ اتنی مدت کیلئے ان کے نام جاری کر دیا گیا ہے لہذا گویا اخباروں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا کہ پرچہ بھیجیں یا نہ بھیجیں۔

آفاق

ان اخباروں میں سے "آفاق" تو حکومت ہی کا اخبار تھا اور یہ اسی واقعہ سے ظاہر ہے کہ اسکو کل ۱۲۲۸۵ روپے کی رقم ادا کی گئی۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور جونہی وسط جون ۱۹۵۱ء میں اسے بیالیس ہزار روپے کی پہلی رقم ادا کی گئی یہ روزانہ اخبار ہو گیا۔ میر نور احمد کا بیان ہے کہ اُن کا اس اخبار سے کوئی ذاتی تعلق نہ تھا لیکن ان کے فرزند میر اقبال احمد روز اول ہی سے چار سو روپے ماہوار پر اسکے مہتمم اشتہارات بن گئے تھے۔ "اس نے فن اشتہار میں کوئی خاص ٹریننگ حاصل نہیں کی لیکن وہ گریجویٹ ہے اس سے پیشتر اس نے کسی اخبار میں ملازمت نہ کی تھی۔ وہ نمک کی برآمد کا کاروبار کرتا تھا۔" کئی دن بعد مسٹر دولتانہ کے وکیل مسٹر یعقوب علی خاں نے ان کو یاد دلایا کہ میر اقبال احمد تقسیم سے پہلے حکومت ہند کے ماتحت تین سو روپے ماہوار پر پبلسٹی افسر بھی تو رہ چکے ہیں اس پر میر نور احمد نے کہا کہ میں نے سابق میں اس بات کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ مجھ سے جو سوال کیا گیا تھا وہ میرے خیال میں اس اسامی کی خاص ٹریننگ کے متعلق تھا بہرحال میر نور احمد نے یہ بھی کہا کہ چیف منسٹر "سیاسی اعتبار" سے "آفاق" میں دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے پانچ ہزار روپے کا چیک "آفاق" کو بطور عطیہ بھیجا دیا تھا اس کے متعلق مسٹر دولتانہ نے کہا کہ یہ رقم بعض مسلم لیگی کارکنوں نے دی تھی تاکہ آفاق کو بطور عطیہ دے دی جائے۔ کیونکہ "آفاق" نے مسلم لیگ کے مقاصد کی خدمات انجام دی ہیں بہرحال جو کچھ بھی ہو یہ رقم مسٹر اقبال احمد کے حساب میں داخل کر کے انہیں "آفاق لمیٹڈ" کا حصہ دار بنا دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ میر اقبال احمد ایک دن صبح کو سو کر جو اٹھے تو انہوں نے ایک پیسہ ادا کئے بغیر اپنے آپکو پانچ ہزار روپے کے حصوں کا مالک پایا لیکن ان کے والد کا بیان

ہے کہ یہ روپیہ وہ نہ تھا جو لائل پور سے یا مسٹر دولتانہ سے ملا تھا۔" گورننگ ڈائرکٹر نے اقبال احمد کو جنرل منیجر کا عہدہ پیش کیا اور مجھے یقین ہے (زور لفظ "یقین" پر ہے) کہ اس کو اُن مزید فرائض کے معاوضے میں جو اس پر عائد ہونے والے تھے ان حصّوں کو قبول کرنے کے لئے کہا۔" ہمارا خیال ہے کہ میر نور احمد فنِ تصریح کے بہت بڑے ماہر ہیں کاش انھوں نے اپنی اس مہارت فن کو شورش کے خلاف نشر و اشاعت میں استعمال کیا ہوتا۔

اس کے بعد چند تحریری شہادتیں ان کو دکھائی گئیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف "آفاق" میں مضمون لکھتے تھے بلکہ اس کو مشورے دیتے تھے اور اسکی پالیسی کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔

"مزدور"

اخبارات کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے دو ایسے اخباروں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو احرار یا فتنہ گروہ میں تو شامل نہ تھے لیکن اُن سے انتہائی مہربانی اور مرحمت کا سلوک کیا جاتا تھا حالانکہ وہ انتہائی ناشائستہ لٹریچر کی اشاعت کر رہے تھے ان میں سے ایک اخبار "مزدور" تھا جسکو سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا ایک بیٹا ابوذر شائع کرتا تھا جب اس نے ڈیکلریشن کی درخواست دی اس وقت بھی معلوم تھا کہ اس اخبار کی سرگرمیاں احمدیوں کے خلاف ہونگی لیکن اس کے باوجود ایک ہزار روپے کی ضمانت لے کر اس کا ڈیکلریشن منظور کر لیا گیا احمدیوں کے خلاف اکھاڑے میں ایک اور مُگتے باز کا کون خیر مقدم نہ کرے گا اور اگر ضمانت کی ضبطی کا موقع بھی آ گیا تو نا قابل فہم دلائل اور سفسطائیت پر مبنی ایک یادداشت فی الفور تیار کی جا سکیگی۔ یہ ۱۳۔ جون ۱۹۵۲ء کو جب اس اخبار نے مرزا غلام احمد کے متعلق ذیل کے الفاظ استعمال کئے: "حضرت خلیفۃ المسیح الزانی۔ بدھا۔ حالہ تالہ" تو میر نور احمد نے محض تنبیہ کی سفارش کی۔ میر صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کارروائی ناکافی تھی اور حسِ تناسب کے فقدان کی مظہر تھی لیکن ان کا عذر یہ ہے کہ اسی کارروائی کی تجویز ڈی آئی جی نے کی تھی۔

"آزاد"

ایک اور اخبار "آزاد" تھا جس کے متعلق رپورٹ کے اس حصّے میں اور دوسرے مقامات پر بھی کافی ذکر آ چکا ہے۔ زمانہ زیر تبصرہ میں اس اخبار نے اتنا قابل اعتراض اور فحش لٹریچر شائع کیا ہے کہ ہمارے لئے اسکے نمونے نقل کرنا مشکل ہے اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان مضامین میں سے بعض کی طرف مرکزی حکومت تین یا چار موقعوں پر حکومت صوبہ کو توجہ دلا چکی تھی ہر دفعہ یہی جواب دیا جاتا تھا کہ تنبیہ کر دی گئی ہے آخر وزارت داخلہ کو یہ کہنا پڑا کہ تنبیہات چونکہ غیر موثر ثابت ہوئی ہیں اس لئے اس اخبار کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ یہ ۱۰۔ دسمبر ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے حکومت پنجاب نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ ہم بتا چکے ہیں کہ اس مہینے کے اواخر میں اس اخبار کی اشاعت مورخہ ۱۲۔ دسمبر ۱۹۵۲ء کے ایک نہایت مکروہ مضمون کو حکومت نے بالکل نظر انداز کر دیا۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں میر نور احمد نے مجبور ہو کر سفارش کی کہ اس اخبار کو چھ ماہ کے لئے بند کر دیا جائے لیکن چیف منسٹر نے ان سے اتفاق نہ کیا یہاں تک کہ مرکزی حکومت نے ۲۶ فروری کو کابینہ میں ایک فیصلہ کیا جس کے رو سے یہ اخبار ایک سال کیلئے بند کر دیا گیا۔

ڈائرکٹ ایکشن

اس زمانے کے تذکرے کو ختم کرنے سے پہلے ہم یہ ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ ۲۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو یا اس کے لگ بھگ علماء نے وزیر اعظم کو کراچی میں ڈائرکٹ ایکشن کا چیلنج دے دیا گو اس کی وضاحت نہ کی کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ خواجہ ناظم الدین کو اس امر میں کوئی شبہ نہ تھا کہ یہ عمل نقض امن کا باعث ہوگا "گذشتہ تجربے سے خصوصاً قبل تقسیم کے زمانے کے واقعات سے یہ ثابت ہے کہ سول نافرمانی کی تمام تحریکیں اسی اعلان کے ساتھ شروع کی گئیں کہ وہ پُر امن اور بے تشدد ہوں گی لیکن ان کا انجام ہمیشہ تشدد پر ہوا"۔ جب خواجہ صاحب ۱۶ فروری کو لاہور آئے اور چیف منسٹر اور گورنر نے ان سے کہا کہ مطالبات کے متعلق کچھ کیجئے تو انہوں نے کہا کہ "میں علماء کے ساتھ جنگ و تصادم پر آمادہ نہیں ہوں" جو مطالبات پر تو متفق ہیں لیکن الٹی میٹم کی صحت و درستی پر متفق نہیں ہیں۔ مسٹر چندریگر کے بیان کے مطابق وزیر اعظم نے یہ بھی کہا کہ وہ علماء سے مذاکرات کر رہے ہیں۔ چونکہ خواجہ صاحب خاص طور پر مضطرب اور خوف زدہ معلوم نہ ہوتے تھے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ وہ مذاکرات کے متعلق پر امید تھے ان کی امید کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک بعض علماء "ڈائرکٹ ایکشن" کے مخالف تھے۔

سی آئی ڈی کیا سمجھتی تھی

لیکن پنجاب کے حکام کو کسی قسم کا تیقن نہ تھا۔ فائل نمبر ج ۱۰ (۷) ۱۶ مظہر ہے کہ سی آئی ڈی نے یکم فروری ۱۹۵۳ء کو ایک چٹھی پکڑی جس میں اس بات کا قرینہ پایا جاتا تھا کہ ڈائرکٹ ایکشن کا پہلا قدم یہ ہوگا کہ احمدیوں کا سوشل مقاطعہ کیا جائے گا اور پر امن پکٹنگ بھی کی جائے گی۔ ۳ فروری کو مسٹر انور علی نے لکھا کہ احرار کے ایماء پر جو آل پارٹیز کنونشن قائم کی گئی تھی وہ مجبوراً ایسے موقف پر پہنچ گئی ہے کہ یا تو اسے ڈائرکٹ ایکشن کرنا پڑے گا یا ان لوگوں کے پیرو اور مریدان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے آپ نے یہ بھی لکھا کہ اگرچہ ڈائرکٹ ایکشن کی کوئی شکل اب تک معین نہیں کی گئی لیکن ابتدائی مرحلے میں غالباً احمدیوں کا مجلسی و اقتصادی مقاطعہ شروع کیا جائے گا احرار خوب جانتے ہیں کہ مسلسل جدوجہد کے لئے تحریک کا بے تشدد رہنا ضروری ہے لیکن اس میں انہیں اپنی کامیابی پر یقین نہیں۔

ڈی آئی جی کا قول: جمہور کو کوئی دلچسپی نہیں رہی ۳ فروری ۵۳ء

"جمہور کو اب احراریوں کی شورش سے چنداں دلچسپی نہیں رہی کیونکہ زیادہ اہم مسائل سامنے آ گئے ہیں"۔ وہ رضاکاروں کو بھرتی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان پر خوب نظر رکھنی چاہیئے۔ ۵ فروری ۱۹۵۳ء کو ڈی ایس پی (P) نے ڈی آئی جی کے زبانی احکام (برائے تحقیقات) کی تعمیل میں رپورٹ کی کہ "کنونشن کے لیڈر تک یہ نہیں جانتے کہ انہیں کیا کرنا ہوگا وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ ڈائرکٹ ایکشن کیا جائے گا"۔ تاہم یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس مہم کا آغاز کراچی سے کیا جائے گا تمام سلسل

کراچی اس کا مقام ہوگا

خبر رسانی اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ اولین مرحلے پر سوشل مقاطعہ اور احمدیوں کی دکانوں پر "پُر امن پکٹنگ" کیا جائے گا۔

ڈی آئی جی پُر امید دکھتے ۱۰ فروری ۵۳ء

جب ۱۶ فروری کو وزیر اعظم کے ورود لاہور پر ہڑتال کی گئی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نتائج کو دیکھ کر مسٹر انور علی نے اپنی رائے تبدیل کر لی انہوں نے کہا کہ واقعات کی رفتار تیز ہے اور "آج لاہور میں دو واقعات رونما ہوئے ہیں جن کا نتیجہ تشدد میں نکلا ہے پابند قانون عوام کو شبہ ہو رہا ہے کہ شاید حکومت اس صورت حالات کے تدارک کی قابلیت نہیں رکھتی"۔ ذرا دیکھیے ۳ فروری کو یہ کہا گیا تھا کہ عوام کو شورش میں کوئی دلچسپی نہیں رہی ان دونوں بیانوں میں کتنا واضح تضاد ہے۔

ایس پی (بی) نظربندی کی سفارش کرتے ہیں

لیکن ہمیں اس پر یقین نہیں کیونکہ فائل نمبر 57/(2)16 - جلد سوم سے ظاہر ہوتا ہے کہ خطرے کے آثار ۱۶۔ فروری سے بھی پہلے نظر آ چکے تھے ۱۳۔ فروری کو ایس۔ پی (B) نے ایک خاص ذریعے کی رپورٹ نقل کی کہ ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور سفارش کی کہ ماسٹر تاج الدین، صاحبزادہ فیض الحسن، سید مظفر علی شمسی اور قاضی احسان احمد کو مقید کر لیا جائے کیونکہ یہ ڈائرکٹ ایکشن کے سرگرم حامی ہیں۔ انہوں نے ایک پوسٹر کا ذکر بھی کیا جو شمسی نے بحیثیت سیکرٹری مجلس عمل شائع کیا تھا، جس میں اعلان کیا تھا کہ ۱۵ فروری کو دہلی دروازہ میں ایک جلسہ ہوگا مسلمانوں کو چاہئے کہ سر سے کفن باندھ کر اس میں شریک ہوں۔ ایس پی (B) نے کہا کہ ۱۴ فروری کو بھی پروپیگنڈا شدید تھا اور لوگوں سے کہا جا رہا تھا کہ جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر آئیں ۱۶ فروری کو یہ رپورٹ دی گئی کہ یوم سابق کے جلسہ میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ احمدیوں کے کاروباری اداروں کی پکٹنگ کر کے ڈائرکٹ ایکشن کا آغاز کیا جائے گا اور دو ہزار رضاکار اسی مقصد کے لئے کراچی بھیجے جائیں گے انہوں نے کہا مولانا اختر علی خاں نے یقین دلایا تھا کہ حکومت پنجاب غالباً رضاکاروں کی نقل و حرکت پر قیود عاید نہیں کرے گی۔

لیکن ڈی آئی جی کہتے ہیں کوئی فوری خطرہ نہیں

ڈی آئی جی نے لکھا کہ کوئی فوری خطرہ نہیں ہے یہ تضاد کی ایک اور مثال ہے کیونکہ یہی ڈی آئی جی صاحب اسی تاریخ کو ایک اور فائل پر لکھ چکے تھے کہ "پابند قانون عوام کو شبہ ہے کہ شاید حکومت صورت حالات کے تدارک کی قابلیت نہیں رکھتی"

فوری خطرہ کیوں نہیں

ممکن ہے اس وقت سچ مچ کوئی فوری خطرہ نہ ہو کیونکہ شورش کا آغاز ایسے مقام پر ہونے والا تھا جو لاہور سے خاصا دور رہے اور اگر لاہور کو صرف رضاکاروں کی روانگی ہی سے تعلق تھا اور مولانا اختر علی خاں سے حکومت پنجاب کا کوئی سمجھوتہ ہو چکا تھا تو ظاہر ہے کہ مقامی طور پر بے فکری کی گنجائش ضرور تھی لیکن تشدد کے دو واقعات اور "جانیں ہتھیلیوں پر رکھ لینے" اور "کفن باندھ کر آنے" کے پروپیگنڈے کو کیا کیا جائے یہ بھی ممکن ہے کہ "فوری خطرے" کے الفاظ ایس پی (B) کی اس سفارش کے جواب میں استعمال کئے گئے ہوں کہ بعض اشتعال انگیز مقررین کو مقید کر دیا جائے۔

ڈی آئی جی کو ماسٹر تاج الدین نے گمراہ کیا

عدالت میں مسٹر انور علی نے کہا کہ جب انہیں ڈائرکٹ ایکشن کے چیلنج کی اطلاع ملی تو انہوں نے تجویز کی کہ حکومت کو فوراً مرکز سے خطاب کرنا اور اس کا رویہ معلوم کرنا چاہئے کیونکہ شورش کی آیندہ رفتار کا انحصار اسی بات پر ہے "ماسٹر تاج الدین نے جو اس وقت عدالت میں موجود ہیں خود مجھے بتایا کہ ڈائرکٹ ایکشن حقیقت میں شروع نہیں ہوگا ہماری اطلاع یہی تھی کہ یہ لوگ حکومت کو محض مجبور کر رہے ہیں تاکہ انہیں حسب منشا فیصلہ مل جائے اس امر کی بابت کہ احرار کا کوئی منصوبۂ عمل بھی تھا میرا خیال یہ ہے کہ میں نے ان سے زیادہ نعلیظ مغز لوگ آج تک نہیں دیکھے ۳ فروری ۱۹۵۳ء کو انہوں نے کہا کہ وہ ایک نہایت بے تشدد اور مسلسل جدوجہد کرنا چاہتے ہیں لیکن مجھے ان پر یقین نہ آیا اس لئے کہ ان کا گذشتہ طرز عمل یہی رہا ہے کہ عہد و پیمان کرتے رہے اور پھر اُن کو توڑتے بھی رہے"۔ تاہم ان کی یادداشت مورخہ ۳ فروری سے ظاہر ہے کہ انہوں نے ماسٹر تاج الدین پر یقین نہ کیا اور اس چالاک لیڈر نے بھی اُن کو یہ بتا کر گمراہ کیا کہ عوام کو اب شورش سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہم نہیں سمجھتے کہ کم از کم اس موقع پر ماسٹر نے کسی پریشان خیالی یا شدید بے مغزی کا ثبوت دیا ہو اس کو قدرتی طور پر یہ توقع تھی کہ چیلنج کے جواب میں حکومت کی طرف سے قانون و انتظام کی سرگرمی کا اظہار ہوگا لہٰذا وہ جیل میں جانے سے پہلے کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا خواہاں تھا اس

مزید اعتماد کی طرف توجہ کیجئے جو یہ احراری لیڈر سی آئی ڈی کے افسر اعلیٰ پر رکھتا تھا۔ "میں اپنے تحریری بیان میں کہہ چکا ہوں کہ آل مسلم پارٹیز کنونشن مجبور ہو کر اب ایسے موقف پر پہنچ چکی ہے کہ یا اسے ڈائرکٹ ایکشن کرنا ہو گا یا اپنے پیروؤں کی عقیدت و ارادت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے مجھے یہ معلومات خود ماسٹر تاج الدین سے حاصل ہوئی ہیں۔ جو اس وقت عدالت میں حاضر ہیں" اس امر کا ذکر ان کی رپورٹ مورخہ ۳ فروری میں بھی موجود ہے جو بالکل ماسٹر تاج الدین کی بہم پہنچائی ہوئی اطلاع پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اگر ماسٹر تاج الدین اپنی جماعت ہی کی جاسوسی کر رہے تھے تو وہ اور بات ہے ورنہ نہیں تو یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ ان کی دی ہوئی اطلاع بہ ذریعہ اطلاع ظاہر کئے بغیر اس قدر اقبال کیا جائے کہ اس کو رپورٹ میں درج کر لیا جائے۔ ممکن ہے ماسٹر تاج الدین کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی نام نہاد سا نقصان پہنچا لیتے ہوں اور یہ ظاہر کرتے ہوں کہ وہ (اپنے اخبار کو محفوظ رکھنے کی خاطر) بعض اسرار فاش کر رہے ہیں۔

ڈی آئی جی کا اقبال و اعتراف

آخر میں مسٹر انور علی نے کہا۔ "میں صاف طور پر اقبال کرتا ہوں کہ مجھ پر یہ بات بالکل واضح نہ تھی کہ ڈائرکٹ ایکشن کا مطلب کیا ہو گا لیکن یہ صحیح ہے کہ تقسیم سے پہلے اس کا مطلب سول نافرمانی اور قانون و انتظام کی خلاف ورزی ہی تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ احراری بیس ہزار رضا کار بھرتی کرنا چاہتے تھے لیکن میرا خیال یہ تھا کہ وہ محض حکومت کو پریشان کرنا چاہتے ہیں چنانچہ میں نے ان کو گرفتار کرنے کی کوئی تیاری نہ کی تھی" یہاں پھر مسٹر انور علی نے ماسٹر تاج الدین کی اس بات پر بھروسا کر لیا کہ "وہ محض حکومت کو مجبور کر رہے ہیں کہ فیصلہ ان کی مرضی کے مطابق ہو جائے" "حکومت" سے صاف مرکزی حکومت مراد تھی کیونکہ وہی ان مطالبات کو ردیا قبول کر سکتی تھی ہمارا خیال ہے کہ ہم نے اس معاملے کے متعلق جو کچھ فائلوں سے نقل کیا ہے اس کو مسٹر انور علی کے بیان کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس سے یہ رائے قائم کرنے کے لئے کافی مواد مہیا ہو جاتا ہے کہ ماسٹر تاج الدین مسٹر انور علی کو سیدھے راستے سے منحرف کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ان کو یہ یقین دلا دیا کہ ہوتا ہواتا کچھ بھی نہیں ہمارا مقصد تو صرف یہ ہے کہ مرکز کو مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور کریں اگر امر واقعہ یہ نہ ہوتا تو جس حالت میں میاں انور علی تجربے سے یہ جانتے تھے کہ ڈائرکٹ ایکشن کا مطلب سول نافرمانی ہے جو ہمیشہ تشدد پر ختم ہوا کرتی ہے تو وہ ۱۶ فروری کو یہ رائے ظاہر نہ کرتے کہ کوئی فوری خطرہ درپیش نہیں لیکن اگر ان کی دوسری آواز جو اسی دن ان کے کام و دہن سے نکلی (کہ پابند قانون عوام کو شبہ ہے کہ شاید حکومت موجودہ صورت حالات کے تدارک کی قابلیت نہیں رکھتی) صحیح آواز تھی تو جہاں ایک طرف ان کی تجویز یہ تھی کہ چیلنج کے متعلق مرکزی حکومت کا رویہ معلوم کرنا چاہیئے وہاں دوسری طرف انہیں ایس پی (ق) کا یہ مشورہ قبول کر لینا چاہیئے تھا کہ قانون و انتظام کی جنگ میں بہتر شجاعت یہی ہے کہ ملزموں کو قید کر دیا جائے۔

۴۔ آخری مرحلہ

مرکز کو چیف سیکرٹری کی چٹھی مورخہ ۱۴ فروری جس میں مضبوط پالیسی کا مطالبہ کیا گیا

اس مرحلے کا آغاز چیف سیکرٹری کی چٹھی مورخہ ۱۲ فروری سے ہوتا ہے جو انہوں نے مسٹر جی احمد سیکرٹری وزارت داخلہ کو لکھی احراریوں کے ان گناہوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد جو ماضی قریب میں ان سے سرزد ہوئے تھے اس چٹھی میں مرکز کو اطلاع دی

گئی تھی کہ ڈائرکٹ ایکشن غالباً کراچی میں ۲۲ فروری کو شروع ہو گا اس میں احمدیوں کی دکانوں پر پکٹنگ کیا جائے گا اور اس مقصد کے لیے رضاکار پنجاب اور دوسرے صوبوں سے بھیجے جائیں گے ۱۶ فروری کو وزیر اعظم کا استقبال ہڑتال اور کالی جھنڈیوں سے کیا گیا اور اسی دن ایک جلسۂ عام میں مقررین نے زور تو اس بات پر دیا کہ تشدد سے ہرگز کام نہ لیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے پولیس سے کہا جا رہا تھا کہ سول نافرمانی کا مقابلہ کرتے وقت یوم قیامت کو یاد رکھیں دکانداروں کو ان کی مرضی کے خلاف دکانیں بند کرنے پر مجبور کیا گیا اور جنہوں نے دکانیں بند نہ کیں ان کے منہ کالے کر دیے گئے۔ تشدد کے دو واقعات بھی رونما ہو گئے پابند قانون شہری ان مظاہروں کی مخالفت اس خوف سے نہ کر سکتے تھے کہ مبادا وہ احمدی قرار دے دیے جائیں لاہور کے ایک ڈپو ہولڈر نے ایک احمدی عورت کے ہاتھ گندم فروخت کرنے سے انکار کر دیا تا آنکہ اس عورت نے یہ اقرار نہ کر لیا کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے خلاف تحریک میں حصہ لے گی۔

چٹھی کے آخر میں یہ لکھا تھا: لیکن یہ شورش اس صوبے تک محدود نہیں اور مطالبات صوبائی دائرہ کار سے باہر ہیں حکومت اپنے آپ کو صورت حالات کے موثر تدارک میں بالکل بے دست و پا محسوس کر رہی ہے۔۔ اور سمجھتی ہے کہ اگر مرکزی حکومت ان مطالبات کے متعلق ایک مضبوط پالیسی اختیار کرنے کا اعلان کر دے تو اس سے صوبائی حکومت کے ہاتھ بڑی حد تک مضبوط ہو جائیں گے یہ پالیسی کچھ بھی ہو۔ . . . . صوبائی حکومت محسوس کرتی ہے کہ وہ صوبے کے اندر اس پالیسی پر عمل در آمد کرنے کی کافی قوت رکھتی ہے۔

لیکن مرکز کی پالیسی تو معلوم تھی ہم نے لاقانونی کی وہ تمام مثالیں نقل نہیں کیں جو اس چٹھی میں مذکور ہیں لیکن جو کچھ بھی ہم نے نقل کیا ہے وہ کم از کم فروری میں صورت حالات کی سنگینی کے اظہار کے لیے کافی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مرحلے پر بھی حکومت پنجاب قانون و انتظام کی کیفیت پر قابو پانے کے لیے آمادہ نہیں تھی تاوقتیکہ مرکز مطالبات کے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان نہ کرے لیکن کیا یہ امر بالکل واضح نہ تھا کہ مرکز کی پالیسی اس معاملہ میں یہ تھی کہ موافق یا مخالف کوئی اعلان نہ کیا جائے اور جارحانہ فرقہ بندی کو سختی سے دبا دیا جائے؟ کیا ۲۰ فروری تک سختی سے دبانا تو درکنار محض دبانے ہی کی کوئی مثال دستیاب ہو سکتی ہے؟ "آزاد" اور "زمیندار" بدگوئی اور دشنام طرازی میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے اور صبر ذرا ہمہ انتظار کر رہے تھے کہ یہ شورش قانون شکنی کی شکل اختیار کرے تو دیکھیں۔

کراچی کانفرنس ۲۶ فروری ۱۹۵۳ء اس چٹھی کے موصول ہونے پر خواجہ ناظم الدین نے ۲۶ فروری کو گورنروں اور چیف منسٹروں کا ایک اجلاس طلب کیا لیکن مسٹر چندریگر اور مسٹر دولتانہ نے مختلف وجوہ کی بنا پر حاضری سے معذوری ظاہر کی یہ وجوہ معقول تھیں یا غیر معقول بہرحال خواجہ ناظم الدین کو یقین نہ آیا اور انہوں نے ٹیلی فون پر مسٹر دولتانہ سے بات کی اس پر یہ فیصلہ ہوا کہ مرکزی کابینہ کے سامنے حکومت پنجاب کے خیالات وزیر مال چودھری محمد حسین چٹھہ پیش کریں گے اور ان کے ساتھ مسٹر غیاث الدین اور مسٹر انور علی بھی ہوں گے ان کانفرنسوں میں جو ۲۶ کی شام کو اور ۲۷ کو آدھی رات کے بعد ہوئیں ان کی تفصیلات سے سوائے مندرجہ ذیل امر کے ہمیں کوئی سروکار نہیں

مسٹر چٹھہ کا بیان شام کی کانفرنس میں مسٹر چٹھہ نے بیان کیا کہ حکومت پنجاب کی رائے یہ ہے کہ وہ تحریک کے آگے جھک نہیں سکتی اور یہاں جو فیصلہ بھی ہو گا پنجاب اس پر عمل در آمد کرے گا ممکن ہے اس میں گولی چلانے اور فائرنگ کرنے کی ضرورت بھی

ہو اور یہ صرف مرکز کی پوری پشت پناہی ہی سے کیا جا سکتا ہے خان عبدالقیوم خاں نے پنجاب کے خیالات کی "حمایت" کی اور کہا کہ تحریک کو کچل دینا چاہیے خواجہ شہاب الدین نے ان کی "تائید" کی اور کہا کہ حکومت کو ایک قطعی غلط مسئلے پر ملاؤں کے آگے نہیں جھکنا چاہیے خواجہ ناظم الدین نے ملاؤں کو کچلنے سے اتفاق نہ کیا اور استعفا دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ کوئی فیصلہ نہ ہوا اور اجلاس اگلی صبح پر ملتوی کر دیا گیا لیکن آدھی رات کے وقت ایک بج کر پندرہ منٹ پر ہر شخص کو نیند سے جگایا گیا اور خواجہ ناظم الدین نے ان کو بتایا کہ انہیں ایک الٹی میٹم موصول ہوا ہے کہ ان کی کوٹھی پر صبح پکٹنگ کیا جائے گا خواجہ صاحب کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ علما تمام متفق نہیں ہیں اور زیادہ تر اسی وجہ سے خواجہ صاحب نے فیصلہ کیا تھا کہ چیلنج قبول کر لیا جائے اور فجر سے پہلے پہلے مجلس عمل کی گرفتاری کا حکم دے دیا جائے انہوں نے مطالبات کے متعلق کسی قسم کا اعلان کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس مسئلہ کا تدارک خالص قانون و انتظام کی سطح پر کروں گا۔

مسٹر چیٹھا کے بیان کی تفسیر

یہ وہ رپورٹ تھی جو مسٹر چیٹھا نے کراچی سے واپس آکر اپنی حکومت کو دی اور یہ ضمیمہ نمبر ۵ کی حیثیت سے مسٹر دولتانہ کے تحریری بیان کے ساتھ منسلک ہے خواجہ ناظم الدین کو اس کے اکثر حصے سے اتفاق

خواجہ ناظم الدین

ہے سوائے اس کے کہ ان کے نزدیک مسٹر چیٹھا مطالبات کو رد کرنے کے قطعی طور پر حامی تھے انہوں نے یہ بھی کہا کہ مسٹر دولتانہ نے ۲۰ فروری کو ٹیلیفون پر گفتگو کے دوران میں بھی یہ بتایا تھا کہ ان کی کابینہ نے مطالبات

مسٹر دولتانہ

کو رد کرنے کا فیصلہ کیا ہے مسٹر دولتانہ کو اس پر اصرار ہے کہ مسٹر چیٹھا کو یہ گذارش کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا تھا کہ مطالبات رجعت پسندانہ ہیں بلکہ یہ کہ ان مطالبات کو پیش کرنے کا طریقہ رجعت پسندانہ ہے لیکن اگر صوبے کی رائے یہ تھی تو پھر مسٹر چیٹھا نے مطالبات کے متعلق اعلان پر کیوں اصرار کیا؟ اگر مطالبات کے مادہ و ماعلیہ اور ان کے پیش کرنے کے طریقے کے درمیان اب یہ خط فاصل نہ کھینچ دیا گیا ہوتا تو مسٹر چیٹھا کے میمورنڈم سے ہم یہی سمجھتے کہ انہیں مطالبات ہی پر اعتراض ہے کیونکہ ان کی رائے یہ تھی کہ حکومت پنجاب اس تحریک کے آگے جھک نہیں سکتی اور خان عبدالقیوم خاں نے پنجاب کی رائے کی حمایت کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ تحریک کو کچل دینا چاہیے خواجہ شہاب الدین نے ان کی تائید کی اور کہا کہ حکومت کو ملاؤں کے آگے نہیں جھکنا چاہیے لہٰذا پنجاب کی رائے جس کی "حمایت" اور "تائید" دوسرے دو حضرات نے کی تھی یہی ہونی چاہیے تھی کہ حکومت کو ملاؤں کے آگے نہ جھکنا چاہیے جس کا مطلب یہی ہے کہ مطالبات رد کر دینے چاہئیں۔

خان سردار بہادر خاں سردار عبدالرب نشتر

خان سردار بہادر خاں اس کانفرنس کے متعلق تو کچھ نہیں کہتے لیکن ۸-۹-اور ۱۰ اگست سنہ ۱۹۵۲ء کی کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے وہ مسٹر دولتانہ سے یہ رائے منسوب کرتے ہیں کہ مطالبات غیر معقول ہیں اور رد کر دینے چاہئیں سردار عبدالرب نشتر کا بیان ہے کہ مسٹر چیٹھا اور خان عبدالقیوم خاں دونوں نے پورے زور سے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس "تحریک" کی سرکوبی کر دینی چاہیے اب اس کے معنی اس امر پر منحصر ہیں کہ "تحریک" سے کیا مراد ہے اگر اس سے احمدیوں کے خلاف تحریک مراد ہے اور یہی ہونا چاہیے تو وہ تین مطالبات کے سوا اور کسی چیز پر مشتمل نہیں لیکن اگر اس کا مطلب تازہ واقعہ یعنی "ڈائرکٹ ایکشن" کے فیصلے سے ہے تو پھر اس میں مطالبات کا کوئی دخل نہیں۔ ان تحقیقات کے مقاصد کے اعتبار سے ہمیں تو نظر نہیں آتا کہ مسٹر دولتانہ کو اس امر سے کیا فائدہ پہنچ سکتا

تفاوت کے بغیر امتیاز

ہے البتہ اگر لوگوں پر یہ واضح کرنا سیاسی اعتبار سے مفید ہے کہ مسٹر دولتانہ بدستور مطالبات

کی معقولیت کے قائل ہیں یا ان سے منکر نہیں ہیں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

مطالبات کے متعلق مرکز کا رویہ ۲۷۔فروری ۱۹۵۳ء

لہٰذا ہم آگے چلتے ہیں اگرچہ اب خواجہ ناظم الدین یہ اعلان عام کرنے پر آمادہ نہ ہوسکے تھے کہ انہوں نے مطالبات کو رد کردیا ہے لیکن اسی دن وہ اس بات پر رضامند ہوگئے کہ تمام صوبوں کے نام ایک خفیہ تار بھیجا جائے جس میں مطالبات کے متعلق مرکزی حکومت کا رویہ واضح کردیا جائے اس تار میں کہا گیا کہ نہ تو جمہور کے کسی طبقے کو اس کی مرضی کے خلاف غیر مسلم اقلیت قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ کسی احمدی افسر یا وزیر خارجہ کو محض مذہب کی بنا پر ان کے عہدوں سے برطرف کیا جاسکتا ہے اس تار میں یہ بھی لکھا گیا کہ مرکزی حکومت کوئی سرکاری اعلان جاری نہیں کرنا چاہتی لیکن صوبائی حکومتوں کو چاہیئے کہ فی الفور انہی خطوط پر پرنٹ و نشر و اشاعت کو منظم کریں اور اخبارات کو بھی مناسب ہدایات دے دیں۔

اس کے ساتھ ہی اخباروں میں ایک سرکاری اعلان بھیجا گیا جس میں احراریوں کی تاریخ بیان کی گئی اور اس امر کو واضح کیا گیا کہ حکومت ڈائرکٹ ایکشن کی دھمکی سے مرعوب ہونے کا ارادہ نہیں رکھتی اور قانون و انتظام کو بحال رکھنے کے لئے اپنے پورے وسائل کو کام میں لائے گی۔

اس مرحلے پر دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ اول۔ مسٹر چیمہ اور ان کے دو ساتھی افسروں نے یہ واضح کردیا کہ وہ پنجاب کی صورت حالات کا تدارک کماحقہٗ کرسکتے ہیں۔ دوم۔ ۲۷ فروری کو انہیں مطالبات کے متعلق مرکز کا رویہ صاف طور پر معلوم ہوچکا تھا اور پنجاب کے دوسرے افسروں اور وزیروں کو اس کی اطلاع دوسرے دن ہوگئی تھی۔

چیف منسٹر کی کوٹھی پر ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء کو فیصلے کئے گئے

جب مسٹر چیمہ اور ان کے رفقا لاہور واپس آئے تو مسٹر دولتانہ کی کوٹھی پر ان کا ایک اجلاس ہوا اور کراچی میں جو قول و قرار کئے گئے تھے ان کی روشنی میں بعض فیصلے کئے گئے (ہوم سیکرٹری کے تحریری بیان کا ضمیمہ ل) یہ فیصلہ ہوا کہ ہر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک ایک فہرست مہیا کرکے تمام سرگرم احراریوں کو زیر دفعہ ۳۔ پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کرلیا جائے اور "زمیندار" "آزاد" اور "الفضل" بند کردئے جائیں۔ ۲۸ فروری کو چیف سیکرٹری کی طرف سے ایک گشتی مراسلہ تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو بھیجا گیا جس میں ان کو ہدایت کی گئی کہ صورتِ حالات کے متعلق چوکنے رہیں اور "مزید گرفتاریوں" کا حکم اس وقت تک نہ دیں جب تک مقامی حالات کے اعتبار سے ایسی کارروائی قطعی طور پر ضروری نہ ہوجائے اور پہلے سے مشورہ کرنے کا کافی وقت نہ ہو۔ مزید گرفتاریوں کے متعلق جو پابندی عاید کی گئی اس پر خاصی بحث ہوئی لیکن مسٹر دولتانہ کا دعویٰ ہے کہ اجلاس میں اس قسم کا کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا اور چونکہ ۲۷۔فروری کے فیصلوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں اس لئے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ چٹھی کے اس حصے کے متعلق مسٹر دولتانہ کو جواب دہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ چٹھی چیف سیکرٹری نے مسٹر دولتانہ کو دکھائے بغیر جاری کردی تھی کسی چٹھی کو جاری کرنے کا کام یقیناً چیف سیکرٹری کے سپرد کیا جاسکتا ہے اور اگر اس میں ہدایات سے زاید کوئی بات لکھی ہو تو اس کی ذمہ داری وزیر پر عاید نہیں کی جاسکتی۔

رضاکار

اس کے بعد رضاکاروں کو کراچی جانے سے روکنے کے متعلق بھی کچھ اختلاف ہے لیکن ہم اس کو چنداں اہمیت نہیں دیتے اس لئے کہ اس معاملہ میں اقدام نہ کرنے کے باعث کوئی سنگین نتائج برآمد نہیں ہوئے مسٹر انور علی بیان کرتے ہیں کہ کراچی میں ۲۰ فروری کو یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ صوبائی حکومت رضاکاروں کو کراچی جانے سے روکے چنانچہ انہوں نے لاہور واپس آنے

کے بعد مختلف فیصلوں کو قلم بند کر کے ہوم سیکرٹری کے حوالے کر دیا تاکہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے نام ضروری ہدایات صادر کر سکیں اس پر عمل کیا گیا اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ ترغیب و تلقین کے طریقے اختیار کریں

مسٹر دولتانہ نے ہدایات میں ترمیم کردی

یا گرفتاریوں سے کام لیں لیکن ۲ مارچ کو انہیں چیف منسٹر کی ہدایات ان کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر ذاکر قریشی کی وساطت سے موصول ہوئیں کہ رضاکاروں کو روکنے سے چونکہ ان اضلاع میں جوش پھیل گیا ہے لہذا حتی الوسع گرفتاریاں نہ کی جائیں اور صرف ترغیب و تلقین کے طریقوں ہی سے کام لیا جائے لہذا مسٹر انور علی نے ڈی آئی جی ملتان کو ٹیلیفون کیا کہ اگر سمجھانے بجھانے کا طریقہ ناکام رہے تو رضاکاروں کو کراچی کی طرف روانہ ہونے کی اجازت دے دی جائے اس حالت میں اُن کو کراچی اور سندھ کے حکام گرفتار کر لیں گے مسٹر دولتانہ کا قول ہے کہ ان کی ہدایات کے معنی غلط سمجھے گئے ان کا مطلب یہ تھا کہ بڑے شہروں میں گرفتاریاں کرنا مناسب نہیں بلکہ یہ کارروائی لاہور اور لودھراں کے درمیانی سٹیشنوں پر کرنی چاہیئے۔ ۳ مارچ کو جب ہوم سیکرٹری نے ان کو بتایا کہ ان کی ہدایات کے سمجھنے میں گڑبڑ ہوئی ہے تو انہوں نے پوزیشن صاف کر دی یہ صحیح ہے کہ ملک حبیب اللہ ایس پی (سی آئی ڈی) کی یادداشت پر جس میں مسٹر انور علی کے بیان کے مطابق ہدایات درج تھیں چیف منسٹر نے ۹ مارچ کو دستخط کر دیئے تھے اور ان کی صحت و درستی پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا لیکن اب مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ اس وقت غلطی کی طرف اشارہ کرنا بے نتیجہ اور غیر مفید ہوتا۔

مسٹر انور علی نے بیان کیا کہ جہاں تک انہیں معلوم ہے صرف دو جتھے کراچی کو روانہ ہوئے تھے پہلا زیر سرکردگی صاحبزادہ فیض الحسن ۲۸ فروری کی ہدایات کے اجرا سے پہلے روانہ ہو چکا تھا اور دوسرا لودھراں پر روکا گیا اگرچہ خواجہ ناظم الدین کا بیان یہ ہے کہ کراچی اور سندھ کے حکام پنجاب سے رضاکاروں کی پیہم آمد کی بار بار شکایت کر رہے تھے لیکن ان کی شہادت محض سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے لہذا اس کو کسی مضبوط فیصلے کے لیے استعمال نہ کرنا چاہیئے تاہم یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ رضاکاروں کے متعلق ہدایات کچھ مدت کے لیے چیف منسٹر کے ایما سے نرم کر دی گئی تھیں۔

مرکز کے رویہ کا پروپیگنڈا مطلوبہ خطوط پر نہ کیا گیا

مطالبات کے متعلق مرکز کے رویے کی نسبت جو تار جاری کیا گیا تھا اس کو حکومت پنجاب نے اُس طریقے سے استعمال نہ کیا جس کو مرکز چاہتا تھا اور یہ کوتاہی قریب قریب تنہا میر نور احمد کی غیر مرئی کوشش کا نتیجہ تھی یاد ہوگا کہ صوبائی حکومتوں سے دو باتیں کہی گئی تھیں (۱) "ان خطوط پر" پُرزور نشر و اشاعت کو منظم کیا جائے (۲) اخبارات کی مناسب ہدایت و رہنمائی کی جائے ہوم سیکرٹری نے ممتاز ایڈیٹروں کو طلب کر کے ان کو بتایا کہ مطالبات کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے (ایڈیٹروں پر اس رویہ کا سرچشمہ ظاہر نہیں کیا گیا) اس کے بعد انہوں نے تار کی ایک نقل ڈائرکٹر تعلقات عامہ کو "بغرض کارروائی ضروری" ارسال کی اور اس کے ساتھ ذیل کی سطور لکھ دیں: "میں نے ایک پریس کانفرنس کو جس میں متعدد مقامی روزناموں کے ایڈیٹر مدعو تھے خطاب کیا چیف سیکرٹری کے مشورے سے سرچشمہ ہدایت کو بے نقاب کیے بغیر ان کو حکومت کا رویہ بتایا اور ان پر واضح کر دیا کہ یہ گفتگو قطعی طور پر اشاعت کے لیے نہیں ہے۔"

ڈی پی آر نے کچھ نہ کیا

میر نور احمد نے محض یہ کیا کہ تار کا مضمون غیر سرکاری طور پر اخباروں کے ایڈیٹروں کو بھیج دیا۔ لیکن جب ان سے سوال کیا گیا کہ آیا آپ نے ہوم سیکرٹری کی یادداشت کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ ہوم سیکرٹری خود بھی یہی کچھ کر چکے ہیں اور آپ کو تار کی نقل بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ ضروری کارروائی کریں اور "پُرزور

نشرو اشاعت" کو منظم کریں؟ تو میر صاحب نے جواب دیا کہ "میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ مرکز کے خیالات اخباروں کے ایڈیٹروں تک پہنچا دے۔"

چیف سیکرٹری نے بھی کچھ نہ کیا

اس تار کا مضمون ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو بھی مہیا نہ کیا گیا جس سے انہیں مرکزی حکومت کا وہ رویہ معلوم ہو جاتا جس کا انتظار مدت سے کیا جا رہا تھا لیکن یہ کام (جیسا کہ مسٹر دولتانہ بجا طور سے کہتے ہیں) چیف سیکرٹری کا تھا۔

نہ مسٹر دولتانہ نے کچھ کیا

خود مسٹر دولتانہ نے بھی "مسلم لیگ کے عظیم الشان اثر۔ اس کی ساکھ اور اس کی تنظیم کو بروئے کار لانے کی کوئی کوشش نہ کی جو اس شورش کے دوران میں بالکل جامد اور شل اور ابتر ہو رہی تھی" یہ الفاظ خود مسٹر دولتانہ کے ہیں وہ اس کوتاہی کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ رائے عامہ کو مجتمع کرنے کے لیے کافی وقت نہ تھا وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ۲۷۔ فروری کو یہ توقع نہ تھی کہ مستقبل قریب میں کوئی شدید عمل رونما ہونے والا ہے لیکن "یہ بالکل ممکن ہے کہ اگر ہم لیگ کونسل کا جلسہ طلب کرتے تو ممبروں پر کوئی اثر نہ ڈال سکتے اور بالکل قائل نہ کر سکتے" ہم یقین کرتے ہیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ ۲۷۔ فروری کو بھی اتنا ہی صحیح تھا جتنا ایک سال قبل صحیح تھا لہٰذا یہ دعویٰ کرنا بیکار ہے کہ اگر مرکز کی طرف سے ذرا پہلے کوئی اعلان ہو جاتا تو مسلم لیگ کی کوششوں سے صوبے کے امن و امان پر کوئی خاص اثر پڑ جاتا لیکن مسٹر دولتانہ بے عملی کی ایک اور وجہ بھی بیان کرتے ہیں "مزید براں ہر مسلم لیگی پارٹی کے ضبط و نظم کے ماتحت سول نافرمانی سے الگ رہنے پر مجبور تھا اور اگر اس سے یہ کہہ بھی دیا جاتا کہ حکومت کی پالیسی مطالبات کو رد کر دینے کی ہے تو اس کے رویہ میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا" اس امر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ محض ایک منفی اور انفرادی فرض تھا مثبت فرض یہ تھا کہ دوسروں کو بھی اپنا ہم خیال بنانے کے لئے اجتماعی جدوجہد منظم کی جاتی۔

۲۸۔ فروری کے بعد کے واقعات

جو کوائف مارشل لا پر منتج ہوئے ان کی باقی کہانی یہ ہے کہ اگرچہ لاہور میں ۲۸ فروری ہی کو جب لیڈر گرفتار کر لیے گئے تھے جلوس بازی شروع ہو گئی تھی لیکن دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے احکام ۲۔ مارچ کے واقعات سے پہلے نافذ نہ کیے گئے اور اس وقت بھی "اندرون فصیل" شہر کو مستثنیٰ رکھا گیا اسی دن صبح کو ہوم سیکرٹری نے جنرل آفیسر کمانڈنگ دسویں ڈویژن لاہور چھاؤنی (میجر جنرل محمد اعظم خاں) سے درخواست کی کہ بدنظمی کے انسداد اور اس کی سرکوبی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کو مدد دینے کے لیے فوجی امداد مہیا کی جائے فوج آگئی اس نے باغ جناح میں ڈیرے ڈال دیئے اور فوج کے گشتی دستے مجسٹریٹوں کی معیت میں شہر میں گشت لگانے لگے۔ ۳۔ مارچ کی شام کو انسپکٹر جنرل نے چیف منسٹر کو اطلاع دی کہ "آدھی لڑائی تو فتح ہو چکی"، لیکن بعد میں یہ اندازہ ضرورت سے زیادہ پُرامید ثابت ہوا کیونکہ دوسرے ہی دن شام کو مسجد وزیر خاں کے دامن میں ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ

عبدالستار نیازی مسجد وزیر خاں میں

پولیس کو بے شمار زخم لگا کر ہلاک کر دیا گیا مسجد وزیر خاں اندرون فصیل حصہ شہر کی ایک نہایت اہم عبادت گاہ ہے جس میں چند روز پہلے مولانا عبدالستار نیازی قلعہ نشین ہو کر تشدد اور لاقانونی کا وعظ کر رہے تھے اور حکام نے ان پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا سول کے حکام کا عام معمول یہ تھا کہ وہ چیرنگ کراس پر جلوسوں کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے (تاکہ انہیں گورنمنٹ ہاؤس کی طرف جانے سے روکیں) اور شام کو سول لائنز کے تھانے میں بیٹھ کر مشورے کیا کرتے تھے اب وہ کوتوالی کی طرف بھاگے یہ مقام مسجد وزیر خاں سے مختلف جگہ پر فصیل شہر کے

باہر واقع ہے قریب قریب روزانہ اور بعض اوقات دن میں متعدد بار سول اور فوجی افسر وزارت اور گورنر سے گورنمنٹ ہاؤس میں ملاقات کرتے تھے جو سول لائنز کے تھانے کے بعد محفوظ ترین مقام سمجھا جاتا تھا ۵ مارچ کو اس پولیس افسر کے

گورنمنٹ ہاؤس کی تین کانفرنسیں

قتل کے بعد گورنمنٹ ہاؤس میں تین کانفرنسیں ہوئیں (قبل دوپہر۔ بعد دوپہر اور شام) اور پہلی کانفرنس میں چند اہم فیصلے کئے گئے ایک فیصلہ یہ تھا کہ پولیس کو کھلے دل سے قوت استعمال کرنی چاہئیے اور اگر صورت حالات کے بعض کوائف مقتضی ہوں تو معاملات کو فوج کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے دوسری کانفرنس بعض ممتاز شہریوں پر مشتمل تھی ان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی شامل تھے جنہوں نے اس مطلب کا بیان شائع کرنے پر اصرار کیا کہ علما سے دوبارہ مذاکرات شروع کئے جائیں گے اس میں بھی اختلاف ہے کہ مولانا کے ٹھیک ٹھیک الفاظ کیا تھے لیکن اس کا موجودہ موضوع سے کوئی تعلق نہیں تیسری کانفرنس کا نتیجہ بعض افسروں کے نزدیک یہ تھا کہ فائرنگ کو نرم کردینے کا حکم دے دیا گیا اس کے لئے "ملاطفت" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا تقریباً تمام افسر جن میں چیف منسٹر بھی شامل ہیں یہی کہتے ہیں کہ پہلی دو کانفرنسوں کی طرح اس کانفرنس کی صدارت بھی مسٹر چندریگر نے کی تھی لیکن مسٹر چندریگر کا قول یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی کانفرنس ہوئی ہے تو وہ گورنمنٹ ہاؤس کے کسی حصے میں منعقد ہوئی ہوگی جس میں میں حاضر نہ تھا شہادت میں جو تفاوت ہے اس کا اثر صرف اس سوال پر پڑتا ہے کہ آیا فائرنگ میں نرمی کرنے کی تجویز مسٹر چندریگر نے پیش کی تھی یا کسی اور صاحب نے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس تجویز پر عمل کیا گیا اور اس سے پولیس کے حوصلے بے حد پست ہوئے۔

اس اثنا میں شہر کے لوگ سرکاری گاڑیاں۔ ڈاک خانے اور دکانیں نذر آتش کررہے تھے ریلوے کے ملازم خود انجنوں کو لوکو شیڈ سے سٹیشن پہنچنے سے روک رہے تھے اور کلرکوں کا عملہ خصوصاً سکرٹیریٹ اور دفتر اکاونٹنٹ جنرل دو نہایت مذہبی ادارے! اپنا کام چھوڑ کر بیٹھا تھا اور گستاخ و شوریدہ سر ہو رہا تھا ٹیلیفون پر نہایت خیرہ چشمی سے یہ دھمکی دی گئی تھی کہ گورنمنٹ ہاؤس کی بجلی کاٹ دی جائے گی اور پیغمبر اسلام کے نام پر چند احمدی قتل بھی کردیئے گئے تھے بعض کہتے تھے کہ فائرنگ بند ہونی چاہئیے اور بعض کا مطالبہ تھا کہ ایک بیان شائع ہونا چاہئیے۔

اس کے بعد گورنمنٹ ہاؤس اور شہر کی اس ابتری کے باوجود ۶۔مارچ کی صبح طلوع ہوئی اور ہر اہم شخص گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچ گیا یہ معلوم ہی ہے کہ اس دن قبل دوپہر مسٹر دولتانہ نے اپنا وہ مشہور بیان شائع کیا جس میں اپنی طرف سے مطالبات کی منظوری کا اعلان کردیا اور مرکز سے بھی منظوری کی سفارش کردی اس کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر مرکز نے لاہور میں مارشل لا نافذ کردیا اور پابند قانون شہریوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس مدت کے دوران میں جو اہم ترین نکات بحث کے محتاج ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ آیا ایک امتناعی حکم ۲۔مارچ کی شام سے پہلے صادر ہونا چاہئیے تھا۔

۲۔ آیا اس کا اطلاق اندرون فصیل کے شہر پر بھی ہونا چاہئیے تھا۔

۳۔ آیا مسجد وزیر خاں کی صورت حالات کا تدارک مناسب طریق پر کیا گیا۔

۴۔ آیا فائرنگ کو نرم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اگر کیا گیا تھا تو اس کا اثر کیا ہوا۔

۵۔ آیا فوج کے ساتھ مناسب رابطہ موجود تھا اور آیا فوج نے کارروائی کرنے سے نارضامندی ظاہر کی تھی۔

۶۔ آیا مارشل لا کے نفاذ سے بچنا ممکن تھا۔

۱۔ دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا استعمال

ہم نے اپنی تحقیقات کے دوران میں اکثر سول افسروں پر واضح کر دیا تھا کہ لیڈروں کو گرفتار کرنے کے بعد انہیں سب سے پہلے یہ خیال آنا چاہئے تھا کہ ایک انتظامی حکم نافذ کریں لیکن چونکہ انہوں نے واضح طور پر بھی اور ضمنی حیثیت سے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ ۲۔ مارچ کی شام سے پہلے صورتِ حالات بالکل نازک معلوم نہ ہوتی تھی لہٰذا ہم ۲۸۔ فروری اور یکم مارچ کے واقعات کی نسبت سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بیان کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

۲۸۔ فروری ۱۹۵۳ء۔ پانچ یا چھ ہزار اشخاص کا ایک جلوس دہلی دروازے کے باہر تیار ہوا اور حکومت۔ پولیس اور احمدیوں کے خلاف نعرے لگاتا ہوا سول سیکرٹریٹ کی طرف گامزن ہوا ان لوگوں نے ہمیں نصف گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ مدت تک مصروف رکھا اور بہت مشکل سے منتشر کئے جا سکے۔ دن بھر چھوٹے چھوٹے جلوس آتے رہے اور حکام انتظامی کے لئے عقدۂ دشوار بنتے رہے احراریوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں آوارہ گرد بازاری آدمی بھی شامل ہو گئے اور نارضامند دکانداروں کو دکانیں بند کرنے پر مجبور کرتے رہے ایک بڑے جلوس میں جب ہجوم چیرنگ کراس کی طرف مارا مار بڑھ رہا تھا مال روڈ کی دکانیں بند ہو گئیں ٹریفک رک گیا اور پابند قانون شہری اپنے اپنے مکانوں اور دکانوں میں بند ہو کر بیٹھ رہے یہ ہجوم زیادہ تر بازاری آدمیوں اور غنڈوں پر مشتمل تھا البتہ جیسا میں نے اپنے تحریری بیان میں لکھا ہے ان لوگوں کے "مذہبی جذبے کا لہجہ بلند" تھا جس سے میرا مطلب یہ تھا کہ وہ کلمہ اور تکبیر کے نعرے لگا رہے تھے۔

یکم مارچ ۱۹۵۳ء

اس دن کم از کم چار جلوس نکلے جن میں سے دو خاصے بڑے تھے پہلا بڑا جلوس بیرون دہلی دروازہ سے شروع کیا گیا مولوی احمد علی اور بتیس دوسرے آدمی گرفتار کئے گئے ہجوم کا رویہ مخالفانہ اور غضبناک تھا اور اس نے خشت باری کر کے پولیس کی ایک گاڑی کو توڑ پھوڑ دیا تھا دوسرے جلوس میں انتیس اشخاص گرفتار کئے گئے تیسرے جلوس میں ۲۳ گرفتاریاں ہوئیں شہر بھر میں چھوٹے چھوٹے جلوس نکلتے رہے جب پولیس کا کوئی دستہ پہنچ جاتا تو یہ جلوس غائب ہو جاتے تھے لیکن جوں ہی پولیس رخصت ہو جاتی وہ پھر جلوس کی شکل اختیار کر لیتے غرض انہوں نے ہمیں دن بھر بھاگ دوڑ میں مصروف رکھا آخر تیسرے پہر دہلی دروازے سے ایک بڑا جلوس نکالا گیا راستے میں غنڈے اس میں شامل ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ انسانوں کی تعداد بے انتہا بڑھ گئی اور اس ہجوم کی نوعیت یہ ہو گئی کہ گویا وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے پر تلا کھڑا ہے۔ دکانیں پھر بند ہو گئیں کاروبار بالکل رک گیا ٹریفک مفلوج ہو گئی اور پابند قانون لوگ اپنی سلامتی کو خطرے میں محسوس کر کے کانپنے لگے۔

دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ۲۔ مارچ کو ایسے حالات میں نافذ کی گئی جو ہوم سیکرٹری کے تار مورخہ ۹۔ مارچ میں بیان کئے گئے تھے یہ تار ہفتے بھر کے واقعات کی اطلاع دینے کے لئے مرکز کو دیا گیا تھا۔ ہوم سیکرٹری کا تار ملاحظہ ہو:

۲ - مارچ ۲ - مارچ کو شورش پسندوں نے جلوس نکالے جو سب چیرنگ کراس پر جمع ہوئے بڑے جلوس کی قیادت "زمیندار" کے مولانا اختر علی خاں کر رہے تھے جن کے خلاف پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظربندی کا حکم صادر کیا جا چکا تھا لیکن گرفتار نہ کئے جا سکے کیونکہ وہ زیادہ وقت مسجد وزیر خاں میں رہے مظاہرین بے حد شوخ و بیباک تھے اور آمادۂ فساد معلوم ہوتے تھے انہوں نے متعدد بار پولیس کے حلقے کو توڑ دیا چنانچہ ان کو ہٹانے کے لئے نرم سا لاٹھی چارج کیا گیا کثیر التعداد لوگوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا جب بالآخر ہجوم واپس چلا گیا تو یہ اطلاع آئی کہ بعض لوگوں نے شیزان ریسٹوران پر جو ایک احمدی کی ملکیت ہے چھوٹے چھوٹے پتھر پھینکے گو ان سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہر کے متاثرہ علاقوں میں جلوسوں کو ممنوع قرار دینے کے لئے زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ایک حکم امتناعی نافذ کر دیا جائے"

۲ - مارچ کا دن پہلے دو دنوں سے کچھ زیادہ خراب نہ تھا ۲ - مارچ کے حوادث اور اس سے پہلے دو دنوں کے واقعات میں یہ فرق تھا کہ اول الذکر دن میں چیرنگ کراس پر زیادہ لاقانونی کا مظاہرہ کیا گیا جہاں سول افسر اپنا آخری سٹیشن قائم کئے انتظار کر رہے تھے اب تک تو جلوس اس آخری سٹیشن ہی پر منتشر ہو جاتے تھے لیکن مسٹر قربان علی خاں کے ایک سابقہ قول کے مطابق کہ ایک لاقانونی سے دوسری لاقانونی پیدا ہوتی ہے چونکہ ان لوگوں نے اس سے قبل اپنے دو کا ناموں کی وجہ سے خاصی اہمیت حاصل کر لی تھی اس لئے انہوں نے آخری سٹیشن کی پابندی کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ دو سابقہ دنوں کی صورت حالات پر بحیثیت مجموعی سکون و اطمینان کا کیا موقع تھا اور وہ بھی محض اس بنا پر کہ کسی خاص نقطے پر جلوس شوریدہ سر نہ تھا حالانکہ دن کے باقی حصے میں انہوں نے حکام کو خاصا پریشان کیا تھا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا اندازہ حکام متعلقہ میں سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سید اعجاز حسین شاہ سب سے زیادہ پرامید اور مطمئن آدمی تھے اور اگر ہم خود ۶ - مارچ کو لاہور میں موجود نہ ہوتے تو شاہ صاحب کے بیان کو پڑھ کر ہم یہی سمجھتے کہ مارشل لا حقیقت میں نافذ ہی نہیں ہوا تھا انہوں نے شروع میں یہ کہا کہ انہیں ۲۸ - فروری کی گرفتاریوں پر کسی گڑبڑ کی توقع نہ تھی چونکہ ہمیں ۲۸ - فروری کے متعلق یہ اندازہ بہت ہی ہلکا معلوم ہوا اس لئے ہم نے ان سے ذیل کے سوالات کئے۔ ہم سوالات و جوابات دونوں کو نقل کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی معقولیت کے خود ہی مظہر ہیں :-

"سوال ۔ آپ کا خیال تھا کہ گرفتاریوں کے بعد کوئی احتجاج ۔ کوئی ہڑتال ۔ کوئی جلسہ عام ۔ کوئی جلوس اور کوئی ہنگامہ آرائی نہ ہوگی؟

جواب ۔ جی ہاں میرا یہی خیال تھا۔

سوال :۔ کیا اسی وجہ سے آپ نے دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت کوئی حکم صادر نہ کیا؟

جواب ۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مجھے اس حکم کے نفاذ کا مشورہ نہیں دیا گیا تھا ۔ اس مسئلے پر پہلے پہل ۲ ۔ مارچ کو غور کیا گیا تھا اگر میں کچھ مدت پیشتر یہ حکم نافذ کر دیتا تو اس سے شہری آزادیاں محدود ہو جاتیں"

اگر آپ غور کریں تو یہ کوئی واحد جواب نہیں اس کا مطلب اولاً یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان سے کہہ دیتا کہ ۲۸ ۔ فروری

کہ ایسا حکم صادر کر دیجئے تو وہ کر دیتے اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ۲ - مارچ تک کسی کو اس کا خیال بھی نہ آیا تھا اور اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہنگامہ آرائی کی توقع بھی ہوتی تو شہری آزادیوں کے مقاصد عالیہ کی خاطر لاقانونی کو بھی برداشت کر لیا جاتا ہمارا خیال ہے کہ ضابطہ فوجداری کو "آزادی" اور "مادر پدر آزادی" کے درمیان بہم سے خط فاصل کا تعین کر دینا چاہیئے۔

"سوال - اگر حکومت کسی تحریک کے علم برداروں کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر دے تو کیا آپ کے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ اس تحریک کی حمایت میں ہونے والے مظاہروں کو بند کر دیا جائے؟

جواب - یہ سب کچھ حالات پر منحصر ہے اگر نہایت ہر دل عزیز لیڈر گرفتار کئے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ ایسا ردّ عمل ہو جس کے خلاف کارروائی ضروری ہو جائے لیکن اگر گمنام لوگ گرفتار کئے جائیں تو ممکن ہے کوئی ردّ عمل بھی نہ ہو"

ان کے نزدیک جو لوگ گرفتار ہوئے تھے وہ گمنام لوگ تھے "خیال یہ تھا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے وہ کراچی میں کیا جائے گا" ہمارے نزدیک اس فقرے سے اصل حقیقت پردے سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے پنجاب کے حکام انتظامی کو یہ امید تھی کہ رضاکاروں کا بہاؤ کراچی کی طرف رہے گا اور ماضی میں ہندوستان کا اور حال میں پاکستان کا بازوئے شمشیر زن یعنی پنجاب رنگروٹ مہیا کرے گا بہر حال مسٹر اعجاز حسین تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں کم از کم ۲۸ - فروری کو معلوم ہوا کہ لاہور بھی گڑبڑ کا مرکز بنے گا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ شورش پسندوں کو کوئی خاص حمایت حاصل نہ ہوگی کیونکہ ۲۸ - جنوری کو جو پہلا جلسہ ہوا تھا اس میں صرف چند ہی اشخاص شریک ہوئے تھے یہ اندازہ سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے اندازے سے بالکل مطابق نہیں معلوم ہوتا۔

صورت حالات ۲۸ - فروری سے پہلے بھی خراب ہی تھی

لیکن ۲۸ - فروری سے پیشتر کے زمانے کے متعلق بھی جب مسٹر اعجاز حسین کے حافظے کو تازہ کرنے کے لئے خود ان ہی کی پانزدہ روزہ رپورٹیں دکھائی گئیں تب جا کر انہوں نے تسلیم کیا کہ فروری کے نصف اول کے دوران میں جب "سامعین کے جنونی جذبے کو جوش دلانے کی غرض سے آتش ریز تقریریں کی گئیں" تو انہوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ "اگر صورت حالات میں ذرا سی خرابی بھی رونما ہو تو امن و انتظام کی حفاظت کے لئے نہایت قوی امتناعی تدابیر اختیار کی جائیں" اس قسم کی سخن طرازیاں علی العموم خفیہ ڈائریوں میں کی جاتی تھیں تاکہ حکومت پر یہ اثر پڑے کہ حکام صورت حالات کی حفاظت کے لئے کس قدر مستعد ہیں لیکن اب مسٹر اعجاز حسین مانتے ہیں کہ یہی صحیح پوزیشن تھی چنانچہ یہ فرض کیا جائے گا کہ ۲۸ - فروری اور یکم مارچ کو جو کچھ ہوا اس سے "صورت حالات میں ذرا سی خرابی بھی رونما نہ ہوئی تھی" اگر یہ صورت حالات بھی خراب نہ تھی تو پھر خراب صورت حالات خدا جانے کیا قیامت ہوگی جب تک اختر علی خاں جیسا کوئی غیر گمنام آدمی صورت حالات کا سرکردہ رہنما نہ ہو صورت حالات اتنی خراب نہیں ہو سکتی کہ کسی حکم امتناعی کی ضرورت پڑ جائے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (جاری)

اپنے خیال کی تائید میں مسٹر اعجاز حسین نے کہا کہ صرف ایک جلوس ۲۸ - فروری کو اور ایک یکم مارچ کو نکلا تھا اور ہر جلوس میں کوئی تین یا چار سو آدمی ہوں گے اس پر انہیں فروری کے نصف دوم کے متعلق ان کی اپنی خفیہ رپورٹ دکھائی گئی جس میں انسانوں کی تعداد چھ ہزار بتائی گئی تھی انہوں نے کہا "لیکن یہ تو اس مقام

پر جمع ہونے والے تمام اشخاص کی تعداد کا محض زبانی اندازہ تھا" حالانکہ موجودہ تخمینہ بھی کوئی تحریری تخمینہ نہ تھا۔ آخر جلوس ایک مقام پر" جمع ہونے والے تمام اشخاص" ہی کو تو کہتے ہیں لہٰذا اگر شاہ صاحب یہ کہتے تو بہتر ہوتا کہ امتداد زمانہ کی وجہ سے غالباً ان کا موجودہ تخمینہ غلط ہوگا۔ باقی رہی جلوسوں کی تعداد تو جب ان کا تحریری بیان انہیں دکھایا گیا تو انہوں نے تسلیم کیا کہ یکم مارچ کو پانچ اور آٹھ کے درمیان جلوس نکلے ہوں گے لیکن "بڑا جلوس ایک ہی تھا۔ ۔ ۔ ۔ اور تیس آدمیوں کی گرفتاری اس امر کا ثبوت نہیں کہ صورتِ حالات خراب تھی"۔

لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ شہادت پر مسلسل نکتہ چینی کرنے اور ہر سطر پر اس کی صداقت کو کسوٹی پر پرکھنے سے صورت حالات یقیناً خراب ہو رہی ہے ہم اس قسم کی رکاوٹ کے عادی نہیں ہیں اس میں کوئی لطف نہیں آتا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا فرض ہے کہ وہ انسدادی کارروائی کے معنی سمجھے

احراریوں کے وکیل مسٹر مظہر علی اظہر کا خیال یہ تھا کہ اگر جلوس کو اس کا موقع نہ دیا جائے کہ اس کے شرکا کی تعداد میں بڑا اضافہ ہو سکے اور اس کو آغاز ہی میں روک دیا جائے تو اس سے کوئی خاص لاقانونی پیدا نہیں ہو سکتی اسی خیال کے ماتحت انہوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے سوال کیا کہ جو جلوس اکبری دروازے کے جلسے سے شروع ہوا تھا اسے مسجد کو جانے کا موقع کیوں دیا گیا جواب یہ ملا کہ جب تک قانون کی کوئی خلاف ورزی نہ ہو بے گناہ آدمیوں کو گرفتار کرنا بالکل بیکار بات ہے ہمارا خیال ہے کہ قانون کی حقیقی خلاف ورزی سے پہلے ایک ایسی شے بھی ہے جسے "انسدادی تدبیر" کہتے ہیں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے لئے اس شے کو یاد رکھنا زیادہ اہم ہے لیکن اگر وہ "شہری آزادیوں" اور قانون شکنی کا ارادہ رکھنے والے کی سابقہ "بے گناہی" کے چکر میں پھنسا رہے گا تو یہ امر اس کے اہم فرائض کی بجا آوری میں سخت حائل ہوگا جب یہ سوال کیا گیا کہ بعد میں جلوس سے تیس آدمی کیوں گرفتار کئے گئے تو انہوں نے جواب دیا کہ انہوں نے ٹریفک کو روک رکھا تھا اور نقضِ امن کے ارتکاب پر تلے ہوئے تھے لیکن یہ بات انہوں نے اپنے تحریری بیان میں نہیں لکھی کیونکہ انہوں نے اس معاملے کو "قابل ذکر" ہی نہیں سمجھا کہ وہ اس لئے گرفتار کئے گئے تھے کہ وہ نقضِ امن کے ارتکاب کا پورا عزم رکھتے تھے اسی طرح ۲۔ مارچ کے واقعات کے متعلق انہوں نے اپنے تحریری بیان میں اس امر کو بھی قابل ذکر نہیں سمجھا کہ شرکائے جلوس "تشدد کی طرف مائل" تھے۔

لیکن اگر یکم مارچ کا جلوس نقضِ امن کے ارتکاب پر تلا ہوا تھا تو بہ اعتبار نوعیت وہ ۲۔ مارچ کے جلوس سے مختلف نہ تھا لہٰذا یہ سمجھنے کی وجہ موجود ہے کہ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے لئے ضروری حالات پیشتر ہی پیدا ہو چکے تھے

ڈی آئی جی کی تصریح

مسٹر انور علی کا بیان ہے کہ افسروں کی رائے یہی تھی کہ اگر جلوسوں کو نکلنے کی اجازت دے دی جائے تو گران کے تشدد پر اتر آنے کا احتمال ہوگا لیکن کم از کم کچھ وقت تک دفعہ ۱۴۴ کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ یہ رائے کسی حد تک میر نور احمد کے اس خیال کے مساوی ہے کہ کسی اخبار کے خلاف کارروائی اُس وقت تک نہ ہونی چاہیے جب تک اس کی تحریروں کا نتیجہ قانون شکنی کی صورت میں ظاہر نہ ہو ہماری رائے میں انسدادی کارروائی کا یہ تصور ہرگز صحیح نہیں ہے جب مسٹر انور علی سے یہ پوچھا گیا کہ آپ نے جلوسوں کو بند کیوں نہ کیا تو انہوں نے ایک اصطلاحی جواب دیا کہ یہ امر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فرائض میں داخل ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ لاہور میں جلوس اکثر نکلتے رہتے تھے اور ان میں کوئی قابل تشویش بات نہ ہوتی تھی ان سے ایک اور سوال کیا گیا کہ اگر جلوس آغاز

ہی میں ممنوع قرار دے دیئے جاتے تو کیا کوئی خاص فرق نہ پڑتا انہوں نے جواب دیا ۔ یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ صورت حالات کیا ہوتی تحریک مناسب قیادت کے ماتحت نہ تھی بلکہ غیر ذمہ دار اشخاص کے ہاتھ میں تھی لہذا یہ پیش گوئی کرنا آسان نہیں کہ تحریک کون سا راستہ اختیار کرتی لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر قیادت غیر ذمہ دار آدمیوں کے ہاتھ میں تھی تو حکام کو اور بھی زیادہ مشوش اور فکرمند ہونا چاہئے تھا۔

ایس ایس پی کا خیال

جب مرزا نعیم الدین سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کو مسٹر انور علی اور مسٹر اعجاز حسین کے تحریری بیانات دکھائے گئے کہ یکم مارچ کے جلوس پرامن تھے تو انہوں نے کہا کہ یہ رائے صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں سے کم از کم ایک جلوس نے پولیس کا ایک ٹرک توڑ پھوڑ دیا تھا۔

لیکن ان کی رائے یہ تھی کہ اگر دفعہ ۱۴۴ پہلے بھی نافذ کر دی جاتی تو کوئی خاص فرق نہ پڑتا کیونکہ جب وہ نافذ کی گئی تو اس کی خلاف ورزی ہوئی ہم نے ان سے سوال کیا کہ آیا صحیح پوزیشن یہ نہیں کہ جب اقدام میں توقف کیا جائے تو لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ حکام غفلت و تاخیر کی وجہ سے اقدام کا حق کھو چکے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ معاملے کو اس زاویہ سے دیکھنے کے بعد اب ان کا خیال یہ ہے کہ اگر حکم امتناعی ۲۸ - فروری کو نافذ کر دیا جاتا تو لوگ ضرور یہ سمجھتے کہ حکومت پختگی سے اپنے فرائض کی بجا آوری پر قائم ہے ۔

اقدام میں توقف اقدام کو بے اثر کر دیتا ہے

ہمیں یقین ہے کہ ہم نے مرزا نعیم الدین کو جو بات سمجھائی اس میں معقولیت ہے ہم محض نفسیات عوام پر بھروسہ نہیں کر رہے ہیں یہ ذہن انسانی کا ایک عام شعار ہے اقدام میں تاخیر کرنا اقدام کو بے اثر کر دیتا ہے پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسے معاملات میں جو ہمارے پیش نظر ہیں جب تک آپ اقدام کا فیصلہ کریں اس وقت تک فریق ثانی اپنے جوش میں ایسی ذہنی کیفیت تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے نتائج کا بالکل ہوش نہیں رہتا آخر میں (اور ملتان فائرنگ کی رپورٹ میں بھی اس حقیقت ثابتہ کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی) اگر حکام کی رائے میں دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے ماتحت حکم کا صدور ضروری ہو اور وہ اس کو نافذ بھی کر دیں تو اس کی نافرمانی کا مقابلہ نہ کر سکنا اچھے نظم و نسق کا ثبوت نہیں ہے اور اس کا نتیجہ جلد یا بدیر لازماً یہی ہوگا کہ مصیبت ناک واقعات رونما ہوں گے جیسے ۱۹ - جولائی کی صبح کو ظہور میں آئے تھے۔

دفعہ ۱۴۴ کس کا فرض ہے؟

اگر دفعہ ۱۴۴ - کے ماتحت حکم کا اجرا ضروری تھا تو اس کو جاری کرنا کس کا فرض تھا؟ دوسرے اضلاع میں واضح طور پر یہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا کام ہے اور یہ سیدھا سادہ قانون ہے اس معاملے میں عام طور پر وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے مشورے سے کام کرتا ہے لیکن لاہور میں انسپکٹر جنرل پولیس ہے جو داخلی سلامتی کا ذمہ دار ہے ہوم سیکرٹری ہے چیف سیکرٹری ہے وزیر قانون و انتظام ہے اور ان سب کی موجودگی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایک بے جان سا آلۂ کار بن کر رہ جاتا ہے جب وہ کسی کانفرنس میں شریک ہوتا ہے تو ایک گھڑا گھڑایا حکم اپنی جیب میں ڈال کر لے جاتا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو اسے جیب سے نکال کر اس پر دستخط کر دے اور اگر ضرورت نہ ہو تو جیب ہی میں پڑا رہنے دے چنانچہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بیان ہے کہ "جب میں یکم مارچ کو افسروں کی کانفرنس میں گیا تو دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت ایک حکم کا محض مسودہ ساتھ لیتا گیا اس لئے نہیں کہ میرے نزدیک اس کا اجرا ضروری تھا بلکہ میں نے سوچا شاید اس کی ضرورت پڑ جائے" دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود تو اس قسم کے حکم کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے لیکن ان کا

خیال یہ تھا کہ اگر کسی شخص نے اس کے نفاذ کی تجویز کی تو وہ اس کو نافذ کر دیں گے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے گمراہ کن بیانات

"دفعہ ۱۴۴ کا ذکر آیا تھا لیکن مجھے یاد نہیں کہ یہ ذکر کس نے کیا تھا ایک بات میرے ذہن میں واضح تھی کہ لاہور ایمرجنسی ڈسٹربنس سکیم کے ماتحت یہ پولیس کا کام تھا کہ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے لئے مجھ سے درخواست کرتی ۲۔ مارچ کو پولیس نے مجھ سے کوئی درخواست نہیں کی بلکہ میں نے اس حکم کا اجرا بالکل اپنی مرضی سے کیا تھا میں نے اس کی تجویز اجلاس میں پیش کی اور سب نے کہ دیا کہ ہاں کر دیجئے۔"

لیکن یہ صحیح نہیں ہے اور اگر آپ نے اس اجلاس کی کارروائی کو پڑھا ہے جو ۲۔ مارچ کو ۸ بجے شام چیف منسٹر کی کوٹھی پر منعقد ہوا تھا اور جس میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی موجود تھے تو آپ ہمارے ساتھ اتفاق کریں گے "انسپکٹر جنرل اور ہوم سیکرٹری نے جو چیرنگ کراس کے واقعات کے عینی شاہد تھے صورت حالات کی کیفیت بیان کی انسپکٹر جنرل نے لاہور میں دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کی تجویز کی اور کہا کہ اندرون فصیل کو مستثنٰے رکھا جائے اس رائے کی سب نے تائید کی اور حکم کے نفاذ کا فیصلہ ہو گیا"

اسی وجہ سے ہم نے اس رپورٹ کے ابتدائی حصے میں لکھا تھا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صورت حالات کی ضرورت سے بھی زیادہ ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں اگر ہمیں یقین ہوتا کہ یہ ذمہ داری صرف نام نہاد طور پر قبول نہیں کی جا رہی ہے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس کو محض اس لئے اپنے سر نہیں لے رہے ہیں کہ زیادہ بڑی ذمہ داری (یعنی ۲۸۔ فروری یا یکم مارچ کو اجرائے حکم میں کوتاہی کی ذمہ داری) سے بچ جائیں تو ہم ان کی تعریف کرتے اگر وہ یکم مارچ کو ایک حکم کا مسودہ ساتھ لے گئے تھے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو وہ اس کی ضرورت کو محسوس کر چکے تھے یا محض ایک فرماں بردار آلہ کار کی حیثیت سے تیار ہو کر گئے تھے دونوں صورتوں میں وہ اپنی ذمہ داری کو بجا نہیں لا سکے اگر انہوں نے مرزا نعیم الدین کی طرح صاف صاف کہہ دیا ہوتا کہ لاہور جیسی جگہ پر اور ایسی صورت حالات میں اگر انسپکٹر جنرل یا ہوم سیکرٹری دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت حکم صادر کرنے کے حامی نہ ہوتے تو گو میرے نزدیک وہ ضروری ہوتا لیکن میں ایسا حکم نافذ نہ کرتا تو ہم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اس تصریح کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے لیکن ۲۸ فروری اور یکم مارچ کی کوتاہی کو حق بجانب ثابت کرنے کی غرض سے انہیں ایک غیر معقول پوزیشن اختیار کرنی پڑی جو موقع آنے پر بدلنی پڑی۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فرض کے متعلق مسٹر دولتانہ کی رائے

مسٹر دولتانہ ۲۔ مارچ کے حکم کی اس سے قبل اس کے اجرا میں کوتاہی کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں "میں اس بات کو نہیں مانتا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس چونکہ فوری طور پر دوسرے اعلیٰ افسروں کے ماتحت کر دیئے گئے تھے لہٰذا وہ آزادانہ کارروائی نہ کر سکتے تھے میں نہیں سمجھتا کہ ان کے فرائض دوسرے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں سے مختلف کیونکر تھے ...... اگر انہیں کچھ شبہات تھے تو بڑے افسروں کا مشورہ انہیں ہر وقت مل سکتا تھا دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے وقت مجھ سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا"

مسٹر دولتانہ اس کانفرنس کو بھول رہے ہیں جو ان کی کوٹھی پر ہوئی تھی اور جس کی صدارت بھی انہوں نے کی تھی اس معاملے کی ذمہ داری کے متعلق ان کا رویہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے رویئے سے بالکل مختلف ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ صورت حالات کی تازہ ترین کیفیت سے باخبر نہ تھے کیونکہ اگر وہ ایسا کہیں تو یہ بات ان کی اپنی

بے التفاتی ظاہر ہوگی لیکن اگر وہ صورت حالات سے باخبر تھے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ صورت حالات نازک تھی اور مسٹر دولتانہ کے افسر اس کی نازک نوعیت سے غافل تھے اگر ایسی حالت میں مسٹر دولتانہ ان کو کارروائی پر آمادہ کرتے تو کیا یہ امر ان کے فرائض میں ناواجب مداخلت کا مترادف ہوتا؟ لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مسٹر دولتانہ نے ان دو بڑے افسروں کے فرائض کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ درست ہے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ آزادانہ اقدام کر سکتا ہے لاہور میں اسے بالخصوص انسپکٹر جنرل سے مشورہ کرنا چاہیئے اور اگر کوئی اعلیٰ افسر اس سے اختلاف کرے تو عقل مندی کی بات یہ ہے کہ وہ اس اختلاف کو ایک یادداشت میں قلم بند کرے اور اس کی ایک نقل اختلاف کرنے والے افسر کے پاس بھیج دے لیکن اسے محض کانفرنسوں ہی میں شریک نہ ہونا چاہیئے اگر اس کی ایک ٹانگ گورنمنٹ ہاؤس میں ہو تو دوسری مسجد وزیر خاں میں ہونی چاہیئے اور بہتر یہ ہے کہ وہ دائیں ٹانگ ہو۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا فرض

ہوم سیکرٹری کا خیال

کسی دوسرے سلسلے میں مسٹر غیاث الدین احمد نے مندرجہ ذیل خیالات ظاہر کئے "میں نہیں سمجھتا کہ کسی نے حکام ضلع یا انسپکٹر جنرل کے فیصلوں میں رکاوٹ پیدا کی ہو میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ لاہور جیسے مقام پر انسپکٹر جنرل جیسے بڑے افسروں کا مقامی حکام کو مشورہ۔ امداد اور ہدایت دینا ضروری ہے کیونکہ مقامی حکام کے علاوہ خود انسپکٹر جنرل کا بھی یہ فرض ہے کہ قانون و انتظام کو قائم رکھے اور صوبے کے داخلی دفاع کی دیکھ بھال کرے" یہ اس سوال کا جواب تھا کہ آیا لاہور کا معاملہ اس وجہ سے خراب نہیں کہ یہاں بہت سے اشخاص کے ساتھ مشورے کرنے پڑتے ہیں۔

٢۔ فصیل شہر
٣۔ مسجد وزیر خاں

یہ دونوں موضوع ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

اس سے قبل ہم صوبائی حکومت کی ایک تحریر مورخہ ۹ مارچ کا ایک اقتباس پیش کر چکے ہیں یہ تحریر مرکزی حکومت کو بھیجی گئی تھی اور اس میں ۲۔ مارچ سے مارشل لا تک کے حالات بیان کئے گئے تھے اس اقتباس کے ایک فقرے کی طرف ہم لطور خاص توجہ دلاتے ہیں جس میں کہا گیا تھا کہ مولانا اختر علی خاں ۲۔ مارچ کے جلوس کی رہنمائی کر رہے تھے ان کے خلاف نظر بندی کا حکم تو پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن وہ گرفتار اس لئے نہ کئے جا سکے کہ وہ زیادہ وقت مسجد وزیر خاں میں مقیم رہتے ہے مسٹر دولتانہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گرفتاری کا یہ حکم یکم مارچ کو دیا گیا تھا اور اگر اختر علی خاں اس وجہ کی بنا پر گرفتار نہ کئے جا سکے کہ وہ مسجد وزیر خاں میں تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یکم مارچ تک بھی مسجد وزیر خاں قانون و انتظام کے اقتدار سے بالاتر تھی یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے جس نے ہم کو ابتدا ہی سے متاثر کیا ہے لیکن بعض افسر اس سے بشدت انکار کرتے ہیں کیونکہ اس کا اقرار ان کے لئے لازماً مشکلات کا باعث ہو سکتا ہے پہلی مشکل یہ ہے کہ اگر مسجد وزیر خاں ایسی ہی خطرناک جگہ تھی تو اس پر حکم امتناعی کا اطلاق کیوں نہ کیا گیا دوسری مشکل یہ ہے کہ اگر پولیس وہاں کی صورت حالات پر قابو نہ پا سکتی تھی تو اس کو فوج کے حوالے کیوں نہ کیا گیا خصوصاً ۵ مارچ کو جب اس بات کا فیصلہ گورنمنٹ ہاؤس میں ہو چکا تھا؟ تیسری مشکل یہ ہے کہ اس امر کا اعتراف کرنے کے بعد یہ معاملہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جب ۴۔ مارچ کی شام کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو قتل کر دیا گیا تو ہر شخص موقع واردات یعنی مسجد وزیر خاں کی طرف نہیں بلکہ کوتوالی کو بھاگا اور یہ لوگ اس امر کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے کہ اس عجیب و غریب طرز عمل کی وجہ یہ تھی کہ صورت حالات ان کے قابو سے باہر اور لاعلاج ہو گئی تھی چوتھی

مسجد وزیر خاں قانون و انتظام سے بالاتر تھی

مشکل تھی مولانا عبدالستار نیازی (صرف مشکل ہی نہیں بلکہ اُسترے کی دھار!) جنہوں نے اپنا گھر چھوڑ کر مسجد میں اڈا جمالیا تھا اور وہاں سے مذہبی بادلوں کی وہ کڑک اور گرج صادر کر رہے تھے جن کی لرزش گورنمنٹ ہاؤس تک محسوس ہو رہی تھی۔

فصیلی شہر کو مستثنیٰ رکھنے کی تجویز انسپکٹر جنرل نے کی تھی

فصیلی شہر کو حکم انتناعی سے باہر رکھنے کی ذمہ داری اصلاً انسپکٹر جنرل پر عاید ہوتی ہے لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس کو بھی اپنی ہی طرف منتقل کرنے پر مصر ہیں۔ مسٹر انور علی کا بیان ہے کہ "یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کوئی ایسا حکم جاری نہ کرنا چاہیے جس کا پورا پورا نفاذ نہ ہو سکے ۱۹۳۴ء میں جب شہید گنج کی تحریک جاری تھی اور میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا پولیس کے آدمیوں پر اینٹیں برسائی گئیں اور وہ فصیلی شہر کے اندر عملاً بند ہو کر رہ گئے اس کے بعد انسپکٹر جنرل نے احکام صادر کیے کہ کہیں فصیل شہر کے اندر کسی جلوس کو روکنے یا اس کا تدارک کرنے کی کوشش کبھی نہ کرنی چاہیئے اگر ایسی حالت پیدا ہو گئی تو فوج کو بھی اسی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا"

"سوال۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی صورت حالات میں فوج اور پولیس دونوں بے بس ہونگی؟

جواب۔ اگر اس قسم کے حکم کا اجرا لازمی ہو تو اس کو شہر کے کسی ایک حصے میں یا چند حصوں میں نافذ کرنا چاہیئے کیونکہ ایسی حالت میں اس کے نفاذ کی مشکلات نسبتاً کم ہونگی"

فوج نے چھ گھنٹے کے اندر شہر پر کیونکر قابو پالیا

اس مرحلے پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوا کہ فوج کے لئے یہ کیونکر ممکن ہو گیا کہ مارشل لا کے چھ گھنٹوں کے اندر اندر پورے شہر پر قابو پالے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے امید بھی یہی تھی اس کا جواب یہ تھا کہ فوج کے پاس نفری بھی زیادہ ہے گولی چلانے کی قوت بھی زیادہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فوج پولیس کی طرح اپنے اقدامات کی جواب دہ نہیں ہے پھر اس سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک خاص صورت حالات فوج کے حوالے کیوں نہ کی گئی یا ایک خاص فرض مثلاً کرفیو توڑنے والوں کو گرفتار کرنے کا کام فوج کے سپرد کیوں نہ کیا گیا

حکومت فوج کو استعمال کرنے سے بچنا چاہتی تھی

مسٹر انور علی کہتے ہیں "اگر فوج پوری قوت کے ساتھ سول حکام کی مدد کے لئے آجاتی تو صورت حالات پر قابو پالیا جاتا فوج کیوں طلب نہ کی گئی؟ اس کی وجوہ یہ ہیں (۱) حکومت فوج کو طلب کرنے سے بچنے کی خواہش مند تھی (۲) احساس یہ تھا کہ فوج اسی صورت میں تعاون کرے گی کہ پورا اختیار اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے سمجھا جاتا تھا کہ اگر پورا اقتدار تفویض کر دیا گیا تو زیادہ خوں ریزی ہوگی یہ دونوں وجوہ مختلف نہیں بلکہ حقیقت میں ایک ہی وجہ ہے کہ حکومت خونریزی کے اندیشے کی وجہ سے فکرمند تھی یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ ۶ مارچ کو بھی جب صورت حالات ہر اعتبار سے سخت نازک ہو رہی تھی مسٹر دولتانہ نے "فوجی قبضے" کے مقابلے میں اپنی شکست کا اعتراف کیا یعنی سول حکام معاملے کو اس زاویہ نظر سے دیکھ رہے تھے!

چیف سیکرٹری کی کوئی رائے نہ تھی

حافظ عبدالمجید چیف سیکرٹری اس معاملے کو محض ایک بیرونی آدمی کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے جب ان سے سوال کیا گیا کہ فصیلی شہر کیوں حکم انتناعی سے مستثنیٰ رکھا گیا تو انہوں نے جواب دیا "اس کا نفاذ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا کام تھا اور یہ سوال ان ہی سے کرنا چاہیے ․․․․ میں نے فصیل شہر کے استثنا پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا"

ہوم سیکرٹری اور فصیلی شہر

مسٹر غیاث الدین احمد نے یہ خیال ظاہر کیا: "ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور انسپکٹر جنرل دوسرے افسروں اور وزیر اعلیٰ سے بے نیاز ہو کر آزادانہ اقدام کر سکتے تھے یہ درست ہے کہ مسجد وزیر خاں اُس وقت تمام گڑبڑ کا مرکز تھی لیکن یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ پولیس کے لئے وہاں کوئی کارروائی کرنا ممکن نہیں (فوج کے متعلق سوال کیا گیا) مجھے معلوم نہیں کہ اس نکتہ پر فوج سے بطور خاص کوئی مشورہ کیا گیا تھا یا اس کو فصیلی شہر کے اندر جانے کے لئے کہا گیا تھا لیکن انسپکٹر جنرل کی رائے یہ تھی کہ قبل تقسیم کے زمانے میں بھی تنگ گلی کوچوں اور گنجان عمارتوں کے باعث اندرون شہر انتظامی اقدامات قابل عمل نہ ہوتے تھے .... یہ صحیح ہے کہ مارشل لا کے نفاذ کے بعد فوج شہر کے اندر مصروف عمل ہوئی لیکن اس کو اس کام میں کوئی چار بریگیڈ متعین کرنے پڑے اور پھر بھی کچھ وقت تک انتظار کرنا پڑا .... یہ درست ہے کہ مارشل لا سے پہلے بھی فوج دستیاب ہو سکتی تھی .... میں نے نہیں دیکھا کہ سول حکام نے اس خاص صورت حالات کو فوج کے حوالے کرنے میں کسی تامل کا اظہار کیا ہو لیکن اس سوال کا صحیح صحیح جواب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور انسپکٹر جنرل ہی دے سکتے ہیں"

فصیلی شہر کے استثنا کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی وجوہ

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کہا کہ میں نے فصیلی شہر کو ۲۔ مارچ کے حکم سے اس لئے خارج رکھا کہ وہاں کسی فساد کا احتمال نہ تھا اور اس کا کوئی بعید سے بعید موقع بھی نہ تھا" لیکن کم سے کم سید فردوس شاہ (ڈی ایس پی) کے قتل کے بعد تو اس قدر قطعی اور یقینی اظہار خیال میں ضبط سے کام لینا چاہیئے تھا جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ واقعہ یاد دلایا گیا تو انہوں نے کہا کہ ۴۔ مارچ کی شام کو مجھے ضروری محسوس ہوا کہ فصیلی شہر کو بھی شامل کر لیا جائے چنانچہ میں نے کرفیو آرڈر پاس کر دیا پھر جب ہم نے کرفیو آرڈر کو پڑھا اور دیکھا کہ اس میں وہ رقبہ کرفیو سے آزاد رکھا گیا ہے جو سرکلر روڈ سے گھرا ہوا ہے تو ہم نے پوچھا کہ کیا کرفیو آرڈر میں شہر شامل ہے اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنے پہلے جواب کو نظر انداز کر کے کہا کہ "مجھے فصیل شہر کے اندر کرفیو نافذ کرنے کا مشورہ نہیں دیا گیا تھا" اس تمام جواب کا نتیجہ یہ ہے کہ "فساد کا احتمال" نہ ہونے یا "بعید سے بعید موقع" نہ ہونے کے متعلق جو بیان دیا گیا تھا وہ از سرتا پا باطل ہو گیا اس کے بعد آپ نے کہا کہ فصیلی شہر کو مستثنیٰ کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ حکم وہاں نافذ نہ ہو سکتا تھا بلکہ یہ تھی کہ پولیس نے اس کے متعلق مجھ سے کوئی تحریک ہی نہیں کی تھی لیکن جب ان کو سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کا یہ بیان دکھایا گیا

بیان ناقابل اعتبار ہے

کہ فصیلی شہر کے استثنا کی وجہ یہ تھی کہ انسپکٹر جنرل کے نزدیک شاید اس حکم کا نفاذ اُس رقبہ میں ممکن نہ ہو اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کہا کہ صحیح پوزیشن یہی ہے بہر حال "صحیح پوزیشن" کچھ بھی ہو ہم اس کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب پر بھروسا نہیں کر سکتے۔

فوج کی امداد کیوں طلب نہ کی

اس کے بعد ان سے سوال کیا گیا کہ اگر "صحیح پوزیشن" یہی تھی تو آپ نے فوجی امداد کیوں طلب نہ کی آپ نے کہا کہ فوج تو اس وقت طلب کی جا چکی تھی! لیکن سب کو معلوم ہے کہ فوج موجود کھڑی تھی ہم تو یہ جاننا چاہتے تھے کہ جب یہ موثر دوا موجود تھی تو اس کو اس بیماری کے علاج کے لئے کیوں استعمال نہ کیا گیا عطائیوں کے ٹوٹکے کیوں استعمال کئے گئے کیونکہ ہمارے نزدیک یہ عطائیوں کے ٹوٹکے سے بھی بدتر تھا کہ خطرے کا مقام تو مسجد وزیر خاں ہو اور فوج کوتوالی میں بھیجی جائے۔

اس کے بعد ان سے پوچھا گیا کہ آیا پولیس کے حاکم ہونے کی حیثیت سے آپ نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ مسجد وزیر خاں

کو خالی کرائے آپ نے جواب دیا "میرا فرض تو حکم دینا تھا ابتدائی کام کرنا پولیس کا فرض تھا"۔ اس سے ہمارے دل میں امید کی جھلک پیدا ہوئی اور ہم نے ان سے پوچھا "کیا واقعی آپ نے کوئی ایسا حکم دیا تھا"؟ جواب ملا کہ "اس قسم کا حکم دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ ہم سب پر واضح تھا کہ مسجد کو خالی کرانا چاہئے اور پولیس اس ضرورت سے باخبر تھی"

ایک اور جگہ انہوں نے مسجد کے سلسلے میں یہ کہا "ہم سب کو معلوم تھا کہ یہ بہت بڑا خطرہ ہے پولیس کو اپنے فرض کا پورا پورا احساس تھا اور وہ اس کے لئے میرے کسی رسمی حکم کی محتاج نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ کرفیو تو نافذ ہو ہی چکا تھا" اور لطف یہ ہے کہ کرفیو میں شہر شامل ہی نہ تھا! پوچھا گیا کہ کیا آپ کے نزدیک پولیس نے اس معاملے کے متعلق ادائے فرض میں کوتاہی نہیں کی آپ نے جواب دیا کہ میں یہ نہیں کہوں گا "کیونکہ پولیس ضرور مسجد کو خالی کرانے کا بہترین طریقہ معلوم کرنے پر غور و خوض کر رہی ہوگی . . . . . . اس معاملے پر ۲-یا ۳- مارچ کو نیازی کی اشتعال انگیز تقریر کے بعد غور کیا جا رہا تھا اور ڈی ایس پی کے قتل کے بعد اس مسئلہ پر اور بھی زیادہ توجہ کی گئی تھی"

"سوال - کیا اس غور اور توجہ کا کوئی محسوس نتیجہ بھی نکلا؟

جواب - پولیس نے ضرور کوئی اقدام کیا ہوگا . . . . . . مجھ سے کسی خاص حکم کی حاجت نہ تھی کیونکہ ہم سب اس خطرے سے پوری طرح باخبر تھے . . . . . . یہ صحیح ہے کہ میں پولیس کا حاکم ہوں لیکن پولیس ضرور صورت حالات کے تدارک کی کوشش کر رہی ہوگی اور میں نے بھی ایک طریقے سے کوشش کی تھی"

انہوں نے ۱۰- مارچ کو چند خواتین و حضرات کو مسجد میں بھیجا جماعت اسلامی کے وکیل چوہدری نذیر احمد خاں کے خیال میں زیادہ زور خواتین پر تھا اس پر چوہدری صاحب نے ایک رباعی پڑھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا کہ ع

زنے از غیب بروں آید و کارے بکند

لیکن پولیس پر اتنا زور دیا جا رہا تھا کہ ہم نے ان سے پوچھا کہ اگر لاہور میں کوئی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نہ بھی ہوتا تو کیا پولیس کو کوئی خاص فرق معلوم ہوتا آپ نے جواب دیا کہ ضرور فرق معلوم ہوتا "کیونکہ ایسی حالت میں ان کے اقدامات کی ہدایت اور ان کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ ہوتا"

"سوال - کیا آپ نے ان کے اقدامات کی ہدایت کی؟

جواب - نہیں - کیونکہ ان کے راستے میں ضرور بعض مشکلات حائل ہوں گی -

سوال - کیا آپ نے اس مشکل کو معلوم کرنے کی کوشش کی؟

جواب - مجھے صرف لاہور ہی کی دیکھ بھال نہیں کرنی پڑتی . . . "

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ٹال مٹول کیوں کر رہے تھے

دوسری باتوں کے علاوہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو امتحان میٹرک کے امیدواروں کے والدین کی طرف سے بیتابانہ ٹیلیفون وصول ہو رہے تھے۔ لہٰذا انہیں قدرتی طور پر مسجد وزیر خاں کو پولیس پر چھوڑ دینا پڑتا ہے لیکن کاش وہ یہی تسلیم کر لیتے کہ انہوں نے مسجد کو پولیس پر چھوڑ دیا تھا آپ کم از کم تین میل کے فاصلے سے مسجد اور پولیس کی "نگرانی" کر رہے تھے لیکن مسجد اور پولیس دونوں کو معلوم تھا کہ صورت حالات نہایت نازک ہے اور انہیں کیا کرنا چاہئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب کا خیال یہ تھا کہ وہ مسلسل احکام

صادر کر رہے تھے لیکن درحقیقت صادر نہیں کر رہے تھے کیونکہ پولیس کو معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور ان سب کو خطرے کا پورا احساس تھا ہمیں اس قسم کی خرافات مدت دراز تک سننی پڑی (اس سے صفحوں کے صفحے بھرے پڑے ہیں اور ہمیں اس کو نقل کرنے کی فرصت نہیں) کیونکہ یہ صاحب یہ ماننے پر آمادہ نہ تھے کہ ان کا اور سب کا فرض کوتوالی سے نہیں گورنمنٹ ہاؤس سے نہیں بلکہ مسجد وزیر خاں سے تعلق رکھتا تھا اور کرفیو کے حکم کا اطلاق کم از کم مسجد وزیر خاں پر ضرور ہونا چاہیے تھا اور اگر صورت حالات قابو سے بالکل باہر ہو گئی تھی تو اس کو فوج کے حوالے کر دینا چاہیئے تھا۔

نیازی کی گرفتاری

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہتے ہیں کہ انہوں نے تجویز کی تھی لیکن دوسرے حضرات مسجد میں گرفتاری کے خلاف تھے

"غالباً یکم مارچ کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ اطلاع ملی کہ مولانا عبدالستار نیازی مسجد وزیر خاں میں مقیم ہیں۔ لیکن ان کی کوئی تقریر ایسی نہیں تھی جس کی بنا پر ان کو گرفتار کرنا جائز ہوتا ...... مجھے معلوم ہوا کہ یہ شورش پسندوں کا گڑھ ہے ...... جب میں نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی تو اس کے بعد پولیس کا کام تھا کہ ... وہاں جاتی"۔ ہمارے خیال میں اس وقت وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ انہوں نے فصیلی شہر کو حکم میں شامل رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنی دلیل کو اسی مفروضہ پر مبنی قرار دیتے ہیں"۔ ۲۔ مارچ کو یہ اطلاع ملی کہ نیازی برابر حکومت پر نکتہ چینی کر رہے ہیں اور لوگوں کے جذبات کو بھڑکا رہے ہیں میرا خیال ہے اس دن مارچ کی تیسری تاریخ تھی میں ان کو گرفتار کرنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اسی اثنا میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں میں نے نیازی کی گرفتاری کی تجویز شد ومد سے پیش کی لیکن سب اس بات پر متفق تھے کہ مسجد کے اندر گرفتاری نہیں ہونی چاہیئے"۔ اب اس کا مقابلہ ان کے تحریری بیان سے کیجیے جس میں وہ ۲۔ مارچ کے واقعات کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ میں نے نیازی کو گرفتار کرنے کی تجویز پیش کی کیونکہ وہ تین دن سے عوام کو اشتعال دلا رہے تھے تین دن پیشتر کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ نیازی کم از کم ۲۸ فروری سے صرف مسجد میں مقیم ہی نہ تھے بلکہ اسی وقت سے عوام کو مشتعل بھی کر رہے تھے جب ان کو یہی تحریری بیان دکھایا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ تحریری بیان میں جو کہانی لکھی ہے وہ "اس غیر واضح معلومات پر مبنی تھی جو مجھے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس سے حاصل ہوئی تھی" ہمارے نزدیک یہ ایسی صورت حالات ہے جس میں کسی گواہ کو خصوصاً ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہونے کی اجازت نہ دینی چاہیئے اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ موجودہ معلومات سابقہ معلومات سے زیادہ مبہم اور غیر واضح نہیں ہوں گی واقعہ یہ ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جو یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے نیازی کو مسجد سے فوراً گرفتار کرنے کی تجویز پیش کی اور دوسرے افسروں نے اس کی مخالفت کی۔ یہ بیان بھی ۴۔ مارچ کی کانفرنس کے ریکارڈ سے غلط ثابت ہوتا ہے (Ex-DE-316) اس ریکارڈ میں ایک فیصلہ شامل ہے کہ "نیازی

لیکن ریکارڈ ان کی تردید کرتا ہے

کے خلاف انضباطی کارروائی فی الفور کی جائے اور ہوم سیکرٹری زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ ان کی گرفتاری کے احکام صادر کر دیں"۔ لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس فیصلہ کو اور لفظ "فی الفور" کو پڑھنے کے بعد بھی اس پر اصرار کیا کہ جو تجویز رد کر دی گئی تھی وہ صرف گرفتاری کی نہ تھی بلکہ (۱) فوری گرفتاری اور (۲) مسجد سے گرفتاری کے متعلق تھی دوسرے الفاظ میں دیگر افسروں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک نیازی مسجد میں ہے اس کو گرفتار نہ کیا جائے۔ نہ صرف

مجسٹریٹ نے تسلیم کیا کہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ نیازی مسجد سے کب باہر نکلیں گے لہٰذا اگر یہ تاویل کی جاتی تو یہ فیصلہ بالکل موثر نہیں ہو سکتا تھا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہتے ہیں "بالکل یہی شکایت مجھ کو تھی"۔ علاوہ اس امر کے کہ فیصلے کے الفاظ سے اُن کے بیان کی تردید ہوتی ہے خود ہوم سیکرٹری نے اس سے انکار کیا ہے کہ نیازی کی گرفتاری کے متعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کوئی تجویز رد کر دی گئی تھی فیصلہ یہ تھا کہ انسدادی کارروائی کی جائے یعنی نیازی کو مزید تقریریں کرنے سے روکا جائے اور یہ مقصد نیازی کو فی الفور گرفتار کئے بغیر حاصل نہ ہو سکتا تھا ہوم سیکرٹری کا بیان ہے کہ وارنٹ اُسی دن جاری کر دیا گیا تھا جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہوم سیکرٹری کا یہ بیان دکھایا گیا کہ نیازی پر حکم کی تعمیل نہ کرائی جا سکتی تھی کیونکہ سی آئی ڈی کی اطلاع کے مطابق مسجد جوش میں بھرے ہوئے عوام سے بھری ہوئی تھی تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نیازی کو مسجد کے اندر گرفتار کرنا مقصود تھا اور نہ یہ میرے اس بیان کے بالکل مطابق ہے کہ ان کو مسجد میں گرفتار کرنے کے متعلق میری جو تجویز تھی وہ نامنظور کر دی گئی تھی" ہم سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ایسی شہادت کے ساتھ تحقیقات کو جاری رکھنا ناممکن ہے اس بات کو ثابت کرنے کی یہ کوشش نہایت لاحاصل ہے کہ اگرچہ مولانا نیازی مسجد میں گرفتار کئے جا سکتے تھے لیکن ان کو گرفتار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہماری نہایت واضح رائے یہ ہے کہ مسجد وزیر خاں کے حالات ۲۰ فروری ہی سے کارروائی کا تقاضا کر رہے تھے اور یہ کوئی دور دست گوشہ نہ تھا بلکہ ساری سرگرمی کا عصبی مرکز تھا آیا انسپکٹر جنرل کے اُن اندیشوں کی کوئی صحیح

فصیلی شہر کے متعلق انسپکٹر جنرل کے اندیشے مضبوط بنیاد پر قائم نہ تھے۔

بنیاد تھی جن کی بنا پر وہ فصیلی شہر میں کرفیو آرڈر کے نفاذ کو غیر ممکن العمل سمجھتے تھے اس کے متعلق ان کے بعض اپنے جوابات سے خاصی امید افزائی کی گنجائش نظر آتی ہے۔ اور اگر ہمارے سامنے یہ حقیقت موجود نہ ہوتی کہ فوج نے کسی تکلف و تصنع کے بغیر اس کام کو انجام دے دیا تو شاید ہم اپنے سوالات اس قدر یقین و اعتماد سے نہ کر سکتے جنرل اعظم نے شکایت کی کہ جو

جنرل اعظم نے فصیلی رقبے میں کارروائی کا مطالبہ کیا

عمومی کام فوج کو تفویض کیا گیا اس میں "ہمیں فصیلی شہر سے باہر رکھا گیا حالانکہ طوفان کا مرکز اندرون فصیل کا رقبہ ہی تھا ہم اس میں نہایت آسانی سے گشت کر سکتے تھے نیم دلی کی تدابیر اور ناقص قیادت کا نتیجہ تباہی کی صورت میں نکلا"۔ پھر گورنمنٹ ہاؤس میں صبح کو جو کانفرنس ہوئی اس میں میں نے تجویز کی کہ ڈی ایس پی کے قتل کا واقعہ چونکہ فصیلی شہر کے رقبے میں ہوا ہے اور یہی سب سے زیادہ فساد زدہ رقبہ ہے اس لئے ہمیں وہاں مضبوط اقدام کرنا چاہیئے"۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر فصیلی شہر میں بغاوت ہو جاتی تو آپ کیا کرتے انہوں نے جواب دیا "میں اس رقبے کو اسی طرح پاک کر دیتا جس طرح میں نے ۶ مارچ کی شام کو چھ بجے تک کر دیا تھا بلا شبہ مسجد وزیر خاں کے فولادی دروازے کو کھولنا مناسب نہ ہوتا جہاں لوگ بند ہو کر بیٹھ گئے تھے لیکن میں نے ان کی بجلی بند کر دی ان کے لاؤڈ سپیکر کاٹ دیئے ان پر پانی بند کر دیا اور کسی شخص کو اندر نہ جانے دیا بالکل یہی تجویزیں میں نے اس کانفرنس میں پیش کی تھیں جو ۵ مارچ کی صبح کو چیف منسٹر کی کوٹھی پر ہوئی تھی اس وقت انسپکٹر جنرل پولیس نے اعتراض کیا تھا کہ کئی سال پیشتر جب انگریزوں نے فصیلی شہر میں کارروائی کی تھی تو انہوں نے تکلیف اٹھائی تھی میری تجویز یہ نہ تھی کہ شہر فوج کے حوالے کر دیا جائے بلکہ یہ تھی کہ اگر پولیس رقبہ متاثرہ کو صاف نہیں کر سکتی تو اس کام کو انجام دینے کی مجھے

اجازت دی جائے۔ یں نے ۶۔ مارچ کو فصیلی شہر کو پاک کرنے میں صرف ایک بٹالین سے کام لیا تھا۔

اس شدید سرکش (مسجد وزیر خاں) کو جو حکومت کے لئے ہوّا بنا ہوا تھا صرف اس کی ضروری آسائشوں سے محروم کر کے قابو میں لے آنا محض خواب نہ تھا بلکہ یہ کارنامہ ہماری آنکھوں کے سامنے واقع ہوا ہے اگر جنرل اعظم ہمیں یہ نہ بتاتے کہ انہوں نے یہ تجاویز کانفرنس میں بھی پیش کی تھیں تو شاید ہم اس کو کوئی خاص فوجی کمال یا راز مخفی سمجھتے جس سے سول حکام بالکل بے خبر ہیں مسٹر چندریگر اور مسٹر انور علی کے سوا سول حکومت سے تعلق رکھنے والے تمام گواہوں کو خود شہادت دینے سے پیشتر اخباروں میں جنرل اعظم کی شہادت کو پڑھنے کا موقع ملا اور انہوں نے جنرل کے بیان کی تردید نہیں کی خون ریزی کے خوف کے باعث شہر کو فوج کے حوالے کرنے سے ہچکچانا تو سمجھ میں آسکتا ہے گو عذر معقول نہیں سمجھا جا سکتا لیکن تجویز کردہ پرامن طریقہ اختیار کرنے میں کیا عذر تھا جو بعد میں جنرل اعظم نے اختیار کئے۔

مسجد وزیر خاں سے غفلت کی گئی

جب ہم نے مری میں تحریری بیانات پڑھے تو اس کے بعد ہمیں یقین ہو گیا کہ مسجد وزیر خاں کے معاملے میں غفلت کی گئی لیکن جس واقعہ سے ہمیں انتہائی تعجب ہوا وہ یہ تھا کہ جب مسجد کے سامنے سید فردوس شاہ کے قتل کی خبر نکلی تو ہر شخص کوتوالی کو بھاگا پہلا بیان پڑھتے وقت ہم نے سمجھا کہ "کوتوالی" محض کتابت کی غلطی ہے اصل میں "مسجد وزیر خاں" مراد ہو گی لیکن جب دوسرے بیان میں پھر مرکز شورش کی حیثیت سے کوتوالی ہی کا ذکر پڑھا تو خیال کیا کہ شاید "کوتوالی" مسجد وزیر خاں کا کوئی حصہ ہو گی اور اب ہم جانتے ہیں کہ ان سب کے کوتوالی کو بھاگنے کی وجہ یہ تھی کہ مسجد وزیر خاں کے بعد یہ بہترین مقام تھا اور آدمی کو خود اپنے ذہن کو قائل کرنے اور دیگر دھوکا دینے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے مسٹر انور علی نے کہا کہ اس واقعہ کے بعد ضروری پیش بندیاں کئے بغیر مسجد وزیر خاں کو جانا خطرے سے خالی نہ تھا ہمارا مطلب یہ نہیں کہ یہ افسر بھی اپنے آپ کو اسی خطرے میں ڈال دیتے جس نے سید فردوس شاہ کی جان لے لی تھی لیکن اس مرحلے پر اس خاص صورت حالات کو فوج کے سپرد کر دینا تو یقیناً حق بجانب تھا۔

۴۔ فائرنگ نرم کرنے کا فیصلہ

مسٹر چندریگر اور جنرل اعظم کے سوا باقی تمام افسر اس امر پر متفق ہیں کہ ۵۔ مارچ کی شام کو ایک تیسری کانفرنس ہوئی تھی جس کی صدارت خود مسٹر چندریگر نے کی تھی ہم نے جنرل اعظم کا نام اس لئے لیا ہے کہ ملک حبیب اللہ (سی پی ڈی سی آئی ڈی) نے جو مختصر یادداشت قلم بند کی تھی اس میں جنرل اعظم کے موجود ہونے کا ذکر کیا ہے جنرل اعظم کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کانفرنس میں حصہ نہیں لیا چونکہ وہ عموماً اس قسم کی دوسری کانفرنسوں میں حاضر ہوتے تھے اس لئے ممکن ہے کہ اس یادداشت میں ان کا ذکر بھولے ہی سے کر دیا گیا ہو لیکن اس قسم کی غلطی اس شخص کے متعلق تو نہیں ہو سکتی جس نے اس کانفرنس کی صدارت کی تھی۔

مسٹر دولتانہ کا بیان

لیکن جہاں تک "LET. UP" فائرنگ کو نرم کر دینے کے فیصلے کا تعلق ہے یہ سب لوگ متفق نہیں ہیں مسٹر دولتانہ کا قول یہ ہے کہ ایسا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا صرف اتنی بات ہوئی تھی کہ عزت مآب گورنر صاحب

نے بعض دوسرے مقامات پر اپنے تجربے کی چند مثالیں پیش کر کے یہ تجویز پیش کی تھی کہ کرفیو آرڈر کی اصطلاحی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کر دیا جائے یہ گفتگو نماز مغرب کے بعد ہوئی تھی۔

مسٹر چندریگر مسٹر چندریگر کا بیان ہے کہ ممکن ہے ان کی غیر حاضری میں کابینہ پنجاب کا کوئی اجلاس گورنمنٹ ہاؤس کے کسی جلسے میں ہوا ہو اور اس نے یہ فیصلہ کیا ہو جہاں تک خود میرا تعلق ہے میں نے صبح اس رائے کی تائید کی تھی کہ کرفیو کی اصطلاحی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کر دیا جائے مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کرفیو کے اوقات میں سڑک پر گزرتا ہوا پایا جائے تو ایسی حالت میں دستور یہ ہے کہ اس کو گولی نہ ماری جائے بلکہ گرفتار کر لیا جائے مسٹر چندریگر نے یہ بھی کہا کہ فائرنگ کو نرم کرنے کا کوئی معاملہ میرے علم میں نہیں آیا۔

جنرل اعظم جنرل اعظم نے کسی شخص کو کسی ایسے فیصلے کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا لیکن انہوں نے یہ کہا کہ مسٹر انور علی شام کے پانچ بجے جیم خانہ ہیڈ کوارٹرز میں ان سے ملنے آئے اور بتایا کہ معززین شہر کا ایک اجتماع گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہو رہا ہے "وہ پریشان معلوم ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ آج دن کے وقت شہر میں جو فائرنگ ہوئی ہے اس نے عوام میں سرکشی پیدا کر دی ہے مجھ پر ان کی باتوں کا یہ اثر ہوا کہ گویا وہ شدید فائرنگ کو غلط خیال کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ جب کبھی پولیس گولی چلاتی ہے اس کے بعد ایک تحقیقات لازمی طور پر ہوتی ہے"

میاں انور علی اس نکتہ پر میاں انور علی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے: "۵ - کی شام کو گورنمنٹ ہاؤس کی ایک کانفرنس میں گورنر نے مجھ سے صورت حالات کے متعلق سوال کیا مسٹر عالم ڈی آئی جی نے رپورٹ کی کہ لاقانونی کا آخری واقعہ (پولیس کی ایک گاڑی کو آگ لگانا) ڈھائی بجے بعد دوپہر ہوا ہے اس وقت تک احکام یہ تھے کہ ہمیں خلاف قانون مجمعوں کو زیادہ سے زیادہ قوت استعمال کر کے منتشر کر دینا چاہیئے اس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ اصطلاحی جرائم کے سلسلے میں گولی نہ چلائی جائے غالباً خود گورنر صاحب نے "[illegible]" کا لفظ استعمال کیا گورنر صاحب قطعی طور پر موجود تھے اور انہی نے فائرنگ میں نرمی اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا ممکن ہے اس وقت لیڈروں کی یہ شکایت ان کے ذہن میں ہو کہ فائرنگ بہت زیادہ کی گئی ہے" پولیس پر اس کا کیا اثر ہوا اس کے متعلق انہوں نے کہا "یہ صحیح نہیں ہے کہ ان فیصلوں سے پولیس کے حوصلے پست ہو گئے تھے لیکن ان میں کوفت اور تکان کے آثار ضرور ظاہر ہو رہے تھے کیونکہ وہ مدت دراز سے بغیر کسی آرام کے ڈیوٹی پر تھے اور اس لئے بھی کہ شورش میں تخفیف کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے یہ صحیح نہیں ہے کہ ان فیصلوں کی وجہ سے پولیس نے کارروائی ترک کر دی تھی"

لیکن انہیں یہ اطلاع ضرور ملی تھی کہ بعض جونیئر افسروں کی رائے میں گولی چلانا بالکل غیر ضروری ہے اور مطالبات منظور کر لینے چاہئیں۔

ملک حبیب اللہ ملک حبیب اللہ جنہوں نے یادداشت قلم بند کی تھی یہ نہیں بتا سکے کہ فیصلہ ٹھیک ٹھیک کیا تھا (یادداشت میں صرف یہ لکھا ہے کہ کرفیو آرڈر کی اصطلاحی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کر دیا جائے) ان کے نزدیک فیصلے کا خلاصہ یہ تھا کہ پولیس کو صرف اس وقت گولی چلانی چاہیئے جب اس پر حملہ کیا جائے اور کرفیو یا دوسرے احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی اصطلاحی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کر دیا جائے "یہ فیصلہ گورنر صاحب کی تجویز

پر کیا گیا تھا لیکن میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ تنہا گورنر صاحب ہی کا فیصلہ تھا ...... میرے حافظہ میں ایک دھندلا سا نقش ہے کہ چیف منسٹر ملک محمد خاں لغاری اور ایک اور وزیر نے یہ کہا تھا کہ انہیں چوک ڈال گراں میں گولی چلنے کی ایک تشویش انگیز خبر ملی ہے ان کا خیال یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ فائرنگ اس امر کا نتیجہ ہے کہ ریلوے کے مزدوروں نے کرفیو آرڈر کی ایک اصطلاحی خلاف ورزی کی تھی مسٹر عالم نے پوزیشن واضح کر دی جس سے حکومت بظاہر مطمئن ہو گئی لیکن میرا خیال ہے کہ معزز شہریوں نے حکومت پر دباؤ ڈالا افسر اس فیصلے کے حامی معلوم نہ ہوتے تھے گورنر صاحب نے شولاپور کے فسادات سنہ ۱۹۳۱ء کی مثال پیش کی اس فیصلے کا پس منظر یہ ہے: ۴۔ مارچ کو ڈی ایس پی کے قتل کے بعد رات کے وقت بھی اور ۵۔ مارچ کو بھی آتش زنی اور زد و کوب کے بے شمار جرائم کا ارتکاب کیا گیا پولیس کو کئی موقعوں پر ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے گولی چلانی پڑی گورنمنٹ ہاؤس کے اجلاس میں یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حکومت مضطرب ہو رہی ہے اور اس کا خیال ہے کہ مزید گولی چلانے سے لوگ مزید غضبناک ہو جائیں گے فائرنگ کو نرم کرنے کے فیصلے کے بعد صورت حالات قطعی طور پر بدتر ہو گئی پولیس کے حوصلے پست ہو گئے اور شوریدہ سر غنڈے زیادہ بیباک و گستاخ ہو گئے۔"

حافظ عبد المجید حافظ عبد المجید نے اپنی شہادت کے پہلے دن یہ بیان کیا کہ "ہلکا ہاتھ" کا لفظ انسپکٹر جنرل نے استعمال کیا تھا اور یہ تجویز بھی ان ہی کی تھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ گورنر یا جنرل اعظم اس وقت موجود تھے خیال یہ تھا کہ آئندہ دن چونکہ جمعہ ہے اور تیسرے پہر کوئی واقعہ نہیں ہوا اس لئے ہمیں عوام کو مشتعل نہ کرنا چاہئے لیکن اس امر کا کوئی اشارہ تک نہ تھا کہ جہاں ضروری ہو وہاں مضبوط اقدام نہ کیا جائے" دوسرے دن حافظ صاحب نے تصریح کی کہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اصل تجویز مسٹر انور علی نے پیش کی تھی یہ صحیح نہیں ہے کہ افسر اس فیصلے کے خلاف تھے اور ایک اور واقعہ کے تعلق میں اب انہیں یاد آ گیا کہ گورنر صاحب ضرور اس اجلاس میں موجود ہوں گے۔

مسٹر غیاث الدین احمد مسٹر غیاث الدین احمد نے کہا کہ گورنر اور جی او سی دونوں اس اجلاس میں موجود تھے اور گورنر صاحب نے تجویز کی تھی کہ کرفیو آرڈر کی محض اصطلاحی خلاف ورزی پر گولی نہ چلائی جائے میرا خیال ہے کہ "ہلکا ہاتھ" کا لفظ گورنر صاحب ہی نے استعمال کیا تھا چونکہ اطلاع یہ تھی کہ سہ پہر کے آغاز ہی سے کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا اور چونکہ شہریوں کے اجتماع میں انسپکٹر جنرل نے صبح کی صورت حالات کا جو تجزیہ کیا تھا اس پر بہت پرشور احتجاج کیا گیا تھا لہٰذا گورنر اور کابینہ دونوں کا خیال یہ تھا کہ فائرنگ میں نرمی کی جائے۔

مرزا نعیم الدین مرزا نعیم الدین سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس اس کانفرنس میں موجود نہ تھے لیکن جب ۶ مارچ کی صبح کو وہ کوتوالی گئے تو انہیں معلوم ہوا کہ گورنمنٹ ہاؤس سے "کوتوالی کنٹرول" میں یہ احکام موصول ہوئے ہیں کہ فائرنگ محدود کر دی جائے اور کرفیو آرڈر کی اصطلاحی خلاف ورزیاں نظر انداز کر دی جائیں جن پولیس افسروں کے ساتھ انہوں نے اس معاملے کے متعلق بات چیت کی ان کی رائے یہ تھی کہ اگر اس حکم کے بعد انہوں نے کہیں گولی چلائی تو ان کے خلاف تحقیقات ہو جائے گی ایک اور حکم بھی کوتوالی میں اسی سرچشمہ سے پہنچا جس کو مرزا اصباح ڈی ایس پی نے وصول کیا کہ پولیس کو صرف اپنے بچاؤ کے لئے گولی چلانی چاہئے سول لائنز کے ایک سب انسپکٹر نے یہ تازہ ترین حکم مرزا نعیم الدین کو پہنچایا مرزا نعیم الدین کہتے ہیں کہ اس طرح گویا پریشان کن اور متضاد ہدایات موصول ہو رہی تھیں

جو خود ان کی سمجھ میں نہ آتی تھیں چہ جائے کہ ان کے ماتحت انہیں سمجھ سکتے مرزا صاحب نے ۶ - مارچ کی صبح

استعفے کی پیش کش

کو انسپکٹر جنرل کے سامنے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور کہا کہ حکومت کی اس کمزور پالیسی سے پولیس کے حوصلے پست ہو رہے ہیں اور اگر حکومت نے اپنی اس پالیسی کو تبدیل نہ کیا تو وہ استعفے دے دیں گے اس نکتے پر مسٹر انور علی واضح طور پر اُن سے اختلاف کرتے ہیں مسٹر انور علی کے قول کے مطابق مرزا نعیم الدین اس وجہ سے استعفا پیش کر رہے تھے کہ جمہور عوام کسی پیغام تسلی کی توقع کر رہے تھے اور اس امر پر ناراض تھے کہ حکومت نے مطالبات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی مسٹر انور علی نے ان سے اتفاق کیا چنانچہ وہ دونوں چیف منسٹر کے پاس گئے اور اُن سے یہی بات کہ دی چیف منسٹر بھی یہی کہتے ہیں کہ مرزا نعیم الدین انسپکٹر جنرل کے ساتھ آئے اور اُنہوں نے مشورہ دیا کہ صورت حالات کے تدارک کا صرف ایک طریقہ ہے کہ کسی قسم کا سیاسی مداوا کیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بعض فوجی افسروں کی وساطت سے گورنر صاحب کے علم میں بھی آیا ان کو بتایا گیا کہ انسپکٹر جنرل اور سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے چیف منسٹر کو مشورہ دیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ گولی چلانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور عوام کی تسکین تسلی کے لئے کچھ کرنا چاہئے مسٹر چندریگر نے چیف منسٹر سے پوچھا۔ پھر ان دونوں افسروں سے بھی سوال کیا " انہوں نے ابتدا میں تو تسلیم کیا کہ انہوں نے ایسا مشورہ دیا تھا لیکن جب میں نے ان کو ڈانٹ کے پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ یہ مشورہ ان کا نہ تھا بلکہ بعض لوگوں کا نقطۂ نگاہ تھا جو انہوں نے چیف منسٹر تک پہنچا دیا تھا"

دونوں افسروں نے بشدت انکار کیا ہے کہ انہیں ڈانٹا گیا تھا۔

استعفے کے معاملے میں مرزا نعیم الدین کی تائید نہیں ہوئی

یہ کوئی ایسا گورکھ دھندا نہیں جس کا حل ناممکن ہو کم از کم اتنی بات تو واضح ہے کہ استعفے کے معاملے میں مرزا نعیم الدین کی خاصی تردید کی گئی ہے اور چونکہ یہ ہمارے نزدیک کوئی تحقیقی تنقیح طلب معاملہ نہیں اس لئے ہمیں صرف یہ کہنا چاہیئے کہ جو کچھ انہوں نے اس کے متعلق بیان کیا وہ ثابت نہیں ہو سکا لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ باہر یہ خیال پھیل گیا تھا کہ فائرنگ نرم کی جائے گی تو پولیس کے نقطۂ نگاہ سے مرزا نعیم الدین کا انسپکٹر جنرل سے شکایت کرنا بالکل طبعی تھا ممکن ہے مسٹر انور علی اس شکایت کو تسلیم کرنے پر اس لئے آمادہ نہ ہوں کہ وہ خود بھی اس فیصلے میں شامل تھے ملک حبیب اللہ نے اس فیصلے کے پس منظر کی تشریح میں جو بیان دیا ہے اس سے ہم کو اس وسیع و پیچیدہ شہادت سے باہر نکلنے کا سیدھا راستہ مل گیا ہے۔

لیکن فائرنگ کے متعلق کوئی حکم ضرور صادر ہوا

اس میں کوئی شک نہیں کہ تیسرے پہر ایک اجتماع ہوا جس میں معزز شہریوں نے اس شدید فائرنگ کے خلاف احتجاج کیا جو سید فردوس شاہ کے قتل پر برپا ہونے والی لاقانونی کے باعث کی گئی تھی وزیروں میں سے بھی بعض اس سے متاثر ہوئے ظاہر ہے کہ ایک عارضی جوش خروش کے مقابلے میں آیندہ الیکشن زیادہ اہم تھا چونکہ دال گراں میں گولی چلی اور جہاں کہیں گولی چلتی ہے الزام پولیس ہی پر عاید کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے موٹر کار کا کوئی بھی حادثہ ہو اس میں قصور ڈرائیور ہی کا ہوتا ہے! یہ صحیح ہے کہ مسٹر عالم نے اس واقعہ کی تشریح کی تھی لیکن آخر وہ بھی پولیس افسر ہی ہیں اور تشریح و توضیح پولیس کا کام نہیں ہے نتیجہ یہ نکلا کہ "یہ" فائرنگ ضرور کرفیو آرڈر کی محض اصطلاحی خلاف ورزی کی وجہ سے کی گئی اور آیندہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے ہم نہایت آسانی سے اپنے آپ کو اس فیصلے کے لئے تیار کر سکتے ہیں لیکن جس حالت میں موضوع زیر بحث "شدید فائرنگ" ہے تو جو فیصلہ اس کی ترمیم کرے گا اس کا مطلب قدرتی طور پر یہی

اس کا مطلب یہی سمجھا گیا کہ یہ فائرنگ کو نرم کرنے کا حکم ہے

سمجھا جائے گا کہ یہ فائرنگ کو نرم کرنے کا نتیجہ ہے اور اسی بنا پر بہت سے افسروں نے اس کا مطلب یہی سمجھا اور ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ وہ تمام متفق الرائے تھے اور اگر ان کے دلوں میں کچھ شبہات بھی تھے تو انہوں نے ان کا اظہار نہ کیا تھا ملک حبیب اللہ نے بیان کیا ہے کہ فہر متفق معلوم نہ ہوتے تھے لیکن یہ بیان محض تاثر ہے اس سے زیادہ نہیں اس امر کی شہادت موجود نہیں کہ یہ فیصلہ کوتوالی کو کس نے پہنچایا لیکن ارسال حکم میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ان کا مطلب یہی سمجھا گیا کہ فائرنگ نرم کر دی جائے خود مسٹر اعجاز حسین شاہ کا بیان بھی ہے کہ سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس ۶- مارچ کی صبح کو شکایت کر رہے تھے کہ فائرنگ کو محدود کر دینے کا حکم دیا گیا ہے اس کے بعد کوتوالی میں ایک انسپکٹر نے بھی مجھ سے پوچھا کہ آیا یہ صحیح ہے

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی اس کے متعلق سُنا

میں نے انسپکٹر سے کہا کہ مجھے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں اور پولیس کو اپنے فرائض حسب معمول بجا لانے چاہئیں ۔

حوصلے اس سے پست ہو گئے

لہٰذا یہ سمجھنا صحیح ہو گا کہ فائرنگ گورنمنٹ ہاؤس کے ایک غیر واضح سے فیصلے کی بنا پر نرم کر دیا گیا ہم سے کہا جائے یا نہ کہا جائے کہ اس قسم کے فیصلے سے حوصلے پست ہو جاتے ہیں ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا یہی اثر ہو گا ظاہر ہے کہ وہ لوگ فائرنگ اس لئے تو نہیں کر رہے تھے کہ گولی بارود کو مدت سے آزمانے کا موقع نہ ملا تھا وہ تو اس لئے فائرنگ کر رہے تھے کہ "آتش زنی اور زدوکوب کے بے شمار واقعات رونما ہو چکے تھے"، ہماری فہرست مظہر ہے کہ ۵- مارچ کو لاقانونی کے کل ۴۷- واقعات کی اطلاعیں موصول ہوئیں جن میں آٹھ آتش زنی کے واقعات - ایک قتل اور دو لوٹ مار کے حادثے شامل تھے اس کے علاوہ تانگے والوں اور دکانداروں کے مُنہ کالے کئے گئے پولیس پر اینٹیں برسائی گئیں کم از کم ایک حملہ ریلوے ٹرین پر بھی کیا گیا اور ان سب کے مقابلے میں پولیس نے ۹ دفعہ گولی چلائی لہٰذا جب اس قسم کا حکم جاری کیا جائے تو اس سے پولیس کو یقیناً اندیشے لاحق ہو جاتے ہیں اسی وجہ سے فوج زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے اس کو یہ فیصلہ نہیں کرنا پڑتا کہ وہ خود حفاظتی کے لئے کارروائی کر رہی ہے یا وہ حقیقی ضرورت کے مقابلے میں زیادہ قوت استعمال کر رہی ہے اسی وجہ سے جنرل اعظم کے قول کے مطابق میاں انور علی شکایت کر رہے تھے کہ جب کبھی پولیس گولی چلاتی ہے اس کے بعد ایک تحقیقات ضرور کی جاتی ہے ۔

۵- فوج کے ساتھ رابطہ

سُنی سُنائی باتوں پر مبنی تاثرات

جس وقت ہم نے سول کے افسروں کے تحریری بیانات پڑھے تو ہم نے یہ زبردست تاثر قبول کیا کہ اگر فوج امداد پر آمادہ ہو جاتی تو ان افسوسناک واقعات کا سدباب ہو سکتا تھا فوج امداد پر آمادہ کیوں نہ تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ فوجی افسر کامل اختیار چاہتے تھے یہ صورت ہم کو قطعاً نہایت افسوسناک معلوم ہوئی کہ ایک ہی مقصد کے لئے کام کرنے والی دو طاقتوں کے درمیان اس قسم کے رسمی تکلفات حائل ہوں لیکن ہمارے سامنے جو شہادت پیش ہوئی اس سے ہمیں خوشگوار تعجب ہوا کہ اگرچہ ہر گواہ کا احساس یہ تھا کہ فوج نے پوری توجہ نہیں کی لیکن انہوں نے اپنے اس احساس کو دوسرے لوگوں سے

سنی سنائی باتوں پر مبنی بتایا بالآخر ان میں سے بعض نے ہمارے سامنے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا ذکر کیا اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہمیں بتایا کہ وہ اس کام سے بالکل مطمئن ہیں جو فوج نے انجام دیا ہے۔

مسٹر چندریگر کا خیال ہم مسٹر چندریگر سے ابتدا کرتے ہیں کیونکہ اگر افسر ایک دوسرے کے ساتھ درست طور پر تعاون نہیں کر رہے تھے تو گورنر کے پاس کوئی نہ کوئی شکایت ضرور پہنچی ہوگی مسٹر چندریگر نے بیان کیا کہ ۶-مارچ کو جنرل اعظم نے یہ خیال ظاہر کیا کہ صورت حالات کو فوج کے سپرد کر دینا چاہیئے اس میں گویا ضمنی طور پر یہ شکایت بھی شامل تھی کہ پولیس صورت حالات کا مقابلہ مضبوطی سے نہیں کر رہی ہے پولیس کی طرف سے بھی ایک شکایت موجود تھی کہ ان کو فوجی نفری اتنی تعداد میں مہیا نہیں کی گئی جس کی انہیں ضرورت ہے جنرل اعظم نے اس کا یہ جواب دیا کہ جب کبھی مجھ سے درخواست کی گئی میرے پاس جتنی نفری موجود تھی میں نے پولیس کے حوالے کردی یہ واضح ہے کہ شکایت کے اس حصے میں امداد کی نوعیت کا کوئی ذکر نہیں مسٹر چندریگر نے مزید یہ کہا

ہار پہنانے کا واقعہ کہ انسپکٹر جنرل نے ان سے ذکر کیا تھا کہ جمہور کے بعض افراد نے چند فوجی افسروں کو پھولوں کے ہار پہنائے اور جنرل اعظم نے تسلیم کیا کہ کم از کم ایک ایسا واقعہ ضرور ہوا تھا جس پر انہوں نے اپنے افسروں کو تنبیہ کردی تھی کہ ہار بالکل قبول نہ کریں۔

پھوٹ ڈالنے کی کوشش (مسٹر چندریگر کا بیان ہے) جنرل اعظم نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تحریک کے بعض لیڈر جان بوجھ کر فوج اور پولیس میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے انسپکٹر جنرل نے مسٹر چندریگر کو بتایا تھا کہ میں نے جب کبھی استدعا کی ہے جنرل اعظم نے میری پوری پوری امداد کی ہے لیکن بعض فوجی افسروں نے ہجوم پر گولی نہیں چلائی حالانکہ انسپکٹر جنرل کے نزدیک انہیں گولی چلانی چاہیئے تھی جنرل اعظم نے اس معاملے کی تحقیقات کی اور ان کی تشریح سے مسٹر چندریگر مطمئن ہو گئے کہ جن موقعوں پر کوتاہی کی شکایت کی گئی ہے ان پر گولی چلانے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔

لہٰذا مسٹر چندریگر کے نزدیک اندیشے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ہار پہنانے کا صرف ایک واقعہ ہوا تھا اور جنرل اعظم نے فوری تنبیہ کردی تھی۔

مسٹر دولتانہ کی رائے مسٹر دولتانہ نے ۶-مارچ کی صورت حالات کے متعلق یہ کہا کہ: "صورت حال پر قابو پانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اس کو فوج کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ اس "پوری امداد" کے باوجود جو اس وقت تک سول حکام کو فوج کی طرف سے مل رہی تھی وہ اس پر قابو نہیں پا سکے تھے مجھ سے کوئی خاص شکایت نہیں کی گئی یہ ۵-۶ کی صبح کو مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ دونوں طاقتوں کے درمیان پورا رابطہ نہیں ہے مثال کے طور پر ۳-یا ۴ کو مجھے معلوم ہوا کہ فوج نے اپنے گشتی دستے شہر سے ہٹا لئے ہیں یہ بھی کہا گیا کہ شہر میں پولیس کے خلاف اور فوج کے حق میں نعرے لگائے گئے ہیں"۔ جیسا مسٹر چندریگر نے کہا ہے اس حرکت کا مقصد پھوٹ ڈالنا تھا لیکن جہاں تک فوج کو ہٹا لینے کا تعلق ہے واقعات یہ ہیں کہ اس کا صرف ایک حصہ اس دن ہٹایا گیا تھا جس دن سول آفیسر یہ کہہ رہے تھے کہ "آدھی لڑائی جیتی جا چکی ہے"۔ لیکن ان کو شہر سے ہٹانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ فوج کا ڈیرا باغ جناح میں تھا اور فوجی سپاہی شہر میں صرف گشت کے لئے جایا کرتے تھے لہٰذا مسٹر دولتانہ کے اس احساس سے "اس پوری امداد" میں کوئی کمی معلوم نہیں ہوتی جو ان کی رائے میں فوج نے سول حکام کو مہیا کی تھی۔

فیصلہ نمبر ۲ موٴرخہ ۵ مارچ

اس مرحلے پر اُس فیصلے کا ذکر کرنا موزوں ہوگا جو ۵ مارچ کا فیصلہ ۲ کہلاتا ہے یہ اُن دس فیصلوں میں سے ایک ہے جو گورنمنٹ ہاؤس کے اجلاس قبل دوپہر میں کیے گئے تھے اور یہ فیصلہ ۳ اور فیصلہ ۴ سے مل کر ایک ایسی چیز بن گیا ہے جس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

فیصلہ ۲: چونکہ لاہور میں صورت حالات بدتر ہوگئی ہے اور شہر میں ایک عام ہنگامہ برپا ہے اس لیے سب سے پہلے پولیس کو چاہیے کہ نہایت مضبوط اقدام کرے اور فسادات کو فرد کرنے کے لیے جس قدر قوت ضروری ہو استعمال کرے پولیس کے گشتی دستوں کی امداد فوج کے دستے کریں گے جو اپنے کمانڈروں کے ماتحت ہوں گے۔

اقدام: انسپکٹر جنرل پولیس / جنرل آفیسر کمانڈنگ

فیصلہ ۳: اگر پولیس کسی خاص خطے کے حالات کا مقابلہ نہ کر سکے تو اس وقت جو سینیئر پولیس افسر موجود ہو اسے چاہیے کہ اس خطے کی صورت حالات کا چارج اس فوجی کمانڈر کے سپرد کر دے جو اس کے ساتھ متعین ہو۔

اقدام: انسپکٹر جنرل پولیس / جنرل آفیسر کمانڈنگ

فیصلہ ۴: اگر مذکورہ بالا تدابیر سے قانون و انتظام بحال نہ ہو سکا اور پولیس فوج کی جزوی امداد سے عام صورت حالات پر قابو نہ پا سکی تو فوج سے کہا جائے گا کہ وہ شہر کا چارج لے لے۔

اقدام: انسپکٹر جنرل پولیس / جنرل آفیسر کمانڈنگ

ہم پہلے ان فیصلوں کی تعبیر ایسے طریق سے کرنے کی کوشش کریں گے گویا یہ مجموعہ ضابطہ فوجداری کا ایک حصہ ہیں فیصلہ ۲ میں "نہایت مضبوط اقدام" پر زور دیا گیا ہے لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ "سب سے پہلے پولیس یہ اقدام کرے گی فوجی کمانڈر اپنے دستے کے ساتھ پولیس کی معیت میں رہے گا کیونکہ فیصلہ ۳ مظہر ہے کہ ناکامی کی صورت میں پولیس افسر اس فوجی کمانڈر کو چارج دے دے گا جو" اس کے ساتھ "متعین ہوگا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ یہ فوجی دستہ پولیس کے گشتی دستے کی امداد کیونکر کرے گا کیونکہ آپ کسی دوسرے شخص کی امداد نہیں کر سکتے جب تک اپنے کام کو اس کے کام سے مطابق نہ کر لیں ایسی حالت میں آپ آزادانہ اقدام نہ کر سکیں گے بلکہ دوسرے شخص کی تجاویز کی تکمیل کے لیے کام کریں گے اگر وہ آپ سے ایک کام کرنے کو کہے اور آپ کوئی دوسرا کام کرنے لگیں تو آپ کا یہ فعل "امداد" نہیں سمجھا جائے گا لہٰذا آپ کو اپنے تمام اعمال اس کے ماتحت رکھنے ہوں گے آپ اس وقت تک کوئی اقدام نہ کریں گے جب تک آپ سے کہا نہ جائے ممکن ہے کہ آپ کو اقدام کے لیے سرے سے کہا ہی نہ جائے۔

آیا یہ بات کہ فوجی دستے "اپنے کمانڈروں کے ماتحت" ہوں گے کوئی خاص معنی رکھتی ہے؟ وہ لوگ ہمیشہ ہی اپنے کمانڈروں کے ماتحت ہوتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اس وجہ کی بنا پر وہ آزادانہ اقدام کر سکیں گے اگر یہ مطلب سمجھا جائے تو پھر لفظ "امداد" بے معنی ہو جائے گا بلکہ فیصلہ ۳ کے ابتدائی الفاظ بھی بے معنی ہو جائیں گے اس فقرے سے کہ "اگر پولیس کسی خطے کے حالات کا مقابلہ نہ کر سکے" ظاہر ہوتا ہے

کہ صورت حالات کا مقابلہ پولیس ہی کر رہی ہے لیکن اگر دونوں دستے آزادانہ اقدام بھی کر رہے ہوں تو پھر وہ دونوں ہی صورتِ حالات کا مقابلہ کر رہے ہوں گے۔

مسٹر چندریگر: اس نکتہ پر مسٹر چندریگر کی شہادت کا مطلب یہ ہے کہ فوجی دستے بھی "بشرطِ ضرورت" قوت کا استعمال کریں گے لیکن وہ اپنے کمانڈروں کے احکام کے ماتحت کام کریں گے کمانڈروں کا فرض قرار دیا گیا کہ وہ "جی او سی کی جاری کردہ عام ہدایات کے ماتحت" اپنے اختیارِ تمیزی کو استعمال کریں۔ واوین کے درمیان جو الفاظ ہیں ان سے ایک مشکل صورت پیدا ہوتی ہے یہ کون فیصلہ کرے گا کہ قوت کا استعمال ضروری ہے اگر کمانڈروں کو اختیارِ تمیزی کے استعمال کا حق ہے تو وہ خود ہی اس کا فیصلہ کریں گے لیکن فرض کیجئے پولیس افسر نے قوت کا استعمال شروع کر دیا اور کمانڈر کے نزدیک وہ غیر ضروری ہو یا کمانڈر کے خیال میں قوت کا استعمال ضروری ہو اور پولیس افسر نے قوت سے کام نہ لیا ایسی حالت میں کمانڈر سے پولیس کے دستے کو "امداد" کیونکر دے گی اس کے علاوہ "جی او سی کی جاری کردہ ہدایات" بھی ہوں گی جن کی گنجائش فیصلے میں کہیں معلوم نہیں ہوتی اگر جی او سی نے یہ عام ہدایات دے دی کہ قوت اسی حالت میں استعمال کی جائے جب پولیس اسے استعمال کر رہی ہو تو پھر اس کے استعمال کا "اختیارِ تمیزی" غائب ہو جاتا ہے اگر ہدایت یہ ہے کہ اختیارِ تمیزی استعمال کیا جائے تو چونکہ یہ فیصلے ہی کا ایک جزو ہے کہ اختیارِ تمیزی سے کام لیا جائے لہٰذا ہدایت بے سود ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ فرض کر لینے کے بعد کہ فیصلہ ۳۰ کی تعبیر یہی ہے مندرجہ ذیل سوال و جواب سے ظاہر ہو جائے گا کہ فوج کے خلاف شکایت تو کجا خود پولیس کے خلاف یہ شکایت کی جاتی تھی کہ وہ کام نہیں کرتی۔

سوال از مسٹر مظہر علی اظہر وکیل احرار: "کیا انسپکٹر جنرل یا جی او سی میں سے کسی افسر نے آپ سے شکایت کی تھی کہ دوسرا افسر فیصلہ ۳۰ کو نافذ نہیں کر رہا ہے؟"

جواب: "جی او سی کی شکایت انسپکٹر جنرل پولیس کے خلاف یہ تھی کہ پولیس کے حوصلے پست ہو گئے ہیں ان کے افسروں کو خوف ہے کہ پولیس کے ان ملازموں کے خلاف جو شہر میں رہتے ہیں انتقامی کارروائیاں کی جائیں گی اور انسپکٹر جنرل پولیس متیقن نہیں ہیں کہ وہ اپنے جوانوں کی وفاداری پر بھروسہ کر سکتے ہیں جب میں نے اس کے متعلق انسپکٹر جنرل پولیس سے سوال کیا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ اس مسئلے پر پولیس کے جوانوں کی وفاداری پر پورا اعتماد نہیں کر سکتے اور ان کی رائے میں زود یا بدیر صورتِ حالات پر قابو پانے کا کام فوج کے حوالے کرنا ہی پڑے گا" مسٹر انور علی تسلیم کر چکے ہیں کہ پولیس کے جونیر افسروں کے نزدیک مطالبات منظور کر لینے چاہئیں اگر یہ صحیح ہے کہ جی او سی نے پولیس کو پست حوصلہ ہونے کا الزام دیا تو یہ بھی صحیح ہے کہ فوج تعاون نہیں کر رہی تھی انسپکٹر جنرل ایک شدید الزام کو قبول کرنے کے بجائے خود اپنی جگہ فوج کے عدم تعاون کا شکوہ کر سکتے تھے۔

اگر فوجی کمانڈر کو حق دے دیا گیا تھا کہ جس قسم کا اقدام چاہے کرے تو پھر فیصلہ ۳۰ کے ماتحت "فوج کے حوالے" کر دینے کا سوال ہی کیونکر پیدا ہوتا تھا وہ صورتِ حالات کا اتنا ہی انچارج تھا جتنا پولیس افسر تھا

اور آپ کسی شخص کو ایک چیز حوالے نہیں کر سکتے جو پہلے ہی اس کے ہاتھ میں ہو۔

حافظ عبدالمجید: مسودہ نویس

حافظ عبدالمجید پر پہلے پہل تو معنی بالکل واضح تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے فوج پر بے حرکتی کا الزام عاید کیا چونکہ مسودہ انہوں نے خود مرتب کیا تھا اس لئے دوسروں کے مقابلے میں وہ فائدے میں بھی تھے۔

تعاون کی کوئی واضح سکیم نہ تھی

انہوں نے بتایا کہ ان کی موجودگی میں فوج اور سول کی قوت کے درمیان تعاون کی کسی واضح سکیم پر کبھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی نہ کوئی فیصلہ کیا گیا اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ موجودہ موقع پر بھی کسی چیز کے متعلق گفتگو یا فیصلہ نہیں ہوا تھا ہمارے خیال میں جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ قوت کے استعمال پر زور دیا گیا اور عمومی حیثیت سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ فوج بلاشبہ پولیس کی امداد کے لئے موجود ہی ہوگی اسی وجہ کی بنا پر جب چیف سیکرٹری سے سوال کیا گیا کہ آیا اُن سے آزادانہ اقدام کی توقع تھی تو انہوں نے جواب دیا کہ "ان پر بر روئے قانون بعض ذمہ داریاں تھیں اور بعض فرائض بھی عائد ہوتے تھے اور انہیں قانون کے مطابق اقدام کرنے سے روکنے والی کوئی چیز نہ تھی" اس کے بعد ان فیصلوں کا ذکر کیا گیا اور پوچھا گیا کہ "آیا ان فیصلوں کے بعد فوج کے لئے آزادانہ اقدام کا اختیار باقی رہ گیا تھا" انہوں نے جواب دیا "ان فیصلوں کے باوجود" میرا خیال یہ ہے کہ ان فیصلوں کی وجہ سے فوج کی یہ ذمہ داری حذف نہیں ہو جاتی تھی کہ جس صورت حالات میں فوجی اقدام ضروری ہو (اور خصوصاً جب پولیس موجود نہ ہو) فوج اقدام کریگی اس کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم ان فیصلوں میں رجحان، تک مسودہ نویس کے علم کا تعلق ہے، آزادانہ اقدام کا تصور شامل نہ تھا تاآنکہ فیصلہ ۳۰ کے عمل درآمد کا وقت آجائے تاہم انہوں نے فوج کی اس پوزیشن کو قبول نہ کیا کہ ان فیصلوں کے رو سے فوج اسی صورت میں کوئی اقدام کر سکتی تھی کہ سول کی قوت ان کے اقدام کی خواستگار ہو۔ انہوں نے ہمیں یاد دلایا کہ جو کچھ ۵۔ مارچ سے پہلے ہو رہا تھا اس کی بھی تحقیق کرنی ضروری تھی۔ اور کہا کہ ان فیصلوں سے گویا یہ کوشش کی گئی تھی کہ "فوج اور پولیس کے درمیان کوئی قابل عمل ترتیب کار قرار پا جائے" ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اس تاریخ تک ترتیب کار کا انتظام تسلی بخش نہ تھا تو ان دونوں کے درمیان تقسیم عمل کا بندوبست کیا جا سکتا تھا اور فوجی کمانڈروں سے کہا جا سکتا تھا کہ وہ آزادانہ اقدام کریں ایسی حالت میں نہ پولیس اور نہ کوئی مجسٹریٹ ان کے ساتھ ہوتا کیونکہ اگر کوئی مجسٹریٹ ان کے ساتھ ہوتا تو کمانڈر بر روئے قانون اس کے زیر ہدایت ہوتے تاآنکہ مجسٹریٹ ان کو اجازت نہ دے دیتا کہ حالات کو اپنے قبضہ میں لے لیں حافظ عبدالمجید بھی اس تعبیر کو قبول کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ فیصلوں میں کمانڈروں پر یہ رستہ کھلا ہوا تھا کہ اکیلے کام پر جائیں یا مجسٹریٹ یا پولیس کی معیت میں جائیں۔

اگر اہل فوج کے نزدیک بھی فیصلوں کی یہ تعبیر صحیح ہوتی تو ان کو کوئی شکایت باقی نہ رہتی اور اس کے بعد وہ موثر کارروائی کرتے کیونکہ چیف سیکرٹری کے قول کے مطابق "وہ صورت حالات پر قابو پانے کا ایسا اختیار چاہتے تھے جس میں سول حکام کی طرف سے کسی مداخلت کا امکان نہ ہو حقیقت یہ ہے کہ یہ کانفرنس اور اس کے فیصلوں کا رجحان اسی تاثر پر مبنی تھا جو سول حکام کے دماغوں میں جاگزین تھا۔ . . . ."

گورنر۔ چیف منسٹر۔ ہوم سیکرٹری۔ انسپکٹر جنرل پولیس اور خود میں نے جو کچھ یکم۔ ۲۔ ۳۔ اور ۴ مارچ کو دیکھا اور جو کچھ فوجی افسروں سے گفتگو کے دوران میں سنا اس کی بنا پر ہم سب کا تاثر یہی تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اس پوزیشن کو قبول کرنے سے ہچکچاتے تھے کہ وان کے قول کے مطابق) ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس اُن کے سپاہیوں کا کمانڈر بن جائے" ہمارا خیال ہے کہ یکم و ۲۔ مارچ کے متعلق بیان محض خطابت کا ایک نمونہ تھا کیونکہ فوج ۲۔ مارچ کی شام تک طلب نہ کی گئی تھی جب مولانا اختر علی خاں مجبوراً منظر عام پر آئے تھے اور فوجی سپاہیوں نے دوسرے دن صبح تک گشت شروع نہ کی تھی جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں اس کے بعد فوج آزادانہ اقدام کرتی اس کو کسی بیرونی اقتدار کی شکایت نہ ہوتی اور وہ اسی طرح عمل کرتی جس طرح اس نے مارشل لا کے دوران میں کیا لیکن اس کے بعد بھی اس نے اقدام نہ کیا چیف سیکرٹری سے ہم نے سوال کیا کہ آیا "عدم امداد" کی کوئی مثال اُن کے علم میں آئی تھی اُن کا جواب یہ تھا کہ" میں نے محض یہ کہا ہے کہ فوجی حکام نے ادھر اُدھر گشت لگانے کے سوا اور کوئی کارروائی نہیں کی اگر صورت حالات کسی خاص اقدام کی متقاضی تھی اور کسی فوجی افسر کا یہ خیال تھا کہ سول حکام صورت حالات کا موثر تدارک نہیں کر رہے ہیں تو ان افسروں کو چاہیئے تھا کہ اپنی تجاویز پیش کرتے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اس امر سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی کہ کیا کرنا چاہیئے" اس بیان سے معاملے کا ایک نیا پہلو ہمارے سامنے آیا ہے فوج کا کام صرف یہی نہ تھا کہ سول اقتدار سے آزاد رہ کر کام کرے بلکہ یہ بھی تھا کہ جہاں صورت حالات کے تدارک کی تدبیر ان کو کمزور پائے وہاں سول حکام کو مشورہ بھی دے لیکن ہم مسٹر چندریگر سے سن چکے ہیں کہ جنرل اعظم نے ان سے شکایت کی تھی کہ پولیس کے حوصلے پست ہو رہے ہیں اس سے سول حکام پر واضح ہو جانا چاہیئے تھا کہ پولیس کسی صورت حالات کا مقابلہ بھی مضبوطی سے نہیں کر رہی ہے

اس پوری مدت میں ہم نے فیصلوں کی طرف توجہ نہیں کی جن کے الفاظ سے آزادانہ اقدام کا کوئی خیال ظاہر نہیں ہوتا چیف سیکرٹری کا استدلال "ان فیصلوں کے باوجود" عام قانون کے وجود پر مبنی ہے ہم یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ اجلاس میں ہر شخص کو یہ معلوم تھا کہ اگر کسی فوجی کمانڈر اور اس کے سپاہیوں کا سامنا کسی خلاف قانون مجمع سے ہوگا تو عام قانون کے ماتحت وہ اپنے اختیار تمیزی کو استعمال کر کے اس کو منتشر کر سکے گا لیکن اگر فوج اور پولیس دونوں کے اعلیٰ حاکم اس علم کے باوجود اجلاس میں اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ فوج کا امدادی دستہ مخصوص انداز سے استعمال کیا جائے گا یعنی وہ پولیس کو "امداد" دے گا تو کیا فوج آزادانہ اقدام کر کے اس الزام کا نشانہ نہ بن جاتی کہ اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے؟ پھر اگر یہ فرض کیا جائے کہ عام قانون کا استعمال بھی پیش نظر تھا تو فوج کا دعویٰ ہے کہ جہاں کہیں اسے مجمع نظر آیا اس نے اس کو منتشر کر دیا اور اس کے خلاف کوئی مثال موجود نہیں۔ خود چیف سیکرٹری کے ذہن میں بھی ایسی کوئی مثال موجود نہ تھی اور بالآخر انہوں نے جو شکایت کی وہ صرف مشورے میں کوتاہی کی شکایت تھی۔

مسٹر انور علی کی تعبیر حافظ عبد المجید کی تردید کرتی ہے

انسپکٹر جنرل کو یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ فوج اور پولیس کے رابطے کی تفصیل کس طریقے سے طے ہوگی لیکن اُن کا بیان فیصلوں کی اس تعبیر کے بالکل خلاف ہے جو چیف سیکرٹری نے کی ہے اُن کے قول کے مطابق حکومت خونریزی کے خوف کی وجہ سے فوج کو طلب کرنے سے بچنا چاہتی تھی ایسی

فکرمندی کی حالت میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ فوج کو آزادانہ اقدام کی اجازت دے دی جائے گی انہوں نے اپنے تحریری بیان میں یہ لکھا کہ اگرچہ میں محسوس کرتا تھا کہ مجمعوں کو منتشر کرنے کے لئے فوج سے کام لینا چاہئے لیکن کابینہ کی رائے یہ تھی کہ فوج کو صرف مخصوص صورتوں میں استعمال کرنا چاہئے اپنی شہادت میں ایک دوسرے مقام پر انہوں نے کہا :- میرا منصوبہ یہ تھا کہ فوج کو چار مقامات پر متعین کیا جائے یعنی باغ جناح - کوتوالی - گول باغ منٹو پارک - اور فوج کے سپاہی بکتر بند گاڑیوں - برین کیریروں اور ٹینکوں کو ساتھ لے کر شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر گشت لگائیں اگر کسی وقت ان سے کام لینے کی ضرورت پڑے تو مجسٹریٹ کسی خاص صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اُن سے استدعا کرے لیکن صورت حالات کو ان کے سپرد نہ کرے" ایک اور جگہ انہوں نے کہا کہ فیصلہ ۲ کا مطلب یہ تھا کہ اگر کسی مخصوص صورت حالات میں پولیس ناکام رہ جائے تو وہ فوج کو بلائے اور اس کو تدارک کے لئے کہہ دے :" اہل فوج یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ان سے کسی مخصوص صورت حالات کا چارج لینے کی کبھی استدعا

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان سے کہا

نہیں کی گئی لہٰذا انہوں نے کچھ نہیں کیا . . . . . . ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھے بتایا کہ فوج نے مجسٹریٹوں کے بعض خاص احکام کی تعمیل نہیں کی میں نے ان سے کہا کہ اس معاملے کے متعلق تحریری رپورٹ بھیجیں لیکن انہوں نے کوئی رپورٹ نہ بھیجی نہ انہوں نے مجھے اس عدم تعمیل کی کوئی مثال بتائی میرے نزدیک فیصلہ ۲ کا مطلب یہ نہ تھا کہ جب کبھی فوج کے نزدیک کوئی صورت حالات مداخلت کی متقاضی ہو تو وہ خود بخود ہی

فیصلے کا مطلب یہ نہ تھا کہ فوج آزادانہ اقدام کر سکے گی

اپنے کمانڈروں کے ماتحت کوئی اقدام کرلے فیصلے کا یہ مقصد نہ تھا کہ فوج کسی مجسٹریٹ یا پولیس کی معیت کے بغیر آزادانہ اقدام کر سکے گی ۵ - مارچ کے فیصلوں سے پہلے فوج کے گشتی دستے پولیس کی معیت کے بغیر ہی گشت کر رہے تھے :"

اس پر جناب مسٹر یعقوب علی خاں نے حسب ذیل سوال کیا :-

سوال - پھر فوج کے خلاف آپ کی وہ شکایت کیا ہوئی جس پر آپ نے اپنے تحریری بیان میں زور دیا ہے ؟

جواب :- اہل فوج نے یہ تاثر پیدا کیا کہ وہ گولی نہیں چلائیں گے جس وقت پولیس کو گالیاں دی جا رہی تھیں اور بعض لوگ اپنے اعضائے مخصوصہ کو کھول کر پولیس کی توہین کر رہے تھے اس وقت بعض موقعوں پر فوجی افسر پھولوں کے ہار اپنے گلوں میں ڈلوا رہے تھے

مال روڈ کے معاملے کے متعلق اس سے قبل بحث کی جا چکی ہے یہ واقعہ فوجی عملیات کے ابتدائی دور میں ہوا تھا اور جی او سی نے اس کے متعلق تنبیہ کر دی تھی یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ حرکت نازیبا تھی اور اگرچہ دشنام طرازی کی صورت حال لازمی طور پر نازک صورت حال نہیں ہوتی لیکن بہرحال اس قسم کا تاثر پیدا نہ ہونا چاہئے تھا بہ ظاہر یہی کی یہ واحد مثال تھی جس سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی وہ شکایت ہمارے نزدیک کچھ اہم تر نہیں ہو جاتی جو انہوں نے انسپکٹر جنرل سے کی تھی اور جس کا منشا یہ تھا کہ فوج نے مجسٹریٹوں کے بعض خاص احکام کی تعمیل نہیں کی انسپکٹر جنرل نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے جو کچھ سنا شاید اسی کی بنا پر گورنر سے شکایت کی کہ بعض موقعوں پر فوج کو اقدام کرنا چاہئے تھا لیکن اس نے نہیں کیا آخر میں مسٹر انور علی نے کہا کہ " ان واقعات کی تفصیلات ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس مہیا کر سکتے ہیں "

ہوم سیکرٹری کی تعبیر لہٰذا اب ہم ان دو افسروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کیونکہ ہوم سیکرٹری ہم کو کچھ زیادہ نہیں بتا سکتے انہوں نے کہا ہے کہ جی او سی نے ہمیشہ سول حکام کو پورے تعاون کا یقین دلایا اور یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ سول حکام نے ان کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کیا میں نہیں کہہ سکتا کہ معاملات کی حقیقی حالت کیا تھی لیکن ایسی شکایات ضرور کی گئیں کہ فوج کوئی موثر حصہ نہیں لے رہی ہے میرا خیال ہے انسپکٹر جنرل نے مجھ سے شکایت کی اور ایک واقعہ بیان کیا کہ بعض فوجی افسروں کو ہار پہنائے گئے یہ واقعہ ہے کہ مارشل لا نافذ ہونے تک فوج نے اپنے وجود کا کوئی موثر ثبوت نہیں دیا اہل فوج شورش کو توڑ کر بے جان کر سکتے تھے" جنرل اعظم کا قول بھی تھا کہ اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ ایسا کر سکتے ہیں لیکن فیصلہ ۲۷ کے متعلق ہوم سیکرٹری کا بھی تاثر یہی ہے کہ فوج کو پولیس کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔

ایس ایس پی کا تاثر سینیر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی شہادت کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ۳-۳ کی صبح کو میں نے ایک فوجی افسر کو وہ راستے بتائے جن پر میں گشت کرانے کی ضرورت سمجھتا تھا میں نے اپنے افسروں کو ہدایت کر دی تھی کہ فوج جس وقت بھی ان سے کوئی امداد طلب کرے تو وہ فوراً مہیا کریں بعض حالات میں پولیس کے افسر فوج کے ساتھ ساتھ تھے فوج کا پہلا کام یہ تھا کہ محض نمائش کی غرض سے گشت کرے انسپکٹر جنرل جی او سی اور دیگر فوجی افسروں سے اصرار کر رہے تھے کہ فوج کو کوئی شدید اقدام کرنا چاہئیے اگر گشتی دستہ کسی مجسٹریٹ کی معیت میں ہوتا تو وہ مجسٹریٹ کے حکم کے بغیر قوت استعمال نہ کر سکتا تھا یہ ہدایت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دی تھی کہ فوج کے گشتی دستوں کے ساتھ مجسٹریٹ بھی جائیں۔

اس وقت یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ فوج کوئی آزادانہ اقدام نہیں کر رہی ہے لیکن میں اس کی کوئی خاص مثال پیش نہیں کر سکتا یہ خیال مجھے بعض پولیس افسروں سے معلوم ہوا جو یہ کہہ رہے تھے کہ فوج نے نہ کہیں گولی چلائی ہے نہ مجمعوں کو منتشر کیا ہے انہوں نے بھی کوئی معین مثال نہیں دی۔ اگر جنرل اعظم یہ کہتے ہیں تو ممکن ہے یہ صحیح ہو کہ جب کبھی فوجی دستے بلوائیوں کو نظر آتے تھے بلوائی منتشر ہو جاتے تھے میرا تاثر یہ ہے کہ ہمیں فوج سے اس قسم کا تعاون حاصل نہیں ہوا جو انہوں نے ۱۹۴۷ء کے بلووں میں پیش کیا تھا جب کہ وہ کسی سے پوچھے بغیر گرفتاریاں کر رہے تھے"

لیکن اس کے برعکس "حکومت" فوج کو زیادہ اختیار دینے میں یہ اندیشہ محسوس کر رہی تھی کہ مبادا وہ خونریزی کا باعث ہو سینیر سپرنٹنڈنٹ پولیس فوج سے جس کام کی توقع کر رہے تھے وہ اس اقدام سے زائد تھا جو انسپکٹر جنرل نے اس کے سپرد کیا تھا جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم بہتر یہ سمجھتے تھے کہ فوج چیف سیکرٹری کی تجویز کے مطابق عمل کرتی لیکن اگر ایسا ہوتا تو "حکومت" کو سخت پریشانی لاحق ہو جاتی ہر شخص کو خوش کرنا بے حد مشکل ہے۔

مرزا نعیم الدین یہ بھی کہتے ہیں: "مجھے خیال ہے کہ بعض مجسٹریٹ بھی فوج کے رویہ کے خلاف گلہ کر رہے تھے مارشل لا کے ایام میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بیان کیا تھا کہ انہیں بھی بعض مجسٹریٹوں سے اس قسم کی شکایات موصول ہوئی تھیں"

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بیان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس سے انکار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں فوج اور پولیس کے رابطۂ عمل سے کاملاً مطمئن تھا ان کے بیان کے مختلف حصوں سے مندرجہ ذیل اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جن سے پوزیشن مزید واضح ہو جائے گی :-

''۳- کی صبح کو ہم سول لائنز کے تھانے میں فوج کے سینیئر افسروں سے ملے اور ان کو وہ اہم مقامات بتائے جن میں گشت کرنا ضروری تھا ہم نے کہا کہ مجسٹریٹ اور پولیس گشتی دستوں کے ساتھ لازمی طور پر ہوں گے اگر کوئی مجمع خلاف قانون نظر آئے گا تو مجسٹریٹ اسی موقع پر مناسب اقدام کا فیصلہ کرے گا میں فوج سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ وہ مجسٹریٹ کے حکم کے بغیر گولی چلائے گی میں ایسی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتا کہ کہیں فوج تنہا گئی ہو۔ کسی ہجوم سے اس کا سامنا ہوا ہو اور اس نے وہ اقدام نہ کیا ہو جو اسے کرنا چاہئے تھا مجھے دو موقعوں کا علم ہے جب صورت حالات کو فوج کے حوالے کرنا ضروری ہو گیا تھا ایک تو ۵- مارچ کو لوہاری دروازے کے باہر جب پولیس کے تھانے پر حملے کا خطرہ تھا اور اس کے اندر اینٹیں پھینکی جا رہی تھیں دوسرا موقع ۶- مارچ کو ٹاؤنٹن مارکیٹ میں پیش آیا فوج نے گولی چلائی اور صورت حالات کا مداوا ٹھیک طور سے کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ میں نے سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کہا تھا کہ مجسٹریٹوں نے مجھ سے فوج کے عدم تعاون کی شکایت کی ہے مجھے پورا اطمینان تھا کہ فوج نے اپنے آپ کو کاملاً سول حکام کے حوالے کر رکھا ہے . . . . . فیصلہ ۳ کا مطلب یہ تھا کہ فوج اور پولیس دونوں اکٹھے ہو کر باہر نکلیں گی''

ملک حبیب اللہ ملک حبیب اللہ نے بیان کیا ''مجھے فوج کی طرف سے تعاون کی کمی کی کوئی شکایت نہ تھی اس کے برعکس ایک ہی موقع پر جب میری موجودگی میں مسٹر عالم نے ایک فوجی دستہ طلب کیا تو فوج نے وہ دستہ فی الفور مہیا کر دیا لیکن ایک اور موقع پر اس مطالبے کے تھوڑی دیر بعد . . . . ہم نے دیکھا کہ جو فوجی دستہ لوہاری دروازے کے تھانے پر پہنچا تھا وہ جارحانہ اقدام کے لئے مورچہ لگائے بیٹھا تھا لیکن عوام اس پر اور اس کی گاڑیوں پر پھول اور ہار پھینک رہے تھے . . . . . فوج ایک ایسے وقت پر تھانے کی طرف گئی تھی جب ہجوم تھانے پر خشت باری کر رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ پوری سڑک اور پورا انارکلی چوک اینٹوں سے پٹا پڑا تھا لیکن فوجی دستے نے گولی نہیں چلائی'' اس سے یہ کہانی کسی قدر پیچیدہ ہو جاتی ہے کیونکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہمیں بتا چکے ہیں کہ فوج نے گولی چلائی اور موثر طور پر چلائی لیکن اگر صرف یہی وہ پھول تھے جن کی خوشبو ہماری کہانی میں بار بار پھیلتی رہی ہے تو ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اس میں فوج کا کچھ قصور نہ تھا کہ وہ تو گولی چلانا چاہے اور لوگ اس پر پھول برسانے کے خواہاں ہوں کوئی شخص ایسے آدمی پر گولی نہیں چلا سکتا جو اس کو پھولوں کا تحفہ پیش کر رہا ہو۔

جنرل اعظم کا بیان آخر میں ہم جنرل اعظم کی شہادت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اگرچہ اب تک جو شہادت قلمبند ہوئی ہے اس سے فوج کے خلاف کسی الزام کا انکشاف نہیں ہوا لیکن صورت حالات کے متعلق جنرل اعظم کا

بیان بھی ضرور سننا چاہیے جنرل اعظم فیصلہ ص۲ کا یہ مطلب نہیں سمجھتے کہ پولیس کے ساتھ فوج ضرور ہوگی۔ "نہ پولیس نے ہم سے کوئی استدعا کی تھی کہ ہم اس کے ساتھ رہیں،، لیکن فوج کہیں دور فاصلے پر مقیم نہ تھی۔ "اپنے کمانڈروں کے ماتحت" کا یہ مطلب نہ تھا کہ فوج پولیس سے بے نیاز ہو کر آزادانہ اقدام کرے گی وہ اس سے پیشتر بھی اپنے ہی کمانڈروں کے ماتحت تھی" مسٹر جندریگر نے فیصلے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ فوجی دستے قوت کا استعمال کریں گے لیکن وہ اپنے کمانڈروں کے ماتحت اقدام کریں گے اور فوجی کمانڈر جی او سی کی عمومی ہدایات کے ماتحت اپنا اختیار تمیزی استعمال کریں گے یہ مطلب ان معنوں میں صحیح ہے کہ اگر پولیس ہم سے امداد طلب کرے گی تو وہ امداد فی الفور دی جائے گی ...... اُن کا بیان کہ میں نے تسلیم کیا ہے کہ ہار پہنانے کا کم از کم ایک واقعہ ضرور ہوا تھا صرف اس حد تک درست ہے کہ ایک دفعہ اس قسم کی کوشش کی گئی تھی اور اس میں پھول دور سے دکھائے گئے تھے شاید اس سے مقصود یہ تھا کہ فوج اور پولیس میں پھوٹ پڑ جائے۔ مسٹر جندریگر نے بیان کیا ہے کہ میں نے اس معاملے کی تحقیقات کی اور انہیں اطمینان ہو گیا کہ جن موقعوں کے متعلق شکایت کی گئی ہے ان پر گولی چلانا ضروری نہ تھا یہ بیان صرف اس حد تک درست ہے کہ میں نے برگیڈ کمانڈر سے تحقیق کی تھی جو اس وقت موقع پر موجود تھا"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہار پہنانے کے صرف ایک واقعہ نے فوج کے خلاف تعصب پیدا کر دیا یہ بات ایک شخص سے دوسرے شخص تک اور ایک حلقے سے دوسرے حلقے تک پہنچی اور لوگ اس کو بطور مثال پیش کرنے لگے کہ فوج نے صورت حالات کے متعلق یہ رویہ اختیار کیا ہے لیکن ایسی کوئی مثال پیش نہیں کی گئی اور کوئی ایسی مثال مبہم طور پر بھی معلوم نہیں جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ فوج نے اپنا مفوضہ کام انجام نہیں دیا یا ایسے طریق سے انجام دیا کہ اس کے متعلق دو رائیں ظاہر کی جا سکیں اس موضوع کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا گیا ہے کہ فوج نے جو کچھ کیا وہ اس سے زیادہ بھی کر سکتی تھی

فوج کے خلاف کوئی چیز ثابت نہیں

وہ یقیناً کر سکتی تھی بشرطیکہ اس کو بغیر کسی تامل کے استعمال کیا جاتا یہ تامل محض اس اندیشے کی وجہ سے تھا کہ وہ خون ریزی کا باعث ہوگی فوج کے خلاف کوئی چیز ثابت نہیں یہ الزام و ملامت سے بچنے کا محض ایک بہانہ تھا۔

۶۔ کیا مارشل لا سے بچنا ممکن تھا؟

جنرل اعظم کا خیال ہے کہ اگر بروقت کارروائی کی جاتی تو فوج بھی بالکل غیر ضروری تھی یہ نیم دلی کی تدبیر اور ناقص قیادت کا نتیجہ تباہی کی صورت میں نکلا پولیس فرسٹ کلاس تھی اگر وہ ایک خاص مرحلے پر مضبوط پالیسی پر عمل کرتی تو فوج کی مدد کے بغیر ہی صورت حالات پر قابو پا لیتی ضرورت جرات کی اور ایک معین مقصد کی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس امر کا احساس چاہیے تھا کہ یہ معاملہ قانون و انتظام کا ہے اور ہر قیمت پر اس کا سامنا کرنا ہے"

اگر فوج کو استعمال کرنے کے متعلق ہچکچاہٹ نہ ہوتی

یہ شاید صحیح نہ ہو کہ فوج کی بالکل ہی ضرورت نہ پڑتی لیکن یہ صحیح ہے کہ سول حکام کے اقدامات پر ایسی مصلحتوں کا اثر تھا جو خالص قانون و انتظام کے معاملے سے بالکل علیحدہ تھیں حکومت فوج کو بلا تامل استعمال کرنے سے ہچکچا رہی تھی کہ مبادا خون ریزی ہو جائے جیسا مسٹر انور علی نے کہا ہے اور روزنامہ معزز شہریوں کے اس احتجاج سے پریشان ہو رہے تھے کہ پولیس اُن پُرتشدد ہجوموں پر بھی گولی چلا رہی ہے (ہم دہراتے ہیں کہ "پُرتشدد ہجوموں پر بھی") جو زیادہ سے زیادہ کسی تھانے پر خشت باری کر دیتے ہیں یا کسی کسی جگہ کسی اومنی بس کو جلا دیتے ہیں یا کسی قصوروار ڈاک خانے کو آگ لگا دیتے ہیں یا مسافروں سے بھری ہوئی کسی ریلوے ٹرین پر پتھر پھینکتے ہیں کیونکہ وہ سٹیشن سے روانہ ہونے کی کوشش کرتی ہے یا ان تانگے والوں اور دکانداروں کا منہ کالا کر دیتے ہیں جو اپنے کاروبار کو بند نہیں کرنا چاہتے۔ یہ بہت چھوٹے واقعات ہیں بمقابلہ اس کے کہ ایک بھری ہوئی بوری کو خواجہ ناظم الدین کا مجسمہ بنا کر دکھایا جائے اور قصور میں ایک گدھا تیار کیا جائے جس کے سوار کو ظفر اللہ خاں ظاہر کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک حکم صادر کر دیا گیا جس کے معنی یہ سمجھے گئے کہ فائرنگ کو محدود رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے اور جس کا اثر پولیس پر طبعاً بہت برا ہوا۔

اگر مسجد وزیر خاں کو منقطع کر دیا جاتا

لیکن اب ہم پھر ۴- مارچ کا ذکر کرتے ہیں جب سید فردوس شاہ قتل کئے گئے تھے اس سے بھی قبل سب کو معلوم تھا کہ مسجد وزیر خاں تمام گڑبڑ کا مرکز ہے مولانا عبد الستار نیازی اس میں مسند نشین ہو چکے ہیں اور ایک ایسی مضبوط نشست سے حکومت کے خلاف نفرت پھیلا رہے ہیں۔ کہ ان کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ کی بھی تعمیل نہیں کی جا سکتی اگر پولیس صورت حالات پر قابو پا سکتی تھی تو مسجد کو کھلا کیوں چھوڑ دیا گیا اور اگر اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا تھا تو اس کو فوج کے حوالے کیوں نہ کیا گیا ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر صرف اس ایک ہی صورت حالات کو فوج کے حوالے کر دیا جاتا تو بلووں کی رفتار پر نہایت نمایاں اثر پڑ جاتا۔

اگر انسدادی اقدام کچھ مدت پہلے کیا جاتا

اب ہم اور بھی پہلے کے واقعات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں سوائے اس حالت کے کہ حکومت پنجاب اور مجلس عمل کے درمیان یہ سمجھوتہ ہو چکا ہو کہ شورش کا مرکز کراچی ہو گا ۲۸- فروری کو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری حکم نافذ کرنا دنیا دارانہ تدبیر تھی اسی وجہ کی بنا پر اسے "انسدادی" تدبیر کہتے ہیں اس قسم کا حکم ۲۶ یا ۲۷ جولائی ۱۹۵۲ء کو بھی جاری کیا گیا تھا جب لیگ کے دفتر کے سامنے تشدد کا مقامی خطرہ درپیش تھا اور یہ حکم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کسی سے استصواب کئے بغیر نافذ کر دیا تھا یہ حسِ تناسب کے فقدان کا ثبوت ہے کہ اس موقع کو ۲۸- فروری سے بھی زیادہ خطرناک ممکنات کا حامل سمجھا گیا حالانکہ ۲۸- فروری کو ڈائرکٹ ایکشن کے چیلنج پر عمل ہونے والا تھا اور مرکزی حکومت نے اس چیلنج کو قبول کر کے ممتاز لیڈروں کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے نزدیک "گم نام" لوگ تھے۔

اگر باورچی اتنے زیادہ نہ ہوتے

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ بہت سے باورچی سالن کی ہنڈیا کو خراب کر دیتے ہیں ہمیں بارہا یہ احساس ہوا ہے کہ لاہور کی مصیبت بھی "بہت سے باورچیوں" کی وجہ سے تھی دوسرے اضلاع میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس صورت حالات پر گفتگو کر کے ایک لائحہ عمل

تیار کر لیتے ہیں اور بغیر کسی خلل اور مداخلت کے اس کو پورا کر سکتے ہیں لاہور میں متعدد بڑے افسر موجود ہیں جن سے مشورہ ضروری ہوتا ہے اور باوجود اس کے جو کچھ مسٹر دولتانہ اور ان کے افسروں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فرائض کے متعلق کہا ہے اگر ان کے پاس ایک ایسا قوی آدمی ہوتا جو بروقت ایک حکم امتناعی جاری کر دیتا مسجد وزیر خاں کو فی الفور آبادی سے منقطع کر دینے کا حکم دے دیتا اور نارنگ نرم کرنے کے فیصلے کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیتا تو ہمیں یقین ہے کہ اس کا آئندہ عہدہ کراچی میں "کنٹرولر اجناس خوردنی و ونٹین" نہیں بنتا لیکن ہم کو حقیقت میں ایسے افسروں کی ضرورت ہے جو ۴۔ مارچ کی شام کو صرف ایک پستول جیب میں ڈال کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر تن تنہا مسجد وزیر خاں میں جا سکیں ہم کو اس قسم کے افسروں کی نسل ڈھالی چاہئے اور ان میں آزادی و خود مختاری کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے"۔

لائل پور کی ایک مثال

"بہت سے باورچیوں" کے موضوع کے سلسلے میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسٹر ابن حسن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ لائل پور نے تن تنہا انسپکٹر جنرل۔ ہوم سیکرٹری۔ چیف سیکرٹری۔ چیف منسٹر اور گورنر کی امداد کے بغیر کیا کام انجام دیا۔ یہ شہر لاہور کے مقابلے میں چھوٹا ہے لیکن اس کا رقبہ مسجد وزیر خاں سے کچھ بڑا ہی ہو گا ۲۔ مارچ کو جامع مسجد میں لاہور اور کراچی جانے والے رضا کاروں کے اعزاز میں اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں لیکن اس کے بعد ہم نے ان رضاکاروں کے متعلق کچھ بھی نہ سنا پولیس نے سالار والا کے مقام پر ان کو کہیں غائب کر دیا ۳۔ مارچ کو سیالکوٹ میں گولی چلنے کی خبر سے کچھ اضطراب پیدا ہوا لہٰذا فوراً دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی چار پانچ ہزار آدمیوں کا ایک جلوس ڈپٹی کمشنر کے مکان کی طرف روانہ ہوا لیکن منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے چند گرفتاریاں کر لی گئیں ۴۔ مارچ کو مکمل ہڑتال تھی ایک جلوس نے پھر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کا رخ کیا لیکن ڈپٹی کمشنر نے نہایت ہوشیاری سے کام لے کر اس کو جیل کی طرف منتقل کر دیا جلوس کا رویہ جارحانہ اور اشتعال انگیز تھا لیکن ڈپٹی کمشنر نے پولیس کی نفری کو ناکافی پا کر اس کو منتشر تو نہ کیا لیکن ۱۲۷۔ آدمیوں کو گرفتار کر لیا اس کے بعد اس افسر نے ہوم سیکرٹری کو ٹیلیفون کر کے فوجی امداد اور ایک ہوائی جہاز کا مطالبہ کیا تاکہ قانون و انتظام کا احترام قائم کیا جائے یہ دونوں چیزیں بلا تاخیر مہیا کر دی گئیں ۵۔ مارچ کو دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری کے حکم کی خلاف ورزی میں ایک جلوس نکالا گیا اور ۵۰۔ اشخاص گرفتار کیے گئے ۶۔ اور ۷ کو بھی جلوس نکلے اور گرفتاریاں کی گئیں لیکن ۷۔ کو فضا زیادہ کشیدہ ہو گئی اور ہنگامہ آرائی رونما ہونے لگی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو خبر ملی کہ تین ٹرینیں روک لی گئی ہیں اور مسافر عورتوں کی بے عزتی کی جا رہی ہے اور ان کو لوٹا جا رہا ہے اس نے مضبوط اقدام کے لئے کسی مجسٹریٹ کو نہیں بھیجا بلکہ خود وہاں گیا اور اس نے ہجوم کو منتشر کرنے کا حکم دے دیا جب لوگ منتشر نہ ہوئے تو اس نے لاٹھی چارج کا خطرہ لینا گوارا نہیں کیا جس میں اکثر پولیس پٹ جایا کرتی ہے اس نے گولی چلانے کا حکم دے دیا جس سے چار ہلاک اور پانچ زخمی ہوئے پھر اس نے ٹرینوں کو فوجی پہرہ مہیا کیا تاکہ آمد و رفت کی روانی معطل نہ ہونے پائے۔

۸۔ مارچ کو اس نے سنا کہ چنیوٹ بازار کے مکانوں کی چھتوں پر اینٹیں جمع کی گئی ہیں تاکہ اگر پولیس جلوسوں میں مداخلت کرے تو اس پر اینٹوں کی بوچھاڑ کی جا سکے ۷½ بجے شام وہ ڈی۔آئی۔جی کے ساتھ چنیوٹ

بازار گیا وہاں ان کا سامنا ایک سرکش ہجوم سے ہوا یہ دونوں افسر وہاں سے واپس آگئے اور پھر فوج کا ایک دستہ لے کر آئے انہوں نے ہجوم کو منتشر ہونے کا حکم دیا جب اس حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے گولی چلانے کا حکم دے دیا جس سے تین آدمی ہلاک ہوئے اور ایک زخمی ہوا۔

اس کے بعد کوئی واقعہ نہیں ہوا صرف ایک واقعہ البتہ ہوا کہ ایک دن شام کو چیف منسٹر نے ٹیلیفون پر اس کے مضبوط اقدام پر مبارکباد دی۔

سیال کوٹ کی مثال سیال کوٹ میں کم از کم دو ایسے واقعات ہوئے جن کا انتظام فوج کے حوالے کر دیا گیا اور کسی کو یہ اندیشہ نہ ہوا کہ فوج ایسا قابو پالے گی کہ سول حکام بالکل ہی بے دخل ہو جائیں گے نہ کوئی ایسا خطرہ تھا کہ خوں ریزی ہو جائے گی ہمارا مطلب یہ ہے کہ اس کے متعلق کوئی اضطراب نہ تھا کیونکہ جب گولی چلے گی تو خونریزی لازماً ہو گی اور "تم کو معلوم ہے کہ ایسے واقعات پر شہود نتیجے کے موقع پر ہوا ہی کرتے ہیں"۔ ہم ایک مختلف موقع پر یہ لکھ چکے ہیں کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جب دیکھا کہ صورت حالات اس کی متقاضی ہے تو اس نے اس کو فوج کے حوالے کر کے دانش مندی کا ثبوت دیا۔

مارشل لا کے بعد جنرل اعظم نے فصیلی شہر کے اندر (جس پر ۶ مارچ سے کسی نے قابو نہ پایا تھا) صرف ایک بٹالین استعمال کی جس میں چار سو اور چھ سو کے درمیان نفری تھی۔ جنرل اعظم نے شکایت کی کہ مارشل لا کے اعلان سے پہلے فوج کو محض "نمائشی مقصد، (یعنی گشت) کے لیے استعمال کیا گیا اور بدنظمی کو دبانے کے لیے کام میں نہ لایا گیا"۔ مثلاً اگر مجھ سے یہ کہا جائے کہ کرفیو آرڈر کو گولی چلا کر اور گرفتاریاں کر کے نافذ کرو تو یہ بدنظمی کو دبانے کا کام ہو گا۔ اس کے بعد طوفان کا مرکز یعنی مسجد وزیر خاں کا رقبہ بلکہ حقیقۃً فصیلی شہر کا پورا رقبہ نظر انداز کر دیا گیا اگر دبانے کا کام ہمارے سپرد ہوتا تو ہم سارے شہر میں اپنی چوکیاں قائم کر لیتے اور لوگوں کو اُن کے "بھٹوں" میں آنے جانے سے بالکل روک دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں کہیں فوجی دستے ظاہر ہوتے تھے لوگ غائب ہو جاتے تھے"۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہمیں بتایا ہے کہ ۵ مارچ کی شام تک پولیس جواب تک صورت حالات کے تدارک کے لیے جدوجہد کر رہی تھی ناکام ہونے لگی اور اس کے بعد "پولیس کا کام تھا کہ فوج کی خدمات سے فائدہ اٹھاتی"۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ آپ نے اس کو ممکن کیوں نہ بنایا انہوں نے جواب دیا "فوج بھی موجود تھی اور پولیس بھی موجود تھی" اُن کا فرض تھا کہ فوج کو طلب کر لیتے اور فوج پہلے ہی سے شہر میں موجود تھی "یہ پولیس کے حاکم اعلیٰ کا فرض تھا کہ انہیں بتاتا کہ انہیں کس طریقے سے کارروائی کرنی چاہیئے اگر مجسٹریٹ موجود ہو جب بھی پولیس ہی کا کام ہے کہ فوج سے اقدام کی استدعا کرے"۔ آپ نے کہا کہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۹ کا یہی مطلب ہے۔

ہمارا یہی مطلب ہے اس قول سے کہ اگر ایک قوی آدمی موجود ہوتا جو قانون و انتظام کے سوا دوسری بیرونی مصلحتوں کو نظر انداز کر دیتا اور اس اعلیٰ درجے کے مواد و سامان میں جو اس کے قدموں میں پڑا تھا زندگی کی روح پھونک دیتا تو حالات بالکل مختلف ہوتے اس باب کو ہم اس مصرع پر ختم کرتے ہیں کہ ؎

شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

اس حصے کے آخری نتائج

اب پوری صورت حالات پر تبصرہ کرنا مناسب ہے۔

ہر شخص اس پر متفق تھا کہ احراری ایک مخالفِ حکومت گروہ ہے یہ لوگ قیام پاکستان کے مخالف تھے اور سردار عبدالرب نشتر کا خیال بھی یہی ہے کہ وہ اپنے اعتماد کو دوبارہ بحال کرنے کی فکر میں ہیں ۱۹۵۰ء میں اور پھر ۱۹۵۲ء میں مسٹر انور علی نے جو اس زمانے میں ڈی آئی جی سی آئی ڈی تھے پُرزور سفارش کی کہ ان کو خلاف قانون جماعت قرار دیا جائے مسٹر قربان علی خاں نے بار بار پُرزور اور پیشگویانہ یادداشتیں لکھیں اور غفلت کے امکانی نتائج سے آگاہ کیا ایک لاقانونی سے دوسری لاقانونی پیدا ہوتی ہے ایک مکروہ شئے دوسری مکروہ شئے کی باعث ہوتی ہے لیکن جب کبھی کوئی کانفرنس ہوئی یا تو ان لوگوں کو اپنی پُرزور رائے تبدیل کرنے پر آمادہ کر لیا گیا یا سرکاری اخلاق نے انہیں احتجاج سے باز رکھا لہٰذا مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ جو فیصلے فائلوں میں درج ہیں ان پر ہر شخص متفق تھا اور حکام متعلقہ نے اس بات کی کبھی تردید نہیں کی لہٰذا ہماری رائے یہ ہونی چاہیئے کہ ذمہ داری مشترک تھی گو ہمارا احساس اس سے مختلف ہے مزید براں ہمارا احساس یہ بھی ہے کہ احراریوں سے تو ایسا برتاؤ کیا گیا گویا وہ خاندان کے افراد ہیں اور احمدیوں کو اجنبی سمجھا گیا۔ احراریوں کا رویہ اس بچے کا سا تھا جس کو اس کا باپ کسی اجنبی کو پیٹنے پر سزا کی دھمکی دیتا ہے اور وہ بچہ یہ جان کر کہ اسے سزا نہ دی جائے گی اجنبی کو پھر پیٹنے لگتا ہے۔ اس کے بعد چونکہ دوسرے لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں اس لئے باپ محض پریشان ہو کر بیٹے کو مارتا ہے لیکن نرمی سے تاکہ اسے چوٹ نہ لگے۔

چونکہ مرکزی حکومت مسلسل دریافت حال کر رہی تھی اور سی آئی ڈی کی یادداشتیں انبار در انبار جمع ہو رہی تھیں اس لئے ۲۵۔ مئی ۱۹۵۲ء کو ایک کانفرنس منعقد کی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ احراریوں اور احمدیوں کے تمام جلسے ممنوع قرار دیئے جائیں یہ اقدام بہت خوب تھا لیکن ۵۔ جولائی تک اس کو کاٹ چھانٹ کر بالکل ہی نیست و نابود کر دیا گیا حکم امتناعی کی خلاف ورزی میں جلوس نکلتے ہیں تو نکلنے دو جلسے ہوتے ہیں تو ہونے دو احراریوں کے سوا کسی کو گرفتار نہ کرو کوئی احراری گرفتار نہ کیا جائے صرف ممتاز احراری گرفتار کیے جائیں اور اگر کوئی ممتاز احراری کسی ایسے جلسے میں تقریر کرے جو اس کی جماعت نے منعقد نہ کیا ہو تو اسے حکومت سے استصواب کیے بغیر گرفتار نہ کیا جائے۔

اور حکام ضلع نے قدرتی طور پر اس میں ایک چوتھی ہدایت کا اضافہ کر لیا حکومت سے استصواب کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ استصواب کرنے میں دیر لگتی ہے آخر حکومت کو پولیس کے سولہ تھانوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اور پھر مہاجرین اور استقبال معززین کو بھی مزید دو تھانے ہی سمجھنا چاہیئے یہ کیس ایک کانفرنس میں پیش کرنا ہوگا لیکن اس وقت جب سات آٹھ اسی قسم کی مزید فائلیں جمع ہو جائیں پھر تین مہینے کے بعد تم سنتے ہو کہ عبداللہ اور سنار ان صرف ادنیٰ قسم کے لوگ ہیں ان کے خلاف مقدمات دائر کرنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہ ہوگا لیکن اگر عدالتی کارروائی کی منظوری بھی دے دی گئی تو تین مہینے گزر جانے کے بعد اس کی انتقامی وقعت کیا رہ جائے گی؟

اگرچہ ۵۔ جولائی کے فیصلے اس وقت کیے گئے تھے جب مسٹر دولتانہ نتھیا گلی میں تھے لیکن اس امر کے قرائن موجود ہیں کہ ان کے جانے سے پہلے ان فیصلوں کے متعلق ان سے بات چیت کی جا چکی تھی ہوم سیکرٹری نے ان سے ٹیلیفون کا رابطہ بھی برابر قائم رکھا تھا۔

جہاں ایک طرف افسروں پر یہ ظاہر کیا گیا کہ ان فیصلوں سے احراریوں کو باقی قوم سے منقطع کرنا مقصود ہے وہاں دوسری طرف احراریوں کو اس امر کا موقع دے دیا گیا کہ وہ ۱۳۔ جولائی کو کنونشن منعقد کرکے تمام مسلم جماعتوں کے علماء سے اتحاد کرلیں اس چال سے احرار نے جمہور کے ایک بہت بڑے طبقے کی ہمدردیاں حاصل کرلیں کیونکہ عوام احرار کی نسبت علما کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔

جب احراریوں نے دیکھا کہ ان کے جلسے ممنوع کیے جا چکے ہیں اور بعض احراریوں کے خلاف مقدمات بھی دائر ہو چکے ہیں تو انہوں نے ایک معافی دے کر اپنی آزادی خرید لی انہوں نے ایک بیان جاری کیا کہ انہوں نے کبھی آج تک تشدد کی تلقین کی ہے نہ آئندہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں حکومت کو معلوم تھا کہ انہوں نے تشدد کی تبلیغ کی ہے یا کم از کم ان کی تقریروں کا اثر یہی ہوا ہے لیکن حکومت نے یہ جانتے ہوئے بھی ان کے بیان کو اس طرح قبول کرلیا گویا احراریوں نے معافی مانگ لی ہے حالانکہ صرف پندرہ روز پیشتر جب مسٹر انور علی نے ان سے معافی مانگنے کو کہا تھا تو انہوں نے انکار کردیا تھا حکومت کو خوب معلوم ہے کہ ایک مبہم قسم کا معافی نامہ کیونکر حاصل کیا جاتا ہے چنانچہ انہوں نے ۲۸۔ فروری کو مولانا اختر علی خاں سے ایسا معافی نامہ حاصل کرہی لیا تھا لیکن احرار کے معاملے میں ایک ایسا بیان جس سے ان کی عزت اور ان کے اعتبار میں ذرہ بھر کمی بھی نہ ہوتی تھی بہت بڑی کامیابی قرار دیا گیا اور ان کو اجازت دے دی گئی کہ وہ شوق سے تقریریں کریں وزیر خارجہ کو گالیاں دیں وزیر اعظم کو رسوا کریں اور شائستگی کے خلاف الفاظ استعمال کریں اس تمام دوران میں مسٹر دولتانہ کو ان کے افسر بار بار یاد دلاتے رہے کہ احرار اپنے قول و قرار کی پابندی نہیں کر رہے ہیں لیکن ان افسروں نے خود بھی کسی کارروائی کی تجویز پیش نہ کی یا تو انہیں علم تھا کہ ان کی یادداشتوں سے کچھ اثر نہیں ہوتا یا انہیں یادداشتیں لکھنے کی عادت پڑ گئی تھی جب متعدد فائلیں جمع ہو گئیں تو ایک پالیسی کانفرنس کی تجویز ہوئی اور ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کو فیصلہ کیا گیا کہ عام قانون کا احترام کیا جائے یہ بات تمسخر سے کم نہیں معلوم ہوتی کہ اب تک حکومت پنجاب۔ اس کی وزارت قانون و انتظام اور ان کی سول اور پولیس سیکرٹریٹ کو معلوم ہی نہ تھا کہ عام قانون کا احترام ضروری ہے لیکن اس وقت تک افسروں کی ذکاوت حس اس قدر مردہ ہو چکی تھی کہ ان کے نزدیک عام قانون کی خلاف ورزی کی سزا میں بھی محض تنبیہ کافی تھی مرکزی حکومت نے پالیسی کی ایک چٹھی ستمبر ۱۹۵۱ء میں اور دوسری جولائی ۱۹۵۲ء میں جاری کی اور صوبائی حکومت پر یہ واضح کردیا کہ جارحانہ فرقہ آرائی کو سختی سے دبا دیا جائے لیکن صوبائی حکام نے اپنی یادداشتوں میں اس امر پر زور دیا کہ مطالبات کے متعلق فیصلہ مرکز کا کام ہے اور جب تک ان کے موافق یا مخالف فیصلہ نہ ہوگا قانون و انتظام کی صورت حالات بہتر نہ ہوگی انہیں خوب معلوم تھا کہ مرکز کسی حالت میں بھی مطالبات کو منظور نہیں کرسکتا اور اگر کوئی فیصلہ ہوگا بھی تو وہ نامنظوری ہی کا

فیصلہ ہوگا لیکن وہ مصر ہے کہ کوئی فیصلہ ضرور ہونا چاہیئے اور مرکز جس کے نمایندہ خواجہ ناظم الدین تھے کھلم کھلا یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ مطالبات کو مسترد کر رہا ہے کیونکہ خواجہ صاحب کے نزدیک ایسے فیصلے سے اُن کا علما سے تصادم ہو جائے گا اور خواجہ صاحب علما کی طرف نہایت گہرا میلان رکھتے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ مطالبات بغیر کسی مذہبی احتیاط کے۔ بغیر امن عامہ کو خطرے میں ڈالے اور بغیر حسیات عامہ کو صدمہ پہنچائے مسترد کیے جا سکتے تھے لیکن ہمارے نزدیک قانون و انتظام کی صورت حالات کے مقاصد کے لیے ان کا جواب دینا بالکل ضروری نہ تھا وہ صورت حالات تو ایک سادہ حکم امتناعی کے نفاذ ہی سے بہت بہتر ہو گئی تھی (گو وہ حکم بہت ناکافی تھا) لیکن جب جولائی سنہ ۱۹۵۲ء کے بعد احرار اور علما کے ہر قول و فعل کی طرف سے کامل بے پروائی کا رویہ اختیار کر لیا گیا تو وہ صورت حالات پھر بگڑتی چلی گئی بلکہ اس کے برعکس چیف منسٹر کی اُن تقریروں کی وجہ سے یہ بگاڑ اور بھی زیادہ ہو گیا جن میں اُنہوں نے علی الاعلان یہ خیال ظاہر کیا کہ احمدی مسلمان نہیں ہیں۔

اخبارات نے یقیناً ڈائرکٹر تعلقات عامہ کی حوصلہ افزائی سے شورش کی آگ کو ہوا دی اور ہم ڈاکٹر قریشی کے اس خیال سے متفق ہیں کہ مسٹر دولتانہ ہرگز اس امر سے بے خبر نہ ہو سکتے تھے کہ اخبارات کیا کر رہے ہیں اُردو کے چار اخباروں کو ان کے ہزاروں پرچوں کے عوض بڑی بڑی رقمیں دی گئیں اور وہ پرچے بھی شاید خریدے نہ گئے اور یہ سب کچھ ایک پرانی پالیسی کی تعمیل میں کیا گیا کہ حکومت کی حمایت کرنے والے اخباروں کی سرپرستی کی جائے اور اگرچہ یہی اخبارات سب سے زیادہ شورش انگیزی کر رہے تھے لیکن جولائی سنہ ۱۹۵۲ء میں ان کے معاہدوں کی تجدید کر دی گئی اور مسٹر دولتانہ کو اس کا علم تھا دو لاکھ روپے کی رقم جو اسمبلی نے ناخواندہ بالغوں کی تعلیم کے لیے منظور کی تھی مسٹر دولتانہ کے احکام کے ماتحت ان چار اخباروں کی خریداری کے لیے منتقل کر لی گئی اور کہا گیا کہ اس سکیم کو خفیہ رکھا جائے ڈائرکٹر نے نہایت خیرہ چشمی سے ہمارے سامنے بیان کیا کہ یہ سکیم خواندگی کو ترقی دینے کے لیے نہیں بلکہ خاص قسم کے اخباروں کی امداد کے لیے وضع کی گئی تھی۔ "زمیندار" باوجود اس امر کے کہ وہ جولائی سنہ ۱۹۵۲ء کے بعد بھی جب ڈاکٹر قریشی نے مسٹر دولتانہ سے شکایت کی تھی برابر نفرت کی تلقین و اشاعت کرتا رہا گویا مامور من اللہ سمجھا جاتا رہا اور اس کے خلاف اقدام اس وقت تک ملتوی ہوتا رہا جب آخر اس التوا کی کوئی گنجائش نہ رہی کیونکہ مرکز نے سخت شکایت کی تھی احراریوں کے آرگن "آزاد" کی طرف مرکز نے بار بار صوبائی حکومت کو توجہ دلائی اور صوبائی حکومت نے ہر دفعہ محض تنبیہ پر اکتفا کیا۔

مجلس عمل کے چیلنج کو دونوں میں سے کسی حکومت نے بھی سنجیدگی سے قابل توجہ نہ سمجھا۔ خواجہ ناظم الدین آخری لمحے تک اسی امید میں رہے کہ غیب سے کوئی اچھا سامان ہو جائے گا اور صوبائی حکومت مطمئن رہی کہ شورش کا آغاز کراچی میں ہو گا۔

آخر کار جب الٹی میٹم رد کر دیا گیا تو پوری صورت حالات کو بالکل تھیٹر کے ایک پُرامن تماشے کی طرح سمجھا گیا جس میں مطمئن سامعین کی دلچسپی کے لیے سٹیج پر جلوس نکالے اور نعرے لگائے جا رہے ہوں۔ "لاہور

میں جلوس قریب قریب روزانہ نکلتے ہیں اور کوئی شخص ان کی پروا بھی نہیں کرتا۔" جرگے بہت ہو رہے تھے اور کارروائی بالکل مفقود تھی۔ "پولیس بھی موجود تھی اور فوج بھی موجود تھی"۔ اور جیسا کہ ایک افسر نے کہا ہر شخص صورت حالات کے متعلق گہرے غور و خوض میں معروف تھا اور ہر شخص کو معلوم تھا کہ کیا کرنا چاہیئے ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ فوج خاصا کام انجام دے سکتی تھی لیکن کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ ایسا کیوں نہ ہوا۔

"بعض کہتے ہیں کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا تھا دوسرے کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا اُن کا کتا تھا یہ لوگ یوں ہی قیاسی باتیں کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو کہہ دے کہ میرا خدا بہتر جانتا ہے۔ (کہف)

ہمیں یقین واثق ہے کہ اگر احرار کے مسئلے کو سیاسی مصالح سے الگ ہو کر محض قانون و انتظام کا مسئلہ قرار دیا جاتا تو صرف ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس ان کے تدارک کے لئے کافی تھے چنانچہ وہ طاقت جسے انسانی ضمیر کہتے ہیں ہمیں یہ سوال کرنے کی ترغیب دیتی ہے کہ آیا ہمارے سیاسی ارتقا کے موجودہ مرحلے پر قانون و انتظام کا مسئلہ اُس جمہوری "ہم بستر" سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جسے وزارتی حکومت کہتے ہیں اور جس کے سینے پر ہر وقت سیاسی کابوس سوار رہتا ہے۔ لیکن اگر جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ قانون و انتظام کو سیاسی اغراض کے ماتحت کر دیا جائے تو اللہ تعالیٰ ہی علیم و خبیر ہے کہ کیا ہوگا اور یہاں ہم رپورٹ کو ختم کرتے ہیں۔

محمد منیر۔ پریذیڈنٹ

ایم آر کیانی۔ ممبر

(انصاف پریس لاہور)